توضیحات

اُردُو شرح

مِشکوٰۃ المصابیح

متن و ترجمہ، تشریح و توضیح کے ساتھ

تألیف

مولانا فضل محمد یوسف زئی

استاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

ناشر:

0092-21-35470973
0321-3788955

کتاب کا نام : توضیحات شرح مشکوٰۃ (جلد اول)

مصنف : استاذ الحدیث حضرت مولانا فضل محمد صاحب یوسف زئی مدظلہ

سن اشاعت : سنہ 2011ء

تعداد صفحات : (736)

ناشر : (0315-3788955) (021-35470973) (0321-3788955)

ملنے کے پتے

کتب خانہ اشرفیہ اردو بازار کراچی — مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

مکتبہ انعامیہ، اردو بازار کراچی — دار الکتاب اردو بازار لاہور

دار الاشاعت، اردو بازار کراچی — مکتبہ خلیل اردو بازار لاہور

اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن کراچی — مکتبۃ الحرمین اردو بازار لاہور

مکتبۃ القرآن، بنوری ٹاؤن کراچی — وحیدی کتب خانہ پشاور

کتب خانہ مظہری گلشن اقبال کراچی — مکتبہ علمیہ اکوڑہ خٹک

بیت الاشاعت، بہار کالونی، کراچی — مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی

نَضَّرَ اللّٰہُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِی فَحَفِظَھَا
وَوَعَاھَا وَاَدَّاھَا (الحدیث طبرانی)

انتساب

میں اپنی اس محنتِ شاقہ کو اپنی مادرِ علمی اور عالمی مرکزِ علمی
جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن کی طرف منسوب کرتا ہوں

جس کے سایۂ عاطفت میں

بندہ نے محدث العصر حضرت اقدس حضرت مولانا محمد یوسف البنوری رحمہ اللہ
اور صدر مدرس حضرت اقدس حضرت مولانا فضل محمد سواتی رحمہ اللہ سے

احادیث مقدسہ کی سند حاصل کی۔

فضل محمد یوسف زئی

روزِ محشر ہر کسے با خویش دارد توشۂ
من نیز حاضر میشوم "توضیح" مشکوٰۃ در بغل

*

وَمِنْ مَذْھَبِی حُبُّ النَّبِیِّ وَکَلَامِہٖ
وَلِلنَّاسِ فِیْمَا یَعْشِقُوْنَ مَذَاھِبُ

بسم الله الرحمن الرحيم
كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ
اَلْمِصْبَاحُ فِىْ زُجَاجَةٍ
اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ

فہرست مضامین

توضیحات شرح مشکوٰۃ (جلد اول)

نوٹ:

قارئین کرام سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اس جدید ایڈیشن میں حتی الوسع اغلاط کی تصحیح کے باوجود اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اس سے ادارہ کو مطلع فرما کر ممنون ومشکور ہوں۔

فقط ناشر

0213-5470973
0315-3788955

مقدمہ در مصطلحاتِ حدیث

از شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ: از مولوی عبدالعلیم علوی

جمہور محدثین کی اصطلاح میں نبی کریم ﷺ کے قول وفعل اور تقریر کو حدیث کہا جاتا ہے (قول وفعل کا مطلب تو واضح ہے، تقریر کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی موجودگی میں کسی شخص نے کوئی کام کیا یا کچھ کہا اور آپ نے اس پر انکار کیا نہ اس سے روکا بلکہ سکوت اختیار فرما کر اس کی توثیق کردی) اسی طرح صحابی اور تابعی کے قول فعل اور تقریر پر بھی حدیث کا اطلاق ہوتا ہے۔

جو حدیث نبی کریم ﷺ تک پہنچے اسے مرفوع کہتے ہیں اور جس کی سند صحابی تک پہنچے اسے موقوف کہتے ہیں جیسے کہا جائے:

قال ابن عباس یا فعل ابن عباس یا قرّر ابن عباس یا عن ابن عباس موقوفا یا موقوف علی ابن عباس.

اور جس حدیث کی سند صرف تابعی تک پہنچے اسے مقطوع کہا جاتا ہے۔

بعض حضرات نے حدیث کو مرفوع اور موقوف تک ہی مخصوص رکھا ہے (مقطوع کو حدیث میں شمار نہیں کیا اس لئے کہ مقطوع کو (حدیث نہیں) اثر کہا جاتا ہے اور بعض دفعہ مرفوع حدیث پر بھی اثر کا اطلاق ہوتا ہے جس طرح نبی کریم ﷺ سے منقول دعاؤں کو ادعیۂ ماثورہ کہا جاتا ہے اور جیسا کہ امام طحاوی نے اپنی کتاب کا نام شرح معانی الآثار رکھا جو نبی ﷺ کی احادیث اور آثار صحابہ پر مشتمل ہے اور بقول امام سخاوی امام طبرانی کی ایک کتاب کا نام تہذیب الآثار ہے حالانکہ وہ مرفوع حدیثوں کے لئے خاص ہے اور اس میں جو موقوف روایات ہیں وہ محض ضمنی طور پر ہی ذکر کی گئی ہیں، خبر اور حدیث ایک ہی معنی میں مشہور ہیں، بعض حضرات حدیث صرف اس کو کہتے ہیں جو نبی ﷺ صحابہ اور تابعین سے منقول ہو اور خبر اس کو کہتے ہیں جو ملوک وسلاطین اور گزشتہ زمانوں کے حالات وواقعات پر مشتمل ہو اسی وجہ سے ان لوگوں کو جو سنت میں مشغول ہوئے ''محدث'' اور ان کو جو خبر میں مشغول ہوئے ''اخباری'' کہا جاتا ہے۔

حدیث کا مرفوع ہونا کبھی تو صراحتاً ہوتا ہے اور کبھی حکماً ہوتا ہے۔

حدیث مرفوع صریحی کی تین قسمیں ہیں: ① قولی ② فعلی ③ تقریری

صریح قولی کی مثال:

جیسے صحابی کہے: ''سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول'' کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ کہتے

ہوئے سنا، یا صحابی یا غیر صحابی کا یہ کہنا کہ آنحضرت ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا (اس میں صحابی کے سماع کی تصریح نہیں ہے) یا عن کے صیغے کے ساتھ آنحضرت ﷺ سے منقول ہو کہ آپ نے یوں ارشاد فرمایا...... الخ

صریح فعلی کی مثال:

جیسے صحابی کہے کہ "رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم فعل کذا" میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح کرتے ہوئے دیکھا یا عن کے صیغے کے ساتھ منقول ہو کہ آپ نے یوں کہا یا صحابی یا غیر صحابی آنحضرت ﷺ کے کسی فعل کو نقل کرلے اور "رفعه" یا "مرفوعا" کے الفاظ استعمال کرلے۔

صریح تقریری کی مثال:

جیسے صحابی یا غیر صحابی یہ کہے کہ فلاں نے یا یوں کہے کہ کسی شخص نے آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں یوں کیا اور آپ نے اس پر انکار نہیں فرمایا۔

حدیث مرفوع حکمی کی بھی تین ہی قسمیں ہیں: ① قولی ② فعلی ③ تقریری۔

حکمی قولی کی مثال:

جیسا کہ کوئی ایسا صحابی جس کو کتب سابقہ کا علم نہ ہو ماضی یا مستقبل کے امور میں سے کسی ایسے امر کی خبر دے جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو، ماضی کے امور جیسے انبیاء علیہم السلام کے حالات، مستقبل کے امور جیسے کہ آئندہ آنے والی جنگوں اور آنے والے فتنوں کا بیان، قیامت کے دن کی ہولناکیوں کا بیان یا کسی مخصوص فعل پر کسی مخصوص جزا یا سزا ملنے کا بیان کہ ان چیزوں کا علم بجز آنحضرت ﷺ کے کسی سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

حکمی فعلی کی مثال:

جیسے کہ صحابی کا کوئی ایسا فعل جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو (کیونکہ ایسا فعل بجز آنحضرت ﷺ سے صادر ہوئے کوئی نہیں کرسکتا)۔

حکمی تقریری کی مثال:

جیسے صحابی کا ارشاد فرمانا کہ ہم رسول اللہ کی زندگی میں یوں کیا کرتے تھے، یہ بھی مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ یہ بدیہی بات ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ضرور اس بات کا علم ہوگا یا (اگر علم نہ ہو اور یہ کام درست نہ ہوتا) تو اس بارے میں وحی اتر جاتی یا صحابہ کا یوں کہنا "ومن السنة کذا" کہ سنت میں سے ایک عمل یہ بھی ہے اس لئے کہ ظاہر ہے کہ سنت سے مراد سنت نبوی ہی ہوتی ہے اگرچہ بعضوں نے فرمایا کہ سنت کا لفظ چونکہ سنت صحابہ اور سنت تابعین پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ یہ بھی مراد ہوسکتا ہے۔

فصل اول سند کے بیان میں

سند طریق حدیث کا نام ہے یعنی وہ لوگ جنہوں نے اسے روایت کیا، اسناد بھی اسی معنی میں ہے اور کبھی یہ سند کے ذکر اور طریقِ متن کے ذکر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور متن وہ ہے جس پر سند کا سلسلہ منتہی ہو۔

اگر درمیان سے کوئی راوی ساقط نہ ہو تو وہ حدیث متصل ہے، عدم سقوط کو ہی اتصال کہا جاتا ہے اور اگر ایک یا ایک سے زیادہ راوی ساقط ہوں وہ حدیث منقطع ہے، اس سقوط کا نام ہی انقطاع ہے، اگر یہ سقوط سند کی ابتداء ہی میں ہو تو اسے معلق کہتے ہیں اور اس اسقاط کا نام تعلیق ہے اور ساقط ہونے والا کبھی ایک ہوتا ہے اور کبھی ایک سے زیادہ، کبھی پوری سند حذف کر دی جاتی ہے، جیسا کہ عام مصنفین کی عادت ہے، وہ اس طرح روایت کرتے ہیں: "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

تراجم صحیح بخاری میں بکثرت تعلیقات ہیں لیکن یہ سب تعلیقات اتصال کے حکم میں ہیں اس لئے کہ امام بخاری نے اپنی اس کتاب میں صحیح احادیث ہی لانے کا التزام کیا ہے لیکن ان تعلیقات کے سوا جن کی سند اپنی کتاب میں دوسری جگہ بیان کر دی ہے اور تعلیقات ان کے مسانید کے درجہ کی نہیں ہیں اور بعض لوگوں نے اس میں یہ فرق کیا ہے کہ جس کو امام بخاری نے جزم اور یقین کے صیغے کے ساتھ بیان کیا ہے اور وہ دلالت کرتا ہو اس بات پر کہ اس کی سند امام بخاری کے نزدیک ثابت ہے تو وہ قطعاً صحیح ہے جیسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا "قال فلان او ذکر فلان" فلاں نے کہا فلاں نے ذکر کیا اور اگر صیغہ تمریض و مجہول کے ساتھ بیان کیا ہو جیسے "قیل یا یقال یا ذکر" یعنی کہا گیا یا کہا جاتا ہے یا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کی صحت میں ان کے نزدیک کلام ہے لیکن جب وہ اپنی کتاب میں لائے ہیں تو اس کی اصل ان کے نزدیک ثابت ہے، اس لئے محدثین کا قول ہے کہ بخاری کی تعلیقات متصل اور صحیح ہیں۔

اگر سقوط سند کے آخر میں اور تابعی کے بعد ہو تو وہ حدیث مرسل ہے اور اس فعل کا نام ارسال ہے جس طرح کوئی تابعی کہے: "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کبھی محدثین کے نزدیک مرسل اور منقطع کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے لیکن پہلی اصطلاح زیادہ مشہور ہے۔

جمہور علماء کے نزدیک مرسل روایت کا حکم توقف ہے اس لئے کہ یہ غیر معلوم ہے کہ ساقط ہونے والا ثقہ ہے یا غیر ثقہ، علاوہ ازیں تابعی دوسرے تابعی سے روایت کرتا ہے اور تابعی ثقات و غیر ثقات دونوں ہی ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مرسل مطلقاً مقبول ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ ارسال کرنے والے نے کمال وثوق اور اعتماد کی بناء پر ہی ارسال کیا ہوگا کیونکہ گفتگو ثقہ راوی سے متعلق ہے اگر وہ تابعی ارسال کرنے والے کے نزدیک صحیح نہ ہوتا تو وہ ارسال ہی نہ کرتا اور نہ یہ کہتا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مرسل اور مسند اگرچہ ضعیف ہو، تاہم اس کی تائید کسی چیز سے حاصل ہو جائے تو وہ مقبول ہو جاتی ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں، یہ اختلاف صرف اس صورت میں ہے جب یہ معلوم ہو کہ تابعی کی

عادت صرف ثقات ہی سے ارسال کرنے کی ہے اور اگر اس کی عادت بغیر کسی امتیاز کے ثقات وغیر ثقات دونوں سے ارسال کرنے کی ہو تو پھر بالاتفاق اس کا حکم توقف کا ہے، اس میں اور بہت سی تفصیلات ہیں جن کو سخاوی نے شرح الفیہ میں ذکر کیا ہے۔

اگر سقوط سند کے درمیان سے ہو اور پے در پے دو راوی درمیان سے ساقط ہوں تو ایسی حدیث کو "**معضل**" (بفتح الضاد) کہتے ہیں، اگر ایک راوی ساقط ہو یا ایک سے زیادہ ہوں لیکن پے در پے نہیں بلکہ مختلف جگہوں سے ساقط ہوں تو اسے "منقطع" کہتے ہیں اس معنی میں منقطع غیر متصل حدیث کی ایک قسم بن جاتی ہے اور کبھی منقطع مطلقاً غیر متصل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو تمام اقسام کو شامل ہے، اس صورت میں یہ ایک مقسم قرار پائے گا۔

انقطاع اور سقوط راوی کا حکم راوی اور مروی عنہ کے درمیان عدم ملاقات سے ہوتا ہے اور عدم ملاقات ہم عصر نہ ہونے یا اجتماع نہ ہونے کے سبب ہوگا یا اس وجہ سے کہ روایت حدیث کی اجازت نہ ملی ہو اور ان سب چیزوں کا علم راویوں کی تاریخ ولادت، ان کی تاریخ وفات، ان کے طلب علم اور سفر کے اوقات کی تعیین ہی سے ہو سکتا ہے اسی لئے محدثین کے نزدیک علم تاریخ بھی ایک بنیادی اور ضروری علم ہے۔

منقطع حدیث کی ایک قسم "**مدلس**" (بضم میم وفتح لام مشددہ) ہے اس فعل کا نام تدلیس اور اس کا مرتکب مدلس (بکسر لام) ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک راوی اپنے اس شیخ (استاد) کا نام تو نہ لے جس سے اس نے حدیث سنی ہے البتہ اس کے اوپر کے راوی سے ایسے الفاظ میں روایت کرے جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ اس نے (اسی) اوپر والے راوی سے سنا ہے جیسے عن فلان یا قال فلان کہے۔ تدلیس کے لغوی معنی فروختنی سامان کے عیب کو بیع کے وقت چھپانے کے ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ دلس سے مشتق ہے جس کے معنی گھمبیر تاریکی کا چھا جانا ہیں۔ حدیث کو مدلس اس لئے کہا گیا کہ اس میں بھی اسی طرح خفاء (تاریکی) ہے۔ شیخ (حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ) کہتے ہیں کہ جس سے تدلیس ثابت ہو اس کا حکم یہ ہے کہ اس سے حدیث قبول نہ کی جائے گی، یہاں تک کہ وہ تحدیث کی صراحت کر دے۔ امام شمنی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ائمہ فن کے نزدیک تدلیس حرام ہے۔ امام وکیع رحمہ اللہ کے نزدیک جب تدلیس کپڑوں میں جائز نہیں تو حدیث میں کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے تو اس کی بہت زیادہ مذمت کی ہے۔

مدلس کی روایت قبول کرنے میں علماء کا اختلاف ہے، اہل حدیث وفقہ کے ایک گروہ کے نزدیک یہ تدلیس جرح (عیب) ہے اور جس شخص کے متعلق معلوم ہو جائے کہ وہ تدلیس کرتا ہے اس کی حدیث مطلقاً غیر مقبول ہے اور بعض کے خیال میں مقبول ہے۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ اس شخص کی تدلیس قابل قبول ہے جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ ثقہ ہی سے تدلیس کرتا ہے جیسے امام ابن عیینہ رحمہ اللہ ہیں اور اس کی تدلیس مردود ہے جو ضعیف وغیر ضعیف سب سے تدلیس کرتا ہے یہاں تک کہ وہ الفاظ سماع سمعت یا حدثنا واخبرنا کے ذریعے سے سماعت کی صراحت نہ کر دے۔

تدلیس کے مختلف اسباب ہیں:

بعض دفعہ اس کے پس پردہ کوئی غرض فاسد ہوتی ہے جیسے کوئی راوی اپنے شیخ (استاد) کی نوعمری کے باعث اس سے اپنے

سماع کو چھپانے کی کوشش کرے یا اس وجہ سے کہ وہ (شیخ) لوگوں میں کوئی خاص شہرت یا مقام و مرتبہ نہیں رکھتا اور بعض اکابر سے جو تدلیس واقع ہوئی ہے تو اس کی حیثیت یہ نہیں ہے، اس کی وجہ تو صرف یہ ہے کہ انہیں حدیث کی صحت پر کامل اعتماد تھا اور شہرت وغیرہ سے وہ بے نیاز تھے۔ شمنی رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ بھی احتمال ہے کہ ثقات کی ایک جماعت سے حدیث سنی ہو اور اس شخص سے بھی، اس لئے اس کے ذکر نے دیگر لوگوں کے ذکر سے مستغنی کر دیا جیسا کہ مرسل میں ہوتا ہے۔

اگر اسناد یا متن میں راویوں کا اختلاف تقدیم و تاخیر یا کمی بیشی کے ذریعے ہو، ایک راوی کی جگہ دوسرا راوی یا ایک متن کی جگہ دوسرا متن ہو یا اسمائے سند یا اجزائے متن میں تصحیف ہو یا اختصار ہو یا حذف ہو یا اسی طرح کی دیگر چیزیں ہوں تو حدیث ''مضطرب'' ہے، اگر ان کے درمیان جمع و توفیق ممکن ہو تو وہ مقبول ہے ورنہ اس کا حکم توقف ہے۔

اگر راوی نے کسی حدیث میں اپنا یا کسی صحابی و تابعی کا کلام اس غرض سے درج کر دیا کہ اس طرح لغت کے مفہوم یا معنی کی وضاحت یا مطلق کی تقیید ہو جائے گی تو وہ حدیث ''مدرج'' کہلائے گی۔

فصل دوم: روایت بالمعنی کے بیان میں:

تنبیہ: اس بحث سے ایک اور بحث احادیث میں روایت بالمعنی پیدا ہو جاتی ہے اس میں کافی اختلاف ہے۔ اکثر اس بات کے قائل ہیں کہ ایسا اس شخص کے لئے جائز ہے جو عربی زبان کا عالم ہو، اسلوب کلام کا ماہر، ترکیبوں کے خواص اور خطاب کے مفاہیم سے واقف ہو، تاکہ زیادتی اور کمی کے ذریعے غلطی نہ کر سکے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مفرد الفاظ میں جائز ہے، مرکبات میں نہیں۔ بعض کے نزدیک اس شخص کے لئے جائز ہے جس کو حدیث کے الفاظ زبانی یاد ہوں اور اس میں تصرف پر وہ پوری طرح قادر ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے لئے جائز ہے جسے حدیث کے معانی تو یاد ہوں لیکن الفاظ بھول گیا ہو حالانکہ ایسا کرنا تحصیل احکام کی بناء پر ضروری ہے اور جسے الفاظ حدیث یاد ہوں اس کے لئے روایت بالمعنی جائز نہیں، اس لئے کہ اس کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ اختلاف جواز اور عدم جواز میں ہے، جہاں تک بغیر کسی تصرف کے الفاظ حدیث روایت کرنے کا تعلق ہے تو اس کی افضلیت میں سب کا اتفاق ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے میری باتیں سنیں، انہیں یاد رکھا اور اس کو دوسروں تک پہنچایا جس طرح مجھ سے سنا''۔ روایت بالمعنی صحاح ستہ اور دیگر کتب میں بکثرت موجود ہیں۔

عنعنة: عن فلان عن فلان کے الفاظ کے ساتھ حدیث بیان کرنے کو کہتے ہیں اور معنعن وہ حدیث ہے جو عنعنہ کے طور پر بیان کی جائے۔ عنعنہ میں امام مسلم رحمہ اللہ کے نزدیک معاصرت (ہم زمانہ ہونا) امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک ملاقات شرط ہے اور دوسرے محدثین کے نزدیک حدیث لینا شرط ہے۔ امام مسلم نے دونوں فریقوں کا بڑی شد و مد سے رد کیا ہے، مدلس کا عنعنہ غیر مقبول ہے۔

ہر وہ مرفوع حدیث جس کی سند متصل ہو ''مسند'' ہے۔ مسند کی یہی مشہور اور معتمد علیہ تعریف ہے، بعض کے نزدیک ہر متصل السند مسند ہے، چاہے موقوف ہو یا مقطوع اور بعض کے خیال میں ہر مرفوع مسند ہے، چاہے مرسل ہو، معضل ہو یا منقطع۔

فصل سوم:

شاذ، منکر اور معلل بھی حدیث کی قسمیں ہیں، شاذ لغت میں اس شخص کو کہتے ہیں جو جماعت سے الگ ہو گیا اور اس سے نکل گیا ہو اور اصطلاح محدثین میں اس حدیث کو کہتے ہیں جو ثقہ راویوں کی روایت کے خلاف ہو۔ اگر اس کے راوی ثقہ نہیں تو وہ "مردود" ہے اور دیگر وجوہ ترجیحات کے مطابق ترجیح دی جائے گی۔ راجح کا نام "محفوظ" اور مرجوع کا نام "شاذ" ہے۔

"منکر" وہ حدیث ہے جسے کوئی ضعیف راوی روایت کرے اور وہ اپنے سے بھی ضعیف تر راوی کی روایت کے خلاف ہو، منکر کا مقابل "معروف" ہے منکر اور معروف دونوں روایتوں کے راوی ضعیف ہوتے ہیں لیکن ایک راوی دوسرے سے زیادہ ضعیف ہوتا ہے اور شاذ اور محفوظ میں راوی قوی ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے زیادہ قوی ہوتا ہے، شاذ اور منکر مرجوح اور محفوظ اور معروف راجح ہوتے ہیں۔

اور بعض نے شاذ اور منکر میں کسی دوسرے کی مخالفت کی قید نہیں لگائی، چاہے وہ ضعیف ہو یا قوی، اور انہوں نے کہا کہ شاذ وہ حدیث ہے جسے ثقہ روایت کرنے میں متفرد ہوں اور اس کی موافقت اور حمایت میں کوئی اصل بھی نہ ہو اور یہ صحیح وثقہ پر بھی صادق آتا ہے اور بعض نے ثقہ اور مخالفت کا اعتبار نہیں کیا۔ اسی طرح منکر ہے کہ وہ اسے صورت مذکورہ کے ساتھ خاص نہیں کرتے اور اس شخص کی حدیث کو بھی منکر کہتے ہیں جو فسق، فرط غفلت اور کثرت اغلاط کے ساتھ مطعون ہو، یہ الگ الگ اصطلاحات ہیں جن میں کوئی مضائقہ نہیں۔

"معلَل" (بفتح لام) وہ سند ہے جس میں صحت حدیث کو مجروح کرنے والی علل اور خفی اسباب پائے جاتے ہوں۔

کبھی معلِل (بکسر لام) کی عبارت اپنے دعویٰ پر دلیل قائم کرنے میں قاصر رہتی ہے جس طرح دینار و درہم کے پرکھنے میں صرّاف اپنے دعویٰ پر دلیل نہیں پیش کرسکتا۔

ایک راوی اگر کوئی حدیث بیان کرے اور دوسرا راوی دوسری حدیث بیان کرے جو اس کے موافق ہو تو اس حدیث کو متابِع (بصیغہ اسم فاعل) کہتے ہیں اور محدثین جو کہتے ہیں "**تابعه فلان**" اور امام بخاری عشاللہ جو اپنی صحیح میں اکثر فرماتے ہیں اور اکثر محدثین بھی کہتے ہیں کہ "**وله متابعات**" تو اس کے معنی یہی ہیں، متابعت تقویت اور تائید کو واجب کرتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ متابع مرتبہ میں اصل کے برابر ہو، متابع کم مرتبہ رکھنے کے باوجود متابعت کی صلاحیت رکھتا ہے، متابعت کبھی نفس راوی میں ہوتی ہے، اور کبھی اس شیخ میں جو اس سے اوپر ہوتا ہے، پہلا دوسرے سے اکمل اور اتم ہے اس لئے کہ کمزوری اکثر اول اسناد میں ہوتی ہے۔

متابع اگر لفظوں میں اصل کے موافق ہو تو "**مثله**" اور اگر لفظوں میں نہیں صرف معنی میں موافقت ہو تو "**نحوه**" کہا جاتا ہے، متابعت میں یہ شرط ہے کہ دونوں روایتیں ایک ہی صحابی سے ہوں، اگر دو الگ صحابیوں سے ہوں تو اسے "شاہد" کہتے ہیں

جیسے کہا جائے "**له شاهد من حديث ابی هريرة**" یا کہا جائے "**له شواهد**" یا "**شهد به حديث فلان**" اور بعض لوگ متابعت کو صرف لفظوں میں موافقت اور شاہد کو معنوی موافقت کے ساتھ خاص کرتے ہیں خواہ وہ ایک صحابی سے منقول ہو یا دو صحابیوں سے اور کبھی شاہد اور متابع ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، وجہ اس کی ظاہر ہے متابع اور شاہد کے جاننے کی غرض سے طریق حدیث اور اس کے اسناد کے تتبع اور تلاش کو اعتبار کہا جاتا ہے۔

فصل چہارم: اقسام حدیث کے بیان میں:

حدیث کی اصل قسمیں تین ہیں: ① صحیح ② حسن ③ ضعیف

صحیح سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے، ضعیف ادنیٰ اور حسن متوسط درجہ ہے۔ تمام وہ قسمیں جو پہلے گزر چکی ہیں وہ انہی تین قسموں میں داخل ہیں۔

''صحیح'' حدیث وہ ہے جس کا نقل کرنے والا عادل، تام الضبط ہو جو نہ معلل ہو نہ شاذ ہو، اگر یہ صفات علی وجہ الکمال پائی جائیں تو وہ ''صحیح لذاتہ'' ہے اور اگر اس میں کسی قسم کا نقص ہو لیکن کثرت طرق سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے تو وہ ''صحیح لغیرہ'' ہے اور اگر اس نقص کی تلافی کرنے والی کوئی چیز نہ ہو تو وہ ''حسن لذاتہ'' ہے۔

''ضعیف'' وہ حدیث ہے کہ جس میں وہ شرائط کلی طور پر یا جزوی طور پر مفقود ہوں جو صحیح کے لئے معتبر ہیں، اگر ضعیف حدیث متعدد طرق سے مروی ہو اور اس کے ضعف کی تلافی ہو جاتی ہو تو وہ ''حسن لغیرہ'' ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صفات جو صحیح کے لئے ضروری ہیں وہ حسن میں ناقص ہوتی ہیں لیکن تحقیق یہ ہے کہ حسن میں جس نقصان کا اعتبار کیا گیا ہے وہ صرف خفت ضبط ہے ورنہ باقی صفات اپنی جگہ بحال رہتی ہیں۔

''عدالت'' اس ملکہ کا نام ہے جو انسان کو تقوی اور مروت کے التزام پر آمادہ کرتا ہے اور تقویٰ سے مراد شرک، فسق اور بدعات جیسے برے اعمال سے بچنا ہے، گناہ صغیرہ سے اجتناب کے بارے میں اختلاف ہے: مختار مذہب یہ ہے کہ یہ شرط نہیں اس لئے کہ اس سے بچنا انسانی طاقت سے باہر ہے بجز اس صورت کے کہ صغیرہ گناہ پر اصرار کیا جائے کہ اس طرح وہ بھی کبیرہ گناہ بن جاتا ہے، اور مروت سے مراد ان بعض خسیس اور چھوٹی باتوں سے بچنا ہے جو گو مباح ہیں مگر ہمت اور مروت (مردانگی) کے خلاف ہیں جیسے بازار میں اکل وشرب اور راستے میں پیشاب کرنا وغیرہ۔

ملحوظ رہنا چاہئے کہ روایت کی عدالت، شہادت کی عدالت سے عام ہے، اس لئے کہ عدلِ شہادت آزاد کے لئے مخصوص ہے اور عدلِ روایت آزاد اور غلام دونوں کو شامل ہے۔

اور ضبط سے مراد ہے سنی ہوئی چیز کو خلل اور ضیاع سے بایں طور محفوظ رکھنا کہ اس کو حاضر کرنا ممکن ہو اس ضبط کی دو قسمیں ہیں: ضبط صدر اور ضبط کتاب۔ پس ضبط صدر دل میں محفوظ رکھنے کا نام ہے اور دوسروں تک پہنچانے کے وقت تک اس کو محفوظ رکھنے کا نام ضبط کتاب ہے۔

فصل پنجم: وجوہ طعن کے بیان میں:

عدالت سے متعلق طعن کے وجوہ پانچ ہیں: ① کذب ② اتہام کذب ③ فسق ④ جہالت ⑤ بدعت

کذب راوی سے مراد یہ ہے کہ حدیث نبوی ﷺ میں اس کا جھوٹ بولنا ثابت ہو گیا ہو، یہ ثبوتِ کذب یا تو خود حدیث گھڑنے والے کے اقرار سے ہو یا دیگر قرائن سے ہو، ایسے مطعون بالکذب راوی کی حدیث موضوع کہلاتی ہے، جس شیخ کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے حدیث میں عمداً جھوٹ سے کام لیا ہے گو کہ اس نے پوری عمر میں ایک مرتبہ ہی ایسا کیا ہو اور پھر اس سے تائب بھی ہو گیا ہو، تاہم اس کی حدیث کبھی قابل قبول نہ ہوگی۔ بخلاف جھوٹے گواہ کے جب وہ توبہ کر لے تو اس کے بعد اس کا قول مقبول ہو جاتا ہے۔ پس محدثین کی اصطلاح میں موضوع حدیث سے مراد یہی ہے (جس کا ذکر کیا گیا ہے) نہ کہ اس راوی کی حدیث جس کا کذب ثابت ہو گیا اور اس کا بطور خاص اس حدیث کا گھڑنا معلوم ہو اور یہ مسئلہ ظنی ہے۔

وضع اور افتراء کا حکم ظن غالب پر ہوتا ہے اس میں قطعیت اور یقین ممکن نہیں، اس لئے کہ جھوٹے سے بھی کبھی سچ کا صدور ہو جاتا ہے اس سے اس قول کا بھی رد ہو جاتا ہے کہ وضع حدیث کا علم واضع کے اقرار کی بناء پر ہو اس لئے کہ ممکن ہے کہ وہ اس قرار میں بھی کاذب ہو اس کا اچھا ہونا ظن غالب کی بناء پر سمجھا جائے گا، اگر ایسا نہ ہوتا تو قتل کا اقرار کرنے والے کا قتل اور زنا کا اعتراف کرنے والے کا رجم جائز نہ ہوتا۔

راوی کے کذب کے ساتھ **مُتَّهَمْ** ہونے کی صورت یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ عام گفتگو میں اس کا جھوٹا ہونا مشہور و معروف ہو۔ تاہم حدیث نبوی میں اس کا کذب ثابت نہ ہو، اسی حکم میں اس شخص کی روایت بھی داخل ہے جو شریعت کے قواعد ضروریہ معلومہ کے خلاف ہو، اسی قسم کے راوی کا نام متروک ہے جیسے کہا جائے کہ اس کی حدیث متروک ہے اور فلاں متروک الحدیث ہے۔ اگر اس شخص نے صدق دل سے توبہ کر لی ہو اور صدق کی علامات اس کے طرز عمل سے ظاہر ہوں تو اس کی حدیث کا سماع جائز ہے اور وہ شخص جس سے حدیث نبوی ﷺ کے علاوہ گفتگو میں کبھی کبھی کذب واقع ہو تو یہ اس کی حدیث کو موضوع یا متروک کہنے کے لئے کافی نہ ہوگا اگر چہ (عام گفتگو میں کسی وقت بھی کذب بیانی) معصیت ہے۔

فسق سے مراد عملی فسق ہے اعتقادی فسق نہیں، اعتقادی فسق تو بدعت میں داخل ہے، اکثر بدعت کا استعمال اعتقاد ہی میں ہوتا ہے اور کذب اگر چہ فسق میں داخل ہے لیکن اس کو علیحدہ اور مستقل اصل شمار کیا گیا ہے اس لئے کہ کذب انتہائی شدید طعن ہے۔

راوی کی جہالت بھی حدیث میں طعن کا سبب ہے اس لئے کہ جب راوی کا نام اور اس کی ذات معلوم نہ ہو تو اس کے حالات بھی معلوم نہ ہوں گے اور نہ اس کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کا پتہ چلے گا۔ جیسے کوئی شخص کہے "**حدثنی رجل یا اخبرنی شیخ**" (مجھ سے کسی آدمی نے حدیث بیان کی یا مجھے شیخ نے خبر دی) تو اس کا نام مبہم ہے اور حدیث مبہم غیر مقبول ہے الا یہ کہ راوی صحابی ہو، اس لئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عدول ہیں۔ اگر تعدیل کے الفاظ کے ساتھ بیان کیا جائے جس

طرح کوئی کہے "اخبرنی عدل یا حدثنی ثقة" تو اس میں اختلاف ہے لیکن صحیح تر بات یہی ہے کہ نامقبول ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ راوی کے خیال میں تو عادل ہو لیکن نفس الامر میں عادل نہ ہو البتہ کوئی امام حاذق بیان کرے تو مقبول ہے۔

بدعت سے مراد یہ ہے کہ دین کی معروف باتوں کے خلاف اور اس کے خلاف جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ سے منقول ہیں کسی امر محدث (نو ایجاد کام) کا اعتقاد شبہ اور تاویل کی بناء پر کرنا، بطریق جحود وانکار نہیں، اس لئے کہ ایسا انکار تو کفر ہے۔ اور بدعتی کی حدیث جمہور کے نزدیک مردود ہے اور بعض کے نزدیک مقبول ہے بشرطیکہ صدق لہجہ اور زبان کی حفاظت کے ساتھ متصف ہو، اور بعض کہتے ہیں اگر وہ کسی ایسے تواتر شرعی کا انکار کرے جس کے متعلق یقینی علم ہو کہ وہ امر دین میں سے ہے تو وہ مردود ہے، اور اگر اس طرح پر نہ ہو تو وہ مقبول ہے، گو مخالفین اس کی تکفیر کریں بشرطیکہ اس میں ضبط وورع، تقویٰ واحتیاط اور صیانت کی صفات پائی جائیں۔ بدعتی کے بارے میں مذہب مختار یہ ہے کہ اگر وہ بدعت کا داعی اور اس کا رائج کرنے والا ہو تو وہ مردود ہے، ورنہ مقبول، بشرطیکہ وہ ایسی چیز روایت نہ کرتا ہو جس سے اس کی بدعت کو تقویت پہنچتی ہو، کیونکہ اس صورت میں وہ قطعاً مردود ہے۔ مختصر یہ کہ اہل بدعت وہوی اور باطل مذاہب والوں سے حدیث اخذ کرنے میں اختلاف ہے، صاحب جامع الاصول نے کہا کہ محدثین کی ایک جماعت نے خوارج، قدریہ، رافضی وشیعہ اور دیگر اصحاب بدعت سے حدیثیں اخذ کی ہیں، اور ایک دوسری جماعت نے احتیاط سے کام لیا ہے اور ان تمام بدعتی فرقوں سے اخذ حدیث میں اجتناب کیا، ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی نیت ہے۔ بلاشبہ ان فرقوں سے حدیث اخذ کرنا بہت زیادہ تلاش وجستجو کے بعد ہوتا ہے، تاہم پھر بھی احتیاط اسی میں ہے کہ ان سے حدیث اخذ نہ کی جائے اس لئے کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ یہ فرق مبتدعہ اپنے مذاہب کی ترویج کے لئے حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور توبہ ورجوع کے بعد اس کا اقرار کر لیتے تھے۔ (واللہ اعلم)

فصل ششم:

ضبط سے متعلق بھی وجوہِ طعن پانچ ہیں: ① فرط غفلت ② کثرت غلط ③ مخالفت ثقات ④ وہم ⑤ سوء حافظہ فرطِ غفلت اور کثرت غلط دونوں قریب المعنی ہیں، غفلت کا تعلق سماع اور تحصیل حدیث اور غلط کا تعلق بیان کرنے اور پہنچانے سے ہے۔ اسناد یا متن میں ثقات کی مخالفت چند طریقوں پر ہوتی ہے جو شذوذ کا باعث ہوتی ہے اور اسے ضبط سے متعلق وجوہِ طعن میں اس لئے شمار کیا گیا ہے کہ ثقات کی مخالفت کا سبب عدم ضبط وحفظ اور تغیر وتبدل سے محفوظ نہ ہونا ہے اور طعن، وہم اور نسیان کے سبب ہوتا ہے کہ راوی ان دونوں کی وجہ سے غلطی کرکے وہم کے طور پر روایت کرتا ہے۔ اس وہم کی اطلاع اگر ایسے قرائن سے ہو جائے جو اس کی غفلت اور قدح کے اسباب وعلل پر دلالت کرنے ہوں تو وہ حدیث معلل ہوگی، اور علم حدیث میں یہ سب سے زیادہ دقیق اور غامض مسئلہ ہے، اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں اللہ نے فہم ثاقب اور وسیع حافظہ عطا کیا ہو اور وہ اسانید ومتون کے احوال اور رواۃ کے مراتب کی معرفت تامہ رکھتے ہوں، جیسے متقدمین اس فن کے ارباب کمال ہیں جن کا سلسلہ امام دارقطنی تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے کہ ان کے بعد اس فن میں ایسا صاحب کمال کوئی

پیدا نہیں ہوا۔ (واللہ اعلم)

سوءِ حفظ سے مراد محدثین کے نزدیک یہ ہے کہ راوی کی اصابت اس کی خطا پر غالب نہ ہو اور اس کا حفظ و اتقان سہو و نسیان سے زیادہ نہ ہو یعنی اگر خطا و نسیان اس کے صواب و اتقان کے مساوی ہو یا غالب ہو تو یہ سوءِ حفظ میں داخل ہوگا۔ پس معتمد علیہ صواب و اتقان اور ان کی کثرت ہے، حافظہ کی خرابی (سوءِ حفظ) اگر ہر وقت اور تمام عمر راوی کے شامل حال رہی ہو تو اس کی حدیث غیر معتبر ہوگی، بعض محدثین کے نزدیک یہ بھی شاذ میں داخل ہے۔

اگر سوءِ حفظ کسی عارض کے سبب طاری ہو جیسے کبر سنی، بینائی کے جاتے رہنے یا کتابوں کے ضائع ہو جانے کے سبب حافظہ میں خلل پیدا ہو جائے تو اسے "مختلط" کہا جائے گا۔ پس ایسے راوی کی اختلاط سے قبل روایت کردہ حدیثیں مقبول ہوں گی بشرطیکہ وہ روایات اس حالت کے طاری ہونے کے بعد کی روایتوں سے ممتاز ہوں، اگر ممتاز نہ ہوں تو توقف کیا جائے گا، اگر مشتبہ ہوں تب بھی یہی حکم ہے اور اگر ایسے مختلط راوی کی بیان کردہ حدیثوں کے متابعات اور شواہد ہوں تو پھر وہ بجائے مردود ہونے کے قبولیت و رجحان کا درجہ پائیں گی، اور یہی حکم مستور، مدلس اور مرسل حدیثوں کا ہے۔

فصل ہفتم: تعدادِ رُواۃ کے بیان میں:

صحیح حدیث کے مختلف مراتب و درجات ہیں۔ اگر اس کا راوی ایک ہے تو وہ غریب ہے، دو راوی ہیں تو وہ حدیث عزیز ہے، اور اگر دو سے زیادہ ہوں تو وہ مشہور یا مستفیض ہے، اور کسی حدیث کے رواۃ کی کثرت اگر اس حد کو پہنچ جائے کہ ان کا کذب پر متفق ہونا محال ہو تو اس حدیث کو متواتر کہیں گے۔ اور غریب کا ایک نام فرد بھی ہے اور مراد اس سے راوی کا کسی جگہ ایک ہونا ہے۔ اگر اسناد میں کسی ایک جگہ ہو تو اسے فرد نسبی کہتے ہیں اور ہر جگہ میں ہو تو فرد مطلق، اور دو ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ ایسا ہی ہو اگر صرف ایک جگہ میں ہو تو وہ حدیث عزیز نہیں غریب ہوگی۔ اسی طرح حدیث مشہور میں کثرت کے معنی یہ ہیں کہ ہر جگہ دو سے زیادہ راوی ہوں اور یہی مطلب ہے محدثین کے اس قول کا کہ اس فن میں اقل اکثر پر حاکم ہے۔

اس بحث سے یہ معلوم ہوا کہ غرابت صحت کے منافی نہیں اور یہ ممکن ہے کہ حدیث صحیح غریب ہو بایں طور پر کہ اس کے سب راوی ثقہ ہوں اور غریب کبھی شاذ کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے یعنی وہ شذوذ جو حدیث میں طعن کے اقسام میں سے ہیں، یہی شذوذ مراد ہیں۔ صاحب المصابیح کے اس قول سے "ھذا حدیث غریب" جبکہ وہ بطریق طعن بیان کریں اور بعض نے ثقات کی مخالفت کا لحاظ کئے بغیر جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے شاذ کی تفسیر مفرد راوی کے ساتھ کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ (یہ حدیث) صحیح شاذ اور صحیح غیر شاذ ہے پس شذوذ اس معنی کے لحاظ سے بھی غرابت کی طرح صحت کے منافی نہیں البتہ جب مقام طعن میں ذکر کیا جائے تو وہاں ثقات کی مخالفت معتبر ہوگی اس لئے وہ صحت کے منافی ہے۔

فصل ہشتم:

ضعیف حدیث وہ ہے جس میں وہ شرائط جن کا اعتبار صحیح اور حسن حدیثوں میں کیا جاتا ہے، تمام کی تمام یا ان میں سے بعض

مفقود ہوں اور اس کے راوی کی شذوذ و نکارت یا کسی علت کی وجہ سے مذمت کی گئی ہو۔ اس اعتبار سے ضعیف حدیث کی متعدد قسمیں ہو جاتی ہیں، اسی طرح صحیح لذاتہ اور صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ ان کمال صفات میں مختلف مراتب و درجات کی حامل ہوں گی، جن کا ان دونوں کے مفہوم میں اعتبار کیا جاتا ہے، درآں حالیکہ اصل صحت اور حسن میں ان کے مابین اشتراک ہے۔

محدثین نے مراتب صحت کا انضباط اور اس کی تعیین کردی ہے اور اسناد میں اس کی مثالیں دی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ عدالت اور ضبط تمام رجال حدیث کو شامل ہے تاہم بعض پر فوقیت رکھتے ہیں۔

مطلقاً کسی خاص سند کو **اصح الاسانید** (سب سے زیادہ صحیح سند) کہنے میں اختلاف ہے! بعض نے "**زین العابدین عن أبیه عن جده**" کو **اصح الاسانید** کہا ہے، بعض نے "**مالك عن نافع عن ابن عمر**" کو اور بعض نے "**سالم عن ابن عمر**" کو لیکن صحیح بات یہ ہے کہ کسی ایک مخصوص سند پر اصح ہونے کا مطلقاً حکم لگا دینا ٹھیک نہیں کیونکہ صحت میں بہت سے مراتب ہیں اور بہت سی اسناد اس میں داخل ہوتی ہیں البتہ اس میں اس انداز کی قید لگا دی جائے کہ یہ فلاں شہر میں **اصح الاسانید** ہے یا فلاں باب یا فلاں مسئلے میں **اصح الاسانید** ہے تو صحیح ہے۔ (واللہ اعلم)

فصل نہم:

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی عادت ہے کہ وہ اپنی جامع ترمذی میں ایک ایک حدیث پر بیک وقت کئی کئی حکم لگا دیتے ہیں مثلاً یہ ''حدیث حسن صحیح'' ہے، یہ ''غریب حسن'' ہے، یہ ''حدیث حسن غریب اور صحیح ہے'' اس کی توجیہ یہ ہے کہ حسن اور صحیح کے اجتماع کے جواز میں بایں طور شبہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی حدیث حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ ہو، اسی طرح غرابت اور صحت کے اجتماع میں بھی شبہ نہیں البتہ غرابت اور حسن کے اجتماع میں لوگوں نے کچھ اشکال محسوس کیا ہے اس لئے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن میں تعدد طرق کا اعتبار کیا ہے پھر وہ غریب کیونکر ہو سکتی ہے (غریب میں تو طرق متعدد نہیں ہو سکتے) اس کا جواب محدثین یہ دیتے ہیں کہ حسن میں تعدد طرق کا اعتبار علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ اس کی ایک قسم میں ہے اور جب حسن اور غرابت کے اجتماع کا حکم لگایا جائے تو اس سے مراد دوسری قسم ہوگی اور بعض طریقوں میں حسن اور بعض کے نزدیک واؤ أو کے معنی میں ہے یعنی انہیں اس بارے میں یقینی علم نہ ہونے کی وجہ سے شک اور تردد ہے کہ آیا یہ حدیث غریب ہے یا حسن اور بعض نے کہا کہ یہاں حسن سے اس کے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہیں یعنی جس کی طرف طبیعت مائل ہو لیکن یہ قول بہت مستبعد ہے۔

فصل دہم:

حدیثِ صحیح کا احکام میں حجت ہونا سب کے نزدیک متفق علیہ ہے، اسی طرح عام علماء کے نزدیک حسن لذاتہ ہے کہ وہ بھی قابل حجت ہونے میں صحیح کے ساتھ ملحق ہے گو رتبہ میں صحیح سے کم ہے، ایسے ہی اس حدیثِ ضعیف کے قابل احتجاج ہونے

میں بھی اتفاق ہے جو تعددطرق کی وجہ سے حسن لغیرہ کے درجے کو پہنچ جاتی ہو۔

یہ جو مشہور ہے کہ حدیث ضعیف فضائل اعمال میں معتبر ہے اس کے ماسوا میں نہیں تو اس سے مراد مفرد احادیث ہیں نہ کہ وہ احادیث جو متعددطرق سے مروی ہوں اس لئے کہ ایسی احادیث تو ضعیف میں نہیں بلکہ حسن کے درجے میں داخل ہیں، اس کی صراحت ائمۂ حدیث نے کر دی ہے، بعض کہتے ہیں کہ اگر ضعیف سوء حفظ یا اختلاط یا تدلیس کی وجہ سے ہو گو اس کا راوی صدق ودیانت سے متصف ہو تو اس کی تلافی تعددطرق سے ہو جائے گی اور اگر اس کا ضعف اتہام کذب یا شذوذ یا خطائے فاحش کی بنا پر ہو تو تعددطرق سے اس کی تلافی ممکن نہیں، ایسی حدیث ضعیف ہی قرار پائے گی جو صرف فضائل اعمال میں ہی کارآمد ہوگی، یہی حکم محدثین کے اس مقولے کے لئے بھی ہوگا کہ ''ضعیف کا ضعیف کے ساتھ ملنا قوت کے لئے مفید ہے'' یعنی اس سے بھی وہی ضعیف روایات مراد ہیں جن کے ضعف کی تعددطرق سے تلافی نہیں ہوتی اگر یہ مطلب نہ لیا جائے تو محدثین کا یہ قول لغو قرار پائے گا۔ فتدبر۔

فصل یازدہم:......مراتب کتب کے بیان میں:

جب مراتبِ صحیح میں تفاوت ہے کہ بعض بعض سے زیادہ صحیح ہیں تو معلوم ہونا چاہیئے کہ جمہور محدثین کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ صحیح بخاری حدیث کی تمام تصنیف شدہ کتابوں میں مقدم ہے یہاں تک کہ ان کا قول ہے کہ "اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری" ''کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب صحیح بخاری ہے'' البتہ بعض مغاربہ نے صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر ترجیح دی ہے۔ جمہور کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں نے صرف حسن بیان، وضع وترتیب کی خوبی، دقیق اشارات کی رعایت اور اسناد میں نکات کی خوبیوں کو ہی پیش نظر رکھا ہے حالانکہ اس بناء پر ترجیح وغیر ترجیح خارج از بحث ہے، اصل گفتگو صحت وقوت اور اس سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں ہے اور اس لحاظ سے کوئی کتاب ان شرائط اور کمال صفات کی بنا پر صحیح بخاری کے برابر نہیں، جن کا امام بخاری نے صحت کے متعلق رجال حدیث میں خیال رکھا ہے اور بعض نے ان دونوں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں توقف کیا ہے لیکن پہلا مسلک صحیح ہے (جس کی رو سے صحیح بخاری کو ترجیح حاصل ہے)۔

وہ حدیث جس کی تخریج میں امام بخاری وامام مسلم متفق ہوں اسے ''متفق علیہ'' کہا جاتا ہے، شیخ (حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ) کہتے ہیں بشرطیکہ وہ ایک ہی صحابی سے ہوں، محدثین نے کہا کہ متفق علیہ احادیث دو ہزار تین سو چھبیس ہیں۔ مختصر یہ کہ جس پر شیخین (امام بخاری وامام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ) متفق ہوں وہ دوسری حدیثوں پر مقدم ہیں۔ دوسرے نمبر وہ احادیث ہیں جنہیں صرف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا، پھر وہ جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا، اس کے بعد ان احادیث کا نمبر ہے جو بخاری ومسلم کی شرطوں کے مطابق ہوں۔ اس کے بعد ان کے علاوہ ان ائمہ کی روایت کردہ حدیثیں ہیں جنہوں نے صحت کا التزام کیا ہے اور ان کی تصحیح کی ہے، اس طرح کل سات قسمیں ہوں گی۔

بخاری ومسلم کی شرط سے مراد یہ ہے کہ رجال حدیث ان صفات کے ساتھ متصف ہوں جن کے ساتھ بخاری ومسلم کے رجال ضبط وعدالت، عدم شذوذ ونکارت اور عدم غفلت میں متصف ہیں، اور بعض کے نزدیک شرط بخاری ومسلم سے مراد یہ ہے کہ اس

کے رجال وہی ہوں جو بخاری و مسلم کے ہیں۔ بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے جس کو ہم نے "**مقدمۃ شرح سفر السعادۃ**" میں بیان کیا ہے۔

فصل دوازدہم:

صحیح احادیث صرف بخاری و مسلم میں ہی محصور نہیں ہیں نہ ان دونوں نے صحیح احادیث کا استقصاء کیا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ ان میں جو احادیث ہیں وہ سب صحیح ہیں اور بہت سی ایسی احادیث ہیں جو ان کے نزدیک صحیح تھیں اور ان کی شرائط کے مطابق بھی تھیں

لیکن اس کے باوجود وہ اپنی کتابوں میں نہیں لائے چہ جائیکہ ایسی احادیث لاتے جو ان کے علاوہ دوسروں کے نزدیک صحیح تھیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ میں اپنی اس کتاب (جامع صحیح) میں صرف صحیح احادیث ہی لایا ہوں اور بہت سی صحیح احادیث چھوڑ بھی دی ہیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ میں اپنی اس کتاب میں جو احادیث لایا ہوں وہ سب صحیح ہیں تاہم میں یہ نہیں کہتا کہ جن احادیث کو میں نے چھوڑ دیا ہے وہ ضعیف ہیں۔ البتہ اس ترک و اخذ میں وہ وجوہ صحت اور دیگر مقاصد کو سامنے رکھا گیا ہے اور انہیں کے مطابق ایسا کیا گیا ہے۔

امام حاکم ابو عبد اللہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام "مستدرک" ہے جن صحیح حدیثوں کو بخاری و مسلم نے چھوڑ دیا ہے، ان کو انہوں نے اپنی اس کتاب میں بیان کر کے اس کی تلافی کی ہے، ان کے علاوہ بعض وہ احادیث بھی بیان کی ہیں، جو ان دونوں کی شرطوں یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہیں اور کچھ ایسی احادیث بھی اس میں لائے ہیں جو شیخین کے علاوہ دیگر ائمہ کی شرائط پر ہیں، امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کے آغاز میں کہا ہے کہ امام بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فیصلہ کبھی نہیں دیا کہ ان کی کتابوں میں بیان کردہ احادیث کے علاوہ جو احادیث ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ہمارے زمانے میں بدعتیوں کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا ہے جنہوں نے ائمۂ دین پر زبان طعن دراز کی کہ ان احادیث کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتی اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے ایک لاکھ صحیح احادیث اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد تھیں، اس صحیح سے ان کی مراد بظاہر (واللہ اعلم) وہ صحیح ہے جو ان کی شرطوں کے مطابق ہو۔

اس کتاب یعنی بخاری میں تکرار کے ساتھ بیان کی ہوئی احادیث کی تعداد سات ہزار دو سو پچھتر (۷۲۷۵) اور حذف تکرار کے بعد چار ہزار (۴۰۰۰) ہے۔ دوسرے کئی ائمہ نے بھی صحاح تصنیف کی ہیں جیسے "صحیح ابن خزیمہ" انہیں امام الائمہ کہا جاتا ہے اور ابن حبان کے شیخ (استاد) ہیں، ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تعریف میں کہا ہے کہ میں نے روئے زمین پر کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو علم حدیث میں ان سے بڑھ کر ہو اور حدیث کے صحیح الفاظ ان سے زیادہ رکھنے والا ہو۔ گویا تمام احادیث ان کی نظروں کے سامنے تھیں اور جیسے ان (ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ) کے شاگرد ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح ہے جو ثقہ ثابت فاضل اور فہیم امام ہیں، امام حاکم ابو عبد اللہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ جو حافظ و ثقہ ہیں، کی صحیح ہے جس کا نام "مستدرک" ہے،

ان کی اس کتاب میں کچھ تساہل راہ پایا گیا ہے جس پر لوگوں نے گرفت کی ہے، لوگوں نے کہا ہے کہ ابن خزیمہ اور ابن حبان حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ سے زیادہ قوی و مستند اور اسانید و متون میں زیادہ بہتر اسلوب کے حامل ہیں اور جیسے حافظ ضیاء مقدسی کی مختارہ (مجموعی حدیث) ہے جس میں انہوں نے وہ صحیح حدیثیں بیان کی ہیں جو بخاری و مسلم میں نہیں ہیں اور محدثین نے ان کی کتاب ''مختارہ'' کو مستدرک سے اچھا قرار دیا ہے اور جیسے ابن عوانہ اور ابن السکن کی ''صحیح'' اور ابن جارود کی "المنتقی" یہ بھی وہ کتابیں ہیں جن میں بطور خاص صحیح احادیث کا اہتمام کیا گیا ہے تاہم بعض لوگوں نے ان کتابوں پر غلط یا صحیح تنقید بھی کی ہے۔ **وفوق کل ذی علم علیم** ہر صاحب علم سے بڑھ کر صاحب علم موجود ہے۔

فصل سیزدہم:

وہ چھ کتابیں جو مشہور ہیں اور اہل اسلام میں پڑھی پڑھائی جاتی ہیں ان کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں:

① صحیح بخاری، ② صحیح مسلم، ③ جامع ترمذی، ④ سنن ابی داؤد، ⑤ سنن نسائی، ⑥ سنن ابن ماجہ

اور بعض کے نزدیک چھٹی کتاب ابن ماجہ کی جگہ موطا امام مالک ہے۔ صاحب جامع الاصول نے بھی موطا ہی کو اختیار کیا ہے (اور بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر) چار کتابوں میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں ہیں لیکن ان سب کا نام ''صحاح ستہ'' تغلیب کے طور پر ہے۔ صاحب المصابیح نے صحیحین کی حدیثوں کے علاوہ دیگر کتابوں کی احادیث کا نام حسن رکھا ہے جو اسی طریق تغلیب اور معنی لغوی کے قریب ہے یا یہ ان کی اپنی کوئی نئی اصطلاح ہے، اور بعض کے خیال میں سنن دارمی کو چھٹی کتاب شمار کیا جانا زیادہ مناسب اور لائق ہے، اس لئے کہ اس کے رجال میں ضعف کم اور اس کی احادیث میں منکر و شاذ حدیثیں نادر ہیں، اس کی سندیں عالی ہیں اور اس کی ثلاثیات بخاری کی ثلاثیات سے زیادہ ہیں۔

یہ مذکورہ کتب وہ ہیں جو سب سے زیادہ مشہور ہیں تاہم ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں شہرت کی حامل ہیں۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''جمع الجوامع'' میں بہت سی کتابوں سے حدیثیں لی ہیں جن کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے اور جو صحیح و حسن و ضعیف حدیثوں پر مشتمل ہے، اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہا ہے کہ میں اس کتاب میں ایسی کوئی حدیث نہیں لایا جو وضع کے ساتھ موسوم ہو اور جس کے رد اور ترک پر محدثین کا اتفاق ہو اور صاحب مشکوٰۃ نے اپنی کتاب کے دیباچے میں کئی ائمہ متقنین کا ذکر کیا ہے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

امام بخاری، امام مسلم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی، امام دار قطنی، امام بیہقی اور امام رزین رحمہم اللہ تعالیٰ، ان کے علاوہ دوسرے ائمہ کا ذکر اجمالاً کیا ہے۔ ہم نے ان سب ائمہ کے حالات الگ ایک کتاب "الاکمال بذکر اسماء الرجال" میں لکھے ہیں۔ **ومن اللہ التوفیق وھو المستعان فی المبدأ والمعاد۔**

تنبیہ: مصطلحات حدیث کا یہ مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو عربی زبان میں ہے اور یہ اردو ترجمہ مولانا عبدالعلیم علوی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کا ہے، میں نے اسی کو نقل کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

بندۂ عاجز فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عرض کرتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال ہوئی تو میں نے قریباً سولہ سال کی عمر میں ۲۲ فروری ۱۹۶۸ء میں ہری پور ہزارہ صوبہ سرحد کے مدرسہ ربانیہ ریلوے اسٹیشن میں درجہ اولیٰ میں پڑھنا شروع کیا، پھر میں نے درجہ ثانیہ انوار القرآن مدرسہ ایبٹ آباد میں پڑھا اور درجہ ثالثہ میں نے پھر مدرسہ ربانیہ ہری پور میں پڑھا، میں نے ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء دو سال تک دار العلوم کورنگی کراچی میں درجہ رابعہ اور خامسہ پڑھا، ۱۹۷۳ء میں میں نے درجہ سادسہ کی کتابیں گوجرانوالہ اشرف العلوم میں پڑھیں، ۱۹۷۴ء میں میں نے جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک میں درجہ سادسہ کی مختلف کتابیں شروع کیں مگر بیماری کی وجہ سے تین ماہ بعد ایبٹ آباد اپر کیہال میں جا کر سال گزارا، ۱۹۷۵ء میں مزید علوم پڑھنے کے لئے میں نے مدرسہ مظہر العلوم مینگورہ سوات میں داخلہ لیا اور درجہ سابعہ وہیں پر حضرت اقدس مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پڑھا، ان کے ہاں میں نے دو سال گزارے ہیں، آپ سے میں نے مشکوٰۃ شریف مکمل پڑھی اور فن ادب میں دیوان متنبی، فقہ میں ہدایہ آخرین پڑھی، یہ میری زندگی کا وہ حصہ ہے جس میں میرے رب نے مجھے حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمۃ اللہ علیہ کے فیض سے فن حدیث اور فن ادب دونوں سے وافر حصہ عطا فرمایا۔

حضرت مولانا کی اجازت سے میں دورہ حدیث کے لئے ۱۹۷۷ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی آیا اور داخلہ لیا، بخاری شریف کے دونوں حصے محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھے، سہ ماہی امتحان کے دوران حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمۃ اللہ علیہ کراچی تشریف لائے تو بخاری جلد ثانی ان سے پڑھی، جامع ترمذی حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، بنوری ٹاؤن میں حضرت بنوری کا یہ آخری سال تھا، اسی مبارک جامعہ سے میں نے تکمیل تعلیم کی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں اجازت حدیث اور سلسلۂ سند بھی درج کروں کیونکہ **"الاسناد من الدین ولولا الاسناد لقال من شاء ما شاء"** محدثین عظام کے ہاں معروف ضابطہ اور قابل اعتماد اور قابل بھروسہ سلسلہ ہے چنانچہ میرے بڑے اساتذہ میں سے حضرت اقدس حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری اور حضرت اقدس حضرت مولانا فضل محمد سواتی اور حضرت اقدس حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے ہیں جو براہ راست شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، اس طرح بندہ کو ایک واسطہ سے حضرت مدنی رحمہ اللہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوجاتا ہے، بندہ نے بنوری ٹاؤن کے دارالحدیث میں اپنے رفقاء کے ساتھ حضرت مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ سے بخاری شریف کا ایک سبق پڑھا ہے اس سے بھی سند عالی درجہ تک جا پہنچتی ہے لیکن ہمیں برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمہ اللہ نے بنوری ٹاؤن کے دارالحدیث میں جو دو سندیں عطا فرمائی ہیں پہلے ان کو یہاں نقل کرتا ہوں۔

سند حدیث ❶:

❶ فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عن شیخ الحدیث مولانا زکریا عن مولانا محمد یحیٰ عن مولانا رشید احمد گنگوہی عن مولانا شاہ عبدالغنی عن شاہ محمد اسحاق عن شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

❷ فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عن شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا عن مولانا خلیل احمد سہارنپوری عن شیخ عبدالقیوم بدھانوی عن شاہ محمد اسحاق عن شاہ عبدالعزیز عن شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

❸ فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عن محدث العصر مولانا محمد یوسف البنوری عن شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی و شاہ انور شاہ کشمیری عن شیخ الہند محمود الحسن رحمہ اللہ عن حجۃ الاسلام قاسم نانوتوی عن شاہ عبدالغنی عن شاہ محمد اسحاق دہلوی عن شاہ عبدالعزیز عن شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

❹ فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عن فقیہ العصر شیخ کامل مولانا فضل محمد سواتی عن شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی عن امام الہند و شیخ الہند محمود حسن عن حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی و فقیہ النفس مولانا مفتی رشید احمد گنگوہی عن شاہ عبدالغنی عن شاہ محمد اسحاق دہلوی عن شاہ عبدالعزیز عن شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

❺ فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عن محدث العصر مولانا سید محمد یوسف البنوری عن الشیخۃ امۃ اللہ عن ابیھا شاہ عبدالغنی عن شاہ محمد اسحاق عن شاہ عبدالعزیز عن شاہ ولی اللہ۔ **رحم اللہ ہؤلاء الاماثل الامجاد رحمۃ واسعۃ وجعل قبورھم روضات من ریاض الجنۃ۔**

فراغت و تدریس:

فراغت کے بعد میں نے ایک سال ایک گمنام مدرسہ میں تدریس کی اور پھر جامعہ حمادیہ شاہ فیصل کالونی میں آٹھ سال مسلسل تدریس کے فرائض انجام دیئے، طحاوی شریف اور سننِ ترمذی جلد ثانی پڑھانے کا موقع بھی ملا، پھر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی شاخ مدرسہ عربیہ اسلامیہ ملیر میں بندہ کا تقرر مفتی احمد الرحمن رحمہ اللہ نے فرمایا، یہاں دو سال تک ابتدائی درجات میں تدریس کا موقع ملا اور پھر ۱۹۸۷ء میں حضرت مولانا مفتی احمد الرحمان رحمہ اللہ کی نوازش اور فرمائش پر مرکز علوم جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں تبادلہ ہوا اور جمعرات ۱۹ شوال ۱۴۰۹ھ بمطابق ۲۵ مئی ۱۹۸۹ء میں اس مقدس درسگاہ میں تدریس کا آغاز کیا، اسی سال بندہ کو پڑھانے کے لئے مشکوٰۃ شریف جلد اول ملی اور ۱۴۰۹ھ سے لے ۱۴۱۷ھ تک مکمل آٹھ سال میں نے مشکوٰۃ شریف جلد اول پڑھائی اور پھر ۱۴۱۷ھ سے، اس وقت ۱۴۲۲ھ تک الحمد للہ مشکوٰۃ

شریف جلد ثانی پڑھا رہا ہوں۔

مشکوٰۃ شریف میں اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس مولانا فضل محمد صاحب سواتی عطاءاللہ کو خصوصی مہارت عطا فرمائی تھی، بندے نے آپ کے درس کو مکمل طور پر قلم بند کیا اور پھر پڑھانے کے زمانے میں رات بھر کی محنت سے مختلف شروحات کا مطالعہ کیا اور مختلف شروحات سے واضح اور اہم مباحث کو ایک مسودہ میں جمع کیا، ہر درس کے ساتھ تاریخ بھی لکھ دی اور پھر درس کی مقدار سبق کو الگ الگ لکھ دیا، اس طرح شوال سے لے کر رجب کی دس تاریخ تک ہر سبق مع تاریخ متعین ہو گیا، میں مسلسل اس مسودہ سے استفادہ کرتا رہا کیونکہ یہ کئی کتب اور کئی شروحات کا نچوڑ ہوتا تھا پھر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے جب مشکوٰۃ جلد دوم کے پڑھانے کا موقع ملا تو میں نے اس کے اسباق کا بھی اسی طرح انضباط کیا، رات گئے تک صبح کے درس کے لئے مطالعہ بھی ہوتا تھا اور روزانہ مسودے کا ایک پرچہ بھی تیار ہوتا تھا اس طرح مشکوٰۃ شریف کے مباحث کا مکمل مسودہ تیار ہو گیا، جس نے تقریباً چودہ سال بعد شرح کی صورت اختیار کی۔

مجھے بعض اوقات بعض طلبہ اور بعض احباب اس طرف توجہ دلاتے رہے کہ آپ اس مجموعہ کو کتابی شکل میں شائع کر دیں مگر میں دل و دماغ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اس لئے کہ یہ ایک بھاری بھر کم کام تھا لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ایک داعیہ پیدا فرمایا جس کی وجہ سے میں خود بعض بزرگوں سے مشورہ کرنے لگا کہ میں یہ ارادہ رکھتا ہوں آپ کی کیا رائے ہے؟ بعض احباب نے ہاں کہہ کر تحسین فرمائی مگر بعض کرم فرماؤں نے تو اس پر زور دیا کہ اس کام کو ضرور کرنا ہے، مدینہ منورہ میں جب ادائیگی عمرہ کے مبارک موقع پر رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ میں بندہ نے ایک علم دوست اور بیدار مغز شخصیت حضرت مولانا عبدالوحید عبدالحق مدظلہ کے سامنے یہ تذکرہ کیا تو آپ نے ضرورت سے زیادہ اس میں دلچسپی لی اور فرمایا کہ میں نے مشکوٰۃ شریف برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب سے پڑھی ہے اور کیسٹوں میں موجود ہے، میں اس کو بھی نکال لوں گا، اگر اس میں مباحث مشکوٰۃ سے متعلق مفید باتیں آگئیں تو آپ اس کو بھی اپنے تشریحات میں شامل کر لیں اگرچہ اس کی نوبت نہیں آئی لیکن حضرت مولانا نے میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس سفر مبارک میں بندہ نے دیگر اہل اللہ اور اولیاء اللہ سے اس کام کی تکمیل اور قبولیت کے لئے دعاؤں کی درخواست کی اور پھر مکہ مکرمہ زادھا اللہ شرفاً میں بیت اللہ کی آغوش میں جمعہ و ہفتہ کی درمیانی شب ساڑھے بارہ بجے میزاب رحمت کے سامنے ۱۴ رمضان ۱۴۲۱ھ کو بطور تبرک ان آیات سے ابتداء کی:

مکہ مکرمہ میں شرح مشکوٰۃ کی ابتداء
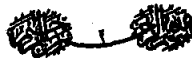
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ نور السمٰوات والارض مثل نورہ کمشکوۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ الزجاجۃ کأنھا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ یکاد زیتھا یضیء ولو لم تمسسہ

نار نور علی نور یھدی اللہ لنورہ من یشاء ○ (سورۃ نور ۳۵)

ترجمہ: اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کسی (مشکوۃ) طاق میں چراغ شیشے کی قندیل میں ہے قندیل گویا موتی کی طرح چمکتا ہوا ستارہ ہے جو زیتون کے مبارک درخت سے روشن کیا جاتا ہے، نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف، اس کا تیل قریب ہے کہ روشن ہو جائے اگر چہ اسے آگ نے نہ چھوا ہو، روشنی پر روشنی ہے، اللہ جسے چاہتا ہے اپنی روشنی کی راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

مدینہ منوّرہ کی مسجد نبوی میں شرح مشکوۃ کی ابتداء

وعن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالی عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرء ما نوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ وسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او الی امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ۔

(متفق علیہ)

لیلۃ الجمعۃ ساعۃ واحدۃ ونصف فی المدینۃ المنورۃ زادھا اللہ شرفا فی روضۃ من ریاض الجنۃ بین منبر النبی او بین بیتہ وروضتہ المقدسۃ۔ (۱۹ رمضان ۱۴۲۱ھ ۱۵ دسمبر ۲۰۰۰)

اللّٰھم تقبلہ منی واجعلہ مقبولاً عند العلماء والأولیاء وعند طلبۃ الدین وانفعنی بہ فی الدنیا والآخرۃ واجعلہ نافعاً للمسلمین آمین یارب العالمین۔

اما بعد!

بندہ عاجز فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی عرض کرتا ہے کہ "توضیحات" کے نام سے شرح مشکوۃ شریف کی ابتداء مدینہ منورہ زادھا اللہ شرفا میں جمعہ کے دن بوقت ڈیڑھ بجے رات منبر نبوی اور روضۂ اقدس کے درمیان ریاض الجنۃ کے وسط میں سب سے زیادہ متبرک مقام اسطوانہ عائشہ صدیقہ میں ہوئی۔ **والحمد للہ علی ذلک حمدًا کثیرًا کثیرًا۔**

میں اپنے اس رب کا شکر کس زبان اور کس قلم اور کس دل و دماغ سے ادا کروں جس پروردگار نے مجھ جیسے حقیر و فقیر اور مجھ جیسے ہمہ جہت ناکارہ اور مجھ جیسے ضعیف و کمزور کو ان جیسے مقدس مقامات میں حاضری کا موقع عطا فرمایا اور میرے دل میں پیارے نبی ﷺ کی احادیث مقدسہ اور انفاس قدسیہ کی خدمت اور اس کی شرح و توضیح کا داعیہ پیدا کیا بس میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ:

اللّٰھم لک الحمد کما ینبغی لجلال وجھک وعظیم سلطانک اللہ لا الہ الا انت لا شریک لک ولا

مثال لك ولا مثيل لك أنت الفرد الأحد الصمد الذى لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوًا احد۔

اللّٰهم صل على سيد الأولين والآخرين امام المتقين جيش الأنبياء والمرسلين صاحب جوامع الكلم وصاحب الجمل الاحمر والسيف المشهر وعلى اٰله الطاهرين واصحابه الطيبين الى يوم الدين۔ آمين يارب العالمين۔

کچھ اس شرح کے متعلق

کچھ باتیں اس سے قبل عرض حال کے عنوان کے تحت لکھ چکا ہوں مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ میں نے ''توضیحات شرح مشکوٰۃ'' میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ سب سے پہلے حدیث شریف لکھوں گا اور اس پر مکمل اعراب لگاؤں گا تا کہ حدیث کی عبارت کے پڑھنے میں غلطی نہ ہو پھر حدیث شریف کا واضح لفظی ترجمہ ہوگا اور پھر عنوان کے طور پر توضیح کا لفظ ہوگا، حدیث میں اگر کوئی لغت مشکل ہوگی تو اس کی تحقیق لغوی ہوگی اور پھر اس حدیث کی فقہی بحث ہوگی جو فقہائے کرام کے مذاہب اربعہ کی روشنی میں ہو گی، ہاں اگر مذاہب اربعہ کے علاوہ کسی مکتب فکر کا کوئی تحقیقی کلام ہوگا تو اس کو بھی زیر بحث لایا جائے گا، فقہی مباحث میں یہ طرز اختیار کروں گا کہ سب سے پہلے یہ بتایا جائے گا کہ زیر بحث حدیث میں کل مذاہب کتنے ہیں اور کن کن فقہائے کرام کے ہیں مثلاً مالکیہ، حنابلہ، شوافع اور احناف کے مسلک کا تذکرہ ہوگا اور پھر ہر ایک کی دلیل کو ذکر کیا جائے گا اور پھر احناف کی دلیل کو ترجیح دی جائے گی اور دیگر حضرات کے مستدلات کی توجیہ، تطبیق اور جواب ہوگا۔

اسی طرز پر مجھے میرے مشفق استاد حضرت اقدس حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا ہے اور یہ طرز بہت آسان اور عام فہم ہے۔ اس شرح میں اس کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا کہ یہ قول کس کا ہے اور کتاب کا حوالہ کیا ہے البتہ یہ اہتمام کیا جائے گا کہ اس شرح میں جن کتابوں اور شروحات سے مسودہ بنانے میں استفادہ کیا گیا ہے اس کو اجمالاً ذکر کر کے مراجع اور مآخذ کی طرف اشارہ کیا جائے گا تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ کلام خود ساختہ نہیں ہے، بعض مواضع میں حوالہ جات بھی آئیں گے لیکن شرح کو آسان رکھنے کے لئے قارئین پر حوالہ جات کا زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، میرے محترم استاد کا طرز بھی یہی تھا، حدیث شریف جس صحابی سے منقول ہوگی اس صحابی سے متعلق تاریخی بحث نہیں ہوگی کیونکہ میرے استاد محترم نے یہی فرمایا کہ ''ہمارے اساتذہ کا طرز مشکوٰۃ میں کسی صحابی کے حالات بیان کرنے کا نہیں رہا''۔ بہر حال اس کے باوجود بندۂ عاجز نے مشکوٰۃ شریف کی بالکل ابتدائی احادیث میں بعض صحابہ کرام کے متعلق کچھ تاریخی بحث کی ہے جو بالکل قلیل بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

میں نے ایک چیز کا اہتمام اس شرح میں کیا ہے وہ یہ کہ جتنا سبق میں نے طلبہ کو ایک دن کے درس میں پڑھایا ہے اس کے ساتھ میں نے تاریخ درج کی ہے کہ یہ سبق فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ میں پڑھایا گیا ہے لہٰذا جب ایک دن اور ایک درس کی احادیث مکمل لکھی جائیں گی تو جب تک ان کی توضیح و تشریح مکمل نہیں ہوگی کسی اور حدیث کو نہیں لکھا جائے گا خواہ شرح کی وجہ سے پورا صفحہ حدیث سے خالی کیوں نہ ہو، اس میں طلبہ اور مدرسین حضرات کے لئے یہ آسانی ہوگی کہ آج کتنا سبق ہونا چاہئے اور اس ماہ میں سبق کہاں تک پہنچ

جانا چاہئے، اس سے کتاب کے پڑھانے اور وقت پر پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں سہولت ہوگی اور ایک تجربہ حاصل ہوگا، ہاں بعض مقامات میں ایسا ہوا ہے کہ مقدار سبق زیادہ لکھی گئی ہے، عنوان میں بھی ایک متعین تاریخ کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن وہ سبق ایک دن میں نہیں ہوسکا بلکہ بحث و مباحثہ کی وجہ سے اس میں دو دن لگے ہیں تاہم یہ بہت کم پیش آیا ہے، یہ بھی یاد رہے کہ میں نے اس شرح میں ایک خالص مدرس کے لئے مواد اکٹھا کیا ہے لہذا وہ تدریس کے دوران تمام متعلقہ چیزوں کو ایک جگہ پائے گا، خصوصاً ہر کتاب کے ابتدائی مباحث میں آسانی ہوگی، میں نے اس شرح میں اس بات کا پورا پورا خیال رکھا ہے کہ یہ نہ اتنی طویل ہو کہ طلبہ اور قارئین اکتا جائیں اور نہ اتنی مختصر ہو کہ طلبہ تشنہ لب رہ جائیں بلکہ میں نے اس کو معتدل اور متوسط رکھنے کی کوشش کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ میں نے بیان کا انداز اس طرح رکھا ہے کہ ہر پڑھنے والا بہت آسانی سے اس کو سمجھ سکے۔ بعض احادیث کے متعلق میں نے آخر میں ''مطلب'' یا ''تعلیم'' کا لفظ لکھا ہے اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ حدیث ہمیں کیا تعلیم دیتی ہے اور اس کا مطلب کیا ہے، میں نے اس شرح میں جمہور امت کا مسلک اختیار کیا ہے اور کسی کے تفرد یا شاذ قول پر اعتماد نہیں کیا ہے نیز میں نے اس شرح میں مشکوٰۃ شریف کی ہر کتاب اور باب کی ابتداء میں اس سے متعلق عمومی بحث بھی کی ہے جو باب کی تمام احادیث سمجھنے کے لئے کافی ہے، اسی طرح میں نے کتاب مشکوٰۃ کے آخر تک تحقیق و توضیح کو جاری رکھا ہے ایسا نہیں کہ ابتداء میں تفصیل اور آخر میں تعطیل ہو بلکہ جلد ثانی میں تفصیل جلد اول سے کم نہیں ہے۔

میں نے شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ مقدمہ جو انہوں نے اصول حدیث سے متعلق عربی زبان میں لکھا ہے اور علماء نے اسے مشکوٰۃ شریف کی ابتداء میں رکھا ہے اس کا صرف اردو ترجمہ اس شرح کی ابتداء میں لکھا ہے تاکہ طلباء اس سے استفادہ کرسکیں اور خوف طوالت سے عربی عبارت چھوڑ دی ہے، میں نے مشکوٰۃ شریف کی تمام احادیث کو متن اور اعراب کے ساتھ بہتر انداز سے کمپوز کروانے کی مکمل کوشش کی ہے، اور ہر باب اور ہر کتاب کی احادیث کو نمبر لگا کر لکھا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ میں نے ہر ہر حدیث کا ترجمہ لکھ دیا ہے خواہ حدیث کی تشریح ہو یا نہ ہو پھر جن شروحات سے میں نے اس شرح میں استفادہ کیا ہے ان میں مندرجہ ذیل شروحات قابل ذکر ہیں:

①	مرقات شرح مشکوٰۃ	ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ
②	شرح الطیبی	حسین بن محمد بن عبد اللہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ
③	لمعات شرح مشکوٰۃ	شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
④	اشعۃ اللمعات	شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
⑤	التعلیق الصبیح	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ
⑥	التعلیق الفصیح	حضرت مولانا شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ
⑦	تنظیم الاشتات	شیخ حافظ ابو الحسن مدظلہ

۸	طحاوی شریف	علامہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ
۹	زجاجۃ المصابیح (مشکوٰۃ حنفی)	مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ ابن مولانا مظفر حیدرآبادی الہند رحمۃ اللہ علیہ
۱۰	مظاہر حق جدید	مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری

اگر کسی کو حوالہ دیکھنے کی ضرورت ہو یا تسلی کے لئے حوالہ دیکھنا چاہتا ہو تو ان شروحات کے اندر ضرور حوالہ ملے گا کیونکہ میں نے انہیں شروحات اور انہیں کتب سے استفادہ کیا ہے پھر بھی میں حوالہ دینے کی کوشش کروں گا لیکن چونکہ میں تنہا اس کام کا احاطہ آسانی سے نہیں کرسکوں گا اس لئے معذرت خواہ ہوں، بہر حال ان تمام شروحات سے استفادہ کے باوجود اس شرح میں میرے محترم استاد محقق زمان حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمہ اللہ کی وہ توضیحات اور وہ مبارک دروس بھی شامل ہیں جو مشکوٰۃ شریف پڑھنے کے دوران میں نے ان سے سن کر ضبط کرلئے تھے، بلکہ اس شرح میں حضرت اقدس کے یہ مبارک دروس بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر شرح کی عمارت کھڑی ہے۔

قارئین سے ایک بار پھر عرض ہے کہ میں نے جمع وترتیب میں کافی محنت اور احتیاط سے کام لیا ہے لیکن چونکہ یہ شرح ایک طویل الذیل کام ہے تو بہت ممکن ہے کہ اس میں مسائل وفضائل کے بیان میں کہیں کوئی فرق آ گیا ہو اور غلطی رہ گئی ہو اس لئے قارئین سے التماس ہے کہ وہ بطور خیر خواہی بندۂ ناچیز کو مطلع فرمائیں، اللہ تعالیٰ میری سوچ اور میرے قلم کو ہر لغزش اور افراط وتفریط سے بچائے۔ آمین یارب العالمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی نبیہ الکریم وعلی الہ وصحبہ اجمعین

گو نالہ نارسا ہو، نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو در گزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

(حضرت مولانا) **فضل محمد یوسف زئی** (صاحب دامت برکاتہم)

استاد حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

یکم محرم الحرام سال نو ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۷ مارچ ۲۰۰۱ء

مورخہ ۷ اشوال ۱۴۰۹ھ پہلا درس

علماء وطلبا اور مدارس کا ثبوت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اہل مکہ کے لئے دو دعائیں مانگی تھیں، ایک کا تعلق کھانے پینے اور مادیات سے تھا اور دوسری دعاء کا تعلق روحانیات سے تھا، رزق اور مادیات کی دعا اس طرح تھی:

واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا بلدًا آمنا وارزق اھله من الثمرات من آمن منھم بالله والیوم الآخر قال ومن کفر فأمتعه قلیلاً ثم أضطره الی عذاب النار وبئس المصیر۔

(سورۂ بقرہ ۱۲۶)

"یعنی اہل مکہ میں سے جو اللہ تعالیٰ اور حشر نشر پر ایمان لائے ان کو دنیا کے پھلوں سے روزی عطا فرما اللہ تعالیٰ چونکہ رب العالمین ہے اس لئے فرمایا کہ روزی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کافروں کو بھی دوں گا البتہ کفر وشرک کی سزا آخرت میں کافروں کو دوں گا"۔

روحانیات کی دعاء اس طرح تھی:

ربنا وابعث فیھم رسولًا منھم یتلو علیھم آیٰتك ویعلمھم الکتاب والحکمة ویزکّیھم انك أنت العزیز الحکیم۔ (سورۂ بقرہ ۱۲۹)

اس دعا میں ایک شان والے رسول کی درخواست تھی جو انہی قریش میں سے ہو اور سرزمین مکہ سے ہو یعنی انہی کے خاندان کا ایک فرد ہو، فرشتہ اور جنات میں سے نہ ہو نیز اسی علاقے کا ہو، باہر سے نہ آیا ہو، یہ دعا درحقیقت محمد عربی ﷺ کے لئے تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور خود نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں دعائے ابراہیم اور بشارت عیسیٰ اور والدہ آمنہ کے خواب کے نتیجہ میں آیا ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اس دعا میں نبی کریم ﷺ کے چار وظائف اور ذمہ داریوں کا بھی ذکر فرمایا تھا کہ اس رسول کی پہلی ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ تیری آیتوں کو پڑھ پڑھ کر اہل مکہ کو سنائے گا، دوسری ذمہ داری یہ کہ وہ ان کو تیری کتاب کی تعلیم دے گا، تیسری یہ کہ ان کو حکمت ودانائی اور احادیث کی تعلیم دے گا، چوتھی ذمہ داری یہ کہ وہ ان کا تزکیہ نفس فرمائے گا۔

ان چار فرائضِ نبوت میں جو دوسری قسم "**ویعلمھم الکتاب**" کی ذمہ داری ہے اس سے منصوصی طور پر علماء وطلباء اور نظام تعلیم ثابت ہوجاتا ہے کیونکہ **یعلم** میں معلم آگیا خواہ وہ قاری ہو، حفظ وناظرہ کا استاد ہو یا درس نظامی کا مدرس ہو یا شیخ الحدیث ہو، معلم میں سب آگئے بشرطیکہ وہ دینی مدارس میں پڑھا رہا ہو، اسکول کالج میں نہیں کیونکہ شریعت نے انگریزی کے محکمۂ تعلیم کی ترغیب نہیں دی ہے۔

"**یعلم**" کے بعد آیت میں لفظ "**ھم**" ہے، اس لفظ سے طلباء ثابت ہو گئے کیونکہ معلم پڑھانے والا مدرس ہو، اور جن کو وہ پڑھا رہا ہے وہ ان کے طالب علم ہوئے تو دو چیزیں یعنی مدرس اور طالب علم قرآن کی صریح آیت سے ثابت ہوئے تو اب اگر کوئی کہے

کہ یہ مولوی اور طلباء کدھر سے آ گئے ہیں؟ تو ان کو جواب دینا چاہیئے کہ جس وقت سے لوح محفوظ اور آسمان اول سے یہ آیت آئی ہے اسی وقت سے علماء وطلباء آئے ہیں، اس آیت میں تیسری چیز "الکتاب" ہے کہ معلم طالب علم کو کیا پڑھائے گا، ان کا نظام تعلیم کیا ہوگا؟ تو بتادیا کہ "الکتاب" یعنی قرآن کریم ان کا نظام تعلیم ہوگا خواہ اجمال سے پڑھائے یا تفصیلات میں جائے، اس لفظ سے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کا تعین ہوگیا۔ اب اگر کوئی کہہ دے کہ مدارس دینیہ میں یہ تعلیم کہاں سے آئی؟ تو ان کو جواب ملے گا کہ جب سے آسمان سے یہ آیت آئی ہے اسی وقت سے دینی مدارس کی یہ تعلیم اور یہ نصاب آیا ہے، یہ تین چیزیں تو قرآن کریم کی نص اور واضح آیت سے ثابت ہیں، اب یہ معلم اور استاد جب طلبہ کو پڑھائے گا تو ایک طرف استاد بیٹھے گا، سامنے طالب علم ہوگا اور بیچ میں دینی تعلیم کی کتاب ہوگی، اس بیٹھنے کے لئے جگہ چاہیئے لہٰذا وہ جگہ یا مسجد ہوگی یا مدرسہ ہوگا لہٰذا اقتضاء النص کے طور پر اس آیت سے مسجد اور مدرسہ ثابت ہوگیا، اب اگر کوئی پوچھے کہ یہ مدارس کہاں سے آئے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب سے یہ آیت آئی ہے اسی وقت سے مدارس آئے ہیں، لہٰذا معلم، **متعلم**، نظام تعلیم اور مدارس سب نص قرآنی سے ثابت ہیں اور مستند ہیں، اس میں کسی کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔

مدارس کا تاریخی پس منظر

مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ نے دار ارقم بن ابی ارقم میں مدرسہ قائم فرمایا جو نووارد یا مقامی صحابہ دین اسلام کے متعلق سیکھنا چاہتے تھے وہ حضور اکرم ﷺ کے پاس اس خفیہ مدرسہ میں جاتے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی یہیں پر آکر مسلمان ہوئے تھے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی اور مسجد نبوی ﷺ میں ''صفہ'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم فرمایا جس میں کبھی اسی اور کبھی کم یا زیادہ طالب علم ہوتے تھے، یہ طلبہ جہاں علم حدیث اور مسائل سیکھتے تھے وہیں پر قطعہ منتظرہ کے طور پر جہاد کے لئے بھی تیار رہتے تھے اور ضرورت پڑنے پر میدان جنگ میں نکلتے تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ انہیں طلباء میں سے ایک تھے، پھر جب اسلام جزیرۂ عرب سے باہر نکلا اور شام فتح ہوا تو جامع دمشق میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں سینکڑوں صحابہ کرام اور تابعین دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور چونکہ دمشق افریقہ اور مغربی ممالک کے لئے دروازہ تھا تو یہی لوگ آگے چل کر میدان جہاد میں حصہ لیتے تھے۔

پھر جب مصر فتح ہوا تو وہاں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مساجد اور مدارس کی بنیاد ڈال دی، کچھ تغیر اور تبدیلی کے بعد جامع ازہر کو اسی علمی سفر کا تاریخی ثبوت حاصل ہے، پھر جب فارس اور عراق فتح ہوئے تو جامع کوفہ میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا جو مدرسہ عبداللہ بن مسعود کے نام سے مشہور ہوا جس میں ہزاروں طلبہ صحابہ کرام اور تابعین علوم سیکھتے تھے، کہتے ہیں یہ ایک فوجی چھاؤنی بھی تھا اور مدرسہ بھی تھا جس میں کبھی کبھی تیس ہزار تابعین اور صحابہ کرام ہوتے تھے، یہ مدرسہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں تھا اور کوفہ چونکہ مشرقی ممالک کے لئے دروازہ تھا، لہٰذا یہیں سے پڑھ کر طلبہ آگے جاتے تھے اور میدان جہاد میں حصہ لیتے تھے، حضرت ابن

مسعود رضی اللہ عنہ کے بعد آپ کے شاگرد اسود و علقمہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس مدرسہ کو سنبھالا پھر ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی نگرانی کی اور پھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا اہتمام سنبھالا اور اس کے بعد آپ کے شاگردوں نے اسے چلایا۔

کوفہ کے بعد وسط ایشیا اور برصغیر مدارسِ اسلامیہ سے بھر گیا، سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب ہندوستان فتح کیا تو ہزاروں مدارس ان علاقوں میں قائم کئے، مغل بادشاہوں نے بڑھ چڑھ کر مدارس کے قیام میں حصہ لیا حتیٰ کہ عورتوں نے بھی مدارس بنائے اور چلائے، مدرسۃ النساء میں ایک ہزار عورتوں نے حفظ قرآن کیا پھر سلطنت عثمانیہ نے مدارس کا سرکاری طور پر اہتمام کیا اور ہر طرف دینی مدارس کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

ترقی کے بعد زوال:

چونکہ یہ مدارس حکومت کی سرپرستی میں چلتے تھے لہٰذا جب اسلامی خلافت کمزور پڑ گئی اور سلطنت عثمانیہ زوال پذیر ہو گئی تو مدارس بھی گھٹ گئے اور جب خلافت بالکل ختم ہو گئی اور انگریز برصغیر پر قابض ہو گیا تو تقریباً مدارس کا وجود ختم ہو گیا، عرب حکمرانوں نے اسکول و کالج کے ساتھ اسلامی مدارس کو جوڑ دیا اور آزاد مدرسے ختم ہو گئے اس لئے آزاد علماء کا پیدا ہونا بھی ختم ہو گیا۔

اسی مایوسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو علمی درسگاہ مدرسہ عالیہ اسلامیہ دیوبند کے نام سے قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور آپ نے ایک آزاد اسلامی مدرسہ قائم فرمایا اور لکھا کہ جب تک یہ مدرسہ عام مسلمانوں کے چندوں سے چلے گا یہ ترقی کرتا رہے گا، چنانچہ الحمدللہ آج تک یہ مدرسہ کسی شخص یا حکومت کے احسان کے نیچے دبا ہوا نہیں ہے لہٰذا اس سے آزاد علماء پیدا ہو رہے ہیں جو حق کا خوب اعلان کرتے ہیں، عرب کو یہ چیز میسر نہیں، دیوبند کے طرز پر الحمدللہ اب ہزاروں مدرسے ہندوستان، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک میں قائم ہو گئے، اب انگریز ظالم پھر پریشان ہو گیا کہ یہ مدارس کیوں چل رہے ہیں؟ حالانکہ اس ظالم نے پہلے خود ان مدارس اور مساجد میں علماء کو محدود کر کے رکھا اور معاشرہ میں علماء کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑی تاکہ یہ علماء ان مساجد و مدارس میں بھوکے مر جائیں مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں مدارس میں علمائے کرام کو ترقی عطا فرمائی، اب یہ ظالم انگریز علماء کو مساجد و مدارس سے بھی نکالنا چاہتے ہیں مگر انشاء اللہ جس طرح انگریز ذلیل و خوار ہو کر برصغیر اور پھر افریقی ممالک سے نکل کر بھاگ گیا ہے اور اب لندن و برطانیہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے یہ اس سے زیادہ محدود ہو جائے گا اور دینی مدارس ترقی کرتے رہیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

مورخہ ۱۸ شوال ۱۴۰۹ھ دوسرا سبق

① صحة النية فی العلم:

قَالَ اللہ تعالیٰ: وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین۔ (سورۃ البینۃ ۵)

ترجمہ: ”اور ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ خالص اللہ کی عبادت کرو“۔

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ دین اسلام کا کوئی عمل صحیح نیت کے بغیر مقبول نہیں، ہر نیک عمل پر ثواب اس وقت مرتب ہوتا ہے جبکہ اس میں نیت خالص اللہ کی رضا کی ہو، اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جو عمل اچھی نیت کے ساتھ ہو وہ پائیدار ہوتا ہے خواہ چھوٹا عمل ہی کیوں نہ ہو اور جس عمل میں اخلاص نہ ہو وہ پائیدار نہیں ہوتا اگرچہ وہ بڑا عمل ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے نیک ارادے سے صفاء مروہ کے درمیان ایک دوڑ لگائی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا قبول فرمایا کہ قیامت تک کے آنے والے حاجیوں پر لازم قرار دے دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے منیٰ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے شیطان پر کنکریاں ماری تھیں، اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو تمام حاجیوں پر واجب کر دیا، یہ اخلاص کی علامت اور نتیجہ ہے، لہٰذا علم دین شروع کرنے سے پہلے نیت کو خالص رکھنا نہایت ضروری ہے۔

کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: **"انما الاعمال بالنیات"** کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ **"تعلیم المتعلم"** میں ایک حدیث مذکور ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بہت سارے اعمال ظاہری شکل سے دنیاوی لگتے ہیں مگر اچھی نیت کی وجہ سے وہ آخرت کے اعمال بن جاتے ہیں اور بہت سارے اعمال ایسے ہیں جو ظاہری صورت میں آخرت کے اعمال دکھائی دیتے ہیں مگر بری نیت کی وجہ سے وہ دنیوی عمل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

صحیح نیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک طالب علم یہ نیت کرے کہ میں یہ علم حضور اکرم ﷺ کی نیابت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور دین اسلام کی اشاعت و ترقی کے لئے پڑھتا ہوں۔

سلف صالحین کے زمانے میں نیت کی خرابی کا خطرہ زیادہ ہوتا تھا اس لئے کہ اس وقت دنیاوی مناصب اور دنیا کے عہدے سب علم دین کی وجہ سے ملتے تھے، جو آدمی زیادہ بڑا عالم ہوتا تھا وہ حکومت کے زیادہ بڑے منصب پر فائز ہوتا تھا، خلیفہ ہونا، وزیر، گورنر اور قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بننا اسی علم دین سے وابستہ تھا تو نیتوں میں فتور آنے کا امکان زیادہ تھا، چنانچہ مدرسہ نظامیہ کے نام سے ایک مدرسہ تھا جو وقت کے بادشاہ نے سرکاری طور پر قائم کیا تھا جس میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بھی طالب علم تھے، بادشاہ وقت بھیس بدل کر آئے اور ہر طالب علم سے پوچھا کہ سچ بتاؤ علم پڑھنے سے تمہارا مقصود کیا ہے؟ ہر ایک نے اپنا مقصود بتایا، کسی نے کہا علم پڑھ کر وزیر بنوں گا، کسی نے کہا گورنر بنوں گا، کسی نے کہا قاضی اور جج بنوں گا۔ الغرض ہر ایک نے دنیوی مناصب میں سے کسی نہ کسی منصب کا ذکر کیا، بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا میں تو چاہتا ہوں کہ اس مدرسے کو تالا لگا کر بند کر دوں کیونکہ یہاں تو سب دنیوی غرض لے کر پڑھنے آئے ہیں پھر آخر میں بادشاہ نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ بتاؤ اس علم پڑھنے سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ اس نے کہا میں **"نیابة عن رسول الله ﷺ"** اس دین کی خدمت کروں گا، بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ بس اب مدرسہ جاری رہے گا کیونکہ اگر ایک طالب علم بھی اس اچھی نیت کی بنیاد پر پڑھ رہا ہے تو ہمارا سال بھر کا خرچ ضائع نہیں جائے گا، یہ طالب علم غزالی تھے جو بعد میں امام غزالی کے نام سے مشہور ہوئے جس پر سال بھر کا خرچہ کرنا واقعی مناسب تھا۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ پہلے زمانے میں نیتوں میں خرابی کا امکان زیادہ تھا، آج کل تو علوم دینیہ پڑھنے والوں کی نیتیں خود بخود

درست ہو جاتی ہیں کیونکہ اس علم کے ساتھ حکومتی سطح پر کوئی منصب وابستہ نہیں ہے بلکہ جو جتنا زیادہ پڑھے گا اتنا ہی زیادہ حکومت کے مناصب سے دور ہوتا جائے گا، آج کل اگر کوئی طالب علم اپنی نیت خراب رکھتا ہے تو وہ صرف امامت وخطابت کی امید پر یا اپنے والد کی جگہ اہتمام یا نظامت وامامت یا دیگر معمولی سے کاموں کی وجہ سے نیت خراب کرے گا جس میں دو تین ہزار تنخواہ کے سوا کچھ نہیں اور مشقت بہت ہے، اگر یہی طالب علم دین اسلام کی خدمت کا ارادہ دل میں رکھے تو اللہ تعالیٰ یہ حقیر دنیا بھی اس کو عطا کرے گا اور دین کے لئے بھی اسے قبول فرمادے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سچ فرمایا۔

مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِلْمَعَادِ
فَازَ بِفَضْلٍ مِّنَ الرَّشَادِ
فَيَا لِخُسْرَانِ طَالِبِيْهِ
لِنَيْلِ فَضْلٍ مِّنَ الْعِبَادِ

"جس نے آخرت کے لئے علم پڑھا وہ ہدایت و رہنمائی میں خوب کامیاب ہوا اور وہ طلبہ کتنے ہی خسارے میں پڑ گئے جو بندوں سے حصول مال کے لئے علم پڑھتے ہوں"۔

خلاصہ یہ ہے کہ طالب علم کو چاہیئے کہ وہ خوب سوچ کر یہ دیکھے کہ ان کی یہ بڑی محنت کہیں حقیر و ذلیل دنیا کی بھینٹ تو نہیں چڑھ رہی ہے۔ "انما الاعمال بالنیات" کی حدیث سب کو معلوم ہے کہ ہجرت جیسا عظیم عمل نیت کی خرابی سے کس طرح خراب ہوا۔

طالب علم کو یہ بھی چاہیئے کہ وہ کسی کے سامنے اپنی عزت نفس کو پامال نہ کرے اور بے جا لالچ اور حرص سے اپنے علمی سفر کو تباہ نہ کرے بلکہ عزت وعظمت اور سنجیدگی اور وقار اور استغناء سے وقت گزارے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے "عَظِّمُوْا عَمَائِمَكُمْ وَوَسِّعُوْا أَكْمَامَكُمْ" یعنی اپنی پگڑیاں بڑی رکھو اور کرتوں کی آستین کھلی رکھو۔
(تعليم المتعلم)

یہ اس لئے فرمایا تا کہ طالب علم اور عالم عوام الناس میں باوقار معلوم ہوں نہ کہ محتاج اور لالچی وحقیر، اسی طرح صحت نیت کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم اس لئے علم حاصل نہ کرے کہ میں لوگوں کے ہاں مرجع بن جاؤں گا، سب لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف موڑ دوں گا یا علامۃ الدھر اور فقیہ العصر کے نام سے مشہور ہو جاؤں گا، یہ سب تباہی کی چیزیں ہیں، نیت صحیح رکھے گا تو دنیا وآخرت دونوں سنور جائیں گی۔

❷ جهد العلم:

کسی بھی علم کے لئے اس میں محنت بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اگر کوئی طالب علم بہت اچھی نیت رکھتا ہے مگر محنت نہیں کرتا ہے تو وہ حصول علم کے مقصد کو نہیں پا سکتا، گویا مقصود تک پہنچنے کے لئے جس طرح صحیح نیت کی ضرورت ہے اسی طرح صحیح محنت کی بھی ضرورت ہے، صرف محنت بغیر نیت کے یا صرف صحیح نیت بغیر محنت کے دونوں صورتیں ناکامی کی ہیں، اس لئے ہر طالب علم پر

لازم ہے کہ وہ صحیح نیت کے ساتھ ساتھ بھرپور محنت کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی" کہ میں کسی کا عمل اور محنت ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو"۔

اسی طرح احادیث مقدسہ میں بھی محنت و مشقت کی بڑی ترغیب اور فضیلت موجود ہے، قرآن کریم میں ہے: "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" ایک جگہ ارشاد ہے: "یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ" اسی طرح اس امت کے حکماء اور عقلاء اور علماء نے فرمایا ہے کہ "مَنْ طَلَبَ شَيْئًا وَجَدَّ وَجَدَ، وَمَنْ قَرَعَ الْبَابَ وَلَجَّ وَلَجَ" یعنی جو شخص محنت کرتا ہے وہ اپنا مقصود پالیتا ہے۔ اس جملہ کو اس طرح مختصر بھی پڑھا جاسکتا ہے "مَنْ جَدَّ وَجَدَ، وَمَنْ قَرَعَ الْبَابَ وَلَجَ"۔ یہ بھی حکماء نے لکھا ہے: "بِقَدْرِ مَا تَتَعَنّٰى تَنَالُ مَا تَتَمَنّٰى"۔ یعنی جتنی محنت ہوگی اسی قدر مقصود حاصل ہوگا۔ بعض حکماء نے لکھا ہے: "اِتَّخِذَ اللَّيْلَ جَمَلاً تُدْرِكْ بِهٖ اَمَلاً"۔ یعنی پوری رات محنت کرو مقصود پالو گے، کسی شاعر نے کہا:

اَلْجِدُّ يُدْنِيْ كُلَّ اَمْرٍ شَاسِعٍ
وَالْجِدُّ يَفْتَحُ كُلَّ بَابٍ مُغْلَقٍ

"یعنی محنت ہر مشکل اور بعید کام کو قریب کرتی ہے اور ہر بند دروازے کو کھول دیتی ہے"۔

بعض نے یہ شعر کہا ہے:

تَمَنَّيْتَ اَنْ تُمْسِيَ فَقِيْهًا مُنَاظِرًا
بِغَيْرِ عَنَاءٍ وَالْجُنُوْنُ فُنُوْنُ
وَلَيْسَ اكْتِسَابُ الْمَالِ دُوْنَ مَشَقَّةٍ
تَحَمَّلُهَا فَالْعِلْمُ كَيْفَ يَكُوْنُ

"یعنی کمال کے حصول کی تمنا بغیر محنت کے پاگل پن ہے اگر مال بغیر محنت حاصل نہیں ہوسکتا ہے تو علم کیسے حاصل ہوگا؟"

طالب علم کا رات بھر جاگنا کامیابی کے لئے بہت ضروری ہے یعنی رات کے اکثر حصے سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

شاعر نے کہا:

بِقَدْرِ الْكَدِّ تُكْتَسَبُ الْمَعَالِيْ
وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰى سَهِرَ اللَّيَالِيْ
تَرُوْمُ الْعِزَّ ثُمَّ تَنَامُ لَيْلاً
يَغُوْصُ الْبَحْرَ مَنْ طَلَبَ اللَّآلِيْ
وَمَنْ رَامَ الْعُلٰى مِنْ غَيْرِ كَدٍّ
أَضَاعَ الْعُمْرَ فِيْ طَلَبِ الْمُحَالِ

”یعنی محنت کے حساب سے بلندی ملتی ہے اور اس کے لئے راتوں کو جاگنا پڑتا ہے، تم مقام حاصل کرنا چاہتے ہو اور پھر راتوں کو سوتے بھی ہو حالانکہ موتی تلاش کرنے والا سمندر میں غوطہ لگاتا ہے جو شخص بغیر محنت کے مقام چاہتا ہے وہ فضول وقت ضائع کرتا ہے“۔

محنت کے میدان میں یہ بھی ضروری ہے کہ طالب علم درس میں حاضری دے، غور سے سنے اور رات کو خوب مطالعہ کرے گویا مطالعہ واجب ہے، درس کی حاضری فرض ہے اور غور سے سننا سنت ہے۔ پھر جو کچھ پڑھا اس کا بار بار تکرار کرے، علماء نے لکھا: ”اَلدَّرْسُ حَرْفٌ وَالتَّكْرَارُ اَلْفٌ“ اسی طرح محنت کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ہاتھ سے لکھے اور پھر صرف لکھنے اور فوٹو کاپی کرنے پر اکتفانہ کرے بلکہ یاد کرے، علماء نے لکھا ہے کہ ”اَلْعِلْمُ صَيْدٌ وَالْكِتَابَةُ قَيْدٌ“ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”اِسْتَعِنْ بِيَمِيْنِكَ“ بعض حکماء نے لکھا: ”مَا كُتِبَ قَرَّ وَمَا حُفِظَ فَرَّ“ یعنی صرف حافظہ پر اعتماد نہ کرو بلکہ لکھ کر یاد کرو تاکہ مکمل حفاظت ہو جائے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ لکھنا اور تکرار کر کے یاد کرنا جس طرح ضروری ہے اسی طرح اپنے لکھے پڑھے کا سمجھنا اور اس کی حقیقت تک پہنچنا بھی ضروری ہے۔ صرف رٹنے رٹانے سے فائدہ نہیں ہوگا، کسی نے کہا ہے: ”حِفْظُ حَرْفَيْنِ خَيْرٌ مِّنْ سِمَاعِ وِقْرَيْنِ وَفَهْمُ حَرْفَيْنِ خَيْرٌ مِّنْ حِفْظِ وِقْرَيْنِ“ یعنی دو بنڈل علم سننے سے دو حرف یاد کرنا زیادہ بہتر ہے اور دو بنڈل یاد کرنے سے دو حرف کا سمجھنا زیادہ بہتر ہے۔

علمی محنت یہ بھی ہے کہ علمی مجلس میں آپس میں علمی مباحثہ اور مناظرہ ہو، اس سے علم پختہ ہو جاتا ہے، کسی نے کہا ہے: ”مُطَارَحَةُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ تَكْرَارِ شَهْرٍ“ علمی محنت یہ بھی ہے کہ طالب ہر کہہ ومہہ سے چھوٹا بڑا مسئلہ بغیر شرم و عار کے معلوم کیا کرے۔ کسی نے کہا:

تَعَلَّمْ　يَا　فَتٰى　وَالْجَهْلُ　عَارٌ
وَلَا　يَرْضٰى　بِهٖ　اِلَّا　الْحِمَارُ

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ”اَلْعِلْمُ عِزٌّ لَا ذُلَّ فِيْهِ وَيُحَصَّلُ بِالذُّلِّ لَا عِزَّ فِيْهِ“ آپ نے یہ بھی فرمایا: ”اَلْعِلْمُ لَا يُعْطِيْكَ بَعْضَهٗ حَتّٰى تُعْطِيَهٗ كُلَّكَ“۔ آپ نے یہ بھی فرمایا جب کسی نے پوچھا: ”بِمَ اَدْرَكْتَ الْعِلْمَ؟ قَالَ مَا اسْتَنْكَفْتُ مِنَ الْاِسْتِفَادَةِ وَمَا بَخِلْتُ بِالْاِفَادَةِ“۔

علمی محنت میں یہ بھی آتا ہے کہ آدمی اپنی محنت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کیونکہ کسی نعمت پر شکر ادا کرنا اس نعمت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ”اِنَّمَا اَدْرَكْتُ الْعِلْمَ بِالْحَمْدِ وَالشُّكْرِ“ علمی محنت کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم کاہلی سستی اور کسل سے بچتا رہے۔ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اِنَّ اللهَ يُحِبُّ مَعَالِيَ الْاُمُوْرِ وَيَكْرَهُ سَفْسَافَهَا۔

وَقَالَ اَبُوْ حَنِيْفَةَ لِاَبِيْ يُوْسُفَ: اِيَّاكَ وَالْكَسَلَ فَاِنَّهٗ شُؤْمٌ وَآفَةٌ۔ کسی نے خوب فرمایا ہے:

دَعِیْ نَفْسِیْ التَّکَاسُلَ وَالتَّوَانِیْ
وَاِلَّا فَاثْبُتِیْ دَارَ الْھَوَانِ

فَلَمْ اَرَ لِلْکُسَالٰی الْحَظَّ یُعْطٰی
سِوٰی نَدَمٍ وَّحِرْمَانِ الْاَمَانِیْ

علمی محنت کا حصہ یہ بھی ہے کہ ماہرفن استاد کو تلاش کیا جائے اور پھر جم کر اسی کے پاس پڑھے، یہ نہیں کہ آج ادھر ہے کل ادھر اور شیطان اس کو ورغلاتا رہے کہ وہاں بہتر ہے، وہاں بہتر، ایسے گھومنے والے طالب کے ورغلانے والے شیطان کا نام "شُمُ الْخَیر" ہے کہ وہاں بہتر ہے، وہاں بہتر ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "ثَبَتُّ عِنْدَ حَمَّادٍ فَنَبَتُّ" آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حصول علم کے لئے یکسوئی ضروری ہے، پوچھا گیا کہ یکسوئی کیسے آئے گی؟ فرمایا سارے تعلقات ختم یا کم سے کم کردو، کسی نے سچ کہا: مَنْ فَرَّ فَقَدْ غَرَّ۔

اسی طرح ایک استاد کے پاس اور ایک مدرسہ میں مختلف حالات اور مصائب پر صبر کرے کیونکہ عقلاء نے لکھا ہے:

"خَزَائِنُ الْمِنَنِ عَلٰی قَنَاطِرِ الْمِحَنِ۔"

کسی نے حصول مطلوب اور حصول علم کے لئے چھ اشیاء کو شرط قرار دیا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے:

اَلَا لَا تَنَالُ الْعِلْمَ اِلَّا بِسِتَّۃٍ
سَاُنْبِیْکَ عَنْ مَجْمُوْعِھَا بِبَیَانٍ

ذَکَاءٌ وَّحِرْصٌ وَّاصْطِبَارٌ وَّبُلْغَۃٌ
وَاِرْشَادُ اُسْتَاذٍ وَّطُوْلُ زَمَانٍ

شیخ الاسلام علامہ سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے طلبہ کو ایک دفعہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کہ جس طالب علم کا مزاج جس فن سے زیادہ مناسبت رکھتا ہو اس کو اسی میں کمال پیدا کرنا چاہیئے، پھر فرمایا کہ تم چاہتے ہو کہ تمام فنون میں کمال پیدا کرلو تو تمام فنون کے کمال سے محروم رہ جاتے ہو اور پھر کہتے ہو معاشرہ ہماری قدر نہیں کرتا تم ایک فن میں کمال حاصل کرو پھر دیکھو کہ معاشرہ کس طرح تم کو ہاتھوں ہاتھ لے کر سر پر اٹھاتا ہے۔

اس لئے بعض عقلاء نے کہا کہ "کمال" چار حروف پر مشتمل ہے اور اسی کمال کے اندر مال ہے یعنی کاف کو ہٹاؤ تو مال رہ جاتا ہے۔ محنت کا حصہ یہ بھی ہے کہ اگر ایک ہزار مرتبہ کوئی مسئلہ سنا ہوا ہے اور پھر سننے کا موقع ملے تو غور سے سنے ورنہ ناقدری ہوگی۔

مورخہ ۱۹ شوال ۱۴۰۹ھ

۳ ادب العلم:

یہ بات یاد رکھیں کہ علم بغیر ادب اور بغیر تعظیم کے حاصل نہیں ہوسکتا اور اگر کسی کو ذہن وحافظہ کے زور پر حاصل ہو بھی گیا تو وہ علم بارآور اور بابرکت نہیں ہوتا، اسی لئے کسی نے کہا ہے:

"مَا وَصَلَ مَنْ وَصَلَ اِلَّا بِالْحُرْمَةِ وَمَا سَقَطَ مَنْ سَقَطَ اِلَّا بِتَرْكِ الْحُرْمَةِ".

استاد کا احترام اور تعظیم علم کے آداب میں داخل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اَنَا عَبْدُ مَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفًا وَّاحِدًا اِنْ شَاءَ بَاعَ وَاِنْ شَاءَ اَعْتَقَ وَاِنْ شَاءَ اِسْتَرَقَّ".

اسی لئے کہا گیا ہے کہ:

رَأَیْتُ اَحَقَّ الْحَقِّ حَقَّ الْمُعَلِّمِ
وَوَاجِبُهٗ حِفْظًا عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٖ
لَقَدْ حُقَّ اَنْ یُّهْدٰی اِلَیْهِ کَرَامَةً
بِتَعْلِیْمِ حَرْفٍ وَاحِدٍ اَلْفُ دِرْهَمٖ

استاد کا ادب یہ بھی ہے کہ ان سے آگے نہ چلے، ان کی خاص جگہ پر نہ بیٹھے، ان کی اولاد کی قدر کرے اور استاد کے ساتھ زیادہ باتیں نہ کرے۔

آداب علم میں کتاب کا ادب بھی شامل ہے پس طالب علم کو چاہیے کہ وہ کسی کتاب کو بغیر وضو کے نہ پڑھے۔ امام شمس الائمۃ حلوانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اِنَّمَا نِلْتُ الْعِلْمَ بِالتَّعْظِیْمِ فَاِنِّیْ مَا اَخَذْتُ الْکَاغَذَ اِلَّا بِالطَّهَارَةِ".

کیونکہ علم نور ہے اور وضو بھی نور ہے تو نور سے نور میں اضافہ ہوتا ہے، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق منقول ہے کہ کبھی کوئی اردو رسالہ بھی بغیر وضو کے نہیں چھوا۔

ادبِ کتاب یہ بھی ہے کہ اس پر سر نہ رکھے، نہ اسے تکیہ بنائے، نہ اسے زمین پر رکھے اور نہ کتاب کے اوپر کوئی سامان رکھے۔ کہتے ہیں کہ ایک طالب علم نے کتاب پر سیاہی کی دوات رکھی تھی تو استاد نے فارسی میں کہا "بر نیابی" یعنی کوئی پھل حاصل نہیں کرسکو گے۔ کتاب کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اس پر لکھ کر خراب نہ کرے، ادب العلم میں یہ بھی ہے کہ اپنے ساتھیوں کا احترام کرے، اپنی درسگاہ اور بیٹھنے کی جگہ کا احترام کرے، مدرسہ کا احترام کرے اور مدرسہ سے قلبی تعلق اور قلبی

محبت رکھے، علماء نے لکھا ہے کہ استاد کے احترام سے درس وتدریس اور علم میں برکت آتی ہے اور والدین کے احترام سے عمر اور رزق میں برکت آتی ہے۔

④ العمل بالعلم:

علم حاصل کرنے کا مقصد اس پر عمل کرنا ہے کیونکہ بغیر علم کے عمل کا حال ایسا ہوگا جیسا ایک عارف کا مقولہ ہے کہ: عِلْمٌ بِلَا عَمَلٍ كَشَجَرٍ بِلَا ثَمَرٍ اور کسی نے کہا ہے:

فَسَادٌ كَبِيْرٌ عَالِمٌ مُتَهَتِّكٌ
وَاَكْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَسِّكٌ

یعنی حدود شریعت کو پامال کرنے والا عالم بہت بڑا فتنہ ہے لیکن عبادت گزار جاہل اس سے بھی بڑا فتنہ ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے: "هَتَفَ الْعِلْمُ بِالْعَمَلِ اِنْ اَجَابَ وَاِلَّا فَارْتَحَلَ" کہ علم پہلے آکر عمل کو پکارتا ہے، اگر عمل آگیا تو ٹھیک ورنہ علم کوچ کر کے چلا جائے گا، ایک روایت میں آیا ہے: "مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" ان آثار وروایات کو دیکھ کر ہر طالب پر لازم ہے کہ وہ اپنے علم پر عمل کرے ورنہ بے عمل علم سے نبی کریم ﷺ نے اس طرح پناہ مانگی ہے: "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ۔"

صاحب "تعلیم المتعلم" نے کسی کی روایت نقل کی ہے کہ جو طالب علم زمانہ طالب علمی میں تقویٰ اختیار نہیں کرتا ہے (اور معصیت میں لگا رہتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کو تین مصیبتوں میں سے کسی ایک میں مبتلا کرتا ہے:

① یا جوانی میں موت آجائے گی۔ ② یا اس کو دیہاتوں اور غیر آباد جگہوں میں ڈال دیتا ہے۔

③ اور یا اس کو کسی حاکم اور گورنر وزیر کا چپراسی اور خادم بنا دیتا ہے۔ یہ روایت کسی تجربہ کار اللہ والے کا قول ہے، علماء نے کہا کہ جب طالب علم فرائض کو پورا کرتا ہے اور کبائر سے بچتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہے اگرچہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ یہ ولی ہے۔

طالب علم کی پرہیزگاری کے لئے یہ چیز لازم ہے کہ وہ کم کھائے، کم سوئے، کم بولے، بازار کا کھانا نہ کھائے، قبلہ کی طرف بغیر ضرورت پیٹھ نہ کرے، فتنہ پرداز اہل معاصی کے پاس نہ بیٹھے اور ترک سنن سے اجتناب کرے کیونکہ جو شخص مستحب میں سستی کرتا ہے اس سے سنت چھینی جاتی ہے اور جو سنن میں سستی کرتا ہے وہ واجبات سے محروم کیا جاتا ہے اور جو واجب کو چھوڑتا ہے اس کو فرائض سے محروم کیا جاتا ہے اور جو شخص فرائض میں سستی کرتا ہے وہ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد سے حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی تو استاد نے نسخہ بتا دیا فرمایا:

شَكَوْتُ اِلٰى وَكِيْعٍ سُوْءَ حِفْظِيْ
فَاَوْصَانِيْ اِلٰى تَرْكِ الْمَعَاصِيْ

فَاِنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ مِّنْ اِلٰهٖ
وَنُوْرُ اللّٰهِ لَا يُعْطٰى لِعَاصِيْ

حافظہ کی قوت کے لئے سب سے عمدہ نسخہ قرآن کریم کی تلاوت ہے مگر دیکھ کر تلاوت ہو، زیادہ مسواک کرنا، شہد پینا اور ''کندر'' یعنی شکر کے ساتھ چیڑ کھانا، نہار منہ کشمش اور منقیٰ کھانا، نہار منہ کشمش خاص منہ کھانا۔

حافظہ کو نقصان دینے والی چیزیں بہت ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

زیادہ گناہ کرنا، دنیا کا غم کرنا، زیادہ تعلقات رکھنا اور ہر وہ چیز کھانا جو بلغم پیدا کرتی ہو، ہرا دھنیا کھانا، ترش سیب کھانا، سولی پر لٹکائے ہوئے مردے کو دیکھنا، قبروں کی تختیوں کو پڑھنا اور زندہ جوئیں زمین پر پھینکنے وغیرہ سے حافظہ کا نقصان ہوتا ہے۔

یہ چند آداب تھے، یہ دو دن کا درس ہوتا ہے، میں نے کچھ تفصیل سے اس لئے لکھ دیا کہ یہ طلباء کے لئے مفید تر ہے، اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔(اکثر باتیں "تعلیم المتعلم" میں موجود ہیں)۔

طبقات المحدثین بحسب تدوینہم

۹۱ھ کے قرب وجوار میں بصرہ میں سب سے آخر میں صحابی رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، اس وقت عالم دنیا پر ان کے علاوہ صرف پانچ صحابہ موجود تھے۔ ۹۹ھ میں خلیفہ عادل وصالح حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے، آپ نے محسوس کیا کہ صحابہ کرام دنیا سے اٹھ کر چلے گئے ہیں اور کبار تابعین بھی جارہے ہیں اس لئے ان کو خوف ہوا کہ کہیں احادیث مبارکہ کا مقدس علم ان کے ساتھ قبروں میں نہ چلا جائے۔

دوسری طرف خوارج وروافض اور قدریہ کے ہر قسم کے فتنے سر اٹھا رہے تھے، اس نازک موقع پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث مقدسہ کو جمع کرنے اور اسے لکھنے کے لئے ایک سرکاری فرمان کے ذریعہ علمائے کرام کے نام ایک خط جاری کیا چنانچہ مدینہ منورہ کے قاضی ابوبکر بن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے نام آپ نے لکھا:

"انظر ما کان من حدیث رسول اللہ ﷺ فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء"۔

(بخاری)

"یعنی نبی اکرم ﷺ کی جو حدیث مل جائے اسے لکھ لو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے اٹھنے کا خوف لاحق ہو گیا ہے"۔

اس قسم کا ایک خط خلیفہ عادل نے امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ کے نام بھی لکھا اور امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی لکھا تھا، ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کو جمع کیا، امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اکٹھا کیا اور امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی جمع کر کے ابواب کے انداز سے اکٹھا کیا لہٰذا ہر ایک کو اول مدون کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے، کوئی تعارض نہیں ہے، تینوں حضرات اس ابتدائی مرحلے میں کسی نہ کسی طریقہ سے شریک ہوئے ہیں۔ احادیث مقدسہ کی جمع وتدوین کی یہ پہلی صدی ہے، گویا جامع قرآن امیر المؤمنین عمر اول عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہوئے اور جامع احادیث امیر المؤمنین عمر ثانی عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ہوئے، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ احادیث کی کتابت وتدوین دیر سے ہوئی، اگر دور اول میں سب احادیث لکھی جاتیں تو سب میں قطعیت آجاتی اور قرآن کی طرح ایک کلمہ کو ضعیف کہنے یا انکار کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا، جب احادیث میں ظنیت آگئی تو امت اس خطرہ سے بچ گئی اور بحث میں وسعت پیدا ہوگئی۔

دوسری صدی کی تصنیفات:

دوسری صدی میں پہلی تصنیف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ولادت ۸۰ھ المتوفی ۱۵۰ھ کی کتاب الآثار ہے جو جامع کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مدرسہ میں بیٹھ کر چالیس ہزار احادیث وآثار سے انتخاب کر کے آپ نے تصنیف فرمائی اور فقہی ابواب کے طرز پر مستند احادیث وآثار پر مشتمل کتاب ترتیب دی، یاد رہے کہ فقہی ابواب اور سنن کے طرز پر یہ اسلام میں پہلی تصنیف ہے، امام دار الھجرۃ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مؤطا میں بھی اس کتاب سے استفادہ کیا ہے کذا قال السیوطی فی تبییض الصحیفۃ۔ نیز امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الآثار میں زیادہ تر روایات

اسی سے لی ہیں پھر اسی صدی میں امام مالک رحمہ اللہ نے موطا مالک تصنیف فرمائی، یہ احادیث و آثار اہل مدینہ اور ان کے فتاوی پر مشتمل عظیم ذخیرہ ہے، امام ابوزرعہ رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اگر کوئی طلاق کی قسم کھائے کہ موطا مالک صحیح ذخیرہ ہے تو وہ حانث نہیں ہوگا۔

اسی صدی میں حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کی تصنیف جامع سفیان ثوری ہے جو آپ نے ۱۹۰ھ میں تالیف کی ہے، اسی صدی میں ابن مروزی کی کتاب الزہد والرقاق ہے جو ۱۸۱ھ کے قرب و جوار میں تصنیف ہوئی ہے، اسی صدی کی تصنیف موطا امام محمد المتوفی ۱۸۹ھ کی ہے جو موطا مالک سے ماخوذ ہے اسی صدی میں مسند ابوداؤد طیالسی وجود میں آئی ہے اور اسی میں مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند حمیدی کی تصنیف عمل میں آئی ہے۔

تیسری صدی کی تصنیفات:

اس صدی میں علم الحدیث اور فن حدیث پر بہت بڑا کام ہوا، فن حدیث کا انتخاب و اختصار ہوا اور جرح و تعدیل کا بہت بڑا میدان قائم ہوا اور صحاح ستہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کی کتابیں منظر عام پر آگئیں، سنن دارمی، کتاب الدعاء لابن ابی الدنیا، مسند حارث بن ابی اسامہ، مسند بزار، مسند ابی یعلی موصلی، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابی عوانہ اور امام طبرانی کی معجم کبیر، معجم صغیر، معجم اوسط اپنی شان کے ساتھ وجود میں آگئیں گویا یہ حدیث اور محدثین کی صدی تھی۔

چوتھی صدی کی تصنیفات:

چوتھی صدی کی تصنیفات میں کتاب صحیح ابن حبان، سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم ہیں۔

پانچویں صدی کی تصنیفات:

اس صدی میں حدیث کی مشہور کتاب سنن بیہقی وجود میں آئی ہے اور بیہقی ہی کی دوسری تصنیف معرفۃ السنن والآثار ہے، حمیدی کی کتاب "الجمع بین الصحیحین" بھی اسی صدی کی تصنیف ہے۔

مراتب کتب الحدیث

یعنی وہ کتاب جن میں سے ہر کتاب کا مقام متعین کر دیا گیا ہو یہ بھی کل پانچ طبقات ہیں۔

پہلا طبقہ:

اس طبقہ میں وہ کتابیں داخل ہیں جس کے متعلق ہم آنکھیں بند کر کے کہیں گے "ھذا صحیح" اور مخالف سے دلیل مانگیں گے کہ کیوں صحیح نہیں ہے؟ اس طبقہ میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا مالک، صحیح ابن حبان، اور صحیح ابی عوانہ ہیں۔

دوسرا طبقہ:

دوسرا طبقہ وہ ہے کہ ہم ان کو صحیح تو نہیں کہہ سکتے ہیں مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قابل استدلال اور صالح للاحتجاج ہیں کیونکہ احتجاج

حسان سے بھی کیا جاسکتا ہے اس طبقہ میں ابوداؤد، ترمذی اور نسائی شامل ہیں۔

تیسرا طبقہ:

وہ ہے کہ ہم نہ اسے صحیح کہیں گے اور نہ غلط بلکہ غور کریں گے کہ کس درجہ کی احادیث ہیں، اس میں مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، ابن ماجہ اور زوائد المسند شامل ہیں یعنی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے نے مسند احمد پر جو اضافہ کیا ہے وہ **زوائد المسند** ہے۔

چوتھا طبقہ:

یہ وہ طبقہ ہے جو اول طبقہ کے بالکل برعکس ہے یعنی ہم آنکھ بند کر کے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے، اس طبقہ میں مسند فردوس دیلمی ہے اور حکیم ترمذی کی نوادر الاصول ہے، یہ وعظ کی کتابیں ہیں، اسی طرح تفسیری روایات وحکایات بھی اس میں داخل ہیں۔

پانچواں طبقہ:

اس طبقہ میں وہ کتب شامل ہیں جو احادیث موضوعہ کے مجموعے ہیں جو اہل بدعت واہواء نے گھڑ لی ہیں ان گھڑی ہوئی روایات سے احادیث کو پاک کرنے کے لئے موضوعات کی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جیسے **الموضوعات الکبیر، اللآلی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعة** وغیرہ وغیرہ۔

پنجشنبہ ۲۳ شوال ۱۴۰۹ھ

حدیث کی تعریف:

الحدیث ضد القدیم لغۃ، حدث یحدث نصر ینصر سے بات کرنے کے معنی میں آتا ہے نیز "حادثہ" کسی نئے واقعے کے پیش آنے کو بھی کہتے ہیں، اور "تحادث وتحدث" گفتگو کے معنی میں آتا ہے، احدث احداثاً نیا کام پیدا کرنا، "التحدیث" دوسرے تک بات پہنچانا اور روایت کرنا، کہا جاتا ہے "**رجل حدیث الملوك**" یعنی بادشاہوں کی مجالس میں باتیں اور قصے بیان کرنے والا۔ "**حدثان الدهر ای وقائعه، حداثة السن**" یعنی نو عمر ہونا بہرحال حدیث کے لغوی معنی میں ایجاد اور ضد قدیم کا مفہوم پڑا ہوا ہے، حدیث کی جمع احادیث ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ حدیث کو حدیث اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام قدیم ہے اور نبی اکرم ﷺ کا کلام حادث ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ لفظ حدیث قرآن کریم کی آیت "**وأما بنعمة ربك فحدث**" سے لیا گیا ہے، نبی کریم ﷺ نے بھی ایک دفعہ قصہ سناتے ہوئے فرمایا "**حدثنی تمیم الداری**" مجھے تمیم داری نے بیان کیا ہے۔ اس لغوی تحقیق کے بعد حدیث کی اصطلاحی تعریف سے متعلق پہلے یہ سمجھ لیں کہ حدیث کے دو فن اور دو علوم ہیں، دونوں کی الگ الگ تعریف، موضوع اور غرض وغایت ہیں۔

ایک علم الحدیث روایۃً ہے اور دوسرا علم الحدیث درایۃً ہے، لوگوں کو دونوں کی تعریف وغرض میں کبھی شبہ لاحق ہوجاتا ہے اور دونوں کی تعریفیں خلط ملط ہوجاتی ہیں اس لئے الگ الگ تعریفات ملاحظہ ہوں۔

علم الحدیث روایۃً کی تعریف:

"ھو علم مشتمل علی ما اضیف الی رسول اللہ ﷺ سواء کان فعلًا او قولًا أو تقریرًا أو صفة۔"

صفت کا مطلب یہ ہے کہ صحابی نے نبی اکرم ﷺ کی صفات بیان کر کے کہا کہ آپ اس طرح حسین تھے، احسن اخلاق کے مالک تھے، اس تعریف کے اعتبار سے علم حدیث کا موضوع یہ ہے۔

موضوعه:

"ذات الرسول من حیث انه رسول"۔

حیثیت رسول کے لفظ سے فن طب سے امتیاز آگیا کیونکہ وہاں ذات انسان سے بحث ہوتی ہے۔

غرضه:

علم الحدیث روایۃً کی دو غرض خاص ہیں اور ایک غرض عام ہے۔

غرض خاص نمبر ایک یہ ہے کہ "الاحتراز عن الخطاء فیما اضیف الی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم"۔

اور غرض خاص نمبر دو اس طرح ہے۔ "معلومیة کیفیة الاقتداء بالرسول صلی اللہ علیه وسلم"۔

اور غرض عام اس طرح ہے "ھو الفوز والسعادة فی الدارین"۔

تعریف میں "ما اضیف الی رسول اللہ" کے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ جو اقوال وافعال اور جو احادیث نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب ہیں اس پر مشتمل علم کا نام علمِ حدیث ہے۔

علم الحدیث درایۃً:

علم حدیث درایۃً کی تعریف اس طرح ہے:

"ھو علم یعرف به أحوال المتن والسند صحةً وحسنًا واتصالًا"۔

موضوعه:

"احوال الراوی والمروی وقیل احوال المتن والسند"۔

اس فن کو اصول الحدیث کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کے لئے بھی دو غرض خاص اور ایک عام ہے۔

غرضہ:
غرض خاص نمبر ایک "**تمییز المقبول من المردود**" اور غرض خاص نمبر دو "**تمییز الضعیف من غیر الضعیف**"۔
اور غرض عام "**الفوز والسعادۃ فی الدارین**" ہے۔

حدیث، خبر واثر اور سنت میں فرق

حدیث اور سنت میں ترادف ہے دونوں ایک ہی چیز ہیں اور حدیث وخبر کے متعلق علماء کی دو رائے ہیں:
اول یہ کہ ان دونوں میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے یعنی ہر حدیث خبر ہے مگر ہر خبر کا حدیث ہونا ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا حدیث وہ ہے جو حضور ﷺ کی طرف منسوب ہو تو اس سے موقوف روایت خارج ہوگئی اور خبر وہ ہے جو موقوف اور مرفوع دونوں پر صادق آتی ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر خبر حدیث نہیں بلکہ صرف مرفوع خبر حدیث ہے اور ہر حدیث خبر ہے۔ بعض علماء کے ہاں موقوف اور مرفوع دونوں پر حدیث کا اطلاق ہوتا ہے تو پھر ان کے ہاں ان دونوں میں ترادف ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ حدیث وہ ہے جو آنحضرت ﷺ سے منقول ہو اور جو غیر سے منقول ہو وہ خبر ہے تو اس صورت میں تباین کی نسبت ہوگی۔ اثر کا اطلاق عام طور پر اقوال صحابہ اور اقوال تابعین پر ہوتا ہے لہٰذا اثر حدیث کا مباین ہے لیکن کبھی اس کا اطلاق حدیث مرفوع پر بھی ہوتا ہے جیسے ادعیۂ ماثورہ پھر دونوں میں ترادف ہوگا۔

أنبأنا، اخبرنا اور حدثنا میں فرق

اس سلسلے میں علماء کے دو طبقے ہیں ایک طبقہ مثلاً امام مالک، ابن شہاب زہری، جمہور کوفیین، علماء متقدمین اور علماء مغاربہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے ان حضرات کا خیال ہے کہ جس طرح ان الفاظ میں لغت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے اسی طرح اصطلاح میں بھی کوئی فرق نہیں ہے مگر بعض دوسرے علماء مثلاً امام شافعی، امام اوزاعی اور جمہور مشارقہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں ان الفاظ میں فرق ہے اور وہ اس طرح کہ جب شیخ پڑھ رہا ہو اور تلمیذ سن رہا ہو یا کئی تلامذہ سن رہے ہوں تو جب بعد میں شاگرد بیان کر رہا ہو تو وہ کہے گا حدثنا فلان اور اگر اکیلا ہے تو کہے گا حدثنی فلان، اور جب شاگرد پڑھ رہا ہو اور استاد سن رہا ہو تو بعد میں شاگرد **أنبأنا** اور **اخبرنا** کے الفاظ استعمال کرے گا۔ امام بخاری پہلے طبقے کے ساتھ ہیں جبکہ امام مسلم دوسرے طبقے کا ساتھ دیتے ہیں۔
ان الفاظ کے رسم الخط کا بھی خیال کرنا چاہیے کیونکہ محدثین اس میں اختصار کر کے "ثنا" لکھتے ہیں یہ حدثنا کا مخفف ہے یا "انا" کہتے ہیں یہ اخبرنا وغیرہ کا مخفف ہے۔
بعض جگہوں میں محدثین "ح" کا لفظ لکھتے ہیں یہ تحویل سند کی طرف اشارہ ہے اس کو ح قال وحدثنا پڑھنا چاہیے۔

"متفق علیہ" اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو بخاری و مسلم دونوں نے ایک ہی الفاظ اور ایک ہی صحابی سے نقل کیا ہو، اگر صحابی الگ الگ ہیں تو اگر چہ مضمون والفاظ ایک ہیں وہ حدیث متفق علیہ نہیں ہوگی۔

چند اصطلاحی الفاظ:

اسی طرح محدثین کے ہاں چند اصطلاحی الفاظ شیخ الحدیث کے رتبہ ومقام کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

❶ مسند:

یہ لفظ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو حدیث کو سند کے طور پر بیان کرتا ہو۔

❷ محدث:

یہ لفظ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو احادیث کا قابل ذکر ذخیرہ جانتا ہو اور متن حدیث کے ساتھ ساتھ بطور جرح و تعدیل رواۃ کا علم بھی رکھتا ہو۔

❸ حافظ:

اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو متن اور سند کے ساتھ ایک لاکھ احادیث یاد ہوں۔

❹ حجۃ:

اس شیخ الحدیث کو کہتے ہیں جن کو متن وسند کے ساتھ تین لاکھ احادیث ازبر یاد ہوں۔

❺ حاکم:

یہ اس شخص کے لئے اعزازی ڈگری ہے جس کو تمام ذخیرہ احادیث یاد ہو۔

کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سات لاکھ احادیث کے حافظ تھے اسی طرح امام ابوزرعہ رحمہ اللہ سات لاکھ کے حافظ تھے۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ تین تین لاکھ احادیث کے حافظ تھے۔ اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ پانچ لاکھ احادیث کے حافظ تھے۔

شرائط اخذ حدیث

امام حازمی رحمہ اللہ نے شروط الائمہ میں لکھا ہے کہ رواۃ اور راویوں کے پانچ طبقات ہیں، ان سے احادیث لینے کا ہر محدث کا اپنا اپنا انداز ہے جس نے شرائط میں سختی کی اس کی کتاب کی شان بڑھ گئی۔ وہ طبقات یہ ہیں:

❶ **كثير الضبط والاتقان وكثير الملازمة بالشيخ۔**

یعنی ذہین بھی ہو، حافظہ بھی قوی ہو اور اپنے استاد کے ساتھ طویل عرصے تک رہا ہو۔

❷ **كثير الضبط والاتقان وقليل الملازمة بالشيخ۔**

❸ قليل الضبط والاتقان وكثير الملازمة بالشيخ۔

❹ قليل الضبط والاتقان وقليل الملازمة بالشيخ۔

❺ الضعفاء والمجهولين۔

امام بخاری طبقہ اولیٰ کی احادیث بالاستیعاب لیتے ہیں اور طبقہ ثانیہ سے کبھی کبھی تعلیقاً لیتے ہیں۔ امام مسلم طبقہ اولیٰ وثانیہ سے بالاستیعاب لیتے ہیں اور طبقہ ثالثہ سے کبھی کبھی لیتے ہیں۔ امام ابوداؤد اور امام نسائی طبقہ اولیٰ وثانیہ اور ثالثہ سے بالاستیعاب لیتے ہیں اور طبقہ رابعہ سے کبھی کبھی لیتے ہیں۔ امام ترمذی چاروں طبقات سے بالاستیعاب لیتے ہیں اور کبھی کبھی پانچویں طبقہ سے بھی لیتے ہیں۔ امام ابن ماجہ پانچوں طبقات سے لیتے ہیں اور لے کر خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔

علم حدیث اور محدثین کی فضیلت

سب سے بڑی فضیلت تو خود یہ ہے کہ ایک شیخ الحدیث گھنٹوں گھنٹوں تک نبی اکرم ﷺ کا نام لے کر روزانہ درود کا ورد کرتا رہتا ہے یہ بہت بڑی برکت ہے اس کے ساتھ ساتھ نبی اکرم ﷺ نے محدثین کو خاص ڈگری بھی عطا فرمائی ہے۔ فرمایا:

اللّٰهم ارحم خلفائي قلنا يا رسول الله ومن خلفاءك؟ قال الذين يأتون من بعدي يروون احاديثي ويعلمونها الناس۔ (ترمذی مشکوٰۃ ص ۳۵)

قال عليه الصلوٰة والسلام: نضر الله عبدًا سمع مقالتي فحفظها ووعاها وأداها فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الى من هو أفقه منه۔ (طبرانی اوسط، مجمع الزوائد)

اسی دعا کی برکت سے محدثین عظام کے چہرے تروتازہ اور روشن و بابرکت ہوتے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کے سینۂ اطہر سے اس محدث کے سینہ تک گویا ایک اتصالی زنجیر ہے جس سے ان پر برکات کا نہ ختم ہونے والا نزول جاری رہتا ہے کسی نے کہا:

اصحاب الحديث هم اهل النبي وان
لم يصحبوا نفسه انفاسه صحبوا
ومن عادتي حب النبي وكلامه
وللناس فيما يعشقون مذاهب

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

مورخہ ۲۴ شوال ۱۴۰۹ھ

حدیث کی اقسام وتعریفات

حدیث دوقسم پر ہے: ① خبر متواتر ② خبر واحد۔

خبر متواتر وہ ہے کہ اس کے راوی اتنے کثیر ہوں کہ عقلاً ان کا کذب وجھوٹ پر جمع ہونا محال ہو (یعنی مختلف ممالک میں رہتے ہوں، ایک دوسرے کو نہ دیکھا ہو اور بات ایک ہی نقل کرتے ہوں) اور ان کا علم حس پر منتہی ہوتا ہو (یعنی کہتا ہو کہ میں نے سنا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا اور یہ عمل کیا، عقل سے بات نہ کرتا ہو) خبر متواتر علمِ یقینی کا فائدہ دیتی ہے نیز اس میں کسی خاص تعداد کی قید نہیں ہے۔

تواتر کی قسمیں:

تواتر چار قسم پر ہے:

❶ تواتر طبقہ جیسے نقل قرآن کریم کہ امت کے ایک طبقہ نے دوسرے طبقہ کو دیا ہے اس میں انفرادی راوی نہیں ہوتے ہیں۔

❷ تواتر اسنادی یہ وہ تواتر ہے جو اوپر متواتر کی تعریف میں بیان ہو چکا ہے۔

❸ تواتر عملی جیسے مسواک کا عمل کہ اس میں اخبار آحاد ہیں مگر امت کے عمل نے اس کو متواتر بنا دیا ہے۔

❹ تواتر قدر مشترک کہ فرداً فرداً اخبار آحاد ہیں مگر مجموعی طور پر جو قدر مشترک سامنے آتی ہے وہ متواتر ہے جیسے معجزات النبی ﷺ یا شجاعتِ علی رضی اللہ عنہ یا جود حاتم طائی۔

خبر متواتر کے مقابلے میں خبر واحد ہے پھر خبر واحد مختلف اعتبارات سے پانچ بڑی قسموں پر منقسم ہے۔

خبر واحد کی پہلی تقسیم:

خبر واحد اپنے منتہائے سند کے اعتبار سے تین قسم پر ہے: ① مرفوع ② موقوف ③ مقطوع۔

مرفوع وہ حدیث ہے جس کی نسبت حضور اکرم ﷺ کی طرف کی گئی ہو اور وہ حدیث حضور ﷺ تک پہنچتی ہو وہ مرفوع کہلاتی ہے۔

دوم موقوف ہے یہ وہ حدیث ہے جو صحابی تک جا کر پہنچی ہے جیسے **قال ابن عباس** رضی اللہ عنہ، **قال ابن عمر** رضی اللہ عنہ۔

سوم وہ ہے جو تابعی تک جا کر پہنچتی ہے جیسے **قال الاعمش** رحمہ اللہ، **قال سعید بن المسیب** رحمہ اللہ یہ مقطوع کہلاتی ہے۔

خبر واحد کی دوسری تقسیم:

خبر واحد تعداد رواۃ کے اعتبار سے تین قسم پر ہے: ① مشہور ② عزیز ③ غریب۔

خبر مشہور وہ ہوتی ہے کہ تین اور تین سے زیادہ راوی اس کو بیان کریں مگر حد تواتر تک نہ پہنچے اگر کسی طبقہ میں راویوں کی تعداد

دو تک گر جائے تو پھر وہ حدیث عزیزی کہلاتی ہے کہ ایک نے دوسرے کو کچھ مضبوط، قوی اور عزیز بنا دیا اور اگر کسی طبقہ میں راویوں کی تعداد ایک تک نیچے آگئی تو پھر حدیث غریب کہلاتی ہے یعنی اوپرا، ناآشنا کہ اکیلا ہے کوئی اس کو نہیں جانتا۔ اب اگر پوری سند میں ایک ایک راوی ہے تو یہ غریب مطلق اور فرد مطلق ہے اور اگر صرف ایک جگہ ایک راوی ہے باقی سند میں ایک سے زیادہ ہیں تو اس کو غریب نسبی اور فرد نسبی کہتے ہیں۔ حدیث میں اقلیت حاکم ہوتی ہے اکثریت پر یعنی حکم جانب قلیل پر لگتا ہے، کثیر پر نہیں۔

خبر واحد کی تیسری تقسیم:

خبر واحد اپنے راویوں کی صفات کے اعتبار سے سولہ اقسام پر ہے۔

① صحیح لذاتہ ② صحیح لغیرہ ③ حسن لذاتہ ④ حسن لغیرہ ⑤ ضعیف ⑥ موضوع ⑦ متروک ⑧ شاذ ⑨ محفوظ ⑩ منکر ⑪ معروف ⑫ معلل ⑬ مضطرب ⑭ مقلوب ⑮ مصحف ⑯ مدرج۔

صحیح لذاتہ وہ ہے جس کے تمام راوی کامل الضبط، عادل ہوں، اس کی سند متصل ہو اور علت وشذوذ سے محفوظ ہو۔ اگر راوی کے صرف ضبط میں نقص آگیا ہو باقی صفات مکمل ہوں لیکن اس نقصان کو تعدد طرق نے پورا کیا ہو تو یہ صحیح لغیرہ ہے۔

حسن لذاتہ وہ ہے کہ جس میں ضبط راوی میں نقصان آگیا ہو باقی صفات صحیح کی موجود ہوں۔ صحیح لغیرہ اور حسن لذاتہ ایک ہی چیز ہے، صحیح لغیرہ کو صرف تعدد طرق نے بلند کر دیا ہے۔

ضعیف وہ ہے جس میں صحیح اور حسن کی اعلیٰ صفات نہ ہوں۔

حسن لغیرہ بعینہ ضعیف ہے لیکن تعدد طرق یا قبولیت کے کسی قرینے نے اس کو بلند کیا ہو۔ صحیح لغیرہ اور حسن لغیرہ کی مختصر تعریف یوں ہے کہ صحیح لغیرہ بعینہ حسن لذاتہ ہے صرف تعدد طرق نے اس کو صحیح لغیرہ بنا دیا اور حسن لغیرہ بعینہ ضعیف ہے صرف تعدد طرق نے اس کو حسن لغیرہ بنا دیا ہے۔

یاد رہے کہ صفات قبولیت چار ہیں: عدالت، ضبط، اتصال سند، علت وشذوذ سے خالی ہونا۔

عدالت اس ملکہ کا نام ہے جو انسان کو ارتکاب کبائر اور اصرار علی الصغائر سے بچائے۔ ضبط واتقان یا حفظ دو طرح پر ہوتا ہے: اول حفظ وضبط بالصدر کہ جس سے جس طرح سنا ہے، ادائیگی حدیث کے وقت تک اسی طرح محفوظ ہے۔ دوم حفظ بالکتابۃ کہ لکھنے سے ایسا محفوظ کر لیا جائے کہ وقت ادائیگی تک کسی دخل اندازی کا خطرہ نہ رہے۔

موضوع وہ حدیث ہے جس کے راوی پر حدیث نبوی ﷺ میں عمداً جھوٹ بولنے کا طعن ثابت ہو جائے، اس شخص کی تمام مرویات ناقابل اعتبار ہو جاتی ہیں خواہ یہ توبہ کیوں نہ کر لے، ایسے روای کو وضاع، روایت کو موضوع اور اس عمل کو وضع کہتے ہیں۔

متروک وہ حدیث ہے جس کے راوی پر کذب کی تہمت ہو یا وہ روایت قواعد شرعیہ کے خلاف ہو۔

شاذ وہ ہے جس کا راوی خود ثقہ ہے لیکن وہ اوثق کے خلاف بیان کرتا ہے، اس کا مقابل محفوظ ہے۔

منکر وہ حدیث ہے کہ ضعیف راوی ثقہ کی مخالفت کرتا ہے اس کا مقابل معروف ہے۔

معلل وہ ہے کہ جس میں علتِ قادحہ خفیہ ہو، یہ عیب ماہرین حدیث معلوم کر سکتے ہیں۔
مضطرب وہ حدیث ہے جس کے متن یا سند میں ایسا اختلاف ہو کہ جس میں تطبیق دینا مشکل ہو۔
مقلوب وہ حدیث ہے جس کے متن یا سند میں بھولے سے تقدیم وتاخیر ہوئی ہو۔
مصحف وہ روایت ہے جس کے نقطوں میں یا حرکات سکنات میں تغیر آگیا ہو اگرچہ صورت خطی بحال ہو۔
مدرج وہ ہے جس میں کہیں پر راوی نے اپنا کلام داخل کیا ہو۔

خبر واحد کی چوتھی تقسیم:

خبر واحد سقوط وعدم سقوط راوی کے اعتبار سے سات قسم پر ہے: ① متصل ② مسند ③ منقطع ④ معلق ⑤ معضل ⑥ مرسل ⑦ مدلس۔
متصل وہ حدیث ہے کہ اس کی سند میں مکمل راوی مذکور ہوں۔
مسند وہ حدیث ہے جس کی سند رسول اللہ ﷺ تک متصل ہو۔
منقطع وہ حدیث ہوتی ہے کہ جس کی سند متصل نہ ہو بلکہ کہیں نہ کہیں سے راوی گرا ہو۔
معلق وہ ہے جس کے شروع سے راوی گرا ہو۔ (امام بخاری نے اپنی کتاب میں تعلیقات سے بہت کام لیا ہے)
معضل وہ روایت ہے جس میں درمیان سند سے مسلسل دو یا زیادہ راوی گرے ہوں۔
مرسل وہ ہے جس کے آخر سے راوی گرا ہو۔
مدلس وہ روایت ہے جس میں راوی اپنے استاد کے نام کو چھپا کر روایت کی نسبت کسی اور شیخ کی طرف کرتا ہے۔ یہ عمل تدلیس ہے روایت مدلس (بفتح اللام) ہے اور یہ عمل کرنے والا مدلس (بکسر اللام) ہے۔

خبر واحد کی پانچویں تقسیم:

صیغہ اداء کے اعتبار سے خبر واحد دو قسم پر ہے: ① معنعن ② مسلسل
معنعن وہ حدیث ہے جس میں راوی عن فلان عن فلان کا لفظ استعمال کرتا ہو۔
مسلسل وہ حدیث ہے جس میں راوی نے ایک طرز پر صیغے استعمال کئے ہوں جیسے پوری سند "سمعت فلانًا قال سمعت فلانًا" یا "حدثنا فلان قال حدثنا فلان" یا "اخبرنا فلان قال اخبرنا فلان" یہ مسلسل بالقول ہے اور دوسرا مسلسل بالفعل ہوتا ہے یعنی مسلسل بالتشبیک کہ نبی اکرم ﷺ نے کسی کا ہاتھ پکڑا پھر راوی نے بھی ایسا ہی کیا کبھی مسلسل بتحریک الشفتین ہوتا ہے اور کبھی مسلسل بالمصافحہ ہوتا ہے۔

اقسام کتب الحدیث

تکمیل فائدہ کی غرض سے اقسام کتب حدیث سے متعلق پہلے یہ شعر یاد رکھ لیں:

جامع و مسانید و معاجم بنگر
رسائل سنن اجزاء واربعین بفکر

یعنی جامع، مسند، معجم، رسائل، اجزاء اور اربعین سات قسم کی کتب حدیث کو سوچ کر دیکھو۔

❶ جامع:

وہ ہے جس میں آٹھ اصناف علوم جمع ہوں جس کو کسی نے اس شعر میں اکٹھا کیا ہے۔

سیر آداب و تفسیر وعقائد
فتن اشراط و احکام و مناقب

بخاری اور ترمذی جامع ہے کہ یہ سب علوم ان میں درج ہیں، مسلم میں تفسیر بہت کم ہے وہ جامع نہیں۔

❷ مسند:

وہ ہے جس میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب یا رتبوں پر احادیث جمع کی گئی ہوں جیسے مسند احمد اور مسند دارمی۔

❸ معجم:

وہ ہے جس میں ناموں کے حروف کی ترتیب یا رتبوں کی ترتیب سے اپنے شیوخ کی احادیث جمع کی گئی ہوں جیسے معجم طبرانی، معجم کبیر، معجم صغیر، معجم اوسط وغیرہ۔

❹ سنن:

وہ کتب ہیں جس میں احکام کی احادیث فقہ کے ابواب کی ترتیب پر ہوں جیسے سنن ترمذی وغیرہ۔

❺ جزئ:

وہ ہے جو ایک ہی شیخ کی مرویات پر مشتمل ہو یا ایک ہی موضوع سے وابستہ ہو جیسے جزء رفع الیدین۔

❻ مستدرکات:

وہ کتب ہیں جس کے مؤلف نے کسی محدث کی کتاب کی احادیث کا استدراک کیا ہو جو اس سے کسی وجہ سے رہ گئی ہوں اور ان کی شرائط کے مطابق ہوں جیسے **مستدرك علی الصحیحین**۔

❼ علل ❽ شمائل ❾ اربعینات:

مسالک محدثین:

❶ امام بخاری ایک قول میں شافعی ایک میں حنبلی ایک میں مجتہد تھے، آخر قول راجح ہے۔

❷ امام مسلم مقلد محض نہیں تھے البتہ شوافع کی طرف مائل تھے، بعض نے مالکی کہا ہے۔

❸ امام ابوداؤد حنبلی مسلک سے وابستہ تھے۔

❹ امام ترمذی بعض نے شافعی بتایا ہے۔

❺ امام ابن ماجہ شافعی یا حنبلی یا آزاد مائل باہل حجاز تھے۔

❻ امام نسائی عام خیال ہے کہ شافعی تھے۔

❼ امام طحاوی پہلے شافعی تھے پھر پکے حنفی بن گئے۔

مورخہ ۲۵ شوال ۱۴۰۹ھ

حجیّت حدیث

منکرین حدیث کا مقصد در حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام جڑ سے اکھیڑ کر ختم کیا جائے اور اس پر کسی کا اعتماد و بھروسہ باقی نہ رہ جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے احادیث کے انکار کا فتنہ کھڑا کر دیا کیونکہ احادیث کے بغیر قرآن عظیم خود بخود معطل ہو کر رہ جاتا ہے یہ لوگ قرآن کریم کی آڑ میں پورے دین کو یکسر ختم کرنے کی سازش میں لگے ہوئے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ علمائے کرام قرآن و حدیث سے حجیّت حدیث کو ثابت و مستحکم کریں اور پھر منکرین حدیث کے شبہات کا سنجیدگی سے جائزہ لے لیں چنانچہ یہاں بھی حجیّت حدیث پر مختصر کلام ملاحظہ ہو:

قرآن عظیم کی متعدد آیتوں سے حدیث کا حجت ہونا اور اس کا واجب العمل ہونا ثابت اور مسلم ہے، علامہ شاہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "احادیث کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا ہے"۔ علامہ محمد یوسف البنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "قرآن کریم احادیث کی تائید و توثیق کیلئے اترا ہے اور قرآن پر ایمان نہیں لایا جاسکتا جب تک کہ احادیث پر ایمان نہ ہو" فرمایا کہ آیت "انك على صراط مستقيم" اسی تائید میں آئی ہے۔ "انك على الحق المبين" اسی توثیق کا حصہ ہے۔ "وأرسلنك للناس رسولا" وغیرہ آیات اس کی بین دلیل اور واضح ثبوت ہیں۔

دلائل:

① وانزلنا اليك الذكر لتبين للناس ما نزل اليهم ولعلهم يتفكرون۔ (نحل ۴۴)

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو قرآن کی آیتوں کا مبین یعنی بیان کرنے والا کہا گیا اور جو آپ ﷺ بیان کریں گے وہ احادیث ہیں۔

② وما اٰتٰكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا۔ (حشر:۷)

اس آیت میں ہر اس چیز کو واجب العمل اور واجب الاخذ قرار دیا گیا جو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان کیا اور جس سے روکا ہے وہ واجب الاحتراز قرار دیا اور یہ سب احادیث کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

③ فليحذر الذين يخالفون عن أمره أن تصيبهم فتنة أو يصيبهم عذاب اليم۔ (نور:۶۳)

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے اوامر کو واجب الاطاعت قرار دیا گیا ہے اور مخالفت پر وعید کا بیان ہے تو امر رسول یہ احادیث ہیں۔

④ ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث۔ (اعراف:۱۵۷)

اس آیت میں احادیث کے وسیع فیصلوں کا ذکر ہے۔

❺ انا انزلنا الیك الكتاب بالحق لتحكم بین الناس بما أراك الله (نساء:۱۰۵)

اس آیت میں "بما اراك الله" نے احادیث کے ذخیرہ کو بیان کیا ہے۔

❻ لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علینا جمعه وقرآنه فاذا قرأناه فاتبع قرآنه ثم ان علینا بیانه۔ (قیامۃ۱۹)

اس بیان سے مراد احادیث ہیں کیونکہ قرآن کا بیان اگر قرآن ہی سے مراد لیا جائے تو پھر ہر نئی آنے والی آیت کا بیان ایک اور آیت سے ہوگا جس سے تسلسل لازم آئے گا۔

❼ وما أرسلنا من رسول الا لیطاع باذن الله۔ (نساء:۶۴)

اس آیت میں اطاعت رسول کا مطلب ان کی احادیث اور فرامین مبارکہ کی اطاعت ہے۔

❽ لقد من الله علی المؤمنین اذ بعث فیهم رسولاً من انفسهم یتلو علیهم آیاته ویزكیهم ویعلمهم الكتاب والحكمة۔ (آل عمران:۱۶۴)

اس آیت میں تعلیم کتاب کا ذکر ہے اور یہ بغیر احادیث کے ممکن ہی نہیں، اسی طرح تزکیۂ نفوس بغیر احادیث کے کیسے ہوسکتا ہے نیز "الحکمۃ" دانائی کی باتوں کی تعلیم خود احادیث ہیں۔

❾ فلا وربك لا یؤمنون حتی یحكموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجًا مما قضیت ویسلموا تسلیمًا۔ (نساء:۶۵)

اس آیت میں تحکیم، حکم دینا، فیصلہ سنانا بغیر احادیث کے کیسے ممکن ہے؟ "مما قضیت" کا کلمہ بتا رہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا سنایا ہوا فیصلہ ماننا ہر مسلمان پر فرض ہے، یہ فیصلہ اور یہ جھگڑے کا نمٹانا سب احادیث ہی ہیں لہٰذا قرآن کے ساتھ ساتھ احادیث کا ماننا خود قرآن کا حکم ہے، اب اگر کوئی آدمی انکار حدیث کرتا ہے تو وہ خود گمراہ ہونا چاہتا ہے تو گمراہ ہوتا پھرے۔

درِ فیضِ محمد وا ہے آئے جس کا جی چاہے
نہ آئے آتشِ دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے
مریضانِ گناہ کو دو خبر فیضِ محمد کی
بلا قیمت دوا ملتی ہے آئے جس کا جی چاہے

منکرین حدیث کے شبہات اور ان کے جوابات

❶ پہلا شبہ: یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بیان کردہ احکامات آپ ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص تھے بعد میں تبدیلی آگئی۔

جواب: آنحضرت ﷺ قیامت تک کے لوگوں کے لئے خاتم النبیین ہیں آپ ﷺ کے بعد احکامات کی تبدیلی کا عقیدہ نبوت کا انکار ہے اس نظریہ سے تو یہود و نصاریٰ کی طرح دین اسلام مسخ ہو جائے گا۔

❷ **دوسرا شبہ:** یہ ہے کہ قرآن سمجھنے کے لئے احادیث کی ضرورت نہیں کیونکہ "**ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر**" نے سب کو آسان کر دیا۔

جواب: یہاں ذکر سے نصائح اور واقعات سابقہ ولاحقہ مراد ہیں، شرعی احکام اور دقیق تحقیقات کو یسر نہیں کہا، نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہل لسان تھے، نزول قرآن کے عینی گواہ تھے وہ کئی مسائل اور کئی مطالب خود نہ سمجھ سکے بلکہ نبی اکرم ﷺ کی طرف لحہ بہ لحہ رجوع فرماتے تھے تو آج اس جہالت مرکبہ کے دور میں کون خود سمجھ سکتا ہے؟۔ میں پوچھتا ہوں کیا تعداد رکعات اور اوقات نماز اور اس کی کیفیات تم بغیر احادیث کے سمجھ سکتے ہو؟ زکوٰۃ کی مقدار اس کے انواع و اقسام اور نصاب کی تکمیل کے اوقات تم قرآن سے پیش کر سکتے ہو؟ حج کے اعمال و افعال اور اوقات و مقامات کا تعین تم قرآن سے بتا سکتے ہو؟ یہ تو سراسر باطل نظریہ ہے اور دین کا انکار ہے۔ دین اسلام کے تمام احکام ان کی ھیئات و کیفیات اور ترتیب وتفصیلات کے ساتھ صرف قرآن سے کون سمجھ سکتا ہے؟ بلی حرام ہے، شیر حرام ہے، گدھا حرام ہے، بھیڑیا حرام ہے، ریچھ حرام ہے، گدھ حرام ہے اور کبوتر حلال ہے، مرغی حلال ہے، ہرن حلال ہے۔ یہ تفصیلات قرآن میں کہاں ہیں؟ چلو پھر یہ بتاؤ کہ تمہارا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ایک ساتھ قرآن کریم میں کہاں ہے؟ نیز یہ بتاؤ یہ قرآن حجت ہے اللہ کا کلام ہے اس پر عمل کرو یہ کس نے بتایا؟ آخر کسی حدیث اور فرمانِ رسول ﷺ کی خبر سے اس کی خبر ہوئی پھر احادیث کا انکار کیسے؟

"بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است

اسی لئے تو امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "**الکتاب احوج الی السنة من السنة الی الکتاب**"۔ یعنی کتاب اللہ اپنے سمجھنے میں سنت وحدیث کی طرف زیادہ محتاج ہے۔ بنسبت سنت کے کتاب اللہ کی طرف، امام مکحول رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔

❸ **تیسرا شبہ:** یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

"**لا تکتبوا عني (شیئًا سوی القرآن) ومن کتب عني غیر القرآن فلیمحه**" (رواہ مسلم ج ۲ ص ۴۱۴)

پہلا جواب: اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابتدا میں عارضی طور پر منع فرمایا تھا تاکہ قرآن وحدیث میں اختلاط والتباس نہ آئے نیز احادیث بطون اوراق کی بجائے صدور رجال میں محفوظ ہو جائیں جب صحابہ کرام نے قرآن وحدیث میں فصاحت وبلاغت اور طرز بیان میں خوب امتیاز پیدا کر لیا اور اختلاط والتباس کا خوف نہ رہا تو آنحضرت ﷺ نے

احادیث لکھنے کی اجازت دیدی اور یہ عارضی ممانعت ختم ہوگئی۔

پہلا جواب: یہ ہے کہ تمام صحیح احادیث کے مقابلے میں اس حدیث کو چھوڑنا پڑے گا یہ روایت اجازت کتابت کی تمام روایات کا مقابلہ نہیں کرسکتی بلکہ اس حدیث کا محمل وہی عارضی ممانعت تھی جو ختم ہوگئی۔

دوسرا جواب: امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ لکھنے کی یہ ممانعت قرآن وحدیث کو ایک ہی صحیفہ اور ایک ہی جگہ لکھنے کی تھی الگ الگ نہیں۔ (فتح الباری ج ا ص ۱۸۵)

❹ چوتھا شبہ: یہ ہے کہ حدیث حجت نہیں صرف قرآن حجت ہے کیونکہ احادیث تابعین کے دور میں لکھی گئی ہیں اتنے طویل عرصہ تک اس کی حفاظت کیسے ہوسکتی ہے؟

جواب: یہ دعویٰ غلط ہے کہ کتابت حدیث حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھی بلکہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کئی نوشتے اور کئی صحیفے موجود تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لکھے گئے تھے ملاحظہ ہوں:

❶ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا صحیفہ:

انہوں نے احادیث نبویہ پر ایک جامع صحیفہ لکھا جس کا نام آپ نے "الصادقہ" رکھا تھا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے مجھ سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کسی نے نقل نہیں کیں سوائے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جو کچھ سنتا وہ لکھتا تھا، مجھ سے ایک دفعہ قریش نے کہا کہ تم جو کچھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے ہو وہ لکھ دیتے ہو حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں کبھی غضب میں اور کبھی خوشی میں بات کرتے ہیں، میں ان کے کہنے پر لکھنے سے رک گیا اور پھر میں نے اس کا تذکرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی سے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ فرمایا کہ "لکھو اس رب کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس زبان سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا"۔

(جواہر الاصول فی مصطلح احادیث الرسول ص ۶۰ و مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اس صحیفہ سے متعلق محبت کے طور پر فرمایا کرتے تھے۔

ما يرغبني في الحيوة الا الصادقة والوهط اما الصادقة فصحيفة كتبتها عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وأما الوهط فارض تصدق بها عمرو بن العاص.

یعنی مجھے زندگی سے محبت دو وجہ سے ہے ایک صادقہ کی وجہ سے دوسرا وھط کی وجہ سے، صادقہ تو احادیث کا وہ مجموعہ ہے جو میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا تھا اور وھط وہ وقفی زمین ہے جو میرے باپ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے وقف کر رکھی

ہے (اس کی نگرانی سے مجھے خوشی ہوتی ہے)۔

۲ حضرت علی کا صحیفہ:

چنانچہ بخاری شریف کتاب العلم میں ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ آپ حضرات کے پاس کوئی (خصوصی) کتاب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ اور کسی مسلمان کو عطا شدہ فہم کے اور جو اس صحیفے میں ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے کہا اس صحیفے میں کیا ہے؟ فرمایا دیت کے احکام ہیں، قیدیوں کی رہائی کے مسائل ہیں اور یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔

۳ عمرو بن حزم کا صحیفہ:

سنن نسائی ج ۲ ص ۲۵۱ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل یمن کے نام ایک مکتوب ارسال فرمایا جس میں فرائض، سنن اور دیات کے مسائل درج تھے آپ نے یہ مکتوب عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ارسال فرمایا تھا اور انہوں نے اہل یمن کے سامنے اسے پڑھ کر سنایا تھا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے نجران کا گورنر مقرر فرمایا تھا جبکہ ان کی عمر سترہ برس کی تھی۔

۴ صحیفۂ عمر بن الخطاب:

ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صدقات سے متعلق ایک تحریر لکھوائی تھی مگر ابھی تک اسے گورنروں کے نام روانہ نہیں کیا تھا کہ آپ ﷺ کا وصال ہو گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اپنی تلوار کے نیام میں محفوظ رکھا تھا۔ جب آنحضرت ﷺ کا وصال ہو گیا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس سے استفادہ کیا آپ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے خوب استفادہ کیا یہاں تک کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی انتقال ہو گیا اور وہ نوشتہ محفوظ رہا۔

۵ صحیفۂ عبداللہ بن مسعود:

حافظ ابوعمرو "جامع بیان العلم" ج ۱ ص ۷۲ میں متصل سند کے ساتھ حضرت معن سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے ایک نوشتہ دکھایا اور حلفیہ بیان کیا کہ یہ نوشتہ میرے والد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے۔

۶ صحیفۂ ابو ہریرہ:

حافظ ابن عبدالبر نے بیان العلم میں ابن وہب اور حسن بن عمرو کے طریقے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک حدیث کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا میں نے کہا کہ حضرت آپ ہی سے تو میں نے وہ حدیث سنی تھی، فرمایا اگر تم نے مجھ سے سنی ہے تو وہ میرے پاس تحریری شکل میں ضرور موجود ہوگی۔ چنانچہ میرا ہاتھ پکڑ کر آپ مجھے اپنے گھر لے گئے اور مجھے احادیث نبویہ کے بہت سارے نوشتے دکھائے اور وہ حدیث بھی مل گئی۔

❻ صحیفہ رافع بن خدیج:

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم آپ سے بہت سی باتیں سن لیتے ہیں کیا ہم انہیں لکھ لیا کریں؟ آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں لکھ لیا کرو۔ (تدریب الراوی ص ۲۷۶)

❼ صحیفہ جابر بن عبداللہ:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھی احادیث مقدسہ کا ایک نوشتہ تھا جس میں احادیث مرقوم تھیں اس کا تذکرہ امام بخاری نے تاریخ کبیر ج ۴ ص ۱۸۶ پر کیا ہے۔ ترمذی میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔

❽ صحیفہ سمرہ بن جندب:

جلیل القدر صحابی حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جس میں بہت سی احادیث درج تھیں اس صحیفہ کا تذکرہ ابوداؤد شریف کی احادیث تشہد میں آیا ہے۔

❾ صحیفہ ابوشاہ یمنی:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں آنحضرت ﷺ کے خطبے کا تذکرہ ہے۔ اس بیان کے آخر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یمن سے ایک آدمی آیا تھا جس کا نام ابوشاہ تھا انہوں نے کہا یارسول اللہ! یہ خطبہ مجھے لکھ کر دے دیں، حضور اکرم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: "**اکتبوا لابی شاہ**" یعنی ابوشاہ کے لئے خطبہ کے یہ مسائل لکھ دو۔

❿ عام صحابہ کے نوشتے:

سند دارمی میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے اردگرد لکھنے میں مشغول تھے کہ اتنے میں آپ سے دریافت کیا گیا کہ ان دو شہروں میں سے پہلے کونسا فتح ہوگا قسطنطنیہ یا روم؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ ہرقل، کا شہر۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کے اردگرد حدیث لکھنے کے لئے ایک فرد نہیں بلکہ ایک جماعت بیٹھا کرتی تھی۔ اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا مجموعہ احادیث لکھا ہوا تھا۔ کنز العمال میں ایک روایت ہے "**اکتب ولا حرج**" حدیث لکھو کوئی حرج نہیں۔ مجمع الزوائد میں ہے کہ ایک شخص نے کہا یارسول اللہ! میں بہت زیادہ بھولتا ہوں آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"**استعن بيمينك**" یعنی دائیں ہاتھ سے لکھ کر اپنی مدد کرو۔

یہ تمام واقعات وروایات اس بات کی دلیل ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک عہد میں کتابت حدیث تھی البتہ قرآن کریم کے ساتھ ملا کر ایک جگہ لکھنے کی ممانعت وقتی تھی۔ صحابہؓ کے دور سے متصل خیر القرون کے دور میں تابعین نے احادیث کے ذخیرے مختلف بلاد میں جمع کر دیئے۔ چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مدینہ منورہ میں موطا مالک لکھ دی۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے مکہ مکرمہ میں حدیث کا ذخیرہ لکھا، امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے شام کی سرزمین پر احادیث کا ذخیرہ لکھ ڈالا۔ حماد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ نے بصرہ میں علم حدیث میں تصنیف لکھ دی۔ معمر نے یمن میں کتاب لکھ دی اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کوفہ میں ایک تصنیف تیار کی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخارا میں، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نیشاپور میں، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ازبکستان میں، امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے سجستان میں اور دیگر محدثین نے اپنے اپنے بلاد میں احادیث کے ڈھیر لگا دیئے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے مغازی پر کام کیا۔ ہشیم نے واسط میں احادیث لکھنے کا کام کیا۔ لیث اور ابن لہیعہ نے مصر میں کتابیں لکھ دیں۔ پھر عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب لکھ دی اور قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب لکھ دی اسی طرح علم الحدیث کا ایک خزانہ اکٹھا ہو گیا۔ کتابت حدیث کے اس اہتمام وانتظام کے بعد بھی جو شخص شک وشبہ کرتا ہے تو وہ درحقیقت احادیث سے قلبی نفرت رکھتا ہے اور قلبی عداوت کا کون علاج کرسکتا ہے یہ سچ ہے:

فعين الرضاء عن كل عيب كليلة
ولكن عين السخط تبدى المساويا

مورخہ ۲۶ شوال ۱۴۰۹ھ

صاحبِ مصابیح

مصابیح اور مشکوٰۃ المصابیح دو الگ الگ مصنفوں کی الگ الگ تصنیفات ہیں۔ پہلے صاحب مصابیح کے احوال لکھے جاتے ہیں۔

نام ونسب:

آپ کا نام حسین تھا، کنیت ابو محمد تھی لقب محی السنۃ تھا والد کا نام مسعود اور دادا کا نام محمود تھا۔ یعنی

هو الامام محيٰ السنة قامع البدعة ابو محمد حسين بن مسعود بن محمود الفراء البغوي۔

آپ ۴۳۵ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۵۱۶ ہجری میں اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف چلے گئے، آپ مرو میں مدفون ہیں۔
"الفرو" عربی میں پوستین کو کہتے ہیں آپ کے داداؤں میں کوئی فرو پوستین کا کاروبار کرتا تھا بعض نے کہا کہ زیادہ پوستین پہنتا تھا اس وجہ سے فراء مشہور ہوا۔
"بغوی" آپ کے وطن بغو کی طرف منسوب ہے بغو اصل میں بغشور تھا جو "باغ کور" یعنی گھر کا باغ کے معنی سے معرب ہے۔ "بغشور" ہرات اور مرو کے درمیان ایک آباد و معمور شہر ہے نسبت کے وقت بغوی ہو جاتا ہے شور کو تخفیف کی غرض سے حذف کر دیتے ہیں۔

تحصیل علم:

صاحب مصابیح شیخ محی السنۃ اپنے زمانے کے مشہور محدث، مفسر قرآن اور مشہور تاریوں میں سے تھے، فقہ میں قاضی حسین بن محمد کے شاگرد تھے آپ نے علاقے کے مشہور محدثین سے علم الحدیث کا علم حاصل کیا اور پھر بڑے بڑے شیوخ حدیث آپ کے شاگرد بنے جو آپ کے کمال کے لئے واضح مینار تھے آپ خود اکابر شوافع میں شمار ہوتے تھے۔

زہد وتقویٰ:

آپ زہد وتقویٰ میں بھی اپنی مثال آپ تھے ساری عمر تالیف وتصنیف اور حدیث وفقہ کی تعلیم وتدریس میں گزاری، ہمیشہ باوضوء درس دیا کرتے تھے۔ آپ نے انتہائی قناعت وصبر کی زندگی گزاری ہے نفل روزہ رکھنے کی پابندی کیا کرتے تھے اور افطار کے وقت خشک روٹی کے چند ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھایا کرتے تھے اس پر آپ کو اطباء نے کہا کہ اس سے دماغ میں خشکی آجائے گی اور حافظہ بھی خراب ہونے کا خطرہ ہے پھر آپ نے زیتون کا روٹی کے ساتھ بطور سالن استعمال کرنا شروع کر دیا۔
آپ کی بیوی کا انتقال آپ سے پہلے ہو چکا تھا اس نے میراث میں بہت مال چھوڑا تھا لیکن محی السنۃ نے کمال تقویٰ کی وجہ سے میراث سے اپنا حصہ نہیں لیا۔

محی السنۃ لقب کی وجہ:

جب آپ نے شرح السنۃ کی تصنیف مکمل فرمائی تو آپ نے نبی اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا حضور اکرم ﷺ فرمارہے تھے "احیاك الله كما احییت سنتی" یعنی جس طرح تم نے میری سنت کو زندہ کیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ تجھے بھی زندہ رکھے اسی دن سے آپ کا لقب بھی محی السنۃ ہو گیا۔ محیی باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔

۸۰ یا ۸۱ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی اور "مرو" جو کہ ولایت ہرات میں ہے اپنے استادِ فقہ قاضی حسین بن محمد رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

تصانیف:

آپ کی مشہور تصانیف میں سے ایک کتاب "المصابیح" ہے جس میں (۴۴۸۴) احادیث درج ہیں اسی کتاب کے خطبہ میں مصنف نے لفظ مصابیح استعمال کیا ہے اسی وجہ سے کتاب کا نام مصابیح ہو گیا اس مقبول ومشہور کتاب کی تقریباً ۱۶ شروحات ہیں اس کتاب کی افادیت اور طرز تالیف کی مکمل تفصیل صاحب مشکوٰۃ نے اپنے مقدمہ مشکوٰۃ میں درج کی ہے جو انشاء اللہ آئندہ آئے گی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تفسیر میں بھی بڑا مقام عطا کیا تھا لہٰذا تفسیر بغوی کے نام سے آپ کی تفسیر بھی موجود ہے نیز فقہ اور قرأت میں بھی آپ کی تصنیفات ہیں:

بنا کر دند خوش رسمی بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

صاحبِ مشکوٰۃ

چونکہ کتاب المصابیح ترمیم واضافہ کے بعد مشکوٰۃ المصابیح کے نام سے منظر عام پر آئی اور درس وتدریس کے لئے علماء ومدارس نے اسے قبول کرلیا اس لئے صاحب مشکوٰۃ کا بھی کچھ تذکرہ قارئین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

نام ونسب:

صاحب مشکوٰۃ المصابیح کا نام محمود یا محمد ہے کنیت ابو عبداللہ لقب ولی الدین اور والد کا نام عبداللہ ہے۔ نسباً عمری ہیں اور خطیب تبریزی سے مشہور ومعروف ہیں۔ یعنی **ابو عبد الله ولی الدین محمد بن عبد الله العمری الخطیب التبریزی۔**

آپ اپنے وقت میں بہت بڑے محدث تھے اور فصاحت وبلاغت کے امام تھے۔ احادیث میں آپ کے اونچے مقام کا اندازہ آپ کی تصنیف مشکوٰۃ سے ہو جاتا ہے آپ کا زمانہ حیات آٹھویں صدی تھا اس صدی میں تاتاریوں کا بہت بڑا فتنہ اٹھا تھا اس لئے آپ کے حالات ضبط نہ ہو سکے تخمیناً اندازے کے مطابق آپ کی وفات ۷۴۰ ہجری کے بعد ہوئی ہے

کیونکہ "اکمال فی اسماء الرجال" کی تالیف سے آپ ۷۴۰ ہجری میں فارغ ہوئے۔ لہٰذا انتقال اس کے بعد ہی ہوا ہوگا۔ اتنا ہی معلوم ہوسکا، اور اس کے سوا کچھ بھی معلوم نہ ہوسکا البتہ آپ کے شیخ علامہ حسین بن محمد طیبی علیہ الرحمہ نے آپ کو "بقية الاولياء" اور "قطب الصلحاء" کے شاندار الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اور ملا علی قاری علیہ الرحمہ نے مرقات شرح مشکوٰۃ میں آپ کو "البحر العلامة والبحر الفهامة مظهر الحقائق وموضع الدقائق الشيخ التقي النقي" کے شاندار القاب سے یاد کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ آپ کے فضل وکمال کے لئے مشکوٰۃ کی تالیف ہی کافی شافی ہے۔

تصانیف:

اس وقت امت کے سامنے آپ کی دو تصنیفات ہیں، اول الاکمال فی اسماء الرجال جو مشکوٰۃ المصابیح کے آخر میں اس کے ساتھ ضم کردی گئی ہے اور دوسری تصنیف مشکوٰۃ المصابیح ہے جو آپ کا مایہ ناز مجموعہ احادیث ہے جو صرف صحاح ستہ پر نہیں بلکہ دیگر کئی حدیث کی کتابوں کی احادیث پر مشتمل ہے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو قبولیت عامہ وخاصہ سے نوازا ہے۔ ہندوستان میں ایک طویل مدت تک مشکوٰۃ شریف تکمیل کے طلبہ کو تکمیل کے وقت پڑھائی جاتی تھی اسی طرح اس زمانے میں مشارق الانوار اور مشکوٰۃ شریف دونوں کو پڑھا کر حدیث کا دورہ مکمل ہوجاتا تھا کوئی اور کتاب نہیں تھی پھر جب دورہ حدیث کے لئے صحاح ستہ کا تعین ہوگیا تب بھی مشکوٰۃ شریف کو موقوف علیہ میں پڑھانا لازم قرار دیا گیا یہ اس کتاب کی عند اللہ مقبولیت کی نشانی ہے بلکہ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ لوگ قرآن شریف کی طرح مشکوٰۃ شریف کو سینوں میں محفوظ رکھتے تھے۔

علماء ہند میں ایک آدمی بابا داؤد مشکوتی کے نام سے مشہور تھا جو مشکوٰۃ شریف کو متن وسند کے ساتھ یاد رکھتا تھا اسی وجہ سے اس کو بابا مشکوتی کا لقب دیا گیا تھا۔

طرز تالیف:

کتاب المصابیح میں محی السنۃ نے صرف احادیث جمع فرمائیں تھیں نہ سند حدیث کا تذکرہ تھا نہ ان صحابی کا نام تھا جن سے حدیث بیان کی گئی تھی اسی طرح حدیث صحیح، ضعیف، حسن اور تخریج ومخرج کا تذکرہ بھی نہیں تھا، صاحب مشکوٰۃ نے ان تمام چیزوں کا اہتمام کیا اور حدیث کی ہر حیثیت کو تذکرہ کرکے حقیقت کو واضح کردیا۔

صاحب مصابیح نے اپنی کتاب کے ہر باب میں دو فصل مقرر کئے تھے پہلی فصل میں بخاری ومسلم اور صحاح کی حدیثیں ذکر کی ہیں۔ اور فصل ثانی میں ابوداؤد، ترمذی نسائی کی حدیثیں لائے ہیں جن کا نام آپ نے حسان رکھا ہے۔

صاحب مشکوٰۃ نے فصل سوم کا اضافہ اپنی کتاب میں کردیا جس میں انہوں نے ان حدیثوں کا ذکر کیا ہے جو اس باب سے مناسبت رکھتی ہیں اور صاحب مصابیح نے ان کو ذکر نہیں کیا ہے۔ نیز اقوال صحابہ اور اقوال تابعین کو بھی اس میں شامل کردیا ہے۔ اس تیسری فصل میں وہ کبھی کبھی بخاری اور مسلم کی حدیثیں بھی لاتے ہیں۔

احادیث مشکوٰۃ کی تعداد:

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بستان المحدثین میں لکھا ہے کہ کتاب المصابیح کی احادیث کی کل تعداد (۴۴۸۴) تھی اس پر صاحب مشکوٰۃ نے پندرہ سو گیارہ (۱۵۱۱) احادیث کا اضافہ کیا ہے تو اب مشکوٰۃ کی ساری حدیثیں (۵۹۹۵) ہیں۔ بعض نے مصابیح کی احادیث کی تعداد (۴۴۳۴) لکھی ہے پھر مجموعہ (۵۹۴۵) ہوگا۔ مشکوٰۃ شریف میں عنوان کے اعتبار سے کل (۲۹) کتب ہیں اور کتاب الایمان سے پہلا عنوان شروع ہوجاتا ہے اس کتاب میں ابواب کی تعداد (۳۲۷) ہے اور اس میں کل (۱۰۳۸) فصلیں ہیں۔

مشکوٰۃ شریف کی وجہ تالیف:

صاحب مشکوٰۃ نے اپنے مقدمہ میں اپنی تالیف وتصنیف کی وجہ خود بتائی ہے لیکن وہاں یہ بات نہیں ہے کہ اصل میں صاحب مشکوٰۃ کے استاد علامہ حسین بن محمد طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو حکم دیا تھا کہ آپ حدیث شریف میں ایک کتاب تصنیف کریں جس میں کتاب مصابیح کی وہ کمی پوری ہوجائے جس کی وجہ سے سطحی نظر والے لوگ مصابیح پر کچھ اشکالات پیش کرتے ہیں چنانچہ آپ نے اپنے شیخ کے حکم پر مشکوٰۃ شریف کی تالیف شروع فرمائی۔ ہر حدیث کی ابتدا میں صحابی کا نام درج کیا اور آخر میں یہ حوالہ دیا کہ یہ حدیث کس کتاب میں ہے جس سے پوری سند کا بھی انتظام ہوگیا۔

آپ نے مصابیح کی دو فصلوں پر تیسری فصل کا اضافہ کیا پہلی فصل میں بخاری ومسلم کی احادیث اور دوسری فصل میں سنن اربعہ وغیرہ سے احادیث جمع فرمادیں۔

اور تیسری فصل میں باب سے مناسبت رکھنے والی حدیثیں جمع کیں، اس جمع کرنے میں صاحب مشکوٰۃ نے کسی خاص کتاب کی قید نہیں لگائی بلکہ بشمول بخاری ومسلم جہاں سے جو حدیث مل گئی خواہ وہ مرفوع حدیث ہو یا آثار صحابہ میں سے کوئی اثر ہو یا تابعین کا اثر ہو سب کو یکجا کرکے احادیث کا وافر گنجینہ اور گلدستۂ علم وعمل امت کے سامنے پیش فرمایا۔ **فجزاہ اللہ علی ذلک احسن الجزاء۔**

آپ نے اپنی اس تصنیف کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا یعنی چراغوں کا طاق تو گویا یہ کتاب طاق ہے اور نبی کریم ﷺ کی مقدس احادیث چراغ ہدایت ہیں اس کتاب میں رشد وہدایت کی وہ تمام قندیلیں روشن ہیں جن سے ہر انسان روشنی حاصل کرسکتا ہے جس کا جی چاہے آئے اور مینارہ نور اپنے ساتھ لے جائے۔

درِ فیضِ محمد وا ہے آئے جس کا جی چاہے
نہ آئے آتشِ دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے
مریضانِ گناہ کو دو خبر فیضِ محمد کی
بلا قیمت دوا ملتی ہے آئے جس کا جی چاہے

مشکوٰۃ شریف کی شروحات:

اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو قبولیت عامہ وخاصہ سے ایسا نوازا ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود یہ کتاب علمائے کرام کی توجہات کا مرکز ہے اور دنیا کے طول وعرض میں اس کا تعلیم وتعلم اور درس وتدریس برابر جاری ہے اسی وجہ سے اس کی بہت زیادہ شروحات بھی منظر عام پر آگئیں ہیں میں چند شروحات کی طرف اشارہ کرتا ہوں:

❶ شرح الطیبی:

یہ کمال کی شرح ہے اور اس کا بڑا کمال یہ ہے کہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ خود صاحب مشکوٰۃ کے استاد اور شیخ ہیں۔ پہلے آپ نے اپنے شاگرد کو حدیث میں کتاب لکھنے کے لئے حکم دیا اور پھر اسی شاگرد کی تصنیف کردہ کتاب کی شاندار شرح لکھ دی جو بارہ جلدوں میں اس وقت بھی موجود ہے جس میں احادیث کی فصاحت وبلاغت اور دقیق نکات کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔
علامہ طیبی شافعی المسلک گزرے ہیں، شرح کا پورا نام "**الکاشف عن حقائق السنن**" ہے۔

❷ المرقات شرح المشکوٰۃ:

یہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی کئی جلدوں میں مایہ ناز اور ضخیم شرح ہے جس میں احادیث مقدسہ کی تشریحات کا ہر لحاظ سے حق ادا کیا گیا ہے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ حنفی مسلک کے پکے امام اور مصنف گزرے ہیں۔

❸ لمعات التنقیح:

یہ عمدہ شرح عربی زبان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ کاش کہ نا تمام ہے۔

❹ اشعۃ اللمعات:

یہ عمدہ شرح فارسی زبان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہی تصنیف ہے۔

❺ مظاہر حق:

یہ شرح اردو میں ہے اور زیادہ تر مرقات اور طیبی سے ماخوذ ہے۔ محترم نواب قطب الدین خان رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۲۸۹ھ نے لکھی ہے۔

❻ التعلیق الصبیح:

یہ شرح حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے عربی زبان میں لکھی ہے۔

❼ التعلیق الفصیح:

یہ شرح حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جو عربی زبان میں ہے۔

❽ تنظیم الاشتات:

یہ اردو زبان میں حضرت مولانا محمد ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ بنگلہ دیشی کی تصنیف ہے۔

❾ شرح مشکوٰۃ:

یہ شرح عربی زبان میں شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر الدین غورغشتوی رحمۃ اللہ علیہ سرحدی کی ہے۔

❿ نفحات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح:

اردو میں یہ شرح ابھی ابھی آئی ہے ابھی صرف ایک جلد چھپ کر آئی ہے شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم کے تلامذہ نے آپ کے فوائد مشکوٰۃ اور دیگر شروحات سے یہ مجموعہ اکٹھا کیا ہے۔ مگر صرف منتخب احادیث کی شرح ہے۔

⓫ اشرف التوضیح:

مشکوٰۃ کی یہ شرح شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب کی اردو تقریر ہے۔ جو صرف تین جلدوں میں ہے۔

⓬ توضیحات اردو شرح مشکوٰۃ:

یہ شرح آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، بندہ ناچیز فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی کی ایک محنت ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

یہ شروحات وہ ہیں جو اس وقت متداول اور طلبہ و مدرسین حضرات کے استعمال میں ہیں اس کے علاوہ عربی کی کافی قدیم شروحات ہیں جو بڑے مشہور علماء اور کامل شخصیات کی طرف منسوب ہیں لیکن چونکہ اس وقت وہ شروحات نایاب ہیں اور کسی کے استعمال میں نہیں ہیں اس لئے میں نے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ البتہ اتنا سمجھنا چاہیے کہ مشکوٰۃ شریف کی عمدہ ترین شروحات کل سولہ ہیں اور اس کے علاوہ دروس مشکوٰۃ وغیرہ کے ناموں سے کئی تقاریر کتابی شکل میں چھپ کر سامنے آگئی ہیں اور آئندہ بھی آئیں گی۔

ان شروحات میں ہر شارح کا انداز جدا اور علمی تحقیقات وتشریحات اپنے اپنے رنگ میں ہیں لہٰذا ہر ایک کا ذائقہ بھی الگ الگ ہے۔ اس لئے ایک شرح نہ حرف اول ہے اور نہ حرف آخر بلکہ **"وفوق کل ذی علم علیم"** ہے۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اپنے پیارے حبیب ﷺ کی احادیث اور تعلیمات عام کرنے کی مزید توفیق اور ہمت عطا فرمائے اور طلبہ کرام کو ہر اچھی محنت کی قدردانی کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین یارب العالمین۔

مورخہ ۲۷ شوال ۱۴۰۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم کی بحث

سلفاً وخلفاً یہ طریقہ جاری ہے کہ جب علمائے کرام کتاب کی تصنیف کرتے ہیں یا کتاب شروع کرتے ہیں تو اتباع قرآن و حدیث اور سلف صالحین کی ترتیب کے مطابق ابتداء میں بسم اللہ اور الحمد للہ ضرور لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مؤلف مشکوٰۃ نے بھی ایسا ہی کیا ہے اس کی وجہ آنحضرت ﷺ کے وہ فرامین واحادیث ہیں جو مختلف الفاظ سے تسمیہ وتحمید کے بارے میں وارد ہیں چنانچہ بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

کل امر ذی بال لم یبدأ فیہ ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم فھو ابتر۔ (خطیب فی الجامع)

اور بعض روایات میں اس طرح ہے کہ:

کل امر ذی بال لا یبدأ فیہ بالحمد للہ فھو اجذم۔ (ابو داؤد ونسائی)

بعض روایت میں مندرجہ بالا روایت کے آخری الفاظ "**فھو اقطع**" آئے ہیں جیسا کہ مشکوٰۃ میں یہ روایت ہے۔ (مشکوٰۃ ص ۲۷۲) بعض روایات میں بسم اللہ اور الحمد للہ کی جگہ ذکر اللہ کے الفاظ بھی آئے ہیں جیسا کہ علامہ رہاوی نے اربعینات میں لکھا ہے۔

اب یہاں علماء کے ہاں ایک بحث چلی ہے کہ ابتدا تو "**کون الشیٔ اولاً**" کا نام ہے اور اول تو ایک ہی چیز ہو سکتی ہے لہٰذا اگر بسم اللہ سے ابتدا ہوگی تو الحمد للہ سے نہیں ہوگی اور اگر الحمد للہ سے ابتدا ہوگی تو بسم اللہ سے نہیں ہو سکے گی۔ گویا دونوں روایتوں میں تعارض ہے پھر اس فرضی تعارض کو دور کرنے کے لئے شارحین لکھتے ہیں کہ ابتدا کی تین قسمیں ہیں:

① ابتداء حقیقی ② ابتداء اضافی ③ ابتداء عرفی

پھر یہ حضرات بسم اللہ کے لئے ابتدا حقیقی مان کر جان چھڑاتے ہیں اور الحمد للہ کے لئے ابتدا، اضافی یا عرفی مانتے ہیں تا کہ تعارض دور ہو جائے۔ پھر اعتراض کرتے ہیں کہ ابتدا حقیقی کو بسم اللہ کے ساتھ کیوں خاص کیا الحمد للہ کے ساتھ کیوں نہ کیا؟ تو جواب دیتے ہیں کہ بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کا اسم ذاتی موجود ہے اور حمد کا تعلق صفات سے ہے اور ذات صفات پر مقدم ہوتی ہے۔ یا یہ جواب دیتے ہیں کہ کتاب اللہ کی ترتیب میں اور سلف صالحین کی کتابوں میں بسم اللہ مقدم تھی اس لئے اس طرز کو اختیار کیا گیا تا کہ سلف کی اقتدا ہو جائے۔

بعض حضرات جمع بین الروایات کا طریقہ اس طرح اپناتے ہیں کہ بسم اللہ سے ذکر اللہ مراد ہے، الحمد للہ سے بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر مراد ہے اور بعض روایات میں ذکر اللہ کا لفظ آیا بھی ہے۔ تو اس عمومی مفہوم کے تحت خواہ بسم اللہ پہلے ہو خواہ الحمد للہ پہلے ہو تعارض نہیں آئے گا کیونکہ ذکر اللہ کا مقصد تسمیہ وتحمید دونوں سے حاصل ہو جاتا ہے اسی توجیہ کے پس منظر میں جب دیکھا جائے تو آنحضرت ﷺ نے اپنے مبارک خطوط میں کبھی صرف حمد پر اکتفا فرمایا ہے اور بعض مصنفین نے صرف بسم اللہ پر

اکتفا کر کے حمد کو ترک کیا ہے۔
بعض حضرات یہ جواب بھی دیتے ہیں کہ ابتدا باللسان سے بھی حدیث کا مفہوم و مقصود پورا ہوجاتا ہے لہٰذا اگر کوئی مصنف اپنی کتاب کی ابتدا میں تسمیہ و حمد میں سے کچھ بھی نہیں لکھتا ہے مگر زبان سے پڑھتا ہے تو یہ بھی کافی ہوجاتا ہے۔

حضرت شاہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:

اوپر مذکورہ تمام توجیہات کے علاوہ حضرت العلامۃ سید شاہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق الگ ہے ہمیں بخاری شریف پڑھاتے ہوئے محدث العصر اور شاہ صاحب کے علوم کے امین سید محمد یوسف البنوری رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا کہ حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اصحاب فنون علماء نے تسمیہ و تحمید کی روایتوں میں جو تعارض بتایا ہے یہ درحقیقت غیر اہل فن نے فن حدیث میں بے جا مداخلت کی ہے حقیقت میں یہاں دو الگ الگ حدیثیں نہیں ہیں کہ اس میں تعارض کا احتمال آجائے یہاں ایک ہی حدیث ہے۔ جس میں دو مقاصد کو بیان کیا گیا ہے یعنی جب بھی کوئی شخص قابل احترام اور مہتم بالشان چیز کی ابتدا کرتا ہے تو اس کو چاہیے کہ بسم اللہ یا الحمد للہ سے ابتدا کرے۔
تو اصل مقصود ابتدا کرنے میں تبرک حاصل کرنا ہے اب یہ برکت تسمیہ سے حاصل کی جائے یا تحمید سے حاصل کرے۔ حدیث کے مقصود و مطلوب پر عمل ہوجاتا ہے یہاں دو حدیثیں نہیں ہیں کہ تعارض آجائے بلکہ ایک حدیث کے دو مطالبے ہیں کہ برکت کے لئے ابتدا میں تسمیہ و تحمید میں سے کوئی نہ کوئی ہونا چاہیے ورنہ وہ کام اقطع دم بریدہ بے برکت ہو کر رہ جائے گا اس عموم کی طرف اس روایت میں اشارہ کیا گیا ہے جس میں ذکر اللہ کا لفظ آیا ہے۔

ایک عام توجیہ:

بعض علماء نے کتابوں کے خطبوں کی ترتیب میں پہلے بسم اللہ پھر الحمد للہ پھر رسولوں کا تذکرہ اور پھر صحابہ کا ذکر اور پھر مقاصد کتاب سے پہلے اپنی تصنیف کردہ کتاب کے تذکرہ سے متعلق ایک عام قاعدہ بیان کیا ہے جس سے خطبۂ کتاب میں ہر چیز کی ترتیب آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہر مصنف جو کتاب کی تصنیف کرنے لگتا ہے تو گویا یہ مصنف موجودات میں ایک نئے موجود کا اضافہ کرتا ہے لہٰذا وہ ترتیب کے ساتھ تمام موجودات کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
چنانچہ موجودات میں سب سے قدیم اور اول موجود واجب تعالیٰ کا وجوبی وجود ہے اس کا حق ادا کرنے کے لئے ہر مصنف بسم اللہ کا تذکرہ کرتا ہے دوسرے نمبر پر موجودات میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا وجود ہے اس کے لئے الحمد للہ سے تذکرہ کرتا ہے پھر خالق و مخلوق کے درمیان افادہ و استفادہ کے لئے رسولوں کا وجود ضروری ہے کیونکہ خالق غایت تقدس میں ہے اور مخلوق غایت تدنس میں ہے استفادہ ممکن نہیں تو رسول رسالت کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ سے ہدایت لیتا ہے اور عالی انسانیت کی حیثیت سے عام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔
لہٰذا مصنف اپنی کتاب میں وجود رسول کے حق ادا کرنے کے لئے بطور شکر یہ درود و سلام لاتا ہے چوتھے نمبر پر رسول کے

آل واصحاب کا وجود ہے لہٰذا ان کا تذکرہ بھی کرتا ہے اور اس کے بعد پانچویں نمبر میں اپنی کتاب کا تذکرہ کرتا ہے تا کہ تمام موجودات کا درجہ بدرجہ حق ادا ہوجائے۔ یہی طریقہ صاحب مشکوٰۃ نے بھی اپنایا ہے، اور سب ایسا ہی کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم میں تین ناموں کی تخصیص کیوں؟

اب یہ ایک الگ بحث ہے کہ بسم اللہ میں ایک اسم ذاتی اور دو اسم صفتی کی تخصیص اللہ تعالیٰ کے ۹۹ ناموں میں سے کیوں کی گئی؟ تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ لفظ اللہ تو اسم ذاتی لواجب الوجود تھا اس کا ذکر سب سے پہلے ضروری اور بدیہی تھا، یہی اسم اعظم ہے جو قرآن میں (۲۳۶۰) بار مکرر آیا ہے اور جب تک یہ نام کسی کی زبان پر ہوگا قیامت نہیں آئے گی۔ اس کے بعد اسماء صفات میں سے رحمان اور رحیم کو ذکر کیا کیونکہ صفات میں سے یہ دو نام سب سے زیادہ عام اور ہمہ گیر تھے کیونکہ یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں یعنی بے حد مہربان اور نہایت رحم والا اور دونوں کا تعلق دو جہانوں سے ہے یعنی عالم دنیا اور عالم آخرت، پھر "رحمت" رقۃ القلب کو کہتے ہیں اس لحاظ سے ان الفاظ کا اطلاق ابتداً اللہ تعالیٰ پر نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ جسم کی ترکیب سے پاک ہے۔ اسی لئے علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پر بعض الفاظ کا اطلاق مبدأ اور ابتدا کے اعتبار سے نہیں ہوسکتا ہے مگر غایت اور نتیجہ کے اعتبار سے ہوجاتا ہے لہٰذا رقۃ القلب کا نتیجہ افاضہ خیر اور شفقت و مہربانی ہوتا ہے اس اعتبار سے رحمت کا اطلاق اللہ کی ذات پر جائز ہے۔

اب یہ بات رہ گئی کہ رحمان کو رحیم پر کیوں مقدم کیا تو علماء کا کہنا ہے کہ رحمٰن کا تعلق دنیا و آخرت دونوں سے ہے نیز یہ رحمت مسلم غیر مسلم انسان اور حیوان تمام کائنات کو شامل ہے اس لئے اس وسعت کی وجہ سے اس کو رحیم پر مقدم کیا اسی لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رحمان میں رحیم کے مقابلہ میں حروف زیادہ ہیں۔ اور "كثرة المباني تدل على كثرة المعاني" قاعدہ ہے لہٰذا اس کو مقدم کیا، بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ رحمان کا تعلق چونکہ براہ راست دنیا سے ہے اور رحیم کا تعلق آخرت سے ہے اور دنیا مقدم ہے اس لئے اس کو مقدم کیا چنانچہ بعض ادعیہ ماثورہ میں "یا رحمان الدنیا و رحیم الاخرة" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

گویا رحمان کا تعلق ربوبیت عامہ سے ہے اور رحیم کا تعلق ربوبیت خاصہ سے ہے، ربوبیت عامہ جیسے مخلوقات کو کھلانا پلانا وجود دینا نعمتوں سے مالا مال کرنا، ہواؤں، دریاؤں چاند ستاروں سورج اور دیگر نعمتوں سے لطف اندوز کرنا ہے اور ہر ایک کے دائرۂ علم میں اس کو زندگی گزارنے کا شعور دینا خواہ وہ انسان ہو یا حیوان ہو خواہ مسلمان ہو یا کافر ہو یہ ربوبیت عامہ ہے لیکن رحیم کا تعلق ربوبیت خاصہ سے ہے یعنی عالم آخرت میں صرف فرمانبردار اور وفادار مسلمانوں پر مہربان ہونا اور نافرمان کفار کو سزا دینا، رب العالمین کے لفظ میں ربوبیت عامہ و خاصہ کی طرف اشارہ ہے کہ دونوں امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں بہر حال ان وجوہات اور نکات کی وجہ سے یہ تقدیم و تاخیر ہے۔

بسم اللہ کا متعلق کیا ہے؟

چونکہ بسم اللہ کے شروع میں با حروف جارہ میں سے ہے اور حرف جر کلام عرب میں کسی اور کلمہ سے وابستہ رہتا ہے لہٰذا علماء

نے بسم اللہ کے متعلق کو بیان کیا ہے۔ علماء نحاۃ میں سے بصریین نے اس کے متعلق محذوف کو فعل قرار دیا ہے مثلاً:
"ابتدأ بسم الله الرحمن الرحيم" بصریین کا خیال ہے کہ فعل کو مقدر ماننے سے جملہ فعلیہ بن جائے گا جو زیادہ بہتر ہے نحاۃ کوفیین نے اس کے مقدر متعلق کا شبہ فعل اسم فاعل، اسم صفت وغیرہ ہونا راجح قرار دیا ہے لہٰذا ان کے ہاں یہ جملہ فعلیہ کے بجائے شبہ جملہ اسمیہ بنے گا۔

پھر نحاۃ کے درمیان اس پر بھی کلام ہے کہ اس مقدر کو بسم اللہ سے مقدم مانا جائے مثلاً "اقرأ بسم الله الرحمن الرحيم" یا اس مقدر کو بسم اللہ سے مؤخر مانا جائے مثلاً "بسم الله الرحمن الرحيم اقرأ" دونوں طرف نحاۃ گئے ہیں اور الگ الگ نکات کی وجہ سے اپنے اپنے مذہب کو ترجیح دی ہے پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا، تاہم لفظ "ابتدا" کے مقدم ہونے کو راجح خیال کیا گیا ہے (کشاف) پھر یہاں باجارہ اور لفظ اللہ کے درمیان اسم کے لفظ کو دو وجہ سے بڑھایا ہے۔ اول یہ کہ اگر باجارہ لفظ اللہ پر داخل ہو جائے تو باللہ قسم کے ساتھ التباس آجائے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسم بڑھانے میں ادب اور عاجزی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ذات باری تعالیٰ تو بہت اونچی ہے اگر اس کے نام سے ابتدا ہو جائے تو یہ بھی بڑی غنیمت ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

هزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

علماء نے لکھا ہے کہ آدمی جس کام کو شروع کرتا ہے اس کی مناسبت سے مقدر فعل نکالنا ہوگا مثلاً پڑھنے لگتا ہے تو "اقرأ بسم الله" کہے یا کھاتا پیتا ہے تو "أكل واشرب بسم الله" کہے یا کوئی اور کام کرتا ہے تو اس کی مناسبت سے فعل مقدر نکالا جائے پھر با کے الف کو بڑھا کر اوپر کی طرف نکال دیا ہے تاکہ با کے الف کے حذف پر نشانی باقی رہے، یہ با استعانت کے لئے بھی ہے، الصاق کے لئے بھی ہے۔

بسم اللہ کی فضیلت:

طفل غنچہ کی چمن میں آج ابتدا ہے
جس طرف دیکھو ادھر اللہ ہی اللہ ہے

بسم اللہ کی سب سے بڑی فضیلت تو یہی ہے کہ قرآن عظیم میں بار بار اس کو دہرا گیا ہے ہر سورت کی پیشانی پر اس کی خوشنما مہر ثبت ہے گویا بسم اللہ ایک سرکاری نشان ہے جس چیز پر یہ نشان ہوگا اس میں برکت ہوگی اور شیطان اس کے قریب نہیں آئے گا۔

تفسیر کبیر نے ایک روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ! جب تم وضو بنانے لگو تو بسم اللہ پڑھا کرو جب تک وضو سے فارغ نہیں ہو گے فرشتے تیرے لئے نیکیاں لکھیں گے۔ جب اپنی بیوی سے ہمبستری کرو تو پہلے بسم اللہ پڑھا کرو، تو غسل جنابت تک فرشتے تیرے لئے نیکیاں لکھیں گے اس جماع کے نتیجہ میں اگر بچہ

ہوا تو اس کے اور اس کی اولاد کے سانس لینے کی مقدار نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اے ابوہریرہ! جب تم سواری پر سوار ہونے لگو تو بسم اللہ اور الحمد للہ پڑھا کرو ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جائے گی، اور جب تم کشتی پر سوار ہونے لگو تو بسم اللہ اور الحمد للہ پڑھو جب تک کشتی سے باہر نہیں آؤ گے برابر نیکیاں لکھی جائیں گی۔

اسی طرح تفسیر کبیر نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ انسان جب لباس اتار دیتا ہے تو اس کی شرمگاہ اور شیاطین کی نظروں کے درمیان پردہ صرف یہ ہے کہ انسان بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھے۔ (تفسیر کبیر ج۱ ص۱۷۱)

حکایت ❶:

تفسیر کبیر میں ایک قصہ لکھا ہے کہ قیصر روم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط لکھا کہ میرے سر میں ہمیشہ درد رہتا ہے آپ مجھے کوئی دوا بھجوادیں۔ امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک ٹوپی روانہ فرمائی کہ اس کو پہنا کرو قیصر روم جب اس ٹوپی کو سر پر رکھتا تو سر کا درد ختم ہو جاتا مگر جب ٹوپی سر سے ہٹا دیتا تو درد پھر شروع ہو جاتا، شاہ روم کو اس پر تعجب ہوا اس نے ٹوپی کو ٹٹولا تو اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا ملا جس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا تھا۔ (تفسیر کبیر ج۱ ص۱۷۱)

حکایت ❷:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے فارس کے مجوسیوں نے کہا کہ آپ اسلام کی حقانیت کا دعویٰ کرتے ہیں لہٰذا آپ ہمیں اس پر کوئی کراماتی نشانی بتادیں تا کہ ہم بھی اسلام قبول کریں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ زہر قاتل لاؤ، وہ لوگ زہر قاتل کا ایک پیالہ لے آئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے پیالہ لے کر اس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ لیا اور سارا زہر پی لیا اور ٹھیک ٹھاک کھڑے ہو گئے۔ مجوسیوں نے کہا یہ دین واقعی سچا دین ہے۔ (تفسیر کبیر ج۱ ص۱۷۲)

حکایت ❸:

کہتے ہیں کہ فرعون نے دعویٰ الوہیت سے پہلے ایک مکان بنوایا تھا اور اس کے باہر والے دروازہ پر بسم اللہ لکھوایا تھا۔ جب فرعون نے ربوبیت کا دعویٰ کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے آکر ان کو وحدانیت کی دعوت دی اور فرعون نے انکار کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے اللہ! میں نے اس شخص کو بار بار دعوت دی ہے لیکن اس میں خیر و بھلائی کی کوئی چیز ہی نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! تم شاید اس شخص کی ہلاکت چاہتے ہو کیونکہ تم اس کے کفر کو دیکھتے ہو لیکن میں اس کے دروازے پر اس کی لکھی ہوئی بسم اللہ کو دیکھتا ہوں۔ (تفسیر کبیر ج۱ ص۱۶۸)

حکایت ❹:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قبرستان پر گزر ہوا آپ نے دیکھا کہ ایک مردے پر قبر میں عذاب کے فرشتے مسلط ہیں اور اس کو سخت عذاب ہو رہا ہے آپ آگے چلے گئے اور کچھ دیر کے بعد واپس آئے آپ نے دیکھا کہ اس مردے کے پاس قبر

میں رحمت کے فرشتے ہر قسم کی نعمتوں کے ساتھ موجود ہیں اور وہ نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بہت تعجب ہوا۔ آپ نے نماز پڑھ کر اللہ سے دعا مانگی کہ اصل حقیقت کھول دے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیج کر بتا دیا کہ اے عیسیٰ علیہ السلام! یہ شخص گنہگار تھا، جب مر گیا تو اپنے گناہوں کی وجہ سے عذاب قبر میں مبتلا ہو گیا مرتے وقت اس نے حاملہ بیوی چھوڑی تھی جس کا بعد میں بچہ پیدا ہوا اس عورت نے اس بچے کو پالا جب بچہ بڑا ہو گیا تو اس کی ماں نے اسے معلم کے پاس بھیج دیا معلم نے اس سے کہا پڑھ بیٹا بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ بچے نے پڑھ لیا تو مجھے حیا آئی کہ میں اس شخص کو زمین کے نیچے عذاب دے رہا ہوں اور اس کا بیٹا زمین کے اوپر میرا نام لے رہا ہے۔ (یعنی معصوم زبان سے کہتا ہے کہ اللہ بڑا مہربان ہے اور بے حد رحم کرنے والا ہے اور اس کے باپ کو عذاب میں رکھوں یہ نہیں ہوگا)۔

بسم اللہ کے بے شمار فوائد اور بے حساب برکات ہیں بس ہمیں چاہیے کہ ہم جب تک زندہ رہیں تو قدم قدم پر کہیں بسم اللہ جب موت آئے تو کہیں بسم اللہ جب قبر میں سوال ہو تو کہیں بسم اللہ جب میدان حشر میں آئیں تو کہیں بسم اللہ جب نامۂ اعمال دیا جائے تو کہیں بسم اللہ جب وزن اعمال ہو تو کہیں بسم اللہ جب پل صراط پر ہوں تو کہیں بسم اللہ جب جنت میں داخل ہوں تو کہیں بسم اللہ جب اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو تو کہیں بسم اللہ۔

لقد بسملت لیلی غداۃ لقیتها
فیا حبذا ذاك الحبیب المبسمل

''جب صبح کو میری ملاقات لیلیٰ سے ہوئی تو اس نے بسم اللہ کہہ کر ملاقات کی واہ واہ بسم اللہ کہنے والا یہ محبوب کیا ہی اچھا تھا''۔

لفظ اللہ جل جلالہ:

جس طرح ذات باری تعالیٰ میں عارفین کی معرفتیں حیران ہیں اور نعرہ زن ہیں کہ "**ما عرفناك حق معرفتك**" اسی طرح لفظ اللہ کی تحقیق و تدقیق میں علماء و عقلاء کی عقلیں حیران ہیں کہ آیا یہ لفظ عبرانی یا سریانی ہے یا عربی ہے؟ بعض علماء مثلاً ابوزید بلخی کا خیال ہے کہ یہ لفظ یا عبرانی ہے یا سریانی ہے کیونکہ اہل کتاب اس کو ''الاھا'' بولتے ہیں اور عبرانی و سریانی کی یہی خصوصیت ہے کہ اس میں الف بڑھایا جاتا ہے جس طرح **بسم الاھا رحمیانا مرحیانا بسم اللہ** میں پڑھتے ہیں عرب نے آخری الف کو حذف کیا تو اللہ رہ گیا یہ تو ان حضرات کا خیال ہے جو اس لفظ کو عجمی مانتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یہ لفظ عربی ہے، کلام اللہ عربی ہے کلام الرسول عربی ہے کلام اہل الجنۃ عربی ہے۔ کیونکہ باقی جتنے اسماء حسنیٰ ہیں اسماء صفات میں سے ہیں تو صفت کے لئے موصوف اور نعت کے لئے منعوت کا پایا جانا ضروری ہے۔

یہاں علماء نے یہ بحث بھی اٹھائی ہے کہ یہ لفظ اگر عربی ہے تو پھر یہ علم ہے یا اسم صفت ہے جامد ہے یا مشتق ہے تو راجح یہی ہے کہ یہ جامد ہے مشتق نہیں اسم علم ہے صفت نہیں، اسی قول کو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ نحاۃ میں سے سیبویہ خلیل ابن احمد، زجاج مبرد اور ابن کیسان نے اختیار کیا ہے۔

جن حضرات نے اس لفظ کو مشتق مانا ہے وہ اس کو یا باب فتح یفتح الہ یالہ بمعنی عبادت و بندگی لیتے ہیں مالوہ ای معبود اور اللہ

معبود ہے یا باب سمع یسمع الہ یالہ بمعنی تحیر و دھش لیتے ہیں کیونکہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے سامنے دہشت زدہ ہے اور اس کی ذات میں حیران ہے۔ سعدی بابا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان وہم
وزہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما ہمچناں دراول وصف تو ماندہ ایم

کسی نے کہا:

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

بعض نے کہا یہ اصل میں **ولاہ** تھا واؤ کو ہمزہ سے تبدیل کیا تو الاہ ہو گیا جیسے وشاح اشاح ہے۔

صاحب کشاف نے کہا کہ یہ اصل میں "الاہ" تھا ابتدا سے ہمزہ کو حذف کر دیا گیا اور اس کے عوض میں الف لام لایا گیا تو اللہ ہو گیا۔ بہر حال اللہ حاجت روا اور مشکل کشا کو کہتے ہیں چنانچہ سیبویہ کی طرف منسوب ہے:

معنی اللہ گفت سیبویہ
یولھون فی حوائجھم لدیہ

یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ ہر وقت ہر حاجت میں اس کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور وہ کسی وقت کسی چیز میں کسی کا محتاج نہیں۔

اس مبارک اسم کی خصوصیات:

اس مبارک نام کی چند لفظی خصوصیات یہ ہیں:

1. یہ نام صرف اللہ ہی کا ہے مخلوق میں سے کسی کا نام نہ ہوا ہے اور نہ جائز ہے۔
2. اس نام کی طرف دیگر اسماء تو منسوب ہوتے ہیں جیسے کتاب اللہ، ناقۃ اللہ، ارض اللہ، بیت اللہ، مگر یہ کسی کی طرف منسوب نہیں ہوتا ہے۔
3. حرف ندا کے حذف کے موقع پر اس کے آخر میں میم مشدد بڑھا کر **اللّٰھم** کہنا درست ہے۔
4. لفظ اللہ کے الف لام تعریف کے ساتھ یا حرف ندا کا آنا جائز ہے دیگر اسماء ایسے نہیں جیسے یا اللہ۔
5. قسم واللہ باللہ تاللہ کے ساتھ خاص ہے۔

خطبۂ کتاب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ، وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ شَھَادَۃً تَکُوْنُ لِلنَّجَاۃِ وَسِیْلَۃً، وَلِرَفْعِ الدَّرَجَاتِ کَفِیْلَۃً۔

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، ہم سب اسی کی تعریف کرتے ہیں اور اسی سے مدد کے طلبگار اور مغفرت کے خواستگار ہیں اور ہم اپنے نفس کی برائیوں اور اپنی بداعمالیوں سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے گمراہی میں چھوڑ دیا اس کو کوئی سیدھا راستہ دکھانے والا نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ایسی گواہی جو نجات کے لئے وسیلہ ہو اور درجات کی بلندی کے لئے ضامن ہو"۔

توضیح: الحمد للہ: حمد سمع سے ثناء اور تعریف کے معنی میں ہے اس میں الف لام استغراق کے لئے بھی ہوسکتا ہے یعنی حمد وثناء کا ہر ہر فرد اللہ ہی کے لئے ہے اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ تعریف تو مخلوق کی بھی ہوتی ہے تو یہ اختصاص کس طرح؟ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا جس چیز کی بھی تعریف ہوتی ہے وہ اللہ ہی کی تعریف ہے کیونکہ اصل میں کائنات کے ہر کمال وجمال کا خالق ومالک اللہ ہے یہی وجہ ہے کہ عارفین کہتے ہیں کہ جب کسی اچھی آواز یا اچھی صورت یا اچھے کمال پر کسی کی تعریف کرو تو کہو کہ وہ اللہ کتنا بڑا ہے جس نے اس مخلوق کو یہ اچھی آواز اور خوبصورت شکل اور اعلیٰ کمال عطا کیا ہے۔

الف لام جنس کے لئے بھی ہوسکتا ہے جنس حمد اور حقیقت حمد وثناء اللہ کے لئے ہے جو افراد کے ضمن میں ہے۔ کیونکہ جنس کی حقیقت بھی افراد کے ضمن میں ہوتی ہے تو نتیجہ وہی نکلا کہ حمد کے تمام افراد اللہ کے لئے ہیں۔ الف لام عہد خارجی کے لئے بھی لیا جاسکتا ہے پھر اس سے اللہ تعالیٰ کے وہ محامد وصفات مراد ہوں گے جو کسی مخلوق کے لئے کسی صورت میں جائز نہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص صفات صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں اس صورت میں الحمد للہ کے اختصاص پر کوئی اعتراض نہیں آئے گا کیونکہ یہ صفات غیر اللہ میں آہی نہیں سکتی ہیں "الحمد هو الثناء باللسان على الجميل الاختياري على جهة التعظيم"۔

یہ حمد کی اصطلاحی تعریف ہے اس میں لسان سے مراد آلہ تعبیر ہے تو اب یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی تعریف کی ہے وہاں لسان وزبان کہاں ہے؟ نیز کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کی تعریف میں لگا ہوا ہے وہاں زبان کہاں ہے تو جواب ہو گیا کہ ہر چیز کی زبان سے مراد آلہ تعبیر ہے جو اس کے مناسب حال ہو:

وفي كل شي له آية
تدل على انه واحد

جمیل اختیاری سے وہ جمال نکل گیا جو اختیار میں نہ ہو جیسے موتی کی چمک دمک ہے کہ اس کی تعریف حمد نہیں بلکہ اس کی تعریف کو مدح کہتے ہیں مثلاً **مدحت اللؤلؤ علی صفائه**۔

اسی طرح علی جھة التعظیم سے استہزاء کی صورت نکل گئی جیسے کسی ان پڑھ کو کوئی شخص کہتا ہے علامہ صاحب آ گئے یہ استہزاء ہے۔

حمد اور شکر میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ حمد کے لئے ضروری ہے کہ زبان سے ہو مقابلہ میں احسان وانعام ہو یا نہ ہو لیکن شکر کے لئے مقابلہ میں نعمت واحسان کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

پھر شکر زبان سے بھی ہوتا ہے اور زبان کے علاوہ جسم سے بھی ہو سکتا ہے لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کے درمیان اس طرح کی نسبت ہے کہ حمد اپنے مورد کے اعتبار سے خاص ہے مگر متعلق کے اعتبار سے عام ہے اور شکر مورد کے اعتبار سے عام ہے لیکن متعلق کے اعتبار سے خاص ہے۔ مورد سے مراد وارد ہونے کی جگہ یعنی زبان ہے۔ شکر کی تعریف یہ ہے کہ:

فعل ینبیء عن تعظیم المنعم۔

نحمدہ: پہلے حمد کو جملہ اسمیہ استمراریہ کی صورت میں ذکر کیا تھا اب حمد کو جملہ فعلیہ کی صورت میں لائے تا کہ تجدد اور حدوث پر دلالت کرے کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں تجدد ہوتا ہے اسی طرح مخلوق کی طرف سے حمد میں بھی تجدد کا جذبہ ہونا چاہیے۔

اب یہاں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جمع متکلم کا صیغہ لا کر مصنف رحمہ اللہ نے یہ اشارہ کیا ہے کہ میں اکیلے اللہ تعالیٰ کی حمد کیسے ادا کر سکتا ہوں ہم سب مخلوق مل کر کچھ نہ کچھ کر سکیں گے۔

ونستعینه: استعانت مدد طلب کرنے کے معنی میں ہے چونکہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہر وقت ہر ضرورت میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اس لئے مجموعی طور پر ہم سب اللہ تعالیٰ سے مدد واستعانت چاہتے ہیں اس لئے یہاں بھی جمع کا صیغہ لائے ہیں اور سین اور تا طلب کے لئے ہے۔

ونستغفرہ: استغفار میں بھی سین تا طلب کے لئے ہے اور "غفر غفران" چھپانے اور ڈھانکنے کے معنی میں ہے مغفرت ومعافی دینے سے بھی گناہوں کو چھپایا جاتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس جملہ سے پہلے حمد واستعانت کا ذکر تھا مصنف رحمہ اللہ نے اشارہ کیا کہ حمد واستعانت میں اگر کوتاہی رہ گئی ہو تو اس پر ہم اجتماعی استغفار کرتے ہیں کیونکہ ذات باری تعالیٰ کی رفعت وعظمت اور جلال وکمال کے لائق اخلاص کے ساتھ حق کہاں ادا ہو سکتا ہے۔

ونعوذ باللہ من شرور انفسنا: کوتاہی اور قصور پر استغفار کرنے کے بعد مصنف رحمہ اللہ اس جملہ میں یہ واضح فرما رہے ہیں کہ نفس وشیطان کی داخلی شرارت، خرابی نیت، ریاکاری، کینہ وحسد اور عجب وتکبر سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ یعنی تمام باطنی قبائح اور ظاہری رذائل سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

ومن سیئات اعمالنا: اور تمام ظاہری اعمال سیئہ کے ارتکاب سے اور محرمات ومکروہات کے صادر ہونے سے اور عبادات وریاضات میں سستی وغفلت کے ارتکاب سے پناہ مانگتے ہیں۔

من یهدہ اللہ فلا مضل له ومن یضلل فلا هادی له: اس سے پہلے اعمال اور شرور وسیئات کی نسبت نفس کی

طرف کی گئی جس سے یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ نفس خود اپنے افعال کا خالق ہے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ بندہ صرف کاسب ہے۔ افعال و اعمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے خلق شر میں تخلیق کمال ہے اگرچہ شر کا استعمال معیوب ہے تو ہدایت و اضلال اور اس کی حکمت صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ اسی کو مکمل اختیار ہے وہ جسے ہدایت دینا چاہے تو ہدایت دیدے کسی کو گمراہ کرنا چاہے تو گمراہ کر دے بندہ کو اختیار نہیں۔

ہدایت راہ نمائیدن کو کہتے ہیں۔ یہ دو قسم پر ہے ایک "**اراءۃ الطریق**" یعنی کسی کو زبان سے سمجھا دیا کہ سیدھا راستہ اس طرف گیا ہے فلاں فلاں نشان کے بعد پہنچ جاؤ گے۔ یہ **اراءۃ الطریق** کہلاتا ہے کہ راہ راست پر لگا دیا، چلا دیا اس میں یہ ضروری نہیں کہ وہ آدمی منزل مقصود تک پہنچ ہی جائے بلکہ ممکن ہے کہ وہ اس راستہ کو چھوڑ دے اور ممکن ہے کہ منزل تک پہنچ جائے۔ ہدایت کی دوسری قسم "**ایصال الی المطلوب**" ہے وہ یہ کہ کسی کو ہاتھ سے پکڑ کر منزل مقصود پر جا کر اتار اجائے اس میں منزل تک پہنچنا یقینی ہوتا ہے اور بھٹکنے کا احتمال نہیں ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں انبیائے کرام علیہم السلام سے ہدایت دینے کی نفی آئی ہے جیسے "**انك لا تهدی من احببت**" وہاں ہدایت سے مراد **ایصال الی المطلوب** ہے، ورنہ انبیائے کرام کو تو ہدایت مخلوق ہی کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اسی طرح "**واما ثمود فهديناهم فاستحبوا العمی علی الهدی**" میں ہدایت سے مراد صرف **اراءۃ الطریق** ہے **ایصال الی المطلوب** نہیں۔

باقی اللہ کی طرف اضلال کی نسبت اثرِ مرتب اور تخلیق کے طور پر ہے ورنہ اللہ تعالیٰ نے قلوب بنی آدم میں ہدایت کی جو استعداد پیدائش کے وقت رکھ دی ہے وہ ماحول اور معاشرہ کے اردگرد کے اثرات سے خود انسان ضائع کرتا ہے جب وہ استعداد ختم ہو جاتی ہے تو اس پر اثر مرتب کا نام مہر جباریت ہے اور یہی اضلال ہے تو قصور خود اس انسان کاسب کا ہے۔

واشهد ان لا اله الا الله: مصنف رحمۃ اللہ علیہ یہاں شہادت کے ذکر کرنے میں مفرد کا صیغہ لائے ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شہادت اور گواہی امر باطنی، امر قلبی ہے جس کی ذمہ داری ہر آدمی کی اپنی اپنی ہے لہٰذا دوسروں کو اس میں شریک کرنا مشکل ہوتا ہے نیز شہادت کا صیغہ عام طور پر احادیث میں بھی مفرد لایا گیا ہے اس کی پیروی میں مفرد کا صیغہ لائے اور صرف اپنی شہادت کا ذکر کیا۔

توحید کی شہادت یہ ہے کہ اس کارخانۂ عالم کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہے اور اس میں ہر حرکت وسکون بلا شرکت غیر صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے وہ فاعل مختار ہے اس کی ذات وصفات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

یقیں دانم دریں عالم کہ لا معبود الا ھو
ولا مقصود فی الکونین ولا موجود الا ھو
چوں تیغ لا بدست آری بیا تنہا چہ غم داری
مجو از غیر حق ۔ یاری کہ لا فتاح الا ھو

شهادة تكون للنجاة وسيلة ولرفع الدرجات كفيلة: شہادت منصوب ہے اور یہ مفعول مطلق ہے، پھر یہ موصوف ہے اور بعد کی عبارت اس کی صفت ہے، نجات سے مراد دنیا و آخرت کے عذاب سے خلاصی ہے اس عذاب سے خلاصی پا کر جنت پہنچنا نجات ہے۔ وسیلہ یہ سبب اور ذریعہ کے معنی میں ہے علت کے معنی میں نہیں کیونکہ اصل علت اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل ہے، رفع الدرجات کا مطلب یہ ہوا کہ جب بار بار اس شہادت سے ایمان کو تازہ رکھے گا تو درجات بلند ہوں گے اور یہی شہادت توحید ان درجات کی بلندی کی ضمانت بنے گی شہادت کے ساتھ یہ فوائد لگا کر مصنف عفی اللہ عنہ بتا رہے ہیں کہ یہ شہادت اس وقت نافع اور فائدہ مند ہوگی جب اس میں ریاکاری نہ ہو۔

نووی ۲۹ شرح ۹۰۲۱

وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ الَّذِي بَعَثَهُ وطُرُقُ الْإِيمَانِ قَدْ عَفَتْ آثَارُهَا، وَخَبَتْ أَنْوَارُهَا، وَوَهَنَتْ أَرْكَانُهَا، وَجُهِلَ مَكَانُهَا.

ترجمہ: اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاجت روا مشکل کشا نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت اپنا رسول بنا کر بھیجا جب ایمان کی راہوں کے نشان مٹ چکے تھے اور اس کی روشنیاں بجھ چکی تھیں، اور اس کے آثار وستون کمزور پڑ چکے تھے اور اس کی بنائی ہوئی منزل نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

توضیح: توحید اور وحدانیت کی گواہی سے فارغ ہو کر مصنف اقرار رسالت اور اثبات رسالت کی شہادت بیان فرما رہے ہیں۔

محمد: یہ آنحضرت ﷺ کے اسماء مبارکہ میں سب سے مشہور نام ہے آپ ﷺ کا دوسرا نام احمد ہے سابقہ کتب سماویہ میں اور آسمان پر فرشتوں کے ہاں آپ کا نام احمد زیادہ مشہور ہے۔ آپ ﷺ کے سو ناموں کا ہونا مشہور ہے ان ناموں میں صرف کثرت اسماء کا فلسفہ کارفرما نہیں بلکہ ہر نام ایک طویل حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ طویل صفات آنحضرت ﷺ کی شخصیت اور ذات مبارکہ میں موجود تھیں چنانچہ محمد اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ صفت سے اسمیت کی طرف منقول ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ذات جو ستودۂ کائنات ہے یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا مدح خواں ہے۔

تاریخ اسلام کی کتابوں میں لکھا ہے کہ قریش نے حضور اکرم ﷺ کے دادا عبدالمطلب سے پوچھا کہ آپ نے اپنے پوتے کا نام محمد ﷺ کیوں رکھا؟ آپ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ زمین وآسمان والوں کی طرف سے ان کی تعریف ومدح ہو۔ اسی نکتہ کی طرف دربارِ رسول ﷺ کے شاعر حضرت حسان رضی اللہ عنہ اس طرح اشارہ فرماتے ہیں:

وضم الاله اسم النبي باسمه
اذا قال فى الخمس المؤذن اشهد
فشق له من اسمه ليجله
فذو العرش محمود وهذا محمد

"اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کا نام اپنے نام کے ساتھ ملا کر رکھا جب مؤذن پانچ وقت کی اذان میں اشہد کہہ کر نام لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بطور اعزاز و اکرام آپ ﷺ کا نام اپنے نام سے مشتق کیا ہے پس عرش والا المحمود ہے اور یہ محمد ہے۔"
اسی کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے "**ورفعنا لك ذكرك**"۔
اس مبارک نام کو جو شخص زبان پر لاتا ہے تو دو دفعہ میم پر ہونٹوں کو ملا کر ایک دوسرے کو بوسہ دیتا ہے۔ یہ نام عرب میں بہت کم ملتا ہے بلکہ سابقہ کتب میں آنحضرت ﷺ کی بشارات کے پیش نظر بعض لوگوں نے اپنی اولاد کا نام محمد رکھا تھا تا کہ وہ نبی آخر زمان بن جائے مگر پورے عرب میں یہ صرف چھ آدمی تھے جو نہ ہونے کے برابر تھے۔
بہر حال نام محمد ﷺ میں چونکہ صاحب صفات حمیدہ کا مفہوم پڑا تھا اس لئے قریش نے جب اس مشکل کو محسوس کیا کہ زبان سے جب محمد کا نام لیا جائے تو صفات حمیدہ کا اقرار لازم آتا ہے۔ اور پھر مذمت کرنے سے واضح تضاد نظر آتا تھا تو انہوں نے محمد ﷺ کے بجائے مذمم کی مذمت شروع کی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے کس طرح مجھ سے قریش کی مذمت ہٹا دی ہے اب وہ مذمم کی مذمت کرتے ہیں اور میں تو محمد ہوں۔
احمد: بھی آنحضرت ﷺ کے مشہور ناموں میں سے ایک نام ہے جو وصفیت سے اسمیت کی طرف منتقل ہو گیا۔ احمد کے معنی سب حامدین سے زیادہ حمد و ثناء کرنے والا یعنی احمد الحامدین اور آنحضرت ﷺ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف اور حمد و ثناء کرنے والے تھے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے عمدہ اور سب سے اعلیٰ تعریف آنحضرت ﷺ کی فرمائی ہے کسی نے کیا خوب فرمایا:

خدا در انتظار حمد ما نیست
محمد چشم بر راہ ثنا نیست
خدا مدح آفرین مصطفی بس
محمد حامد حمد خدا بس
محمد از تو میخواہم خدا را
خدایا از تو عشق مصطفی را

عبدہ ورسولہ: منصب رسالت اگر چہ اونچا مقام ہے اور مقامات بشریت میں انتہائی ارفع و اعلیٰ کمال ہے مگر عبد کا رتبہ چونکہ اصل وضع میں عبدیت میں مضمر ہے اس لئے اس کو رسالت پر مقدم کیا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے عبد کا ذکر سب سے زیادہ اعزاز و اکرام کے مواقع میں آنحضرت ﷺ کے لئے کیا ہے چنانچہ معراج پر لے جانے کے وقت "**سبحان الذی اسریٰ بعبدہ**" فرمایا اور پھر سدرۃ المنتہیٰ کے شریف ترین مقام پر عبد کی طرف اضافت تشریفی کر کے فرمایا "**فاوحی الی عبدہ ما اوحی**" لہٰذا یہاں بھی عبد کے محبت بھرے الفاظ سے انتہائی قرب کا اشارہ فرمایا ایک شاعر نے لوگوں سے کہا کہ مجھے محبوبہ کا عبد کہہ کر پکارا کرو:

لا تدعني الا بيا عبدها
فانه اشرف اسمائيا

نیز اس لفظ میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ عبد کتنے ہی بلند مقام پر پہنچ جائے وہ پھر بھی عبد ہے معبود نہیں۔ معبود صرف اللہ کی ذات ہے خالق خالق ہے اور مخلوق مخلوق ہے۔ کسی نے کہا:

محمد بشر ليس كالبشر
وياقوت حجر ليس كالحجر
وكم طيب يفوح ولا كمسك
وكم طير يطير ولا كبازي

رسول اور نبی میں فرق:

رسول لغت میں قاصد اور پیغام پہنچانے والے کے معنی میں آتا ہے اور اصطلاح میں رسول کی تعریف اس طرح ہے:

انسان بعثه الله الى الخلق لتبليغ الاحكام معه كتاب متجدد۔

یہاں انسان کہہ کر جنات اور ملائکہ سے احتراز کیا کیونکہ انسان بشر کے معنی میں فرشتوں اور جنات کے مقابلہ میں آتا ہے۔
ہدایۃ النحو کی شرح **الھامیہ** میں رسول کی یہی مندرجہ بالا تعریف کر کے قیودات میں لکھا ہے کہ ''انسان'' کہا ''رجل'' نہیں کہا تا کہ انسان کا لفظ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی شامل رہے پھر **صاحبِ الھامیہ** نے لکھا ہے کہ عورتوں کو بھی نبی بنایا گیا جیسے حضرت مریم، حضرت آسیہ اور حضرت فاطمہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن۔
اس اللہ کے بندے نے اس مقام میں دانستہ یا نادانستہ طور پر کئی غلطیوں کا ارتکاب کیا اول تو اس نے ایک اجماعی عقیدہ اور نصوص قرآنیہ کی واضح تصریحات واشارات کے خلاف عورتوں کے لئے نبوت اور رسالت ثابت کرنے کی کوشش کی دوم انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے نبوت ثابت کرنے کی بات کر کے ختم نبوت کے قطعی نصوص کی واضح خلاف ورزی کی کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی اکرم ﷺ خاتم النبیین نہیں تھے بلکہ آپ کے بعد عائشہ اور فاطمہ بھی نبی بنیں۔ میں کہتا ہوں کہ **صاحبِ الھامیہ** نے اپنی ہی ایک بنائی ہوئی تعریف کی ایک قید احترازی کے لئے اتنی بڑی بات کہہ دی حالانکہ یہ تعریف کوئی آسمانی وحی نہیں ہے اور اس میں اس قید کی حیثیت بھی ایک شخص کی ذہنی نکتہ سنجی ہے۔ نہ یہ حدیث ہے نہ آیت ہے نہ کوئی اجماع امت کا فیصلہ ہے جس کے سامنے ہم مجبور ہوں۔ الہامیہ چھاپنے والوں پر لازم ہے کہ وہ قرآن وحدیث سے متصادم یہ باتیں آئندہ نکال دیں۔

نبی کی تعریف یہ کہ:

انسان بعثه الله الى الخلق لتبليغ الأحكام۔

اب علماء کے ہاں یہ بحث چلی ہے کہ رسول اور نبی میں کیا فرق ہے؟
بعض علماء نے لکھا ہے کہ دونوں میں ترادف ہے کیونکہ قرآن کریم میں رسول اور نبی کا اطلاق بیک وقت ایک ہی ذات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً "وکان رسولا نبیا" یہ اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے۔ بعض علماء نے رسول اور نبی کی تعریفوں کو دیکھ کر تباین کا قول کیا کہ رسول کے پاس نئی شریعت ہوتی ہے اور نبی نئی شریعت لے کر نہیں آتا ہے بلکہ سابقہ شریعت کی تجدید کے لئے آتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں سورۂ حج کی آیت: "وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی" میں رسول پر نبی کا عطف ہوا ہے جو مغایرت کو چاہتا ہے اسی طرح احادیث میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے اور رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ بتائی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں تغایر و تباین ہے۔
رسول کی اس تعریف پر ایک اعتراض ہے کہ آسمانی صحیفے کل ایک سو ہیں اور بڑی کتابیں کل چار ہیں اور رسول کل تین سو تیرہ ہیں تو ہر رسول کے پاس کتاب کہاں سے آئے گی؟
نیز اسماعیل علیہ السلام کو قرآن، رسول کے نام سے ذکر کرتا ہے حالانکہ ان کے پاس کوئی نئی کتاب نہیں تھی اس اعتراض کا جواب محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے درس بخاری کے دوران شاہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اس طرح دیا تھا کہ شاہ صاحب نے ایک دفعہ مجھے بلا کر نہایت خوشی کے عالم میں مجھ سے فرمایا کہ کتابوں میں مجھے رسول اور نبی کا فرق مل گیا اور وہ اس طرح کہ نبی وہ ہوتا ہے جو مسلمانوں کی طرف بھیجا گیا ہو، معاشرہ میں غیر مسلم بھی ہوں اور مسلم بھی ہوں مگر رسول وہ ہوتا ہے جو خالص قوم کفار کی طرف بھیجا گیا ہو اور ان کا اس قوم کے ساتھ خوب مقابلہ بھی ہو جائے۔ لہٰذا حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے جتنے پیغمبر آئے ہیں وہ انبیاء تھے۔ اور نوح علیہ السلام کے وقت رسولوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مقابلے ہوئے چنانچہ آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے کفار کی طرف بھیجے گئے جیسا کہ جب آپ آئے تو روئے زمین پر کفر و شرک ہی تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ کیا اور غلبہ پالیا۔
الذی بعثه: یہ رسول کی صفت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مکہ میں چالیس سال کی عمر میں ہوئی اور جن وانس کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عام تھی صرف ان پڑھ عرب کے لئے نہ تھی جیسا کہ عیسائی دھوکہ دیتے ہیں کہ قرآن نے آپ کو "لیکون للعالمین نذیرا" فرمایا اور آپ نے خود فرمایا: "وارسلت الی الخلق کافة" یعنی تمام انسانوں اور جنات کے لئے مجھے رسول بنا کر بھیجا گیا۔
طرق الایمان قد عفت أثار ھا: طرق جمع طریق ہے اور طریق راستہ کو کہتے ہیں اور یہاں واؤ حالیہ ہے۔ اور طرق الایمان سے مراد انبیائے کرام، ان کی تعلیمات اور آسمانی کتابیں ہیں کہ ہدایت کے یہ سارے راستے مٹ چکے تھے اور اس کے نشانات ختم ہو چکے تھے۔
یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت انبیائے کرام کی تعلیمات ناپید ہو چکی تھیں، صحیح رہبری کا وجود نہیں تھا، کہیں کہیں خفیہ غاروں میں کوئی عیسائی پادری راہب ہوگا لیکن وہ عامۃ الناس کے سامنے آنے کی حالت میں نہیں تھے اور نہ قیادت کر سکتے

تھے۔ انبیائے کرام کے علوم و معارف کی قدر و منزلت سے ناواقفیت عام تھی اور ان مراکز دینیہ کے مراجع لوگ بھول چکے تھے الغرض تاریکی اور گمراہی کا دور دورہ تھا۔

مورخہ ۳۰ شوال ۱۴۰۹ھ

فَشَيَّدَ صَلَوَاتُ اللهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ مِنْ مَعَالِمِهَا مَا عَفَا، وَشَفَىٰ مِنَ الْعَلِيلِ فِي تَأْيِيدِ كَلِمَةِ التَّوْحِيدِ مَنْ كَانَ عَلَىٰ شَفَا، وَأَوْضَحَ سُبُلَ الْهِدَايَةِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَسْلُكَهَا، وَأَظْهَرَ كُنُوزَ السَّعَادَةِ لِمَنْ قَصَدَ أَنْ يَمْلِكَهَا۔

ترجمہ: پس نبی اکرم ﷺ نے ان مٹے ہوئے نشانات کو از سر نو نمایاں اور مستحکم کر کے بلند اور مضبوط کیا اور کلمۂ توحید کی تعلیم سے اس بیمار کو شفا پہنچائی جو ہلاکت کے کنارے جا پہنچا تھا اور اس شخص کے لئے ہدایت کے راستہ کو روشن کیا جو اس پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہو اور نیک بختی و سعادت کے خزانے اس شخص کے لئے ظاہر کئے جو اس کے مالک ہونے کا قصد کرتا ہو۔

توضیح: **شید:** تشیید سے ہے یہ گچ کرنے، پلستر کرنے اور بلند و مضبوط کرنے کے معنی میں آتا ہے "**وقصر مشید**" اسی سے ہے۔

"**معالم**" معلم کی جمع ہے راستے وغیرہ کے نشان کو کہتے ہیں۔

"**ما عفا**" میں ما موصولہ ہے اور عفا صلہ ہے۔ موصول صلہ سے مل کر شید کے لئے مفعول بہ ہے۔

اور **من معالمها** یہ بیان مقدم ہے **ما عفا** کے لئے اور صلوات اللہ علیہ وسلامہ بیچ میں جملہ معترضہ ہے

"**ای شید ما عفی من معالمها صلوات الله علیه وسلامه**"۔

وشفی من العلیل فی تائید کلمة التوحید من کان علی شفا: شفی کا عطف **شید** پر ہے اور **شید** میں ضمیر فاعل آنحضرت ﷺ کی طرف لوٹتی ہے اور **من کان علی شفا** اس کا مفعول بہ ہے اور **شفا** اول اور **شفا** ثانی میں صفت جناس ہے کہ لفظاً دونوں کلمے مشابہ ہیں۔ اس جملے میں قرآن کریم کی آیت "**و کنتم علی شفا حفرة من النار**" کی طرف اشارہ ہے۔

اور **من العلیل** کو مقدم کیا تا کہ عبارت میں سجع کا حسن پیدا ہو جائے، یہ **من**، **کان** کا بیان ہے اور **فی تائید کلمة التوحید** جار و مجرور "**شفی**" کے ساتھ متعلق ہے اور فی تعلیل کے لئے ہے۔ عبارت اس طرح ہے: "**وشفی بسبب کلمة التوحید من کان علی شفا من العلیل**" یعنی کلمہ توحید کی تعلیم کے ذریعہ سے آنحضرت ﷺ نے اس بیمار کو شفا پہنچائی جو تباہی کے کنارے پر پہنچ گیا تھا۔

سبیل: لفظ سبیل مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس لئے "**سلکها**" میں مؤنث کی ضمیر سبیل کی طرف لوٹائی گئی ہے نیز یہ بھی یاد رکھیں کہ ضمیر مؤنث و مذکر میں "**زیدها هو**" کی طرح دونوں کی گنجائش ہے یعنی لفظ زید اگر مراد

ہے تو ھو ضمیر ہے اور اگر لفظ زید سے مراد کلمہ لیا جائے تو ھا ضمیر لوٹانا جائز ہے۔ تو کہہ سکتے ہیں زید ھا ھو۔

کنوز السعادۃ: سے مراد نیک بختی اور سعادت دارین کے معنوی خزانے ہیں جیسے علوم دینیہ اچھے اور حمیدہ اخلاق اور صالح اعمال یہ سب کنوز سعادت ہیں۔

اما بعد: کلام کا ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل کرنے کے لئے فصحاء اور بلغاء اما بعد کا لفظ استعمال کرتے ہیں تا کہ کلامین میں فصل آجائے یہ لفظ قدیم عرب کے خطباء نے بھی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

قد علم الحی الیمانین اننی
اذا قلت اما بعد انی خطیبھا

کتاب کے خطبوں میں اما بعد کا مضاف الیہ عموما محذوف ہوتا ہے اور اما قائم مقام فعل شرط ہوتا ہے یعنی "مھما یکن شیء من الاشیاء بعد الحمدلۃ والبسملۃ والتصلیۃ فھو کتابی ھذا"۔ یہ حصر ادعائی ہے جو جائز ہے۔

بعد: ظروف زمانیہ میں سے ہے اگر اس کا مضاف الیہ مذکور ہو یا نسیا محذوف ہو تو دونوں صورتوں میں یہ معرب ہوتا ہے اور اگر اس کا مضاف الیہ محذوف منوی ہو تو یہ مبنی علی الضم ہوتا ہے۔ چونکہ یہ کلمہ بہت خفیف ہو کر رہ گیا ہے اس لئے اس کو اثقل الحرکات ضمہ پر مبنی کیا گیا تا کہ ضمہ کی وجہ سے اس میں کچھ ثقل آجائے پھر چونکہ "اما" معنی شرط کو متضمن ہے اس لئے بعد میں فاء جزائیہ لایا جاتا ہے لیکن جہاں صرف "وبعد ہے" وہاں بھی کبھی کبھی فاء جزائیہ لایا جاتا ہے حالانکہ وہاں فاء جزائیہ لانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بعض شارحین کہتے ہیں کہ فاء توہم "اما" کی وجہ سے ذکر کیا گیا ہے یعنی مصنف کو وہم ہو گیا کہ آیا میں نے اما بعد لکھا ہے یا وبعد لکھا لہٰذا اما بعد کا خیال غالب آیا اور پھر فاء جزائیہ کا ذکر کیا گیا۔ یہ وجہ عجیب اور انتہائی کمزور ہے کیونکہ اس طرح مجموعہ نسیان اگر مصنف ہوگا تو وہ آگے چل کر کیا لکھے گا جس کو سامنے لکھی ہوئی عبارت میں اس وقت وہم ہو گیا جبکہ عبارت قلم کی نوک پر تھی۔ درحقیقت وبعد کے بعد جو فاء جزائیہ کسی نے ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد زمانیہ کے ساتھ معاملہ حرف شرط کا کیا گیا ہے جس طرح قرآن کریم میں ہے "واذ لم یھتدوا بہ فسیقولون ھذا افک قدیم" یہاں اذ ظرفیہ ہے جو معنی شرط کو متضمن ہے لہٰذا فاء لائی گئی یہی صورت وبعد کی بھی ہے۔

اب یہ ایک الگ بحث ہے کہ سب سے پہلے اما بعد کے الفاظ کس نے استعمال کئے تو یہاں کئی اقوال ہیں مگر راجح یہ ہے کہ سب سے پہلے اس لفظ کو حضرت داؤد علیہ السلام نے استعمال فرمایا ہے۔ مفسرین نے کہا کہ "واتیناہ الحکمۃ وفصل الخطاب" میں یہ خطاب فاصل اما بعد کا کلمہ تھا جو حضرت داؤد علیہ السلام نے استعمال کیا تھا۔

پھر عام خطبوں میں نبی اکرم ﷺ نے بھی اس کو استعمال فرمایا اور تا حال استعمال ہوتا ہے لہٰذا یہ مستحب ہے کہ ہر خطیب اپنے خطبہ میں اس کو استعمال کرے۔

﴿اَمَّا بَعْدُ﴾ فَاِنَّ التَّمَسُّكَ بِهَدْيِهٖ لَا يَسْتَتِبُّ اِلَّا بِالْاِقْتِفَاءِ لِمَا صَدَرَ مِنْ مِشْكٰوتِهٖ وَالْاِعْتِصَامَ بِحَبْلِ اللّٰهِ لَا يَتِمُّ اِلَّا بِبَيَانِ كَشْفِهٖ وَكَانَ كِتَابُ الْمَصَابِيْحِ الَّذِيْ صَنَّفَهُ الْاِمَامُ مُحْيِ السُّنَّةِ قَامِعُ الْبِدْعَةِ

أَبُو مُحَمَّدٍ الْحُسَيْنُ ابْنُ مَسْعُوْدٍ الْفَرَّاءُ الْبَغَوِيُّ رَفَعَ اللهُ دَرَجَتَهُ أَجْمَعَ كِتَابٍ صُنِّفَ فِيْ بَابِهِ، وَأَضْبَطَ لِشَوَارِدِ الْأَحَادِيْثِ وَأَوَابِدِهَا۔

ترجمہ: بعدازاں جاننا چاہیئے کہ نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کواختیار کرنا اسی وقت معتبر ہوسکتا ہے کہ اس چیز کی کامل اتباع کی جائے جوآپ کے سینۂ مبارکہ سے ظاہر ہوئی تھی" یعنی آپ کے ارشادات واحکام" اسی طرح خدا کی مضبوط رسی یعنی قرآن کریم پر اعتماد اور اس پر عمل جب ہی ممکن ہوسکتا ہے کہ اس کی تشریح وتوضیح احادیث نبوی سے ہو (ادھر احادیث کی کتابوں میں) امام محی السنۃ (یعنی سنتوں کوزندہ کرنے والے) اور قامع البدعۃ (بدعت کومٹانے والے) ابومحمد حسین الفراء البغوی عَلَیہِ الرَّحمَہ، (اللہ ان کے درجات بلند کرے) نے جوکتاب مصابیح تالیف فرمائی تھی وہ اپنے فن کی ایک جامع کتاب تھی جس میں امام موصوف نے نہایت حسن وخوبی کے ساتھ منتشر ومتفرق احادیث کوجمع فرمایا تھا۔

توضیح: یہاں سے صاحب مشکوٰۃ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے باوجودیکہ اعلیٰ درجہ کی قابل اعتماد حدیث کی کتاب مصابیح موجود تھی پھر مشکوٰۃ المصابیح کی تالیف کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ممکن نہیں جب تک کہ آپ کی احادیث کاعلم حاصل نہ کیا جائے اسی طرح قرآن کریم کے تفصیلی احکامات پر عمل کرنا بغیر احادیث کے ممکن نہیں ہے۔

ان دونوں اہم مقاصد کے حصول کے لئے حدیث کی ضرورت تھی اور حصول حدیث کے لئے ایک جامع کتاب کی ضرورت تھی جس میں ہرقسم کی ضروری احادیث کوجمع کیا گیا ہو، اس طرح کی جامع کتاب امام حدیث، شیخ محی السنۃ کی کتاب مصابیح تھی جواپنے فن میں عمدہ ترین کتاب تھی۔

لا یستتب: یہ لفظ باب استفعال سے ہے جوبمعنیٰ **لا یستقیم** اور **لا یستمر** کے ہے۔

الاقتفاء: تلاش کرنے اورٹٹولنے کے معنی میں ہے، مراد اتباع اور پیروی ہے۔

مشکاته: **مشکاة** غیرنافذہ طاقچہ کوکہا جاتا ہے، آنحضرت ﷺ کے قلب منور کوروشن چراغ قرار دیا جوسینۂ اطہر میں رکھا گیا ہے توسینہ کی تشبیہ طاقچہ سے دی جس کے اندر روشن دل موجود ہے، یہ تشبیہات قرآن کریم کی آیت: "**اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکوۃ فیہا مصباح**" سے ماخوذ ہیں۔ (سورۃ نور ۳۵)

الاعتصام: چنگل مارکرکسی چیزکومضبوطی سے پکڑنے کے معنی میں آتا ہے۔

حبل اللہ: سے مراد قرآن کریم ہے۔

لا یتم الا ببیان کشفه: بیان کی اضافت کشفہ کی طرف اضافت بیانیہ ہے یعنی "**بیان هو کشفه**" مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے مجملات کی تفصیل احادیث کے بغیر ممکن نہیں، قرآن کریم میں اصول وقواعد ہیں۔ احادیث نے اس کی وضاحت کی اگر احادیث کی تفصیلات کوقرآن سے الگ رکھا جائے توقرآن معطل ہوکر رہ جائے گا کیونکہ احکامات کے فرائض وواجبات وسنن اوراس کے اوقات وکیفیات کی تفصیلات قرآن کریم میں کہاں ہیں ملحدین کی یہی کوشش ہے کہ

احادیث کو قرآن سے کاٹا جائے تا کہ دین اسلام اپنی جڑوں سے اکھڑ کر ختم ہو جائے۔

اضبط: اضبط، ''اجمع کتاب'' پر عطف ہے اور یہ بھی کان کی خبر ہے۔ اضبط مرتب کے معنی میں ہے یعنی یہ کتاب حفظ وضبط کے سب سے زیادہ لائق تھی کیونکہ اس میں سند وغیرہ نہیں تھی اور احادیث میں تکرار بھی نہیں تھا۔

شوارد: یہ شاردۃ کی جمع ہے یعنی بھاگنے والا اونٹ اسی طرح اوابد آبدۃ کی جمع ہے بدکنے والا وحشی جانور، ان دونوں لفظوں سے یہ بتایا گیا ہے کہ بعض احادیث جو کتب احادیث میں مختلف جگہوں میں مذکور ہیں وہ گویا طالب علم سے بھاگے ہوئے اونٹ کی طرح ہیں جو ہاتھ نہیں آرہا ہے اور بعض احادیث کے معنی طالب علموں سے پوشیدہ رہتے ہیں ان کی تشبیہ ایسے وحشی جانوروں سے دیدی جو متوحش غیر مانوس ہیں۔ دونوں لفظوں میں تشبیہ دی ہے اور یہ استعارہ ہے اور اوابد، شوارد کے لئے عطف تفسیر ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ احادیث کو بدکنے والے وحوش کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح وحشی جانور موقع پاتے ہی بھاگ جاتے ہیں اسی طرح احادیث بھی ذرا سی غفلت سے ضبط وحافظہ سے نکل جاتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اسی لئے کہا گیا ہے کہ ''العلم صید والکتابۃ قید'' یہاں یہ اعتراض بے معنی ہے کہ احادیث کی تشبیہ غیر مانوس وحوش کے ساتھ کیوں دی ہے۔ اس لئے کہ تشبیہ میں تمام صفات اور تمام کیفیات کا لحاظ نہیں ہوتا ہے نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ مشبہ سے مشبہ بہ ہمیشہ اعلیٰ وارفع ہو بعض دفعہ مخصوص وضاحت کیلئے مخصوص پہلو کا لحاظ کر کے تشبیہ دی جاتی ہے حالانکہ مشبہ بہ ادنیٰ ہوتا ہے جس طرح کہ ''اللہ نور السموات والارض'' آیت میں ''کمشکاۃ فیھا مصباح'' ہے۔

یکم ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ:

وَلَمَّا سَلَكَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ طَرِيقَ الْاِخْتِصَارِ وَحَذَفَ الْاَسَانِيدَ تَكَلَّمَ فِيهِ بَعْضُ النُّقَّادِ وَاِنْ كَانَ نَقْلُهُ وَاِنَّهُ مِنَ الثِّقَاتِ كَالْاِسْنَادِ لٰكِنْ لَيْسَ مَا فِيهِ أَعْلَامٌ كَالْأَغْفَالِ فَاسْتَخَرْتُ اللّٰهَ تَعَالٰى وَاسْتَوْفَقْتُ مِنْهُ فَأَوْدَعْتُ كُلَّ حَدِيثٍ مِنْهُ فِي مَقَرِّهٖ فَأَعْلَمْتُ مَا أَغْفَلَهُ كَمَا رَوَاهُ الْاَئِمَّةُ الْمُتْقِنُونَ وَالثِّقَاتُ الرَّاسِخُونَ مِثْلُ اَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ ابْنِ اِسْمٰعِيلَ الْبُخَارِيِّ وَاَبِي الْحُسَيْنِ مُسْلِمِ بْنِ الْحَجَّاجِ الْقُشَيْرِيِّ وَأَبِي عَبْدِاللّٰهِ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ الْأَصْبَحِيِّ وَأَبِي عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ اِدْرِيسَ الشَّافِعِيِّ وَأَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ اَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ حَنْبَلَ الشَّيْبَانِيِّ وَأَبِيْ عِيسٰى مُحَمَّدِ بْنِ عِيسٰى التِّرْمِذِيِّ وَأَبِي دَاوٗدَ سُلَيْمَانَ بْنِ الْأَشْعَثِ السِّجِسْتَانِيِّ وَأَبِيْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ أَحْمَدَ بْنِ شُعَيْبٍ النَّسَائِيِّ وَأَبِي عَبْدِ اللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ يَزِيدَ ابْنِ مَاجَةَ الْقَزْوِينِيِّ وَأَبِيْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الدَّارِمِيِّ وَأَبِي الْحَسَنِ عَلِيِّ بْنِ عُمَرَ الدَّارَقُطْنِيِّ وَأَبِي بَكْرٍ أَحْمَدَ بْنِ الْحُسَيْنِ الْبَيْهَقِيِّ وَأَبِي الْحَسَنِ رَزِيْنِ بْنِ مُعَاوِيَةَ الْعَبْدَرِيِّ وَغَيْرِهِمْ وَقَلِيلٌ مَا هُوَ وَاِنِّيْ اِذَا نَسَبْتُ الْحَدِيثَ اِلَيْهِمْ كَأَنِّيْ أَسْنَدْتُ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ لِاَنَّهُمْ قَدْ فَرَغُوا مِنْهُ وَأَغْنَوْنَا عَنْهُ۔

ترجمہ: اور جب مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے نقل احادیث کے وقت اختصار کے طریقہ کو اپنایا اور اسناد کو حذف کر دیا تو اس پر بعض محدثین وناقدین نے اعتراض کیا اگر چہ مصنف کا حدیث کو بغیر سند کے نقل کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ سند کے ساتھ نقل کیا ہو کیونکہ وہ نقل حدیث کے معاملے میں ثقہ اور معتمد محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں لیکن پھر بھی جو چیز بے نشان ہو وہ نشان والی چیز کی طرح نہیں ہوسکتی ہے اس لئے میں نے اللہ تعالیٰ سے مدد چاہی اور اس کی توفیق کا طلب گار ہوا میں نے بے نشان پر نشان لگایا اور میں نے ہر حدیث کو جس باب سے اس کا تعلق تھا اسی باب میں نقل کر دیا اور قابل اعتماد اور راسخ العلم علماء ومحدثین نے جس طرح اس کو روایت کیا اسی طرح میں نے بھی کتاب کے حوالے کے ساتھ اس کو ذکر کیا مثلاً امام بخاری، امام مسلم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی، امام دارقطنی، امام بیہقی، امام رزین بن معاویہ عبدری رحمہم اللہ تعالیٰ ان ائمہ محدثین نے جس طرح اپنی کتابوں میں حدیث کو نقل کیا اسی طرح میں نے وہاں سے لے کر اپنی اس کتاب میں درج کر دیا ہے، ان ائمہ کے علاوہ کچھ دوسرے محدثین بھی ہیں (مثلاً ابن حبان اور ابن عبدالبر) جن کی کتابوں سے احادیث نقل کی گئی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب میں نے کوئی حدیث ان ائمہ ومحدثین کی طرف منسوب کر دی تو گویا میں نے اس کی سند رسول اللہ ﷺ تک پہنچادی کیونکہ یہ ائمہ اپنی کتابوں میں سند ذکر کر کے اس کام سے فارغ ہو گئے ہیں اور ہمیں بھی اس کام سے مستغنی کر دیا۔

توضیح: ولماسلك: صاحب مصابیح نے اپنی کتاب میں اختصار سے کام لیا تھا ایک تو آپ نے حدیث کی سند کو ذکر نہیں کیا تھا اور دوسرا انہوں نے کسی کتاب کا حوالہ بھی نہیں دیا تھا کہ یہ حدیث فلاں کتاب میں ہے تیسرا انہوں نے ابتداء میں اس صحابی کا نام بھی نہیں لیا تھا جس سے حدیث لیکر بیان فرمائی تھی۔

یہ ایسی چیزیں تھیں کہ فن حدیث کے شعبہ میں انتہائی خطرناک تھیں کیونکہ ماہرین حدیث اور حفاظ حدیث کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے اس سے اعتماد کی فضاء میں فائدہ اٹھانا مشکل تھا، خود صاحب مصابیح گو سو فی صد ثقہ اور قابل بھروسہ تھے مگر دوسروں کا معاملہ تو اور تھا اور کسی حدیث کی صحت وعدم صحت کے لئے سند کا جو سلسلہ محدثین نے طے کیا تھا اس قاعدہ کا پورا ہونا ضروری تھا کیونکہ "**الاسناد من الدین ولولا الاسناد لقال من شاء ماشاء**" ایک قانونی ضابطہ تھا جس کا پورا ہونا ضروری تھا اسی وجہ سے صاحب مشکوۃ کو موقع ملا کہ وہ مصابیح میں ترمیم واضافہ کر کے ایک نئی تصنیف منظر عام پر لائیں چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔

لکن لیس مافیه اعلام کالاغفال: اعلام علم کی جمع ہے نشان کے معنی میں ہے ہمزہ کا فتح ہے علامت اور اثر بھی اس کا ترجمہ ہے اور اغفال بھی ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے جو غفل کی جمع ہے اور غفل اس زمین کو کہتے ہیں جس پر کوئی علامت اثر یا نشان نہ ہو۔

اعلام سے صاحب مشکوۃ نے اپنی کتاب **مشکاۃ** مراد لی ہے اور اغفال سے مصابیح مراد لی ہے کیونکہ مشکوۃ میں صحابی کے نام کا نشان لگ گیا، سند کی علامت لگ گئی جو مصابیح میں نہیں تھی۔ یہاں عبارت کا تقاضہ یہ تھا کہ مصنف اس طرح عبارت

لاتے "**لیس مافیه اغفال کالاعلام**" یعنی بے نشان مصابیح اس درجے کی نہیں تھی جس درجے کی نشان والی مشکوۃ ہے لیکن قربان جائیے ان صلحاء کے آداب پر کہ صاحب مصابیح صاحب مشکوۃ کے استاذ بھی نہیں اور دونوں کے زمانے میں صدیوں کا فاصلہ بھی ہے مگر پھر بھی صاحب مشکوۃ قصور کی نسبت اپنی طرف کر رہے ہیں کہ جس کتاب میں نشان لگا ہے وہ اس درجہ کی نہیں جو بے نشان ہے اس میں کسر نفسی اور ادب کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ کیونکہ "**الدین کله ادب**"۔

وانی اذانسبت الحدیث الیهم: یہ عبارت درحقیقت ایک سوال مقدر کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ جس طرح صاحب مصابیح نے سند ذکر نہیں کی تو صاحب مشکوۃ نے بھی سند کو ترک کر دیا ہے لہٰذا جو اعتراض محدثین نے مصابیح پر کیا تھا وہ صاحب مشکوۃ پر بھی ابھی تک باقی ہے۔

اس عبارت سے صاحب مشکوۃ نے اسی کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جن ائمہ محدثین کی کتابوں سے صاحب مشکوۃ نے احادیث لی ہیں اور حدیث کی نسبت اس کتاب کی طرف کی ہے تو گویا یہ حدیث سند کے اعتبار سے نبی اکرم ﷺ تک پہنچادی، اس لئے کہ ان محدثین اور ان کی کتابوں کے مصنفین نے بڑی جانفشانی اور بڑی محنت سے ان احادیث کی سندیں ذکر کی ہیں گویا جستجو، تحقیق وتدقیق اور بحث وتمحیص اور جرح وتعدیل کے تمام مراحل سے ان حضرات نے گزر کر احادیث جمع فرمادی ہیں لہٰذا ان کی طرف صرف نسبت کرنا اور ان کا حوالہ دینا ہی سند کے لئے کافی شافی ہے، ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیاق وسباق میں چونکہ سند کی بحث اس عبارت میں چل رہی ہے لہٰذا "منه" میں مجرور کی ضمیر اور "عنه" کی ضمیر "اسناد" کی طرف لوٹتی ہے۔

مورخہ ۲ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ:

وَسَرَدْتُ الْكُتُبَ وَالْأَبْوَابَ كَمَا سَرَدَهَا وَاقْتَفَيْتُ أَثَرَهُ فِيهَا وَقَسَمْتُ كُلَّ بَابٍ غَالِبًا عَلَى فُصُولٍ ثَلَاثَةٍ أَوَّلُهَا مَا أَخْرَجَهُ الشَّيْخَانِ أَوْ أَحَدُهُمَا وَاكْتَفَيْتُ بِهِمَا وَإِنِ اشْتَرَكَ فِيهِ الْغَيْرُ لِعُلُوِّ دَرَجَتِهِمَا فِي الرِّوَايَةِ وَثَانِيهَا مَا أَوْرَدَهُ غَيْرُهُمَا مِنَ الْأَئِمَّةِ الْمَذْكُورِينَ وَثَالِثُهَا مَا اشْتَمَلَ عَلَى مَعْنَى الْبَابِ مِنْ مُلْحَقَاتٍ مُنَاسِبَةٍ مَعَ مُحَافَظَةٍ عَلَى الشَّرِيطَةِ وَإِنْ كَانَ مَأْثُورًا عَنِ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ ثُمَّ إِنَّكَ إِنْ فَقَدْتَ حَدِيثًا فِي بَابٍ فَذٰلِكَ عَنْ تَكْرِيرٍ أُسْقِطُهُ وَإِنْ وَجَدْتَ آخَرَ بَعْضَهُ مَتْرُوكًا عَلَى اخْتِصَارِهِ أَوْ مَضْمُومًا إِلَيْهِ تَمَامُهُ فَعَنْ دَاعِي اهْتِمَامٍ أَتْرُكُهُ وَأُلْحِقُهُ وَإِنْ عَثَرْتَ عَلَى اخْتِلَافٍ فِي الْفَصْلَيْنِ مِنْ ذِكْرِ غَيْرِ الشَّيْخَيْنِ فِي الْأَوَّلِ وَذِكْرِهِمَا فِي الثَّانِي فَاعْلَمْ أَنِّي بَعْدَ تَتَبُّعِي كِتَابَيِ الْجَمْعِ بَيْنَ الصَّحِيحَيْنِ لِلْحُمَيْدِيِّ وَجَامِعِ الْأُصُولِ اعْتَمَدْتُ عَلَى صَحِيحَيِ الشَّيْخَيْنِ وَمَتْنَيْهِمَا وَإِنْ رَأَيْتَ اخْتِلَافًا فِي نَفْسِ الْحَدِيثِ فَذٰلِكَ مِنْ تَشَعُّبِ طُرُقِ الْأَحَادِيثِ وَلَعَلِّي مَا اطَّلَعْتُ عَلَى تِلْكَ الرِّوَايَةِ الَّتِي سَلَكَهَا الشَّيْخُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ.

ترجمہ: اور میں نے اس کتاب کی ترتیب وہی رکھی ہے جو صاحب مصابیح نے رکھی تھی اس سلسلے میں انہی کے نقش قدم کی پیروی کی ہے اور میں نے عمومی طور پر ہر باب کو تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے پہلی فصل میں ان احادیث کو جمع کیا ہے جو شیخین یعنی بخاری و مسلم نے روایت کی ہیں یا ان دونوں میں سے کسی ایک نے روایت کی ہیں اگر چہ ان حدیثوں میں بعض ایسی بھی ہیں جن کو دوسرے محدثین نے بھی روایت کیا ہے لیکن میں نے اس فصل میں صرف شیخین کے ذکر پر اکتفاء کیا کیونکہ شیخین کا درجہ تمام محدثین سے بلند ہے۔ اور دوسری فصل میں وہ احادیث نقل کی ہیں جن کو امام بخاری و مسلم کے علاوہ دوسرے مذکورہ ائمہ میں سے کسی نے روایت کیا ہے اور تیسری فصل میں احادیث کے علاوہ صحابہ کرام وتابعین کے ان اقوال وآثار کو بھی جمع کیا ہے جو باب کے لائق اور مناسب تھے لیکن آثار وخبر کو شامل کرتے ہوئے شرائط حدیث کو مدنظر رکھا ہے (پھر بھی یادرکھیں) اگر کسی باب میں کوئی حدیث نہ پائی جائے تو سمجھا جائے کہ اسے میں نے تکرار کی وجہ سے نقل نہیں کیا اور اگر آپ کسی حدیث کو اس طرح پائیں کہ اس کا بعض حصہ اختصار کی وجہ سے چھوڑ کر حذف کر دیا گیا ہے یا بقیہ حدیث کا حصہ اس کے ساتھ ملایا گیا ہے تو یہ چھوڑنا اور ملانا خاص مقصد کے تحت ہوا ہے اور اگر دونوں فصلوں میں اختلاف نظر آئے یعنی غیر شیخین کی احادیث تو فصل اول میں لائی گئی ہوں اور شیخین کی حدیث کو فصل ثانی میں نقل کیا گیا ہو تو جان لینا چاہیئے کہ یہ اختلاف غلط یا غفلت کی وجہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ میں نے حمیدی کی کتاب جمع بین الصحیحین اور جامع الاصول میں بہت تلاش وتحقیق اور تتبع کے بعد ایسا کیا ہے اور اس سلسلے میں بخاری ومسلم اور دونوں کے اصل نسخوں اور اس کے متن پر اعتماد کیا ہے اور اگر نفس حدیث میں آپ کو اختلاف نظر آئے تو اس کی وجہ حدیث کی مختلف اسناد ہیں اور شاید کہ میں اس حدیث پر مطلع نہ ہوسکا جسے شیخ مصنف علیہ الرحمہ نے روایت کیا ہے۔

توضیح: وسردت الکتب والابواب: مصنفین کا دستور ہے کہ اپنی تالیف میں تذکرہ مسائل کے لئے کتاب کا عنوان رکھتے ہیں جیسے کتاب الطھارہ پھر اس کے ضمن میں مختلف انواع کے مسائل جو اس عنوان کے مناسب ہوں ابواب کے تحت لاتے ہیں جیسے باب الوضوء باب الحیض اسی طرح ابواب کے ضمن میں فصل کا ذکر کرتے ہیں اور تمام مسائل کو جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، صاحب مشکوۃ فرماتے ہیں کہ میں نے محی السنۃ کی پیروی میں ایسا ہی کیا ہے البتہ مصابیح میں فصل اول اور فصل دوم کی ایک نئی اصطلاح تھی کہ اول میں بخاری ومسلم کی روایتیں ذکر کرتے ہیں اور فصل ثانی میں حسان کی احادیث ہوتی ہیں لیکن صاحب مشکوۃ نے اسی میں ایک تیسری فصل کا اضافہ کر دیا تا کہ احادیث مرفوعہ کے علاوہ اقوال صحابہ اور آثار بھی اس میں حسب موقع جمع ہوسکیں۔ بخاری ومسلم کی روایتوں کو اگر چہ دوسرے محدثین نے بھی ذکر کیا ہو مگر صاحب مشکوۃ فرماتے ہیں کہ میں نے ذکر کرنے میں صرف بخاری ومسلم کا نام لیا ہے کیونکہ ان کی شان ہی اور ہے۔

مع محافظة علی الشریطة: یعنی تیسری فصل میں مناسبت موضوع کے ساتھ سلف صالحین کے آثار بھی مرفوع احادیث کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں لیکن فصل اول اور ثانی میں جس طرح شرائط تھیں تیسری فصل میں بھی ان کا لحاظ رکھا گیا ہے یعنی صحابی راوی کا نام ذکر کرنا، کتاب اور مخرج کا حوالہ دینا اور صحت روایت کا خیال رکھنا۔

ثم انك ان فقدت حدیثا: یعنی صاحب مصابیح نے مکرر احادیث کا ذکر کیا تھا، صاحب مشکوۃ فرماتے ہیں کہ

اگر کہیں ایسا نظر آجائے کہ مصابیح میں ایک حدیث ہے اور مشکوۃ میں نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مصابیح میں احادیث کا تکرار تھا اور مشکوۃ میں اس تکرار کو ختم کرنے کے لئے میں نے حدیث کو ترک کردیا اور باب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی روایت کو درج کردیا۔

وان وجدت آخر بعضه متروکًا: مصابیح میں بعض احادیث میں اختصار تھا، صاحب مشکوۃ نے ان میں سے بعض کو تو اسی طرح مختصر چھوڑا اور بعض کو پورا کردیا۔ علامہ طیبی عشلیلیه فرماتے ہیں کہ صاحب مصابیح بعض دفعہ ایک طویل حدیث کے کچھ حصے باب کی مناسبت کی وجہ سے لیتے ہیں اور طویل حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔ صاحب مشکوۃ بھی اختصار کے پیش نظر یہی طریقہ اپناتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مختصر حدیث کے سمجھنے کے لئے اس طویل محذوف حدیث کا ذکر کرنا بھی ضروری ہوتا ہے تو صاحب مشکوۃ اس کو ذکر کرتے ہیں، غرضیکہ ضرورتِ حدیث اور مناسبت مقام کی وجہ سے یہ حذف واثبات اور یہ ترک وذکر ہوتا رہتا ہے اسی کو "**اتر كه والحقه**" سے تعبیر فرمایا۔

ملاعلی قاری عشلیلیه فرماتے ہیں کہ "**اتر كه والحقه**" میں واو، اَو کے معنی میں ہے۔ یعنی داعی اور ضرورت کے پیش نظر کبھی ترک وحذف پر عمل ہوتا ہے اور کبھی ذکر کرنے اور الحاق پر عمل ہوتا ہے۔

وان عثرت علی اختلاف فی الفصلین: صاحب مصابیح نے یہ طریقہ اپنایا ہے کہ فصل اول میں بخاری ومسلم کی روایات کو لاتے ہیں اور فصل ثانی میں ان احادیث کو جمع کرتے ہیں جو بخاری ومسلم کے علاوہ ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں ذکر کی ہیں لیکن صاحب مشکوۃ نے بعض مقامات میں ایسا کیا ہے کہ مصابیح نے جن احادیث کو شیخین کی طرف منسوب کرکے نقل کیا ہے آپ نے ان احادیث کو دیگر ائمہ کی طرف منسوب کیا ہے جیسے باب سنن الوضوء کی فصل اول ص ۴۵ پر **رواہ مالك والنسائی ولابی داؤد نحوہ** آیا ہے اسی طرح کتاب فضائل القرآن ص ۱۸۵ پر حدیث انس میں **رواہ الترمذی** ہے لیکن فصل اول میں ہے۔ اسی طرح صاحب مشکوۃ نے بعض جگہ فصل ثانی کی حدیث کو شیخین بخاری ومسلم کی طرف منسوب کیا ہے جیسے باب **ما یقرأ بعد التکبیر** ص ۷۸ پر سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت فصل ثانی میں مسلم کی طرف منسوب کی ہے آخر یہ تغیر وتبدل اور یہ اختلاف کیوں ہے؟

تو صاحب مشکوۃ نے اس ردوبدل اور اس فرق کے بارے میں فرمایا کہ یہ میری غلطی یا سہو کی بناء پر نہیں ہوا بلکہ میں نے کتاب **الجمع بین الصحیحین** اور کتاب **جامع الاصول** اور اسی طرح بخاری ومسلم کے اصل نسخوں کو اور ان کتابوں کے متون کو نہایت غور اور جستجو وتلاش اور گہری تحقیق سے دیکھا چنانچہ ان چار کتابوں میں جن احادیث کو شیخین کی طرف منسوب نہیں کیا گیا ہے اور صاحب مصابیح نے انھیں فصل اول میں شیخین کی طرف منسوب کیا ہے تو میں نے ان احادیث کو مشکوۃ میں شیخین کی طرف منسوب کرنے کی بجائے ان کے اصل راوی اور ناقل کی طرف منسوب کردیا ہے جیسے باب سنن الوضوء میں کیا ہے۔

اور اسی طرح جن احادیث کو صاحب مصابیح نے شیخین کے علاوہ دوسرے ائمہ کی طرف منسوب کرکے دوسری فصل میں نقل کیا

تھا اور مجھے وہ احادیث ان کتب مذکورہ اربعہ میں شیخین کی طرف منسوب مل گئیں تو میں نے ان کو شیخین کی طرف منسوب کر دیا۔ اور چونکہ مجھے اپنی تحقیق وجستجو پر اعتماد تھا پھر ان کتب اربعہ کی تائید بھی مل گئی اس لئے میں نے صاحب مصابیح کا یہ خیال کر کے خلاف کیا کہ ہوسکتا ہے صاحب مصابیح سے نقل حدیث کے وقت سہو ہو گیا ہو۔

وان رأیت اختلافاً فی نفس الحدیث: یعنی صاحب مصابیح نے ایک حدیث نقل کی اور وہی روایت جب صاحب مشکوٰۃ نے ذکر فرمائی تو ان دونوں کے الفاظ میں فرق نکلا ایک کے الفاظ اور ہیں اور دوسرے کے کچھ اور ہیں اس کے متعلق صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ یہ فرق درحقیقت سندوں کے اختلاف کی بناء پر ہے یعنی صاحب مصابیح کو وہ روایت جس سند سے ملی انہوں نے ان الفاظ سے نقل کیا اور مجھے وہ روایت جس سند سے پہنچی میں نے انہی الفاظ کے ساتھ نقل کیا اور شاید مجھے وہ روایت نہ مل سکی جس کو شیخ نے اختیار فرمایا۔

وَقَلِيلاً مَّا تَجِدُ أَقُولُ مَا وَجَدْتُّ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِي كُتُبِ الْأُصُولِ أَوْ وَجَدْتُّ خِلَافَهَا فَإِذَا وَقَفْتَ عَلَيْهِ فَانْسُبِ الْقُصُوْرَ إِلَىَّ لِقِلَّةِ الدِّرَايَةِ لَا إِلَى جَنَابِ الشَّيْخِ رَفَعَ اللّٰهُ قَدْرَهٗ فِي الدَّارَيْنِ حَاشَا لِلّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ رَحِمَ اللّٰهُ مَنْ إِذَا وَقَفَ عَلٰى ذٰلِكَ نَبَّهَنَا عَلَيْهِ وَأَرْشَدَنَا طَرِيْقَ الصَّوَابِ وَلَمْ آلُ جُهْداً فِي التَّنْقِيْرِ وَالتَّفْتِيْشِ بِقَدْرِ الْوُسْعِ وَالطَّاقَةِ وَنَقَلْتُ ذٰلِكَ الْاِخْتِلَافَ كَمَا وَجَدْتُّ وَمَا أَشَارَ إِلَيْهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مِنْ غَرِيْبٍ أَوْ ضَعِيْفٍ أَوْ غَيْرِهِمَا بَيَّنْتُ وَجْهَهٗ غَالِبًا وَمَا لَمْ يُشِرْ إِلَيْهِ مِمَّا فِي الْأُصُوْلِ فَقَدْ قَفَيْتُهٗ فِي تَرْكِهٖ إِلَّا فِي مَوَاضِعَ لِغَرَضٍ وَرُبَّمَا تَجِدُ مَوَاضِعَ مُهْمَلَةً وَذٰلِكَ حَيْثُ لَمْ أَطَّلِعْ عَلٰى رَاوِيْهِ فَتَرَكْتُ الْبَيَاضَ فَإِنْ عَثَرْتَ عَلَيْهِ فَأَلْحِقْهُ بِهٖ أَحْسَنَ اللّٰهُ جَزَائَكَ وَسَمَّيْتُ الْكِتَابَ بِمِشْكٰوةِ الْمَصَابِيْحِ وَأَسْأَلُ اللّٰهَ التَّوْفِيْقَ وَالْإِعَانَةَ وَالْهِدَايَةَ وَالصِّيَانَةَ وَتَيْسِيْرَ مَا أَقْصِدُهٗ وَأَنْ يَّنْفَعَنِيْ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ وَجَمِيْعَ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔

ترجمہ: اور بہت کم مقامات میں آپ کو یہ بات ملے گی جہاں میں نے کہہ دیا کہ یہ روایت کتب اصول میں میں نے نہیں پائی یا اس کے خلاف اس میں موجود ہے جب کسی ایسے اختلاف پر آپ مطلع ہو جائیں تو قصور کی نسبت میری کم علمی کی وجہ سے میری طرف کریں، نہ کہ حضرت شیخ کی طرف اللہ تعالیٰ دارین میں ان کا درجہ بلند کرے۔ اور ان کو اس غلطی اور قصور سے پاک اور محفوظ رکھے اور خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جسے وہ روایت معلوم ہو جائے اور وہ ہمیں اطلاع کر کے راہ حق بتا دے۔ میں نے اپنی تحقیق وتدقیق اور تلاش وجستجو میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اپنی وسعت وطاقت کے مطابق پوری چھان بین کی اور یہ اختلاف میں نے جیسا پایا ویسا ہی نقل کر دیا اور جن احادیث پر شیخ رحمہ اللہ نے ضعیف یا غریب وغیرہ کا حکم لگایا ہے میں نے اس کا سبب عموماً بیان کر دیا ہے اور جن احادیث اور اصولی باتوں کی طرف شیخ نے اشارہ نہیں کیا تو میں نے بھی شیخ کی پیروی کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا ہے مگر بعض

مقامات پر مجبوری کی بناء پر میں نے توضیح کر دی ہے۔ اور بسا اوقات آپ کو ایسے مقامات ملیں گے کہ وہاں حدیث کے بعد میں نے جگہ خالی چھوڑ کر حوالہ نہیں دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ باوجود تفتیش وتلاش کے میں مخرج کے نام سے واقف نہ ہو سکا۔ پس میں نے اس جگہ میں بیاض چھوڑ دیا ہے پس اگر آپ کو راوی کے نام کا علم ہو جائے تو اس خالی جگہ میں اس کا حوالہ دیدیں اس پر اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا کرے گا۔ اور میں نے اس کتاب کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا ہے، میں اللہ تعالیٰ سے اس کتاب کی تصنیف میں بھرپور توفیق، پوری مدد اور مکمل رہنمائی اور راہ راست پر چلنے کا طلب گار ہوں اور اپنے مقصد کی تکمیل، خطا وقصور سے حفاظت اور مشکلات کی آسانی کے لئے دعا کرتا ہوں اور یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ خداوند قدوس اس زندگی میں اور مرنے کے بعد مجھے بھی اور ہر مسلمان مرد وعورت کو اس کتاب سے نفع پہنچائے، اللہ میرے لئے کافی اور اچھا کارساز ہے کیونکہ نیک کام پر آنے کی قوت اور برائی سے بچنے کی ہمت قدرتوں اور حکمتوں کے مالک اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

توضیح: وقليلاً ما تجد اقول ما وجدت هذه الرواية في كتب الاصول: سے مراد وہی بخاری اور مسلم اور صحاح ستہ کی کتابیں ہیں۔ صاحب مشکوٰۃ بعض مقامات میں فصل اول یا فصل ثانی کی روایات واحادیث نقل کر کے حدیث کے مأخذ ومخرج کا حوالہ دینے کے بجائے کہتے ہیں "**ماوجدت هذه الرواية في كتب الاصول او وجدت خلافها**" مجھے کتب اصول میں یہ روایت نہیں ملی یا اس کے برعکس ملی جو صاحب مصابیح نے نقل کیا ہے اس کے متعلق نہایت ادب کا لحاظ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ میری تتبع وتلاش کا نقص ہے اس میں شیخ کا قصور نہیں حاشا وکلا! وہ اس قصور سے بری الذمہ ہیں۔ میں نے بڑی جانفشانی سے جستجو اور تلاش کی مگر جب نہیں ملی تو جس طرح اختلاف پایا اس کا اظہار کر کے اسی طرح نقل کر دیا اب اگر کسی شخص کو یہ روایت صحیح طور پر معلوم ہو جائے جو صاحب مصابیح نے نقل کی ہے اور مجھے معلوم نہیں ہوئی تو وہ شخص میری زندگی میں مجھے مطلع کر دیں ورنہ بعد میں کتاب میں اضافہ کر دیں ان پر اللہ رحم کرے گا کمال ادب اور کمال دیانت کو دیکھئے کہ کئی صدیوں کے فاصلے کے باوجود کتنا احترام کرتے ہیں یہ دینی علوم کی برکت ہے۔

وما اشار اليه من غريب او ضعيف: یعنی صاحب مصابیح نے جہاں کسی حدیث کو ضعیف یا غریب یا منکر کہا ہے اور وجہ وسبب بیان نہیں کیا تو صاحب مشکوٰۃ اکثر مقامات میں اسکی وجہ بتا دیتے ہیں کہ یہ اس وجہ سے منکر، شاذ، ضعیف یا غریب ہے لیکن بعض مقامات میں صاحب مصابیح نے خود سکوت اختیار کیا ہے نہ ضعیف کہا ہے نہ غریب کہا ہے۔ حالانکہ اصول کی کتابوں میں اس کی نوعیت کے بارے میں لکھا ہے کہ ضعیف یا منقطع ہے یا مرسل ہے۔

تو صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ میں نے بھی ایسے مواقع میں صاحب مصابیح کی پیروی کر کے سکوت اختیار کیا ہے البتہ بعض جگہوں میں مجبور ہو کر کچھ کہنا پڑا کیونکہ لوگوں نے حدیث کو مثلاً موضوع کہہ دیا یا باطل کہہ دیا تو میں نے لوگوں کے اس الزام کی تردید کی اور ترمذی وغیرہ کے حوالے سے حدیث کی نوعیت کا تعین کیا مثلاً "**المرأ على دين خليله فلينظر احد كم من يخالل**" (مشکوٰۃ ص ۴۲۷) بعض لوگ اس حدیث کو موضوع کہتے ہیں حالانکہ ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے تو صاحب مشکوٰۃ نے اس کی وضاحت کر دی ہے اگرچہ مصابیح نے سکوت اختیار کیا ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اسنادہ صحیح۔

وربما تجد مواضع مھملة: صاحب مشکوٰۃ نے بعض جگہ حوالہ کی جگہ خالی چھوڑی ہے یہ حوالہ نہ ملنے کی وجہ سے ہوا ہے اس لئے یہاں فرماتے ہیں کہ جس کسی کو حوالہ مل جائے تو وہ اس جگہ کو پُر کردے اس خالی جگہ کو بیاض کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مشکوٰۃ میں کئی مقامات پر بیاض ملیں گے چنانچہ ص ۲۲۷ پر بیاض ہے اسی طرح صفحہ ۴۶۸ پر بیاض ہے پھر ص ۴۷۰ پر ہے اسی طرح کئی اور جگہوں میں ہے اور وہاں محدثین نے حوالہ دے کر جگہ پُر کرنے کی محنت کی ہے۔

وسمیت الکتاب بمشکوۃ المصابیح: مشکاۃ دیوار کے اس طاقچہ کو کہتے ہیں جس میں چراغ رکھا جاتا ہے اور مصابیح مصباح کی جمع ہے۔ چراغ کو کہتے ہیں المصابیح سے مراد شیخ محی السنۃ کی کتاب بھی ہوسکتی ہے اور احادیث النبی بھی ہوسکتی ہیں کیونکہ کتاب اور حدیث دین پر چلنے والوں کے لئے بمنزلہ چراغ کے ہیں مشکاۃ المصابیح کے اس نام میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے وہ یہ کہ چراغ جب کھلی جگہ میں رکھا ہو تو اس کی روشنی پھیل کر کمزور ہو جاتی ہے لیکن اگر اس کو ایک طاقچہ میں رکھا جائے تو روشنی مجتمع ہو کر بہت تیز ہو جاتی ہے اسی طرح یہ کتاب یا احادیث رسول پہلے بھی نافع تھیں لیکن مشکوٰۃ المصابیح کے اندر آنے کے بعد اس کی آب وتاب اور چمک دمک دو چند سہ چند ہوگئی اور اس کی افادیت میں اس ترتیب خاص کی وجہ سے اضافہ ہوگیا۔

کسی نے سچ کہا:

لئن کان فی المشکاۃ یوضع مصباح
فذلك مشکاۃ وفیھا مصابیح

یہاں یہ اعتراض بے محل ہے کہ احادیث رسول اور قلب منور کی نورانیت تو چراغ سے بڑھ کر ہے پھر چراغ کو مشبہ بہ کیوں بنایا؟ جواب واضح ہے کہ مشبہ بہ کا اقوی واعلیٰ اور افضل ہونا ضروری نہیں بلکہ اوضح واظہر ہونا چاہیے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی تشبیہ طاقچہ اور قندیل میں چراغ سے اس طرح دی ہے **مثل نورہ کمشکاۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ**۔

کسی شاعر پر جب یہ اعتراض ہوا کہ تم نے بادشاہ کی سخاوت وشجاعت کی تشبیہ عمرو اور حاتم سے دے کر بادشاہ کی شان کو گھٹایا تو شاعر نے اس خیالی اعتراض کا جواب اس طرح دیا:

لا تنکروا ضربی له من دونه
مثلا شرودا فی الندی والباس
فاللہ قد ضرب الاقل لنورہ
مثلا من المشکاۃ والنبراس

میں نے سخاوت اور شجاعت میں جو مثال ایک کمتر چیز سے دی ہے اس پر نکیر وتنقید نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال ایک کمتر چیز فانوس اور طاقچہ سے دی ہے۔

اللھم تقبل منی ھذہ البضاعۃ المزجاۃ فأوف لنا الکیل وتصدق به علینا

فوائد متفرقہ

خطبہ مشکوٰۃ اور اس سے پہلے حدیث پاک کے متعلق ابتدائی مباحث تفصیل کے ساتھ لکھ دیئے گئے نیز ایک مدرس اور ایک محنتی طالب علم کے لئے حل کتاب اور درس و تدریس کی حد تک وہ تمام چیزیں میں نے ایک جگہ جمع کر دی ہیں جس کی ان حضرات کو ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے خود پر بوجھ ڈال کر ان حضرات کو کئی صفحات اور کئی اوراق کی ورق گردانی سے بچانے کی کوشش کی ہے اور وہ تمام چیزیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں جن کو ڈھونڈنے کے لئے بہت وقت اور بہت محنت اور ذہانت چاہیے اسی وجہ سے میں نے فنون کی ابتدائی بحث مباحثے اور کتب فن کے شروع کے اشکالات و جوابات کا اچھا خاصا ذخیرہ منتہی طلباء کی کتاب مشکوٰۃ کے ساتھ جوڑ دیا تاکہ طلباء و مدرسین بغیر کسی زحمت کے تیار لقمہ اٹھا کر منہ میں رکھیں اور مزہ آنے پر بندۂ ناچیز کو بھی دعاؤں میں یاد فرمائیں۔

اسی مقصد کی تکمیل کے لئے میں نے خطبہ کتاب سے فراغت کے بعد فوائد متفرقہ ضروریہ کا جمع کرنا ضروری سمجھا تو لیجئے چند باتیں حاضر خدمت ہیں:

قواعد ہمزۂ ''ابن''

خطبہ مشکوٰۃ میں ابن کا لفظ بار بار آیا ہے اور کتب حدیث میں بھی بار بار یہ لفظ آتا ہے عموماً اس کے قواعد سے طلبا اور بعض علماء ناواقف ہوتے ہیں تو لیجئے:

① لفظ ابن کا ہمزہ وصلی ہے اور ہمزہ وصلی کا عام قاعدہ یہ ہے کہ وہ وسط کلام میں لکھنے میں باقی رہتا ہے مگر پڑھنے میں گر جاتا ہے۔

② قاعدہ تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوا کہ الف لکھنے میں باقی رہتا ہے لیکن ابن کے استعمال کی ایک خاص صورت ہے جہاں ہمزہ کو کتابت اور لکھنے سے بھی گرایا جاتا ہے استعمال کی وہ خاص صورت یہ ہے کہ ابن علمین متناسلین کے درمیان واقع ہو یعنی پہلا علم بیٹا ہو اور ابن کے بعد والا علم باپ ہو اور یہ ابن پہلے علم کی صفت بن رہا ہو اور دوسرے کی طرف مضاف ہو رہا ہو ایسی صورت میں ابن کا ہمزہ پڑھنے لکھنے سے گرایا جاتا ہے جیسے محمد بن اسماعیل محمد بیٹا ہے اسماعیل کا اور اسماعیل اس کا باپ ہے۔ تو متناسلین یعنی نسل بھی ایک ہے اور ابن ماقبل کے لئے صفت بھی بن رہا ہے اور مابعد کی طرف مضاف بھی ہے تو یہاں الف گرایا جائے گا، نہ پڑھنے میں آئے گا نہ لکھنے میں آئے گا خطبہ مشکوٰۃ میں سب نام اسی طرز پر آئے ہیں اور یہی قاعدہ وہاں پر جاری ہے۔

③ اگر لفظ ''ابن'' علمین متناسلین کے درمیان واقع ہو اور دیگر شرائط بھی پوری ہوں لیکن لفظ ابن سطر کے شروع میں آرہا ہو پھر اس کا ہمزہ لکھا جائے گا، ابن کے اس قاعدہ میں ایک تخفیف یہ بھی ہوئی کہ اس سے پہلے علم سے تنوین حذف ہو جاتی ہے جیسے محمد بن اسماعیل میں محمد سے تنوین گر گئی ہے۔

④ اگر ابن علمین متناسلین کے درمیان واقع ہے لیکن پہلے علم کے لئے صفت نہیں بن رہا ہے بلکہ اس سے خبر واقع ہے تو پھر الف لکھنے میں برقرار رہے گا جیسے زید ابن عمرو زید عمرو کا بیٹا ہے۔

محمد بن یزید ابن ماجہ:

خطبہ مشکوۃ میں یہاں اس نام میں دو ابن واقع ہیں، پہلے ابن سے ہمزہ گرانا چاہیے کیونکہ یہ علمین متناسلین کے درمیان ہے مگر دوسرے ابن کے الف کو لکھنا چاہیے کیونکہ یہ علمین متناسلین کے درمیان نہیں ہے اس لئے کہ یزید ماجہ کا بیٹا نہیں بلکہ ایک قول کے مطابق دونوں ایک ہیں کہ ماجہ لقب ہے یزید کا اور ایک قول میں زوجہ ہے یزید کی یعنی محمد بن یزید و محمد بن ماجہ تو ماجہ محمد کی والدہ ہوں گی اور یزید کی زوجہ ہوں گی۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ کا لفظ لقب ہے یزید کا یہ محمد کا دادا نہیں ہے اور شرح اربعین میں لکھا ہے کہ ماجہ محمد کی والدہ کا نام تھا۔

حاصل یہ ہے کہ دوسرا ابن یزید کی صفت نہیں بلکہ محمد سے بدل ہے یعنی محمد بیٹا یزید کا یعنی بیٹا ماجہ کا اگر ماجہ یزید کی بیوی ہو تو پھر ابن ماجہ کا تعلق محمد سے ہوگا کہ محمد بیٹا یزید کا اور بیٹا ماجہ کا تو ماجہ محمد کی ماں ہوگی اس قسم کی ترکیب کئی دیگر ناموں میں بھی ہے جس سے بظاہر وہم ہوتا ہے کہ آخری علم قریب والے علم کے لئے باپ ہے حالانکہ وہ قریب والے علم کی بیوی اور اصل علم جو پہلے مذکور ہوتا ہے اسکی ماں ہوتی ہے۔ مثلاً

1. عبد اللہ بن عمرو ابن ام مکتوم یہاں ابن ام مکتوم کا تعلق عبد اللہ سے ہے عبد اللہ بیٹا عمرو کا بیٹا ام مکتوم کا۔
2. عبد اللہ بن ابی ابن سلول، سلول عبد اللہ کی والدہ اور ابی کی بیوی ہے عبد اللہ بیٹا ابی کا بیٹا سلول کا۔
3. عبد اللہ بن مالک ابن بحینۃ عبد اللہ کی ماں ہے اور مالک کی بیوی ہے۔
4. محمد بن علی ابن الحنفیہ، حنفیہ محمد کی ماں ہے علی کی بیوی ہے۔
5. اسماعیل بن ابراہیم ابن علیۃ، علیۃ ابراہیم کی بیوی اور اسماعیل کی والدہ ہے۔
6. اسحاق بن ابراہیم ابن راہویہ، راہویہ ابراہیم ہی کا لقب ہے۔

غرض اوپر پانچ نام ایسے ہیں کہ ماں اور باپ دونوں کی طرف منسوب ہیں یعنی عبد اللہ، عمرو کا بیٹا اور اپنی ماں ام مکتوم کا بیٹا ہے۔ عبد اللہ اپنے باپ ابی اور ماں سلول کا بیٹا ہے۔ ان ناموں میں آخری نام اسحاق بن ابراہیم ابن راہویہ میں راہویہ اور ابراہیم ایک ہی چیز ہے اور یہی رائے بعض علماء کی ماجہ میں ہے کہ یہ یزید کا لقب ہے یعنی محمد بیٹا یزید کا اور یزید کا لقب ماجہ ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ محمد بیٹا ماجہ کا کیونکہ ماجہ اور یزید ایک ہی چیز ہے محمد دونوں کا بیٹا ہے۔

الجمع بین الصحیحین للحمیدی

خطبہ مشکوۃ میں یہ لفظ آیا ہے "**الجمع بین الصحیحین**" شیخ حمیدی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے آپ کا نام حافظ ابو عبد اللہ محمد بن ابی نصر رحمۃ اللہ علیہ ہے اپنے دادا حمید کی طرف منسوب ہے، ابن حزم کے خاص شاگرد ہیں، ظاہری مذہب پر تھے، صاحب کرامات بزرگ تھے، صاحب تقویٰ تھے۔ علامہ حمیدی رحمۃ اللہ علیہ نے "**الجمع بین الصحیحین**" میں بخاری اور مسلم کی احادیث کو جمع کر دیا ہے بعض روایات کی تشریح بھی کی ہے اور بعض کی تکمیل و تتمیم بھی کی ہے مگر امتیاز رکھا ہے آپ قرن

خامس کے مشہور مصنفین میں سے تھے ۸۸ ۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ ایک امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد حمیدی ہیں وہ اور ہیں اور یہ دوسرے ہیں، آپ کا ایک شعر یہ ہے۔

لقاء الناس ليس يفيد شيئًا
سوى الهذيان من قيل وقال
فأقلل من لقاء الناس الا
لاخذ العلم او اصلاح حال

جامع الاصول:

خطبۂ مشکوۃ میں اس کا تذکرہ بھی آیا ہے، یہ علامہ ابن اثیر جزری رحمہ اللہ کی مشہور و معروف کتاب ہے جس میں آپ نے صحاح ستہ کی احادیث کو جمع فرمایا ہے اور ابواب کی ترتیب حروف تہجی کی بنیاد پر رکھی ہے، آپ ابن اثیر جزری کے نام سے مشہور ہیں، آپ نے لغات الحدیث میں ایک نہایت عمدہ و نافع کتاب نہایہ ابن الاثیر لکھی ہے، جامع الاصول دس سے زیادہ جلدوں میں ہے۔

محدث شہیر ابوالحسن رزین بن معاویۃ:

شیخ رزین اندلس کے رہنے والے تھے قریش کے ایک بطن عبدالدار بن قصی کی طرف منسوب ہو کر عبدری ہو گئے آپ حافظ الحدیث اور جلیل القدر محقق تھے، علم حدیث میں آپ نے ''تجرید الصحاح'' کے نام سے کتاب لکھی ہے جس میں آپ نے مؤطا مالک اور صحاح ستہ کو جمع کیا ہے، علامہ ابن اثیر جزری رحمہ اللہ نے جامع الاصول کی تصنیف میں اسی کتاب پر اعتماد کیا ہے آپ کا انتقال مکہ مکرمہ میں ۵۳۵ھ میں ہوا۔ رزین کا نام راء کے ضمہ زاء کے فتحہ یا کے سکون کے ساتھ لجین کی طرح پڑھا گیا ہے۔

الفراء البغوی:

خطبۂ کتاب میں یہ لفظ آیا ہے، الفرائ، محی السنۃ کے والد کی صفت ہے جن کا نام مسعود ہے۔ فراء فرو سے ہے، فرو پوستین کو کہتے ہیں۔ شیخ مسعود شاید پوستین کی تجارت کرتے تھے یا اس کو زیادہ پہن کر استعمال کرتے تھے یا کوئی خاندانی نسبت ہے کسی نے یہ کام کیا ہوگا۔ لفظ فراء جب مسعود کی صفت ہوگی تو پھر مجرور پڑھا جائے گا۔ البغوی مرفوع پڑھا جائے گا کیونکہ یہ حسین کی صفت ہے اور وہ مرفوع ہے، تو یہ بھی مرفوع ہے علماء نے لکھا ہے کہ ناموں کے تسلسل میں جب آخر میں کوئی نسبت آتی ہے تو قاعدہ یہ ہے کہ یہ نسبت پہلے نام کے ساتھ لگ کر اس کی صفت بنے گی۔ جیسے بغوی یعنی حسین بغوی پھر بغوی اصل میں ''یاںغ'' کی طرف منسوب ہے یا ''بغشور'' کی طرف یہ مرو اور ہرات کے درمیان خراسان کے علاقے میں ایک گاؤں کا نام ہے اس نسبت میں بغوی بھی جائز ہے اور بغشوری بھی درست ہے یا پورے مرکب کی طرف نسبت کر دیا چاہو تو آخری جز

کاٹ کر پہلے جز کی طرف نسبت کرو جیسے بعلبک میں ''بعلبکی'' اور ''بعلی'' دونوں جائز ہے یہاں ''بغ'' کی نسبت بغی آتی ہے مگر اس لفظ کے معنی زانیہ کے آتے ہیں اس لئے بغ کی نسبت میں واو بڑھا کر بغوی کر دیا گیا اور اسماء محذوفۃ الاعجاز میں اس طرح کرنا جائز ہے جیسے دم میں دموی اب میں ابوی ہے اور اخ میں اخوی آتا ہے۔

مذکورہ ائمہ کی سنہ وفات:

خطبۂ مشکوٰۃ میں جن ائمہ حدیث کے نام آئے ہیں، تتمیم فائدہ کی غرض سے ان کی سنہ ولادت اور سنہ وفات کو لکھا جاتا ہے۔

1. حسین بن مسعود بغوی ولادت ۴۳۵ھ وفات ۵۱۶ھ (مرو میں مدفون ہیں)
2. محمد بن اسماعیل البخاری ولادت ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ (بخارا میں مدفون ہیں)
3. مسلم بن حجاج القشیری ولادت ۲۰۴ھ وفات ۲۶۱ھ (نیشاپور میں مدفون ہیں)
4. امام مالک بن انس ولادت ۹۵ھ وفات ۱۷۹ھ (مدینہ منورہ میں مدفون ہیں)
5. محمد بن ادریس الشافعی ولادت ۱۵۰ھ وفات ۲۰۴ھ (مصر میں مدفون ہیں)
6. احمد بن حنبل ولادت ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ (بغداد میں مدفون ہیں)
7. محمد بن عیسیٰ ترمذی ولادت ۲۰۹ وفات ۲۷۹ھ (ترمذ میں مدفون ہیں)
8. ابوداؤد سجستانی ولادت ۲۰۲ھ وفات ۲۷۵ھ (بصرہ میں مدفون ہیں)
9. احمد بن شعیب نسائی ولادت ۲۱۵ھ وفات ۳۰۳ھ (مکہ مکرمہ میں مدفون ہیں)
10. محمد بن یزید ابن ماجہ ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۳ھ (قزوین میں مدفون ہیں)
11. عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی ولادت ۱۷۲ھ وفات ۲۵۵ھ۔
12. علی بن عمر دارقطنی ولادت ۳۰۶ھ وفات ۳۸۵ھ
13. احمد بن حسین البیہقی ولادت ۳۸۴ وفات ۴۵۸ (نیشاپور میں مدفون ہیں)
14. رزین بن معاویہ ولادت معلوم نہیں وفات ۵۳۵ھ (مکہ مکرمہ میں مدفون ہیں)

تنبیہ:

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سن وفات اور سن ولادت میں علماء تاریخ کے درمیان اختلاف آتا رہتا ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا تاریخوں میں اگر تفاوت نظر آیا تو اس کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

مورخہ ۱۳ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

اخلاص نیت والی حدیث

﴿۱﴾ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِامْرِءٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهٖ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلٰى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے، یعنی عمل کا ثمرہ نیت پر مرتب ہوتا ہے۔ اور ہر آدمی کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی لہٰذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کی (ظاہراً) تو اس کی ہجرت (حقیقتاً) اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کے لئے ہوگی اور جس نے دنیا کمانے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کام کے لئے ہوگی جس کا اس نے ارادہ کیا۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس حدیث کو عموماً باب کی مناسبت کے بغیر باب سے پہلے درج کیا جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

علماء نے اس بارے میں لکھا ہے کہ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس حدیث کی طرف پڑھنے والوں کی توجہات مبذول کرانے کی غرض سے مناسبت کے بغیر ابتداء میں درج کیا جاتا ہے جیسا کہ دنیا والوں کا دستور ہے کہ وہ لوگوں کی توجہات کسی کام اور پیشہ کی طرف مبذول کرانے کے لئے عجیب وغریب مہیب شکل بنا کر پیش کرتے ہیں، تو لوگ اس کو دیکھ کر غور کرتے ہیں اور دلچسپی لیتے ہیں۔ اس حدیث شریف کو بھی الگ تھلگ لا کر طلبہ اور علماء کو متوجہ کرانا ہے کہ یہاں احادیث کا بحر ذخار ہے، اس میں غوطے لگا کر موتی حاصل کرلو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سلفاً وخلفاً مصنفین ومحدثین نے اس حدیث شریف کو بے ربط و بے جوڑ ابتدا میں رکھا ہے تا کہ ہر پڑھنے والے کی پہلی نگاہ اصلاح احوال وافعال اور درستی نیت واقوال کے اس روشن مینار پر پڑ جائے اور آگے کا سارا سفر صحت نیت اور خلوص افعال واعمال کے ساتھ ہو جائے۔ چنانچہ اس حدیث کی جلالت شان اور عظمت مقام کے متعلق علماء کرام اور ائمہ عظام، عظیم الشان رائے رکھتے ہیں۔

اس حدیث کی شان:

❶ عبدالرحمن بن مہدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

من اراد ان یصنف کتابا فلیبتدأ بهذا الحديث.

یعنی جو شخص بھی کوئی کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کرے تو اس پر لازم ہے کہ اس حدیث سے کتاب کی ابتداء کرے۔

❷ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اساتذہ اور متقدمین ہر اچھے کام اور دینی امور میں اس حدیث کو ابتداء میں رکھنے کو پسند کرتے تھے۔

❸ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو نصف العلم کا درجہ دیا ہے، کیونکہ علم قلب سے تعلق رکھتا ہے یا زبان و جوارح و قالب سے تعلق رکھتا ہے اور حسن نیت کا تعلق قلب اور دل سے ہے تو یہ نصف العلم ہے۔

❹ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ربع العلم فرمایا، کیونکہ دین اسلام کو چار اہم شعبوں پر یوں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

① اتقاء الشبہات ② زهد فی الدنیا ③ ترك ما لا یعنیه ④ خلوص النیة۔

چنانچہ ایک چوتھائی شعبہ اس حدیث میں ہے جو خلوص نیت ہے۔

❺ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ علماء نے اس حدیث کو ثلث العلم کہا ہے کیونکہ عمل کا تعلق قلب سے ہے یا جوارح سے ہے یا لسان سے ہے اور قلب سے جو عمل وابستہ ہے وہ حسن نیت اور خلوص نیت ہے جس پر یہ حدیث محیط ہے۔

شانِ ورود حدیث:

سنن سعید بن منصور اور معجم کبیر میں طبرانی نے اس حدیث کے شان ورود میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے کسی عورت کو پیغام نکاح دیا تھا اس نے نکاح کے لئے یہ شرط لگائی کہ اگر تم ہجرت کرو گے تو تمہارے ساتھ نکاح کروں گی۔ یہ عورت ام قیس کے نام سے مشہور تھی، جس کا نام ''قیلہ'' تھا اس شخص نے جب اس عورت سے نکاح کے لئے ہجرت کی تو لوگ اسے ''مہاجر ام قیس'' کہنے لگے۔

• علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابی کی شان کی حفاظت کی اور آج تک معلوم نہ ہوسکا کہ اس شخص کا نام کیا تھا اور یہ کون تھا؟

اب یہاں ایک اصولی اعتراض ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پیغام نکاح دیا۔ ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے شرط لگائی کہ اگر اسلام قبول کرو گے تو نکاح ہو جائے گا انہوں نے اسلام قبول کیا اور نکاح ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں اسلام کو قبول کیا گیا اور وہاں ہجرت کا سارا ثواب ضائع ہو گیا حالانکہ دونوں جگہ نکاح کی غرض کارفرما تھی؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہجرت اور اسلام میں امتداد و عدم امتداد کا فرق ہے، ہجرت ایک آنی عمل ہے یعنی ایک حد پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے اس میں امتداد نہیں اور اسلام ایک فعل ممتد اور "امر" امتدادی ہے کسی جگہ پر جا کر اس کی حد و سرحد ختم نہیں ہوتی، لہٰذا جب ایک شخص اپنی غرض کے لئے ہجرت کرتا ہے تو آخری مرحلہ میں وہ اپنا مطلوب پاتا ہے اور پھر ہجرت ختم ہو جاتی ہے تو آخری مرحلہ تک خود غرضی تھی اور آگے ہجرت نہیں تھی اس لئے وہ خراب رہ گئی، اس کے برعکس اسلام ایک امر ممتد اور عمل ممتد ہے اگر آج اس میں نیت کی خرابی تھی اور اسلام مقبول نہیں ہوا تو کل نیت صحیح ہوسکتی ہے اور اسلام درست ہوسکتا ہے اس لئے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے اسلام کو ضائع نہیں کہا گیا۔

یہ حدیث غریب ہے:

اس حدیث کی سند میں غرابت ہے اور سعید بن منصور راوی کے بعد تمام واسطوں میں غرابت ہے مگر کثرت طرق کی وجہ سے یہ

قوی ہوگئی ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ بخاری شریف میں بھی غریب احادیث موجود ہیں، غریب کوئی نامقبول نہیں ہے اس حدیث کو "حدیث المنبر" بھی کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا حضور ﷺ نے منبر پر اس کو بیان کیا تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ:

آپ عدوی قریشی ابوحفص الفاروق ہیں جو چھ نبوی میں چالیس آدمیوں کے بعد اسلام لائے۔آپ کے ایمان کے بعد اسلام کو عزت ملتی رہی۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفۃ المسلمین بنے۔ ۲۳ لاکھ چالیس ہزار مربع میل زمین پر دس سال تک عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کی۔دنیا میں مفتوحہ علاقوں میں چار ہزار عام مساجد بنوائیں اور نوسو بڑی جامع مسجدیں بنوائیں، شام، مصر، دیار بکر اور فارس کو فتح کرکے ۲۳ ہجری میں ابولؤلؤ مجوسی کے ہاتھ یکم محرم الحرام کو شہید ہوئے۔ (۵۳۷) احادیث روایت کیں، آپ کی انگوٹھی کی مہر میں یہ عبارت تھی "**کفی بالموت واعظا**"۔

انما کی تحقیق:

اہل لغت اور اصولیوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ واضع نے انما کو حصر کے لئے وضع کیا ہے اور اس سے حکم کی تاکید مقصود ہوتی ہے جیسے "**انما علی رسولنا البلاغ المبین، انما الھکم الہ واحد**" بہرحال انما سے مذکور کا اثبات ہوتا ہے اور غیر مذکور کی نفی ہوتی ہے۔حصر کا معنی اس طرح ہوگا: "**انما الاعمال تعتبر بالنیۃ ولا تعتبر بغیرھا**" یا اس طرح ہوگا "**لیست الاعمال حاصلۃ الا بالنیۃ**"۔

الاعمال کی تحقیق:

"اعمال" عمل کی جمع ہے اس کے مقابلے میں النیات مذکور ہے اور جب جمع کا مقابلہ جمع سے ہوجائے تو تقسیم آحاد پر ہوتی ہے تو نتیجہ اس طرح نکلا کہ ہر ہر عمل نیت کے ساتھ وابستہ ہے۔عمل اور فعل میں تھوڑا سا فرق علماء نے بتایا ہے وہ یہ کہ عمل کا اطلاق صرف اختیاری کاموں پر ہوتا ہے غیر اختیاری کام کو عمل نہیں کہتے اور فعل عام ہے، اختیاری ہو یا غیر اختیاری ہو چنانچہ **اعملوا صالحا** آیا ہے، **افعلوا صالحا** نہیں آیا ہے۔دوسرا فرق یہ ہے کہ عمل کے مفہوم میں دوام اور استمرار پڑا ہے اور فعل میں ایسا نہیں ہے۔

بالنیات میں باء کا متعلق کیا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ بہت سارے اعمال ایسے ہیں جو حسًا وصورۃً نیت کے بغیر حاصل ہوجاتے ہیں اور جو اعمال غیر اختیاری ہیں مثلاً چھت وغیرہ سے گرجانا یہ سب بغیر نیت کے وجود میں آجاتے ہیں۔لہٰذا یہاں **بالنیات** کے لئے ایک ایسی عبارت مقدر نکالنی پڑے گی جس سے حدیث کا مفہوم واضح ہوجائے۔نیز **بالنیات** میں جار مجرور کا متعلق بھی معلوم ہوجائے۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ یا تو افعال عامہ میں سے کوئی فعل مقدر نکالا جائے یعنی "**کون، ثبوت، حصول، وجود**" ان چار افعال عامہ میں سے کوئی فعل مقدر نکالا جائے لیکن اس میں یہ نقصان ہے کہ افعال عامہ کا تعلق حسی افعال سے ہوتا ہے

لہٰذا ان میں سے کسی فعل کے مقدر ماننے سے یہ لازم آئے گا کہ اعمال کا حسی وجود بغیر نیت کے نہیں ہوتا، یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ افعال حسی کا وجود تو بغیر نیت کے ہوسکتا ہے۔

اب ضروری ہوا کہ یہاں کوئی فعل خاص مقدر مانا جائے، اب کونسا فعل خاص نکالا جائے؟ تو جمہور ائمہ نے اس کا متعلق **صحة یا تصح یا منوطة بالنیات** مانا ہے یعنی کوئی عمل نیت کے بغیر صحیح نہیں، ہر عمل کا دارومدار نیت پر ہے، ائمہ احناف نے **کاملة** اور **ثواب** کا فعل مقدر مانا ہے۔ یعنی **انما الاعمال تثاب بالنیات** یعنی اگر نیت نہیں تو عمل پر ثواب مرتب نہیں ہوگا مگر نفس عمل کا وجود ہو جائے گا۔

ان دونوں مقدرات پر اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے انداز سے اعتراضات ہیں، احناف **ثواب** کے مقدر ماننے کو ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ثواب کے مقدر ماننے سے سب کو فائدہ ہے لیکن اگر **صحة** نکالیں گے تو یہ جمہور کے بھی خلاف ہے کیونکہ بہت سارے افعال ایسے ہیں جو اُن کے ہاں بھی بغیر نیت کے متحقق ہو جاتے ہیں۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک **تعتبر** او **معتبرة** مقدر ماننا زیادہ واضح ہے تاکہ تمام عبادات کو آسانی سے شامل ہو جائے یعنی **انما الاعمال معتبرة** اور **تعتبر بالنیات** اس میں تمام اعمال آگئے۔

❶ خواہ عبادات مقصودہ ہوں جیسے صوم وصلوٰۃ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ۔ یہاں **انما الاعمال تعتبر لصحتها النية** یعنی ان عبادات فرضیہ کی صحت کے لئے نیت ضروری ہے بغیر نیت فرض عبادت صحیح نہیں۔

❷ یا وہ اعمال عبادات فرضیہ کے لئے شرائط کے درجہ میں ہوں گی جیسے طہارات، ستر عورت وغیرہ تو یہاں **لحصول ثوابها** مقدر مانا جائے گا جیسے **انما الاعمال تعتبر لحصول ثوابها النية** یعنی جب تک شرائط کے درجہ کے اعمال مثلاً غسل، وضو، تیمم، طہارت مکان و بدن اور طہارت لباس وغیرہ میں ثواب کی نیت نہ کرو گے تو ثواب نہیں ملے گا اگرچہ عمل صحیح ہوگا۔

❸ یا وہ اعمال امور مباح ہوں گے تو وہاں **تعتبر** کے بعد **تصیر و تنقلب** مقدر مانا جائے گا جیسے:

انما الاعمال المباحة تعتبر ای تصیر وتنقلب بالنية الحسنة حسنات وبالنية السيئة سيئات۔

بہر حال **تعتبر** عام لفظ ہے، اس عموم کے پیش نظر موقع و محل کے مناسب فعل نکالا جائے گا تو عبادات مقصودہ وغیر مقصودہ اور مباح سب کو شامل ہو جائے گا بلکہ متروکات جیسے خمر، زنا وغیرہ کے ترک کرنے کو بھی شامل ہو جائے گا کہ نیت حسنہ کے ساتھ چھوڑنے پر اجر وثواب ملے گا، ابن دقیق العید نے اس کی تائید بھی کی ہے کہ متروکات کے ترک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اعمال متعلقہ بالنیات کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے:

❶ معاصی:

معصیت میں نیت سے کوئی تغیر نہیں آتا، گناہ کا کام حسن نیت سے نیک کام نہیں بنتا جیسے حرام مال کے خرچ کرنے میں ثواب کی نیت کی، یا اس سے مسجد بنوائی، یا مدرسہ بنالیا، یا کسی اور نیک کام میں لگادیا سب صورتوں میں کچھ بھی ثواب نہیں ملے گا۔

❷ طاعات وعبادات مقصودہ:

یہ عبادات اصل صحت میں بھی نیت کی طرف محتاج ہیں اور مزید فضیلت میں بھی نیت کی طرف محتاج ہیں، اصل نیت میں تو اس لئے کہ عبادت ضائع نہ ہو۔ اور اکثار **فضیلت** اور رفع درجات کے لئے اس میں اس طرح نیت کی جائے کہ کئی نیتیں ایک عمل میں شامل کر کے کئی ثواب حاصل کئے جائیں مثلاً نماز کے لئے مسجد میں آیا قبلہ رخ ہونے کی نیت بھی کی، اعتکاف کی نیت بھی کی، انتظار صلوٰۃ کی نیت بھی کی، غریب کی مدد کی نیت بھی کی، وغیرہ وغیرہ تو ان سب نیتوں پر ثواب ملے گا۔

❸ مباح عمل:

مباح کام ایک پاکیزہ نیت کا احتمال رکھتا ہے جیسے عطر لگانا نیک نیتی کے ساتھ ایک مباح امر ہے مگر فخر ومباہات اور تکبر کے طور پر ناجائز وگناہ ہے۔ ہاں اگر اقتداء سنت رسول اللہ ﷺ کی کرے تو ثواب بھی ہے ورنہ ویسے مباح عمل کے کرنے میں ثواب نہیں ملے گا یا مسجد کے احترام کی نیت کر لے تو اس مباح عمل سے بھی ثواب ملے گا بلکہ ایک عمل میں کئی نیک اعمال کی نیت کرے تو کئی ثواب ملیں گے۔

ان تمام ابحاث کے بعد یہ سمجھ لیں کہ احناف کے ہاں وسائط اور وسائل میں نیت ضروری نہیں، ہاں مقاصد میں ضروری ہے مگر شوافع کے ہاں مقاصد اور وسائل اور وسائط دونوں میں نیت ضروری ہے، اس پر ایک اختلافی مسئلہ متفرع ہے جو آئندہ درس میں آرہا ہے۔

مورخہ ۲ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

بالنیات:

یہ مشدد بھی صحیح ہے اور بغیر شدّ کے بھی صحیح ہے نیات جمع ہے نیة کی اور نیت لغت میں قصد کے معنی میں ہے اور اس کی اصطلاحی تعریف اس طرح ہے: **توجه القلب نحو الفعل ابتغاء لوجه الله۔**

نیت کی تین قسمیں ہیں:

❶ **تمییز العبادة من العادة۔** ❷ **تمییز العبادة من العبادة۔** جیسے ظہر کی نیت ظہر کو عصر سے ممتاز کرتی ہے۔

❸ **تمییز المعبود الحق من المعبود الباطل۔** مثلاً نماز صرف ایک معبود کے لئے ہے روزہ صرف ایک معبود کے لئے ہے غیر کے لئے نہیں۔

فقہاء کا اختلاف:

بالنیات میں جار مجرور کا جو متعلق مقدر نکالا گیا ہے وہیں سے فقہائے کرام کے درمیان وضو میں نیت کرنے نہ کرنے کا اختلافی مسئلہ شروع ہوگیا۔ جمہور نے چونکہ "تصح" کا لفظ مقدر مانا ہے اس لئے وہ ہر ہر عمل میں صحت کے لئے نیت کو شرط قرار دیتے ہیں لہٰذا ان کے ہاں وضو میں بھی نیت ضروری ہے کیونکہ وضو بھی اعمال میں سے ایک عمل ہے۔

ائمۂ احناف اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فقہاء فرماتے ہیں کہ وضو کی صحت کے لئے نیت ضروری نہیں ہے، جمہور نے **انما الاعمال بالنیات** سے استدلال کیا ہے۔ احناف نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے مگر ثواب کا لفظ مقدر مان کر فرمایا کہ نفس وجود بغیر نیت کے صحیح ہے، ہاں نیت کرنے سے ثواب حاصل ہو جائے گا احناف نے شوافع پر اعتراض کیا ہے کہ اگر ہر عمل میں نیت شرط ہے تو تمہارے نزدیک غسل ثیاب کپڑے وغیرہ دھونے میں نیت کی شرط کیوں نہیں ہے؟ شوافع نے جواب دیا ہے کہ غسل ثیاب میں ازالۂ نجاست حکمیہ نہیں بلکہ نجاست حقیقیہ ہے اور وضو میں ازالۂ نجاست حکمیہ ہے، نیت نجاست حکمیہ کے ازالہ کی صورت میں ضروری ہے احناف فرماتے ہیں کہ یہ فرق آپ نے کہاں سے پیدا کیا حالانکہ پانی کو اللہ تعالیٰ نے "**وانزلنا من السماء ماء طهورًا**" فرما کر ہر چیز کے لئے بغیر نیت کے مطہر قرار دیا پھر آپ نے وضو کے لئے مطہر بالنیۃ اور کپڑوں کے لئے مطہر بغیر نیت کا فرق کہاں سے نکالا ہے۔

منشاء اختلاف:

فقہائے کرام کے درمیان یہاں منشاء اختلاف یہ ہے کہ جمہور نے وضو کو عبادت محضہ غیر مدرک بالعقل قرار دیا ہے تو باقی عبادات محضہ کی طرح اس میں بھی نیت ضروری ہے احناف نے وضو کو عبادات محضہ کے لئے وسیلہ اور واسطہ مانا ہے کہ وضو نماز کے لئے واسطہ اور وسیلہ ہے خود عبادت محضہ نہیں ہے۔ اب وضو کی عبادت محضہ سے بھی مشابہت ہے اور وسیلہ سے بھی مشابہت ہے کیونکہ عبادت بھی ہے اور دوسرے کے لئے طہارت بھی تو اس وجہ سے فقہاء میں اختلاف ہو گیا، جمہور نے اس کو عبادت سے مشابہ قرار دیا اور احناف نے اس کو طہارت سے اشبہ قرار دیا، عبادت محضہ میں سب کے نزدیک نیت ضروری ہے لیکن وضو کی حیثیت کے تعین میں اختلاف ہوا تو اس میں نیت کے حکم میں اختلاف پیدا ہو گیا اب دیکھنا یہ ہے کہ وضو کس سے زیادہ مشابہ ہے؟ طہارت سے یا عبادت سے؟ تاکہ جس سے وہ زیادہ مشابہ ہو اسی سے اس کو ملایا جائے تو احناف فرماتے ہیں کہ قرآنی نصوص اور احادیث کی تصریحات یہ بتاتی ہیں کہ وضو کا تعلق طہارت سے ہے۔ قرآن میں وضو سے متعلق آیت اس طرح ہے "**ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم**" (مائدة ٦) اس آیت میں وضو کو طہارت کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے اسی طرح "**مفتاح الصلوٰۃ الطھور**" حدیث نے وضو کو طہارت میں شامل کر دیا ہے۔ لہٰذا جس طرح "**وثیابك فطھر**" میں کسی کے نزدیک غسل ثیاب کے لئے نیت نہیں تو وضو میں بھی صحت وضو کے لئے نیت کی ضرورت نہیں ہاں ثواب الگ چیز ہے۔

اب یہاں ایک اعتراض ہے جو احناف کی طرف متوجہ ہے اور وہ یہ کہ تیمم میں احناف نے بھی نیت کو فرض قرار دیا ہے حالانکہ تیمم بھی وسائل میں سے ہے اور عبادات محضہ میں سے نہیں ہے؟ احناف جواب دیتے ہیں کہ تیمم میں دو وجہ سے احناف نے نیت کو فرض قرار دیا ہے: اول وجہ یہ ہے کہ تیمم کے مفہوم میں لغت کے اعتبار سے نیت کا معنی پڑا ہوا ہے۔ دوم یہ کہ مٹی اصلاً ملوث ہے، جسم کو آلودہ کرتی ہے تو نیت کرنے سے طہارت آئے گی اور پانی تو اصلاً مطہر ہے۔ جب آپ نے ایک مطہر چیز استعمال کر لی تو طہارت حاصل ہو گئی، جو پانی کا طبعی اثر ہے، اس میں مزید نیت صرف مزید ثواب ہی کیلئے ہو سکتی ہے۔

بعد اللتیا والتی اصل صورت حال یہ ہے کہ نزاعی مسئلہ دراصل اجتہادی مسئلہ ہے جو قواعد سے مستنبط ہے۔ شوافع اور جمہور کا الگ اجتہاد ہے، اور احناف کا الگ اجتہاد ہے۔ مسئلہ اپنی جگہ پر ہے لیکن اس اختلافی مسئلہ کا اس حدیث سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اس حدیث سے مستنبط ہے۔ اگر کوئی شخص اس مسئلے کو اس حدیث کی طرف منسوب کرتا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے، ورنہ حدیث تو صرف حسن نیت اور قبح نیت بیان کرنے کے لئے آئی ہے کہ اچھی نیت ہوگی تو عمل پر ثواب ملے گا، بری نیت ہوگی تو ثواب نہیں ملے گا، یہ بابِ اخلاص کے قبیل سے ہے جس کا بار بار قرآن کریم نے اعلان کیا ہے، اور احادیث مقدسہ میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے۔

اس مذکورہ حدیث میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ قربانی کے لحاظ سے سب سے بڑا عمل ہجرت ہے۔ جب غلط نیت سے اتنی بڑی قربانی ضائع ہوسکتی ہے تو چھوٹے اعمال کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔ آپ غور فرمائیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ نیت کے بغیر تو وضو ممکن ہی نہیں ہے۔ جب آدمی گھر سے اٹھتا ہے، وضو بناتا ہے پھر مسجد جاتا ہے، گرمی اور سردی میں محنت و مشقت اٹھا کر وضو کرتا ہے تو کیا یہ اتنا طویل عمل نیت کے بغیر ہوگیا حالانکہ نیت تو قلبی ارادے کا نام ہے جو کسی چیز کی طرف متوجہ ہو جانا ہے تو وضو بغیر نیت کے ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ بحث اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اس کا اس حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں بغیر ارادہ وضو اس وقت متحقق ہوسکتا ہے کہ آدمی کسی کام سے جا رہا ہو اور اچانک کنوئیں میں گر کر تر بتر ہوگیا، یا بارش میں سفر کر رہا تھا اور پورا جسم بھیگ گیا بلکہ دھل گیا تو یہاں یہ مسئلہ اٹھ سکتا ہے کہ نیت کے بغیر وضو یا غسل صحیح ہوا یا صحیح نہیں ہوا، لیکن یہ صورت نادر ہے اور نادر کالمعدوم ہوتا ہے۔

مقدر نکالنے پر جانبین سے اعتراض:

اس حدیث سے مذکورہ نزاعی مسئلہ کا اس وجہ سے بھی تعلق نہیں ہے کہ مقدر نکالنے پر ہر جانب نے دوسرے پر اعتراضات کئے ہیں، شوافع نے جو "تصح" مقدر نکالا ہے، اس پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ صحیح عمل وہ ہوتا ہے جس میں تمام شرائط موجود ہوں، تو صحت کا یہ حکم دنیوی اعمال پر تو لگ سکے گا کہ شرائط کو دیکھ کر حکم لگا دیں گے مگر اخروی اعمال کی صحت پر یہ حکم نہیں لگ سکے گا، حالانکہ "**انما الاعمال بالنیات**" عام ہے، اس کو دنیوی اعمال تک خاص کرنا مناسب نہیں؟

دوسرا اعتراض شوافع پر یہ ہوتا ہے کہ صحت کا حکم اور عدم صحت کا حکم یہ نئی اصطلاح ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں یہ اصطلاح نہیں تھی تو حدیث کو اس پر حمل نہیں کیا جاسکتا۔

تیسرا اعتراض یہ کہ اگر شوافع سارے عملوں کے صحیح ہونے کے لئے نیت شرط قرار دیتے ہیں تو پھر اس حدیث پر وہ خود بھی عمل نہیں کرسکیں گے کیونکہ اخلاق و آداب، معاملات و عقوبات، امانات و مناکحات اور خصومات وغیرہ ایسے احکام ہیں جس میں تمہارے ہاں بھی نیت شرط نہیں ہے۔

احناف نے "**ثواب**" کو مقدر مانا ہے اس پر بھی یہ چند وجوہ اعتراض ہے۔

اول اعتراض یہ ہے کہ ثواب کا تعلق صرف اعمال آخرت سے ہے۔ اعمال دنیا سے نہیں حالانکہ حدیث عام ہے دنیا و آخرت

دونوں سے متعلق ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ثواب کا مدار صحت عمل پر ہے اگر عمل صحیح ہے تو ثواب ملے گا ورنہ نہیں ملے گا، تو آخر کار یہ مقدر بھی شوافع کے مقدر "صحت" کی طرف لوٹ کر آئے گا، تو بات وہیں پہنچی جہاں سے چلی تھی، معلوم ہوا کہ یہ حدیث حسن نیت اور قبح نیت سے متعلق ہے اور "تعتبر" مقدر نکال کر اس کو اپنے عموم پر رکھنا زیادہ مناسب ہے۔

۰ پیر ۵ ذی القعدہ ۱۴۰۹ھ

زیر بحث حدیث کے جملے تین ہیں۔ ہر جملہ تفصیل چاہتا ہے۔ پہلا جملہ "**انما الاعمال**" ہے اس پر کلام ہو چکا ہے۔ دوسرا جملہ "**وانما لکل امرء ما نوی**" ہے۔ جس کے متعلق ابھی تفصیل آنے والی ہے اور تیسرا جملہ "**فمن کانت هجرته الی الله الخ**" ہے اس پر بھی کلام ہوگا، سر دست "**وانما لکل امرء ما نوی**" کی تحقیق ملاحظہ ہو:

لفظ "**امرء**" میں جو راء ہے یہ آخر حرف ہمزہ کے اعراب کے تابع ہے۔ اگر ہمزہ پر پیش ہو تو راء پر بھی پیش آئے گا۔ اگر ہمزہ پر زبر ہو تو راء پر بھی زبر آئے گا، اور اگر ہمزہ پر زیر آجائے تو راء پر بھی زیر آئے گی۔ اس لحاظ سے یہ ایک عجیب کلمہ ہے جس میں بیچ والے حرف پر بھی اعراب جاری ہوتا ہے۔ "**ما نوی**" میں "ما" موصولہ ہے اور نوی میں ضمیر منصوب محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں ہے "**ما نواه**" یعنی ہر آدمی کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے، یعنی بقدر نیت ثواب ملے گا، اب اگر ایک نیکی میں کئی نیتیں کرتا ہے تو کئی ثواب ملیں گے۔

دونوں جملوں میں ربط:

"**انما الاعمال**" اور "**انما لکل امرء ما نوی**" یہ دو جملے ہیں، اب ان کا آپس میں ربط اور جوڑ اور مابین کی مناسبت کیا ہے؟ تو اس میں کئی اقوال ہیں:

❶ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جملہ ثانیہ جملہ اولیٰ کے لئے تاکید ہے، اس سے پہلے جملہ کی تحقیق و تاکید مقصود ہے کہ نیت کا معاملہ اتنا مہتم بالشان ہے کہ ایک ہی مضمون کو بعنوان دیگر دوبارہ ذکر کیا۔ پہلے سے ثابت ہوا کہ نیت ہی عمل کے لئے علت باعثہ اور ابھارنے والی ہے اگر نیت صحیح ہے تو عمل مقبول ہے اور اگر نیت فاسد ہے تو عمل مردود ہے۔ پھر تاکیداً فرمایا کہ ہر آدمی کو وہی کچھ ملے گا جو اس کی نیت ہو "**ان خیرًا فخیر وان شرًا فشر**"۔

❷ یہ جملہ تاکید نہیں بلکہ تاسیس ہے۔ تاسیس اس کو کہتے ہیں کہ کوئی جملہ ماسبق جملہ کا معنی لے نہیں لوٹتا بلکہ وہ نیا حکم لے کر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ تاسیس والی اولیٰ و افضل ہے تاکید سے۔

اب جملہ ثانیہ میں وہ نیا حکم کونسا اور کیا ہے؟ تو اس میں علماء کی کئی آراء ہیں اور کئی اقوال ہیں:

❶ پہلا قول یہ کہ جملہ اولیٰ اعمال کی حالت کے متعلق ہے کہ عمل جب نیت کے تابع ہو جاتا ہے تو اس پر اچھا حکم مرتب ہوتا ہے اور جملہ ثانیہ عامل کے احوال کے مطابق ہے کہ اس مزدور کو وہی کچھ ملے جو اس نے کی۔

❷ جملہ ثانیہ سے دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ نیت میں نیابت قبول نہیں اپنی ہی نیت کا اعتبار ہے۔ غیر کی نیت کا کوئی فائدہ نہیں اور جملہ اولیٰ میں بتایا تھا کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے۔

❸ عز بن عبد السلام نے فرمایا کہ جملہ اولیٰ اس لئے تھا کہ اعمال میں کونسا عمل معتبر ہے؟ تو بتادیا کہ اچھی نیت والا عمل معتبر ہے۔ اب جملہ ثانیہ میں اس کا پھل اور نتیجہ اور ثمرہ بتادیا کہ نیت صالحہ پر یہ ثمرہ اور پھل ملتا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ جملہ اولیٰ عرب کے محاورہ کے مطابق بطور مقدمہ عقلیہ عرفیہ ذکر کیا گیا ہے کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ اعمال کا پھل نیت سے ملتا ہے۔ جملہ ثانیہ میں اسی مقدمہ عرفیہ کو مقدمہ شرعیہ کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ جو عرف عام تھا شرعی حکم بھی وہی ہے۔

فمن کانت ھجرتہ: اس جملہ کا ماسبق سے ربط اس طرح ہے کہ "**اذا تقرر ان کل انسان عملہ بنیتہ فمن کانت ھجرتہ: نصر ینصر** سے **ھجرا وھجرانا وھجرۃ** لغوی اعتبار سے ترک کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی سے **الھاجرۃ والھجیرۃ** ہے جو دوپہر کو کہتے ہیں کیونکہ اس وقت بھی لوگ کام کاج چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی لغوی مفہوم پر "**والمھاجر من ھجر الخطایا والذنوب**" وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ ہجرت کا شرعی مفہوم اور اصطلاحی تعریف اس طرح ہے کہ "اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رضا اور اپنی جان ومال وآبرو کی حفاظت کے لئے اپنے وطن مالوف کو چھوڑنا"۔

پھر اس کی تین قسمیں ہیں:

❶ **الانتقال من دار الکفر الی دار الامن:** کہ دار کفر سے ہجرت کرکے ایسے ملک میں جائے جہاں جان ومال وآبرو کے لئے امن موجود ہو۔ صحابہ کرام کی مکہ مکرمہ سے حبشہ کی طرف ہجرت اسی قسم کی تھی۔

❷ **الانتقال من دار الکفر الی دار الایمان:** یہ ہجرت مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف تھی جو آنحضرت ﷺ نے کی تھی۔

❸ **الانتقال من دار الفجور الی دار التقوی:** کہ جہاں شریعت کا نفاذ ہو، احکام الٰہی پر عمل ہو، تقوی اور امن ہو، فسق وفجور کے دروازے بند ہوں ایسے ملک کی طرف ہجرت مستحب اور پسندیدہ عمل ہے۔ لیکن اسلام کے ابتدائی دور میں دو قسم کی ہجرتیں ہی تھیں اور مکہ سے ہجرت کرنا فرض قرار دیا گیا تھا، کسی آدمی کا ایمان اس وقت تک معتبر نہیں سمجھا جاتا جب تک وہ یہ خاص ہجرت نہ کرتا، پھر جب مکہ فتح ہوگیا تو یہ خاص ہجرت موقوف ہوگئی، اس کے علاوہ ہجرت قیامت تک جاری رہے گی۔ کیونکہ ہجرت جہاد کا پیش خیمہ ہے تو جب تک جہاد ہے تب تک ہجرت بھی ہے۔

اسلام میں ہجرت کا بڑا مقام ہے کیونکہ اس میں مال وطن، خاندان، سہولت وآرام، ہر چیز کی قربانی ہے گویا اس میں ہر روز موت اور شہادت کا مقام ملتا ہے کیونکہ موت سے یا شہادت سے تو آدمی دنیا کے مصائب سے اٹھ کر چلا جاتا ہے مگر مہاجر تو ہر روز مصائب اٹھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مشورے سے اسلامی تاریخ کا پہلا دن ہجرت کے دن کو مقرر فرمایا کیونکہ اس میں سب بڑے قربانی اور یادگار تاریخ تھی۔

پھر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہجرت بھاگنے کا نام نہیں ہے، بلکہ پلٹ کر حملہ کرنے کا نام ہے اور مسلمانوں سے چھینی ہوئی زمین کو

دوبارہ حاصل کرنا ایک شرعی حکم ہے۔قرآن اعلان کرتا ہے: **واخرجوھم من حیث اخرجوکم والفتنة اشد من القتل**" یعنی جس سرزمین سے ان کفار نے تمہیں نکالا ہے، اس سے تم ان کفار کو نکالو۔اس آیت نے مسلمانوں کی زمین کو کس قدر مقدس بنادیا؟؟ کاش مسلمان حکمران اس بات کو سمجھ جائیں کہ دین کے لئے زمین کا حصول کتنا اہم ہے۔

فمن کانت ھجرته الی الله: اس جملہ پر ایک فنی اعتراض ہے وہ یہ کہ شرط اور جزا میں تغایر ہوتا ہے اتحاد نہیں ہوتا اور یہاں شرط اور جزا متحد ہیں۔یعنی **ھجرته الی الله ورسوله** اور **ھجرته الی الله ورسوله** ایک ہی چیز ہے جیسے: "**من اطاع اطاع**" تو کلام کے مہمل ہونے کا خطرہ ہے۔

اس کا جواب علماء نے دیا ہے اول جواب یہ ہے کہ جملہ اولیٰ شرط میں لفظ "**دنیا**" کو مقدر ماننا پڑے گا اور جزاء میں لفظ "**عقبیٰ**" مقدر ہوگا۔یعنی "**فمن کانت ھجرته الی الله ورسوله فی الدنیا فھجرته الی الله ورسوله فی العقبیٰ**" تو دونوں میں تغایر ہے۔

دوسرا جواب یہ کہ پہلے جملہ شرطیہ میں **قصدًا** اور **نیةً** کے الفاظ محذوف ماننے ہوں گے اور جملہ جزائیہ میں **ثمرة ومنفعة** مقدر ہوگا تو اب کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔

دنیا: یہ لفظ الف کے قصر کے ساتھ ہے اس پر تنوین نہیں ہے، یہ **دنا یدنو دنوًا نصر ینصر** سے بمعنی قریب کے ہے اور دنیا بھی آخرت سے قریب ہے یا ہر آدمی اس کے قریب ہے اور یا یہ لفظ **سمع یسمع** سے **دنی یدنی دنا ودناءة** سے ہے جو ذلیل اور کمینہ کے معنی میں ہے اس بے حقیقت دنیا کی حقیقت اور اس کی تعریف میں اختلاف ہے کہ یہ کس چیز کا نام ہے۔

① الدنیا ھو اسم مجموع ھذا العالم المتناھی۔ ② کالمخلوقات من الجواھر والاعراض الموجودة۔ ③ ھی ما علی الارض من الھواء والجو والفضاء

کس عارف نے دنیا کے لئے کہا ہے:

دنیا تخادعنی کأنی لست اعرف حالھا
مدت الیّ یمینھا فقطعتھا وشمالھا
منع الاله حرامھا وأنا اجتنبت حلالھا
فرأیتھا محتاجة فوھبت جملتھا لھا

یار ناپائیدار دوست مدار
دوستی را نہ شاید ایں غدار
جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

اس حدیث پاک میں دنیا کے بعد "او امرأة یصیبها" کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ دنیا کے مفہوم میں امرأۃ عورت پہلے سے داخل ہے تو اس کو الگ ذکر کرنے سے اس کے کامل و مؤثر فتنہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ تخصیص بعد التعمیم ہے اس کے خطرات کو ظاہر کرنے اور اس پر متنبہ کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ حدیث کا شان ورود چونکہ عورت کا معاملہ تھا اس لئے تعمیم کے بعد تخصیص میں اسی امر واقعی کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حدیث کے اول حصہ میں "الی الله ورسوله" مکرر لایا گیا ہے جبکہ آخری حصہ میں "الی دنیا یصیبها اور امرأة یتزوجها" کے الفاظ کو مکرر نہیں لایا گیا بلکہ مبہم چھوڑ کر "فهجرته الی ما هاجر الیه" کہا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جملے میں بطور استلذاذ اور حصول لذت کے لیے اللہ اور رسول کا نام مکرر لیا گیا ہے جیسے:

بالله یا ظبیات القاع قلن لنا
الیلای منکن ام لیلی من البشر

اس شعر میں بھی لیلیٰ کا نام دوبارہ ذکر کرنا بطور استلذاذ ہے۔ اور دوسرے جملے میں دنیا کا ذکر تھا اور عورت کا ذکر تھا اس میں استلذاذ نہیں تھا تو مبہم کر کے "الی ما هاجر الیه" فرمادیا۔

مورخہ ۶ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

کتاب الایمان
ایمان کے ابواب

تمام مباحث سے پہلے یہ بات ذہن میں آنی چاہیے کہ صاحب مشکوٰۃ نے کتاب الایمان سے پہلے "**انما الاعمال بالنیات**" کی حدیث سے ابتداء کیوں فرمائی؟ اور پھر تمام اعمال وعبادات پر کتاب الایمان کو مقدم کیوں کیا؟ نیز کتاب الایمان میں سب سے پہلے حدیث جبرئیل کو ذکر کیا اس کا حدیث **انما الأعمالُ بالنیات** سے کیا تعلق ہے؟ جواب یہ ہے کہ کتاب الایمان کو مقدم کرنے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ چونکہ اعمال وعبادات کی قبولیت وصحت ایمان پر موقوف ہے خواہ وہ اعمال عبادات کے قبیل سے ہوں یا معاشرت ومعاملات واخلاقیات کے قبیل سے ہوں خواہ اس کا تعلق شخصی اعمال سے ہو یا اجتماعی اعمال سے ہو، خواہ اس کا تعلق احوال غم سے ہو یا خوشی سے ہو، سب کی قبولیت کا دارومدار ایمان پر ہے اس لئے کتاب الایمان کو تمام اعمال پر مقدم کیا۔

پھر حدیث جبرئیل کی تقدیم کی وجہ اور اس کی مناسبت حدیث **انما الاعمال بالنیات** سے کیا تھی تو اس کے متعلق علامہ طیبی، قاضی عیاض مالکی، ملا علی قاری اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ حدیث جبرئیل چونکہ ہر قسم کی عبادات ظاہرہ وباطنہ پر مشتمل ہے۔ چنانچہ عقائد قلبیہ کی طرف لفظ "**الایمان**" سے اشارہ ہے اور اعضائے ظاہرہ سے متعلق امور کی طرف لفظ "**الاسلام**" سے اشارہ ہے اور اخلاص وسرائر کی طرف لفظ "**الاحسان**" سے اشارہ کیا گیا ہے۔

غرضیکہ یہ حدیث شریعت وطریقت اور حقیقت پر اجمالی طور پر مشتمل ہے اور سنن نبویہ اور آداب شرعیہ پر بطور اختصار حاوی اور محیط ہے اسی وجہ سے اس کو "**ام السنۃ**" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس طرح کہ سورۂ فاتحہ پورے قرآن کریم کے مضامین پر مشتمل ہے تو اس کو **ام القرآن** کہا جاتا ہے۔ اب ربط اور ترتیب اس طرح بن گئی کہ حدیث **انما الاعمال** بمنزلہ **بسم اللہ** ہے اور حدیث جبرئیل جامعیت اور ام السنۃ ہونے کی وجہ سے بمنزلہ سورۂ فاتحہ ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ امام بغوی نے اپنی کتاب مصابیح کو ان دونوں حدیثوں سے شروع کیا تاکہ فی الجملہ قرآن کریم کا اتباع ہو پھر حدیث جبرئیل پورے دین کے لئے بمنزلہ خلاصہ اور نچوڑ ہے کہ ۲۳ سال میں جو شریعت آسمان سے نازل ہوئی تھی اس کا خلاصہ اور اجمال حدیث جبرائیل میں ہے یہی وجہ ہے کہ روایات میں تصریح ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کی آخری عمر میں یہ سوالات کئے تھے۔ **فتح الملھم** میں ہے کہ ممکن ہے کہ یہ سوال وجواب حجۃ الوداع کے بعد ہوئے ہوں۔

صاحب مشکوٰۃ نے عنوان "کتاب الایمان" رکھا ہے اور پھر اسلام کا ذکر بھی کیا اس سے ایمان و اسلام کے اتحاد کی طرف اشارہ کیا اور اگر دونوں میں اتحاد نہ ہو تو پھر ایمان کو اصل کی وجہ سے ذکر کیا اور ضمن میں اسلام بھی آ گیا۔
حدیث **انما الاعمال** کو کتاب الایمان سے مقدم لانے کی وجوہات اس حدیث کے شروع میں مفصل بیان کی گئی ہیں۔

کتاب، باب اور فصل کی تعریف

❶ الکتاب ھو طائفۃ من المسائل اعتبرت مستقلۃ اشتملت انواعاً اولم تشتمل۔

❷ الباب نوع من المسائل اشتمل علیھا الکتاب ولیست بفصل۔

❸ الفصل طائفۃ من المسائل تغیرت احکامھا بالنسبۃ الی ما قبلھا غیر مترجم بالکتاب والباب۔

کتاب بمعنی مکتوب ومجموع ہے کیونکہ الکتاب والکتیبہ جمع اور مجموعے کے معنی میں ہے۔تو کتاب الایمان کا ترجمہ یہ ہوگا۔

ھذا مجموع ومکتوب فی الاحادیث الواردۃ فی الایمان۔

ایمان کی لغوی تحقیق:

ایمان امن سے ماخوذ ہے جو ضد خوف ہے۔امن یامن سمع یسمع سے لازمی معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔یعنی بے خوف ہونا۔ اور باب افعال سے آمن ایماناً متعدی ہوتا ہے یعنی بے خوف بنانا۔متعدی ہونے کی صورت میں امن ایماناً ایک یا دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔جیسے **امنت زیدا** میں نے زید کو امن دیا اور **امنت زید اعمروا** میں نے زید اور عمرو دونوں کو امن دیا۔متعدی ہونے کی صورت میں کبھی یہ متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے جیسے "**وامنھم من خوف**" اور کبھی متعدی بالصلۃ والحرف ہوتا ہے۔پھر یہ صلہ دو قسم پر ہوتا ہے کبھی با اور کبھی لام کے ساتھ آتا ہے۔اگر صلہ میں باء آئے تو باء کا مدخول کبھی احکام میں سے ہوگا جیسے "**امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون**" **ما انزل** احکامات ہیں اور کبھی مدخول ذوات میں سے ہوگا۔ "**کل امن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ**" یہ سب ذوات ہیں۔اور اگر امن متعدی بحرف اللام ہو تو ایمان کبھی اذعان ویقین اور تصدیق کے معنی میں آتا ہے۔جیسے "**لن نؤمن لک حتی نری اللہ جھرۃ**" یعنی ہم یقین نہیں کرتے ہیں۔اذعان وتصدیق نہیں کر سکتے۔"**وما انت بمؤمن لنا ولو کنا صادقین**" **ای وما انت بمصدق لنا** اور کبھی اطاعت وانقیاد کے معنی میں آتا ہے۔جیسے "**انؤمن لک واتبعک الارذلون**"۔خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ایمان کا معنی صلہ کی تبدیلی سے تبدیل ہو جاتا ہے۔

ایمان کی شرعی اصطلاحی تعریفات

ایمان کی اصطلاحی تعریفات الفاظ کے اختلاف کے ساتھ کل چھ ہیں۔اگرچہ مفہوم اور مرجع سب کا ایک ہی ہے۔تاہم کچھ فوائد تعدد تعریفات میں ہیں۔اس لئے میں چھ تعریفات مکمل نقل کرتا ہوں۔اگرچہ ایک بھی کافی ہے۔لیکن انشاء اللہ نقل

کرنے میں برکت ہوگی۔

❶ علامہ سید محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے ایمان کی تعریف اس طرح کی ہے:

"الایمان هو التصدیق بما علم مجئی النبی صلی الله علیه وسلم به ضرورة تفصیلا فیما علم تفصیلا واجمالا فیما علم اجمالا"۔ (روح المعانی ج۱ ص۱۱۰)

یعنی ایمان اس کا نام ہے کہ آدمی ان چیزوں کی تصدیق کرے جن کا ثبوت آنحضرت ﷺ سے یقینی طور پر متحقق ہو۔ جو چیزیں تفصیل کے ساتھ ثابت اور معلوم ہوں اس کا تفصیلی طور پر اقرار و تصدیق کرے اور جو چیزیں اجمالی طور پر ثابت ہوں اس کا اجمالی اقرار کرے۔ مثلاً نماز کا حکم، اس کی رکعات کا حکم تفصیل کے ساتھ، بدیہی اور ضروری ہے۔ اس پر تفصیل سے ایمان لانا ضروری ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ، صوم، حج کا حکم تفصیل سے معلوم و معروف و ظاہر و بدیہی اور یقینی ہے تو اس پر تفصیل سے ایمان لانا فرض ہے۔ اسی طرح اجمالی طور پر عذاب قبر یقینی بدیہی ہے۔ اس پر اجمالی طور سے ایمان لازمی ہے۔ اور عذاب قبر کی تفصیلات کا علم اخبار آحاد سے ثابت ہے اور ضروری نہیں ہے۔

تصدیق سے مراد انقیاد باطنی ہے۔ صرف زبانی نہیں۔ اسی لئے ہرقل کا اسلام معتبر نہ ہوا نیز تصدیق سے منطقی تصدیق مراد نہیں ہے۔

"ضرورةً" سے مراد یہ ہے کہ ہر خاص و عام کو معلوم ہو یا اس کا ثبوت یقینی ہو اور ضروریات دین میں سے ہو۔

❷ امام غزالی رحمہ اللہ نے "فیصلة التفرقة بین الایمان والزندقة" میں ایمان کی تعریف اس طرح کی ہے:

"التصدیق بجمیع ما جاء به النبی صلی الله علیه وسلم والکفر تکذیب النبی ﷺ فی شیء مما جاء به"۔

(اس تعریف میں ایک فائدہ یہ ہوا کہ ایمان کے مقابل کفر کی تعریف بھی اس میں آگئی ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ایمان کے لئے ضروری ہے کہ پورے اسلام کو آدمی تسلیم کرے لیکن کافر بننے کیلئے پورے اسلام کا انکار ضروری نہیں بلکہ کسی بھی ضروری حکم کے انکار سے آدمی اسلام سے نکل کر کافر ہو سکتا ہے)۔

❸ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ایمان کی تعریف اس طرح کی ہے: "کتاب اللہ کا ظاہراً اور باطناً اقرار کرنا اور اس کے معانی کو قرآن و حدیث کے موافق استعمال کرنا"۔

❹ علامہ شاہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے اس طرح تعریف کی ہے:

"تصدیق النبی بما جاء به النبی بالاعتماد علی النبی"۔

اس تعریف سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جو لوگ عقل کے زور اور عقلی دلائل سے نبی کریم ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں وہ مسلمان نہیں ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہاں اعتماد علی النبی نہیں بلکہ اعتماد اپنی عقل اور اپنی دلیل پر ہے۔

۵ شیخ عبدالقادر جیلانی، مرزا مظہر جان جاناں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہم اللہ تعالیٰ ایمان کی تعریف میں فرماتے ہیں:
"ایمان کی ایک ظاہری صورت ہے اور ایک اس کی حقیقت اور باطنی صورت ہے۔ ظاہری صورت تو یہ ہے کہ تصدیق بالجنان عمل بالارکان اقرار باللسان ہو، اور حقیقت ایمان یہ کہ مقتضاء طبع مقتضاء شرع کے تابع ہو جائے"۔

۶ امام محمد نے ایمان کی تعریف اس طرح فرمائی ہے:

"تصديق النبي بما جاء به مع التبري عن جميع ماسواه"۔

اس تعریف میں بہت اچھا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ماسوائے اسلام تمام قوانین کفریہ سے بیزاری کو بھی ایمان کا جزو قرار دیا گیا ہے۔
ایمان کی ان تعریفات کے بعد ایمان کی چند اقسام بھی ملاحظہ فرمائیں۔

- ایمان مطبوع: یہ فرشتوں کا ایمان ہے گویا یہ مہر شدہ ایمان ہے اس میں کوئی فرق نہیں آسکتا اور نہ تبدیلی آسکتی ہے۔
- ۲ ایمان معصوم: (یعنی محفوظ) یہ انبیائے کرام کا ایمان ہے۔
- ۳ ایمان مقبول: یہ عام مؤمنین کا ایمان ہوتا ہے۔
- ۴ ایمان موقوف: یہ اہل زیغ و بطلان اور اہل بدعت کا ایمان ہے جو موقوف ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بدعت سے توبہ کرے اور ایمان کی طرف لوٹ کر آئے۔
- ۵ ایمان مردود: یہ منافقین کا ایمان ہوتا ہے جو نامقبول و مردود ہے۔

کفر کی حقیقت اور اقسام

کفر چونکہ ایمان کا مقابل اور ضد ہے اس لئے اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ "وبضدها تتبين الاشياء"۔
چنانچہ کفر لغوی اعتبار سے ستر اور چھپانے کے معنی میں ہے۔ اور شریعت میں کفر کی تعریف و حقیقت کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان کی تعریف میں بیان فرمایا ہے:

"والكفر تكذيب النبي في شيء مما جاء به"۔

ایک مختصر تعریف کفار کی یہ بھی ہے: "الذين ستروا الحق عنادا"۔ یعنی جنہوں نے عناد کی وجہ سے حق کو چھپایا۔
یہ بات پہلے لکھی جاچکی ہے کہ اسلام لانے کے لئے ضروری ہے کہ پورے اسلام کے سارے احکامات کا آدمی اقرار و تصدیق کرے لیکن کافر ہوجانے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ضروریات دین میں سے کسی ایک حکم کا انکار کر دیا جائے۔ اس سے عوام الناس کے اس نظریئے کی تردید ہوجاتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ ایک دو حکموں کے انکار سے کچھ بھی نہیں ہوتا ہم تو کلمہ بھی پڑھتے ہیں نماز بھی پڑھتے ہیں۔ کافر تو وہ ہوگا جو پوری شریعت کے ایک ایک جز کا انکار کرے اور اسلام سے بھاگ جائے۔ یہاں کفر کی چند اقسام بھی علماء نے بیان کی ہیں:

❶ کفر انکار:

جوشخص دل وزبان سے شدت کے ساتھ اسلام کا انکار کرتا ہے یہ کفر انکار ہے اسی پر عام کفار ہیں۔

❷ کفر جحود:

وہ یہ ہے کہ دل سے دینِ حق کو سچا سمجھتا ہے اس کی حقانیت کا قائل ہے لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتا ہے بلکہ انکار کرتا ہے۔ یعنی خوب جانتا ہے مگر مانتا نہیں جیسے کفر ابلیس، کفر یہود وغیرہ "وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلما وعلوا" (نمل)

❸ کفر عناد ومعاندہ:

وہ یہ ہے کہ اسلام کو دل سے بھی سچا جانتا ہے اور زبان سے بھی اقرار کرتا ہے لیکن دینِ حق کے علاوہ ادیان باطلہ سے بیزار نہیں ہوتا ہے اور دین حق کی اطاعت نہیں کرتا ہے جیسے کفر ہرقل اور کفر ابو طالب کہ دونوں میں انقیاد ظاہری نہیں تھا۔

❹ کفر نفاق:

یہ وہ ہے کہ دل میں تکذیب وانکار ہے صرف مصلحت واغراض دنیویہ کے لئے زبان پر اقرار ہے۔ جیسے عبداللہ بن ابی ابن سلول اور ان کی پارٹی خواہ کوئی بھی ہو، نفاق کے اس شعبہ کے تحت دیگر بہت سارے اہل باطل زندیق، روافض، آغا خانی، قادیانی، بہائی، پرویزی اور ایک قسم کے کمیونسٹ بھی داخل ہیں کہ بوقت ضرورت کلمہ تو پڑھتے ہیں نماز بھی ادا کر لیتے ہیں مگر دوسری طرف دین کی ضروریات میں سے کسی امر ضروری کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے مختلف درجات ہیں بعض نفاق میں ہیں اور بعض واضح کفر میں جا پڑے ہیں۔

اعتراض نمبر ❶:

ایمان کی تعریف میں تصدیق کا لفظ بار بار آیا ہے اب کئی قسم کے لوگوں میں تصدیق قلبی نص صریح سے ثابت ہے لیکن وہ پھر بھی کافر ہیں۔ جیسے یہود کے بارے میں آیت ہے: "يعرفونه كما يعرفون ابناءهم" اس کے باوجود وہ قطعی طور پر کافر ہیں۔ تو تعریف ایمان دخول غیر سے مانع نہ ہوئی اس میں کافر داخل ہو گئے۔

توضیح: مندرجہ بالا تمام تعریفات کو اگر دیکھا جائے تو یہ اعتراض قطعاً متوجہ نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ پوری شریعت کی تصدیق اور چیز ہے اور حضور اکرم ﷺ کو نبی آخر الزمان کی حیثیت سے پہچاننا اور چیز ہے ایک میں ماننا ہے دوسرے میں جاننا ہے دونوں میں بڑا فرق ہے لیکن شراح حضرات نے یہ اعتراض اٹھایا ہے اور پھر خود اس کا جواب بھی دیا ہے تو میں بھی اشارہ کرتا ہوں۔

تو اصل جواب یہ ہے کہ تصدیق سے مراد اختیاری تصدیق ہے اور یہود کی تصدیق غیر اختیاری اور اضطراری تھی۔

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اضطراری تصدیق در حقیقت تصدیق ہی نہیں بلکہ صرف تصور ہے ادھر حضرت شاہ انور

شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے جو تعریف کی ہے اس میں اعتماد علی النبی کے الفاظ ہیں کہ نبی کی نبوت پر اعتماد کرتے ہوئے تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔ صرف عقل اور دلائل کے زور سے یا غیر اختیاری جذبات واحساسات اور رجحانات و تصورات کی وجہ سے دل میں تصدیق کے بیٹھنے کا نام ایمان نہیں ہے۔ لہٰذا ایمان کی تعریف سے فرعون اور اس کی پارٹی اور یہود اوران کی پارٹی نکل گئی۔

اعتراض نمبر ❷:

یہود سے متعلق جو اعتراض تھا مندرجہ بالا جواب سے اس کا جواب تو ہو گیا لیکن ہرقل اور ابو طالب سے متعلق تو ابھی وہ اعتراض باقی ہے کیونکہ ان دونوں نے دل سے تصدیق بھی کی اور زبان سے اقرار بھی کیا۔

چنانچہ ہرقل نے یہاں تک کہا صحیح بخاری کے یہ الفاظ ہیں۔

"لو کنت عندہ لغسلت عن قدمیه"۔ (بخاری ج ۱ ص ۴)

یعنی اگر میں اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتا تو میں آپ کے قدموں کو دھو لیتا اور خدمت کرتا۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری شرح بخاری میں یہ عبارت نقل فرمائی ہے:

"واللہ انی لا علم انه نبی مرسل ولکنی اخاف الروم علی نفسی ولولا ذلك لا تبعته۔

(فتح الباری ج ۱ ص ۳۷)

اتنی زوردار تصدیق اور شاندار اختیار اقرار کے باوجود ہرقل کو کافر قرار دیا گیا۔

اور امام بخاری نے تو ان کا قصہ سنا کر آخر میں فیصلہ بھی سنا دیا کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوا۔

اور ابو طالب نے تو تصدیق واقرار واختیار کی حد کردی۔ چنانچہ وہ اپنے اشعار وقصائد میں اعلان کرتے ہیں:

وَاللهِ لَنْ يَّصِلُوْا اِلَيْكَ بِجَمْعِهِمْ حَتّٰى اُوَسَّدَ فِي التُّرَابِ دَفِيْنَا

خدا کی قسم! یہ لوگ اپنی جماعت لے کر اس وقت تک حملہ نہیں کر سکتے جب تک کہ میں قبر میں دفن نہ کیا جاؤں۔

وَدَعَوْتَنِيْ وَزَعَمْتَ اَنَّكَ صَادِقٌ وَصَدَقْتَ فِيْهِ وَكُنْتَ ثَمَّ اَمِيْنَا

آپ نے مجھے دین کی دعوت دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچے ہونے کا دعویٰ بھی کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کہا اور آپ اس میں امین بھی ہیں۔

وَعَرَفْتُ دِيْنَكَ لَا مَحَالَةَ اَنَّهٗ مِنْ خَيْرِ اَدْيَانِ الْبَرِيَّةِ دِيْنَا

میں نے یقیناً آپ کے دین کو پہچان لیا کہ تمام ادیان سے یہ بہتر دین ہے۔

لَوْلَا الْمَلَامَةُ اَوْ حَذَارُ مَسَبَّةٍ لَوَجَدْتَنِيْ سَمْحًا بِذَاكَ مُبِيْنَا

اگر لوگوں کے طعن اور گالی کا خطرہ نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اس دین میں کھل کر سخاوت کرنے والا پا لیتے۔

قریش کے بنو ہاشم سے بائیکاٹ کے موقع پر ابو طالب نے ایک شاندار قصیدہ لامیہ پڑھا ہے۔ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کی انتہا ہے۔ اسلام کے محاسن کا تذکرہ ہے اور پھر مکمل اور بھرپور حمایت کا اعلان ہے۔ یہ قصیدہ (۹۲) اشعار پر مشتمل ہے۔

اور البدایہ والنھایہ ج ۳ ص ۵۱ پر موجود ہے۔

یہاں میرے استشہاد اور مطلب کے لئے تو ایک دو شعر کافی تھے لیکن میں نے قارئین کے سامنے ان کے فائدے کے لئے اور حضور ﷺ سے اپنی محبت کے اظہار کے لئے اور مزید اراشعار سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضرورت سے زیادہ اشعار نقل کئے ہیں پڑھئے اور لطف اٹھایئے:

لَعَمْرِیْ لَقَدْ كُلِّفْتُ وَجْدًا بِاَحْمَدَ ۔۔۔ وَاِخْوَتِهٖ دَابَ الْمُحِبِّ الْمُوَاصِلِ

اپنی عمر کی قسم میں احمد مجتبیٰ اور ان کے احباب کی وجہ سے دائمی اور مسلسل عاشق کی طرح محبت میں مبتلا کیا گیا ہوں۔

فَمَنْ مِّثْلُهٗ فِی النَّاسِ اَیُّ مُؤَمَّلٍ ۔۔۔ اِذَا قَاسَهُ الْحُكَّامُ عِنْدَ التَّفَاضُلِ

جب خوبیوں اور فضیلتوں میں مقابلہ شروع ہو جائے تو لوگوں میں ان کی طرح امید گاہ خلائق کون ہو سکتا ہے؟

حَلِیْمٌ رَشِیْدٌ عَادِلٌ غَیْرُ طَائِشٍ ۔۔۔ یُوَالِیْ اِلٰهًا لَیْسَ عَنْهُ بِغَافِلٍ

وہ حق پر قائم، انصاف پسند بردبار اور سنجیدہ ہیں جو اپنے معبود کی عبادت اور تعلق سے کبھی غافل نہیں۔

كَرِیْمُ الْمَسَاعِیْ مَاجِدٌ وَابْنُ مَاجِدٍ ۔۔۔ لَهٗ اِرْثُ مَجْدٍ ثَابِتٌ غَیْرُ نَاصِلٍ

ان کے کارنامے اچھے ہیں۔ وہ خود بزرگ اور بزرگوں کی اولاد ہیں ان کی بزرگی قدیمی اور موروثی ہے جو تغیر پذیر نہیں۔

وَاَبْیَضُ یُسْتَسْقَی الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ ۔۔۔ ثِمَالُ الْیَتَامٰی عِصْمَةٌ لِّلْاَرَامِلِ

وہ ایسے خوبصورت ہیں کہ ان کے چہرۂ انور کی برکت سے بادل سے بارش طلب کی جاتی ہے وہ یتیموں کے غمخوار بیواؤں کے محافظ ہیں۔

یَلُوْذُ بِهِ الْهُلَّاكُ مِنْ اٰلِ هَاشِمٍ ۔۔۔ فَهُمْ عِنْدَهٗ فِیْ رَحْمَةٍ وَّفَوَاضِلِ

بنو ہاشم کے تباہ حال لوگ ان کی پناہ لیتے ہیں پس وہ لوگ ان کی وجہ سے نعمتوں اور رحمتوں میں ہیں۔

كَذَبْتُمْ وَبَیْتِ اللّٰهِ نُبْزٰی مُحَمَّدًا ۔۔۔ وَلَمَّا نُطَاعِنْ دُوْنَهٗ وَنُنَاضِلِ

خانہ کعبہ کی قسم! تم جھوٹ کہتے ہو کہ ہم محمد ﷺ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے جب تک کہ ہم نے ان کے دفاع میں نیزہ بازی اور تیر اندازی نہ کریں۔

وَنُسْلِمُهٗ حَتّٰی نُصَرَّعَ حَوْلَهٗ ۔۔۔ وَنَذْهَلَ عَنْ اَبْنَائِنَا وَالْحَلَائِلِ

ہم ان کو اس وقت دشمن کے حوالے کریں گے جب ہم سب ان کے ارد گرد کٹ کر گر جائیں اور اپنی بیویوں اور بچوں کو بھول جائیں۔

وَاَیَّدَهٗ رَبُّ الْعِبَادِ بِنَصْرِهٖ ۔۔۔ وَاَظْهَرَ دِیْنًا حَقُّهٗ غَیْرُ زَائِلِ

رب کائنات نے اپنی نصرت و مدد سے ان کی تائید کی ہے اور اس نے ایسا دین پیش کیا ہے جو ناقابل زوال ہے۔

فَوَاللّٰهِ لَوْلَا اَنْ اَجِیْئَ بِسُبَّةٍ تُجَرُّ عَلٰی اَشْیَاخِنَا فِی الْمَحَافِلِ

بخدا! اگر میری وجہ سے ہمارے بزرگوں پر ایسی بدنامی نہ آتی جس کے تذکرے مجالس میں ہونے لگے۔

لَکُنَّا تَبِعْنَاهُ عَلٰی کُلِّ حَالَةٍ مِنَ الدَّهْرِ جِدًّا غَیْرَ قَوْلِ التَّهَازُلِ

تو ہم ہر حالت میں زمانہ بھر تک مذاق سے نہیں بلکہ سچے دل سے ان کی متابعت کرتے۔

لَقَدْ عَلِمُوْا اَنَّ ابْنَنَا لَا مُکَذَّبٌ لَدَیْنَا وَلَا یَعْنِیْ بِقَوْلِ الْاَبَاطِلِ

قریش کو خوب معلوم ہے کہ ہمارا لختِ جگر ہمارے ہاں جھٹلایا نہیں جاتا اور نہ اہل باطل کے باطل قول سے ان کا ارادہ کیا جاتا ہے۔

فَاَصْبَحَ فِیْنَا اَحْمَدُ فِیْ اَرُوْمَةٍ یُقَصِّرُ عَنْهَا سَوْرَةُ الْمُتَطَاوِلِ

پس احمد مجتبیٰ ہمارے ہاں ایسی عزت اور شرافت پر فائز ہیں جس کے سامنے بڑوں بڑوں کی عزتوں کی دیواریں پست ہیں۔

حَدِبْتُ بِنَفْسِیْ دُوْنَهٗ وَحَمَیْتُهٗ وَدَافَعْتُ عَنْهُ بِالذُّرٰی وَالْکَلَاکِلِ

میں نے ان پر اپنی جان جھکا کر حفاظت وحمایت کا حق ادا کر دیا اور میں نے بچاؤ کا ہر سامان اور سینہ سامنے رکھ کر ان کا دفاع کیا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ایمان کی تعریف میں ہرقل اور ابوطالب داخل ہو گئے کہ دونوں نے دل سے تصدیق بھی کی اور زبان سے اقرار بھی کیا تو تعریف مانع نہیں دخول غیر سے۔

جواب: اس اعتراض کا پہلا جواب تو وہی ہے کہ ایمان کی تمام تعریفات کو غور سے دیکھنے کے بعد یہ اعتراض ہی نہیں ہوتا لیکن چونکہ شارحین نے کیا ہے لہٰذا اس کا جواب دے دیا گیا ہے کہ تصدیق قلبی اور اقرار لسانی کے ساتھ اطاعت و انقیاد لازم ہے۔ اور انقیاد ظاہری کی طرف مندرجہ بالا تعریفات میں اشارے بھی موجود ہیں۔ نیز شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے التزام شریعت کا عنوان اختیار کیا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے عنوان سے اسی مفہوم کا تذکرہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایماندار بننے کے لئے، قول القلب ضروری ہے اور قول القلب سے مراد یہی شریعت اور اطاعت ہے۔

شیخ ابوطالب مکی نے بھی التزام اطاعت کا عنوان اختیار کیا ہے۔ محقق ابن ہمام نے **استسلام قلبی** اور انقیاد باطنی کا عنوان اختیار کیا ہے جب ایمان کی تعریفات اور تصدیق قلبی کی تشریحات میں التزام شریعت اور انقیاد ظاہری کا مفہوم پڑا ہے تو پھر ہرقل اور ابوطالب ایمان کی تعریف سے خارج ہو گئے کیونکہ ہرقل نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر روم کے لوگ ناراض نہ ہوتے اور ان کی مخالفت کا خطرہ نہ ہوتا تو میں دینِ اسلام کی اتباع اور اطاعت کرتا تو انہوں نے خوف ذہاب حکومت کی وجہ سے ایمان کی دولت عظمیٰ کو ترک کر دیا اس نے کہا:

"ابلغ صاحبك انه نبی ولکن لا اترك ملکی"۔ (مسند بزار)

اسی طرح ابوطالب نے واضح الفاظ میں تصدیق واقرار لسانی کے ساتھ ساتھ دین حق کی اطاعت سے انکار کا بھی اعلان کیا ہے۔

"لولا تعیرنی قریش یقولون انما حمله علی ذالك الجزع لاقررت بها عینك".

(رواہ مسلم کتاب الایمان)

یعنی اگر قریش مجھے یہ عار نہ دیتے کہ آگ سے ڈر کر ایمان لایا تو میں دینِ حق قبول کر کے تیری آنکھوں کو ٹھنڈا کر لیتا۔

چنانچہ آخری اعلان ابوطالب کا یہی تھا کہ میں اپنی قوم کے مذہب پر دنیا سے اٹھ رہا ہوں اور یہ بھی کہا "اختار العار علی العار" لہٰذا عدم اطاعت کی وجہ سے وہ ایمان کی تعریف میں داخل نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان کی تعریف میں "والتبری عن جمیع ماسواہ" فرمایا ہے۔ اور ادیان باطلہ سے تبری وبیزاری کا اعلان نہ ہرقل نے کیا تھا اور نہ ہی ابوطالب نے۔ بس زبان سے دینِ اسلام کو اچھا کہتے رہے مگر اپنے مذہب سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹے تو وہ کیسے اسلام میں آئے؟ اور ان پر کس طرح ایمان کی تعریف صادق آئے گی؟

شیعہ رافضی ابوطالب کو بہت بڑا مسلمان مانتے ہیں اور ان کے نام پر اپنے امام بارگاہوں کے نام رکھتے ہیں لیکن وہ کسی تصدیق قلبی یا عدم تصدیق یا اقرار لسانی یا عدم اقرار کی وجہ سے نہیں کہتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ابوطالب مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کا والد ہے اور مولیٰ علی کا والد کیسے غیر مسلم ہوسکتا ہے، یہ نظریہ غلط ہے کیونکہ بعض انبیائے کرام کے آباؤ اجداد یا اولاد غیر مسلم چلے آئے ہیں تو حضرت علی کے حق میں کیسے محال ہوسکتا ہے۔

مورخہ ۷ ذیلقعدہ ۱۴۰۹ھ

ایمان کی حقیقت میں مشہور مذاہب

ایمان شرعی کی دو جہتیں ہیں:

1. جہت دنیوی جس سے جان ومال کی حفاظت اس وقت ہوجاتی ہے جب کوئی شخص زبان سے اس کا اقرار کرتا ہے۔
2. جہت اخروی وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد عذاب اور خلود فی النار سے حفاظت ہوجاتی ہے۔

جہت دنیوی کے لئے اتفاقاً صرف اقرار لسانی کافی ہے اور جہت اخروی میں کل سات مذاہب ہیں۔ دو مذہب اہلِ حق کے ہیں اور پانچ مذاہب اہل باطل کے ہیں۔

۱ معتزلہ کا مذہب:

اہل باطل میں سے پہلا مذہب معتزلہ کا ہے۔ ان کے نزدیک ایمان کی حقیقت اس طرح ہے:

"الایمان هو التصدیق بالجنان والاقرار باللسان والعمل بالارکان".

یعنی دل سے تصدیق کرنا، زبان سے اقرار کرنا اور اعمال اسلام اور ارکان اسلام پر عمل کرنا۔ اور ان کے نزدیک:

"ومن ارتکب الکبیرۃ فھو خارج عن الاسلام غیر داخل فی الکفر وعندھم منزلۃ بین المنزلتین فی النار۔ کما فی الایمان والکفر منزلۃ بین المنزلتین"۔
یعنی معتزلہ نے جوتعریف کی ہے یہ ان کے عقیدے کے موافق ہے کیونکہ ان کے نزدیک مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج ہے لیکن کفر میں داخل نہیں۔ اسی طرح ان کے نزدیک دوزخ میں بھی دو درجات کے درمیان ایک درجہ ہے جس میں نہ خالص کافر ہوں گے اور نہ خالص مسلمان ہوں گے بلکہ یہی مرتکب کبیرہ ہوں گے۔

۲ خوارج کا مذہب:

اہل باطل میں سے دوسرا مذہب خوارج کا ہے ان کے ہاں ایمان کی حقیقت یہ ہے:
"الایمان ھو التصدیق بالجنان والاقرار باللسان والعمل بالارکان ویخرج بالکبیرۃ من الاسلام ویدخل فی الکفر فھو کافر"۔
یہ دونوں مذہب باطل ہیں کیونکہ صحابہ وتابعین اور سلف صالحین اور تمام اہلِ اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ جس شخص کے دل میں مثقال ذرہ اور رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہو وہ "مخلد فی النار" نہیں ہوگا۔ (یعنی ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا) اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی شفاعت اہلِ کبائر کے لئے ہے "شفاعتی لاھل الکبائر" حدیث ہے۔ اسی طرح یہ حدیث "یخرج من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان"۔ اسی طرح قرآن کریم میں ہے: "وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما"۔ یہاں دونوں لڑنے والوں کو مسلمان کہا گیا۔ اسی طرح آیت: "یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً"۔ اسی طرح توبہ کرنے کی دیگر آیتیں اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ وغیرہ کی احادیث "وان زنی وان سرق" اس پر دال ہیں کہ مرتکب کبیرہ ناقص مؤمن ہے۔ مگر مخلد فی النار نہیں بلکہ سزا بھگتنے کے بعد دوزخ سے نکلے گا تو یہ معتزلہ وخوارج کی بدعات واہیات میں سے ہیں کہ معتزلہ نے مسلم سے مسلمان کا نام چھین لیا اور خوارج نے مسلمان کو ایمان ومؤمن کے پیارے لفظ سے نکال باہر کیا اور کافر بنا کر چھوڑ دیا۔

۳ جہمیہ کا مذہب:

"الایمان ھو معرفۃ القلب فقط"۔ یعنی صرف قلبی معرفت کافی ہے اقرار لسانی اور عمل ارکانی کی کوئی حاجت و ضرورت نہیں ہے۔ یہ باطل مذہب جہمیہ کا ہے یہ جہم بن صفوان کی جماعت کے لوگ ہیں۔ یہ مذہب بالکل باطل ہے کیونکہ اہلِ کتاب کے بارے میں قرآن کہتا ہے: "یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم" تو کیا یہ لوگ مسلمان ہو گئے؟ اسی طرح ہرقل کو معرفت قلبی حاصل تھی حالانکہ وہ کفر پر مرا ہے اسی طرح ابوطالب کا حال تم نے پڑھ لیا تو کیا وہ صرف حصولِ معرفت سے مسلمان ہو گئے؟

یہود نا بہبود کے متعلق قرآن اعلان کرتا ہے:

"ولما جاء هم ما عرفوا كفروا به فلعنة الله على الكافرين"۔

اگر صرف معرفت قلبی ایمان کے لئے کافی تھی توان کو قرآن نے کافر کیوں کہا؟ اور کیا یہ مسلمان ہیں؟

۴ مرجئہ کا مذہب:

اہلِ باطل میں سے چوتھا مذہب مرجئہ کا ہے وہ کہتے ہیں کہ:

"الايمان هو التصديق فقط ولا تضر مع الايمان معصية كما لا تنفع مع الكفر طاعة"۔

یعنی ایمان صرف تصدیق کا نام ہے تعریف اتنی ہی ہے اب آگے اس تعریف کی روشنی میں وہ کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ کوئی معصیت اور نافرمانی نقصان نہیں دیتی جیسا کہ کفر کے ساتھ کوئی طاعت فائدہ نہیں دیتی۔

یہ مذہب بھی باطل ہے کیونکہ دخول جنت کا وعدہ عمل صالح کے بغیر قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا ہے اور بلکہ تصدیق قلبی **امنوا** کے ساتھ "**امنو وعملوا الصلحت**" کا لفظ ہر جگہ لگا ہوا ہے۔ اور حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کی زندگی اس مذہب کی نفی کرتی ہے۔ کیونکہ ان حضرات سے نماز وغیرہ اعمال ترک کرنے کا امکان ہی نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ دخول جنت کے لئے اعمال صالحہ کا ہونا ضروری ہے۔

۵ کرامیہ کا مذہب:

انکے نزدیک ایمان کی تعریف یہ ہے:

"الايمان اقرار باللسان فقط"۔

یہ تعریف بھی غلط ہے اور یہ مذہب بھی باطل ہے کیونکہ قرآن نے منافقین کو بدترین کافر قرار دیا ہے حالانکہ وہ اقرار لسانی میں کمی نہیں کرتے تھے۔

"ومن الناس من يقول امنا بالله وباليوم الآخر وما هم بمؤمنين.

اذاجاء ك المنافقون قالوا نشهد انك لرسول الله والله يعلم انك لرسوله والله يشهد ان المنافقين لكاذبون"۔

اگر صرف اقرار لسانی کافی ہوتا تو کبھی بھی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کافر نہ کہتا۔

یہ لوگ محمد بن کرام کے پیروکار ہیں ان کا یہ شعر ہے:

الفقه فقه أبي حنيفة وحده والدين دين محمد بن كرام

بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ لوگ **عهد الست بربكم قالوا بلى** کے اقرار کو ایمان کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔

❻ **مذہب احناف وغیرہم:**

اہلِ باطل کے پانچ مذاہب کے بعد دو مذہب اہل حق کے ہیں تو مسلسل گنتی کے لحاظ سے چھٹا مذہب اہل حق میں سے احناف اور جمہور متکلمین ابو منصور ماتریدی اور ابوالحسن اشعری وغیرہم کا ہے یہ کہتے ہیں کہ:

"الایمان ھو التصدیق بالجنان فقط"۔

آگے اس تعریف کا نتیجہ اور ثمرہ ہے کہ:

والعمل بالارکان والاقرار باللسان شرطان لا شطران للایمان۔

یہ ایمان کے لئے دو شرطیں ہیں مگر ایمان کیلئے شطر یا جزء یا رکن نہیں۔ اس مذہب کے مطابق ایمان تصدیق قلبی امر بسیط کا نام ہے۔

❼ **مذہب شوافع وغیرہم:**

اہل حق میں سے جمہور محدثین شوافع مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک ایمان کی تعریف اس طرح ہے:

الایمان ھو التصدیق بالجنان والاقرار باللسان والعمل بالارکان۔

ان کے نزدیک ان تین اشیاء سے ایمان مرکب ہے بسیط نہیں ہے۔

یہ دونوں اہلِ حق کی جماعت اہلِ سنت والجماعۃ میں سے ہیں ان کا آپس میں اختلاف حقیقی نہیں بلکہ لفظی اور ظاہری ہے۔ جیسا کہ آئندہ تفصیل آرہی ہے بہر حال اہلِ حق کے درمیان اتنا اختلاف تو یقینی ہے کہ احناف اور جمہور متکلمین ایمان کو بسیط کہتے ہیں۔ اور شوافع و جمہور محدثین ایمان کو تین امور سے مرکب مانتے ہیں۔

امام بخاری نے ایمان کے مرکب ہونے پر بہت سے دلائل جمع کئے ہیں۔

مورخہ ۸ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

ایمان بسیط ہے یا مرکب؟ طرفین کے دلائل

یہاں ایک اہم بات سمجھ لینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ حضرات شوافع اور جمہور محدثین نے ایمان کی جو تعریف کی ہے یہ بعینہ وہی تعریف ہے جو معتزلہ اور خوارج نے کی ہے۔ لیکن یہ صرف لفظی مشابہت ہے ورنہ حقیقت میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ معتزلہ اور خوارج ایمان کو اجزاء ثلاثہ سے ایسا مرکب مانتے ہیں کہ ایک جزء کے چھوٹ جانے سے ایمان ہی جاتا رہتا ہے۔ اور ان کے نزدیک تارک اعمال "مخلد فی النار" ہے، اسی طرح احناف اور متکلمین نے ایمان کی جو تعریف کی ہے وہ بعینہ وہی تعریف ہے جو مرجئہ نے کی ہے مگر یہاں بھی صرف لفظی مشابہت ہے ورنہ حقیقت میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ احناف اور متکلمین اعمال کی ضرورت کو مانتے ہیں اور تارک اعمال کو فاسق گردانتے ہیں جبکہ مرجئہ کے نزدیک

عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے بہر حال تعریف کے اشتراک کی وجہ سے محدثین اور شوافع کو معتزلہ کا ہمنوا سمجھنا ایسا ہی ظلم ہوگا جس طرح کہ تعریف ایمان کے اشتراک لفظی کی وجہ سے احناف کو مرجئہ کا ہمنوا سمجھنا ظلم عظیم ہے۔

پھر امام صاحب کی طرف ارجاء کی نسبت کرنا بڑی بے جابات ہے اور بڑی ہی گستاخی ہے۔ ایمان کی تعریف میں اشتراک لفظی کو بنیاد بنا کر اتنی بڑی جسارت کرنا بڑی ناانصافی ہے اگر معتزلہ اور خوارج کے ساتھ تعریف ایمان میں اشتراک لفظی حضرات شوافع ومحدثین کو معتزلہ وخوارج نہیں بناتا تو احناف کو کیوں مرجئہ بنا سکتا ہے؟

بہر حال ایمان کی تعریف جو احناف نے کی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایمان بسیط ہے اور احناف ایمان کو بسیط مانتے ہیں اس پر ان کے ہاں جو دلائل ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

احناف کے دلائل:

❶ **ان الذین امنوا وعملوا الصالحات کانت لھم جنات الفردوس نزلًا۔** (الکھف ۱۰۷)

قرآن میں جابجا ایمان پر عمل صالح کا عطف آیا ہے۔ اور عطف تغایر کو چاہتا ہے تو ایمان اور چیز ہے اعمال اور چیز ہے۔

"اولئك کتب فی قلوبھم الایمان"۔ (المجادلة ۲۲)

"ولما یدخل الایمان فی قلوبکم"۔ (الحجرات ۱۴)

"قالوا امنا بافواھھم ولم تؤمن قلوبھم"۔ (المائدة ۴۱)

"ولکن لیطمئن قلبی"۔ (البقرة ۲۶۰)

"الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان"۔ (النحل ۱۰۶)

ان تمام آیتوں میں دل کو محل ایمان قرار دیا گیا ہے اور ایمان کی نسبت دل کی طرف کی گئی ہے۔ دل کے اندر تو صرف عقیدۂ جازمہ آسکتا ہے اور وہ امر بسیط ہے وہاں ترکیب کا امکان نہیں۔

❸ **من عمل صالحًا من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فلنحیینہ حیوٰۃ طیبۃ۔"** (النحل ۹۷)

اس آیت میں قبولِ عمل کے لئے ایمان کو شرط قرار دیا گیا ہے تو ایمان شرط ہے اور عمل مشروط ہے اور شرط ومشروط میں مغایرت ضروری ہے تو ایمان شرط کے درجہ میں اور چیز ہے اور عمل مشروط کے درجہ میں اور چیز ہے تو ایمان بسیط ہوا۔

❹ ایمان ضد کفر ہے اور کفر کا محل قلب ہے تو ایمان کا محل بھی قلب ہوگا۔ **وبضدھا تتبین الاشیاء**۔ جب محل قلب ہوا تو ایمان بسیط ہوا۔

❺ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص نے کلمہ پڑھا حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس کو مارا اور پھر

فرمایا کہ اس نے جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھا تھا دل میں ایمان نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: **فهلا شققت من قلبه**۔ معلوم ہوا کہ محل ایمان دل ہے تو بسیط ہے۔

❻ حدیث جبرئیل میں **ما الایمان؟** کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے "**ان تومن بالله وملائکته**" کا ذکر فرمایا جو کہ تصدیق قلبی ہے کیونکہ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر کتابوں پر رسولوں پر سب تصدیق قلبی کے قبیل سے ہے۔

❼ جب حضور اکرم ﷺ کسی سے فرماتے: "**اٰمنوا**" تو وہ لوگ خود سمجھتے تھے کہ "**اٰمنوا**" سے مراد دل سے ماننا ہے تصدیق قلبی ذہن میں آتا تھا معلوم ہوا تصدیق قلبی ہی ایمان کا نام ہے اور دل کے اندر جو کچھ ہوگا وہ بسیط ہوگا مرکب نہیں ہوسکتا۔

شوافع کے دلائل:

جمہور محدثین اور شوافع حنابلہ اور مالکیہ نے ایمان کو تین اشیاء سے مرکب مانا ہے اس پر ان کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

❶ **لیس البر ان تولوا وجوهكم قبل المشرق والمغرب ولكن البر من اٰمن بالله واليوم الاٰخر والملائكة والكتاب... الخ**

اس آیت میں بہت سارے ابواب البر کو ایمان کے ساتھ لگا دیا ہے جس سے ایمان کی ترکیب کا پتہ چلتا ہے۔

❷ **الایمان بضع وسبعون شعبة فافضلها قول لا اله الا الله وادناها اماطة الاذی عن الطريق والحياء شعبة من الايمان۔**

اس حدیث میں بھی ایمان کے کئی شعبوں کا تذکرہ کیا گیا جس سے ایمان کی ترکیب کا مدعا ثابت ہوتا ہے۔

❸ **بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله واقام الصلوة... الخ**

اس حدیث میں ایمان کو پانچ ارکان سے مرکب بتایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ مرکب ہے بسیط نہیں کیونکہ احادیث شریفہ میں اچھے اعمال کو ایمان کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا گیا ہے گویا یہ سب کچھ ایک ہی چیز یعنی ایمان کے کئی اجزاء ہیں اور ایمان ان سے مرکب ہے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں اسی قسم کی کئی آیات اور احادیث سے بار بار استدلال فرمایا ہے۔

خلاصۂ بحث:

مندرجہ بالا بحث مسطورہ اور دلائل مذکورہ کے بعد بطور خلاصہ یہ سمجھ لیں کہ اہلِ باطل کے پانچ مذاہب کے ساتھ اہلِ حق کا تعریف ایمان میں اور تفصیل و تحقیق میں اختلاف حقیقی اور معنوی ہے جس پر ایسے نتائج مرتب ہوتے ہیں جس کے درمیان بڑا فاصلہ اور طویل بعد ہے۔ اور اہلِ حق کے درمیان جو ایمان کی تعریف میں اختلاف ہے یہ معنوی ہے حقیقی نہیں بلکہ لفظی ہے جس کا مرجع ایک ہے۔ چند وجوہات ملاحظہ ہوں۔

❶ بس اتنا سمجھ لیں کہ اہلِ حق کا اختلاف باعتبار ملاحظہ اور ماحول کے ہے ایک نے معتزلہ کو دیکھا ان کے تشدد اور تعدی اور خروج عن الحق کو دیکھا تو اعمال کو ایمان سے الگ کرنے کا حکم دیا جیسے احناف ہیں دوسروں نے مرجۂ کو دیکھا جنہوں نے اعمال کے بارے میں حد سے تجاوز کر کے اعمال کے مقام کو گرایا تو شوافع نے اعمال سے ایمان کو مرکب بنانے کا فیصلہ کیا۔

❷ اہلِ حق کے درمیان ایمان کی تعریف میں اختلاف ''جہات'' کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ شوافع اور محدثین نے ایمان کی جہت کامل مکمل اور اعلیٰ جانب کو دیکھا تو اعمال کو اس میں شامل کر دیا اور مرکب کہا۔ احناف و متکلمین نے ایمان کے جانب ادنیٰ اور آخری درجہ کو دیکھا تو ایمان کو اعمال سے الگ کہہ کر اس کے بسیط ہونے کا قول اختیار کیا یعنی ایمان کا وہ درجہ لیا جس کے بعد ایمان نہیں ہے۔

❸ یا یوں سمجھ لیجئے کہ جمہور محدثین و شوافع کے نزدیک ایمان کے لئے اعمال بمنزلہ لازم ماہیت ہیں۔ احناف و متکلمین کے ہاں ایمان کے لئے اعمال بمنزلہ لازم وجود ہیں اور معتزلہ و خوارج کے ہاں ایمان کے لئے اعمال بمنزلہ لازم ذات ہیں۔

❹ یا یوں سمجھ لیجئے کہ مثلاً نفس ایمان اور نفس تصدیق بمنزلہ ذات انسان ہے۔ اور اعمال بمنزلہ اطراف و اعضاء ہیں کہ اعضاء کے نقص سے نقص آتا ہے مگر ذات تو اپنی جگہ پر موجود ہے۔ یا شجرہ اور اغصان کی مثال لے لیجئے کہ درخت کی ایک ذات ہے اور دیگر شاخیں ہیں ذات اپنی جگہ پر قائم ہے شاخوں کی حیثیت الگ ہے۔

تو انسان اور درخت کے لئے اعضاء و اغصان اجزاء ہیں لیکن یہ اجزاء **تحسینیہ تزیینیہ تخلیلیہ** ہیں **ترکیبیہ** نہیں۔

اہلِ حق کے درمیان اگر یہ نزاع لفظی نہ مانا جائے تو پھر ان اجزاء سے مرکب ایمان کے قائل محدثین و شوافع مرتکب کبیرہ کو خوارج کی طرح کافر کیوں نہیں مانتے اور معتزلہ کی طرح اس کو خارج اسلام کیوں نہیں کہتے؟

اور اگر احناف و متکلمین کے نزدیک اعمال کا اعتبار نہیں صرف تصدیق قلبی بسیط کافی ہے تو پھر تارک اعمال کو یہ حضرات فاسق کیوں کہتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ نزاع باعتبار ملاحظہ باعتبار جہات باعتبار اجزاء **تحسینیہ تخییلیہ تزیینیہ** ہے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ احناف و متکلمین کے اس نظریہ سے اعمال کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اعمال کو جزء ایمان قرار دے کر تصدیق قلبی کی اہمیت بھی تو گھٹ جاتی ہے۔

پھر اعتراض یہ ہوا کہ احناف و متکلمین کے مذہب سے **مرجئہ** کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے مذہب سے معتزلہ اور خوارج کی تائید ہوتی ہے۔ بہر حال یہ سب نزاع لفظی ہے دونوں فریق اعمال کی قدر کرتے ہیں احناف تو اعمال میں زیادہ آگے ہیں۔ پس دونوں فریق نے اپنے اپنے زمانے کے لوگوں کی حد سے تجاوز کو روکنے کے لئے بطور اصلاح و علاج الگ الگ قول اختیار کر کے رائے قائم کی ہے۔ حضرات شوافع و محدثین کے سامنے **مرجئہ** کا منظر تھا اور حضرات متکلمین و احناف کے سامنے معتزلہ کا منظر تھا۔

مورخہ ۹؍ ذیقعدہ ۱۴۰۵ھ

ایمان میں زیادت ونقصان کی بحث

حضرات محدثین وشوافع اور معتزلہ وخوارج ایمان کی زیادت ونقصان کے قائل ہیں۔ اور ائمہ احناف ومتکلمین کا اس میں اختلاف ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اختلاف دراصل اسی ماسبق اختلاف پر متفرع ہے جس میں یہ حضرات ایمان کے مرکب اور بسیط ہونے میں اختلاف کر چکے ہیں۔ پس جو لوگ ایمان کو بسیط مانتے ہیں ان کے ہاں امر بسیط میں زیادت ونقصان نہیں ہے۔ کیونکہ بسیط حقیقی "الذی ما لا جزء له اصلاً" کو کہتے ہیں اور بسیط عرفی "ما لا یرکب من الاجسام المختلفة" کا نام ہے تو اس میں زیادت ونقصان کا امکان نہیں ہے۔ اور جو لوگ ایمان کو مرکب من الاجزاء الثلاثة مانتے ہیں وہ زیادت ونقصان کے قائل ہیں لہٰذا یہ اختلاف بھی پہلے اختلاف کی طرح لفظی ہے اختلاف حقیقی نہیں ہے۔

اس کلام کا خلاصہ یہ نکلا کہ جن حضرات محدثین اور شوافع نے اعمال کو ایمان میں داخل مانا ہے انہیں یہی کہنا چاہیے تھا کہ: "الایمان یزید وینقص" کیونکہ یہ ظاہر بات ہے کہ اعمال میں کمی زیادتی ہوتی ہے۔
اور جن حضرات متکلمین اور احناف نے ایمان کو صرف تصدیق قلبی کا نام دیا ہے اور اعمال کو اس کے مفہوم میں داخل نہیں مانا ہے، انہیں یہی کہنا چاہیے تھا کہ "الایمان لا یزید ولا ینقص" کیونکہ تصدیق قلبی اعتقاد جازم کا نام ہے۔ اور یہ امر بسیط ہے اس سے آگے تصدیق کا کوئی درجہ ہی نہیں اس لئے اس میں کمی بیشی کا امکان ہی نہیں۔ اگر کسی کا اعتقاد جازم جزم کی حد سے نیچے آ گیا تو وہ ایمان نہیں کیونکہ جزم سے نیچے ظن ہے اور شریعت کی اصطلاح میں ظن کو ایمان نہیں کہا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوا جن حضرات نے اعمال کو ایمان کا جز مانا ہے ان کا فیصلہ یہی تھا کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے اور جن حضرات نے اعمال کو ایمان سے الگ مانا ہے ان کا فیصلہ یہی تھا کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی ہے۔
محدثین وشوافع حضرات نے ایمان کی زیادت ونقصان پر قرآن عظیم کی کئی آیتوں سے استدلال کیا ہے جس میں زیادت کا لفظ آیا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب بخاری میں اس قسم کے دلائل کا ابتدائے کتاب الایمان میں انبار لگا دیا ہے۔ چند دلائل ملاحظہ ہوں:

❶ لیزدادوا ایمانا مع ایمانهم۔ (فتح ۴)

❷ واذا تلیت علیهم اٰیاته زادتهم ایمانا وعلیٰ ربهم یتوکلون۔ (انفال ۲)

❸ لیزداد الذین اٰمنوا ایمانا ولا یرتاب الذین اوتوا الکتاب۔ (مدثر ۳۱)

❹ فاما الذین اٰمنوا فزادتهم ایمانا وهم یستبشرون۔ (بقرہ ۱۲۴)

❺ الذين قال لهم الناس ان الناس قد جمعوا لكم فاخشوهم فزادهم ايمانا وقالوا حسبنا الله ونعم الوكيل۔ (آل عمران ۱۷۳)

❻ انهم فتية آمنوا بربهم فزدناهم هدى۔ (کہف ۱۳)

❼ قال ابن عمر رضی الله عنهما: تعلمنا الايمان ثم تعلمنا القرآن فازددنا ايمانا۔

❽ وقال ابن مسعود رضی الله عنه: اللّٰهم زدنا ايمانا ويقينا وفقها۔

"محدثین کو احناف و متکلمین کا جواب"

● شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جن نصوص میں ایمان کی زیادت ونقصان کا ذکر ہے اس سے مراد حلاوت ایمان میں زیادتی ہے نفس ایمان میں زیادتی مراد نہیں یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں یعنی اجزاء **تحسينيه، تزيينيه تخييليه** میں زیادتی مراد ہے۔

❷ ایک ایمان اجمالی ہے اور ایک ایمان تفصیلی ہے ایمان اجمالی زیادت ونقصان کو قبول نہیں کرتا اور تفصیلی ایمان زیادت ونقصان کو قبول کر لیتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا:

"**الايمان المجمل لا يزيد ولا ينقص واما المفصل فهو يزيد**"۔

❸ یہ زیادت اور نقصان مؤمن بہ کی وجہ سے ہے کہ وحی کے ذریعہ سے جتنا مؤمن بہ بڑھتا رہتا ہے اس پر ایمان بھی بڑھتا ہے۔ دو آیتوں پر ایمان لانے کے بعد دس آیتوں پر مزید ایمان لایا تو اس مؤمن بہ کی وجہ سے ایمان بڑھتا رہتا ہے۔

❹ نزول وحی کے زمانے میں تو "**يزيد وينقص**" ہو سکتا تھا لیکن وحی بند ہونے کے بعد اب تو "**لا يزيد ولا ينقص**" ہی ہے۔

❺ مشہور قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اور ایک اور قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ "**الايمان يزيد ولا ينقص**" یعنی نصوص آیات واحادیث سے زیادت کا پتہ تو چلتا ہے لہٰذا زیادت ہے لیکن نقص ونقصان کا پتہ نہیں چلتا لہٰذا نقصان نہیں ہے۔

❻ یہ زیادتی اور کمی نور ایمانی کے اعتبار سے ہے اصل ایمان کے اعتبار سے نہیں گویا اجزاء نورانیہ میں نقص اور انبساط آتا رہتا ہے۔

[illegible]

ایمان واسلام میں نسبت کی بحث

اسلام کی تعریف جب ہو جائے گی تو اس کی نسبت ایمان کے ساتھ آسانی سے سمجھ میں آجائے گی لہٰذا پہلے اسلام کی تعریف ملاحظہ ہو۔

❶ **الاسلام عبارة عن التسليم والاستسلام بالاذعان والانقياد.**

❷ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

الایمان اعتقاد، والاسلام انقیاد، والاحسان استشهاد.

❸ میر سید سند فرماتے ہیں:

الاسلام هو الخضوع، والانقياد لما اخبر به النبی صلی الله علیه وسلم.

❹ علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کشاف میں فرمایا:

ان کل ما یکون الاقرار باللسان من غیر مواطاة بالقلب فهو الاسلام وما واطا فیه القلب اللسان فهو ایمان.

یعنی جہاں زبانی اقرار موافقت دل کے بغیر ہو وہ اسلام ہے۔ اور جہاں دل اور زبان دونوں موافق ہوں وہ ایمان ہے۔

❺ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حق یہ ہے کہ شریعت نے ایمان و اسلام کو بطور ترادف بھی استعمال کیا ہے اور بطور تباین وتغایر بھی استعمال کیا ہے۔ اور بطور تداخل بھی استعمال کیا ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

ترادف کی مثالیں

❶ **فاخرجنا من کان فیها من المؤمنین فما وجدنا فیها غیر بیت من المسلمین.** (ذاریات ۳۶)

علماء کا اس میں اتفاق ہے کہ وہاں ایک ہی گھرانہ تھا جو حضرت لوط علیہ السلام کا تھا اسی کو مؤمن اور مسلم فرمایا تو ترادف ثابت ہوا۔

❷ **وقال موسیٰ یا قوم ان کنتم امنتم بالله فعلیه توکلوا ان کنتم مسلمین.** (یونس ۸۴)

یہاں ایک ہی قوم کو مؤمن اور مسلم کہا گیا تو ترادف ثابت ہوا۔

تباین وتضاد کی مثالیں:

❶ **قالت الاعراب امنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم.**

(حجرات ۱۴)

اس آیت میں دیہاتیوں سے تصدیق قلبی اور اذعان وطمانینت کی نفی کی جو "امنا" اور "لم تؤمنوا" کے مفہوم میں تھی۔ اور استسلام ظاہراً باللسان والجوارح کو ثابت کیا جس سے تغایر تباین اور تضاد واضح ہو گیا۔

❷ اس آیت میں اس تغایر وتضاد کی تائید مسند احمد کی اس مرفوع روایت سے بھی ہوتی ہے کہ

"الاسلام علانیة والایمان فی القلب"۔

❸ حدیث جبرئیل علیہ السلام سے بھی ایمان و اسلام کے تباین وتغایر کا پتہ چلتا ہے کیونکہ وہاں جب ایمان کے متعلق سوال

ہوا تو آپ ﷺ نے "ان تؤمن باللہ وملائکتہ و کتبہ و رسلہ" سے جواب دیا جو سب کے سب تصدیق قلبی کے تحت آتے ہیں۔ جواذعان ہے اور جب اسلام کے متعلق سوال کیا گیا تو جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "ان تشھد ان لا الہ الا اللہ وتقیم الصلوۃ ...الخ" یعنی جواب میں سب کی سب تسلیم والی چیزیں آ گئیں کہ یہ کرو، یہ کرو، یہ کرو، معلوم ہوا کہ ایمان و اسلام میں فرق ہے تب ہی الگ سوال اور جواب آیا جس میں تسلیم قولی اور تسلیم فعلی دونوں کا ذکر آ گیا۔

❹ **وفی حدیث سعد رضی اللہ عنہ انہ صلی اللہ علیہ وسلم اعطی رجلا اعطاء ولم یعط الاخر فقال سعد یا رسول اللہ ترکت فلانالم تعطہ وھو مؤمن فقال او مسلم؟**

اس سے تباین وتغایر واضح ہو جاتا ہے۔

❺ علامہ شاہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ خاص محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فرق درس بخاری میں بیان فرمایا جو درحقیقت حضرت شاہ صاحب کی تحقیق تھی جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام اور ایمان کی مسافت ایک ہے صرف مبداء اور منتہی کا فرق ہے۔ اسلام ظاہر سے شروع ہوتا ہے اور رچ بس کر باطن میں پہنچتا ہے۔ اور ایمان کامل باطن سے شروع ہو کر پھوٹ پھوٹ کر ظاہر پر آ جاتا ہے۔ اگر ایمان قوی ہے تو فوراً ظاہری اعضاء پر اس کا اثر نمودار ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کا سفر اندر سے شروع ہو کر باہر آتا ہے اور اسلام کا سفر باہر سے شروع ہو کر اندر کی طرف جاتا ہے۔

❻ **الایمان والاسلام اذا اجتمعا افترقا واذا افترقا اجتمعا کالمسکین والفقیر اذا اجتمعا افترقا واذا افترقا اجتمعا۔**

ایمان اور اسلام میں تداخل

بعض احادیث سے ایمان و اسلام میں تداخل ثابت ہوتا ہے جیسے آنحضرت ﷺ سے کسی نے سوال کیا:

ای الاعمال افضل؟ فقال: الاسلام فقال: ای الاسلام افضل؟ فقال: الایمان۔

(التعلیق الصبیح)

تداخل کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام سے مراد تسلیم بالقلب اور عمل بالارکان دونوں لئے جائیں اور ایمان سے فقط تسلیم بالقلب مراد لیا جائے۔

مذکورہ روایت میں اسلام کے جواب میں ایمان آیا یعنی تسلیم بالقلب، اور اسلام خود تسلیم قلبی اور عمل بالارکان کا نام ہے۔ تو ایمان کو اسلام میں داخل کر لیا گیا جو تداخل ہے۔ اسلام عام ہو گیا اور ایمان خاص ہو گیا۔

ایمان میں استثناء کا حکم

ایمان میں استثناء کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کہے: انا مومن إن شاء الله۔ یہ کہنا جائز ہے یا نہیں اس میں کئی اقوال ہیں۔

❶ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء کوفہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد کہتے ہیں کہ "انا مومن إن شاء الله" کہنا جائز ہے۔ بعض احناف کی بھی یہی رائے ہے۔

❷ اہل تحقیق کے نزدیک انا مومن کے ساتھ إن شاء الله نہیں لگانا چاہیے۔ یہی مذہب امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔

❸ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مختلف اعتبارات کالحاظ کر کے انا مومن انشاء الله کا حکم معلوم کرنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص انا مومن إن شاء الله فی الحال کے اعتبار سے کہتا ہے تو یہ نہیں کہنا چاہیئے۔ کیونکہ اس شخص کو حالاً اپنے ایمان میں تردد ہے۔ اور اگر مستقبل کے متعلق کہتا ہے کہ انشاء اللہ میں مؤمن ہوں گا یا تبرک کے لئے استعمال کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔ تاہم اس سے احتراز کرنا چاہیئے کیونکہ بعض صورتیں خطرناک ہیں۔

محل ایمان:

شوافع کے ہاں ایمان کا محل قلب ہے کیونکہ نصوص میں ایمان کی نسبت قلب کی طرف کی گئی ہے جیسے "**وقلبه مطمئن بالایمان**" امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے کہ محل ایمان دماغ ہے۔ صاحب ہدایہ نے اشارہ کیا ہے کہ محل ایمان قلب ہے تو دماغ کی بات اور امام صاحب کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ ہاں قلبی روشنی کے لئے دماغ بمنزلہ بلب ہے۔

مورخہ ۱۱ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

الفصل الاول

حدیث جبرائیل

﴿۲﴾ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا يُرَىٰ عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ حَتّٰى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ أَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِسْلَامِ قَالَ اَلْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ وَ تُقِيْمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا قَالَ صَدَقْتَ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ قَالَ فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِيْمَانِ قَالَ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِحْسَانِ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ قَالَ فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْؤُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَأَخْبِرْنِيْ عَنْ أَمَارَاتِهَا قَالَ أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ لِيْ يَا عُمَرُ! أَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ قُلْتُ اللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ قَالَ فَإِنَّهُ جِبْرِيْلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَرَوَاهُ أَبُوْ هُرَيْرَةَ مَعَ اِخْتِلَافٍ وَفِيْهِ وَإِذَا رَأَيْتَ الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الصُّمَّ الْبُكْمَ مُلُوْكَ الْأَرْضِ فِيْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللهُ ثُمَّ قَرَأَ إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ۔ اَلْآيَةَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم ایک دن جناب رسول اللہ ﷺ کی مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک آدمی اندر آیا جس کا لباس نہایت سفید اور بال نہایت سیاہ چمکدار تھے۔ اس پر نہ تو سفر کی کوئی علامت نظر آرہی تھی اور نہ ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا، وہ حضور اکرم ﷺ کے قریب آکر بیٹھا اور آپ ﷺ کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا لئے اور (بطور ادب) اپنے دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ لئے۔ پھر اس نے عرض کیا اے محمد! مجھے اسلام کی حقیقت بتا دیجئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی قابل پرستش نہیں۔ اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، پھر پابندی سے نماز پڑھا کرو، زکوٰۃ ادا کیا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر بیت اللہ تک پہنچنا ممکن ہو اور زادِ راہ موجود ہو تو بیت اللہ کا حج

بھی کرو۔''اس شخص نے جواب سن کر کہا'' آپ نے صحیح فرمایا'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں تعجب ہوا کہ یہ آدمی ایک طرف تو سوال کر رہا ہے اور پھر جواب کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر وہ شخص بولا'' اے محمد! ایمان کی حقیقت بیان فرمائیے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو، اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کو، اس کی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو اور قیامت کے دن کو دل سے تسلیم کرو اور یقین کرو کہ برا بھلا سب کچھ اللہ کی طرف سے اللہ کے فیصلے کے مطابق ہے۔ اس نے کہا آپ نے بجا فرمایا۔ پھر پوچھا احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اور اگر یہ (شہودی درجہ) استحضار ممکن نہ ہو تو اتنا دھیان کرو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ قیامت کے بارے میں مجھے کچھ بتائیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اس بارے میں جواب دینے کا علم سوال کرنے والے کے علم سے زیادہ نہیں''۔ وہ شخص بولا کہ پھر قیامت کی نشانیاں بتا دیجئے۔ ارشاد ہوا کہ جب لونڈی اپنے آقا یا مالک کو جنے گی۔ اور برہنہ پا، برہنہ جسم، مفلس و فقیر اور بکریاں چرانے والوں کو عالیشان عمارات میں فخر و غرور کی زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھو۔ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) پھر وہ آدمی چلا گیا۔ میں نے کچھ دیر توقف کیا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا۔ عمر! سائل کو جانتے ہو کون تھا؟ میں نے کہا اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں فرمایا: یہ جبرئیل تھے جو تم لوگوں کو دین سکھانے آئے تھے۔ (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس روایت کو کچھ الفاظ کے فرق کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ان کی روایت کے آخری الفاظ اس طرح ہیں کہ تم ننگے پاؤں، ننگے بدن، بہرے اور گونگے لوگوں کو زمین پر حکمرانی کرتے ہوئے دیکھو اور قیامت کے وقت کی تعیین تو ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: **ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام وما تدری نفس ماذا تکسب غدا وما تدری نفس بای ارض تموت ان اللہ علیم خبیر۔** (لقمان ۳۴)

توضیح: یہ ایک جامع حدیث ہے اور شریعت مطہرہ کے تمام شعبوں پر محیط ہے چونکہ ان بنیادی باتوں کے سوالات حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ سے کئے تھے۔ اس لئے اس کو حدیث جبرئیل کہتے ہیں۔ جب سوال کرنے والے جبرئیل ہوں اور جواب دینے والے خاتم النبیین ﷺ ہوں تو پھر اس حدیث کے بنیادی مضامین کی شان خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ یہ حدیث تمام عبادات ظاہری اور باطنی اور ایسے احکامات پر مشتمل ہے جو ایمان، اعمال، جوارح اور اخلاص سرائر سے متعلق ہیں۔ یہاں تک کہ شریعت کے تمام علوم اس کی طرف راجع ہیں اور سب اس سے پھوٹ کر پھیلتے ہیں۔ اور اسی جامعیت کی وجہ سے علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ **"یصلح ان یقال لہ ام السنۃ"** یعنی جس طرح سورۃ فاتحہ قرآن کے لئے ام القرآن ہے یہ حدیث تمام احادیث کے لئے ''ام السنۃ'' ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ امام بغوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب مصابیح اور شرح السنۃ کی ابتداء اسی حدیث شریف سے کی ہے۔ اس حدیث سے متعلق گزشتہ مباحث میں بھی چند باتیں لکھی گئی ہیں۔ وہاں ملاحظہ کریں۔

بینما۔۔۔ یہ لفظ مفرد ہے اور ظرفیت کے لئے آتا ہے اور جملہ اسمیہ اور فعلیہ دونوں کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ **اذ** اور **بینما** دونوں ظرف زمان بمعنی مفاجاۃ آتے ہیں۔ اور یہی مفاجاۃ کا معنی اس ظرف کا عامل بنتا ہے۔ حدیث کا معنی یہ ہوا۔

وقت حضورنا فی مجلس النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاجأنا طلوع ھذا الرجل۔

ترجمہ کرنے میں "**بینما**" کا ترجمہ اس طرح ہوتا ہے۔ اسی اثناء میں یا اسی درمیان اور اسی دوران۔

ذات یوم: لفظ ذات بڑھایا گیا ہے یہ اس وہم کو دور کرنے کے لئے ہے کہ یہاں مجازاً مطلق زمان مراد نہیں بلکہ دن ہی مراد ہے۔ نیز لفظ ذات کلام کی تحسین کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ بعض نے اس کو مقحم یعنی زائد بھی کہا ہے۔

نحن عند رسول اللہ: ایک روایت میں "**فی آخر عمرہ**" کا لفظ آیا ہے۔ بعض نے حجۃ الوداع کے بعد دس ہجری میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی اس آمد کا وقت بتایا ہے۔ گویا حضرت جبرائیل علیہ السلام تمام احکام کے نازل ہونے کے بعد امور دین کی تثبیت تقریر اور مضبوطی کے لئے آئے اور اجمالی خاکہ ایک ہی مجلس میں پیش کیا۔

بخاری کی روایت میں ہے "**کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوما بارزا للناس**" ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک نمایاں جگہ پر تشریف فرماتے تھے کیونکہ صحابہ نے آپ کی اجازت سے آپ ﷺ کے بیٹھنے کے لئے ایک چبوترہ بنایا تھا تاکہ امتیاز آجائے۔ اسی روایت سے قرطبی نے علماء اساتذہ اور مدرسین کے لئے نمایاں جگہ بنانے پر استدلال کیا ہے۔ بشرطیکہ ضرورت ہو، اس حدیث کا شانِ ورود یہ ہے کہ چونکہ قرآن کریم نے سوال پر پابندی لگائی تھی جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا "**سلونی فھابوا ان یسالوہ فجاء جبرئیل**" یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا مجھ سے سوال پوچھو تو صحابہ سوال کرنے سے گھبرا گئے تب جبرائیل علیہ السلام آئے اور سوال کئے۔

اذ طلع علینا رجل: دخل کی بجائے طلع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آنے والا ایک شخص اچانک آیا تھا اور اچانک آمد کے لئے طلع زیادہ مناسب تھا کیونکہ **طلوع الشیء** دفعتاً ہوتا ہے۔

یا لفظ طلع کمال ظہور، کمال عظمت اور علو مرتبت کے لئے اختیار کیا جیسے **طلع البدر علینا یا طلع الشمس** کے الفاظ عظمت کے لئے بولے جاتے ہیں۔

تیسری وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ یہ شخص چونکہ جبرئیل امین تھے اور فرشتے نورانی مخلوق ہیں اس نور اور روشنی کے لئے طلع کا لفظ زیادہ مناسب تھا۔ "**رجل**" میں تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ یعنی ایک شان والا آدمی نمودار ہوا، فرشتہ ہمیشہ جب کسی کی شکل اپناتا ہے تو مردوں کی شکل میں آتا ہے۔ عورت کی شکل میں نہیں آیا کرتا۔

شدید بیاض الثیاب: یہاں اضافت لفظیہ تخفیف کے لئے ہے۔ اور مضاف الیہ میں الف لام عوض مضاف الیہ ہے۔ یعنی **شدید بیاض ثوبہ** اور اگر شدید مضاف پر تنوین لی جائے تو بیاض اس کا فاعل بن جائے گا۔ یعنی **شدید بیاض ثوبہ**۔

سفید لباس اختیار کرنے سے اشارہ کیا کہ سب سے عمدہ لباس سفید ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں بھی ہے آنحضرت ﷺ نے

فرمایا "البسوا ثیاب البیض فانہا اطہر واطیب و کفنوا فیہا موتاکم" اور سفید لباس اختیار کرنے سے توحش دور ہوجاتا ہے اس لئے اس کو اختیار کیا، اس جملے کی تشریح آنے والے شدید سواد الشعر کے جملہ میں بھی چلے گی۔
ان دونوں جملوں کے ملانے سے علم دین کے طلباء کے لئے چند مفید آداب حاصل ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ حصول علم کے لئے پہلا ادب تو یہ ہے کہ طالب علم صاف ستھرا ہو خواہ پرانا کپڑا ہو مگر صاف ہو نظافت ہو دوسرا ادب یہ کہ علم دین کے حصول کا زمانہ جوانی کا ہے کہ اس میں ہر مشقت برداشت کرنا بھی آسان ہوتا ہے۔ اور ذہن اور حافظہ اور دیگر قویٰ بھی تروتازہ ہوتے ہیں۔
ولا یعرفہ منا احد: یہاں یہ سوال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیسے فرمایا کہ ہم میں سے کوئی بھی انکو نہیں جانتا تھا ممکن ہے پورے مجمع میں کوئی جاننے والا ہو۔ جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے گمان کے مطابق سب کی طرف یہ نسبت کی یا یہ کہ حاضرین مجلس کے قول اور تصریح کے مطابق یہ فرمایا کیونکہ یہ قول ابن حجر عثمان بن غیاث کی روایت میں ہے۔
فنظر القوم بعضهم الی بعض فقالوا ما نعرفه۔
حتی جلس الی النبی ﷺ: اس روایت میں کچھ اجمال ہے۔ مسند امام اعظم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو روایت منقول ہے وہ اس طرح ہے۔
عن ابن مسعود الی ان قال السلام علیك یا رسول الله فقال وعلیك السلام فقال یا رسول الله اَدْنُ فقال اُدْنُ قال فدنا حتی جلس......الخ۔
جلوس اور قعود مترادف الفاظ ہیں اور بیٹھنے کے معنی میں ہیں۔
فأسند رکبتیها الی رکبتیه: سوال یہ ہے کہ اس طرح بیٹھنے میں بے ادبی کا احتمال ہے ایسا کیوں کیا؟
اسکے چند جوابات ہیں۔
1. طلب علم میں اپنی شدید حاجت واحتیاج ظاہر کرنے کے لیے ایسا کیا۔
2. حضور ﷺ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے ایسا کیا۔
3. لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایسا کیا۔
4. اپنی ہیئت وحیثیت چھپانے کے لیے ایسا کیا کہ کوئی پہچان نہ سکے۔

ووضع کفیه علی فخذیه: کفیه کی ضمیر تو اس آنے والے سائل جبرائیل امین کی طرف لوٹتی ہے یہ طالب علم کے باادب بیٹھنے کا انداز ہے کہ دوزانو ہو کر قعدہ کی شکل میں بیٹھ کر دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ دے گویا ہر متعلم کو ادب کا درس دیا۔
فخذیه: اس میں ضمیر اگر سائل کی طرف راجع ہے تو اس میں کمال ادب کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے لیکن امام بغوی علامہ طیبی اسماعیل تیمی وغیرہ علماء کے نزدیک یہ ضمیر نبی اکرم ﷺ کی طرف راجع ہے کہ اس سائل نے اپنے دونوں ہاتھ نبی اکرم ﷺ کی رانوں پر رکھ دیئے۔ ان علماء کی اس رائے کی تائید نسائی کی روایت سے ہوتی ہے کیونکہ کہ اس میں تصریح ہے۔ **ثم وضع یدیه علی رکبتی النبی صلی الله علیه وسلم** اس تصریح کے بعد

اس میں بحث نہیں کرنا چاہئے کہ ضمیر کس طرف لوٹتی ہے؟

البتہ یہاں پھر وہی سوال اٹھے گا کہ یہ صورت کیا بے ادبی کی نہیں ہے؟ اس کے وہی جوابات ہیں جو اوپر کے جملے میں دیئے گئے ہیں۔ کہ اس سے وہ اپنا بدوپن ظاہر کرنا چاہتے تھے تا کہ ملک اور فرشتہ ہونا پوشیدہ رہے، یا توجہ مبذول کرانا چاہتے تھے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مجاز پر حمل کیا ہے کہ اس سے مراد کمال قرب ہے لیکن مجاز لینے کی کیا ضرورت ہے؟ حقیقت موجود ہے، جبرائیل امین کی آمد و گفتگو اور سوال و جواب پر علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ، علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر شارحین نے جو کلام کیا ہے اسکا خلاصہ یہ ہے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام کا مطمح نظر ابہام، اخفاء حال اور لوگوں کو ہر ممکن طریقے سے ورطۂ حیرت اور التباس میں ڈالنا تھا۔ کبھی آپ تہذیب یافتہ لوگوں کا طرز اختیار کر کے یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ نووارد انتہائی درجہ کے مہذب، باوقار اور آدابِ تعلیم سے واقف ہیں۔ اور کبھی ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس سے آداب مجلس سے ناواقف ہونے دیہاتی اور بدوی ہونے کا خیال آتا ہے۔

کبھی اپنی رانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر مہذب انداز میں بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی ناواقف دیہاتیوں کی طرح گھٹنوں سے گھٹنا ٹیک کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ کبھی یارسول اللہ کہہ کر تہذیب کا رنگ اختیار کرتے ہیں اور کبھی یا محمد کہہ کے گنوار پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کبھی سلام کر کے مجلس میں آنے کی اجازت مانگتے ہیں اور کبھی گردنوں کو پھلانگ کر دیہاتیوں کی طرح آگے بڑھتے ہیں کبھی عمدہ و عمیق سوال کرتے ہیں تو جواب ملنے پر خود تصویب کر کے واقفیت اور ناواقفیت کے تضاد کو جمع کرتے ہیں۔ بدن اور لباس پر آثار سفر ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے مقیم معلوم ہوتے ہیں۔ اور کسی کا ان کو نہ پہچاننا مسافر ہونے کی دلیل ہے۔ عجیب یہ ہے کہ جبرائیل امین نے تعمیہ اور اخفاء کے تمام طور طریق اپنا کر لوگوں کو قابلِ غور میں ڈال دیا یہاں تک کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت تک نہ پہچانا اور جانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ جبرائیل تھے۔

۱۱ ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ

وقال یا محمد: سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس طرح خطاب کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرنے سے منع فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے "**لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا**"۔

اسکے باوجود جبرائیل امین نے یا محمد سے آپ کو کیوں پکارا ہے؟ نیز قرآنی ممانعت کے ساتھ ساتھ اس طرح خطاب کرنے میں بے ادبی کا پہلو بھی ہے۔

پہلا جواب: یہ ہے کہ اس خطاب اور اس ممانعت کے مکلف اور پابند انسان ہیں فرشتے نہیں، یہ اچھا جواب ہے کیونکہ کئی دیگر مقامات میں جبرائیل امین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی نام سے پکارا ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ لفظ محمد سے وصفی معنی بمعنی ستودہ صفات "حمیدہ خصال والے" مراد لئے گئے ہیں، علمی معنی مراد نہیں ہے۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ جبرائیل امین اپنے آپ کو چھپا رہے تھے اسکے لئے اس طرح کا پکارنا ضروری تھا۔ بہر حال جب شارحین حدیث نے اس میں بے ادبی کا احتمال نکالا ہے تو اب ''یا محمد'' کہہ کر پکارنا حرام ہے۔

ایک بریلوی عالم نے مشکوۃ کی شرح لکھی ہے اس مقام پر وہ لکھتے ہیں ''اب حضور کو ''یا محمد'' کہہ کر پکارنا حرام ہے''۔

اخبرنی عن الإسلام: یہاں پر امر استدعاء کے معنی میں ہے۔ استعلاء اور حکم کے معنی میں نہیں ہے۔ کیونکہ انبیاء کرام فرشتوں سے افضل ہیں۔

"الاسلام هو الانقياد الظاهر بشرط الانقياد الباطن" الاسلام میں الف لام حقیقت شرعیہ کے لئے ہے۔ اور ایک روایت میں شرائع الاسلام کے الفاظ بھی ہیں۔ اسی لئے اس کا جواب ارکان خمسہ سے دیا گیا ہے۔ صرف تعریف نہیں بتائی۔

یہاں پر سوال یہ ہے کہ مسلم، کتاب حمیدی، جامع اصول، ریاض الصالحین اور مشکوۃ میں اسلام سے متعلق سوال و جواب مقدم لایا گیا ہے اور بخاری اور مصابیح میں ایمان کا سوال و جواب مقدم لایا گیا ہے۔

اسکا جواب یہ ہے کہ یہاں مقام کا تقاضا یہ تھا کہ اسلام مقدم ہو کیونکہ جبرائیل علیہ السلام نے سیکھنے اور تعلیم کے لئے سوال کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہری طور پر جواب دیا کیونکہ آپ حکمت تدریجیہ کے اصول پر جواب دیا کرتے تھے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہم کو مقدم کر کے ذکر فرماتے تھے۔ لہذا یہاں ظاہری انقیاد سے تدریجاً ترقی کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کا ذکر فرمایا پھر اس سے ترقی کر کے احسان کا تذکرہ فرمایا جو اخلاص کا مقام ہے گویا یہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کی ایک صورت تھی، ورنہ ایمان تو اساسِ اسلام اور اساسِ دین ہے وہ سب سے مقدم ہے۔

بہر حال صاحب مشکوۃ نے صاحب مصابیح پر عملاً اعتراض کیا کہ ایسا ہونا چاہئے تھا کہ پہلے سوال و جواب اسلام سے ہو، یا جواب یہ ہے کہ یہ تقدیم تاخیر بعض رواۃ کی طرف سے تصرف ہے جو ہوتا رہتا ہے، اور مختلف اسلوب اختیار کرتے رہنا محدثین کی عام عادت ہے اور جہاں ایمان مقدم ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دین کے لئے اساس اور بنیاد ہے اس کے بغیر کسی عمل کا اعتبار نہیں ہے۔

ان تشهد: یہاں "أن" مصدریہ ہے جس نے تشہد کو شہادۃ مصدر بنا دیا۔ "ان لا اله الا الله" میں **أن مخففه من الثقيلة** ہے۔ جو "انه" کے معنی میں ہے اور ضمیر شان ہے اور "لا اله الا الله" کلمۃ التوحید ہے۔ **"والتوحيد فى اللغة "وحدانية الشئ" واصطلاحًا "اثبات ذات الله بالوحدانية"** کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی مشابہت سے پاک ہے۔ عقیدۃً وقولاً وعملاً وعرفاً وثبوتاً ودواماً۔

توحید سے متعلق امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں **للتوحيد لبان وقشران كالجوز** ..... الخ یعنی توحید کے لئے دو چھلکے ہیں۔ اور دو مغز ہیں جس طرح بادام میں ہوتا ہے۔ اقرار باللسان توحید کے لئے اوپر کا چھلکا ہے اور اعتقاد بالجنان دوسرا چھلکا ہے جس طرح بادام کی گٹھلی پر ایک چھلکا ہوتا ہے پھر خود گٹھلی دوسرا چھلکا ہے پھر لُب ہے۔ توحید کا لب یہ ہے کہ انسان کائنات کی تمام اشیاء کو ایک اللہ کی تخلیق مانے اور یہ جانے کہ سب کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے ہے جو سب کا فاعل مختار

ہے۔اور پھر تمام اسباب کو ان کے مسببات کے ساتھ جڑا ہوا ماننے، اسکے کے بعد لب اللب ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کی نظر کائنات میں صرف ایک اللہ پر ہی ہو، دیگر کوئی چیز اسکو نظر نہ آئے۔اور اسی واحد لاشریک ذات کے مراقبہ میں مستغرق ہوجائے۔تو **قشر** اور **قشر القشر** اور **لب** اور **لب اللب** یہ چار چیزیں توحید میں ہیں۔

محمد رسول اللہ: اس جملے سے نبوت اور رسالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور شہادت کے مفہوم میں "**محمد رسول اللہ**" کا مفہوم خود پڑا ہوا ہے کیونکہ یہ دونوں لازم و ملزوم نہیں تو کبھی اس کو ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی صرف شہادت کے لفظ پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

ان استطعت الیه سبیلا: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں استطاعت مال کا نام ہے، لہٰذا، معذور بیمار پر بھی حج فرض ہے جبکہ وہ مالدار ہو وہ اپنے نائب کو پیسہ دے کر حج کرائے گا۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک "**استطاعة بالبدن**" ہے کہ آدمی صحت مند اور تندرست ہو تو اس پر حج فرض ہے پیدل جائے گا راستے میں کمائے گا کھائے گا اور آگے بڑھتا جائے گا۔احناف کے ہاں **زاد و راحلة** کا حاصل ہونا استطاعت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بعض روایات میں حج کا ذکر نہیں ہے، بعض میں روزے کا ذکر نہیں ہے حج کا ہے، بعض ترتیب میں آگے پیچھے ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ راویوں کے تصرفات میں سے ہے کہ کسی نے کسی کو ذکر کیا کسی نے کسی کو ذکر کیا۔کسی کو ایک طرح یاد تھا اور کسی کو کسی اور طرح یاد تھا اسی میں تقدیم تاخیر بھی ہوگئی۔

قال صدقت فعجبنا له: یعنی صحابہ کو اس پر تعجب ہوا۔

❶ یہ شخص سائل بن کر اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہا ہے اور پھر تصدیق کر کے اپنے عالم ہونے کا اظہار کر رہا ہے۔

❷ صحابہ کرام کے تعجب کی دوسری وجہ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے کہ صحابہ جانتے تھے کہ علم کا منبع اور سرچشمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے بغیر کوئی بھی ان علوم کو نہیں جانتا، یہ سائل کبھی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے نہیں تو یہ کیسے تصدیق کرتے ہیں کیونکہ تصدیق کیلئے سابق علم کا ہونا ضروری ہے۔

قال فاخبرنی عن الایمان: یہاں پر بھی امر استدعا کے معنی میں ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ سوال مؤمن بہ اور متعلقات ایمان سے ہے، حقیقت ایمان اور تعریف سے نہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ان امور مؤمن بہ کا ذکر کیا ورنہ حقیقی ایمان تو تصدیق قلبی ہے۔اب یہاں اشکال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "**اخبرنی عن الایمان**" کے جواب میں "**ان تؤمن**" فرمایا۔تو یہ تو **تعریف الشئ بنفسه** ہوئی، جواب یہ ہے کہ سوال میں ایمان شرعی کا ذکر ہے۔اور جواب میں ایمان لغوی کا ذکر ہے تو حد اور محدود الگ الگ ہیں۔نیز ایمان جب جواب میں آیا تو اس کے صلہ میں با آیا اور ایمان اس صلہ کی وجہ سے "**تعترف**" کے معنی میں ہوا۔یعنی سائل نے پوچھا ایمان شرعی کیا ہے؟ جواب دیا گیا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، ملائکہ ۔۔۔۔الخ کے اقرار کا نام ایمان ہے۔

وملائکته: یہ اصل میں **مألكة** من **الالوكة** سے بمعنی الرسالۃ ہے پھر ہمزہ پر لام کو مقدم کیا تو **مَلْئَكَة** ہوگیا پھر

ہمزہ کا فتحہ لام کو دیا اور ہمزہ حذف کر دیا گیا تو "ملك" رہ گیا جس کی جمع ملائکة ہے۔ امام بیہقی کی تصریح کے مطابق فرشتوں سے متعلق یہ عقیدہ اور ایمان رکھنا چاہئے:

● یہ عقیدہ ہو کہ انکا وجود ہے۔ یہ اللہ کی عظیم مخلوق ہے۔

❷ اللہ تعالی نے عظیم مرتبہ سے نوازا ہے اور انہیں عالم بالا و عالم سفلی کے بڑے کاموں پر مامور کیا ہے۔

❸ یہ عقیدہ ہو کہ لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون۔

❹ یہ عقیدہ ہو کہ بعض فرشتے انبیاء کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے سفراء ہیں بعض دوسرے کاموں میں ہیں۔ فرشتوں کے بارے میں نیچری اور سرسید پیروکار نے بڑی زیادتی کی ہے کہ جو نظر نہیں آتا اس کا انکار کرو، اس لیے وہ فرشتوں اور جنات کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے جسم میں بہت ساری چیزیں ہیں مثلاً لوہا ہے، شوگر ہے، چونا وغیرہ ہے جو نظر نہیں آتا مگر کوئی انکار نہیں کرتا۔ ماچس کی تیلی میں آگ کہاں نظر آتی ہے دودھ میں مکھن کہاں نظر آتا ہے۔ مگر کوئی انکار نہیں کرتا تو صرف فرشتوں کا انکار کیوں کیا جاتا ہے؟

اگر یہ کوئی شرعی ضابطہ ہے کہ جو نظر نہ آئے اسکا انکار کرو تو پھر اللہ تعالیٰ تو نظر نہیں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کے اکثر پیروکار دہریہ بن جاتے ہیں۔ فرشتوں کی تعداد صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ہاں چار فرشتے مشہور ہیں۔ فرشتوں پر اجمال اور تفصیل کے ساتھ ایمان لانا ہے۔ یہاں ملائکہ کو رسولوں پر مقدم کر کے ذکر کیا یہ تقدیم فضیلت کے اعتبار سے نہیں بلکہ تقدیم ذکری ہے نہ کہ رتبی۔ ویسے بھی فرشتے وجود کے اعتبار سے مقدم ہیں تو پہلے ذکر کیا۔

وکتبه: تمام صحائف اور کتب مراد ہیں۔ اس پر ایمان یہ ہے کہ اللہ کا کلام ہے قدیم ہے مجرد از حروف وصوت ہے۔

یہ کتابیں انبیاء کرام علیہم السلام پر بواسطہ فرشتہ یا براہِ راست اتری ہیں اور قرآن کریم سب سے افضل ہے جو عربی میں محمد عربی ﷺ پر اترا ہے۔ قرآن کے آنے کے بعد سابقہ تمام کتابیں منسوخ ہوگئیں قرآن کریم ان کے لئے ناسخ ہے۔

کل آسمانی صحائف ایک سو بتائے جاتے ہیں۔ اور چار مشہور کتابیں ہیں یہ کتب اور صحائف کل ایک سو چار ہوتے ہیں۔ پچاس صحائف حضرت شیث علیہ السلام پر نازل ہوئے۔ تیس حضرت ادریس علیہ السلام پر اترے۔ اور دس حضرت آدم علیہ السلام کی طرف بھیجے گئے۔ اور دس حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئے۔ اور باقی چار مشہور کتابیں مشہور زبانوں میں مشہور نبیوں پر اتریں۔ ان حروف سے سب کی طرف اشارہ ہے۔ "تعم" یعنی تورات عبرانی زبان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ تاء سے تورات عین سے عبرانی اور میم سے موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔

"**فعم**" یعنی فرقان مجید عربی زبان میں محمد ﷺ پر نازل ہوا۔

"**اسع**" یعنی انجیل سریانی زبان میں عیسیٰ علیہ السلام پر اتری۔

"**زید**" یعنی زبور یونانی زبان میں داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اجمال یا تفصیل کے ساتھ ان تمام کتب وصحائف پر ایمان لانا ضروری ہے۔

ورسله: رسولوں پر اجمالاً وتفصیلاً ایمان لانا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کیلئے نبیوں کو بھیجا یہ خالق اور مخلوق کے درمیان پیغام رسانی پر مامور تھے۔ انکو معجزے دیئے گئے تھے وہ کبائر سے قبل النبوۃ پاک اور معصوم تھے۔ اور جن لغزشوں کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے ہم کو ان کا تذکرہ موضوع بحث بنا کر نہیں کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ خالق ہے وہ اگر معمولی لغزش پر سخت سرزنش کرے تو کر سکتا ہے۔

انبیاء کرام ایک معتمد روایت کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں، جن میں تین سو تیرہ رسول تھے، ''کم وبیش'' کا کلمہ لگا کر تعداد انبیاء کرام کا تذکرہ کرنا چاہئے تا کہ کلام میں احتیاط ہو جائے۔

نبی اور رسول کا فرق اور اصطلاحی تعریف ابتدائے کتب میں ہو چکی ہے۔

الیوم الآخر: سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ وہ دنیا کا آخری دن ہے۔ نیز اس دن کے بعد رات ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی، تو وہ آخری دن ہوا، آخرت پر ایمان یہ ہے کہ ایک دن یہ کارخانۂ عالم ختم ہو جائے گا انسان کا جسم روح کے ساتھ جوڑ کر میدان محشر تک حساب کیلئے لایا جائے گا پھر جنت یا دوزخ ٹھکانہ بنے گا۔

وتؤمن بالقدر خیرہ و شرہ: اس جملے سے ان لوگوں پر رد ہو گیا جو تقدیر کو مانتے ہی نہیں یا مانتے ہیں لیکن شر کا خالق ''اہرمن'' اور خیر کا خالق ''یزدان'' کو مانتے ہیں جیسا کہ مجوس کا یہ عقیدہ ہے، مومن کا عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ خالق خیر وشر ایک اللہ ہے۔ خلق تو کمال ہے، ہاں اکتساب شر جو انسان کرتا ہے وہ عیب ہے اور یہ عقیدہ رکھے کہ جو تفصیلات خارج میں آتی ہیں۔ اس کا ایک اجمالی خاکہ ہے، اس خاکے کے مطابق تمام تفصیلات رونما ہوتی ہیں، اس مسئلے کی تفصیل باب الایمان بالقدر میں ان شاء اللہ آجائے گی۔

یہاں "**تؤمن**" کو لوٹا کر اعادۂ بعد عہد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی جب کلام طویل ہو جاتا ہے تو عامل کو لوٹا کر کلام شروع کیا جاتا ہے تا کہ بھولا ہوا سبق یاد آجائے۔ جیسا شاعر نے اعادۂ بعد عہد کیلئے "انی" کو لوٹایا ہے۔

قد علم الحی الیمانین اننی اذا قلت اما بعد انی خطیبها

قال فاخبرنی عن الاحسان: بغیر صلہ جب لفظ احسان آجائے تو اس کا مفہوم اخلاص ہوتا ہے یعنی اخلاص کے معنی میں ہے۔ اور اگر صلہ کے ساتھ آجائے تو پھر یہ اچھائی اور انعام کے معنی میں آتا ہے۔ **احسن الیه ای أنعم علیه** لغوی طور پر احسان، اچھائی کے معنی میں ہے، اور اسکی اصطلاحی تعریف وہی ہے جو حدیث شریف میں ہے۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں احسان کا ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ جملۂ اولیٰ سے مشاہدۂ حق کا بیان مقصود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کے وقت عابد پر ایسی کیفیت طاری ہونی چاہئے گویا کہ واقعی مشاہدۂ حق ہو رہا ہے اور عبادت میں ذوق وشوق، عظمت وحیاء اور اکمل درجہ کی استغراقی کیفیت ہونی چاہیے اور اگرچہ دنیا میں فی الحقیقت ذات حق کا مشاہدہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

پھر جملہ ثانیہ میں مراقبۂ حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ تم دنیا میں مشاہدہ تو نہیں کر سکتے ہو مگر کم از کم یہ تو دھیان رہے

کہ ذاتِ حق تجھے دیکھ رہی ہے گویا پہلے جملے میں مقامِ شہود کا ذکر ہے اور دوسرے جملے میں مقام غیبوبت کا ذکر ہے۔ دونوں سے مراد اخلاص پیدا کرنا ہے۔ عابد کی دو حالتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ ارفع واعلیٰ حالت مشاہدہ کی کیفیت ہے جو مقام مشاہدہ ہے اور ادنیٰ حالت مقام مراقبہ ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے شریعت اور طریقت کا فرق اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جب علم کی کشمکش اور دلائل کا دور ہو تو یہ شریعت ہے۔ اور جب طمانینت آجائے تو یہ طریقت ہے یا اس طرح سمجھایا ہے کہ جب احکام اسلام پر بتکلف چلتا رہے تو یہ شریعت ہے اور جب طبعیت بن جائے تو یہ طریقت ہے، احسان اسی طریقت کے درجے کا نام ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فضل الباری جلد دوم میں فرماتے ہیں: ''اصل چیز تو ایمان ہے اور وہ جذر قلب میں ہوتا ہے اور جب وہ ترقی کرتا ہے تو جوارح یعنی ظاہری اعضاء پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ پھر اس ایمان پر جو شخص انبیاء علیہم السلام کی ہدایت کے مطابق مزاولت (ہمیشگی) کرتا ہے تو اس باقاعدگی اور مزاولت سے جو قوت حاصل ہوتی ہے اسکو احسان کہا جاتا ہے۔ انبیاء کرام اس فن کے بڑے بڑے اساتذہ ہیں۔ گویا اسلام ترقی کر کے ایمان بنتا ہے۔ اور ایمان ترقی کر کے احسان بنتا ہے۔ شریعت جو ایمان واسلام کا مجموعہ ہے اس کی باقاعدہ مشق سے احسان حاصل ہوتا ہے یہی طریقت ہے۔

بعض گمنام بریلوی صوفیوں نے یہاں احسان کا مقام بتاتے ہوئے حدیث کا ترجمہ اسطرح کیا ہے کہ "ان لم تکن تراہ" یعنی اگر تمہارا وجود ختم ہو جائے اور تم اس کو فنا کر دو اور خود مٹ جاؤ تب اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکو گے تیرا اپنا وجود ہی اس رؤیت میں بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ ترجمہ غلط ہے اور یہ مطلب لینا حدیث میں تحریف ہے۔ اپنے آپ کو فنا کرنا اپنی جگہ پر ایک اہم عمل ہے اور صحیح ہے لیکن حدیث کا مصداق یہ نہیں ہے۔ یہ مطلب غلط اس لئے ہے کہ اگر "تراہ" جزا ہے ان لم تکن کیلئے تو جواب شرط کی وجہ سے تراہ کا الف باقی نہیں رہنا چاہئے تھا بلکہ گر جانا چاہئے تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر "ان لم تکن" کے لئے "تراہ" جزا ہو جائے تو "فانہ یراك" کا کیا بنے گا؟ وہ جملہ تو مہمل رہ جائے گا حالانکہ وہ جزا ہے۔

تیسری وجہ یہ کہ بعض روایات میں ان لم تکن نہیں ہے۔ بلکہ ان لم تراہ ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کا دیدار نہیں ہو سکتا ہے۔ خواہ کوئی اپنے آپ کو فنا کرے یا نہ کرے۔ لہٰذا یہ شرح اور یہ توجیہ اور یہ مطلب حدیث کی عبارت اور معنی دونوں کے منافی ہے۔ بعض روایات میں یہاں بھی حضرت جبرائیل نے صدقت کا جملہ کہا ہے۔ مگر شاید راویوں نے اختصار کے پیش نظر یا بھول کر چھوڑ دیا۔

۱۳ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

قال فاخبرنی عن الساعۃ: یہ سوال نفس وقوع قیامت کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ وقوع قیامت تو قطعی اور یقینی ہے بلکہ یہ سوال تعیین وقت کیلئے تھا اور ایک روایت میں "متی الساعۃ" یعنی قیامت کب آئے گی کے الفاظ آئے ہیں جو اس بات کی تائید ہے کہ سوال تعیین وقت سے متعلق تھا۔

الساعة: زمانے کے اس جزء غیر معین کا نام ہے جس کے (۲۴) اجزاء سے دن رات بن جاتے ہیں۔ یہاں ساعۃ کا اطلاق قیامت پر ہوا ہے۔ قیامت کے تین مراحل ہیں:

قیامت کبریٰ یہ وہ ہے جب کارخانۂ عالم اپنی کل کائنات کے ساتھ ختم ہوجائے گا۔

دوسرا مرحلہ قیامت وسطیٰ کا ہے یہ وہ ہے کہ ایک قرن ختم ہوجائے مثلاً قرن صحابہ یا قرن تابعین یا تبع تابعین۔

تیسرا مرحلہ قیامت صغریٰ ہے اور وہ ہر آدمی کی ذاتی اور شخصی موت ہے یعنی "**من مات فقد قامت قیامته**" قیامت کا عقیدہ اسلام کے بنیادی اور اہم عقائد میں سے ہے جن قوموں سے یہ عقیدہ نکل گیا وہ قومیں بریک فیل گاڑی کی طرح تباہ ہوگئیں۔ مثلاً یہود و نصاریٰ کا عقیدۂ آخرت اپنے بڑوں اور بزرگوں کے متعلق غلط خیالات ونظریات کی وجہ سے خراب ہوگیا کہ ان بزرگوں نے ہم کو بخشوا دیا ہے اس پر وہ لوگ تباہ ہوگئے پھر آغا خانیوں، رافضیوں اور پھر بریلویوں کے عقائد آخرت کے بارے میں جتنے کمزور ہوگئے اتنے ہی وہ اعمال سے دور جا گرے۔ کیونکہ آخرت کی جواب دہی کا عقیدہ دنیاوی زندگی کو کنٹرول کرتا ہے ورنہ ہر آدمی یہ کہے گا کہ: ع

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ما المسؤل عنها باعلم من السائل: یعنی قیامت کے بارے میں قیامت تک جس سے بھی سوال کیا جائے گا وہ سائل سے زیادہ جاننے والا نہیں ہوگا۔ بلکہ عدم علم میں دونوں برابر ہونگے۔ **باعلم** میں باء تاکید نفی کے لئے ہے۔

نبی کریم ﷺ نے "**لا ادری**" یا "**لا اعلم**" نہیں فرمایا بلکہ ایک طویل جملہ اختیار فرمایا اسکی وجہ یہ ہے کہ "**لا اعلم**" اور "**لست إعلم**" سے زیادہ سے زیادہ اپنی ذات سے علم قیامت کی نفی ہوتی لیکن اس طویل جملے سے آپ نے ایک ضابطہ بتادیا ہے کہ قیامت کے بارے میں کوئی بھی سائل جب بھی سوال کرے گا تو عدم علم میں دونوں یعنی سائل و مسئول برابر ہونگے عدم علم کی مساوات صرف قیامت کے بارے میں ہے باقی احکامات میں نہیں ہے۔

سوال:

اہل بدعت اس جملے میں معنوی تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت سے متعلق جتنا علم تجھے ہے اتنا ہی مجھے ہے کوئی زیادہ نہیں یہ مفہوم چند وجوہ سے غلط ہے:

1. حضور ﷺ کو اب تک یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ جبرائیل ہیں۔
2. اگر دونوں کو قیامت کا علم تھا تو پھر امارات سے جواب کیوں دیا گیا۔
3. قرآن وحدیث کی صریح نصوص سے بالکل واضح ہے کہ قیامت کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے پھر یہاں یہ کھینچا تانی صریح غلطی ہے، غیب بمعنی ملکہ اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے جزئیات کا علم اگر کسی کو ہوا تب بھی کلیات کا علم کسی کو نہیں ہے۔

سوال: جبرائیل امین نے یہ سوال کیوں کیا جبکہ ان کو معلوم تھا کہ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔

جواب: جبرائیل نے آکر یہ سوال اس لئے کیا تاکہ آئندہ کوئی شخص قیامت سے متعلق سوال نہ کرے گویا اس سوال

وجواب سے سامعین اور امت کے تمام افراد کو قیامت سے متعلق سوالات سے منع کر دیا۔

سوال: بعض صوفیاء کو بعض مغیبات کا علم کیسے ہوتا ہے؟ کیا ان کے مکاشفات کو علم غیب کہا جا سکتا ہے؟

جواب: غیب کے کچھ مبادی اور اصول ہیں اور کچھ لواحقات ہیں۔ مبادی اور اصول مفاتیح الغیب کو تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا نہ ملک مقرب اور نہ نبی مرسل۔ لواحقات کو اللہ تعالیٰ کبھی محبوبین پر ظاہر فرما دیتا ہے لیکن یہ پھر غیب نہیں رہتے ہیں۔ کیونکہ علم غیب وہ ہوتا ہے جو حواس خمسہ ظاہرہ کے توسط کے بغیر حاصل ہو جائے۔ کسی کے بتانے یا القاء والہام کے ذریعے سے یا مکاشفہ کے ذریعے سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ علم غیب کی تعریف سے خارج ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے غیب کی تعریف اس طرح کی ہے:

یؤمنون بالغیب المراد به الخفی الذی لا یدرکه الحس ولا یقتضیه بداهة العقل۔

(بیضاوی ج۱، ص:۱۸)

یعنی علم غیب وہ ہوتا ہے جو حواس خمسہ کے ادراک سے بالاتر ہو کر کسی کو حاصل ہو جائے۔ جس پر عقل کی دسترس نہ ہو لہٰذا یہ بات واضح ہو گئی کہ الہام، مکاشفات وغیرہ سے حاصل شدہ علوم یا تو اسباب کے ذریعے سے ہیں یا غیر یقینی ظنیات ہیں جو علم غیب سے خارج ہیں۔

نوادر حمیدی میں ہے کہ یہی گفتگو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے درمیان بھی ہوئی تھی لیکن وہاں سوال کرنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور جواب دینے والے حضرت جبرائیل تھے۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ سوال حضرت جبرائیل اور جواب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا اندازہ ہوتا ہے۔

مورخہ ۱۴ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

علامات قیامت

قال فاخبرنی عن اماراتها: بفتح الهمزة جمع امارة ای علامة وفی روایة عن اشراطها وفی روایة ساخبرك وساحدثك عن اشراطها۔

قیامت کی علامات دو قسم کی ہیں۔ علامات صغریٰ اور علامات کبریٰ، علامات صغریٰ ظہور مہدی تک ہیں۔ اور خود ظہور مہدی اور خروج دجال ونزول عیسیٰ وخروج یاجوج ماجوج تا قیام قیامت سب علامات کبریٰ ہیں۔ اس حدیث میں ظہور مہدی سے پہلے واقع ہونے والی علامات صغریٰ مراد ہیں۔

قال ان تلد الامة ربتها: یعنی لونڈی اپنے مولی کو جنے گی۔

یہاں سب سے پہلے یہ امر تشریح طلب ہے کہ لفظ "ربتها" میں تائے تانیث کیوں لائے ہیں حالانکہ یہاں لفظ رب بمعنی آقا و مولیٰ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تانیث اس لئے ذکر کی تا کہ رب العباد کے لفظ کے ساتھ لفظی اشتراک بھی نہ آئے۔ اگرچہ خصوصی اضافت کے ساتھ رب کا اطلاق غیر اللہ پر بھی ہوتا ہے۔

اس جملے کے سمجھنے کے لئے علماء نے کئی انداز سے اس کی تشریح وتوضیح فرمائی ہے۔

اول:

یہ کہ نافرمانی بڑھ جائے گی یہاں تک کہ اولاد ماں باپ کے ساتھ ایسا سلوک کرے گی جیسا کہ سردار اپنی لونڈی سے کرتا ہے کہ وہ سردار اسے گالی دیتا ہے، مارتا ہے یا خدمت میں رکھتا ہے۔ یہی سلوک اولاد بھی کرے گی۔ لڑکی کا ذکر اس لئے کہ یہ اطاعت گزار ہوتی ہے جب پردہ نشین لڑکی کا یہ حال ہوگا تو لڑکوں کا کیا حال ہوگا گویا زمانہ کے انقلاب وانعکاس کی طرف اشارہ ہے۔ غلام آقا بن جائے گا تربیت حاصل کرنے والا مربی بن جائے گا۔ اس صورت میں **ربتھا** کا لفظ مجازاً والدین کے لئے استعمال کیا گیا۔

دوم:

یہ ہے کہ بیٹی ماں پر نافرمانی کی کثرت کی وجہ سے ایسا حکم چلائے گی جس طرح سردارنی اپنی لونڈی پر چلاتی ہے۔

سوم:

یہ کہ اس سے اشارہ ہے کہ قرب قیامت میں شرفاء اور باعزت مقام والے لوگ ذلیل ہوجائیں گے اور ذلیل قسم کے لوگ عزت کے مقام پر آجائیں گے جس طرح ماں کا مقام عزت کا ہے پھر بیٹی آقا بن جائے گی تو معاملہ الٹ جائے گا۔

چہارم:

یہ کہ اس میں کثرت فتوحات اسلامیہ کی طرف اشارہ ہے کہ غلام اور آقا زیادہ ہوجائیں گے لونڈیوں کی کثرت ہوجائے گی تو لوگ فساد احوال کی وجہ سے لونڈیوں کو بیچنا شروع کردیں گے اسی خرید وفروخت میں ایسا بھی ہوجائے گا کہ ماں اپنے بیٹے کے ہاتھ میں فروخت ہوجائے گی۔ تو اب بیٹا آقا ہے جس کو اس لونڈی ماں نے جنم دیا ہے تو لونڈی نے آقا کو جن لیا۔

پنجم:

یہ کہ لونڈیوں کی اولاد میں سے بادشاہ بن جائیں گے تو یہ مائیں اس بادشاہ بیٹے کی رعیت میں آجائیں گی تو لونڈی نے آقا کو جنم دیا۔
حافظ ابن حجر علامہ خطابی ملا علی قاری علامہ سندھی اور مولانا ادریس کاندھلوی رحمہم اللہ تعالیٰ سب نے مندرجہ بالا توجیہات میں سے کوئی نہ کوئی توجیہ کی ہے۔

وان تری الحفاۃ العراۃ: یہ بھی انقلاب احوال کی طرف اشارہ ہے کہ:

کیسے کیسے ویسے ویسے ہوگئے ویسے ویسے کیسے کیسے ہوگئے؟

یتطاولون فی البنیان: یعنی عالیشان عمارتوں اور محلات میں ایک دوسرے پر فخر اور تکبر کرنے لگ جائیں گے۔ گویا بکریوں کے چرواہے جو **اعجز خلق اللہ واضعفھم** ہوتے ہیں میں انقلاب اور تغیر آجائے گا کہ وہ تکبر کرنے لگ جائیں گے۔ صرف اونٹوں والے ہی نہیں جو طبعاً متکبر ہوتے ہیں بلکہ بکریوں والے بھی متکبر ہوجائیں گے جو طبعاً متواضع ہوتے ہیں۔

الحفاۃ: جمع حافی ننگے پاؤں پھرنے والے۔ "**العراۃ**" جمع "عاری" ننگے بدن والے۔ "**العالۃ**": عائل کی جمع ہے مفلس آدمی۔ "**رعاء**" جمع راع بمعنی چرواہا۔ "**الشاء**" جمع شاۃ بکریاں۔ "**الصم**": اصم کی جمع ہے بمعنی بہرا۔ **البکم:** بکم کی جمع ہے بمعنی گونگا یعنی حق کے سننے کہنے سے بہرے اور گونگے ہونگے "**یتطاولون**" یعنی فخر وتکبر کریں گے محلات بنانے میں مقابلہ کریں گے۔

فلبثت ملیا: ملاء پُر ہونے کو کہتے ہیں ہاں ملیاً زمانہ طویلہ کے معنی میں ہے۔ اب یہاں یہ اشکال آتا ہے کہ ابوداؤد کی روایت میں اس **ملیًا** کا تعین موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تین دن کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم نے پہچانا کہ یہ کون تھا؟

ادھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے کہ اس مجلس میں آنحضرت ﷺ نے بتادیا کہ یہ جبرائیل تھے، تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔ ان دونوں روایتوں میں تعارض نظر آرہا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سائل کی تلاش میں کئی صحابہ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی چلے گئے۔ اور پھر وہ اپنے گھر گئے اور جب تین دن کے بعد حضور ﷺ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ سائل کون تھا؟ اور آپ کے چلے جانے کے بعد مجلس کے سامنے حضور ﷺ نے حقیقت حال بیان فرمادی کہ یہ جبرائیل تھے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

قلت اللہ ورسولہ اعلم: اعلم کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اللہ اور اس کے رسول کو تو اعلم بتارہے ہیں اور اپنے آپ کو صرف عالم بتارہے ہیں بلکہ یہاں اعلم کا لفظ اسم تفضیل کے معنی میں نہیں بلکہ اصل فعل کے معنی میں آیا ہے جیسے "**الصیف احر من الشتاء**" کہ یہاں "احر" نفس حرارت کے معنی میں آیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ موسم گرما موسم سرما سے زیادہ گرم ہے حالانکہ جاڑوں کا موسم گرم ہوتا ہی نہیں۔ صحابہ کرام نے ہمیشہ ادب کا لحاظ کر کے "**اللہ ورسولہ اعلم**" کا جملہ استعمال کیا ہے۔

فانہ جبرئیل: ای اذا فوضتم العلم الی اللہ ورسولہ فانہ جبرئیل۔ اس عبارت میں فا جزائیہ کے آنے کی وجہ معلوم ہوئی، اللہ تعالیٰ کا علم کلی اور اصلی ہے۔ اللہ کے بتانے سے رسول کو علم ہوجاتا ہے تو ادب کا تقاضا یہی ہے کہ "**اللہ ورسولہ اعلم**" کہے اور صحابہ کرام نے ہمیشہ اس ادب کا خیال رکھا ہے۔

یعلمکم دینکم: یہاں دین اسلام ایمان واحسان اور دیگر علوم خود آنحضرت ﷺ نے بتادیئے لیکن چونکہ جبرائیل امین سائل تھے اور اچھا سوال نصف العلم ہوتا ہے اس وجہ سے مجازاً ان کی طرف "**یعلمکم**" کی نسبت کی گئی۔

اور چونکہ دین اسلام کے اول مخاطبین صحابہ کرام ہی تھے اس لئے "**دینکم**" فرمایا ورنہ یہ دین تو قیامت تک کے لوگوں کے لئے ہے۔ جبرائیل امین کے چلے جانے کے بعد آنحضرت ﷺ کو پتہ چلا کہ یہ جبرائیل امین تھے چنانچہ دارقطنی کی تفصیلی روایت میں مذکورہ عبارت کے بعد یہ ہے:

"**فخذوہ عنہ والذی نفسی بیدہ ما اشتبہ علی منذ اتانی قبل مرتی ھذہ وما عرفتہ حتی ولی**"۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے ورنہ اتنی طویل گفتگو میں آنحضرت ﷺ نے ان کو نہیں پہچانا اور جب اللہ تعالیٰ نے بتادیا تو پہچان لیا بس جب وحی کا کنکشن جڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے ورنہ نہیں سعدی بابا رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے:

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند — کہ اے روشن گہر پیر خرد مند
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی — چرا در چاہ کنعانش ندیدی
بگفت احوال ما برق جہاں است — دمے پیدا ودیگر دم نہاں است
گہے برطارم اعلیٰ نشینم — گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہا:

علم غیبے کس نمی داند بجز پروردگار — ہر کہ گوید ماندانم تو ازو باور مدار
مصطفیٰ ہرگز نہ گفتی تانہ گفتی جبرئیل — جبرئیلش ہم نہ گفتی تا نہ گفتی کردگار

فی خمس: ای علم تعیین الساعۃ فی ضمن خمس لا یعلمھن الا اللہ۔

یہاں سوال یہ ہے کہ مغیبات صرف یہ پانچ تو نہیں ہیں نہ اس میں بند ہیں پھر صرف ان کا ذکر کیوں ہوا؟

جواب یہ ہے کہ یہ سائل کے سوال کے جواب میں چند مغیبات کا ذکر ہے حصر مقصود نہیں ہے۔

اب ایک مسلمان کا یہ عقیدہ ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا علم کلی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے کسی نبی یا فرشتہ کو کلی علم نہیں دیا گیا اور علم جزئی شرعیات میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو وافر مقدار میں دیا تھا اور علم جزئی تکوینیات سے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کو اتنا دیا تھا کہ تمام انبیاء کا علم اس کے مقابلہ میں ایک قطرہ بنسبت دریا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کلی علم کے مقابلہ میں کل اہل اللہ کا علم ایک قطرہ بنسبت دریا ہے۔

ثم قرأ إن اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام وما تدری نفس ماذا تکسب غدا وما تدری نفس بای ارض تموت ان اللہ علیم خبیر۔ (لقمان)

منصور بادشاہ نے خواب میں موت کا فرشتہ دیکھا تو اس سے پوچھا کہ میری عمر کتنی باقی ہے موت کب آئے گی فرشتہ نے پانچ انگلیوں سے اشارہ کردیا منصور پریشان ہوگیا کسی نے تعبیر دی کہ عمر میں پانچ دن باقی ہیں کسی نے کہا پانچ ماہ کا اشارہ ہے کسی نے پانچ سال کا کہا حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے جب پوچھا تو آپ نے فرمایا یہ اشارہ ہے کہ وقت موت پانچ مغیبات میں سے ہے اللہ ہی کے پاس اس کا علم ہے۔

فوائد حدیث جبرائیل برائے طلباء دین:

1. لباس میں سفید تر اور پاکیزہ صاف لباس پہننا چاہیئے۔

❷ حضرت جبرائیل کے شدت سوادِ شعر سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علم دین کے حصول کا اعلیٰ زمانہ جوانی کا زمانہ ہوتا ہے پھر استقامت کا مظاہرہ بھی کرنا چاہئے۔

❸ طالبعلم اپنے استاذ اور مربی کے بالکل قریب بیٹھا کرے یعنی ادب کے ساتھ سامنے قریب ہو کر بیٹھے۔

❹ مفید باتوں کا سوال کرنا چاہئے کیونکہ اچھا سوال نصف علم ہے۔

❺ اپنی لاعلمی پر شرم محسوس نہ کرے بلکہ جو بات معلوم نہیں تو صاف کہہ دیا کرے کہ مجھے معلوم نہیں۔

❻ طالب علم حصول علم کے زمانے میں لوگوں کے ساتھ تعلقات نہ بڑھائے بلکہ گمنام ہو کر اپنے مقصد میں لگا رہے گویا کوئی اس کو جانتا ہی نہیں جس طرح یہاں جبرائیل امین نے اپنے آپ کو چھپا کر گمنام رکھا۔

❼ طالب علم کو چاہیئے کہ ایسے علوم اور وسائل کا اہتمام کرے جو عقائد و اعمال سے متعلق ہوں جن کا دنیا و آخرت میں فائدہ واضح ہو۔

❽ حصول مقصد اور حصول علم کے بعد فوراً اپنے مقصود اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جائے بیکار مدارس میں نہ پڑا رہے۔

۱۶ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

ایمان کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے

﴿۳﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: نبی اکرم ﷺ کا مبارک ارشاد ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے ایک اس عقیدے کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود (حاجت روا اور مشکل کشا عبادت اور بندگی کے لائق) نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، دوسرے نماز قائم کرنا، تیسرے زکوٰۃ ادا کرنا، چوتھے حج کرنا، پانچویں رمضان کے روزے رکھنا۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: حضرت ابن عمر کا نام عبداللہ ہے، مکہ میں اپنے والد کے ساتھ مسلمان ہوئے، بعثت نبوی سے ایک سال پہلے پیدا ہوئے اور بالاتفاق جنگ خندق میں شریک ہوئے، جنگ بدر و احد میں ان کی عمر ۱۵ سال سے کم تھی، اس لئے جنگ میں شریک نہیں ہو سکے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کی طرف دنیا لپک کر آئی اور وہ اس کی طرف مائل نہ ہوا ہو سوائے عمر اور ابن عمر کے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ علم میں کامل، تقویٰ میں اعلیٰ مقام پر فائز، صاحب احتیاط اور صاحب فکر اور متبع سنت صحابی تھے۔ حجاج بن یوسف کی سازش سے ایام حج میں شہید کر دیئے گئے، ۷۳ھ میں ۸۴ سال کی عمر میں دنیا سے چلے گئے۔

بنی الاسلام علی خمس: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اسلام کی تشبیہ ارکان کے دوام و استمرار میں ایک خیمہ و

مکان سے دی ہے، جس میں ایک اصل عمود وستون ہوتا ہے اور باقی اطناب واوتاد ہوتے ہیں، اصل عمود پر خیمہ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے قطب پر باقی ارکان گھومتے ہیں، وہ قطب اور مرکزی ستون کلمہ شہادت ہے اور باقی ارکان اطناب واوتاد ہیں۔
اگر خیمہ کے اطناب واوتاد میں سے کنارے کا کوئی ستون گر جاتا ہے تو اس طرف میں نقص تو آجاتا ہے لیکن خیمہ کھڑا رہتا ہے اور اگر کناروں کے سارے ستون گر جائے مگر بیچ کا عمود اعظم باقی ہو تو نام کا خیمہ پھر بھی باقی ہوگا، اگرچہ اس سے کام نہیں لیا جاسکتا، نہ وہ سایہ کے قابل ہوگا اور نہ گرمی سردی سے بچاؤ کی صلاحیت رکھے گا لیکن اگر خیمہ کا عمود اعظم اور مرکزی قطب کا ستون گر گیا جس پر خیمہ کے قیام کا مدار ہے تو اب نام کا خیمہ بھی باقی نہیں رہے گا اگرچہ کناروں کے چاروں ستون موجود ہوں مگر وہ خیمہ کو گرنے سے نہیں بچا سکیں گے اور یہ خیمہ زمین بوس ہو جائے گا، بعینہ یہی تشبیہ اور یہی صورت حال اسلام کی عالیشان عمارت کی ہے، جس میں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج چار ستون ہیں جو کناروں میں واقع ہیں اور کلمہ شہادت بیچ کا عمود اعظم ہے، اگر باقی ارکان میں نقص آتا ہے تو اس عمارت میں تو نقص آجائے گا مگر عمارت باقی رہتی ہے لیکن اگر کلمۂ شہادت کے رکن میں نقص آ گیا اور اس کا وجود قائم نہ رہا یا قائم ہونے کے بعد ختم ہو گیا تو اب اسلام کی عمارت باقی نہیں رہ سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جنازے میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات مشہور شاعر فرزدق سے ہوئی تو آپ نے ان سے پوچھا:

ما اعددت لمثل هذا المقام؟ فقال شهادة ان لا اله الا الله منذ كذا سنة فقال هذا العمود فاين الأطناب؟

تو اس حدیث میں پانچ مشہور اصول دین اور مشہور ارکان کا ذکر کیا گیا ہے جو فرضیات عینیہ ہیں، اس کے علاوہ باقی تمام اعمال اس کے ضمن میں ہیں کیونکہ شہادت سے مراد **تسليم بجميع ماجاء به النبي صلى الله عليه وسلم** ہے اس میں اسلام کے تمام احکام آگئے، خلاصہ یہ ہے کہ مشہور ارکان کا ذکر کیا، باقی کی نفی مراد نہیں یعنی فرضیات عینیہ کا ذکر کیا، فرضیات کفایہ وغیرہ کی نفی مقصود نہیں۔

سؤال: فقہاء کرام نے قبول اسلام کے لئے صرف شہادتین کو کافی سمجھا ہے حالانکہ بناء اسلام پانچ اشیاء پر ہے؟

جواب: اس کا جواب واضح ہے کہ شہادتین کے ضمن میں پورا اسلام اپنے تمام محاسن کے ساتھ ملحوظ اور مراد ہے۔

سؤال: یہ ہے کہ اس روایت سے اسلام کا صرف پانچ چیزوں پر مبنی ہونا معلوم ہوتا ہے اور اگلی روایت میں **بضع و سبعون شعبة** فرمایا ہے تو تطبیق کیا ہے؟

جواب: اس کا جواب بھی گزر گیا ہے کہ پانچ تو مشہور و معروف ارکان ہیں اور ان معروف اور غیر معروف سب کو ملا کر ستر سے کچھ اوپر بنائے جاتے ہیں۔

شهادة: اعراب کے اعتبار سے یہ کلمہ مجرور بھی ہے کہ یہ بدل ہے خمس سے اور وہ مجرور ہے اور منصوب بھی ہے **اعنی** فعل محذوف کی وجہ سے "**اي اعني شهادة... الخ**" اور یہ کلمہ مرفوع بھی ہے کہ یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے یعنی "**احدها شهادة... الخ**"۔

شہادتین کو عام طور پر ایک خصلت شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں تلازم ہے کبھی کبھی الگ بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ حج کے ساتھ استطاعت کا ذکر بوجہ شہرت نہیں کیا، اقام الصلوٰۃ میں نفس نماز مقصود نہیں بلکہ تمام آداب وفرائض ومحاسن کے ساتھ اس کا قیام مقصود ہے، ایتاء الزکاۃ میں استمرار کی طرف اشارہ ہے حج کا درجہ موخر ہے کیونکہ حج سات یا آٹھ یا نو ہجری کو فرض ہوا ہے اور روزہ تین ہجری میں فرض ہوا مگر ترتیب کا لحاظ راوی نے نہیں رکھا، یہ تصرف رواۃ میں سے ہے، اس حدیث سے مرجئہ پر صریح رد ہے جو اعمال کو نظر انداز کرتے ہیں۔

ارکان خمسہ میں ترتیب:

❶ عبادات دو قسم پر ہیں یا قلب سے متعلق ہوں گی یا غیر قلب سے متعلق ہوں گی، اول کی مثال شہادتین ہے جو تصدیق قلبی کا نام ہے، غیر قلب سے جو متعلق ہیں وہ پھر دو قسم پر ہیں، ایک وہ ہیں جن کا تعلق کرنے سے ہے، دوسرے وہ ہیں جن کا تعلق کسی فعل کے چھوڑنے سے ہے، یہ دوسری قسم روزہ ہے جس میں کھانا پینا اور جماع ترک کیا جاتا ہے، اول قسم عبادت پھر تین قسم پر ہے، یا صرف بدن سے متعلق ہوگی وہ نماز ہے، یا صرف مال سے متعلق ہوگی، وہ زکوٰۃ ہے، یا مشترک ہوگی وہ حج ہے۔

❷ یا ترتیب کو یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی دو قسم کی صفات ہیں، صفات جمالیہ اور صفات جلالیہ تو صلوٰۃ کا تعلق صفات جلالیہ سے ہے کہ بندہ معبود کے سامنے کمال عبودیت اور کمال عاجزی سے پیش ہو کر آتا ہے اور ذوالجلال کے سامنے زمین پر ناک رگڑتا ہے۔

زکوٰۃ بھی صفات جلالیہ سے ہے کیونکہ انسان ممسک ہے "و انه لحب الخير لشديد" اس حالت میں مال خرچ کرنا اور رضائے خدا میں زکوٰۃ دینا عظمت جلال کی جلالیت کی نشانی ہے۔

روزہ اور حج مظہر جمال ہیں اول میں عاشق اپنے محبوب کے لئے بھوکا رہتا ہے اور دوسرے میں عاشق محبوب کے لئے گھر بار بیوی بچوں کو چھوڑ کر محبوب کے مکان کی طرف جاتا ہے وہاں پہنچ کر طواف کرتا ہے۔

کبھی دوڑتا ہے کبھی در و دیوار کو بوسہ دیتا ہے۔

امر علی الدیار دیار لیلی اقبل ذا الجدار وذا الجدارا

وما حب الدیار شغفن قلبی ولکن حب من سکن الدیارا

ومن عادتی حب الدیار لاھلھا وللناس فیما یعشقون مذاھب

❸ یا ارکان خمسہ کی ترتیب میں یوں کہیں کہ ارکان خمسہ میں سے پہلے شہادتین ہے یہ قولی عبادت ہے اور زبانی طور پر محبوب کا تذکرہ ہے عاشق کا سب سے پہلا کام یہی ہوتا ہے نظم ونثر کے سارے داؤ پیچ اسی زبانی تذکروں کے گرد گھومتے پھرتے ہیں۔ دوسرا کام محبوب کی انتہائی تعظیم ہوتی ہے یہی صلوٰۃ اور نماز ہے جو مجموعہ تعظیم الٰہی ہے۔ عاشق کا تیسرا کام محبوب کے لئے مال لٹانا ہوتا ہے زکوٰۃ اسی کا نام ہے۔ عاشق کا چوتھا کام محبوب کے لئے بھوکا رہنا ہے روزہ اسی کا نام ہے۔ عاشق کا

پانچواں کام محبوب کے لئے اپنا گھر بار چھوڑنا ہوتا ہے اور محبوب کے گھر اور اس کے کھنڈرات میں جا کر گھومنا ہوتا ہے۔ حج اسی کو کہا جاتا ہے اس لئے فرمایا بنی الاسلام علی خمس ... الخ۔

۱۷ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

ایمان کی شاخیں

﴿۴﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اَلْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَأَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، ان میں سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ تو "لا الہ الا اللہ" کا اقرار ہے اور سب سے کم تر شعبہ کسی تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹانا ہے اور حیاء ایمان کی اہم شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: **هريرة: هرة** کی تصغیر ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے نام ونسب میں بہت اختلاف ہے، اصل نام میں تقریباً تیس اقوال ہیں مشہور یہ ہے کہ آپ کا نام جاہلیت میں عبد الشمس یا عبد عمرو تھا۔

اسلام لانے کے بعد ان کا نام عبد اللہ یا عبد الرحمان تھا، احمد وحاکم نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں صحیح تر تحقیق یہ ہے کہ ان کا نام اسلام میں عبد الرحمان بن صخر تھا، آپ کا تعلق دوس قبیلہ سے تھا، آپ کی کنیت اتنی غالب آگئی کہ گویا آپ کا اور کوئی نام ہی نہ تھا، ۷ ہجری جنگ خیبر کے موقع پر آپ اسلام لائے تھے، پھر آپ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ چمٹ گئے، ملازمہ ومواظبہ کیا، علم دین سیکھنے کے شوقین تھے، بھوکے پیٹ رہتے تھے، حضور اکرم ﷺ جہاں جاتے آپ ساتھ رہتے، اس ساتھ رہنے اور آنحضرت ﷺ کی دعا کی برکت سے تمام صحابہ میں سب سے زیادہ تیز حافظہ کے مالک تھے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آٹھ سو سے زیادہ صحابہ وتابعین نے آپ سے علم حاصل کیا ہے۔

ابو ہریرہ کنیت پڑنے کی وجہ خود ابو ہریرۃ کی روایت سے ابن عبد البر نے نقل کیا ہے، فرمایا کہ میں نے ایک دن آستین میں بلی اٹھا رکھی تھی کہ مجھے حضور اکرم ﷺ نے دیکھا اور پوچھا یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ یہ بلی ہے یعنی "هرة" آپ نے فرمایا "فانت ابو هريرة" بس یہ کہنا تھا کہ اصل نام غائب ہو گیا اور کنیت غالب آگئی، آپ کی کل مرویات ۵۳۶۴ ہیں ۵۹ھ کو مدینہ منورہ میں ۸۷ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

الايمان: ای ثمرات الایمان وفروعه لان الایمان هو التصدیق البسیط۔

بضع: وبضعة دونوں روایتیں ہیں، مونث کے لئے **بضعة** تانیث کے ساتھ اور مذکر کے لئے **بضع** ہوتا ہے، پھر تین سے نو تک عدد میں زیادہ تر استعمال ہوا، **بضع** کا مادہ جتنا الٹ پلٹ کر کے رکھو گے سب میں ٹکڑا اور قطعة کا مفہوم ہوگا مثلاً **بضع، عبض، ضبع، ضبعة عضب** سب قطعہ کے معنی پر ہے۔

سوال: یہاں ایک واضح اشکال ہے کہ اس حدیث میں "بضع وسبعون" کا ذکر ہے، بخاری شریف میں "ستون" کا ذکر ہے، ایک روایت میں صرف "ستون" ہے، ایک اور میں "اربع وستون" کا ذکر ہے، سب میں تضاد ہے اس کا کیا جواب ہے؟

پہلا جواب: اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ عدد اقل عدد اکثر کی نفی نہیں کرتا ہے بلکہ ساکت رہتا ہے جس میں تعارض نہیں آتا ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ من جانب اللہ تمام شعبے مکمل نہ تھے، تو پہلے ساٹھ کا ذکر تھا، پھر بذریعہ وحی ستر کا حکم آ گیا۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ راجح "بضع وسبعون" والی روایت ہے کیونکہ یہ کثرت سے آئی ہے۔ تیسرا جواب یہ کہ بعض شعبوں میں تداخل کر کے کم کا ذکر کیا جاتا ہے اور جب تداخل نہ کیا جائے تو زیادہ کا ذکر ہو جاتا ہے۔ ویسے ان اعداد کو اگر تکثیر پر حمل کیا جائے تو پھر تحدید کا مسئلہ ہی نہیں رہتا ہے تو پھر تعارض ہی نہیں، تکثیر کے لئے عدد کا آنا معروف ہے۔

شعبة: لغت میں شاخ اور غصن الشجر کو کہتے ہیں یہاں خصلت محمودہ خصلت حمیدہ مراد ہے۔

فافضلها: فا تفریعیہ تفصیلیہ ہے یا جزائیہ ہے یعنی **اذا کان الایمان ذا شعب فافضلها.........الخ**۔

وادناها: اگر ادنیٰ دنو سے قرب کے معنی میں ہے تو مطلب یہ ہوگا "**اقربها منزلة**" یعنی قرب وتقرب کے حصول میں قریب تر "**اماطة الاذی**" ہے، ایک روایت میں "**ارفعها**" بھی ہے جو دنو بمعنی تقرب کی تائید ہے اور اگر ادنیٰ دنائت سے لیا جائے تو پھر کم تر اور حقیر کے معنی میں ہوگا۔ یعنی کم تر شعبہ "**اماطة الاذی**" ہے سیاق سباق سے یہ زیادہ مناسب ہے۔

اماطة: باب افعال کا مصدر ہے، ہٹانے کے معنی میں ہے "**الاذی**" تکلیف دہ اور گندی چیز جیسے پتھر کانٹے، غلاظت وغیرہ۔ تو اس حدیث میں شعبہ اولیٰ عبادات قولیہ سے متعلق ہے، شعبہ ثانیہ طاعات فعلیہ سے متعلق ہے یا پہلا شعبہ معاملہ مع الحق سے وابستہ ہے اور شعبہ ثانیہ معاملہ مع الخلق سے وابستہ ہے۔

والحیاء شعبة من الایمان: سوال یہ ہے کہ حیاء خود ایمان کے شعبوں میں داخل ہے پھر اس کو الگ کیوں ذکر کیا گیا؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ **تخصیص بعد التعمیم** ہے اور یہ حیاء کی شان بڑھانے کے لئے ہے یہی وجہ ہے کہ شعبة میں تنوین تعظیم کے لئے ہے یعنی حیاء ایمان کے شعبوں میں سے ایک عظیم الشان اور اہم شعبہ ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیاء تمام شعب ایمان پر حاوی ہے اور تمام شعبوں کے لئے سبب اور داعی ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے انسان خصائل حمیدہ حاصل کر سکتا ہے اور اس پر قائم رہ سکتا ہے اس لئے اس کو الگ ذکر کیا گیا۔

حیاء کی تعریف اور قسمیں:

حیاء کی بڑی دو قسمیں ہیں: ایک حیاء ایمانی دوسری حیاء طبعی، یہاں حدیث میں حیاء سے حیاء ایمانی شرعی مراد ہے جس کی ایک تعریف اس طرح ہے: "**هو خلق یمنع الشخص من الفعل القبیح بسبب الایمان**"۔

یعنی حیاء اس ملکہ اور خلق کا نام ہے جو آدمی کو ایمان کی وجہ سے قبیح فعل سے منع کرتی ہے۔ جیسے ننگا ہونا، لوگوں کے سامنے فحش

حرکات کرنا، زنا کرنا، وغیرہ وغیرہ، ان چیزوں سے یہ ایمانی شرعی حیاء منع کرتی ہے۔
حیاء ایمانی کی دوسری تعریف جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا نظارہ کر کے اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں کو دیکھ کر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے یہی حیاء ہے۔
حیاء ایمانی کی تیسری تعریف اس طرح کی گئی ہے "**ان لا یراك مولاك حیث نهاك**" اس تعریف کے پیش نظر حیاء بعینہ احسان کا مقام ہے، اس لئے یہ حدیث، حدیث جبرائیل کے لئے بمنزلہ اجمال ہے، حدیث جبرائیل میں تین چیزوں کا بیان تھا: ایمان، اسلام اور احسان، اس حدیث میں "**فافضلها**" سے ایمان کی طرف اشارہ ہے اور "**ادناها**" میں اسلام کی طرف اشارہ ہے اور "**والحیاء**" میں احسان کی طرف اشارہ ہے۔
حیاء طبعی کی تعریف اس طرح ہے "**هو تغیر وانكسار یعتری المومن من خوف مایلام علیه**" مطلب یہ ہے کہ قابل ملامت کام کے خوف سے جب کسی شخص کے اعضاء اور بدن پر انقباض طاری ہو جاتا ہے یہی حیاء طبعی ہے۔
ان دونوں تعریفوں کے فرق اور اس تشریح سے علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ حیاء تو غیر مسلموں میں بھی ہوتی ہے تو کیا ان میں ایمان کا شعبہ آ گیا؟
جواب واضح ہے کہ حدیث میں ایمانی حیاء کو ایمان کا شعبہ کہا گیا ہے، طبعی حیاء حدیث کا مصداق نہیں۔
دوسرا جواب علی حد فتح یفتح ہے یعنی فتح یفتح باب کے لئے ضروری ہے کہ اس میں حرف حلقی ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاں حرف حلقی آ جائے وہاں فتح یفتح کا باب ہوگا اسی طرح ایمان کے لئے حیاء ضروری ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ جہاں حیاء ہو وہاں ایمان ہوگا۔ حیاء کی چند اقسام بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

❶ حیاء جنایت:

جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی حیاء تھی کہ سر جھکائے جنت میں بھاگ رہے ہیں، اللہ نے فرمایا کیوں بھاگتے ہو؟ فرمایا: "**حیاء منك یا الله**"۔

❷ حیاء حشمت:

جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مذی سے متعلق مسئلہ حشمت و حجاب کی وجہ سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں پوچھا بلکہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ وغیرہ کے واسطہ سے سوال کیا۔

❸ حیاء اجلال:

کہ جلال کی وجہ سے حیاء آئی جیسا کہ "**تسربل اسرافیل بجناحیه حیاء من الله لاجلاله**"۔ شعب ایمان پر کئی علماء نے کئی تصنیفات لکھی ہیں۔

۱۸ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

مومن اور مسلم کا مفہوم

﴿۵﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللهُ عَنْهُ. هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ. وَلِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ اَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ؟ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ ۔[۱]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان (کی ایذا) سے مسلمان محفوظ رہیں اور اصل مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دے، یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور مسلم کی روایت میں ارشاد ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ کے ضرر سے مسلمان محفوظ رہیں۔

توضیح: عمرو: واؤ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے تاکہ عمر اور عمرو میں فرق آجائے، عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قریشی ہیں، اپنے والد صاحب سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، باپ سے گیارہ یا بارہ یا تیرہ سال چھوٹے تھے، کثیر العلم اور کثیر العبادۃ صحابی تھے، کثرت سے رونے کی وجہ سے آخری عمر میں بینائی چلی گئی حدیث کے کاتب تھے۔ مکہ یا طائف اور یا مصر میں ۵۶ ہجری میں انتقال کر گئے تھے رحمه الله رحمة واسعة ۔[۲]

المسلم: اس سے کامل مسلمان مراد لیا جاتا ہے تاکہ یہ اعتراض نہ آئے کہ جس کے ہاتھ و زبان سے عام مسلمان محفوظ نہ ہوئے تو کیا وہ شخص مسلمان نہیں رہے گا؟ تو عام شارحین کامل مسلمان مراد لیتے ہیں لیکن اس تقدیر نکالنے سے شارع علیہ السلام کی غرض فوت ہو جاتی ہے، اس لئے کامل کے ساتھ ترجمہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ حصر ادعائی ہے کہ مسلمان تو بس وہی ہے جس کے ہاتھ و زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔[۳]

یہاں مبتدا اور خبر دونوں معرفہ ہیں اس کا فائدہ بھی یہی حصر ہے نیز عربی محاورہ بھی ہے کہ "الناس العرب، المال الابل یہ سب حصر ادعائی کے قبیل سے ہیں یعنی افضل المال الابل، افضل الناس العرب تو الف الام جنسی مدح کے لئے ہے، شاہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ علمی تحقیق اور قیودات کی تدقیق و تعمیق کی حد تک تو یہ قید لگانا درست ہے لیکن یہ تاویل اس لئے مناسب نہیں کہ اس سے کلام میں زور باقی نہیں رہتا اور مقصود شارع فوت ہو جاتا ہے، اس قسم کی تمام احادیث کا یہی مطلب لینا چاہیے۔

یعنی مسلم تو وہی ہے جس میں سلامتی ہو مہاجر تو وہی ہے جس میں ہجرت عن المعاصی ہو، مجاہد تو وہی ہے جس میں جہد فی العمل ہو، وہ کیا مسلمان جس میں سلامتی کا مادہ نہیں، وہ کیا مہاجر جس میں ہجرت کا مادہ نہیں اور ہجرت کی صفت نہیں، وہ کیا مجاہد جس

---

[۱] اخرجه البخاری ۱/۹ [۲] المرقات ۱/۱۴۲، ۱۴۳ [۳] المرقات ۱/۱۴۳

میں جہد عمل اور مشقت عبادت نہیں۔ [۱]

سؤال: یہاں یہ اعتراض ہے کہ سلامتی کی صفت اگر کسی غیر مسلم میں آجائے یا مسلم میں صرف سلامتی ہو، باقی ارکان نہ ہوں تو کیا وہ بھی کامل مسلم ہو جائے گا؟

جواب: یہ باب فتح یفتح کے قبیل سے ہے کہ اس کے لئے حرف حلقی کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاں حرف حلقی آجائے وہاں فتح یفتح کا باب ہوگا، اسی طرح مسلم کے لئے سلامتی ضروری ہے لیکن اگر یہ صفت غیر مسلم میں آجائے تو ضروری نہیں کہ مسلمان کہلائے، مسلمان کے لئے یہ اوصاف ضروری ہیں۔

المسلمون: یہاں ایک اشکال ہے کہ ایذاء رسانی سے حفاظت کو صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص کیا گیا حالانکہ ناجائز ایذارسانی تو کسی کافر بلکہ جانور کی بھی منع ہے جس طرح کہ احادیث وقرآن میں اس کی تصریح ہے تو یہاں المسلمون کو کیوں خاص کیا گیا ہے۔

جواب: چونکہ مسلمانوں کی ایذاء رسانی سے بچنے کی اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ہے اس لئے اس کا ذکر کیا گیا ہے، یہ قید احترازی نہیں بلکہ قید اتفاقی ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے ورنہ ناحق طور پر ایذا کسی مرد وزن، مسلم وغیر مسلم بلکہ جانور کی بھی جائز نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں المسلمون کی جگہ **من سلم الناس من لسانه ویده** کے الفاظ آئے ہیں اور **المؤمن من امنه الناس علی دمائهم واموالهم** کے الفاظ مذکور ہیں۔ [۲]

اس کے بعد یہ بھی ملحوظ رہے کہ حدود اللہ کی تنفیذ اور اجراء، تعزیرات، ضرب اطفال، جہاد فی سبیل اللہ یہ سب امور اصلاح کے لئے ہیں، یہ عرفاً ایذا نہیں یا شرعاً مستثنیٰ ہیں اور "المسلمون" کہہ کر جہاد کو الگ کر دیا گیا ہے کیونکہ جہاد کفار سے ہوتا ہے، بہر حال حدیث میں بلا وجہ اور بلاغرض صحیح ناحق طور پر ایذارسانی سے منع کیا گیا ہے صحیح وجہ اور معقول سبب سے سزا دینا منع نہیں ہے۔

من لسانه: ایذاء لسانی میں سب وشتم، لعن طعن، غیبت، چغلخوری، بہتان وغیرہ سب داخل ہیں، زبان کو "ید" پر مقدم کیا اس لئے کہ زبان کی ایذاء، زندوں، مردوں، حاضرین، غائبین، اگلوں، پچھلوں اور ابرار وفجار سب کو عام ہے یا اس لئے مقدم کیا کہ زبان کی کاٹ بڑی سخت ہوتی ہے تو اس کی ایذا عام بھی ہے اور تام بھی ہے کسی نے عربی میں کہا ہے۔ [۳]

جراحات السنان لها التيام　　ولا يلتام ما جرح اللسان [۴]

کسی نے فارسی میں کہا ؎

جراحت نیزہ را گردد بدارو　　ولے جرح زباں را نیست دارو

"**من لسانه**" کا لفظ اختیار کیا "**من قوله**" نہیں فرمایا کیونکہ بعض اوقات خود زبان کی کیفیت فعلی سے ایذاء دی جاتی ہے،

---

[۱] للکاشف ۱/۱۱۱،۱۱۲　[۲] المرقات ۱/۱۳۳　[۳] المرقات ۱/۱۳۳　[۴] المرقات ۱/۱۳۳

مثلاً زبان نکال کر مذاق واستہزاء کیا جاتا ہے تو "لسانه" اس کو بھی شامل ہے۔

ویده: ہاتھ کی ایذاء رسانی میں ضرب، قتل، ہدم، دھکا دینا اور کسی کے خلاف ناجائز تحریر لکھ دینا یا ہاتھ سے اشارہ کر کے ایذا پہنچانا سب داخل ہیں۔

ہاتھ بول کر کنایہ سب اعضاء سے کیا گیا ہے کیونکہ ہاتھ ہی سے تمام افعال کا ظہور ہوتا ہے، اس لئے بطور خاص ہاتھ کا ذکر ہوا ہے، ہاتھ سے مراد ظاہری ہاتھ بھی ہے اور اس سے معنوی ہاتھ یعنی کسی چیز پر قبضہ جمانا اور ناجائز طور پر دبانا بھی داخل ہے۔[1]

والمهاجر: ایک ہجرت ظاہری ہوتی ہے جو ترک وطن لاجل الدین ہوتی ہے اس ہجرت سے متعلق پہلے بھی بحث ہوئی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی کسی مقام پر تفصیل آئے گی، دوسری ہجرت باطنی ہوتی ہے یعنی "**ترك ما تدعو اليه النفس الامارة**" یا "**ترك ما نهى الله عنه**" یہ دوسرا اطلاق لغوی مفہوم کی روشنی میں ہوتا ہے جس میں مہاجر کے مبدء اشتقاق کے حوالہ سے بات ہوئی ہے۔[2]

مثلاً مذکورہ حدیث میں یہی مفہوم ہے کہ ایک شخص گھر بار چھوڑ کر وطن واعزہ سے الگ ہو جاتا ہے، لحہ لحہ مشقتیں اٹھاتا ہے، یہ اس لئے ہوتا ہے تاکہ یہ شخص دور جا کر اپنے رب کی اطاعت کرے اور گناہوں سے اجتناب کرے، اب اگر ایک مہاجر گناہ کو ترک نہیں کرتا ہے اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس کو مہاجر کہا جائے۔

ای المسلمین خیر؟: یعنی مسلمانوں میں سب سے بہتر مسلمان کون ہوتا ہے۔

سؤال: یہاں ایک مشہور اشکال ہے اور وہ یہ ہے کہ احادیث میں "**ای المسلمین خیر**" کی طرح "**ای الاسلام احب**" یا "**ای الاعمال افضل**" وغیرہ مختلف سوالات، آنحضرت ﷺ سے کئے گئے ہیں اور سب کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی اعمال میں سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ ان سب کا جواب بظاہر ایک ہی آنا چاہئے اس لئے کہ سب سے افضل تو ایک ہی عمل ہو سکتا ہے لیکن احادیث میں جوابات مختلف آرہے ہیں؟

چنانچہ یہاں مذکورہ حدیث میں "**من سلم المسلمون من لسانه**" آیا ہے، بعض روایات میں "**ای الاسلام خیر**" کے جواب میں "**تطعم الطعام وتقرأ السلام**" آیا ہے، بعض روایات میں "**ای الاعمال افضل**" کے جواب میں "**الصلوٰة لوقتها**" آیا ہے اور اسی سوال کے جواب میں بعض جگہ "**الایمان بالله**" آیا ہے اور بعض جگہ "**الجهاد فی سبیل الله**" آیا ہے اور بعض میں "**بر الوالدین**" آیا ہے، اس قسم کے اور سوالات وجوابات احادیث میں مذکور ہیں، جب سوال ایک ہی ہے مقصود بھی ایک ہے کہ افضل کون سا عمل ہے تو جوابات کیوں مختلف آئے ہیں؟

جوابات:

❶ سائلین کے احوال کے اعتبار سے جواب دیا گیا ہے جس میں جو کمی محسوس کی گئی اسی کی ترغیب میں جواب دیا گیا، یا جس میں جو استعداد دیکھی اسی کے موافق دیا۔

---

[1] المرقات ۱/۱۳۳ [2] المرقات ۱/۱۳۳

❷ زمانے کے احوال کے اعتبار سے جواب دیا گیا ہے، حج کے زمانہ میں حج کی ترغیب کے لئے اس کو سب سے افضل کہا، جہاد کے زمانے میں جہاد کو سب سے افضل کہا، نمازوں کے اوقات کے وقت نماز کی ترغیب دے دی گئی، کسی اور قربانی و ایثار کے وقت اس کی ترغیب کو افضل کہہ دیا گیا۔

❸ امام طحاوی عشاللہ نے فرمایا کہ افضل ایک نوع ہے جس کے تحت ایک فرد نہیں بلکہ کئی افراد ہیں اب جن جن اشیاء پر افضلیت کا حکم لگایا گیا ہے وہ سب اسی نوع کے تحت داخل ہیں یہ افراد ایک دوسرے کے معارض نہیں بلکہ معاون و موافق ہیں۔

❹ علامہ شبیر احمد عثمانی عشاللہ نے فرمایا کہ افضلیت کے اعتبارات مختلف ہیں مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں "ارحم امۃ" کے اعتبار سے حضرت عمر "اشدھم فی امر اللہ" کے اعتبار سے افضل ہیں، حضرت عثمان "اصدقھم حیاء" کے اعتبار سے افضل ہیں اور حضرت علی "اقضاھم" کے لحاظ سے افضل ہیں تو کوئی تضاد و تعارض نہیں، جہات فضیلت مختلف ہیں۔

۱۹ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

حضور اکرم ﷺ سے محبت کے درجات

﴿۶﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ میں اس کو اس کے باپ، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: انس بن مالک بن نضر الانصاری الخزرجی رضی اللہ عنہ، دس سال کی عمر میں ان کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا ان کو نبی اکرم ﷺ کے پاس اس وقت لے آئیں جب کہ ان کے والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی والدہ نے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا تھا، ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور اکرم ﷺ سے فرمایا "خویدمك ادع اللہ لہ" آنحضرت ﷺ نے مال و اولاد کی برکت کی دعا اس طرح فرمائی: "اللّٰھم بارك فی مالہ وولدہ واطل عمرہ واغفر ذنبہ" اس دعاء کا یہ اثر ہوا کہ خود فرماتے ہیں میں نے اپنے ہاتھ سے ۹۸ بچے دفن کئے ہیں پھل کا یہ عالم تھا کہ سال میں دو دفعہ فصل آتی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعلیم حدیث و فقہ کے لئے بطور معلم بصرہ بھیجا تھا، فرمایا کہ اب طول عمر سے اکتا گیا ہوں اور آنحضرت ﷺ کی آخری دعاء مغفرت کی امید رکھتا ہوں۔ دس سال تک بطور خاص حضور اکرم ﷺ کے خادم رہے اور سو سال سے کچھ زیادہ عمر پا کر بصرہ میں ۹۳ھ میں انتقال کر گئے۔[2]

---

[1] اخرجہ البخاری ۱/۷ ومسلم: ۱/۴۹ [2] المرقات ۱/۱۴۴

احب الیہ من والدہ: احب محبوب کے معنی میں ہے۔ **والدہ:** عاقل کے نزدیک اہل و مال بلکہ اپنے نفس سے بھی والد اور ولد معزز ہوتے ہیں چنانچہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے مگران کو بچاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث انس میں "نفس" کا لفظ نہیں اور دوسری روایات میں ہے اس میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ جب والد کا لفظ آ گیا تو والد تو نفس سے زیادہ عزیز ہے لہٰذا نفس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

حدیث میں "**والد**" کو "**ولد**" پر مقدم کیا ہے کیونکہ والد وجود کے اعتبار سے مقدم بھی ہے اور معظم بھی ہے۔ اور اگر ولد مقدم ہو جیسے صحیح مسلم کی روایت میں ہے تو پھر شفقت کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے، والد سے مراد من لہ الولد ہے جو ماں کو بھی شامل ہے لہٰذا والد سے مراد والد اور والدہ دونوں ہیں، یہ سب بطور تمثیل ہے، مراد عام اعزہ اصول و فروع نفس اور مال ہے اس کے بعد[1] "**والناس اجمعین**" میں تعمیم بعد تخصیص ہے جس میں تمام انسان آ گئے۔

اقسام محبت:

ابن بطال رحمہ اللہ نے محبت کو تین انواع پر تقسیم کیا ہے:

1. محبت اجلال و عظمت جیسے والدین سے محبت ہوتی ہے۔
2. محبت شفقت جیسے اولاد کی محبت ہے۔
3. محبت لذت جیسے میاں بیوی کی محبت ہوتی ہے اس حدیث میں ان تینوں قسموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"**والد**" سے پہلی قسم، **ولد** سے دوسری قسم اور **والناس اجمعین** سے تیسری قسم کی طرف اشارہ ہے۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ محبت یا بڑے سے ہوتی ہے یا چھوٹے سے اور یا مساوی سے ہوتی ہے۔ حدیث میں **والدہ** سے بڑے، **ولدہ** سے چھوٹے، **والناس اجمعین** سے مساوی کی طرف اشارہ ہے تینوں قسم محبت آ گئی۔

سُؤال: یہاں یہ مشہور اشکال ہے کہ اس حدیث میں محبت رسول کو ایمان کے لئے معیار بنایا گیا ہے جب کہ طبعی محبت والدین اور اولاد کے ساتھ زیادہ ہوتی ہے تو پھر کون مومن رہے گا، نیز محبت غیر اختیاری چیز ہے اس کو ایمان کا معیار کیسے بنایا گیا؟

جَواب: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ محبت کی تین قسمیں ہیں:

اول: محبت طبعی ہے جیسے اولاد و والدین وغیرہ سے محبت ہوتی ہے، یہ غیر اختیاری ہوتی ہے۔ یہ قسم خارج عن البحث ہے کیونکہ "**لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا**" ہے، قاضی بیضاوی رحمہ اللہ اور علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں طبعی محبت مراد نہیں۔

دوم: محبت عقلی ہے وہ یہ کہ ایک کام خواہش کے خلاف ہے طبیعت اس سے انکار کرتی ہے لیکن عقل کہتی ہے کہ اس میں فائدہ ہے تو یہ شخص اس کام کو کرتا ہے یا اس چیز کو استعمال کرتا ہے اگرچہ مزاج اور خواہش کے خلاف ہے مثلاً مریض ہے وہ کڑوی دوا کو طبعاً مکروہ سمجھتا ہے نہار منہ کریلے کا پانی سوہان روح سمجھتا ہے مگر عقلاً بیماری کے پیش نظر اس کو اچھا سمجھتا ہے

[1] المرقات ۱/۱۴۴، ۱۴۵

کیونکہ اس میں شفاء ہے بالکل اسی طرح یہاں یہ محبت ہے کہ مثلاً حضور ﷺ کا حکم آجائے کہ یہ کام کرو اور والدین واولاد کا حکم آجائے کہ یہ کام نہ کرو تو اگرچہ طبعی میلان والدین کی طرف ہے لیکن عقل کہتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا حکم مان لو کیونکہ اس میں اخروی فائدہ ہے مثال کے طور پر حضور اکرم ﷺ کسی کو اپنے والدین کے قتل کرنے کا حکم دیتے ہیں اولاد کے قتل کا حکم دیتے ہیں کیونکہ وہ کفار ہیں یا کفار سے جہاد کا حکم دیتے ہیں تو طبعاً یہ کام بھاری ہے مگر عقل کہتی ہے کہ فلاح دارین اسی میں ہے اس پر عمل کرنا ہے تو وہ شخص اس پر عمل کرتا ہے یہ عقلی تقاضا ہے، حدیث میں ہم سے جس محبت کا مطالبہ ہے وہ یہی محبت عقلی ہے نہ کہ محبت طبعی جو غیر اختیاری بھی ہے۔

سوم: محبت ایمانی شرعی ہے یہ بھی یہاں مطلوب ہے اور وہ یہ ہے کہ "ایثار جمیع اغراض المحبوب علی اغراض غیرہ حتی القریب والنفس و هذا الحب هو الناشی عن الایمان والاجلال والتوقیر والرحمة"۔ [1]

بعض شارحین نے "لا یومن" میں "لا" کمال کے لئے لیا ہے کہ کامل مومن نہیں ہوسکتا ہے۔

بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ آپ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ:

لانت احب الی من کل شیء الا من نفسی قال علیہ السلام لا حتی اکون احب الیک من نفسک فقال عمر فانک الآن احب الی من نفسی فقال علیہ السلام الآن یا عمر۔

اس واقعہ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے طبعی محبت کا تقاضا کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا وہ کیسے ہو سکتی ہے تب آنحضرت ﷺ نے توجہ کا پرتو ڈالا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طبعی محبت کا اقرار کیا تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اب ایمان کامل ہو گیا۔ [2]

حضرت سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میرا ذوق ہے کہ اس حدیث میں محبت سے مراد وہ محبت ہے جس کی ابتداء عقلی ہو اور انتہاء طبعی ہو کیونکہ صحابہ کرام نے اسی طبعی محبت کا عملی ثبوت پیش کیا ہے۔

❶ مثلاً حضور اکرم ﷺ کا جب وصال ہوا تو صدمہ کو صحابہ برداشت نہ کر سکے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تو وقتی طور پر وفات کا انکار ہی کر دیا، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ غم کی وجہ سے کسی کے سلام سننے یا جواب دینے کے قابل نہ رہے، کچھ صحابہ تو مدینہ منورہ کو چھوڑ کر شام وغیرہ چلے گئے کہ بغیر محبوب کے مدینہ میں رہنا مشکل ہے اور عام صحابہ پر روشن دنیا تاریک ہوگئی۔ اسی حالت میں جب عبداللہ بن زید بن عبدربہ صاحب اذان کو ان کے بیٹے نے آنحضرت ﷺ کی وفات کی اطلاع دے دی اس وقت وہ اپنے باغ میں کام کر رہے تھے تو انہوں نے اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس طرح دعا مانگی، اے اللہ تیری اس کائنات میں ان آنکھوں سے حضور اکرم ﷺ کو دیکھتا تھا جب حضور ﷺ نہ ہوں تو مجھے ان آنکھوں کی ضرورت نہیں اے مولا! میری نگاہوں کو چھین لے چنانچہ دعا ختم ہوتے ہی وہ نابینا ہو گئے یہ طبعی محبت تھی۔

---

[1] المرقات ۱/۱۳۵ [2] المرقات ۱/۱۳۵

❷ جنگ احد میں جب کفار نے حضور اکرم ﷺ پر ہجوم کر کے حملہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کون ہے جو اس وقت میرا دفاع کرے اور وہ میرے ساتھ جنت میں رہے، اس اعلان پر انصار میں سے یکے بعد دیگرے سات صحابہ کرام نے حضور اکرم ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر شہادت کا جام نوش کیا اور آنحضرت ﷺ پر کوئی آنچ نہ آنے دی یہ طبعی محبت تھی۔

❸ اسی غزوۂ احد میں جب عارضی شکست ہوئی اور مدینہ منورہ میں یہ وحشت ناک خبر پھیل گئی کہ حضور ﷺ شہید کر دیئے گئے تو مدینہ منورہ سے عورتیں بے اختیار احد کے میدان کی طرف دوڑ پڑیں اسی میں ایک خاتون کلثوم بنت رافع رضی اللہ عنہا تھیں، راستہ میں کسی نے بتادیا کہ جنگ احد میں تیرا شوہر شہید ہو گیا ہے وہ فرماتی ہیں کہ شوہر کی بات چھوڑو مجھے بتاؤ کہ نبی اکرم ﷺ کس حالت میں ہیں پھر کسی نے کہا کہ تیرا باپ بھی شہید ہو گیا، اس نے پھر وہی جواب دیا پھر کسی نے کہا کہ تیرا بھائی بھی شہید ہو گیا ہے وہ مسلسل یہ کہہ رہی تھیں کہ مجھے بتاؤ حضور اکرم ﷺ کیسے ہیں؟ جب احد پہنچ کر اس نے حضور ﷺ کو صحیح سالم دیکھ لیا تو فرمانے لگی "**کل مصیبة بعدك یارسول الله جلل**" یعنی جب آپ خیریت سے ہیں تو باقی ساری مصیبتیں چھوٹی چھوٹی اور ہیچ ہیں، یہ طبعی محبت تھی۔

❹ مدینہ منورہ کے ایک منافق نے حضور ﷺ کی گستاخی میں کچھ زبان درازی کی جس کا پتہ حضور اکرم ﷺ کو چلا تو آپ ﷺ نے اس کے بیٹے کے سامنے تذکرہ فرمایا بیٹے نے آنحضرت ﷺ سے باپ کے قتل کرنے کی اجازت مانگی حضور ﷺ نے اجازت نہیں دی، تاہم اس صحابی نے جا کر اپنے منافق باپ سے کہا کہ یہ کہہ دو کہ حضور اکرم ﷺ معزز اور بزرگ ہیں اور تم ذلیل ہو ورنہ قتل کر دوں گا اس نے کہہ دیا کہ حضور معزز ہیں اور میں ذلیل ہوں، تب بیٹے نے اسے چھوڑ دیا یہ طبعی محبت تھی۔

❺ علماء کرام نے کئی جگہ اس واقعہ کو لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک دفعہ سینگی لگوا کر خون نکلوا دیا اور پھر ایک صحابی کو دیا کہ جا کر اسے کسی پوشیدہ مقام میں گرادو اس نے جا کر سوچا کہ نبی اکرم ﷺ کے جسم مبارک کا یہ مقدس خون میں زمین پر کیسے گرادوں چنانچہ انہوں نے وہ خون پی لیا اور آ کر حضور ﷺ سے عرض کیا کہ "**القیت اخفی مکانه**" میں نے اسے پوشیدہ مقام پر ڈال دیا، یہ سب طبعی محبت کے آثار تھے۔

❻ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو جب کفار قتل کرنے کے لئے میدان میں لے آئے اور سولی پر چڑھا دیا تو ابوسفیان نے کہا کہ کیا آپ کو یہ بات پسند ہے کہ اس وقت تیری جگہ محمد ﷺ ہمارے پاس ہوں ہم ان کی گردن تلوار سے اڑا دیں اور تم اپنے گھر میں ہو؟ اس کے جواب میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے محبت کا اس طرح عظیم اظہار فرمایا۔ "خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ محمد عربی ﷺ کو اپنی جگہ میں کانٹا بھی چبھے اور میں آزاد ہو کر گھر میں رہوں" یہ طبعی محبت تھی جس کا مظاہرہ صحابہ کرام نے کیا اور امت کو یہ تعلیم دی کہ محبت کی ابتداء اگرچہ عقلی اور شرعی ہو لیکن اس کی انتہاء طبعی ہونی چاہیے۔

اسباب محبت: جمال، کمال، نوال:

محبت کے تین بڑے اسباب ہیں:

❶ پہلا سبب: جمال ہے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو سب سے زیادہ جمال عطا کیا تھا آپ کا جمال شمائل سے ظاہر اور واضح ہے ابو علی سینا ایک بڑے فلسفی اور بڑے حکیم گزرے ہیں انہوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''حسن'' تناسب اعضاء اور اعتدال اعضاء کا نام ہے اور شمائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سب سے زیادہ معتدل الاعضاء تھے لہٰذا آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک نبی اکرم ﷺ کی طرح کوئی حسین پیدا نہیں ہوا ہے، خود حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "انا ملیح واخی یوسف صبیح" کسی نے کہا ہے:

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضاء داری آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری

جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں تیرے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار

واحسن منك لم تر قط عيني واجمل منك لم تلد النساء

خلقت مبرأً من كل عيب كانك قد خلقت كما تشاء

فاق النبيين فی خلق وفی خلق ولم یدانوه فی علم ولا كرم

منزه عن شريك فی محاسنه فجوهر الحسن فيه غير منقسم

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

لنا شمس وللآفاق شمس و شمسی خير من شمس السماء

فشمس الناس تطلع بعد فجر وشمسی تطلع بعد العشاء

پھر فرمایا۔

لواحی زليخا لو رأين جبينه لآثرن بالقطع القلوب علی اليد

یعنی اگر زلیخا کی سہیلیاں آنحضرت ﷺ کو دیکھ لیتیں تو انگلیوں کے بجائے دلوں کو کاٹ لیتیں۔

يا صاحب الجمال ويا سيد البشر من وجهك المنير لقد نور القمر

لا يمكن الثناء كما كان حقه بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لن يخلق الرحمان مثل محمد ابدا وعلمی انه لم يخلق

مظہر چہ توان کرد بیاں وصف جمالش شد خالق کونین ثنا خوان محمد ﷺ

❷ محبت کا دوسرا سبب: کمال ہے آپ کے کمالات کا احصاء تو ممکن نہیں مگر ختم نبوت کا جو کمال ہے یہ ایسا کمال ہے جس کے اثرات سے اولین اور آخرین سب ہی بیک وقت مستفیض ہو رہے ہیں۔

وکل اٍی من رسل الکرام به فانه ما اتصلت من نوره بهم

جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں ترے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار

ختم نبوت اس اعتبار سے کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اولیاء اللہ اور اولاد آدم کو جو دینا تھا وہ دے دیا پھر آنحضرت ﷺ پر کمالات کی تکمیل فرمادی گویا اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ جتنے کمالات تھے وہ سب ہم نے اپنے نبی کو عنایت کیے روحانیات کی تکمیل آپ پر کردی، اب کسی اور نبی کے آنے کی گنجائش نہیں کیونکہ روحانیات اور مادیات جتنا حضور اکرم ﷺ کو دیا اب اس کے بعد کسی کو کچھ دینے کی گنجائش نہیں گویا انعامات اور کرامات کی تکمیل آپ ﷺ پر فرمادی۔

مضت الدهور وما اتین بمثله ولقد اتی فعجزن عن نظر ائه

لا یمکن الثناء کما کان حقه بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

نفسی الفداء لمن اخلاقه شهدت بانه خیر مولود من البشر

آفاقہا گردیدہ ایم مہر و بتان ورزیدہ ایم

بسیار خوباں دیدہ ایم لیکن تو چیزے دیگرے

❸ محبت کا تیسرا سبب: نوال ہے نوال عطیہ اور جود وسخاوت کو کہتے ہیں۔ آپ پر جود کی انتہاء ہو چکی تھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت تیز ہوا کی طرح ہوتی تھی آپ نے یہ تعلیم دی کہ "**ولا تخش من ذی العرش اقلالا**" ایک دیہاتی کو آپ نے وادی بھر کر بکریاں دے دیں کبھی آپ کی زبان پر عطیہ کی موجودگی میں "لا" کا کلمہ نہیں آیا۔

ما قال "لا" قط الا فی تشهده لولا التشهد لکانت لائه نعم

نفسی الفداء لقبر انت ساکنه فیه العفاف وفیه الجود والکرم

میدان حنین میں آپ نے اپنے صحابہ کے علاوہ غیر مسلموں کو ہزاروں اونٹ دے کر عالم انسانیت کو حیرت میں ڈال دیا، نو مسلموں کے ایک ایک آدمی کو سو سو اونٹ دے کر فیاضی اور سخاوت کا ریکارڈ قائم فرمایا۔

جب آنحضرت ﷺ میں جمال بدرجہ اتم تھا کمال بدرجہ اکمل تھا۔ نوال بدرجہ اعم تھا تو آپ سے محبت رکھنا آپ کا ذاتی حق ہے، اس لئے شرعی طور پر آپ سے محبت رکھنے کو اس حدیث میں جو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے یہ آپ کا ذاتی استحقاق ہے جو ہر مسلمان پر لازم ہے۔

۲۰ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

ایمان کی لذت کا حصول

﴿۷﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ وَمَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقٰى فِي النَّارِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۱]

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص میں یہ تین چیزیں ہوں گی وہ ان کی وجہ سے حقیقی ایمان کی لذت سے لطف اندوز ہوگا۔ ① اول یہ کہ اسے اللہ اور اس کے رسول کی محبت دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ ہو۔ ② دوسرے یہ کہ کسی بندہ سے اس کی محبت محض اللہ (کی خوشنودی) کے لئے ہو۔ ③ تیسرے یہ کہ جب اسے اللہ نے کفر کے اندھیرے سے نکال کر ایمان واسلام کی روشنی سے نواز دیا تو اب وہ اسلام سے پھر جانے کو اتنا ہی برا جانے جتنا آگ میں ڈالے جانے کو۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: ثلاث: ثلاث مبتدا ہے اور "من کن فیہ" پورا جملہ شرطیہ اس کی خبر ہے، اب سوال یہ ہے کہ ثلاث نکرہ ہے یہ کس طرح مبتدا واقع ہوا ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ نکرہ محضہ نہیں بلکہ نکرہ مخصصہ ہے یہ خود صفت ہے اور موصوف خصال محذوف ہے، یعنی "**خصال ثلاث**" تو اب اعتراض نہیں ہوگا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ثلاث کی تنوین تعظیم کے لئے ہے یعنی تین بڑی چیزیں ہیں۔[۲]

وجد: ادرک کے معنی میں ہے بمعنی "**ذاق**" بھی ہے اور "**صادف**" بھی اس کا معنی ہے۔[۳]

حلاوۃ الایمان: اس حلاوت ایمانی کے دو مطلب ہیں۔[۴]

❶ **"ای استلذاذ الطاعات وایثار الطاعات علی جمیع الشھوات وتحمل المشقات فی مرضاۃ اللہ ورسولہ والرضا بالقضاء فی جمیع الحالات"۔**[۵]

❷ حلاوت ایمانی سے مراد التذاذ قلبی ہے جس کو دوسری روایات میں بشاشت قلبی کہا گیا ہے جس کے سامنے دنیوی لذائذ ہیچ نظر آجائیں اور صرف طاعات میں اصلی حلاوت ولذت محسوس ہوتی ہو اللہ اور اس کے رسول کی محبت ہر مسلمان میں ہے مگر عند المعارضہ ظاہر ہوتی ہے۔ حب فی اللہ کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کثرت عطایا سے اس میں اضافہ نہ ہو اور مصائب وشدائد کے وقت اس میں کمی نہ آئے۔

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے یہ بتادیا کہ ایمان کی اصل حلاوت وہی آدمی چکھ سکتا ہے جس کا دل روحانی صفات سے منور ہو اور وہ روحانی اعتبار سے بالکل تندرست ہو اگر کوئی شخص روحانی طور پر بیمار ہو یعنی اس کا دل روحانی صفات سے عاری ہو تو وہ

[۱] أخرجه البخاري ۱/۱۰ ومسلم ۱/۴۹ [۲] المرقات ۱/۱۳۶،۱۲۷ [۳] المرقات ۱/۱۲۷ [۴] المرقات: ۱۲۷ [۵] المرقات ۱/۱۲۷

شخص ایمان کی حلاوت بالکل محسوس نہیں کرسکتا ہے اس کی مثال ایک تندرست اور بیمار شخص کی طرح ہے اگر کوئی آدمی تندرست اور صحت مند ہے تو وہ شہد کی حلاوت کو اس طرح پاسکتا ہے جس طرح کہ شہد کی حقیقت ہے لیکن اگر کوئی شخص صفراء کا مریض ہے تو وہ شہد کو چکھ کر اعلان کرے گا کہ یہ کڑوا ہے حالانکہ شہد کڑوا نہیں ہوتا بلکہ یہ قصور اس شخص کی بیماری کا ہے کہ صفراء کی وجہ سے اس کو ایک لذیذ ترین چیز کڑوی لگتی ہے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص روحانی امراض میں مبتلا ہے تو وہ اسلام کی حقیقی لذت کو کبھی محسوس نہیں کرسکتا ہے، وہ الٹا اس لذیذ ترین نعمت کو کڑوا قرار دینے کی کوشش کرے گا لیکن اگر روحانی اعتبار سے یہ شخص تندرست ہے تو وہ ایمان کی اعلیٰ ترین لذت کو محسوس کر کے اس کا اعتراف کرے گا اور اعلان کرے گا کہ ہاں یہ لذیذ ترین نعمت ہے روحانی تندرست کے لئے۔[۱]

اس حدیث میں حلاوت ایمان کی چاشنی محسوس ہونے کے لئے تین چیزوں کو ضروری قرار دیا گیا ہے: اول یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت دوسری تمام محبتوں پر غالب ہو، دوم یہ کہ اگر کسی مخلوق سے محبت ہو تو وہ بھی صرف اللہ کے لئے ہو، سوم یہ کہ مسلمان ہونے کے بعد کفر سے اتنی نفرت ہو جتنی آگ میں ڈالے جانے سے ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جس نے ایمانی لذت محسوس کی تو شریعت پر چلنا آسان ہوگا ورنہ بڑی تکلیف محسوس کر کے بھاگے گا۔[۲]

من كان: یہاں تقدیری عبارت ماننا ضروری ہے یعنی **احداها محبة من كان الله ورسوله احب الخ** احب سے محبت اختیاری شرعی مراد ہے۔[۳]

مما سواهما: یہ سواہما عام ہے ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول ہوں، مال میں سے ہو یا جاہ و منصب میں سے ہو یا شہوات میں سے ہو۔[۴]

سوال: اشکال یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہاں اللہ تعالیٰ کا نام اور اپنا نام تثنیہ کے ساتھ ایک ضمیر میں جمع فرمایا ہے یعنی "**مما سواهما**" اسی طرح خطبہ نکاح میں بھی دونوں کو ایک ضمیر "**هما**" میں جمع فرمایا ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ نے خود ایک خطیب کو ان الفاظ پر ڈانٹا تھا جنہوں نے یہ الفاظ کہے تھے "**من يطع الله ورسوله فقد رشد ومن يعصهما فقد غوى**" **فقال ﷺ بئس الخطيب انت قم**، اب اس کا جواب کیا ہوگا؟[۵]

جواب: شارحین حدیث اس سوال کے کئی جواب دیتے ہیں۔

پہلا جواب: یہ کہ یہ اعتراض حضور اکرم ﷺ کی طرف متوجہ نہیں ہے کیونکہ کبھی ایک چیز امت کے لئے منع ہوتی ہے حضور اکرم ﷺ کے لئے منع نہیں ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً "**هما**" کی ضمیر میں اگر آنحضرت ﷺ نے دونوں ناموں کو اکٹھا فرمایا ہے تو آپ سے تو شرک، تسویہ اور برابری کا وہم نہیں ہوسکتا لیکن دوسروں میں یہ احتمال ہے کہ وہ اتحاد ضمیر کی وجہ سے اشتراک اور مساوات کا گمان کرے اس لئے منع کیا۔[۶]

---

[۱] المرقات ۱/۱۴۷ [۲] المرقات ۱/۱۴۷ [۳] المرقات ۱/۱۴۷ [۴] المرقات ۱/۱۴۷ [۵] المرقات ۱/۱۴۷ [۶] المرقات ۱/۱۴۷

دوسرا جواب: یہ ہے کہ اطاعت میں دونوں کو جمع کرنا توصحیح ہے کیونکہ ایک کی اطاعت ناتمام ہے رہ گیا معصیت کا معاملہ تواس میں ایک کی معصیت بھی تباہ کن ہے اور خطیب نے دونوں کی معصیت کو تباہی وگمراہی کے لئے ضروری بنادیا۔[۱]

تیسرا جواب: یہ کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے بغیر اجازت خطبہ کے لئے کھڑا ہونا اور خطبہ دینا کس قدر بے ادبی کی بات ہے شاید اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے سرزنش فرمائی یہ وجہ کسی کتاب میں نہیں ملی ممکن ہے صحیح ہو ورنہ بندہ معافی کا خواستگار ہے۔

وثانیتها محبة من احب عبدا حرا كان او عبدا مملوكا لا يحبه اى لا يحبه لغرض وعرض وعوض ولا يشوب محبته حظ دنيوى ولا امر بشرى بل محبته تكون خالصة الله تعالىٰ.[۲]

یعنی

محبت　رکھے　پاک　لینے　دینے　کے　منہ　میں　خاک

وثالثها كراهة من يكره ان يعود: عود کے دو معنی لئے جاسکتے ہیں اول یہ کہ ایک آدمی اسلام پر پیدا ہوا اور اسی پر پھلا پھولا اب یہ شخص کفر کی طرف لوٹنے کو برا مانتا ہے تو یہ عود صیرورت کے معنی میں ہے گویا اس کا معنی ابتداء کسی چیز کی طرف رجوع اور لوٹنے کا ہوا۔

عود کا دوسرا معنی حالت اولیٰ کی طرف لوٹنے کا ہے یہ ان لوگوں کے سامنے مناسب ہوگا جو پہلے کفر پر تھے پھر مسلمان ہو گئے اب دوبارہ حالت اولیٰ حالت کفر کی طرف لوٹنے کو برا مانتے ہیں۔[۳]

اس حدیث میں ایمان کی حلاوت کا جو بیان ہوا ہے اس پر یہ بحث ہوتی ہے کہ آیا یہ حلاوت حسی ہے کہ آدمی منہ میں محسوس کرے یا یہ معنوی حلاوت اور مٹھاس ہے؟ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حسی مٹھاس کا قول بھی کیا ہے۔

جس پر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے سخت تعجب کا اظہار کیا ہے کہ حسی مٹھاس کیسے ہوسکتی ہے، مگر صوفیاء کرام کی اکثریت بھی اس کے قائل ہے کہ حسی ظاہری مٹھاس ہوسکتی ہے، بہرحال صفائی باطن کے ساتھ اس کا تعلق ہے تو اصحاب کمال اس تشریح کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں، عام علماء نے معنوی حلاوت مراد لیا ہے۔

اس حدیث میں تین صفات کا بیان ہے اول دو صفات تو **تحلی وتزين بالفواضل والفضائل** کے قبیل سے ہیں اور تیسری صفت **تخلی من الرذائل** کے قبیل سے ہے گویا اس میں اشارہ ہوگیا کہ کفر سے براءت کا اعلان بھی ایمان کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

ایمان کا لطف کب حاصل ہوتا ہے

﴿۸﴾ وَعَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاقَ طَعْمَ الْإِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[۴]

[۱] المرقات ۱/۱۴۷　[۲] المرقات ۱/۱۴۸　[۳] المرقات ۱/۱۴۸　[۴] اخرجه مسلم ۱/۴۶

ترجمہ: حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو اپنا پروردگار، اسلام کو اپنا دین اور محمد ﷺ کو اپنا رسول خوشی سے مان لیا تو سمجھ لو کہ اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا۔ (مسلم)

توضیح: حضرت عباس رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں دو سال ان سے عمر میں بڑے ہیں کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ میں سے کون بڑا ہے تو آپ نے فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ بڑے ہیں البتہ میں "اسن" ہوں یعنی عمر میں زیادہ ہوں، یہ ان کی ذکاوت تھی، قدیم الاسلام تھے، مگر اسلام کو چھپاتے تھے، فتح مکہ سے کچھ قبل ہجرت کر کے اظہار کیا، بدر میں مجبور کر کے لڑائی کے لئے لائے گئے تھے، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو ان کے قتل سے منع فرمایا تھا۔[1]

ان کی والدہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے بیت اللہ کو غلاف پہنانے کا طریقہ رائج کیا، ان کی گم شدگی پر نذر مانی تھی کہ غلاف پہناؤں گی۔[2]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی عمر ۸۸ سال تھی ۳۲ ہجری میں آپ کا انتقال ہوا، جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

ذاق: ای وجد و اصاب و نال یعنی حلاوت ایمانی پالی، ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے معنوی حلاوت کے بجائے حسی حلاوت کا قول کیا ہے جس کو ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب تر قرار دیا ہے۔[3]

"رضی" یعنی اسلام کے لئے سینہ کھل گیا اور دل مطمئن ہو گیا ظاہراً اور باطناً انقیاد حاصل ہو گیا۔[4]

"باللہ ربا" اللہ کی ربوبیت پر راضی اس طرح کہ نہ شکایت نہ حکایت، ہر حالت پر اور زمانے کی ہر نیرنگی پر راضی، اسلام پر راضی اس طرح کہ تمام احکامات کو بلا چوں چرا بجالائے، رسول اللہ پر راضی اس طرح کہ طبعی طور پر رسول اللہ سے محبت کی وجہ سے آپ کی سنت اور آپ کے طریقے پسند ہوں اور اللہ تعالیٰ کی قضاء پر رضا ہو۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:[5]

ای ان یکون صابرًا علی بلائه شاکرًا علی نعمائه راضیًا بقدره وقضائه ومنعه واعطائه وان یعمل بجمیع شرائع الاسلام بامتثال الاوامر واجتناب الزواجر وان یتبع الحبیب حق متابعته فی سننه وآدابه واخلاقه ومعاشرته۔[6]

اس حدیث کا مضمون بھی اس سے پہلی والی حدیث کی طرح ہے کہ شہد کی لذت حسی و معنوی وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس کا ذائقہ درست ہو، صفراوی امراض سے اس کا ذائقہ زبان ماؤف اور خراب نہ ہوا ہو، اسی طرح ایمان کی لذت بھی وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جو اسلامی عقائد اور صحیح صفات اسلامیہ سے متصف ہو، وہ اسلام و ایمان اور نبی آخر الزمان پر اسی طرح عقیدہ رکھتا ہو جس کا اس کو رب تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا ہے۔

---

[1] المرقات ۱/۱۳۹ [2] المرقات ۱/۱۳۸ [3] المرقات ۱/۱۳۹
[4] المرقات ۱/۱۳۹ [5] المرقات ۱/۱۳۹ [6] المرقات ۱/۱۵۰

اسلام ہی مدار نجات ہے

﴿۹﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَا يَسْمَعُ بِيْ أَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ۔

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے اس امت میں سے جو شخص خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی، میری نبوت کی خبر پائے اور پھر میری لائی ہوئی شریعت پر ایمان لائے بغیر مر جائے وہ دوزخی ہے۔ (مسلم)

توضیح: "**والذی نفس محمد بیدہ**": یہ قسم ہے آنحضرت ﷺ نے تعلیم امت کے لئے قسمیں کھائی ہیں، جس سے امت کو یہ تعلیم ملی کہ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے تھے، خدائی کے مالک نہیں تھے بلکہ آپ کی جان اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں تھی، دوسرا یہ بتانا مقصود تھا کہ قسم صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی کھانا چاہئے، تیسرا یہ معلوم ہو گیا کہ بغیر ضرورت تاکید کلام کے لئے قسم اٹھائی جاسکتی ہے حرام نہیں ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے کبھی نہ جھوٹی قسم کھائی ہے اور نہ سچی قسم کھائی ہے یہ ان کی امتیازی شان ہے۔

نفس محمد: سے روح محمد ﷺ ذات محمد ﷺ وحالات وحرکات وسکنات محمد ﷺ مراد ہیں۔[2]

"**بیدہ**": یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اللہ کی نعمت ورحمت کے ہاتھوں میں ہے، لفظ "ید" متشابہات میں سے ہے، متشابہات کی ایک قسم وہ ہے جس کے معنی معلوم ہیں لیکن مراد کا علم نہیں جیسے ید، وجہ، ساق، جلوس، مجیٔ، استعاء وغیرہ اس میں سلف صالحین کا مسلک یہ ہے کہ ایمان لانے کے لئے یہی ظاہری الفاظ ہیں، اس کے معنی مایلیق بشانہ ہیں، اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، جس طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "**الاستواء معلوم والکیفیة مجهولة والسؤال عنها بدعة**" امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ید" کی تاویل قدرت سے کرنا اللہ تعالیٰ کی صفات میں تحریف کے مترادف ہے، اس لئے جو الفاظ آئے ہیں اس پر ایمان لا کر مایلیق بشانہ کہہ کر اللہ کے سپرد کرنا چاہئے، یہ سلف صالحین کا مسلک رہا ہے، متاخرین نے فتن وبدع کے ظہور کے پیش نظر کچھ مناسب تاویلیں کی ہیں، ایمان وعقیدہ کی حفاظت کی غرض سے زمانہ کے احوال کے تغیر کی وجہ سے اس کی بھی گنجائش ہے مگر یہ صرف تاویلات ہیں یقینی مطلب نہیں ہے۔[3]

"**احد**": خواہ موجود ہو اس کلام کے وقت یا آئندہ آنے والا ہو۔

"**من هذه الامة**" امت کی دو قسمیں ہیں ایک امت اجابت ہے یعنی جنہوں نے اسلام قبول کر کے کلمۂ توحید کا اقرار کیا ہے، دوسرے وہ ہیں جنہوں نے توحید کا اقرار نہیں کیا، اسلام قبول کرنے سے انکار کیا ہے وہ امت دعوت ہے مسلمانوں کے علاوہ تمام انسان امت دعوت ہیں۔[4]

---

[1] اخرجه مسلم ۱۰۱/۹۳ [2] المرقات ۱/۱۵۰ [3] المرقات ۱/۱۵۰ [4] المرقات ۱/۱۵۱

حدیث میں تین قسم کے لوگ آگئے ایک وہ جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی نبوت کا سنا مگر ایمان نہیں لائے یہ آگ والے ہیں دوسرے وہ کہ جنہوں نے سنا اور ایمان بھی لائے یہ جنت والے ہیں، تیسرے وہ کہ جنہوں نے نہ سنا نہ ایمان لائے یہ مسکوت عنہم کے درجہ میں ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لانا سب پر یکساں فرض ہے یہود ونصاریٰ کا ذکر یہاں بطور خاص اس لئے کیا گیا کہ وہ صاحب کتاب اور اہل کتاب تھے۔ جب اصحاب کتاب کی نجات آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے بغیر ممکن نہیں تو جن کے پاس کچھ بھی نہیں جیسے، ہندو، سکھ، دہریہ، ملحد، بے دین تو ان کی نجات بغیر ایمان کے کس طرح ہوسکتی ہے۔

اس حدیث میں "لا یسمع" میں لا بمعنی لیس ہے اور "احد" اس کا اسم ہے اور "یسمع من ھذہ الامۃ" "احد" کی صفت ہے اور "یھودی ولا نصرانی" "احد" سے بدل واقع ہے اور لیس کی خبر محذوف ہے، عبارت اس طرح ہے

لیس احد یسمع من ھذہ الامۃ یھودی ولا نصرانی الخ کائنا من اصحاب شئی الا کان من اصحاب النار۔

دوہرا اجر پانے والے

﴿۱۰﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ وَّالْعَبْدُ الْمَمْلُوكُ إِذَا أَدَّى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِيهِ وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَةٌ يَطَأُهَا فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيمَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهُ أَجْرَانِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں جن کو دو اجر ملیں گے: ① اس اہل کتاب یہودی عیسائی شخص کو جو پہلے اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا پھر محمد ﷺ پر ایمان لایا، ② اس غلام کو جو اللہ کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے آقاؤں کے حق کو بھی ادا کرتا رہے، ③ اس شخص کو جس کی کوئی باندی تھی اور وہ اس سے صحبت کرتا رہا پھر اس کو اچھا ہنر مند بنایا پھر اس کو خوب اچھی طرح تعلیم دی، اور پھر اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا تو یہ بھی دوہرے اجر کا حق دار ہوگا۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے جلیل القدر صحابی ہیں، مکہ مکرمہ میں اسلام قبول کیا پھر حبشہ کو ہجرت کی پھر اہل سفینہ کے ساتھ اس وقت مدینہ منورہ تشریف لائے جب ۷ھ کو حضور اکرم ﷺ غزوہ خیبر میں جا چکے تھے،

[1] اخرجہ البخاری ۱/۳۵، ۳/۱۵۴ ومسلم ۱/۹۳

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ کو بصرہ کا گورنر مقرر فرمایا، آپ نے اھواز فتح کیا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت تک وہیں رہے پھر کوفہ منتقل ہوئے اور وہاں کے والی رہے، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو آپ مکہ مکرمہ چلے گئے اور وہاں پر ۵۲ھ میں انتقال کر گئے۔[1]

دوہرے اجر والے اہل کتاب کون ہیں:

ثلاثة مبتدا ہے **لھم اجران** اس کی خبر ہے "**رجل من اھل الکتاب ای احدھم رجل من اھل الکتاب**"۔

شارحین حدیث کا اس میں اختلاف ہے کہ اہل کتاب سے مراد صرف عیسائی ہیں یا عیسائی اور یہودی دونوں ہیں صاحب ازھار حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد صرف نصرانی عیسائی اہل کتاب ہیں ان کی نقلی دلیل کتب حدیث کی وہ روایات ہیں جن میں تصریح ہے **الذی اٰمن بعیسی ثم ادرك زمان نبینا محمد فاٰمن به** اور بخاری میں ہے **واذا اٰمن بعیسی ثم اٰمن بی فله اجران**۔ (بخاری ج ا ص ۴۹۰)[2]

ان حضرات کی عقلی دلیل یہ ہے کہ یہود نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا تو وہ کافر ہو گئے اور ان کا ایمان اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام پر بھی ختم ہو گیا تو اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو دوہرا اجر کیسے ملے گا جب کہ "**اٰمن بنبیه**" موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے یہودی مراد نہیں ہو سکتے بلکہ وہ عیسائی بھی ان "اجرین" سے محروم ہیں جو تثلیث کے قائل تھے اور اپنے نبی پر جھوٹ باندھتے تھے لہٰذا اس حدیث کو عموم پر حمل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس سے عیسائیوں کے وہ بقایا لوگ مراد ہیں جو سابقہ دین عیسوی پر صحیح طور پر قائم تھے اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اسی کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے مشکل الآثار میں ذکر کیا ہے اور کئی روایات سے اس کی تائید کی ہے اور حضرت عیاض بن حمار مجاشعی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے ایک خطبہ میں یوں سنا:

"**ان اللہ عز وجل اطلع علی عبادہ فمقتھم عربھم وعجمھم الا بقایا من اھل الکتاب**۔"

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ یہاں مطلق اہل کتاب مراد ہیں خواہ یہودی ہوں یا نصرانی ہوں اور یہ واضح ہے۔[3]

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت "**الذین اٰتینا ھم الکتاب من قبله ھم به یومنون اولئك یوتون اجر ھم مرتین بما صبروا**" اور مذکورہ حدیث کو یہود و نصاریٰ تک عام کرنے میں ایک فائدہ ہے وہ یہ کہ بنی اسرائیل کے کچھ یہودی یا دوسرے لوگ جو یہودی بن چکے تھے اور ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی دعوت نہیں پہنچی تھی تو وہ یہودی اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے انہوں نے کسی کا انکار بھی نہیں کیا تھا وہ مومن تھے انہوں نے جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پالیا اور ایمان قبول کر لیا جیسے یمن کے کچھ یہودی تھے وہ لوگ مذکور و مسطور ثواب پائیں گے جبکہ وہ

---

[1] المرقات ۱/۱۵۲ [2] المرقات ۱/۱۵۲ [3] الکاشف ۱/۱۲۵

اہل کتاب یہودی ہیں، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کتاب سے مراد انجیل وتورات اور اہل کتاب سے یہود ونصاریٰ دونوں مراد ہیں جیسا کہ عام نصوص سے یہی متبادر ہوتا ہے اور مذکورہ آیت بھی یہی بتاتی ہے کیونکہ یہ عبداللہ بن سلام اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہما کے متعلق اتری ہے جن میں سے پہلے یہودیت سے مسلمان ہوئے تھے اور دوسرے عیسائیت سے مسلمان ہوئے تھے۔[1]

اب سوال یہ ہے کہ یہود مدینہ نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانا تھا اس کا جواب ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ توبہ استغفر اللہ کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسے لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفر کریں، نیز یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آیا دین عیسیٰ دین موسوی کے لئے ناسخ بھی تھا یا نہیں اگر ناسخ نہیں تھا تو جن یہود نے اپنے نبی کو مانتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول فرمایا تو وہ اس آیت وحدیث کے دوہرے اجر کے مصداق ہوں گے، اس طرح جن عیسائیوں نے کسی اور نبی کا کفر نہیں کیا اور اپنے نبی پر ایمان رکھتے ہوئے دین اسلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کیا وہ بھی دوہرے اجر کے مستحق ہوں گے۔

ورجل كانت عنده امة يطأها: وطی کی قید اس لئے لگا دی ہے کہ کسی کو وہم نہ ہو کہ رجل نے تو اس سے وطی کا فائدہ اٹھایا پھر دوہرا اجر کیسے ملے گا؟ تو فرمایا کہ بیشک وطی بھی کرے تب بھی دوہرا اجر ملیں گے اور بغیر وطی تو ضرور ملیں گے یا یہ قید احترازی نہیں ہے بلکہ اتفاقی ہے کہ ایسا ہوتا ہے عادت یہی ہے کہ وطی ہوتی ہے۔ (کذا فی الاشعہ)[2]

فله اجران: اس شخص کو ایک اجر تو لونڈی کی تعلیم وتربیت اور ادب سکھانے پر ملا اور دوسرا اجر اس کے آزاد کرنے اور نکاح کر کے گھر کی ملکہ بنانے پر ملا، بعض نے کہا ہے کہ تعلیم وآداب تو اس کا حق تھا، یہاں دو اجر اس طرح ہیں کہ آزاد کرنے پر ایک اجر ملا اور پھر نکاح کر کے بیوی بنانے پر دوسرا اجر ملا، "**فله اجران**" میں تاکید کے ساتھ نئی تصریح فرما دی کہ اس شخص کو بھی دو اجر ملیں گے، اس تصریح کی وجہ یہ تھی کہ پہلے جو دو شخص تھے ان کے دوہرے ثواب کا معاملہ تو واضح تھا کہ ایک نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے سابق مرکز ایمان کے بعد نئے مرکز ایمان کو قبول کیا اور دوسرے نے حق اللہ ادا کر کے پھر حق مولیٰ کو بطریق احسن ادا کیا ان دونوں اشخاص کے بڑے کارنامے اور واضح فیصلے تھے لیکن یہ تیسرا شخص تو جو کچھ کر رہا تھا اس میں اس کے اپنے منافع بھی تھے اس لئے یہاں اس تاکید اور وضاحت کی ضرورت پڑی کہ اس کو بھی دو اجر ملیں گے اس میں شبہ نہیں ہے۔[3]

سوال: یہاں ایک مشہور اعتراض ہے کہ ان اشخاص کو جو یہ دو اجر دیئے گئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے دو عمل کئے، اب جو شخص بھی دو عمل کرے گا دو اجر پائے گا اس میں ان کی کیا خصوصیت رہی؟ نیز دو اجر کیا چیز ہے ایک عمل پر تو دس نیکیاں پھر سات سو تک ملتی ہیں اس سے بھی زیادہ کا امکان ہے۔

پہلا جواب: تو یہ ہے کہ یہ دو اجر اصل ثواب سے زائد ہیں اصل ثواب کا قاعدہ تو مقرر ہے کہ دس سے سات سو تک ہے یہ دو اجر اس پر مستزاد ہیں۔

---

[1] المرقات ۱/۱۵۳ [2] المرقات ۱/۱۵۳ اشعۃ اللمعات ۱/ [3] المرقات ۱/۱۵۴

دوسرا جواب: یہ کہ ان تین اشخاص کا ہر عمل دوہرے ثواب کا باعث ہے یعنی نماز ایک پڑھی وہ دو کے قائم مقام ہوگی تو عام لوگوں کی ایک نماز اگر دس کے قائم مقام ہے تو ان کی بیس کے قائم مقام ہے۔ عام لوگوں کا ایک روزہ دس کے برابر ہے تو ان اشخاص کا ایک روزہ بیس کے برابر ہے اور ہر عمل میں یہی قاعدہ ہے تو یہ بڑی فضیلت ہے۔

تیسرا جواب: بعض نے یہ دیا ہے کہ یہ دہرا ثواب صرف ان اعمال پر ملے گا جن اعمال میں عمل بالضدین ہوتا ہو کہ ایک عمل کے ساتھ دوسرا امزاحم ہو رہا ہو اس تضاد و تزاحم و ٹکراؤ کی صورت میں جب یہ آدمی دونوں پر عمل کرے گا تو دوہرا ثواب ملے گا مثلاً سابق نبی کے ساتھ ساتھ لاحق نبی اور اس کی شریعت کے ماننے میں بڑی دشواری ہوتی ہے، اسی طرح غلام میں، ایک آقا کا حکم ایک طرز پر ہے کہ مثلاً نماز پڑھو اور دوسرا کہتا ہے کہ فلاں کام کرو، اب ان دونوں کاموں کا نبھانا کتنا مشکل ہوگا، اسی طرح لونڈی میں، ایک باہر کی خادمہ کو لاکر اپنی بیوی کی جگہ بٹھانا سابقہ بیوی سے اور لوگوں کے لعن طعن سے طرح طرح کی مزاحمت ہوگی یہ سب تزاحم و تضاد والے اعمال جب کریں گے تو ان کو دو اجر ملیں گے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان تین اشخاص کو اپنے مخصوص افعال کے ساتھ خاص کر بطور تمثیل کیوں ذکر کیا گیا۔ [1]

دین کے غلبہ تک کفار سے جنگ کا حکم

﴿۱۱﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. إِلَّا أَنَّ مُسْلِمًا لَمْ يَذْكُرْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ. [2]

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا گیا ہے کہ میں کفار سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ اس بات کی گواہی نہ دے دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں، نیز نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں پس جب وہ ایسا کرنے لگیں تو انہوں نے اپنی جان و مال کو مجھ سے بچا لیا ہاں جو باز پرس اسلامی ضابطہ کے تحت ہوگی وہ اب بھی باقی رہے گی اس کے بعد ان کے باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، مسلم کی روایت میں "الا بحق الاسلام" کے الفاظ نہیں ہیں۔

توضیح: "امرت" یہ مجہول کا صیغہ لایا گیا ہے کیونکہ اس کا فاعل متعین تھا کہ "اللہ" ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ کو حکم دینے والا اللہ ہی ہوتا ہے جس طرح صحابہ کہتے ہیں 'امرنا' تو وہاں فاعل نبی اکرم ﷺ متعین ہوتے ہیں تو "امرت" کا مطلب یہ ہوا "امرنی اللہ بان اقاتل الناس۔" [3]

---

[1] المرقات [2] اخرجہ البخاری ۱/۱۲ و مسلم ۱/۳۹ [3] المرقات ۱/۱۵۵

سُوال: یہاں یہ سوال ہے کہ اسلام میں جزیہ کا حکم بھی ہے جس سے کافر ذمی بن کر زندہ رہ سکتا ہے، اسی طرح معاہد بھی بغیر قتال کے رہ سکتا ہے، کفار سے صلح بھی جائز ہے حالانکہ اس حدیث میں مطلق لڑنے کا حکم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر سے لڑے بغیر کوئی اور صورت نہیں۔

جوابات:

اس سوال کے کئی جوابات ہیں:

پہلا جواب: یہ دیا گیا ہے کہ الناس میں الف لام عہد خارجی کے لئے ہے اور اس سے مراد جزیرۂ عرب کے مشرکین ہیں جن کے لئے "اما السیف اوالاسلام" اس کی تائید نسائی کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں **امرت ان اقاتل المشرکین**۔[1]

دوسرا جواب: اس سے ملتا جلتا ہے کہ الناس سے مراد اہل عرب ہیں ذمی اور معاہد خود نکل گئے کیونکہ یہ عام حکم ہے اور ہر عام مخصوص البعض ہوتا ہے تو لڑنے والوں سے لڑیں گے، ذمی اور معاہد ان سے مستثنیٰ ہیں۔ (کذا قال الطیبی)[2]

تیسرا جواب: اس حدیث کی غایت میں تاویل کرنے سے دیا گیا ہے یعنی "**حتی یستسلموا اویستلموا**" کہ یا اسلام حقیقۃً لے آئیں یا اسلام کے سامنے جھک جائیں اور استسلام کی صورت میں ذمی اور معاہد داخل ہیں کیونکہ اب اس نے اطاعت کی ہے یعنی جہاد سے مراد اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں اسلام یا استسلام، کافر کفر پر رہتے ہوئے جب اسلامی حکومت قبول کرتا ہے تو اعلاء کلمۃ اللہ متحقق ہو گیا۔[3]

سُوال: یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اس حدیث میں شہادتین کا ذکر موجود ہے نماز اور زکوٰۃ کا ذکر بھی ہے لیکن یہاں نہ صوم کا ذکر ہے نہ حج کا یہ کیوں؟

جواب: اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ اختصار من الراوی ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ اب تک روزہ اور حج کا حکم نہیں آیا تھا۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے تمام ارکان کو بیان کرنا نہیں تھا بلکہ بتلانا مقصود تھا کہ جو شخص مسلمان ہو جائے اور نماز اور زکاۃ کا اہتمام کرے یہ ان کے مسلمان ہونے کی علامت ہے اب ان سے تعرض کرنا نہیں ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ یہاں شہادتین کے اقرار کا ذکر ہے اور جو شخص نبی اکرم ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ **جمیع ماجاء به النبی** ﷺ کا اقرار کرتا ہے اس میں ساری شریعت آ گئی۔[4]

تارک صلوٰۃ کا حکم:

اس حدیث میں چونکہ حفظ جان کے لئے کلمہ شہادت کے بعد نماز کا ذکر آیا ہے اس لئے شارحین نے تارک صلوٰۃ کے حکم سے متعلق ایک بحث چھیڑ دی ہے، اس کو آپ اس طرح سمجھ لیں کہ تارک صلوٰۃ کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ لوگ ہیں جو نماز

[1] المرقات ۱/۱۵۶ [2] المرقات ۱/۱۵۶ والکاشف ۱/۱۲۷ [3] المرقات ۱/۱۵۶ [4] المرقات ۱/۱۵۶۱

چھوڑنے کو حلال سمجھتے ہیں اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس کے قریب نہیں جاتے ہیں، یہ لوگ اتفاقاً کافر مرتد اور واجب القتل ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو سستی کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتے ہیں مگر اس کی فرضیت کو مانتے ہیں چھوڑنے کو ناجائز سمجھتے ہیں اس قسم کے لوگوں میں فقہاء کرام کا اختلاف ہوا ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ نصوص قرآنی اور تصریحات حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ قصداً متعمداً تارک صلوٰۃ نے کفر کا ارتکاب کیا اس لئے احمد بن حنبل، عبداللہ بن مبارک اور اسحاق بن راھویہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے کہ بلا عذر عمداً فرض نماز چھوڑنے والا کافر ہے، اس کو قتل کیا جائے گا اور یہ قتل مرتد کا قتل ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ تارک صلوٰۃ کافر نہیں مگر اس جرم کی سزا قتل ہے اور یہ قتل مرتد کا نہیں بلکہ فاسق فاجر کا قتل ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کافر نہیں اور اس کی سزا قتل نہیں بلکہ حاکم وقت اس کو جیل میں ڈال دے اور جب تک توبہ نہیں کرتا ہے ہر نماز کے وقت میں اس کو کوڑے مارے جائیں یہاں تک کہ یا وہ توبہ کرے اور یا جیل ہی میں مر جائے، سلطان باھو رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے، بابا سعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کو قرض نہ دو جو شخص خدا کا قرض ادا نہیں کرتا وہ تیرا قرض کیا ادا کرے گا۔

بہر حال اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انجام کے اعتبار سے تارک صلوٰۃ کے بارے میں امت کے فقہاء نے مارنے کا حکم دیا ہے خواہ فوراً ہو یا جیل کی صورت میں تاخیر سے ہو، خواہ کفراً ہو، خواہ سزاً ہو، اس سے نماز کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، جن حضرات نے تارک صلوٰۃ کو کافر مرتد قرار دیا ہے ان کے دلائل وہ آیات واحادیث ہیں جن میں تارک صلوٰۃ کی طرف کفر کی نسبت کی گئی ہے اور وہ بہت سی احادیث ہیں، مگر جو حضرات تارک صلوٰۃ کے کافر ہو جانے کے قائل نہیں ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں تاویل کی جائے گی کہ اس شخص نے کافروں والا کام کیا اس سے لڑا جائے مارا نہ جائے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مرتد ہو گیا اس کو قتل کر دو کیونکہ مرتکب کبیرہ کے بارے میں امت کا فیصلہ ہے کہ وہ خارج از اسلام نہیں تو پھر تارک صلوٰۃ کو مرتد کیسے کہیں گے پھر ان احادیث کو تشدید تغلیظ اور تھدید پر حمل کریں گے کیونکہ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ کبھی امت میں تارک صلوٰۃ کو قتل نہیں کیا گیا۔

الا بحق الاسلام: یعنی اس شخص کا خون قصاص حدود وارتداد میں محفوظ نہیں ہوگا بلکہ قصاصاً قتل ہوگا۔ نیز اگر شادی شدہ ہے مسلمان ہے اور زنا کیا تو رجم کیا جائے گا یا مسلمان تھا پھر مرتد ہو گیا تو قتل کیا جائے گا کیونکہ یہ اسلام ہی کا حق ہے، اسلام نے کہا ہے کہ ایسا کرو اور وہ صرف تین کام ہیں۔ جس میں نماز شامل نہیں۔ [1]

وحسابھم علی اللہ: یعنی ظاہراً بچ گیا باطناً معاملہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے ہم باطن کے فیصلوں کے مکلف نہیں ہیں۔

---

[1] المرقات ۱/۱۵۷

مطلب حدیث:

اس حدیث مبارک کا حاصل یہ ہے کہ نبی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مجھے لوگوں سے قتال اور جہاد کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ لوگ تین کام نہ کرلیں: ① شہادتین کا اقرار ② اقامت صلوٰۃ ③ زکوٰۃ ادا کرنا، جو لوگ یہ تین کام کرلیں گے اور سچے مسلمان بن جائیں گے تو ان کی جان محفوظ ہو جائے گی اب ہمارے لئے ان کے مال و جان سے تعرض کرنا جائز نہیں ہوگا البتہ مسلمان ہو جانے کے بعد اگر کسی موقع پر اسلام ہی کا تعارض ہو تو وہ مارے جانے سے معصوم نہ رہے گا ظاہر حکم لگے گا باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔[1]

ترتیب احکام:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں مبعوث ہوئے توحید و تبلیغ کا کام شروع ہوا، تلاوت قرآن کا دور شروع ہوا ابھی تک عام فرائض واحکام نہیں آئے تھے پھر نماز مکہ مکرمہ میں فرض ہوئی پھر ہجرت ہوئی پھر زکوٰۃ فرض ہوئی، پھر روزوں کا حکم مدینہ میں ۲ھ سے پہلے آیا، پھر چھ یا سات یا نو ہجری کو حج فرض ہوا، پھر دوسرے احکام آئے ہجرت کے متصل مدینہ منورہ میں جہاد کی مشروعیت کا حکم آیا، دفاع کی اجازت کے بعد اقدام کا حکم آیا مسجد الحرام کے قریب نہ لڑنے کے بعد وہاں بھی لڑنے کا حکم آ گیا، اشہر حُرم میں جنگ پر پابندی کو بھی اٹھالیا گیا اور آخر میں تا قیام قیامت مطلق جہاد کا حکم آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عالمی اعلان فرمایا **امرت ان اقاتل الناس الخ** اب یہی حکم باقی ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گا۔ تفصیلات کے لئے مشکوٰۃ جلد ثانی کتاب الجہاد کا انتظار کیجئے۔[2]

عجیب مناظرہ:

تارک صلوٰۃ کی تکفیر و عدم تکفیر میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی ایک دلچسپ بحث ہوئی وہ اس طرح کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے تارک صلوٰۃ کے بارے میں جب پوچھا تو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کافر ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے سوال کیا کہ پھر وہ کس طرح مسلمان ہوگا آپ نے فرمایا کہ کلمہ پڑھ لے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کلمہ تو وہ پہلے سے پڑھتا ہے نماز نہیں پڑھتا۔ آپ نے فرمایا کہ نماز پڑھ لے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب وہ کافر ہے تو بغیر ایمان کے نماز کیسے پڑھ لے؟ اس پر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ خاموش ہو گئے۔

۲۳ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

محفوظ مسلمان کون ہوتا ہے؟

﴿۱۲﴾ وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ صَلّٰى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَأَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِيْ لَهُ ذِمَّةُ اللهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللهَ فِيْ ذِمَّتِهٖ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[3]

[1] المرقات ۱/۱۵۸ [2] المرقات ۱/۱۵۶ [3] اخرجه البخاری ۱/۱۰۸

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہمارے ذبیحوں کو کھائے وہ مسلمان ہے اور اللہ اور اللہ کے رسول کے عہد و امان میں ہے۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کے عہد و امان میں ہے تم اس کے ساتھ عہد شکنی مت کرو۔ (بخاری)

توضیح: "من صلی صلوتنا": یعنی جس نے ہماری طرح نماز پڑھی، یہ عمل ایک مسلمان موحد ہی کر سکتا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا اقرار کرتا ہو، جب نبوت کا اقرار ہو گیا تو نبی اکرم ﷺ کی لائی ہوئی پوری شریعت کا اعتراف بھی ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ اس شخص کی نماز اس کے ایمان کے لئے علامت بنائی گئی۔ یہاں شہادتین کا تذکرہ نہیں کیا گیا کیونکہ شہادتین حقیقتاً یا حکماً نماز کے ضمن میں خود ہی آ گئے نبی اکرم ﷺ نے اس مسلمان کی تین علامتیں بیان فرمائی:
(١) ہماری جیسی نماز پڑھے (٢) ہمارے قبلہ کا استقبال کرے (٣) ہمارا ذبیحہ کھائے۔[1]

سوال: یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ مسلمان کے تعارف میں جن تین چیزوں کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، ان میں اتنی مرکزیت کہاں تھی؟ نماز ایک عمل ہے بہت اونچا عمل ہے، مگر ایمان و اسلام کے بعد کا عمل ہے، اسی طرح قبلہ کی طرف رخ کرنا بھی کوئی اتنا مرکزی عمل نہیں ہے اور ہمارا ذبیحہ کھانا تو کوئی عبادت بھی نہیں پھر ان چیزوں کو اسلام میں اتنا اہم مقام کیوں دیا گیا کہ مسلمان کا تعارف اس پر موقوف کر دیا گیا۔

جواب: اس اشکال کا جواب سمجھنے سے پہلے یہ بات سمجھ لیں کہ یہاں حدیث میں جس شخص کا ذکر ہے اور جس کے مومن و مسلم ہونے کا تعارف کیا گیا ہے یہ وہ شخص ہے جو ابھی اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے اور اپنا سابق دین چھوڑ کر اسلام میں آنا چاہتا ہے، اسی وجہ سے حدیث میں ایسے شخص کے مابہ الامتیاز اعمال کا ذکر کیا گیا، یعنی نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں اہل کتاب اور اہل اسلام کے درمیان مابہ الامتیاز ہر ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنے والے اعمال اگر تھے، تو وہ یہی تین اعمال تھے، کیونکہ ایمان تصدیق قلبی کے درجہ میں ہو یا اقرار لسانی بھی ساتھ ہو، اس میں غیر مسلم کو نمایاں کرنے کے اتنے مواقع نہیں تھے جتنے ان مذکورہ تین اعمال میں تھے کیونکہ یہ اسلامی شعائر اور ممتاز اعمال ہیں۔ دیکھئے نماز اسلامی شعائر میں سب سے کھلا امتیازی عمل ہے، اسی طرح قبلہ کا معاملہ ہے جس کے بارے میں یہود و نصاریٰ انتہائی حساس ہیں اور ان کے نزدیک حقانیت کے لئے قبلہ ہی کو معیاری مقام حاصل ہے، یہ تو عبادات کے حوالہ سے امتیازی نشان تھے۔

آگے ذبیحہ کا معاملہ بھی ایک امتیازی معاملہ ہے، یہود و نصاریٰ اپنے ماسوا کسی کا ذبیحہ نہیں کھاتے اور ذبیحہ کو وہ لوگ معاشرتی لحاظ سے امتیاز اور جدائی کا بڑا حد فاصل سمجھتے ہیں تو اس حدیث میں بتایا گیا کہ جو شخص اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے پھر وہ عبادات کے حوالہ سے ہماری طرح امتیازی نماز پڑھتا ہے اور قبلہ کا رخ کرتا ہے اور معاشرتی لحاظ سے ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے تو اب یہ شخص عبادات کے بعد عادات میں بھی غیر مسلموں سے ممتاز ہو گیا لہٰذا اب یہ تمام صفات کے ساتھ مسلمان شمار کیا جائے گا۔[2]

---

[1] المرقات ١/١٥٩　[2] الکاشف ١/١٣١

واستقبل قبلتنا: یہاں سوال یہ ہے کہ پہلے جملہ "من صلی صلوتنا" میں یہ جملہ داخل تھا، کیونکہ ہماری نماز ہمارے ہی قبلہ کی طرف ہوتی ہے پھر اس جملے کالانا بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے، حالانکہ یہاں اس کو ایمان کا معیار بنایا گیا ہے؟

پہلا جواب: یہ ہے کہ نماز کی نسبت قبلہ کا معاملہ زیادہ اعرف واشہر تھا، کیونکہ بہت سارے مسلمان نماز پڑھتے بھی نہیں اور جانتے بھی نہیں لیکن قبلہ کو جانتے مانتے اور پہچانتے ہیں، اس لئے نماز کے بعد قبلہ کا ذکر ضروری تھا۔[1]

دوسرا جواب: یہ ہے کہ نماز میں دوسرے مذاہب کے لوگ بھی کسی نہ کسی طریقہ سے شریک ہیں تو مکمل امتیاز نہیں لیکن قبلہ میں تو نمایاں امتیاز ہے، ہر مذہب کا الگ قبلہ ہے، یہود کا بیت المقدس میں گنبد صخرہ ہے اور نصاری کا بیت المقدس میں جانب شرقی ہے اور مسلمانوں کا مکہ مکرمہ میں بیت اللہ ہے، اس لئے اس کا ذکر کرنا ضروری تھا۔

فذالك المسلم: یعنی جس میں یہ تین صفات ہوں وہی مسلم ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن میں ہے اللہ کے عہد وضمان میں ہے، نہ اس کا قتل جائز ہے، نہ مال وآبرو کی بے حرمتی جائز ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی عہد شکنی سے بچو۔

اخفار: بدعہدی کو کہتے ہیں عہد توڑنا خیانت کرنا اور مال وجان سے تعرض کرنا مراد ہے کہ اس سے احتراز کرو، اللہ تعالیٰ کی عہد شکنی رسول کی عہد شکنی تھی، اسی لئے ایک کے ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا۔[2]

سوال: قادیانی کہتے ہیں کہ یہ تین کام ہم بھی کرتے ہیں، پھر ہم مسلمان ہوئے تو ہمیں کافر کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: ان تین کاموں کے اپنانے کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ وہ شخص ضروریات دین میں سے کسی امر ضروری کا انکار نہ کرے، کیونکہ ایمان واعمال وہی معتبر ہیں جن کے منافی کوئی بنیادی عمل ایسا نہ ہو جو ان سب اعمال کے حبط کا ذریعہ بنے، قادیانی نئی نبوت کو کھڑا کرتے ہیں تو ان کا ایمان شریعت پر کیسے باقی رہ سکتا ہے؟

سوال: اس حدیث میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ اس میں حضور اکرم ﷺ نے زکوۃ صوم اور حج کا ذکر نہیں کیا؟

پہلا جواب: یہ ہے کہ اس وقت تک یہ احکام فرض نہیں ہوئے تھے۔

دوسرا جواب: یہ کہ نبی اکرم ﷺ کو تمام ارکان کا بیان کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ مسلمان کے تعارف کی حد تک جتنا مقصود تھا اس کو بیان کیا۔

جنت میں لے جانے والے اعمال

﴿۱۲﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ أَتَى أَعْرَابِيٌّ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ دُلَّنِي عَلَى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ قَالَ تَعْبُدُ اللهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَتُقِيمُ الصَّلَاةَ الْمَكْتُوبَةَ وَتُؤَدِّي الزَّكَاةَ الْمَفْرُوضَةَ وَتَصُومُ رَمَضَانَ قَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا أَزِيدُ عَلَى هٰذَا شَيْئًا وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُ فَلَمَّا وَلَّى قَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى رَجُلٍ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى هٰذَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[3]

---

[1] المرقات ۱/۱۵۹　[2] المرقات ۱/۱۶۰　[3] اخرجه البخاری ۲/۱۳۰ ومسلم ۱/۳۳

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتادیجئے کہ جس کے کرنے سے میں جنت میں داخل ہوجاؤں، آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نماز پڑھو، فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔ یہ سن کر دیہاتی نے کہا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نہ تو اس پر کچھ زیادہ کروں گا اور نہ اس میں سے کچھ کم کروں گا، جب وہ دیہاتی چلا گیا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی جنتی آدمی کو دیکھنے کی سعادت اور مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس شخص کو دیکھ لے۔

(بخاری و مسلم)

توضیح: دخلت الجنة: یعنی دخول اولی سے داخل ہوجاؤں جس میں کسی قسم کی سزا و عذاب نہ ہو۔[1]

تعبد الله: یہ خبر بمعنی امر ہے "ای اعبد الله" یا ''ان'' مصدر یہ مقدر ہے ای ان تعبد الله۔[2]

سوال: سوال یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اس شخص کو توحید اپنانے کا حکم نہیں دیا شہادتین کا ذکر نہیں فرمایا جو کہ دخول جنت اور صحت عمل کے لئے ضروری ہے۔

پہلا جواب: عبادت سے مراد توحید و شہادتین ہے، اس صورت میں یہ شخص ابھی تک مسلمان نہیں ہوا ہوگا تو اس کو حکم دیا کہ توحید اپناؤ۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ یہ شخص پہلے سے مسلمان ہو چکا تھا، بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اس نے پوچھا تھا "ماذا فرض الله علی" یعنی مجھ پر اللہ کے کیا فرائض ہیں؟ اس صورت میں توحید اور بیزاری شرک کا ذکر بطور تبرک و شرف اور بطور تاکید ہوا ہے۔

ولا تشرك به شيئا: یعنی شرک جلی اور شرک خفی سے بچو توحید اور عبادت کو اپناؤ، اس جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ عبادت سے مراد توحید کا کلمہ ہے اور توحید کے ضمن میں رسالت بھی آگئی، اس روایت میں حج کا ذکر نہیں شاید اس وقت تک حج فرض نہیں ہوا ہوگا یا آنحضرت ﷺ کو اتنے ہی ارکان کا بیان مقصود تھا، یا کسی راوی نے اختصار کیا ہے۔ **"والذی نفسی بیده"** معلوم ہوا بغیر ضرورت قسم کھانا جائز ہے **"لا ازید ولا انقص منه"** اس جملہ کے کئی مطلب ہیں۔[3]

① میں اس تعلیم کی تبلیغ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے میں کمی بیشی نہیں کروں گا چونکہ یہ شخص قوم کا بڑا تھا تو پہنچانا اس کی ذمہ داری تھی۔ ② **لا ازید فی السوال ولا انقص فی العمل۔** ③ **لا ازید شیئا من تلقاء نفسی ولا انقص کذالك من نفسی۔** ④ یا یہ کلام بطور محاورہ تھا کہ جب آدمی مثلاً کوئی چیز خریدتا ہے تو کہتا ہے قیمت میں کوئی کمی زیادتی نہیں ہوگی، یہاں اصل مقصود کمی کرنا ہے زیادتی کا لفظ تبعاً محاورہ میں آگیا اسی طرح حدیث میں **"لا ازید"** کا لفظ تبعاً آگیا ہے مقصود **"لا انقص"** ہے ورنہ عبادت میں تو زیادت مطلوب ہے۔ ⑤ حق بات یہ ہے کہ یہ عبارت اور یہ جواب ''کمال اطاعت'' سے کنایہ ہے۔[4]

---

[1] المرقات ۱/۱۶۰　[2] المرقات ۱/۱۶۰　[3] المرقات　[4] المرقات ۱/۱۶۱

"من سرہ" یعنی جن کو یہ بات اچھی لگتی ہو کہ وہ کسی جنتی کو دیکھے تو وہ اس شخص کو دیکھے آپ کو بذریعہ وحی معلوم ہوا کہ اس شخص کا انجام محمود ہے اور یہ مامون العاقبۃ ہے اور یہ بغیر سزا کے دخول اولی کے ساتھ جنت میں جائے گا۔ اس دیہاتی کا نام سعد بن الاحزم تھا۔ (کما فی الطبرانی)[1]

ایمان پر استقامت

﴿۱۴﴾ وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الثَّقَفِيِّ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْ لِيْ فِي الْإِسْلَامِ قَوْلًا لَا أَسْأَلُ عَنْهُ أَحَدًا بَعْدَكَ وَفِيْ رِوَايَةٍ غَيْرَكَ قَالَ قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[2]

ترجمہ: حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے اسلام کی کوئی ایسی بات بتا دیجئے کہ آپ کے بعد مجھ کو کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اور ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ آپ کے علاوہ کسی دوسرے سے پوچھنے کی حاجت نہ رہے۔ آپ نے فرمایا زبان و دل سے اس بات کا اقرار کرو کہ میں اللہ پر ایمان لایا ہوں، اور پھر اس اقرار و اعتراف پر ڈٹ کر قائم رہو۔ (مسلم)

توضیح: حضرت سفیان رضی اللہ عنہ کی کنیتِ ابوعمر ہے۔ یہ شخص صحابی ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف سے گورنر مقرر تھے، بنوثقیف سے ان کا تعلق ہے اور طائف کے باشندہ ہیں، ان سے صرف پانچ حدیثیں مروی ہیں۔[3]

"**فی الاسلام**": یعنی تکمیل اسلام سے متعلق ایک جامع قول ارشاد فرمائیں، اس جملہ میں توابع اسلام سب کے سب آگئے گویا پوری شریعت کی بات ہوگئی۔ "**امنت باللّٰہ**" یعنی ان تمام چیزوں پر ایمان لایا ہوں جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس میں بھی پوری شریعت آگئی۔ "**ثم استقم**" یہ لفظ قرآن کریم کی آیت "**ان الذین قالوا ربنا اللّٰہ ثم استقاموا**" سے ماخوذ ہے یعنی اوامر کے امتثال پر اور نواہی سے اجتناب پر ڈٹ کر قائم رہو، یہ حدیث جوامع کلم میں سے ہے، جو اصول اسلام توحید اور ارکان اسلام یعنی طاعات پر مشتمل ہے توحید کی طرف اشارہ "**امنت باللّٰہ**" سے ہوا اور باقی طاعات کی طرف اشارہ "**ثم استقم**" سے ہوا کیونکہ استقامت اس کا نام ہے کہ ہر مامور کا امتثال ہو اور ہر محظور سے اجتناب ہو اگر ذرا بھی اوامر و نواہی میں فرق آگیا تو "**اعوجاج**" ٹیڑھا پن آجائے گا جو استقامت کے منافی ہے۔ اس طرح اس حدیث میں اعمال قلب، اعمال بدن، ایمان، اسلام اور احسان سب آگئے۔

یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کرام نے کہا ہے "**الاستقامة خیر من الف کرامة**"۔ پس اگر کوئی شخص مامور کو چھوڑتا ہے تو استقامت جاتی ہے یا منھی عنہ کا ارتکاب کرتا ہے تو استقامت نہیں رہتی ہے، یہ پل صراط کی طرح باریک تیز دھار نوک دار تلوار پر سفر ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "**شیبتنی ھود واخواتھا**" کیونکہ ان سورتوں میں "**فاستقم کما امرت**" کا حکم تھا۔[4]

[1] المرقات ۱/۱۶۱ [2] اخرجه مسلم ۱/۴۷، [3] المرقات ۱/۱۶۱ [4] المرقات ۱/۱۶۱، ۱۶۲

استقامت کا مفہوم:

❶ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں صحیح راستہ پر استقامت اتنی مشکل ہے جتنا کہ عالم آخرت پر پل صراط پر استقامت مشکل ہوگی، اس دنیا میں استقامت کا ہر پل بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔[1]

❷ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جب استقامت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا "ان لا تشرك بالله شيئا" یعنی استقامت خالص توحید کا نام ہے۔

❸ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو فرمایا "تستقيم على الامر والنهى ولا تروغ روغان الثعالب" یعنی حق وباطل کے وقت حق پر مضبوط ڈٹ جاؤ اور لومڑی کی طرح ادھر ادھر قلابازیاں نہ کھاؤ۔

❹ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے استقامت کے متعلق فرمایا "اخلصوا العمل لله" یعنی خالص رضائے الٰہی کے لئے ہر کام کرنا استقامت ہے۔

❺ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "داوموا الفرائض كلها" یعنی تمام فرائض پر دوام واستمرار کے ساتھ قائم رہنا استقامت ہے۔

۲۴ ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ

فرائض اسلام

﴿۱۵﴾ وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرَ الرَّأْسِ نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهِ وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُوْلُ حَتّٰى دَنَا مِنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَإِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْإِسْلَامِ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ فَقَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ فَقَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ وَذَكَرَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ الزَّكَاةَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا فَقَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَأَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُوْلُ وَاللهِ لَا أَزِيْدُ عَلَى هٰذَا وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أَفْلَحَ الرَّجُلُ إِنْ صَدَقَ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نجد سے ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا جس کے سر کے بال پراگندہ و پریشان تھے ہم اس کی آواز کی گنگناہٹ تو سن رہے تھے لیکن (فاصلہ پر ہونے کی وجہ سے) یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آپ ﷺ سے کیا کہہ رہا ہے یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بالکل قریب پہنچ

[1] المرقات ۱/۱۶۲، ۱۶۳ [2] اخرجه البخاری ۱/۱۸ ومسلم ۳/۳۳۵

گیا تو اچانک ہم نے سنا کہ وہ اسلام کے فرائض کے بارے میں سوالات کر رہا ہے رسول اللہ ﷺ نے (اس کے جواب میں) فرمایا کہ رات دن کی پانچ نمازیں فرض ہیں (یہ سن کر) اس شخص نے کہا کیا ان نمازوں کے سوا مجھ پر کچھ اور نمازیں بھی فرض ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں مگر نفل نمازیں تمہیں پڑھنے کا اختیار ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں اس شخص نے کہا کیا ان روزوں کے سوا کچھ اور روزے مجھ پر فرض ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں مگر نفل روزے کا تمہیں اختیار ہے، روای کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد زکوٰۃ کا ذکر فرمایا اس نے عرض کیا کیا اس کے علاوہ بھی مجھ پر کوئی صدقہ فرض ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں مگر نفل صدقہ کا تمہیں اختیار ہے، اس کے بعد وہ شخص یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ خدا کی قسم میں نہ تو اس پر کچھ زیادتی کروں گا اور نہ اس میں کچھ کمی کروں گا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اس شخص نے سچ کہا ہے تو نجات پا گیا ہے اور کامیاب ہو گیا ہے۔

توضیح: حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو محمد ہے، آپ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، بدر کے سوا تمام غزوات میں شریک رہے ہیں، بدر میں آپ کو ایک اور ساتھی کے ہمراہ ابوسفیان کے قافلہ کی خبر کے لئے حضور اکرم ﷺ نے بھیجا تھا۔ احد کے دن حضور اکرم ﷺ کی دفاع میں تیر کھا کھا کر ہاتھ شل ہو گیا تھا، نیزہ اور تیر کے ۷۵ زخم آپ رضی اللہ عنہ کے جسم پر لگے تھے، حضور اکرم ﷺ نے آپ کو اسی میدان میں یہ اعزاز دیا "**اوجب طلحة**" یعنی طلحہ نے اپنے لئے جنت واجب کرادی، واقعہ جمل میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ ۳۶ھ میں ۶۴ سال کی عمر میں شہید کر دیئے گئے۔[۱]

"**جاء رجل**": کہتے ہیں یہ ضمام بن ثعلبہ تھے جو سعد بن بکر کی طرف سے وفد و جرگہ بن کر آئے تھے، اس حدیث میں "**رجل**" مبہم آیا ہے، کوئی تعین نہیں کہ یہ کون تھا، اس سے پہلے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اعرابی کا لفظ آیا ہے سوال اور مضمون سوال ملتا جلتا ہے، تو آیا یہ ایک ہی شخص تھا، ایک ہی واقعہ تھا یا الگ الگ واقعہ اور الگ الگ شخص تھے؟

علامہ طیبی، حافظ تورپشتی اور قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ دونوں واقعات ایک ہی شخص کے ہیں اور سائل بھی ایک ہی ہے جن کا نام ضمام بن ثعلبہ ہے، یہ حضرات اپنی تائید میں قرائن اور بعض احادیث کے اشارات اور امام مسلم کے طرز بیان کو پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف امام قرطبی امام نووی اور شاہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں، دونوں حدیثوں کا طرز بیان بھی مختلف ہے، دونوں جگہ سوالات کا انداز بھی مختلف ہے اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے بشارت کے کلمات میں بھی فرق ہے، لہٰذا اس حدیث میں واقعہ ضمام بن ثعلبہ کا ہے اور گزشتہ حدیث میں واقعہ سعد بن اخرم کا تھا۔[۲]

"**من اهل نجد**": نجد بلند زمین کو کہا جاتا ہے، اس کا مقابل تہامہ ہے جو نشیب زمین میں واقع ہے، آج کل حجاز پر اہل نجد کی حکومت ہے، ریاض اور اس کے اطراف کے علاقے نجد میں آتے ہیں۔[۳]

"**ثائر الراس**": یہاں مضاف محذوف ہے یعنی "**منتشر شعر الراس**" پراگندہ بال، یا بطور مبالغہ فرمایا کہ بال اتنے پراگندہ تھے گویا سر ہی پراگندہ تھا۔[۴]

---

[۱] المرقات ۱/۱۶۴ [۲] المرقات ۱/۱۶۴ [۳] المرقات ۱/۱۶۴ [۴] المرقات ۱/۱۶۴

"دوی": یہ دوی النحل کی طرح ہے بھنبھناہٹ مراد ہے، علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دوی سے مراد ایسے کلمات ہیں جن کی آواز تو سنی جاسکتی ہو، مگر مفہوم سمجھ میں نہ آتا ہو، جیسے شہد کی مکھی کی آواز ہوتی ہے۔ [1]

اس شخص کے بالوں اور لباس کی حیثیت سے تو یہ معلوم ہوا کہ یہ ایک طویل سفر کر کے آیا تھا اور سوال کے دوران گنگناہٹ کی آواز سے معلوم ہوا کہ ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قدرتی رعب پڑ رہا تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا تھا۔

"فاذا ھو یسأل" اذا مفاجاتیہ تعجب کے لئے لایا گیا ہے کہ ایسے ضعیف پراگندہ حال اور ایسے بدوی دیہاتی سے، اسلام کے متعلق سوال کرنا باعث تعجب اور غیر متوقع تھا۔ [2]

"عن الاسلام": ای عن فرائضہ التی فرضت علی من وحد اللہ و صدق رسولہ لا عن حقیقۃ الاسلام".

یعنی اسلام کے ان فرائض کے متعلق سوال کر رہا تھا جو رسول کے ماننے والے ہر موحد پر فرض ہوتے ہیں، اسلام کی حقیقت اور تعریف کے بارے میں سوال نہیں تھا، اسی وجہ سے جواب میں فرائض وارکان کا ذکر آیا ہے شہادتین کا ذکر نہیں ہے۔ یہ شخص چونکہ پہلے سے مسلمان تھا اس لئے شہادتین کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، بخاری شریف کی روایت سے اس کی تائید ملتی ہے وہاں یہ الفاظ ہیں "فاخبرنی ماذا فرض اللہ علی من الصلوات"۔ [3]

سوال: سوال یہ ہے کہ فرائض اسلام میں یہاں حج کا ذکر کیوں نہیں آیا؟

جواب: ممکن ہے اس وقت حج فرض نہیں ہوا ہو کیونکہ حج چھ یا آٹھ یا نو ہجری کو مختلف اقوال کے مطابق فرض ہوا تھا۔

دوسرا جواب: یہ کہ یہ آدمی ممکن ہے کہ قابل حج نہیں تھا، غریب آدمی تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا ذکر چھوڑ دیا۔

تیسرا جواب: یہ کہ ممکن ہے کسی راوی نے نسیاناً یا بطور اختصار اس کا ذکر نہیں کیا ہو، حالانکہ بخاری میں روایت کے یہ الفاظ بھی ملتے ہیں۔ [4]

"فاخبرہ النبی بشرائع الاسلام": یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو اسلام کے تمام شرائع کی خبر دے دی تھی۔

"خمس صلوات: یعنی پانچ نمازیں قائم کرنی ہیں "اقامۃ خمس صلوات" او "خذ خمس صلوات"۔

سوال: اس روایت میں وتر کا ذکر نہیں ہے بلکہ پانچ فرائض کے علاوہ سب کو نوافل کہا گیا ہے جب کہ وتر کا وجود بھی ہے اور وجوب بھی ہے۔

جواب: ایک جواب یہ کہ اس وقت وتر کا وجوب نہیں ہوا تھا، عیدین کا وجوب بھی نہیں ہوا تھا۔ دوسرا جواب یہ کہ یہاں فرائض کا سلسلہ اور بیان تھا، وتر کا سلسلہ فرائض کا نہیں بلکہ واجب کا ہے یا وتر عشاء کی نماز کے تابع ہے تو الگ ذکر نہیں کیا، باقی عیدین تو صلوٰۃ سنویہ یعنی سالانہ نماز تھی یہاں صلوٰۃ یومیہ کا ذکر چل رہا ہے۔ [5]

---

[1] المرقات ۱/۱۶۴ [2] المرقات ۱/۱۶۵ [3] المرقات ۱/۱۶۵ [4] المرقات ۱/۱۶۵ [5] المرقات ۱/۱۶۵

شروع نوافل کا حکم:

"الا ان تطوع" اس جملہ کا ایک مطلب یہ ہے کہ تیرے ذمہ فرض نمازیں تو صرف پانچ ہیں، ہاں اگر نوافل ادا کرنا چاہو تو ادا کر سکتے ہو، یہ مطلب واضح ہے مگر یہ اس وقت ہے جبکہ استثناء منقطع ہو الا بمعنی لکن ہو۔

لیکن اگر استثناء متصل ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ تیرے ذمہ صلوات خمسہ کے سوا کوئی نماز واجب نہیں، ہاں اگر نوافل شروع کرو گے تو اس کے بعد وہ واجب ہو جائیں گے جن کا مکمل کرنا ضروری ہوگا، بدلیل قولہ تعالیٰ "لا تبطلوا اعمالکم" نیز صحابہ کرام کا نفلی حج پر اجماع ہے کہ شروع فی الحج کے بعد اس کا اتمام واجب ہے ان دلائل کے بعد ابن حجر رحمہ اللہ کے اس اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی کہ نوافل میں شروع کے بعد اس کے اتمام کو لازم کہنا بلا دلیل ہے نص قرآنی اور اجماع صحابہ بڑی دلیل ہے۔

خود شوافع حضرات بھی نفلی حج اور نفلی عمرہ کے شروع کرنے کے بعد اتمام کو واجب سمجھتے ہیں اور اس مسئلہ میں امت کا اتفاق ہے، احناف پر یہ اشکال ضرور آتا ہے کہ جب نص قرآنی اور احادیث سے اتمام ثابت ہے تو پھر نوافل کے اس اتمام کو فرض کیوں نہیں کہتے ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "لا تبطلوا اعمالکم" اپنی دلالت میں قطعی نہیں اگرچہ ثبوت میں قطعی ہے تو اس سے فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔[1]

"لا ازید ولا انقص": ... ای لا ازید فی التبایغ ولا انقص او لا ازید فی السوال ولا انقص فی العمل او لا ازید من تلقاء نفسی ولا انقص کذلک او الکلام علی محاورۃ العرب والعجم او اراد الرجل کمال الاطاعۃ کما مر تشریح الحدیث فی حدیث أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ۔

"افلح الرجل": الف لام جنس کے لئے ہے مراد ہر وہ شخص ہے جو اس طرح عزم بالجزم کر کے پابندی کرے۔

فلاح کی دو قسمیں ہیں ایک دنیوی ہے وہ یہ کہ زندگی بھی ملے اور زندگی کے تمام اسباب بھی ملیں۔ دوسری اخروی ہے وہ یہ کہ نجات تام حاصل ہو جائے "افلح" کا کلمہ تمام بھلائیوں کے لئے جامع کلمہ ہے، بعض نے اس کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے "بانہ بقاء بلا فناء وغناء بلا فقر وعز بلا ذل وعلم بلا جھل۔"[2]

"ان صدق": پہلی حدیث اور اس میں الفاظ کا تفاوت ہے، وہاں یقین کے جملے غیر مشروط تھے، یہاں "ان صدق" کے ساتھ مشروط کیا ہے تو اگر واقعات دو ہیں، آدمی الگ الگ ہیں جس طرح سوال سے بھی پتہ چلتا ہے اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے جزم کے ساتھ کہا ہے تو پھر تو کوئی اشکال نہیں معاملہ صاف ہے، لیکن اگر ایک ہی واقعہ ہے، ایک ہی آدمی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ پہلی حدیث میں جزم کے ساتھ اور اس حدیث میں شک کے ساتھ حکم کیوں آیا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جزم اور یقین کے ساتھ حکم اس وقت سنایا گیا ہے جب کہ یہ شخص موجود نہیں تھا اور جس وقت موجود تھا

---

[1] المرقات ۱/۱۶۵، ۱/۱۶۶ [2] المرقات ۱/۱۶۷

تو شک ڈال دیا تا کہ آدمی غرور و تکبر اور سستی میں نہ پڑ جائے۔ یا یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ لوگوں کے احوال کے تغیر سے وحی کے ذریعہ سے نیا نیا حکم آتا رہتا تھا، کبھی یقین کی حالت تھی، کبھی شک کی ہوگئی۔[۱]

۲۵ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

حدیث وفد عبد القیس

﴿۱۶﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ إِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ لَمَّا أَتَوُا النَّبِيَّ ﷺ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَنِ الْقَوْمُ أَوْ مَنِ الْوَفْدُ قَالُوا رَبِيعَةُ قَالَ مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ. أَوْ بِالْوَفْدِ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامٰى قَالُوا يَارَسُولَ اللهِ إِنَّا لَا نَسْتَطِيعُ أَنْ نَأْتِيَكَ إِلَّا فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ فَمُرْنَا بِأَمْرٍ فَصْلٍ نُخْبِرْ بِهِ مَنْ وَرَاءَنَا وَنَدْخُلْ بِهِ الْجَنَّةَ وَسَأَلُوهُ عَنِ الْأَشْرِبَةِ فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ. وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ أَمَرَهُمْ بِالْإِيمَانِ بِاللهِ وَحْدَهُ قَالَ أَتَدْرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللهِ وَحْدَهُ قَالُوا اَللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ وَإِقَامُ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ وَصِيَامُ رَمَضَانَ وَأَنْ تُعْطُوا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ عَنِ الْحَنْتَمِ وَالدُّبَّاءِ وَالنَّقِيرِ وَالْمُزَفَّتِ وَقَالَ احْفَظُوهُنَّ وَأَخْبِرُوا بِهِنَّ مَنْ وَرَاءَكُمْ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَلَفْظُهُ لِلْبُخَارِيِّ)[۲]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب وفد عبد القیس نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں مدینہ پہنچا تو نبی اکرم ﷺ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں یا یوں پوچھا کہ یہ کس قبیلہ کا وفد ہے۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ قبیلہ ربیعہ کے افراد ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا خوش آمدید۔ (اور چونکہ تم لوگ خوشی سے مسلمان ہو کر آئے اس لئے) نہ دنیا میں تمہارے لئے رسوائی ہے اور نہ آخرت کی شرمندگی ہے۔ اہل وفد نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! چونکہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا (مشہور جنگجو) قبیلہ پڑتا ہے اس لئے ہم آپ کی خدمت میں جلد جلد نہیں آسکتے ہیں صرف ان مہینوں میں آسکتے ہیں جن میں لڑنا حرام ہے۔ لہٰذا آپ حق و باطل کے درمیان واضح اور دوٹوک انداز سے فرق کرنے والے ایسے احکام ہمیں عطا فرما دیجئے جن پر ہم خود بھی عمل کریں اور ان لوگوں کو بھی ہم اس سے آگاہ کر دیں جن کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور اس پر عمل کرنے سے ہم جنت میں داخل ہو جائیں اسی کے ساتھ انہوں نے ان برتنوں کے بابت بھی پوچھا (جن میں نبیذ بنائی جاتی تھی کہ کون سے استعمال میں لائے جا سکتے ہیں اور کون سے نہیں) آپ ﷺ نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے منع کیا۔ اول اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے کا حکم دیا اور فرمایا اللہ پر ایمان لانا اس حقیقت کی شہادت دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود حاجت روا اور مشکل کشا نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، پابندی سے نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ماہ رمضان کے روزے رکھنا، ان چار باتوں کے علاوہ بعد میں آپ ﷺ نے

---

[۱] المرقات ۱/۱۶۷　　[۲] اخرجه البخاری ۱/۲۰ و مسلم ۱/۳۵

مال غنیمت میں سے پانچویں حصے کے دینے کا حکم بھی فرمایا، اور ان چار برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا ① لاکھ کئے ہوئے برتنوں سے ② کدو کی تونبوں سے ③ درخت کی کھوکھلی جڑوں سے بنائے ہوئے برتنوں سے ④ اور رال کئے ہوئے برتنوں سے پھر آپ ﷺ نے فرمایا ان باتوں کو اچھی طرح یاد کرلو اور جن مسلمانوں کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو ان کو بھی ان باتوں سے آگاہ کردو۔

(بخاری ومسلم، الفاظ بخاری کے ہیں)

توضیح: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی ہیں ہجرت سے تین سال قبل مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے تھے حضور اکرم ﷺ کے انتقال کے وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی آنحضرت ﷺ نے ان کے لئے فقاہت حکمت اور تفسیر قرآن کی دعا مانگی تھی اس لئے گفتگو میں افصح الناس تھے، علم میں اعلم الناس تھے اور شکل میں اجمل الناس تھے، لمبے قد کے مالک تھے، جب پیدل چلتے تو سواری پر معلوم ہوتے تھے، دو دفعہ جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں ان کو عمر رسیدہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر مقدم رکھتے تھے اور ان سے مشورہ لیتے تھے، آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، ۷۱ سال کی عمر میں ۶۸ ھ میں انتقال کر گئے، طائف میں جامع مسجد ابن عباس کے مکتبہ ابن عباس میں مدفون ہیں۔

"ان وفد عبد القیس": وفد وافد کی جمع ہے جیسے رکب راکب کی جمع ہے، وفد اس جرگہ کا نام ہے جو کسی قوم کی طرف سے اشراف پر مشتمل جماعت ہو اور کسی امیر وحاکم کے پاس اپنی حاجت کے سلسلہ میں جائے۔

عبد القیس ان کے بڑے دادا کا نام تھا یا وفد کے لیڈر کا نام تھا، یہ وفد چالیس افراد پر مشتمل تھا اور قبیلہ ربیعہ بن نزار سے ان کا تعلق تھا جو قبیلہ مضر کے مقابل تھے۔[1]

وفد عبد القیس کب مدینہ آیا تھا:

عبد القیس بحرین کا ایک بڑا قبیلہ تھا، یہ وفد مدینہ منورہ کب آیا تھا؟ اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کب حاضری دی تھی؟ اکثر علماء اور شارحین حدیث کے قول کے مطابق یہ وفد ۸ ھ میں آیا تھا اور یہ لوگ برضا ورغبت خود مسلمان ہو کر آئے تھے، امام تاریخ علامہ واقدی اور قاضی عیاض رحمہما اللہ تعالیٰ اسی قول کی طرف گئے ہیں۔ امام مغازی ابن اسحاق اور ابن کثیر وغیرہ اہل تاریخ کے نزدیک یہ وفد ۹ ھ میں آیا تھا۔ ابن اثیر اور تاریخ خمیس والے نے اس وفد کی آمد کو ۱۰ ھ میں بتایا ہے۔

تحقیق کے بعد یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ یہ وفد دو دفعہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا تھا ایک مرتبہ ۵ ھ میں اور دوسری دفعہ ۹ ھ میں حاضر خدمت ہوا تھا۔

---

[1] المرقات ۱/۱۶۷، ۱۶۸

وفد عبد القیس کی آمد کا سبب:

بحرین کے لوگ تاجر پیشہ تھے، ان میں سے ایک تاجر منقذ بن حیان بغرض تجارت مدینہ منورہ آیا تھا آنحضرت ﷺ سے ان کی ملاقات ہوئی نبی اکرم ﷺ نے دلچسپی سے اہل بحرین کے شرفاء کے حالات ان سے معلوم کئے اور خصوصیت سے ایک صاحب منذر بن عائذ کے حالات دریافت کیے۔ آنحضرت ﷺ نے منقذ بن حیان کو اسلام کی دعوت دی، وہ مسلمان ہو گئے اور کچھ ضروری چیزیں اسلام کی سیکھ کر واپس وطن جانے لگے۔ آنحضرت ﷺ نے بحرین کے سرداروں کے نام خط لکھ کر ان کے حوالہ کر دیا منقذ بن حیان یہ خط لے کر بحرین پہنچا اور منذر بن عائذ ملقب باشج عبد القیس کے ہاتھ میں دے دیا۔ منقذ بن حیان اشج عبد القیس کا داماد تھا ان کی بیوی اشج کی بیٹی تھی وہ منقذ بن حیان کو عبادت کرتے ہوئے دیکھتی تھی اور حیران ہو جاتی تھی اس نے اپنے باپ اشج کے سامنے اس کا تذکرہ کیا کہ میرا شوہر جب سے مدینہ سے واپس آیا ہے وہ عجیب عجیب عبادات میں مشغول رہتے ہیں۔ اشج نے جب آنحضرت ﷺ کا خط کھول کر پڑھا اور بیٹی سے اسلام کے بارے میں سنا تو وہ مسلمان ہو گیا پھر انہوں نے مجمع میں یہ خط پڑھ کر سنایا لوگ مسلمان ہو گئے اور پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری دی اس دفعہ یہ وفد تیرہ آدمیوں پر مشتمل تھا۔[1]

مدینہ پہنچ کر سب نے دوڑ دوڑ کر آنحضرت ﷺ کو سلام کیا، دست بوسی کی لیکن اشج نے پہلے ساتھیوں کا سامان محفوظ کیا، پھر اونٹ باندھ دیئے، پھر نئے کپڑے پہن کر نہایت وقار سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری دی، دست مبارک کو بوسہ دیا، شکل و شباہت اچھی نہیں تھی، آنحضرت ﷺ نے تعجب سے جب دیکھا تو اشج کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ انسان کی یہ کھال تو مشکیزہ کی مانند ہے، اصل انسان تو یہ نہیں ہے درحقیقت "**الانسان باصغریه**" یعنی دو چھوٹے اعضاء کی وجہ سے انسان انسان ہے اور وہ دل اور زبان ہیں۔ اشج سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول پسند کرتے ہیں "دانائی اور بردباری" اشج نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ خصلتیں پیدائشی ہیں یا میں نے کسب سے حاصل کی ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا تجھ میں یہ پیدائشی ہیں اس پر وہ خوش ہوئے اور پھر کہا: "**الحمد لله الذی جبلنی علی خلیقتین یحبهما الله ورسوله**"۔

چونکہ منذر بن عائذ کے چہرے پر زخم کا نشان تھا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو اشج کا لقب دیا، چنانچہ نووی فرماتے ہیں کہ منذر بن عائذ کو اشج کا لقب حضور اکرم ﷺ نے دیا تھا پھر وہ اشج عبد القیس سے مشہور ہوا۔

من القوم او من الوفد: اس کلام میں راوی کو شک ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "**من القوم**" فرمایا تھا یا "**من الوفد**" فرمایا تھا، یہ صحابہ کرام کا نہایت احتیاط اور ان کی اعلیٰ ذہانت اور امانت اور حضور اکرم ﷺ سے محبت تھی کہ تلفظ میں تغیر کو گوارا نہیں کرتے تھے، لفظ "**او**" کے بعد "**قال**" پڑھا جاتا ہے حضور اکرم ﷺ کا ان لوگوں سے یہ سوال یا تو تعارف کے لئے تھا یا طلب استیناس کی غرض سے تھا، یہ آپ کی عام عادت تھی جس میں محبت ہی محبت تھی۔[2]

---

[1] المرقات ۱/۱۶۵، ۱۶۶ [2] المرقات ۱/۱۶۸

قالوا ربیعة: ای نحن من ربیعة بن نزار، ہمارا تعلق ربیعہ سے ہے۔[1]

قال مرحبا: مرحب مصدر میمی بمعنی وسعت ہے **"ای اصاب القوم رحبا وسعة"** یہ لفظ اسی فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے **"رحب یرحب رحبا و مرحبا"** وسعت اور کشادگی کے معنی میں ہے۔[2]

"غیر خزایا": غیر حال ہے اس لئے منصوب ہے خزایا، خزیان کی جمع ہے اور خزی ذلت و رسوائی کے معنی میں ہے۔[3]

"ولا ندامی": یہ ندمان کی جمع ہے جو نادم پشیمان کے معنی میں ہے، اگرچہ ندمان کا ایک معنی ہمنشین بھی ہے مگر وہ یہاں مراد نہیں بلکہ نادم کے معنی میں استعمال ہوا ہے، بعض نے ندامی کو نادم کی جمع کہا ہے، مگر یہ قید لگا دی ہے کہ یہ خلاف القیاس ہے کیونکہ نادم کی جمع قیاس کے مطابق نادمین ہے، بہر حال ''خزایا'' کا ہم وزن بنانے کی غرض سے ''ندامی'' لایا گیا ہے ورنہ نادمین لایا جاتا اور ہم وزن کا خیال عربی کلام میں رکھا جاتا ہے، جیسے ''عشایا'' کے لئے ''غدایا'' لایا جاتا ہے حالانکہ غداۃ کی جمع غدوات ہے نہ کہ غدایا، اسی طرح لادریت کی رعایت کر کے **"لادریت ولا تلیت"** لایا گیا ہے حالانکہ یہ **"لاتلوت"** ہے مگر پڑوس کا خیال رکھا جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ اس وفد کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اچھا ہوا کہ تم سے ہماری لڑائی نہیں ہوئی، لڑائی سے پہلے از خود اسلام قبول کر کے آگئے تو لڑائی کی رسوائی سے بچ گئے، نیز جنگ نہ ہونے کی صورت میں پشیمانی بھی اٹھانی نہ پڑی، ورنہ اگر جنگ ہوتی آدمی قتل ہوجاتے یا گرفتار و زخمی ہوتے تو اب پشیمانی ہوتی کہ کاش جنگ نہ کرتے پہلے مسلمان ہوجاتے۔[4]

الشهر الحرام: یہاں **"الشهر"** میں الف لام جنس کے لئے ہے جس کا اطلاق قلیل و کثیر سب پر ہوتا ہے، تو **"الشهر الحرام"** سے تقدس و احترام کے چار مہینے مراد ہیں جن میں تین ایک ساتھ ہیں اور ایک الگ ہے۔ ذوالقعدہ اور ذوالحجہ اور محرم ایک ساتھ ہیں اور رجب الفرد الگ ہے لہٰذا یہاں گویا مفرد کے ساتھ جمع کا معاملہ کیا گیا ہے کہ **"الشهر الحرام"** سے چاروں مہینے مراد ہیں اور اس کی تائید بخاری و مسلم سے ہوتی ہے کہ وہاں **"اشهر الحرم"** جمع کا لفظ موجود ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں اس وفد نے **"الشهر الحرام"** سے صرف رجب کا مہینہ مراد لیا ہے کیونکہ قبیلہ مضر کے لوگ رجب کا احترام بے حد کرتے تھے حتیٰ کہ رجب کا نام رجب مضر ہو گیا تھا۔ اس رائے کی تائید بیہقی اور ابو بکرہ کی روایت سے ہوتی ہے کہ **"الشهر الحرام"** سے مراد رجب مضر ہے، اس رائے کے مطابق **الشهر الحرام** میں الف لام عہد کے لئے لیا جا سکتا ہے۔ اب یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ ۹ ھ میں جزیرہ عرب آزاد ہو چکا تھا پھر اس وفد نے مضر کی جنگ اور راستہ کی بات کیوں اٹھائی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وفد ایک دفعہ ۶ ھ کو آیا تھا یہ اسی وقت کی بات ہے اس وقت قبیلہ مضر مسلمان نہیں ہوا تھا۔[5]

امر فصل: فصل کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ فاصل کے معنی میں ہے جو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن امر ہو یا فصل مفصول و مفصل کے معنی میں ہے کہ ہمیں خوب تفصیل سے بتا دیجئے تا کہ ہم کسی اور کی طرف محتاج نہ ہوں۔[6]

---

[1] المرقات ۱/۱۶۸ [2] المرقات ۱/۱۶۸ [3] المرقات ۱/۱۶۸،۱۶۹ [4] المرقات ۱/۱۶۹ [5] المرقات ۱/۱۶۹ [6] المرقات ۱/۱۶۹

نخبر به: یعنی ہم ان واضح اور دوٹوک احکامات کو واپس جا کر اپنی قوم کے سامنے بیان کریں گے، اس سے اشاعت دین کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور تبلیغ کی ذمہ داری کا احساس بھی معلوم ہوتا ہے مگر پہلے سیکھ کر تیار ہونے اور پھر جانے کے اصول کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، تفصیل سے سیکھو پھر جاؤ۔[1]

وندخل به الجنة: نخبر وندخل دونوں فعل مجزوم بھی ہیں کیونکہ یہ "**مرنا**" امر کے جواب میں آئے ہیں اور دونوں جملہ مستانفہ کی صورت میں مرفوع بھی ہیں، دخول جنت سے مراد یہ کہ ہم رضائے الٰہی کا خاص مقام چاہتے ہیں جو جنت ہے کیونکہ جنت اللہ تعالیٰ کی رضا کے مجموعے کا نام ہے۔[2]

اب یہ اعتراض نہیں آئے گا کہ عمل تو دخول جنت کا موثر ذریعہ نہیں، موثر علت تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، عمل تو صرف وسیلہ ہے تاہم نفس جنت کا سوال بھی جائز ہے کیونکہ وہ بھی مامور بہ حکم ہے مگر اعلیٰ خلوص کی بات ہی اور ہے۔[3]

وسالوه عن الاشربة: اشربه جمع شرب بمعنی مشروب ہے اور جواب سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گویا فرمایا کہ تم تو مشروب کا پوچھتے ہو میں تو ان مشروبات کے برتنوں کو بھی جائز نہیں سمجھتا، جن میں کبھی شراب رکھنے بنانے اور پینے کا عمل ہوا تھا، کیونکہ یہ برتن مذکرات ہیں، ان سے روکنا بھی تاکیدی حکم ہے تاکہ شراب سے بھی مکمل اجتناب ونفرت ہو جائے، جب اس کی نفرت صحابہ کے دلوں میں بیٹھ گئی، تب برتن رکھنے کی اجازت بھی مل گئی، بہر حال **اشربة** بحذف مضاف ہے **ای عن ظروف الاشربة** کیونکہ یہ لوگ مسلمان تھے حرمت شراب کے پہلے سے قائل تھے۔[4]

"فامرهم باربع":

سوال: یہاں ایک مشہور سوال ہے اور وہ یہ ہے کہ اجمال میں چار چیزوں کا وعدہ کیا گیا کہ "**فامرهم باربع**" مگر تفصیل میں پانچ اشیاء کا ذکر آ گیا ہے یعنی ایمان، نماز، زکوٰۃ، صوم، اعطاء خمس یہ پانچ چیزیں ہیں اور اگر تفصیل واجمال ایک ہے تو پھر صرف ایمان کا ذکر ہو گیا اور اسی کے فروعات کا ذکر آ گیا اور چار چیزوں کا وعدہ پورا نہ ہوا۔

جواب:

اس کے کئی جوابات ہیں اور شارحین نے چھوٹی چھوٹی وجوہات کو بھی کھینچ کر کئی جوابات بنا دیئے ہیں میں دو تین باتیں بیان کروں گا۔

❶ **اول جواب:** یہ کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے چار چیزوں کا وعدہ فرمایا تھا اور "**اقام الصلوٰة، ایتاء الزکوٰة، صوم رمضان، وان تعطوا من الخمس**" تک چاروں کو بیان فرمایا۔ رہ گیا شہادتین کا ذکر تو وہ توطیہ وتمہید اور تبرک کے طور پر تھا کیونکہ یہ لوگ پہلے سے مسلمان تھے، ان کے لئے شہادتین کا ذکر صرف بطور تبرک ہی ہو سکتا ہے۔ اس کی تائید بخاری کی روایت سے ہوتی ہے جہاں شہادتین کا ذکر ہی نہیں، چنانچہ بخاری ج ۲ ص ۹۱۲ پر یہ حدیث اس طرح ہے:

---

[1] المرقات ۱/۱۷۰ [2] المرقات ۱/۱۷۰ [3] المرقات ۱/۱۷۰ [4] المرقات ۱/۱۷۰

عن ابن عباس فقال علیہ السلام اربع واربع ① اقیموا الصلوٰۃ ② وأتوا الزکوٰۃ ③ وصوم رمضان ④ واعطوا خمس ما غنمتم الخ۔

اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شہادتین کا تذکرہ چار چیزوں کے وعدے میں نہیں ہے، جہاں ذکر کیا گیا ہے وہاں بطور تبرک تو طیہ وتمہید ذکر کیا گیا ہے۔ بعض روایات میں آنحضرت ﷺ نے گنتی کے وقت شہادتین پر انگلی بند فرمادی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ گنتی میں امر اول تھا، مگر علماء نے لکھا ہے کہ یہ توحید کی طرف اشارہ تھا گنتی کی طرف نہیں تھا، کیونکہ اس کے بعد آپ نے دوسری انگلی کو نہ بند کیا نہ اشارہ کیا، اگر گنتی ہوتی تو سب میں انگلی بند فرمادیتے۔

② **دوسرا جواب:** یہ ہے کہ شہادت کو امر اول شمار کرو نماز زکوٰۃ روزہ یہ چار ہو گئے۔ اور خمس کا جو ذکر آیا ہے اس کا عطف "**امرھم**" پر ہے عبارت اس طرح ہے "**امرھم باربع وامرھم ان تعطوا من المغنم الخمس**" تو خمس کا ذکر گنتی کے اندر نہیں بلکہ وفد کے مامورات میں سے ہے کہ یہ کرو، یہ کرو اور خمس ادا کرو۔ یہ دو جواب سب سے عمدہ اور قابل اعتماد ہیں۔

③ **تیسرا جواب:** یہ بھی دیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چار چیزوں کی گنتی فرمائی تھی مگر کسی راوی نے اختصار کر کے سب کو چھوڑ دیا اور ایمان کے اجمال وتفصیل کو ذکر کر دیا یہ عجیب جواب ہے۔

④ **چوتھا جواب:** یہ ہے کہ شہادتین سے لے کر خمس تک چار چیزوں کا آنحضرت ﷺ نے ذکر فرمادیا اور مال غنیمت اور خمس کا ذکر بطور اضافہ اس وفد کی مناسبت سے ان کے لئے اس لئے کیا کہ یہ لوگ قبیلہ مضر سے جہاد کے میدان میں برسر پیکار تھے ان کو اس حکم کی ضرورت تھی۔

اس حدیث میں حج کا حکم مذکور نہیں کیونکہ حج ۹ ھ میں فرض ہوا تھا اور وفد عبد القیس ایک دفعہ ۹ ہجری سے پہلے آیا تھا۔

ونھاھم عن اربع: یعنی آنحضرت ﷺ نے ان کو چار قسم کے ایسے برتنوں سے منع فرمایا جس میں وہ لوگ شراب بناتے تھے۔ جن کے مسامات بند ہوتے تھے اور اس میں بہت جلدی شراب بنتی تھی اور جلدی سکر آتا تھا تو ابتداء میں اس میں نبیذ بنانے کو بھی منع فرمایا کہ کہیں دوبارہ شراب بنانا شروع نہ ہو جائے یہ کل چار برتن تھے۔[1]

① **الحنتم: حنتم** اور مٹکا مٹی کا سبز ٹھیلیا یا روغنی مرتبان اور روغنی گھڑا ہوتا تھا۔[2]

② **الدباء:** یہ ایک قسم کا کدو ہے جو خشک ہوتا ہے اور اس کے اندر سے کرید کر تخم کو پھینک دیا جاتا ہے یہ اندر سے بہترین برتن ہے اوپر سے پکڑنے کے لئے ایسی گردن ہے گویا پکڑنے ہی کے اندازے پر تخلیق ہوئی ہے اس کو تونبی بھی کہتے ہیں اب بھی قبائل اور کوہستانی علاقوں میں لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں۔[3]

③ **النقیر:** یہ بھی ایک برتن ہے لوگ کھجور کے درخت کا تنا اندر سے تراش کر کھوکھلا بنایا کرتے تھے اور پھر اس میں شراب بناتے اور رکھتے تھے۔[4]

---

[1] المرقات ۱/۱۷۱ [2] المرقات ۱/۱۷۲ [3] المرقات ۱/۱۷۲ [4] المرقات ۱/۱۷۲

❹ **المزفت:** یہ وہ برتن ہے جس پر وہ لوگ سیاہ تارکول مل لیا کرتے تھے، یعنی روغن زفت یا روغن قار جو کشتیوں پر ملا جاتا تھا اور جاہلیت میں شراب کے ان برتنوں پر مسامات بند کرنے کی غرض سے مل لیا کرتے تھے، یہ بھی روغنی برتن ہے ابتداء میں حرمت شراب کے وقت ان برتنوں کی بھی ممانعت تھی پھر اجازت مل گئی جیسے مشکوٰۃ زیارۃ القبور میں یہ روایت ہے "**ونھیتکم عن النبیذ الا فی سقاء فاشربوا فی الاسقیة کلھا ولا تشربوا مسکرا**"۔

(مشکوٰۃ ص ۱۵۴)[1]

ائمہ احناف کا یہی مسلک ہے اور یہی دلیل ہے باب الاشربہ مشکوٰۃ ص ۳۷۰ میں بھی اسی قسم کی روایات ہیں امام مالک رحمہ اللہ اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے ہاں ان برتنوں کا استعمال اب بھی ناجائز ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک قول اور فتویٰ کو لیتے ہیں کہ انہوں نے منع فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح احادیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت بعد میں ختم ہوگئی تھی لہٰذا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں تاویل کی جائے گی کہ شاید ان کو نسخ کا علم نہ ہوا ہو۔

واحفظوھن: اس سے معلوم ہوا کہ پہلے سیکھو پھر جا کر سکھاؤ، پہلے تبلیغ کی تیاری کرو پھر جا کر تبلیغ کرو، خوب یاد کرو تا کہ بیان کرنے میں غلطی نہ آئے۔[2]

۲۶ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

اسلام کے احکامات

﴿۱۷﴾ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِنْ أَصْحَابِهِ بَايِعُوْنِيْ عَلَى أَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ وَلَا تَأْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهُ بَيْنَ أَيْدِيْكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْا فِيْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ بِهِ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَهُوَ إِلَى اللّٰهِ إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[3]

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کی اس جماعت کو جو آپ کے ارد گرد بیٹھی ہوئی تھی فرمایا مجھ سے ان باتوں پر بیعت (عہد و اقرار) کرو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، اپنے بچوں کو قتل نہ کرو گے، جان بوجھ کر کسی پر بہتان تراشی نہ کرو گے اور شریعت کے مطابق تمہیں جو احکام دوں گا اس کی نافرمانی نہیں کرو گے، پس تم میں سے جو شخص اس عہد و اقرار کو پورا کرے گا، اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور جو شخص (شرک کے سوا) ان میں سے کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے اور پھر دنیا میں اس کو اس کی سزا بھی مل جائے (جیسے حد وغیرہ جاری ہو) تو یہ سزا اس کے

[1] المرقات ۱/۱۷۲،۱۷۳ [2] المرقات ۱/۱۷۳ [3] اخرجہ البخاری ۱/۱۸۷، ۲ومسلم ۵/۱۶۲

اس گناہ کے لئے کفارہ ہوجائے گی۔اور کسی شخص نے ان گناہوں میں سے کسی کا ارتکاب کیا مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈالا (اور دنیا میں سزا نہ ملی) تو اب وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر ہے چاہے تو وہ ازراہِ کرم آخرت میں بھی اسے معاف کردے اور چاہے تو آخرت میں اسے سزا دے دے۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم نے ان سب شرطوں پر آپ ﷺ سے بیعت کی۔

توضیح: عبادۃ: جہاں بھی آئے گا تو **فُعَالہ عجالہ** کے وزن پر آئے گا مگر امام بخاری کے شیخ محمد بن عبادہ واسطی میں ایسا نہیں ہوگا، وہاں عین مفتوح ہے، حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوالولید انصاری ہے، یہ نقباء میں سے ہیں عقبہ اولی ثانیہ اور ثالثہ تینوں میں شریک رہے، اسی طرح بدر اور دیگر تمام غزوات میں بھی شریک ہوئے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کا قاضی بنایا تھا، یہ حمص میں رہے پھر فلسطین چلے گئے اور رملہ یا بیت المقدس میں ۳۴ھ میں انتقال کر گئے ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔[1]

"**عصابة**": فعالہ کے وزن میں احاطہ کا معنی پڑا ہے جیسے **عمامة حمالة، جعابة حبالة**، عصابہ عصب سے ماخوذ ہے اور عصب شدت اور مضبوطی کے معنی میں ہے، چنانچہ سر پر مضبوط پٹی باندھنے کو عصابہ کہتے ہیں۔ دس سے چالیس افراد کی جماعت کو عصابہ کہتے ہیں، یہ بھی ایک دوسرے کے لئے مضبوطی کا سبب ہوتے ہیں، کبھی چالیس سے زیادہ پر بھی بولا جاتا ہے جیسے اصحاب بدر پر عصابۃ کا اطلاق ہوا ہے وہ ۳۱۳ تھے۔[2]

بیعت کی بحث:

بایعونی مبایعہ بیع سے ماخوذ ہے یہ بیعت بھی مشابہ بیع ہے جس طرح بیع **مبادلة المال بالمال بالتراضی** ہے اسی طرح بیعت بھی ایک عہد وعقد اور قول وقرار ہے جس کا مفہوم "**نیل الاجر و الثواب بالطاعة والانقیاد**" ہے گویا اپنی جان و مال کسی کے حوالے کرنا کہ یہ سب اللہ اور اس کے رسول کے ہیں اس کی مرضی میں استعمال کرنا یہ بیعت ہے بیعت کی مشہور چار قسمیں ہیں:[3]

① بیعت اسلام ② بیعت جہاد ③ بیعت خلافت ④ بیعت طریقت۔

صحابہ کرام نے بیعت اسلام اس وقت کیا جب انہوں نے اسلام قبول کیا پھر صلح حدیبیہ کے موقع پر عام بیعت جہاد کیا پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی۔

بیعت طریقت اس بیعت کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کامل شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ترک معاصی اور التزام طاعات کا عہد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آپ کی رہنمائی میں اپنے ظاہر و باطن کو شریعت کے تابع بناؤں گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں جس بیعت کا ذکر آیا ہے یہ کون سی بیعت تھی؟ تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ بیعت بیعت طریقت تھی کیونکہ بیعت اسلام تو صحابہ پہلے کر چکے تھے ایک مسلمان سے بیعت اسلام لینے کی کیا ضرورت ہے۔

---

[1] المرقات ۱/۱۷۳ [2] المرقات ۱/۱۷۳ [3] المرقات ۱/۱۷۴

اسی طرح یہ بیعت جہاد بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ جہاد کا کوئی مضمون اس حدیث میں مذکور نہیں ہے، اسی طرح یہ بیعت خلافت بھی نہیں تھی کیونکہ یہاں نبوت کا دور ہے خلافت کا دور ابھی نہیں آیا تھا، کیونکہ نبی کے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت خلافت بعد میں ہوئی اب واضح طور پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ یہ بیعت ترک معاصی اور التزام اطاعت کے لئے تھی اور یہی بیعت طریقت ہوتی ہے گو اس وقت اس کا نام نہیں تھا اور نہ اس کی شہرت تھی تاہم وقتاً فوقتاً آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام سے صفاء باطن کے لئے اور التزام شریعت کے لئے اس قسم کی بیعت لی ہے۔ لہٰذا جس بیعت کو بعد میں مشائخ نے بیعت طریقت کا نام دیا ہے اس کا یہ عنوان اور نام نہ سہی آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں دوسرے عنوان کے حوالہ سے اس کا کام ہوا ہے اور وہ تجدید اعمال کا عہد اور التزام شریعت کا وعدہ تھا جو اس حدیث میں واضح طور پر مذکور ہے لہٰذا بیعت طریقت کو بدعت کہنا انتہائی بے انصافی اور ظلم ہے۔

اسی طرح حدیث جبرائیل میں درجہ احسان اسی سلوک اور بیعت طریقت کا نام ہے اگرچہ الگ الگ عنوان ہے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب علم و دلائل کی کشمکش ہو تو یہ شریعت ہے اور جب قلبی طمانیت ہو تو یہ طریقت ہے یا یوں کہیں کہ جب آدمی احکام اسلام پر تکلف کر کے چلتا ہے تو یہ شریعت ہے اور جب مزاج بن جائے تو یہ طریقت ہے یا یوں سمجھیں کہ دین اسلام کا ابتدائی سفر شریعت ہے اور خوب مہارت کے بعد انتہاء طریقت ہے جس طرح ایک ڈرائیور پہلے سیکھتا ہے اور پھر ہاتھ کی صفائی کے لئے شارع عام پر آتا ہے تاکہ خوب مہارت حاصل کرے۔

بہر حال اصل بیعت و طریقت سنت سے ثابت ہے مگر اس میں زیادہ تر ٹھگ لوگ داخل ہو گئے۔ جنہوں نے اس طریقہ کو بدنام کیا ورنہ اہل اللہ کے ہاتھ پر بیعت اور شریعت کی محنت تو کبریت احمر ہے: ؎

نہیں ملتے یہ موتی بادشاہوں کے خزینوں میں

نیز بیعت نساء اور اس کے اصلاحی پہلوؤں کو خود قرآن مجید کی سورت **ممتحنہ** میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اس طرح بیعت طریقت کی ایک اصل قرآن سے ثابت ہوئی پھر سلف صالحین میں یہ مبارک عمل متواتر چلا آیا ہے تو انکار بیکار ہے۔

ان لا تشرکوا: شرک سے مراد شرک اصغر یا ریاکاری ہے یا یہ تجدید بیعت ہے اور آئندہ کے لئے شرک سے بچنے کی ہدایت ہے ورنہ مسلمان تو پہلے سے توحید پر ہوتا ہے۔[1]

عرب میں قتل اولاد کا فلسفہ:

ولا تقتلوا اولادکم: چونکہ عرب میں قتل اولاد کا رواج تھا اس لئے خصوصیت سے یہ بیعت لی گئی۔ عرب میں دو قسم کے لوگ دو مختلف کمزوریوں کی وجہ سے اولاد کو قتل کرتے تھے۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو فی الحال مفلس و فقیر تھے یہ اولاد کا بوجھ اٹھانے سے عاجز تھے، اس لئے اولاد کو قتل کرتے تھے قرآن کریم نے ان کو کہا ہے "**ولا تقتلوا اولادکم من املاق**" دوسرے وہ لوگ تھے جو فی الحال تو خوشحال تھے لیکن ان کو خطرہ تھا کہ آئندہ اولاد بڑھنے سے ہم فقیر ہو جائیں گے

[1] المرقات ۱/۱۷۴

تو وہ اولاد کو قتل کرتے تھے ان کے لئے قرآن کریم نے یہ اعلان کیا "**ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق**" کہ تمہیں آئندہ کا خوف فقر دامن گیر نہیں ہونا چاہیے پھر دونوں قسم کے لوگوں کو تسلی دی گئی۔ اول قسم کو فرمایا "**نحن نرزقکم و ایاھم**" کہ ہم تمہیں بھی اور آئندہ تمہاری اولاد کو بھی رزق دیں گے اور دوسری قسم کو فرمایا "**نحن نرزقھم و ایاکم**" کہ ہم ان کو بھی دیں گے اور تمہیں بھی دیں گے۔ یہ اسلوب کلام فصاحت و بلاغت سے بھرا ہوا ہے ذرا غور تو کرو۔

عرب میں خاص کر بچیوں کے قتل کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ لڑکی بڑی ہو جائے گی تو دوسرے مرد کے ساتھ کیسے جائے گی وہ اس سے جنسی استفادہ کیونکر کرے گا، یہ جاہلیت کی بے جا حمیت تھی جس کی وجہ سے وہ بچیوں کو زندہ درگور کرتے تھے، اسلام نے خواتین پر احسان عظیم کیا اور اس رسم کو حرام قرار دے کر مردوں اور عورتوں کو دوزخ سے بچا لیا۔

آج کل اسکول و کالج میں بچوں اور بچیوں کو داخل کرا کر ان کے مستقبل کو دینی اور اخلاقی اعتبار سے تباہ کرنا بھی درحقیقت زندہ درگور کرنا ہے پیٹ کی خاطر ان کی آخرت تباہ کرنا کون سی تعلیم و عقلمندی ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　صد حیف کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ولا تاتوا ببھتان: بھتان بھت سے مبہوت اور متحیر کرنے کے معنی میں ہے، یہ وہ جھوٹ ہے جو سننے والے کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد "**قذف**" ہے۔[۱]

بین ایدیکم وارجلکم: ہاتھ اور پاؤں کا ذکر اس لئے کیا کہ بڑے بڑے کام انہی سے رونما ہوتے ہیں "**تسمیة الشئی باھم جزئه**" مراد انسان کی ذات اور نفس انسان ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آمنے سامنے کسی پر بہتان نہ لگاؤ کیونکہ یہ سخت تر ہوتا ہے اور باعث فساد ہوتا ہے۔[۲]

ولا تعصوا فی معروف: معروف کا ذکر یہاں تعمیم بعد تخصیص ہے کہ خاص خاص چیزوں کے بعد عام معروف کا ذکر کیا۔ معروف و منکر وہ ہے جس کا حسن اور قبح شریعت سے معلوم ہو۔ معروف میں تمام مامورات و منہیات شرعیہ آ گئے تو اس میں رسالت پر ایمان بھی آ گیا تو ساری شریعت کی اطاعت بھی آ گئی، یہاں معروف کی قید اتفاقی ہے کیونکہ کسی نبی کا کوئی فعل غیر معروف نہیں ہوا کرتا مراد یہ کہ **لا تعصوا فی شئی من الاشیاء**۔[۳]

فمن وفی: وفی تخفیفًا وتشدیدًا دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ علامہ طیبی نے لکھا ہے کہ "**وفی**" یہ ہے کہ کوئی کام پورا پورا اور مکمل کیا جائے لہٰذا یہ ثواب اس شخص کو ملے گا جو تمام حقوق و عہود مکمل کرے۔[۴]

فعوقب به: یعنی اس مرتکب گناہ پر حد شرعی قائم کر دی گئی۔ **فھو کفارة له**، ایک نسخہ میں **فھو طھور له** آیا ہے یہ حکم شرک کے علاوہ دیگر معاصی کے لئے ہے۔[۵]

---

[۱] المرقات ۱/۱۶۴　[۲] المرقات ۱/۱۶۴　[۳] المرقات ۱/۱۶۴　[۴] المرقات ۱/۱۶۴　[۵] المرقات ۱/۱۶۴

حدود کفارات ہیں یا زاجرات؟

اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے کہ آیا حدود مکفرات و مطہرات ہیں یا زاجرات ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ حد قائم ہونے کے بعد سزا یافتہ شخص آخرت کے عذاب سے بھی پاک ہوگیا یا یہ صرف دنیوی زجر تھا اور آخرت میں پھر سزا ہوگی۔

امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ تینوں کے نزدیک حدود مطہرات ہیں کہ دنیا میں حد قائم ہونے سے یہ شخص آخرت کی سزا سے پاک ہوگیا۔ ائمہ احناف کے نزدیک حدود زاجرات ہیں دنیاوی سزا حد ہے تاکہ معاشرہ میں نظم و امن قائم ہو اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے حکم توڑنے کی سزا الگ ہوگی، ہاں جن حدود سے توبہ ملحق ہو جائے اور سزا یافتہ شخص سچے دل سے توبہ کرے تو پھر یہ حدود مطہرات بنیں گے، بغیر توبہ صرف زاجرات ہیں۔

دلائل:

جمہور کی دلیل زیر بحث حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں "**فھو کفارۃ**" کے الفاظ آئے ہیں کہ حدود کفارات ہیں۔

❶ ائمہ احناف کی پہلی دلیل سورۃ مائدہ آیت محاربہ ۳۴ ہے "**ذلك لهم خزي في الدنيا ولهم في الآخرة عذاب عظيم**" اب اگر حد مطہر و ساتر و مکفر ہے تو قطاع طریق کو آخرت کا یہ عذاب عظیم کیوں ہے؟ معلوم ہوا یہ زاجر ہے ہاں اگر سچی توبہ سے یہ حد ملحق ہو تو پھر زاجر کے ساتھ مطہر بھی ہے۔

❷ اسی سورۂ مائدہ میں آیت نمبر ۳۸ آیت سرقہ کے نام سے مشہور ہے:

"**والسارق والسارقة فاقطعوا ايديهما جزاءً بما كسبا نكالا من الله والله عزيز حكيم فمن تاب من بعد ظلمه واصلح فان الله يتوب عليه**"۔[1]

اس آیت میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا بتایا اور پھر "**فمن تاب**" سے توبہ کا ذکر کیا گیا اگر صرف حد ساتر و مطہر و مکفر ہے تو پھر توبہ کے تذکرے کا کیا مطلب ہے۔ معلوم ہوا حد زاجر ہے ہاں اگر ملحق بالتوبہ ہو تو پھر ساتر اور مطہر ہے۔

❸ سورۂ نور کی حد قذف والی آیت نمبر ۴ میں ہے:

"**فاجلدوهم ثمانين جلدة ولا تقبلوا لهم شهادة ابدا واولئك هم الفاسقون الا الذين تابوا من بعد ذلك واصلحوا**"۔[2]

اس آیت میں حد قذف لگنے کے بعد بھی اس شخص کو فاسق کہا گیا ہے اور اس کو مردود الشہادت قرار دیا گیا ہے اور اس کے بعد اس کی توبہ کا ذکر "**الا الذين**" سے کیا گیا اگر حد ساتر و مکفر و مطہر ہے تو حد لگنے کے بعد وہ مردود الشہادۃ کیوں ہے؟ فاسق کیوں ہے؟ اور پھر اس کی توبہ کا ذکر اور اس کی ترغیب کیوں ہے؟ معلوم ہوا حدود زواجر ہیں سواتر

---

[1] سورۃ مجادلہ ۳۴ [2] سورۃ نور ۴

نہیں۔ یہاں "الا الذین" کا استثناء "فاسقون" سے ہے کیونکہ وہ قریب ہے اور قریب سے استثناء جب ممکن ہو تو وہی متعین ہے۔
نیز یہ استثناء حد قذف سے ممکن بھی نہیں کیونکہ قاضی کے پاس جب گواہ وغیرہ سے ثبوت حد ہو جائے تو وہ حد توبہ کرنے سے ساقط نہیں ہوتی، جب حد ساقط نہیں ہوتی ہے تو پھر استثناء لغو ہو جائے گا اور حاشا وکلا کہ اللہ کا کلام لغو ہو جائے۔
احناف نے ان احادیث سے بھی استدلال کیا ہے جن میں حد لگنے کے بعد حضور ﷺ نے سزا یافتہ شخص سے فرمایا کہ استغفار کرو معافی مانگو بعد اللتیا والتی وبعد القض وقضیضھا انصاف یہ ہے کہ حدود نہ مطلقاً ساتر ہیں اور نہ مطلقاً زواجر ہیں بلکہ اقرار اور توبہ اور عدم اقرار وعدم توبہ کا فرق ہے جس نے جل جل کر اور رو رو کر اقرار کیا اور توبہ کی تو حدود سواتر ہیں ورنہ زواجر ہیں تو طرفین کا اختلاف لفظی بن کر ختم ہو گیا۔ مذکورہ حدیث بھی آیات کی وجہ سے مقید ہوگی اور توبہ کی شرط ملحوظ ہوگی۔
احناف کی طرف سے جمہور کو الزامی جواب یہ ہے کہ مرتد کی سزا دنیا میں موت ہے تو کیا سزا پانے کے بعد یہ مرتد پاک ہو گیا آخرت میں اس کو عذاب نہیں ہوگا؟
فسترہ اللہ علیہ: یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈالا ہے تو اس شخص کو چاہیے کہ وہ بھی اس گناہ کا تذکرہ لوگوں کے سامنے نہ کرے بلکہ خفیہ طور پر توبہ کرے پس قاعدہ یہ ہے کہ خلوت کی معصیت کی توبہ خلوت میں ہے اور جلوت کی جلوت میں ہے۔[1]

۲۷ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

عورتوں کے لئے آنحضرت ﷺ کا فرمان

﴿۱۸﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَرَجَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي أَضْحًى أَوْ فِطْرٍ إِلَى الْمُصَلَّى فَمَرَّ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَإِنِّي أُرِيتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ فَقُلْنَ وَبِمَ يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِينٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ قُلْنَ وَمَا نُقْصَانُ دِينِنَا وَعَقْلِنَا يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ قُلْنَ بَلَى قَالَ فَذٰلِكِ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِهَا قَالَ أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ قُلْنَ بَلَى قَالَ فَذٰلِكِ مِنْ نُقْصَانِ دِينِهَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ عید الفطر یا بقر عید کی نماز کے لئے عید گاہ تشریف لائے تو عورتوں کی ایک جماعت کے پاس سے بھی گزرے (جو نماز کے لئے الگ ایک گوشہ میں جمع تھیں) ان کو مخاطب کر

---
[1] المرقات ۱/۱۷۵ [2] اخرجہ البخاری ۱/۸۳ ومسلم ۱/۶۱

کے آپ ﷺ نے فرمایا اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ وخیرات کرو کیونکہ میں نے تم میں سے اکثر کو دوزخ میں دیکھا ہے (یہ سن کر) عورتوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اس کا سبب کیا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم لعن طعن بہت کرتی ہو اور اپنے شوہروں کی نافرمانی و ناشکری کرتی رہتی ہو اور میں نے عقل و دین میں کمزور ہونے کے باوجود ہوشیار مرد کو بیوقوف بنانے میں تم سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ سن کر ان عورتوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہماری عقل اور ہمارے دین میں کیا کمی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا ایک عورت کی گواہی مرد کی آدھی گواہی کے برابر نہیں؟ انہوں نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس کی عقل کا نقصان ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ جس وقت عورت حیض کی حالت میں ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے انہوں نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس کے دین کا نقصان ہے۔

توضیح: ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا نام سعد بن مالک ہے۔ مگر کنیت سے مشہور ہوئے ہیں۔ قبیلہ خدرہ کی طرف منسوب ہیں جو انصار کا ایک قبیلہ ہے، یہ کثیر الروایت صحابہ میں سے ہیں ۶۴ھ میں مدینہ منورہ میں فوت ہوئے ہیں، آپ کی عمر ۸۴ سال تھی۔ [۱]

فی اضحی: ای فی عید الاضحی تو مضاف محذوف مقدر ہے "او فطر" راوی کو شک ہے۔ [۲]

المصلی: عیدگاہ کے معنی میں ہے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ عیدگاہ آج تک موجود ہے، معلوم ہوا ان کے زمانے تک تھا، اب تو کچھ بھی نہیں چھوڑا گیا، عید کی نماز کے لئے نکلنا سنت متوارثہ ہے۔ بلا ضرورت مسجد میں عید کی نماز پڑھانا سنت متوارثہ مستمرہ کے خلاف ہے۔ ہاں آج کل لوگ اتنے زیادہ ہیں کہ ایک جگہ جمع ہونا محال ہے نیز تخالف عقائد اتنا ہے کہ اجتماع ممکن نہیں۔ [۳]

مر علی النساء: مر کا صیغہ متعدی بالباء وعلی ہوتا ہے، ممکن ہے آپ ﷺ وعظ کے لئے وہاں گئے ہوں یا یہ کہ جب گذر ہی ہوا تو پھر وعظ بھی فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت عورتیں بھی نماز کے لئے مسجدوں میں جاتی تھیں تو زمانہ خیر القرون کا تھا، وحی کا نزول ہو رہا تھا، مدینہ منورہ کی پاک سرزمین تھی، صحابہ کرام کی پاک باز جماعت تھی اور نبی اکرم ﷺ کا مقدس وجود موجود تھا، تو عورتوں کو کئی پابندیوں کے ساتھ مسجد میں آنے کی اجازت تھی۔ [۴]

پھر احوال کی خرابی سے ان پر پابندیوں کا سلسلہ آہستہ آہستہ شروع ہوا پھر مکمل ممانعت کر دی گئی جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے واضح ہے۔ آئندہ اس مسئلہ کی تفصیل آئے گی۔

اریتکن: اگر رؤیت سے رؤیت قلبی مراد ہے تو پھر یہ قلبی رؤیت یا صلوۃ کسوف میں ہوئی ہو گی، یا بطور وحی ہوئی ہو گی یا کشف وانکشاف کی صورت میں ہوئی ہو گی اور اگر رؤیت بصری ہے تو پھر معراج کی رات آپ کو جنت اور دوزخ کی سیر کرائی گئی تھی۔ وہ مراد ہو گی "اری" بمعنی "اعلم" تین مفعول چاہتا ہے۔ مفعول اول "اریتکن" میں نائب فاعل کی تا ہے، مفعول ثانی "کُنَّ" اور "اکثر اھل النار" مفعول ثالث ہے۔ [۵]

---

[۱] المرقات ۱/۱۷۵ [۲] المرقات ۱/۱۷۵ [۳] المرقات ۱/۱۷۵ [۴] المرقات ۱/۱۷۵ [۵] المرقات ۱/۱۷۶

تصدقن: چونکہ صدقہ کفارہ سیئات بنتا ہے کیونکہ حدیث میں ہے **الصدقة ترد البلاء** اور **الصدقة تطفئ غضب الرب**، اور **اتقوا النار ولو بشق تمرة** اور **کل امرء فی ظل صدقته**. اس لئے آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو صدقہ کرنے کا حکم دیا اور پہلے سے عورتوں کو آگ سے بچنے کا علاج بتلادیا تاکہ عورتیں مایوس و پریشان نہ ہوں پھر عورتوں کا دوزخ میں زیادہ ہونا دنیا کی محبت کی وجہ سے تھا تو صدقہ کرنے سے حب دنیا اور بخل و کنجوسی کی خصلت ختم ہو جائے گی۔[1]

اکثر اھل النار: یعنی میں نے دیکھا کہ دوزخ میں عورتیں زیادہ تھیں وہ عورتیں مراد ہیں جو مرچکی تھیں۔

سوال: یہاں پر یہ اشکال ہے کہ جنت میں ہر جنتی کو دو عورتیں ملیں گی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں جنت میں زیادہ ہوں گی اور یہاں دوزخ میں زیادہ بتلائی گئی ہیں ان دونوں باتوں میں واضح تعارض ہے۔

پہلا جواب: یہ ہے کہ عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے اور ان کی پیدائش لڑکوں کی نسبت اتنی کثرت سے ہے کہ جنت میں دو دو ملنے کے باوجود دوزخ میں زیادہ ہوں گی۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ ابتداء میں دوزخ میں زیادہ ہوں گی پھر سزا بھگتنے کے بعد جب جنت میں جائیں گی تو دوزخ میں کم رہ جائیں گی۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ یہاں جو اکثر اہل النار فرمایا تو یہ مردوں کے مقابلے میں نہیں کہا بلکہ فی نفسہ جو تعداد تھی وہ کثیر تھی اس کو کثیر کہا گیا یعنی اتنی نہیں ہونی چاہیے تھی۔

فقلن وبم: یعنی کس وجہ سے اور کس سبب سے ہم دوزخ میں زیادہ ہوں گی؟

قال تکثرن اللعن: لعنت اگر اللہ کی طرف سے کسی پر ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا **ابعاد الله تعالیٰ العبد من رحمته** اور اگر بندے کی طرف سے ہو تو **الدعاء بابعاد العبد من رحمة الله** کے معنی میں ہوگی۔

اب اگر کوئی شخص کسی پر لعنت بھیجتا ہے تو وہ یا خبر دیتا ہے کہ یہ شخص ملعون ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اللہ نے نکال دیا ہے یہ دعویٰ علم غیب ہے جو بڑا جرم ہے اور یا وہ شخص بددعا دیتا ہے کہ اللہ اس شخص کو اپنی رحمت سے باہر فرمادے تو یہ بہت بڑا بخل اور بہت بڑی حسد ہے جو ناجائز ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تعین کے ساتھ کسی پر لعنت بھیجنا جائز نہیں ہے جب تک کہ کفر پر موت واقع ہونے کا یقین نہ ہو جیسے گزشتہ لوگوں میں ابو جہل و فرعون وغیرہ ہیں اور آنے والوں میں ابلیس ہے۔[2]

پھر لعنت کی بڑی دو قسمیں ہیں۔ ایک لعنت "**خروج عن رحمة الله العامة**" ہے یہ لعنت کفار کے ساتھ خاص ہے دوسری لعنت **خروج عن رحمة الله الخاصه** ہے یہ **فساق فجار** مسلمانوں کے لئے بھی اجمالاً بغیر تفصیل و تعین جائز ہے جیسے **لعن الله الواشمة والمستوشمة**. اور **لعن الله السارق** وغیرہ جائز ہے کہ لعن وصف کے تذکرہ کے ساتھ

---

[1] المرقات ۱/۱۷۶ [2] المرقات ۱/۱۷۶

ہوا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے فسادی پر لعنت کرے تو اس میں اجمال ہے تعین نہیں ہے یہ جائز ہے۔

پھر یہاں **تکثرن اللعن** فرمایا کیونکہ تھوڑی لعن تو عورتوں کی عادت بن چکی ہے وہ ان کے مزاج کا حصہ ہے تو اس میں کچھ نرمی کی گئی ہے جیسے غیبت کے بارے میں بعض ائمہ نے کہا ہے کہ یہ کبیرہ کے بجائے صغیرہ ہے ورنہ پوری امت اور خاص کر خواص امت فاسق بن جائیں گے۔

وتکفرن العشیر: عشیر سے مراد شوہر ہے یعنی پوری زندگی شوہر کے احسانات سے مالا مال رہتی ہے لیکن ذرا سی بات پر سب کو فراموش کر دیتی ہے اور کہتی ہے "**ما رایت منك خیر اقط**" نکرہ تحت النفی کے ساتھ کلی طور پر ہر چیز کی نفی کرتی ہے۔[۱]

من ناقصات عقل: یعنی باوجود اس نقص اور کمزوری عقل کے تعجب ہے کہ ایک تجربہ کار ہوشیار عقل مند جہاندیدہ شخص کو کس طرح برباد کر کے رکھ دیتی ہے، یہ کچھ بھی نہ کہے ان کو دیکھنے سے بھی دوسرا برباد ہو جاتا ہے کسی نے سچ کہا:[۲]

یصرعن ذا اللب حتی لا حراك به وهن اضعف خلق الله ارکانا[۳]

شاہوں کے تاج چھینے راجوں کے راج چھینے گردن کشوں کی گردن نیچا دکھا کے چھوڑا

اکبر دبے نہ تھے کسی ظالم کی فوج سے لیکن قتیل ہو گئے عورت کی موج سے

العقل هو قوة غريزة يدرك بها المعالی ويمنعه عن القبائح وهو نور الله فی القلب واللب هو العقل الخالص عن شوب الهوی۔[۴]

سؤال: یہاں عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں ناقص العقل کہا گیا ہے جب کہ بعض عورتیں مردوں کی نسبت بہت تیز ہوتی ہیں حکومت کرتی ہیں۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہی زمانے ایک ہی تعلیم ایک ہی علاقے ایک ہی خاندان کے مردوں اور عورتوں میں اگر موازنہ کیا جائے تو عورت ہر استعداد میں مرد کی آدھی ہوتی ہے خواہ عقل میں ہو خواہ دیکھنے میں ہو یا سننے بولنے چلنے دوڑنے میں ہو ہر قوت میں آدھی ہوتی ہے اور اگر آپ مرد کسی دیہات و جنگل سے اٹھا کر لاؤ گے اور عورت کسی ماڈرن شہر کے تعلیم یافتہ طبقہ سے لاؤ گے تو ظاہر ہے فرق ہوگا کہ عورت ہوشیار، عیار، مکار اور دعار ہوگی۔

پھر یہاں ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ حیض کی بیماری قدرتی طور پر غیر اختیاری طریقے سے عورت کے ساتھ لگی ہوئی ہے تو اس کو دین کا نقصان کیوں بتایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو دین کا حصہ ہی اتنا دیا ہے اب یہ عورت کا قصور نہیں ہے نہ اس کو قصوروار ٹھہرایا جا رہا ہے بلکہ اس کی تخلیق اور تخلیقی حصہ کی نشاندہی کی گئی ہے جو امر واقعی تھا وہ بتلایا گیا۔

پھر دیکھیں کہ اسی حدیث میں نقصان عقل کا پتہ چل گیا کہ عورتوں نے کلام میں ترتیب نبوی کو تبدیل کر دیا حضور ﷺ نے

---

[۱] المرقات ۱/۱۷۶ [۲] المرقات ۱/۱۷۶ [۳] المرقات ۱/۱۷۶ [۴] المرقات ۱/۱۷۶

نقصان عقل کو مقدم رکھا تھا کیونکہ عقل ہی مدار و معیار ہے عورتوں نے جواب میں اس کو موخر کر کے دین کا ذکر پہلے کر دیا، انہوں نے دین کے اہتمام کی وجہ سے اس کو مقدم ذکر کیا۔[1]

الحازم: ہوشیار مرد کے ساتھ جب عورت یہ کھیل کھیل سکتی ہے کہ اس کے جسم کے سب سے زیادہ حساس حصہ عقل ہی کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے تو غیر ہوشیار کم تجربہ کار کے ساتھ کیا کھیل کھیلے گی۔[2]

احدا کن: یعنی ایک عورت جب یہ کام کر سکتی ہے تو کئی عورتوں کا تو پوچھو ہی نہیں۔

من ناقصات: میں ''من'' زائد ہے استغراق کی غرض سے لایا گیا ہے یہ جملہ صفت ہے، موصوف محذوف کے لئے یعنی **ما رایت احدا من ناقصات عقل... الخ**[3] **اذهب للب الرجل الحازم:** یہ صفت ہے یا رایت کے لئے مفعول ثانی ہے **من احدا کن، اذهب** سے متعلق ہے۔

الیس: میں ضمیر شان کی ہے اور **فذالك** میں یہ ممکن ہے کہ خطاب ایک عورت سے ہو تو پھر کاف کو مکسور پڑھنا ہوگا یا **ذالك** ماقبل کے لئے اشارہ ہے جو معروف ہے۔[4]

۲۹ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

انسان کو سرکشی زیب نہیں دیتی

﴿۱۹﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللهُ تَعَالٰى كَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ وَشَتَمَنِي وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ فَأَمَّا تَكْذِيْبُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ لَنْ يُعِيْدَنِي كَمَا بَدَأَنِي وَلَيْسَ أَوَّلُ الْخَلْقِ بِأَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ إِعَادَتِهِ وَأَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ اتَّخَذَ اللهُ وَلَدًا وَأَنَا الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ أَلِدْ وَلَمْ أُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لِي كُفُوًا أَحَدٌ وَفِي رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَأَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ لِي وَلَدٌ وَسُبْحَانِي أَنْ أَتَّخِذَ صَاحِبَةً أَوْ وَلَدًا۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[5]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابن آدم (انسان) مجھ کو جھٹلاتا ہے اور یہ بات اس کے لئے لائق نہیں اور میرے بارے میں بدگوئی کرتا ہے حالانکہ یہ اس کے لائق نہیں۔ اس کا مجھ کو جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جس طرح اللہ نے مجھے اس دنیا میں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے اس طرح آخرت میں وہ مجھ کو دوبارہ ہرگز پیدا نہیں کر سکتا حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے کے مقابلہ میں مشکل نہیں ہے اور اس کا میرے بارے میں بدگوئی اور گالی یہ ہے کہ وہ کہتا ہے اللہ نے اپنا بیٹا بنایا ہے حالانکہ میں تنہا اور بے نیاز ہوں نہ میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ مجھ کو کسی نے جنا اور نہ میرا کوئی ہمسر ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں اس طرح ہے اور اس انسان کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ کا بیٹا ہے حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ کسی کو بیوی یا بیٹا بناؤں۔

[1] المرقات ۱/۱۷۷ [2] المرقات ۱/۱۷۷ [3] المرقات ۱/۱۷۶، ۱۷۷ [4] المرقات ۱/۱۷۷ [5] اخرجه البخاری ۶/۱۲۹، ۶/۲۲۲

توضیح: یہ حدیث قدسی ہے اور حدیث قدسی وہ ہوتی ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نسبت اللہ کی طرف کر کے یوں کہیں کہ "قال الله" اللہ نے یہ فرمایا حدیث قدسی کے معنی اور مضمون آسمانی ہوتے ہیں ہاں الفاظ نبی اکرم ﷺ کے ہوتے ہیں اور نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور قرآن کے معانی و الفاظ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہوتے ہیں جو وحی متلو کہلاتی ہے اور عام احادیث میں معنی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور الفاظ حضور اکرم ﷺ کے ہوتے ہیں مگر اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت نہیں ہوتی ہے۔ اس تشریح سے قرآن کریم اور حدیث قدسی اور عام احادیث میں فرق واضح ہو گیا۔ [1]

کذبنی ابن آدم: اس جملہ میں ابن آدم پر پہلا رد ہے کہ خود تو دوسرے سے پیدا ہے۔ خود دیکھو کہ کن کن احوال سے پلٹ پلٹ کر آئے ہو اور کن کن حالات سے گزرے ہو۔ اب مجھے جھٹلاتے ہو۔

یہاں حشر ونشر کے انکار کو تکذیب قرار دیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حشر ونشر اور قیامت کو دلائل کے ساتھ بار بار بیان فرمایا ہے بندہ جب کہتا ہے کہ حشر نشر نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو جھٹلاتا ہے کہ جو قرآن میں اللہ نے کہا ہے وہ صحیح نہیں ہے یہ صریح تکذیب ہے اس پر حدیث کا یہ جملہ دلالت کرتا ہے کہ [2] **فقوله من يعيدنی:** اعادہ ایجاد بعد عدم مسبوبالوجود کو کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ مجھے وہ زندہ نہیں کرے گا۔ یعنی یا زندہ نہیں کر سکتا ہے یا زندہ نہیں کرے گا یا اس طرح جسم کے ساتھ زندہ نہیں کرے گا یہ تمام صورتیں کفر کی ہیں۔

وليس اول الخلق باهون: یہ ایک عام فہم مثال ہے اور **اول الخلق** میں صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے۔ یعنی الخلق الاول یعنی پہلی بار پیدا کرنا۔ "باھون" اسم تفضیل نہیں بلکہ اصل فعل کے معنی میں ہے بمعنی "ھین" ہیں جیسے **الصيف احر من الشتاء** میں فعل اصل معنی میں مستعمل ہے یعنی میری قدرت میں دونوں آسان ہیں۔ اول اور ثانی کا کوئی فرق نہیں، **اھون** کا ذکر قرآن میں بھی ہے اور اس حدیث میں بھی ہے یہ کلام بندوں کے اعتبار سے ہے کہ تمہارے نزدیک **ایجاد مالم یوجد** کے طور پر اول پیدا کرنا ثانی اعادہ سے زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ اول پیدا کرنے میں تو کوئی مثالِ سابق اور کوئی نمونہ نہیں ہوتا ہے کوئی اصل نہیں ہوتا بلکہ محض انشاء اور ایجاد مالم یوجد ہوتا ہے اور دوبارہ اعادہ کرنے میں سابق مثال اور نمونہ و اصل موجود ہوتا ہے اس کو دوبارہ بنانے میں تو تم بھی کہتے ہو کہ یہ آسان ہے کیونکہ:

ع

نقاش نقشہ ثانی بہتر کشد زاول

جب تمہارے نزدیک عام عادت کے تحت ایک چیز کا اعادہ آسان ہے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے یہ کیا مشکل ہے۔ [3]

واما شتمه اياى: الشتم هو توصيف الشئی بما فيه من نقص وازدراء. یعنی کسی کی طرف کسی ناقص اور حقیر چیز کی نسبت کرنا شتم اور گالی ہے۔

---

[1] المرقات ۱/۱۷۸ [2] المرقات ۱/۱۷۸ [3] المرقات ۱/۱۷۸، ۱۷۹

اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت اس لئے گالی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف ضمنی طور پر احتیاج ومحتاجی کی نسبت ہے کیونکہ توالد وتناسل کی طرف محتاج وہ ہوتا ہے جو استبقاء نوع ونسل اور احراز المال وغیرہ کی طرف محتاج ہو اور یہ نسبت اللہ تعالیٰ کی شان میں گالی اور گستاخی ہے۔[1]

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اس طرح سمجھایا ہے کہ مثلاً ایک انسان ہے اس نے سانپ یا بچھو جنم دیا تو باوجود یہ کہ دونوں حادث اور دونوں زوال پذیر ہیں لیکن خلاف جنس چیز کے جنم دینے سے وہ انسان کتنا عار اور کتنی شرم محسوس کرے گا تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد ثابت کرنا کتنا بڑا عیب ہوگا جب کہ دونوں کے درمیان کوئی مماثلت بھی نہیں کوئی جنسیت بھی نہیں اس سے زیادہ تحقیر کیا ہوسکتی ہے۔ اور اس سے زیادہ بدگوئی اور شتم کیا ہوگا؟ یہی نقصان یہود نے کیا اور کہا "عزیر ابن اللہ" اور نصاری نے کہا "عیسیٰ ابن اللہ" اور مشرکین عرب نے کہا "الملائکۃ بنات اللہ" پھر ایک عیب یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ اولاد قائم مقام ہوگی تو اللہ تعالیٰ کے لئے فنا اور زوال کا عقیدہ بھی آگیا تعالیٰ اللہ علوا کبیرا۔

زمانے کو برامت کہو

﴿۲۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قَالَ اللهُ تَعَالٰى يُؤْذِيْنِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَأَنَا الدَّهْرُ بِيَدِيَ الْأَمْرُ أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ابن آدم مجھے تکلیف دیتا ہے وہ اس طرح کہ وہ زمانہ کو برا کہتا ہے حالانکہ زمانہ کچھ نہیں وہ تو میں ہی ہوں سب تصرفات میرے قبضہ میں ہیں اور شب وروز کی گردش میرے ہی حکم سے ہوتی ہے۔

توضیح: قاعدہ کے مطابق یہ حدیث "عنہ" کے لفظ سے ذکر کرنی چاہیے تھی کیونکہ پہلے بھی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے مگر یہاں نام کی تصریح اس لئے کردی کہ سابق حدیث کے آخر میں "وفی روایۃ عن ابن عباس" کے الفاظ تھے جس سے وہم ہوسکتا تھا کہ عنہ کی ضمیر ابن عباس کی طرف لوٹتی ہو، اس لئے احتیاط کے طور پر "وعن ابی ھریرۃ" کی تصریح کردی سبحان اللہ محدثین کے یہاں کیا ہی احتیاط تھی۔[3]

یوذینی ابن آدم: قولاً وفعلاً کسی ناپسندیدہ مکروہ امر کو کسی شخص تک پہنچانے کا نام ایذا ہے خواہ اس غیر میں اثر کرے یا نہ کرے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ایذا دینے سے مراد ایسا کام کرنا ہے جس سے اللہ اور رسول ﷺ ناراض ہوجائیں۔ دوسرا مطلب یہ کہ چونکہ اللہ تعالیٰ انسانی افعال وغیرہ اشیاء کے تاثر اور انفعال سے پاک ہے لہٰذا یہاں ایذا کا معاملہ مراد ہے کہ ایذا رسانی کا معاملہ کرتا ہے کیونکہ حقیقی ایذا کوئی اللہ تعالیٰ کو نہیں پہنچا سکتا ہے۔[4]

[1] المرقات ۱/۱۷۹ [2] اخرجہ البخاری ۶/۱۶۶ ومسلم ۷/۴۵ [3] المرقات ۱/۱۸۱ [4] المرقات ۱/۱۸۱

یسب الدھر: یعنی نزول مصائب کے وقت زمانہ کو برا کہتا ہے اس کا خیال ہے کہ سب کچھ زمانہ کر رہا ہے یعنی زمانہ دیتا ہے، منع کرتا ہے، نافع ہے اور ضار ہے جیسے اہل جاہلیت کا یہ عقیدہ تھا وہ کہتے تھے "**یا خیبة له. یابؤ سا الدھر فعل کذا و کذا. تباله و حسرة علیه**"۔[۱]

وانا الدھر: یعنی زمانہ کو موثر سمجھ کر گالی دیتے ہیں اور حقیقت میں متصرف میں ہوں تو گالی میری طرف لوٹے گی کیونکہ زمانہ میں جو انقلاب آتا ہے اس کا فاعل میں ہوں تو بالواسطہ یہ گالی مجھ کو دی گئی۔ امام راغب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دھر کی طرف خیر وشر خوشی اور غم کی جو نسبت کی جاتی ہے اللہ فرماتے ہیں کہ اس خیر وشر کا فاعل میں ہوں، پس جس کو تم فاعل خیال کرتے ہو جب اس کو گالی دیتے ہو گویا تم مجھے گالی دیتے ہو۔ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں مضاف محذوف ہے یعنی **انا مقلب الدھر والمتصرف فیه**۔ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں کہ عبارت اس طرح ہے **انا المدھر ای مقلبه**۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور مسئلہ کے ضمن میں لکھا ہے کہ انسان جب کسی کو عصاء سے یا کسی اور چیز سے مارتا ہے تو اصل میں لاٹھی یا آدمی مارنے والا نہیں بلکہ آدمی اور لاٹھی کے علاوہ ایک غیر مرئی طاقت ہے سارا کام اسی کا ہے یعنی حقیقت میں ضرب کا اثر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے تصرف میں ہے۔[۲]

اللہ تعالیٰ کا صبر وتحمل

﴿۲۱﴾ **وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَا أَحَدٌ أَصْبَرَ عَلَى أَذًى يَسْمَعُهُ مِنَ اللهِ يَدْعُونَ لَهُ الْوَلَدَ ثُمَّ يُعَافِيهِمْ وَيَرْزُقُهُمْ.** (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۳]

ترجمہ: اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تکلیف دہ کلمات سن کر اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر وتحمل کرنے والا کوئی نہیں لوگ اس کے لئے بیٹا تجویز کرتے ہیں اور وہ اس پر بھی ان کو عافیت بخشتا ہے اور روزی پہنچاتا ہے۔

توضیح: صبر کی تعریف اس طرح ہے: "**الصبر ھو حبس النفس عما تشتھیه**" یعنی چاہت والی چیزوں سے اپنے نفس کو روکے رکھنے کا نام صبر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مفہوم میں تو صبر کی نسبت اللہ کی طرف جائز نہیں ہے پھر یہاں صبر کا اطلاق اللہ پر کیسے ہوا ہے؟ اس کا جواب شارحین حدیث نے یہ دیا ہے کہ صبر کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جائے تو اس سے مراد **تأخر العذاب عن المستحق** ہوتی ہے۔[۴]

گویا یہ ان الفاظ میں سے ہے جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر غایت اور انجام ونتیجہ کے اعتبار سے ہوتا ہے جیسے رحمت، حیاء وغیرہ الفاظ ہیں۔ یہ مبادی کے اعتبار سے اللہ پر نہیں بولے جاتے ہیں بلکہ منتہیٰ کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں۔

اذی: اسم فاعل کے معنی میں ہے **ای الموذی**، یا ایذا رسانی کا معاملہ کرتے ہیں "اللہ تعالیٰ کے سننے اور سماعت سے مراد

[۱] المرقات ۱/۱۸۱ [۲] المرقات ۱/۱۸۱ اشعة اللمعات: ۱/۶۰، ۶۱ [۳] اخرجه البخاری ۸/۳۱ ومسلم ۸/۱۳۳ [۴] المرقات ۱/۱۸۲

مایلیق بشانہ ہے انسان بواسطہ جارحہ مخصوصہ سنتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ بغیر واسطہ اور بغیر آلہ سنتا ہے۔ اس حدیث میں تخلق باخلاق اللہ کی تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ قادر بھی ہے سنتا بھی ہے پھر بھی صبر کرتا ہے تو تم لوگ بھی صبر کی عادت ڈالو حالانکہ تم قادر علی الاطلاق بھی نہیں ہو۔[1]

صبر کی موٹی موٹی تین قسمیں ہیں:

صبر علی الطاعة: کہ حالات جیسے بھی ہوں ہمیں عبادت میں لگے رہنا چاہیے۔

صبر علی المعصیة: کہ ہر حال میں گناہ سے بچنے کا جذبہ دل میں ہو اور گناہ سے رک کر صبر کرتا رہے۔

صبر علی المصیبة: یہ آخری قسم جو ہے اس کو عوام اور خواص صبر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ صبر کی تین قسمیں ہیں جس کا بیان اوپر ہو گیا۔

۳۰ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ

توحید کی اہمیت

﴿۲۲﴾ وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ كُنْتُ رِدْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى حِمَارٍ لَيْسَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ إِلَّا مُؤْخِرَةُ الرَّحْلِ، فَقَالَ يَا مُعَاذُ هَلْ تَدْرِيْ مَا حَقُّ اللهِ عَلَى عِبَادِهِ؟ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ قُلْتُ اَللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ قَالَ فَإِنَّ حَقَّ اللهِ عَلَى الْعِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ أَنْ لَا يُعَذِّبَ مَنْ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَفَلَا أُبَشِّرُ بِهِ النَّاسَ قَالَ لَا تُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سفر کے دوران سواری کے گدھے پر میں آنحضرت ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا میرے اور آنحضرت ﷺ کے درمیان کجاوے کا پچھلا حصہ حائل تھا آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا معاذ! جانتے ہو بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے اور اللہ پر بندوں کا کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ پر بندوں کا یہ حق ہے کہ جس نے کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرایا اسے عذاب نہ دے (یہ سن کر) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ خوشخبری لوگوں کو سنا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤ کیونکہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے اور عمل کرنا چھوڑ دیں گے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ عقبہ ثالثہ اخیرہ میں ستر نفوس قدسیہ کے ساتھ بیعت میں شریک تھے۔ تمام غزوات میں حضور اکرم ﷺ کے شانہ بشانہ شریک رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو یمن کا قاضی و گورنر مقرر فرما کر بھیجا تھا آپ ﷺ نے ان کو اچھی اچھی وصیتیں فرمائیں اور چند قدم آپ کی سواری کے

---

[1] المرقات ۱/۱۸۲ [2] اخرجه البخاری ۸/۳۵ ومسلم

ساتھ پیدل چل کر روانہ فرمایا، آپ کا تعلق انصار کے خزرج قبیلے سے تھا لہٰذا انصاری خزرجی ہیں۔ آپ طاعون عمواس میں ۱۸ھ میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔[۱]

الردف والردیف: التابع الذی یرکب خلف الراکب شہسوار کے پیچھے بیٹھنے والے کو ردیف کہتے ہیں، یہ لفظ گھوڑے گدھے وغیرہ کے لئے زیادہ استعمال ہوتا ہے، جس طرح اونٹ پر دو سواروں کو زیادہ تر زمیل کہتے ہیں، کبھی اونٹ سوار کو بھی ردیف کہتے ہیں۔[۲]

علی حمار: حضور اکرم ﷺ نے بطور تواضع وانکساری کبھی کبھی گدھے کی سواری کی ہے جس سے گدھے کی قسمت جاگ اٹھی کہ اس کا پسینہ ناپاک نہ رہا اور جھوٹے میں بھی نجاست نہ رہی۔[۳]

یہاں ایک اہم بات سمجھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس گدھے سے چھوٹے چھوٹے گدھے مراد نہیں جو ہمارے ہاں ہوتے ہیں جن پر سواری کرنا عموماً معیوب سمجھا جاتا ہے بلکہ یہاں گدھے سے عرب کا وہ بڑا گدھا مراد ہے جو قریباً خچر کے برابر ہوتا ہے جس طرح بڑے سفید گدھے ہوتے ہیں ان پر سوار ہونا کوئی عیب کی بات نہیں تھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضور اکرم ﷺ کا ایک ساتھ سوار ہونا بھی بتاتا ہے کہ یہ بڑا گدھا تھا۔

موخرة الرحل: رحل کجاوہ کو کہتے ہیں، **موخرة الرحل** کجاوے کی اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے سوار آدمی تکیہ اور ٹیک لگاتا ہے یہ سوار کے پیچھے ہوتی ہے دو آدمیوں کے بیچ میں آگے سوار کے لئے الگ اور آخری سوار کے لئے الگ لکڑی ہوتی ہے یا صرف آگے والے سوار کیلئے ہوتی ہے۔ **موخرة الرحل** کا اطلاق دونوں پر ہوسکتا ہے۔ یہ لفظ موخرة الرحل چار طرح پڑھا جاتا ہے:[۴]

① باب افعال سے اسم فاعل کے وزن پر۔ ② باب تفعیل سے بھی اسم فاعل کے وزن پر آتا ہے۔ ③ باب تفعیل سے اسم مفعول کے وزن پر بھی آتا ہے۔ ④ **آخرة الرحل** بھی آتا ہے اول اور آخری لغت فصیح تر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس تعیین اور تبیین اور اس ہیئت وکیفیت بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس وضاحت سے قرب بیان کرنا ہے اور پوری کیفیت بیان کرنے سے یہ بتانا ہوتا ہے کہ صحابی جو حدیث بیان کر رہا ہے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اس نے نہایت **تیقظ** اور ہوشیاری و بیداری سے یہ حدیث حضور اکرم ﷺ سے خود سنی ہے۔ حدیث کے الفاظ تو کیا اس کی کیفیات وھیئات تک اس کے دل ودماغ میں محفوظ ہیں۔

حق العبد علی اللہ کی بحث:

یا معاذ هل تدری ما حق الله: بندوں پر اللہ تعالیٰ کے حق کے بارے میں تو کوئی کلام اور کوئی شبہ نہیں ہاں دوسرے جملہ میں کلام ہے جہاں **حق العبد علی الله** کے الفاظ آئے ہیں پس اتنی بات سمجھ لینا چاہیے کہ حق باطل کے مقابلے میں بھی آتا ہے حق ثابت اور واجب کے معنی میں بھی ہے لازم کے معنی میں بھی ہے اور لائق اور جدیر کے معنی میں بھی آتا ہے

---
[۱] المرقات ۱/۱۸۲ [۲] المرقات ۱/۱۸۲ [۳] المرقات ۱/۱۸۲ [۴] المرقات ۱/۱۸۲

اب معتزلہ نے **حق العبد علی اللہ** میں حق بمعنی واجب اور لازم لیا ہے تو ان کے نزدیک بندوں کا حق بطور عدل اللہ تعالیٰ پر واجب اور لازم ہوتا ہے ہدایہ میں جو یہ لکھا ہے کہ بحق فلاں کہنا صحیح نہیں کیونکہ کسی بندے کا وجوبی حق اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہیں ہے تو وہاں یہی معتزلہ والا حق مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذمہ وہ لوگ لازم اور واجب قرار دیتے ہیں اس کی نفی ہدایہ نے کی ہے بہرحال مذکورہ حدیث ظاہری طور پر معتزلہ کی دلیل ہے اہل السنۃ والجماعۃ حدیث کی کئی توجیہات کرتے ہیں۔ [1]

● اول توجیہ یہ ہے کہ حق کے کئی معنی ہیں پس **حق اللہ علی العباد** میں واجب اور لازم کے معنی اور **حق العباد علی اللہ** میں لائق اور جدیر کے معنی لئے جائیں گے۔

● خطابی نے کہا ہے کہ یہاں **حق العبد علی اللہ** صرف پہلے جملہ کے مقابلہ میں مشاکلۃ ہے، یہی رائے شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ہے۔

● یہ حق اللہ تعالیٰ نے رحمۃً شفقۃً احساناً واکراماً اپنے اوپر خود لیا ہے گویا خود ایک عہد اپنے اوپر لیا ہے تو پہلے جملہ میں حق وجوبی لزومی ہے اور دوسرے جملہ میں **حق تفضلی** احسانی لیا جائے گا۔

ان یعبدوہ: اس میں عبادات اور توحید دونوں کا ذکر آ گیا اور بتادیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا حق مکمل عبادات اور کامل وخالص توحید کے بغیر ادا نہیں ہوسکتا ہے۔

ان لا یشرکوا بہ فی الافعال والاعمال والاقوال والاحکام: اس میں رسالت بھی آ گئی اور تمام اعمال بھی آ گئے تو اللہ تعالیٰ کے حسن سلوک اور وعدہ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد وہ اس موحد کو عذاب نہ دے کیونکہ اگر توحید کے ساتھ اعمال صالحہ کی پابندی کی ہے تو عدم دخول نار کا وعدہ ہے اور اگر اعمال صالحہ میں کوتاہی ہوئی ہے تو **عدم خلود فی النار** کا وعدہ ہے کہ دائماً عذاب نہ دے گا۔ [2]

سوال: سوال یہ ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے خوشخبری دینے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا اگر سارے اعمال ملحوظ تھے تو پھر روکنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: یہ ہے کہ لوگ "**لا یشرکوا**" کو بغیر قیودات کے سمجھ کر اعمال کو چھوڑ دیں گے چونکہ نومسلم ہیں اور اجمال کو لے لیں گے، قیودات سے واقف نہیں ہوں گے، اس لئے اس ابتدائی دور کے پیش نظر لوگوں کو بشارت سنانے سے منع کیا لیکن اعمال کی تفصیل سمجھنے کے بعد جب اعمال راسخ ہو گئے اور اعمال چھوڑنے کا خطرہ ختم ہو گیا تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس علمی امانت کو امت کے سپرد کر کے بیان فرمایا یا یہ کہ ابتداء میں ممانعت تھی پھر جب "**بلغوا عنی**" فرمایا تو عوام کو بتانے کی عام اجازت ہوگئی۔ [3]

سوال: اسی سے ملتا جلتا ایک اور سوال ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ممانعت کے باوجود یہ روایت آخر میں کیوں بیان کی؟

پہلا جواب: یہ ہے کہ یہ ممانعت اسلام کے ابتدائی دور کے لئے تھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے آخر وقت میں بتادیا۔

---

[1] المرقات ۱/۱۸۲، ۱۸۳ [2] المرقات ۱/۱۸۳ [3] المرقات ۱/۱۸۳، ۱۸۴

دوسرا جواب: یہ ہے کہ یہ ممانعت ایک مخصوص جماعت کیلئے تھی عام نہ تھی بعد میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عوام کے لئے بیان کیا۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے بوقت انتقال بتادیا تاکہ کتمان علم کی وعید سے بچ جائیں جس طرح آنے والی روایت میں ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معاذ رضی اللہ عنہ کو بشارت کے مخفی رکھنے کا حکم وقتی اور عارضی تھا دائمی اور ابدی نہیں تھا۔[1]

فیتکلوا: نہی کے جواب میں واقع ہونے کی وجہ سے ان ناصبہ مقدر ہے اس لئے منصوب ہے ای ان یتکلوا، **اتکال** بھروسہ اور اعتماد وتکیہ کے معنی میں ہے یعنی لوگ صرف کلمہ توحید کے اجمال پر جم جائیں گے اعمال میں سست ہو جائیں گے یہاں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتانے سے منع فرمایا کہ بتانے میں خطرہ ہے اسی کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو سختی سے منع فرمایا کہ لوگ اجمال پر تکیہ کر کے بیٹھ جائیں گے معلوم ہوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ فعل درست تھا۔[2]

دوزخ سے رہائی کا سبب توحید ہے

﴿۲۳﴾ وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم وَمُعَاذٌ رَدِيفُهُ عَلَى الرَّحْلِ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ ثَلَاثًا قَالَ مَا مِنْ أَحَدٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهِ إِلَّا حَرَّمَهُ اللهُ عَلَى النَّارِ قَالَ يَا رَسُولَ اللهِ أَفَلَا أُخْبِرُ بِهِ النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوا قَالَ إِذًا يَتَّكِلُوا فَأَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهِ تَأَثُّمًا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[3]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے معاذ! انہوں نے کہا یا رسول اللہ حاضر ہوں اور خدمت کے لئے تیار ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے معاذ! حضرت معاذ نے عرض کیا حاضر ہوں یارسول اللہ اور خدمت کے لئے تیار ہوں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری مرتبہ فرمایا اے معاذ! حضرت معاذ نے عرض کیا حاضر ہوں یارسول اللہ اور خدمت کے لئے تیار ہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ اسی طرح حضرت معاذ کو مخاطب فرمانے کے بعد فرمایا اللہ کا جو بندہ سچے دل سے اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حاجت روا مشکل کشا نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، تو اس پر اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے یہ (سن کر) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ کیا میں اس خوشخبری سے لوگوں کو آگاہ کر دوں۔ تاکہ وہ اس بشارت کو سن کر خوش ہو جائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آخر کار معاذ نے اس خوف سے کہ

[1] المرقات ۱/۱۸۳ [2] المرقات ۱/۱۸۳ [3] اخرجه البخاری ۱/۲۴ ومسلم ۱/۴۵

حدیث چھپانے کا گناہ نہ ہو اپنی وفات کے وقت اس حدیث کو بیان کر دیا تھا۔ (یہ روایت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے خود بھی مروی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بھی بیان کی ہے)۔

توضیح: **لبیك:** یعنی میں بار بار سننے کے لئے حاضر ہوں،[1]

وسعدیك یعنی میں بار بار خدمت واطاعت کے لئے موجود ہوں دونوں میں تکرار ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام شان کی غرض سے تین مرتبہ یہ کلمہ دہرایا تاکہ آئندہ آنے والی بات نہایت اہتمام کے ساتھ سن لیں تو جہ تمام ہو اور کلام کا اہتمام ہو۔[2]

صدقا من قلبه: سوال یہ ہے کہ اس قید کو کیوں بڑھایا ہے؟ جواب یہ ہے کہ تاکہ منافق لوگ اس حدیث سے خارج ہو جائیں، کیونکہ **صدقا من قلبه** میں استقامت واستدامت دونوں مراد ہیں اور وہ منافقین میں نہیں ہیں۔[3]

الا حرمه الله علی النار۔

سوال: یہاں ایک اہم سوال ہے کہ ایک شخص مثلاً اقرار شہادتین کے ساتھ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو کیا وہ بھی **حرام علی النار** ہوگا حالانکہ دوسری روایت سے عصاۃ مومنین کا جہنم میں جانا اور شفاعت یا سزا بھگتنے کے بعد واپس آنا ثابت ہے تو بظاہر ان دو قسم کی روایات میں تعارض وتضاد ہے نیز مذکورہ حدیث کے پیش نظر تو اعمال کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے حالانکہ اعمال کا ایک مقام ہے۔ الغرض جن روایات میں صرف کلمہ توحید پر دخول جنت کی ضمانت دی گئی ہے اور حرمت دوزخ کا فیصلہ سنایا گیا ہے وہ روایات اعمال صالحہ کو ضروری قرار دینے والی روایات سے متعارض ومتصادم ہیں۔

جواب: اس اعتراض کے چند جوابات شارحین حدیث دیتے ہیں اور کتاب الایمان کی کئی احادیث پر اس قسم کے اعتراض کے یہی جوابات ہیں ملاحظہ ہوں۔

❶ اگر کسی شخص نے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا یا گناہ کیا مگر سچے دل سے توبہ کی اور معاف ہو گیا تو یہ شخص اولاً جنت میں داخل ہو گا اور ابتداہی سے اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو گئی تو "**حرمه الله علی النار**" اس پر صادق ہے۔ لیکن اگر اس شخص نے گناہ کیا تو بہ بھی نہ کی نیکی سے گناہ زیادہ بھی ہیں اور کوئی گناہ معاف بھی نہ ہوا تو ایسا شخص انتہاءً دوزخ پر حرام ہے یعنی "**حرمه الله علی النار**" اس کے حق میں سزا بھگتنے کے بعد ہے کہ اس کے لئے دائمی دوزخ نہیں ہے۔

❷ یا مطلب یہ ہے کہ کلمۂ شہادت اپنے تمام تقاضوں اور حقوق کے ساتھ پڑھا یعنی امتثال اوامر کیا اور اجتناب نواہی کیا اس کے لئے **حرمه الله علی النار** ہے یعنی کلمہ تو مفتاح جنت ہے مگر اس کے لئے دندانے ضروری ہیں **کما قال وهب بن منبه** رحمہ اللہ۔

❸ تیسرا جواب یہ ہے کہ اس کلمہ شہادت سے اس شخص کا کلمہ مراد ہے جس نے کلمہ پڑھا لیکن اعمال کا موقع نہیں ملا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔[4]

❹ **یا تحریم الخلود** مراد ہے کہ ہمیشہ آگ میں رہنا اس کے لئے حرام ہے۔

---

[1] المرقات ۱/۱۸۴　[2] المرقات ۱/۱۸۴　[3] المرقات ۱/۱۸۵　[4] المرقات ۱/۱۸۵

۵ یا ان کو کافروں والی آگ نہیں جلائے گی کیونکہ ان کے لئے عذاب بطور اہانت وتحقیر ہے مومن کا عذاب بطور تطہیر ہے۔

۶ یا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کی ایک انفرادی خاصیت ہوتی ہے انفرادی حالت میں وہ اثر اور خاصیت ظاہر ہوکر کام کرتی ہے مگر جب دوسری اشیاء سے مل جاتی ہے تو مغلوب ومخلوط ہوکر اپنا اثر نہیں دکھاتی ہے مثلاً زہر ہے اس کی خاصیت قتل کرنا ہے مگر دوسرے اجزاء سے مل کر معجون مرکب بن کر مفید بن جاتا ہے اور بطور دوا استعمال ہوتا ہے اسی طرح پانی کی طبیعت برودت ہے مگر دھوپ یا آگ کی مجاورت سے حرارت آکر برودت ختم ہوجاتی ہے، بعینہ اسی طرح کلمہ شہادت ہے اس کی انفرادی خاصیت تو بالکل وہی ہے جو مذکورہ حدیث میں ہے کہ دوزخ کی آگ اس کے پڑھنے والے پر حرام ہے مگر قیامت میں فیصلہ معجون مرکب پر ہوتا ہے لہٰذا دوسری اشیاء معاصی اور گناہ وغیرہ سے مل کر کلمہ شہادت کی خاصیت مغلوب ہوجاتی ہے اور اس کا اثر ختم ہوجاتا ہے تو انفرادی اور ذاتی اثر وہی ہے جو حدیث میں بتایا گیا ہے لیکن قیامت میں فیصلہ معجون مرکب پر ہوتا ہے لہٰذا آگ سے بچنے کے لئے اعمال صالحہ کی ضرورت اب بھی برقرار ہے اور جو شخص گناہ گار ہے وہ آگ میں گرفتار ہے، سزا بھگتنے یا شفاعت کے بعد دوزخ سے رہا ہوسکتا ہے کتاب الایمان میں اس قسم کی حدیثوں کے یہی جوابات ہیں۔

صاحب مشکوٰۃ نے اس روایت کے بعد کئی احادیث ایسی پیش کردی ہیں جن میں اعمال کی ترغیب وتاکید ہے جس سے انہوں نے اشارہ کیا کہ شہادت توحید میں اعمال ملحوظ ہیں اور صاحب مشکوٰۃ کا یہی طریقہ بھی ہے کہ آنے والی روایت سے گزشتہ روایت کی تفسیر کرتے ہیں۔[۱]

تأثما: ای تجنبا عن الاثم: یعنی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت اس حدیث کو عوام الناس کے سامنے بیان کر دیا تاکہ کتمان علم کا گناہ نہ ہوجائے۔ اس حدیث سے ایک عام قاعدہ سمجھ میں آگیا کہ بعض دقیق احکامات بعض لوگوں کے لئے باعث تشویش بنتے ہیں تو ایسے لوگوں کے سامنے اس قسم کے مسائل رکھنا مناسب نہیں بلکہ ان سے مخفی رکھنا چاہیے جب کہ ان احکام کا تعلق کسی عمل سے بھی نہ ہو اور عوام الناس کی عقلوں سے بالاتر بھی ہوں تو عوام کو اس میں الجھا کر برباد نہیں کرنا چاہیے جیسے صفات باری تعالیٰ کے مسائل ہیں یہ مسائل عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر ہیں لہٰذا ان میں پڑنا نہیں چاہئے **کلموا الناس علی قدر عقولھم**۔[۲]

۲ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ

ایمان پر خاتمہ جنت کی ضمانت ہے

﴿۲۴﴾ وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَعَلَيْهِ ثَوْبٌ أَبْيَضُ وَهُوَ نَائِمٌ ثُمَّ أَتَيْتُهُ وَقَدِ اسْتَيْقَظَ فَقَالَ مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلَى ذٰلِكَ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ قُلْتُ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ قَالَ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ قَالَ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ قَالَ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ عَلَى رَغْمِ أَنْفِ أَبِي ذَرٍّ وَكَانَ أَبُو ذَرٍّ إِذَا حَدَّثَ بِهٰذَا قَالَ وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍّ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۳]

---

[۱] الکاشف ۱/۱۵۹، ۱/۱۶۱، ۶۳ [۲] المرقات ۱/۱۸۵ [۳] اخرجه البخاری ۷/۱۹۲، ومسلم ۱/۶۶

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک دن حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ایک سفید کپڑا اوڑھے ہوئے سو رہے تھے (اس وقت تو میں واپس چلا آیا) پھر دوبارہ آپ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جب آپ نیند سے بیدار ہو چکے تھے آپ نے (مجھ کو دیکھ کر) فرمایا جس شخص نے صدق دل سے لا الہ الا اللہ کہا اور اسی عقیدہ پر اس کا انتقال ہو گیا تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا، میں نے عرض کیا کہ اگر چہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہو اور اگر چہ اس نے چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اگر چہ اس نے چوری کی ہو، میں نے عرض کیا اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اگر چہ اس نے چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا ہاں اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اگر چہ اس نے چوری کی ہو۔ میں نے پھر عرض کیا اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اگر چہ اس نے چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اگر چہ اس نے چوری کی ہو (وہ جنت میں داخل ہوگا) اگر چہ ابوذر کو ناگوار گزرے۔ راوی کا بیان ہے کہ جب بھی ابوذر یہ حدیث بیان کرتے تو (بطور فخر) اس آخری فقرہ کو ''خواہ ابوذر کو کتنا ہی ناگوار گزرے'' ضرور نقل کرتے تھے (کیونکہ یہ محبوب کے محبوب منہ سے نکلے ہوئے الفاظ تھے)

توضیح: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ قبیلہ غفار سے تعلق رکھتے تھے مکہ مکرمہ میں پانچویں خوش قسمت تھے جو اسلام میں داخل ہوئے، متقی و پرہیزگار زاہد تھے، ان کے مسلک میں کھانے کے بعد دوسرے وقت کے لئے کھانا رکھنا یا مال جمع کرنا جائز نہ تھا اور جب کسی کو مال جمع کرتے دیکھتے تو لاٹھی سے مارتے تھے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے خاندان کی طرف واپس چلے گئے اور وہاں اسلام کی دعوت دیتے رہے، چار ہجری میں غزوہ خندق کے موقع پر مدینہ منورہ تشریف لائے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابوذر تم اکیلے جاکر مروگے یہ تقویٰ کے دور کے آدمی تھے اور لوگ فتویٰ کے دور کے آگئے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کو مدینہ سے ''ربذہ'' چلے جانے کا حکم دیا یہ چلے گئے اور وہاں پر ۳۲ھ میں فوت ہو گئے حضرت بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جنازہ پڑھایا۔[1]

و علیہ ثوب ابیض: اس کیفیت کے بیان کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ مجھے بات خوب یاد ہے بلکہ کیفیات اور ہیئات و حالات تک معلوم ہیں میں بیداری میں اعتماد سے بات کہتا ہوں کوئی شک و شبہ نہ کرے، نیز یہ بھی بتانا ہے کہ محبوب کے خدوخال اور ان کے خصوصی احوال بیان کرنے سے لذت محسوس ہوتی ہے۔[2]

وذکرك للمشتاق خیر شراب — وکل شراب دونه کسراب

اعد ذکر نعمان لنافان ذکره — هو المسك ما کررته یتضوع

قہر ہو یا مہر ہو یا کچھ بھی ہو — ہر ادا محبوب کی محبوب ہے

دخل الجنة: اس روایت پر ایک شبہ تو وہی ہے جو سابقہ روایت پر تھا کہ صرف کلمہ شہادت سے کیسے جنتی ہو گیا اعمال کہاں گئے؟ جو جوابات وہاں دیئے گئے ہیں یہاں بھی وہی جوابات ہیں کہ دخول اولاً یا ثانیاً ہے یا کلمہ اپنے تقاضوں کے ساتھ ہے یا دوزخ میں دخول ابدی دائمی نہیں ہے یا فیصلہ معجون مرکب پر ہوتا ہے مفرد کلمہ پر نہیں یا اس شخص کا کلمہ مراد ہے جس کو عمل کا

[1] المرقات ۱/۱۸۵، ۱۸۶ [2] المرقات ۱/۱۸۶

موقع نہیں ملا اور مر گیا وغیرہ وغیرہ۔ یہاں دوسرا شبہ اور سوال یہ ہے کہ شہادت میں صرف "لا الہ الا اللہ" کا ذکر ہوا ہے "محمد رسول اللہ" کا ذکر نہیں ہوا۔

پہلا جواب: یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ بطور علم اور عنوان ذکر کیا گیا ہے، مراد مکمل شہادتین اور پورا کلمہ ہے جیسے پوری سورت فاتحہ کو الحمد شریف کے نام سے یاد کرتے ہیں اور "اخلاص" پوری قل ھو اللہ احد کے لئے بولا جاتا ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ یہاں راویوں نے اختصار کیا ہے۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ یہ کلمہ ایسا مشہور ہے کہ لا الہ الا اللہ کے ذکر سے خود بخود پورا کلمہ ذہن میں آتا ہے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ محمد رسول اللہ کے بغیر اس دور میں یہ کلمہ نافع نہیں ہے۔ [1]

ثم اتیته: یعنی کچھ دیر بعد میں پھر آیا تو آنحضرت ﷺ نیند سے اٹھ چکے تھے۔

قلت وان زنی وان سرق: یہاں ہمزہ استفہام محذوف ہے یعنی "ادخل الجنة وان زنی وان سرق؟"۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے سوال میں نہایت جامعیت ہے کیونکہ "وان زنی" سے تمام حقوق اللہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور "وان سرق" میں سارے حقوق العباد کی طرف اشارہ کیا یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں کوتاہی کرنے والا بھی کیا جنت میں جائے گا؟

آنحضرت ﷺ نے جواب دیا کہ ایمان اور تصدیق قلبی کی وجہ سے وہ بالآخر جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اعمال صالحہ میں کوتاہی کی ہو، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا تین بار سوال کرنا استعجاب اور مزید تاکید اور زیادہ وضاحت حاصل کرنے کے لئے تھا اور حضور اکرم ﷺ کا جواب انکار کے طور پر تھا کہ اس کو کیوں اتنا بڑا باعث تعجب سمجھتے ہو، کیا اللہ تعالیٰ کی رحمت میں بخل کرتے ہو؟ حالانکہ اس کی رحمت بڑی وسیع ہے تم خوش ہو یا ناخوش معاملہ ایسا ہی ہے۔ زنا اور سرقہ اسلام میں بڑے گناہ شمار ہوتے ہیں اس کا حکم جب معلوم ہوگیا تو چھوٹے گناہوں کا حکم خود بخود معلوم ہوجائے گا۔ [2]

وکان ابو ذر: یعنی ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بطور لذت یا کلام رسول کی کمال حفاظت کی وجہ سے "وان رغم انف ابی ذر" کے کلمات کو ضرور ادا فرماتے، محبوب کے ادا کردہ کلمات سے لطف اٹھاتے اور اپنے لئے فخر سمجھتے جیسے کہا گیا ہے: [3]

بدم گفتی و خر سندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل و شکر خارا

علی رغم انف ابی ذر: اور "وان رغم انف ابی ذر" عرب کے ہاں عربی زبان کا محاورہ ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی کی مجبوری تنگی ناخوشی اور ذلت ظاہر کرنا ہو کیونکہ رغام مٹی کو کہتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ ناک خاک آلود ہوجائے اور مٹی میں رگڑا کھائے، ناخوشی سے کنایہ ہے، ویسے یہ پورا محاورہ عربی میں ناپسند کرنے اور ناخوش ہونے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس حدیث میں معتزلہ اور خوارج پر نہایت تاکید کے ساتھ رد آتا ہے جو مرتکب کبیرہ کو خارج از اسلام کہتے ہیں۔ [4]

---

[1] المرقات ۱/۱۸۶ [2] المرقات ۱/۱۸۶، ۱۸۷ [3] المرقات ۱/۱۸۷ [4] المرقات ۱/۱۸۷

مدار نجات کیا ہے؟

﴿۲۵﴾ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ شَهِدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ وَأَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ وَابْنُ أَمَتِهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةَ وَالنَّارَ حَقٌّ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حاجت روا مشکل کشا نہیں وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور یہ کہ بلا شبہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بندی حضرت مریم کے بیٹے ہیں اور اس کا (معجزاتی) کلمہ ہے جس کو اس نے مریم کی جانب ڈالا تھا اور اللہ کی بھیجی ہوئی روح ہیں اور یہ کہ جنت اور دوزخ حق (واقعی چیزیں) ہیں تو (اس اقرار کے بعد) اللہ تعالیٰ اسے جنت میں ضرور داخل کرے گا خواہ اس کے اعمال کیسے ہی ہوں۔

(بخاری ومسلم)

توضیح: وان محمدا عبدہ: ای عبدہ الاجل ورسولہ الاکمل وان عیسیٰ عبد اللہ ورسولہ:

یہاں یہ شبہ اور اشکال ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کرنے اور آپ کی تخصیص کی کیا ضرورت تھی جبکہ سب انبیاء کرام عبدیت اور رسالت میں شریک ہیں اور اہل ایمان سب کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خیالات رکھنے والی دو قومیں جزیرہ عرب میں آباد تھیں، ایک یہود تھے دوسرے نصاریٰ تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دونوں قومیں اپنے خیالات میں افراط اور تفریط میں مبتلا تھیں۔

ایک طرف یہود نے نہ صرف یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا انکار کیا بلکہ یہود نا بہبود نے آپ علیہ السلام پر بیہودہ الزامات لگائے اور آپ کی والدہ صدیقہ پر بہتان باندھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت اور انجیل کو جھٹلایا۔ دوسری طرف نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اتنا غلو کیا کہ انہوں نے آپ کو اللہ، ابن اللہ یا ثالث ثلاثۃ کہہ دیا آنحضرت ﷺ چونکہ تمام انبیاء کرام کے مصدق بن کر آئے تھے سب کی حیثیت بتانے والے بن کر آئے تھے اور یہ شریعت اور یہ امت چونکہ وسط اور معتدل تھی اس لئے افراط وتفریط سے پاک ایک پاکیزہ نظریہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جزیرہ عرب کے یہود ونصاریٰ کے سامنے رکھا۔

انہی خصوصی احول اور خاص ضرورت کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر خصوصیت کے ساتھ آیا تا کہ ان سے متعلق صحیح صورت حال سے عوام وخواص کو آگاہ کیا جائے اور دونوں جانب کی افراط وتفریط کو باطل کیا جائے تا کہ یہ لوگ دخول جنت کے مستحق

[1] اخرجہ البخاری ۴/۲۰۱ ومسلم ۱/۴۲

بن جائیں، چنانچہ "عبد الله" کے الفاظ سے نصاریٰ پر رد ہو گیا کہ وہ اللہ کے بندے تھے نہ کہ اللہ کے ساتھ شریک تھے نہ اس کے بیٹے تھے "ورسوله" سے یہود پر رد کیا جو ان کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ ۱؎

وابن امته: اس سے بھی دونوں فرق پر رد بلیغ کیا کیونکہ نصاریٰ کہتے ہیں کہ وہ ابن الله تھے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابن الله نہیں "ابن امة الله" تھے اور یہود پر یہ رد ہو گیا کہ حضرت مریم اللہ تعالیٰ کی خاص بندی ولیہ تھیں، امته کی اضافت تشریفیہ سے اس طرف اشارہ ہو گیا پھر امته کی اضافت سے نصاریٰ پر رد کیا جو کہتے ہیں کہ مریم اللہ تعالیٰ کی بیوی ہے فرمایا بیوی نہیں، خاص بندی تھی۔ ۲؎

امته: کی اضافت تشریفیہ سے یہود پر اس طرح رد کیا کہ مریم اللہ تعالیٰ کی مقبول اور برگزیدہ پاکیزہ بندی تھیں انکی طرف زنا کی نسبت یہودیوں کی خباثت وخساست ہے، یہود پر یہ رد بھی کیا جو کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ العیاذ باللہ فلاں شخص کی ناجائز اولاد تھے فرمایا وہ حضرت مریم کے بیٹے تھے ان کا باپ نہیں تھا اگر باپ ہوتا تو ماں کی طرف کیوں منسوب ہوتے۔ ۳؎

وكلمته: یعنی کلمۂ کن سے بلا باپ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا یا کلمہ سے مراد حجته الله ہے کہ وہ لوگوں پر اللہ کی طرف سے حجت ودلیل تھے کہ اللہ نے ان کو بغیر باپ اپنی قدرت سے پیدا کیا یا اپنی والدہ کی برأت اور اپنی نبوت ورسالت پر بچپن میں دلیل بن کر کہا "انی عبد الله اتانی الکتاب و جعلنی نبیا" چنانچہ کلمته الله کہلائے۔ ۴؎

حکایت:

حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ملفوظات میں اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ میرے ساتھ ایک پادری کا مناظرہ قرار پایا موضوع ابنية مسيح تھا جب مناظرہ کی تاریخ آگئی تو حضرت شیخ الھند کو پتہ چلا وہ مناظرہ میں حاضر ہوئے اور خیال کیا کہ یہ پادری کہنہ مشق تجربہ کار ہے کہیں نوجوان اشرف علی کو شکست نہ دے اس لئے خود آئے اور مناظرے کے لئے خود پیش ہوئے، عیسائی پادری نے اپنے بیان میں کہا کہ دیکھو مسلمانوں! تمہارا قرآن حضرت مسیح کو "كلمة" کہتا ہے تو اب تم بتاؤ مسیح کلمہ تھے یا نہ تھے، پادری کا خیال تھا کہ مسلمان کہیں گے کہ بے شک قرآن نے ان کو کلمہ کہا ہے وہ کلمہ تھے تو میں کہوں گا کہ بس کلمته الله اور ابن الله ایک ہی چیز ہے۔

حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ بے شک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمہ تھے اور قرآن نے ان کو کلمہ کہا ہے لیکن کلمہ تین قسم پر ہے: اسم، فعل، حرف اب تم بتاؤ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان تین قسم میں سے کس قسم میں داخل تھے؟ اب پادری ہکا بکا رہ گیا اور حیران ہو کر ایسا بھاگا کہ مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ ۵؎

۱؎ المرقات ۱/۱۸۷ الکاشف ۱/۱۶۶، ۱۶۷ ۲؎ المرقات ۱/۱۸۷ الکاشف ۱/۱۶۶
۳؎ المرقات ۱/۱۸۷ ۴؎ المرقات ۱/۱۸۷ ۵؎ المرقات ۱/۱۸۷

الی مریم: مریم عابدہ کے معنی میں ہے، قرآن عظیم میں تیس بار اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ حضرت مریم کا نام ذکر کیا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ یہ اشارہ بھی دینا چاہتا ہے کہ مریم اللہ کی بیوی نہیں اگر ایسا ہوتا تو کوئی بھی شخص مجلسوں اور عوام الناس کے سامنے اپنی بیوی کا نام نہیں لیتا ہے پھر اس کے ساتھ ابن مریم کا کلمہ لگا کر بتا دیا کہ میرا نہیں مریم کا بیٹا ہے۔

وروح ای ذو روح منہ او ھو روح منہ او کان لہ معجزۃ یحیی بہ الاموات: یا وہ نفخۂ جبرائیل سے پیدا ہوئے اور جبرائیل کا نام "روح الامین" ہے اس لئے ان کو روح فرمایا بہر حال یہاں روح سے **ما بہ الحیوۃ** حیوانی روح مراد نہیں ہے۔ نیز یہاں من تبعیض کے لئے نہیں ہے جس سے جزئیت ثابت ہو جائے بلکہ من ابتدائیہ ہے معنی یہ ہے "**وروح مخلوق من امر اللہ ای بامر اللہ**"۔ [۱]

حکایت:

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تشریح میں ایک بڑے نصرانی عالم کا واقعہ لکھا ہے کہ اس نے ایک قاری صاحب سے قرآن کریم کی آیت "**و کلمتہ القاھا الی مریم و روح منہ**" کو پڑھتے ہوئے سنا تو کہنے لگا کہ عیسائی بھی تو اس سے زائد کچھ نہیں کہتے بس یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ سے ہیں، یعنی اللہ کا ایک جز ہیں اور نبی ہیں اس عیسائی عالم نے "**منہ**" میں من تبعیض کے لئے لیا اس پر دین اسلام کے عالم علی بن حسین بن واقد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے سامنے قرآن کی یہ آیت پڑھی: "**و سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض جمیعا منہ**" (جاثیہ آیت ۱۳) اور پھر فرمایا کہ اگر من تبعیض کے لئے ہے تو پھر زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب کو اللہ تعالیٰ کا جز تسلیم کرو یہ سن کر وہ عیسائی مسلمان ہو گیا۔ [۲]

والجنۃ والنار حق: یعنی جنت و دوزخ کے جو احوال قرآن و حدیث میں مذکور ہیں وہ سب حق ہیں جنت کا وجود بھی ثابت ہے دوزخ کا وجود بھی ہے اور اس میں جزا و سزا کے سارے واقعات بھی حق ہیں اس سے ایسے فلاسفہ و زنادقہ اور ملحدین و دھریوں پر رد مقصود ہے جو کہتے ہیں جنت شنت کچھ نہیں باغ شاغ ہے دوزخ شوزخ کچھ نہیں دھپکا شبکا ہے مرزا غالب الحاد کے انداز سے کہتا ہے: [۳]

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ادخلہ اللہ علی ما کان من العمل: یعنی خواہ وہ عمل اچھا ہو یا برا ہو قلیل ہو یا کثیر ہو جیسا بھی عمل ہو اس اچھے عقیدہ کے بعد وہ آدمی جنت میں جائے گا۔ اس حدیث کا مطلب بھی وہی ہے کہ **انتہاءً و مآلاً** یہ شخص دخول جنت کا مستحق ہے اس میں بھی معتزلہ اور خوارج پر واضح رد و تردید ہے جو مرتکب کبیرہ کو خارج از اسلام مانتے ہیں۔ [۴]

قبول اسلام سے سابقہ گناہ مٹ جاتے ہیں

﴿۲۶﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ أُبْسُطْ يَمِيْنَكَ

[۱] المرقات ۱/۱۸۷　[۲] الکاشف ۱/۱۶۸　[۳] المرقات ۱/۱۸۸　[۴] المرقات ۱/۱۸۸

فَلِأُبَايِعَكَ فَبَسَطَ يَمِينَهُ فَقَبَضْتُ يَدِي فَقَالَ مَا لَكَ يَا عَمْرُو قُلْتُ أَرَدْتُ أَنْ أَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ مَاذَا قُلْتُ أَنْ يُغْفَرَ لِي قَالَ أَمَا عَلِمْتَ يَا عَمْرُو أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَأَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

وَالْحَدِيثَانِ الْمَرْوِيَّانِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ اللهُ تَعَالَى أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ وَالْآخَرُ اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي سَنَذْكُرُهُمَا فِي بَابَيِ الرِّيَاءِ وَالْكِبْرِ إِنْ شَاءَ اللهُ تَعَالَى۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھائیے تاکہ میں آپ سے بیعت اسلام کروں، آپ ﷺ نے اپنا داہنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ اپنی طرف کھینچ لیا، آپ ﷺ نے (حیرت سے) فرمایا عمرو یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ میں کوئی شرط لگانا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا شرط لگانا چاہتے ہو کیا شرط ہے؟ میں نے عرض کیا (میں چاہتا ہوں کہ) میرے تمام گناہوں کو معاف کردیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا اے عمرو! کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام ان تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے جو قبول اسلام سے قبل کئے گئے ہوں اور ہجرت ان تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے جو اس سے پہلے کئے گئے ہوں اور حج ان تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے جو اس سے پہلے کئے گئے ہوں۔ (مسلم شریف)

اور وہ دونوں حدیثیں جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہیں اور پہلی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: **انا اغنی الشرکاء عن الشرك** الخ اور دوسری کے الفاظ یہ ہیں **الکبریاء ردائی** ... الخ ہم ان دونوں حدیثوں کو باب ریا اور باب کبر میں ان شاء اللہ بیان کریں گے۔

توضیح: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی ہیں ہجرت سے پانچ سال پہلے اسلام قبول کر چکے تھے اور تمام جنگوں میں شریک ہوئے جنگ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے معاملہ تحکیم میں شامل تھے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مصر آپ کے ہاتھوں میں فتح ہوا اور آپ فاتح مصر کے نام سے مشہور ہوئے اور آخر وقت تک آپ مصر کے حاکم و گورنر رہے ۴۳ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔[2]

ابسط یمینك: آپ اپنا داہنا ہاتھ آگے پھیلا دیجئے تاکہ میں اس پر آپ سے بیعت کروں معلوم ہوا زبانی بیعت کی نسبت ہاتھ میں ہاتھ دینا اصل اور افضل ہے، عورتوں کی بیعت میں کبھی آنحضرت ﷺ نے ہاتھ نہیں دیا وہاں صرف زبانی بیعت اصل ہے، یہ بیعت اسلام کی تھی اور ہر پیر و مرشد کو چاہیے کہ کسی اجنبی عورت کے ہاتھ کو بوقت بیعت ہاتھ نہ لگائیں۔[3]

[1] اخرجه مسلم ۷۸/۱ [2] المرقات ۱۸۸/۱ [3] المرقات ۱۸۸/۱

فلا بایعك: میں عین پر نصب اور ضمہ دونوں جائز ہیں۔ اول احتمال اس طرح ہے کہ "فاکلمہ" زائد ہو اور اس کے بعد لام کلمہ بمعنی لام "کی" تعلیلیہ ہو جو ناصب فعل ہوتا ہے یعنی "کی ابا یعك" تو عین منصوب ہے۔

دوسرا احتمال یہ کہ لام زائد ہو اس صورت میں عین پر ضمہ آئے گا اور فا تفریعیہ ہوگی یعنی **ابسط یمینك فابایعك**۔[1]

ان اشترط: معلوم ہوا کہ بیعت سے پہلے شرط لگانی جائز بھی ہے اور مناسب بھی ہے تاکہ خوب تسلی ہو۔[2]

قال تشترط ماذا؟ ماذا کا کلمہ چونکہ استفہام ہے اسلئے یہ صدارت کلام کو چاہتا ہے یہاں صدارت نہیں؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہاں ماذا کلام کی ابتداء میں محذوف ہے اور مذکورہ ماذا آخر میں اس کی تفسیر ہے یعنی **ماذا تشترط ماذا**۔ یا یوں سمجھ لیں کہ حضور اکرم ﷺ نے بطور انکار و تعجب استفہام کے ساتھ یہ پوچھا **اتشترط؟** یعنی اسلام میں شرط لگاتے ہو؟ پھر پوچھا ماذا یعنی کیا شرط لگاتے ہو تو یہ **ماذا** الگ کلمہ ہے جو الگ سوال کے ساتھ آیا ہے جو صدارت پر واقع ہے پھر مجموعہ کلام اس طرح بن گیا **تشرط ماذا**، ہمزۂ استفہام کو حذف کیا گیا۔[3]

یغفرلی: معروف و مجہول دونوں طرح پڑھا گیا معروف کی ضمیر لفظ اللہ کی طرف لوٹتی ہے۔

اما علمت یا عمرو: یعنی تم عقلمند ہوشیار اور جہاندیدہ سمجھدار آدمی ہو کیا تم پر یہ بات پوشیدہ ہے جو کسی عقل مند پر پوشیدہ نہیں رہنی چاہیئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی عقل کا حوالہ دیا ورنہ عمرو رضی اللہ عنہ مذکورہ مسئلہ سے قبل ایمان سے کیا واقف ہو سکتے تھے۔[4]

الاسلام یھدم ما کان قبله: علماء نے یہاں اسلام سے مراد حربی کا اسلام لیا ہے کیونکہ ذمی کا حکم اس طرح نہیں ہے۔[5]

والھجرة: یعنی میری زندگی میں مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت اور فتح مکہ کے بعد دار الحرب سے دار اسلام کی طرف ہجرت کرنا یعنی اسلام ہجرت اور حج تینوں ماسبق تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں ہجرت کی بحث گزر چکی ہے۔[6]

سابقہ گناہ مٹنے کا ضابطہ اور علماء کی آراء

اسلام:

جمہور علماء کے نزدیک جب کوئی غیر مسلم حربی یعنی غیر ذمی اسلام قبول کرتا ہے تو اسلام اس کے صغائر گناہ اور کبائر سب کو مٹا دیتا ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد مظالم اور غیر مظالم سب گناہوں کو مٹا کر رکھ دیتا ہے۔[7]

---

[1] المرقات ۱/۱۸۸　[2] المرقات ۱/۱۸۹　[3] المرقات ۱/۱۸۹

[4] المرقات ۱/۱۸۹　[5] المرقات ۱/۱۸۹　[6] المرقات ۱/۱۹۰　[7] المرقات ۱/۱۹۰

ہجرت اور حج:

البتہ ہجرت اور حج میں اختلاف ہے کہ آیا وہ بھی صغائر و کبائر کو مٹا دیتے ہیں یا نہیں جس کا ذکر یہاں حدیث میں اسلام کے ساتھ ہوا ہے تو حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ اور متقدمین شارحین کا خیال ہے کہ ہادم صرف اسلام ہے اور حج و ہجرت سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں مطلقاً اور کبائر اس وقت معاف ہوں گے جب کہ اس کے ساتھ توبہ ملحق ہو جائے بشرطیکہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو اور اگر وہ کبائر حقوق العباد سے متعلق ہوں تو صاحب حق سے معاف کرائے بغیر صرف توبہ سے وہ بھی معاف نہیں ہوں گے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ ہجرت و حج سے کبائر معاف نہیں ہوتے ہیں۔ حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نصوص قرآن سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ﴿ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنه نکفر عنکم سیئاتکم﴾ کی نص مقید سے صغائر کی معافی معلوم ہوتی ہے لہٰذا نصوص مطلقہ کو نصوص مقیدہ پر حمل کر کے صغائر و کبائر کی قید کا لحاظ رکھنا ہوگا۔[1]

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:

علامہ طیبی اور علامہ قسطلانی رحمہما اللہ تعالیٰ کی رائے یہ ہے کہ اسلام کی طرح حج اور ہجرت سے بھی تمام صغائر و کبائر معاف ہو جاتے ہیں اور جو حکم ہادم ہونے میں اسلام کا ہے وہی حج و ہجرت کا بھی ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں علماء متقدمین پر رد کرنا نہیں چاہتا ان کی رائے اور تحقیق اپنی جگہ پر صحیح ہے اور عام قواعد کے مطابق ہے لیکن میں نفس حدیث کو دیکھ کر اس کے سیاق و سباق اور اسلوب کلام اور بلاغت و فصاحت کے اصولوں کو دیکھ کر یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ اسلام کے لئے جس خصوصیت کا ذکر کیا گیا ہے وہ خصوصیت حج و ہجرت کے لئے بھی حاصل ہے کیونکہ نفس حدیث میں چند قرائن ایسے ہیں جس سے واضح طور پر اسلام ہجرت اور حج کی خصوصیت یکساں طور پر معلوم ہوتی ہیں مثلاً۔

1. حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے بیعت اسلام سے پہلے اپنے تمام گناہوں کی مغفرت کی شرط لگائی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے علاوہ ہجرت و حج کو بھی ان کے اطمینان کے لئے ذکر کیا کہ تم تو اسلام کی بات کرتے ہو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مغفرت کی یہ خصوصیت تو اسلام کے علاوہ حج اور ہجرت میں بھی ہے۔
2. حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اسلام کی تشبیہ گناہوں کے مٹانے میں مکان و پہاڑ توڑنے والے ہادم آلے سے دی ہے بعینہ یہی تشبیہ حج اور ہجرت کو بھی دی ہے کہ ہدم ذنوب میں حج اور ہجرت بھی اسلام کی طرح عام اور مطلق ہے۔

---

[1] سورۃ النسآء ۳۱

❹ اسلام حج اور ہجرت کو یہاں عطف کے ذریعہ سے ذکر کیا گیا ہے اور معطوف معطوف علیہ میں کمال مناسبت ضروری ہے یہاں مناسبت قویہ کی شکل مساوات فی الحکم میں ظاہر ہوگی کہ جو حکم اسلام کا ہے وہی اس کے معطوفات حج اور ہجرت کا ہے لہٰذا جس طرح اسلام صغائر کبائر سب کے لئے ھادم ہے حج وہجرت بھی اسی طرح ہے۔

❺ صیغہ یہدم کا ہر بار مستقلاً تکرار کے ساتھ آنا خود اس بات کی دلیل بھی ہے اور تاکید بھی ہے کہ جو کام اسلام کا ہے وہی کام مستقل طور پر ہجرت اور حج کا بھی ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق بہت عمدہ ہے اور جس آیت کو علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے بطور استدلال پیش کیا ہے اس سے معتزلہ نے بھی استدلال کیا ہے لیکن آیت کی اپنی صحیح اور واضح تفسیر بھی ہے جو علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر عثمانی میں نقل فرمائی ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

ویسے جو لوگ حج کی مشقتیں برداشت کر کے کئی ماہ وہاں گزارتے ہیں کیا وہ گناہوں سے توبہ نہیں کرتے ہوں گے اور حقوق العباد کا انتظام نہیں کرتے ہوں گے؟ اسی طرح ہجرت جیسی بڑی قربانی کیا توبہ سے خالی ہوگی؟ جب توبہ عقلاً و عرفاً ملحق ہے تو پھر مغفرت میں کیا شک ہے۔[1]

[1] الکاشف ۱/۱۷۰ تا ۱۷۱

مورخہ ۴ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ

الفصل الثانی

ارکانِ دین اور جہاد

﴿۲۷﴾ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ اَخْبِرْنِي بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِي مِنَ النَّارِ قَالَ لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ اَمْرٍ عَظِيمٍ وَاِنَّهُ لَيَسِيرٌ عَلَى مَنْ يَسَّرَهُ اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ تَعْبُدُ اللهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَتُقِيمُ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ وَتَصُومُ رَمَضَانَ وَتَحُجُّ الْبَيْتَ ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّكَ عَلَى اَبْوَابِ الْخَيْرِ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ وَصَلَاةُ الرَّجُلِ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ ثُمَّ تَلَا تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ حَتّٰى بَلَغَ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّكَ بِرَأْسِ الْاَمْرِ وَعَمُودِهِ وَذِرْوَةِ سَنَامِهِ. قُلْتُ: بَلٰى يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعَمُودُهُ الصَّلَاةُ وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ. ثُمَّ قَالَ: اَلَا اُخْبِرُكَ بِمِلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ قُلْتُ بَلٰى يَا نَبِيَّ اللهِ فَاَخَذَ بِلِسَانِهٖ وَقَالَ كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا فَقُلْتُ يَا نَبِيَّ اللهِ وَاِنَّا لَمُؤَاخَذُونَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهٖ قَالَ ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا مُعَاذُ وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ اَوْ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ۔

(رواه احمد والترمذي وابن ماجه.) [1]

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی عمل ایسا بتادیجئے جو مجھ کو جنت میں لے جائے اور دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے ایک بڑی چیز کا سوال کیا لیکن جس پر اللہ آسان کردے اس کے لئے یہ بہت آسان بھی ہے، پھر فرمایا اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، نماز پابندی کے ساتھ ادا کرو زکوۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور خانہ کعبہ کا حج کرو پھر اس کے بعد فرمایا اے معاذ! کیا تمہیں خیرو بھلائی کے دروازوں تک نہ پہنچادوں۔ (تو سنو) روزہ ڈھال ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا گناہ کو اس طرح مٹادیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھادیتا ہے۔ اور رات میں مؤمن کا نماز پڑھنا (گناہ کو ختم کردیتا ہے) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: تتجافی جنوبهم عن المضاجع تا یعلمون، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تمہیں اس چیز (یعنی دین) کا سر اور اس کے ستون اور اس کے کوہان کی بلندی نہ بتادوں؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ! ضرور بتادیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس چیز (دین) کا سر اسلام ہے اس کا ستون نماز ہے اور اس کے کوہان کی بلندی جہاد ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں ان تمام چیزوں کی جڑ نہ بتادوں؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں اے اللہ کے نبی ضرور بتادیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک پکڑی اور اس

[1] اخرجه احمد ۲۳۱/۵ والترمذی ۱۱/۵ ابن ماجه ۲/ ۳۹۷

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اس کو بند رکھو میں نے عرض کیا اے اللہ کے نبی! کیا ہم اپنی زبان سے جو لفظ نکالتے ہیں اس پر بھی مواخذہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، معاذ! تیری ماں تجھے گم کردے اچھی طرح جان لو کہ لوگوں کو ان کے منہ کے بل یا پیشانی کے بل دوزخ میں گرانے والی اسی زبان کی بری باتیں ہی تو ہوں گی۔ (احمد ترمذی ابن ماجہ)

توضیح: بعمل: تنوین تعظیم کے لئے ہے ای **بعمل عظیم یدخلنی الجنة** اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دخول جنت اعمال صالحہ کی وجہ سے ہوگا حالانکہ دوسری روایت میں تصریح ہے کہ داخلۂ جنت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور رحمت سے ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سبب کی طرف اسناد مجازی ہے تو ترتیب اس طرح ہے اخبار النبی ﷺ سبب ہے عمل کا اور عمل سبب ہے فضل الٰہی اور رحمت الٰہی کا اور فضل الٰہی سبب ہے دخول جنت کا تو مجازاً عمل کی طرف دخول کی نسبت درست ہے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ نفس داخلہ تو فضل خداوندی سے ہوگا مگر تقسیم درجات اور تفاوت درجات اعمال صالحہ کے تفاوت سے ہوگا۔

ویبا عدنی من النار: معلوم ہوا اس دخول سے مراد دخول اولی ہے۔[1]

لقد سألت عن امر عظیم: شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لمعات میں لکھا ہے کہ اس جملہ کے دو مفہوم و مطلب ہیں اول یہ کہ تیرا سوال ایک عظیم الشان سوال ہے (کیونکہ دخول جنت اور نجات عن النار کے سبب کا سوال ہے) اور چونکہ اس کا تعلق امور غیبیہ سے ہے لہٰذا اس کا جواب اسی کے لئے آسان ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ آسان کرے (اور وہ انبیاء کرام ہوتے ہیں)۔

دوسرا مفہوم و مطلب یہ کہ تیرا یہ سوال ایک مہتم بالشان فعل کے بارے میں ہے کیونکہ ایسے افعال نفس پر بہت شاق و گراں ہوتے ہیں مگر جس کے لئے اللہ تعالیٰ آسان کرے اس کے لئے اس پر عمل آسان ہے۔[2]

تعبد اللہ: یہ صیغہ یا امر کے معنی میں اعبد اللہ ہے اور یا مبتدا مقدر کی خبر ہے **ای ھو أن تعبد اللہ** اس جملہ میں توحید کا ذکر ہوا اور بعد کے جملوں میں اعمال صالحہ کا ذکر آ گیا کیونکہ توحید کے بغیر کوئی عبادت قبول ہی نہیں۔[3]

الا ادلك علی ابواب الخیر: ملا علی قاری رحمہ اللہ اور شیخ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نوافل ہیں کیونکہ اعمال نافلہ سے فرائض میں مضبوطی اور استحکام آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نوافل کو فرائض کا باب اور دروازہ قرار دیا گیا ہے چنانچہ نوافل کے ترک کرنے سے فرائض میں عدم استحکام اور کمزوری آتی ہے جیسا کہ تفسیر کبیر اور علامہ طیبی رحمہ اللہ وغیرہ علماء نے لکھا ہے کہ نوافل و مستحبات اور سنن کے چھوڑنے سے ہر مرحلہ میں ترتیب کے ساتھ اوپر والا عمل بطور سزا چھینا جاتا ہے جیسا کہا گیا ہے۔[4]

من ترك الادب عوقب بحرمان النوافل ومن عوقب بحرمان النوافل عوقب بحرمان السنن

---

[1] المرقات ۱/۱۹۱ [2] المرقات ۱/۱۹۲ اشعة اللمعات: ۱/۶۵ [3] المرقات ۱/۱۹۲ [4] المرقات ۱/۱۹۳

ومن عوقب بحرمان السنن عوقب بحرمان الفرائض ومن عوقب بحرمان الفرائض یوشك ان یعاقب بحرمان المعرفة۔"

"**الا ادلك**" کے جواب دینے میں آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پوچھنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ خود جواب ارشاد فرمادیا اس میں اشارہ ہے کہ یہ مسئلہ اتنا اہم اور مہتم بالشان ہے کہ سامع کے جواب کا انتظار ضروری نہیں ہے۔[1]

الصوم جنة: جنة جیم کا ضمہ ہے اور نون مشدد ہے جیم اور ڈبل نون کے مادے میں ستر کا معنی پڑا ہوا ہے جیسے جنت، جنین، جن، جنان، جنون، **جنة**، سب میں ستر اور ڈھانپنے کا معنی موجود ہے روزے کی حالت میں چونکہ انسان بھوکا رہتا ہے اور بھوک و پیاس سے انسان کی رگوں میں خون کا دوڑنا بند ہوجاتا ہے اور شیطان اسی خون کے ساتھ رگوں میں دوڑتا ہے اس لئے روزے کی وجہ سے وہ انسان پر تصرف نہیں کرسکتا ہے کیونکہ روزہ قاطع شہوات ہے تو انسان آگ سے بچ جاتا ہے لہٰذا روزہ ڈھال ہے آگ سے بھی اور شیطانی تصرفات سے بھی بشرطیکہ انسان خود اس ڈھال کو پھاڑ نہ دے اور اس کا پھاڑنا منافی صوم امور کا ارتکاب کرنا ہے۔[2]

والصدقة تطفیٔ الخطیئة: خطا یا خطیئة گناہ کے معنی میں ہے، بعض نے اس سے صغیرہ گناہ مراد لیا ہے یہاں تطفیٔ کے لفظ میں آگ بجھانے کا مفہوم پڑا ہے تو گناہ کی تشبیہ آگ سے دی ہے اور صدقہ کی تشبیہ پانی سے دی گئی ہے پھر اسی آگ کی مناسبت سے اطفاء بجھانے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس میں استعارات ہیں۔ تو روزہ گناہوں کی آگ کے لئے ڈھال بن گیا مگر گناہوں کی حرارت کا پھر بھی امکان تھا تو اس جملہ میں گناہوں کی حرارت بجھانے کے لئے صدقہ کا ذکر کیا صدقہ سے گناہوں کی حرارت بجھ جاتی ہے۔[3]

وصلوٰة الرجل: یہ عبارت مبتداء ہے اور کذالك خبر محذوف ہے "**ای تطفیٔ الخطیئة**۔"[4]

فی جوف اللیل: رات کے بیچ میں کیونکہ اس میں کمال اخلاص بھی ہوتا ہے اور یہ عمل نفس پر شاق بھی ہوتا ہے۔[5]

رأس الامر: حافظ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ **راس الامر** سے مراد شہادتین و اسلام دونوں ہیں اور جواب میں اسلام ہی بتادیا ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ **راس الامر** سے مراد اصل اور جڑ ہے اور جواب میں جو اسلام آیا ہے اس سے مراد شہادتین ہے۔[6]

وعمودہ: ما یعتمد علیه الشی بنیاد اور ستون مراد ہے اور نماز دین کا ستون ہے۔

وذروة سنامه الجهاد: ذروة کسرہ سے زیادہ مشہور ہے ویسے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور فتح سے بھی آیا ہے ذروۃ کی جمع ذریٰ ہے جو اعلیٰ اور بلند چوٹی کے معنی میں آتا ہے درحقیقت ہر چیز کے بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ حصہ پر یہ لفظ بولا

---

[1] المرقات ۱/۱۹۳ [2] المرقات ۱/۱۹۳ [3] المرقات ۱/۱۹۳ [4] المرقات ۱/۱۹۳ [5] المرقات ۱/۱۹۳ [6] المرقات ۱/۱۹۳

جاتا ہے خواہ مکان ہو، قلال وجبال ہو جسم ہو یا سنام ہو یہاں اسلام کو ایک قوی الجثہ اونٹ سے تشبیہ دی گئی ہے پھر اونٹ کے لوازمات میں سے اس کا کوہان ہے پھر کوہان کا ایک بلند و بالا حصہ ہوتا ہے جو رفعت و عظمت کا ضامن ہوتا ہے اور اونٹ وغیرہ مذکر کی شان کی نشانی ہوتا ہے۔ اسلام میں جہاد کے مقام کو اسی حیثیت سے ظاہر فرمایا گیا ہے۔[1]

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اشارة الی صعوبة الجهاد وعلو امره وتفوقه علی سائر الاعمال" یعنی **ذروہ** کے لفظ سے اشارہ ہے کہ جہاد ایک مشکل عمل ہے اور ایک عالی شان حکم ہے جو تمام اعمال پر فوقیت رکھتا ہے۔[2]

سنام: کوہان کو کہتے ہیں اس کی جمع **اسنمة** آتی ہے۔

یہاں روزہ صدقہ اور جوف اللیل میں قرآن پڑھنے کو نجات کے اعمال سے بیان کیا گیا ہے تو اس کی ترتیب اور ربط اس طرح ہے کہ توحید کے بغیر تو کوئی عمل معتبر نہیں اس لئے اس کا ذکر کیا پھر احکام اسلام نماز روزہ زکوۃ اور حج یہ فرائض اس توحید کے لوازمات میں سے تھے اس کا ذکر کیا پھر اس کے بعد چند اضافی نوافل کا ذکر ابواب الخیر کے نام سے آیا پھر اس کے بعد عذاب الٰہی سے بچانے والی تین چیزوں کا ذکر کیا مگر الگ الگ خاصیت کے ساتھ کہ روزہ دفع شہوات اور کسر شہوات کے ذریعہ سے عذاب الٰہی کو روکتا ہے اور صدقہ غضب الٰہی کی آگ سے بچاتا ہے اور عذاب الٰہی کو دفع کرتا ہے اور قرآن عظیم اللہ تعالیٰ کا مدلل کلام ہے وہ قوت دلیل سے عذاب الٰہی کو انسان سے دفع کرتا ہے۔

اس پوری روایت کے مختلف جملوں پر نظر ڈالتے ہوئے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ایک عجیب انداز سے دین اسلام کا تصور پیش کیا گیا ہے یعنی جس طرح جسم کے لئے سر اہم ہوتا ہے اسی طرح ایمان اور عقیدۂ توحید و رسالت دین کے لئے بمنزلہ سر ہے اگر توحید و رسالت نہ ہو تو یہ جسم بغیر سر کے کارآمد نہیں رہے گا پھر اس جسمانی وجود کو کارآمد بنانے کے لئے ستونوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے ورنہ عمارت اسلام اصلی حالت میں باقی نہیں رہے گی لہٰذا یہاں ان ستونوں نماز روزہ زکوۃ اور حج کا تذکرہ آگیا پھر اس جسمانی عمارت کو باعظمت اور شان و شوکت بنانے اور اس کی شوکت کو بڑھانے کے لئے اور پوری عمارت کی حفاظت کے لئے جہاد کی ضرورت ہے یہ وہ ضرورت ہے جس پر دین کی عظمت و شوکت اور ترقی و وسعت کا مدار ہے اگر جہاد کو اسلام کی بنیادی ضروریات میں شمار نہ کیا جائے تو دین ایک بے شکوہ اور بے اثر ڈھانچہ بن کر رہ جائے گا اس لئے آخر میں فرمایا **وذروة سنامه الجهاد**۔

(جہاد کی تعریف واقسام فضائل واحکام انشاء اللہ کتاب الجہاد میں آئیں گے)

اونٹ ایک ایسا جانور ہے جس میں مشقت برداشت کرنے کا بڑا سامان ہے وہ ریگستان کا جہاز ہے، طاقتور ہے، کئی ہفتوں تک بغیر کھائے پئے گزارہ کرتا ہے اور اپنی کوہان کی چربی سے حیات کو باقی رکھتا ہے، اسی لئے اس سخت جان جانور کے ساتھ جہاد کو تشبیہ دے دی ہے کہ جہاد بھی اسلام کے لئے ایک مضبوط حصار اور مضبوط قلعہ ہے۔

ملاك ذلك: "ملاك الشيء قوامه اي ما تقوم به تلك العبادات"۔ **ملاك** کسرہ کے ساتھ ہے اور کبھی

[1] المرقات ۱/۱۹۵ [2] الکاشف ۱/۱۷۶، ۱۷۷

فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جس چیز کے ذریعہ سے کسی اور چیز کو تقویت واستحکام ملتا ہو وہ اس کے لئے **ملاک** ہے جس کا ترجمہ اصل اور جڑ سے کیا جاتا ہے کہتے ہیں "القلب ملاك الجسد"۔ ؎۱

کف علیك هذا: یعنی زبان کی حفاظت کر کے اس کو فضولیات اور بے فائدہ باتوں سے روک لو اس سے تمام احکامات و شرائع محفوظ ومضبوط ومستحکم ہوجائیں گے۔ ؎۲

ثکلتك امك: ثکل فقد الولد بیٹے کے گم ہونے کو کہتے ہیں یعنی تیری ماں تجھے گم کردے اور تجھے روئے، یہ کلمہ عربی محاورہ میں تعجب کے وقت بولا جاتا ہے، واضع نے اس کو اصل میں بددعا کے لئے وضع کیا ہے لیکن اس کا استعمال بددعا میں نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ تنبیہ اور تادیب کے لئے استعمال ہوتا ہے، بہرحال یہاں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے تعجب سے پوچھا کہ کیا زبان کی محض باتوں کا مواخذہ ہوگا؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قدرے سخت انداز سے جواب دیا کہ جہنم میں درحقیقت زبان ہی کی بے احتیاطی بنیادی حیثیت رکھتی ہے بڑے بڑے گناہوں کا تعلق اور بڑے بڑے فتنوں کا تعلق زبان سے ہے۔ ؎۳

ہرچہ بر آدمی رسد ززیان ہمہ از آفت زبان برسد

یکب: یہ مجرد میں نصر سے منہ کے بل گرانے کے لئے آتا ہے اور باب افعال سے بھی اسی معنی میں آتا ہے حدیث میں باب افعال سے آیا ہے۔

الا حصائد السنتهم: حصائد حصیدة کی جمع ہے جو محصودۃ کے معنی میں ہے فصل کے کاٹنے کو کہتے ہیں۔ یہاں **محصودات الالسنه** یعنی انسان کی زبان کی گفتگو اور بے تحاشہ کلام کی تشبیہ اس کھیت سے دی گئی ہے جو تیز درانتی سے کاٹا گیا ہو یہ ایک فصیح وبلیغ تشبیہ ہے گویا زبان بلاتمیز ہر جائز وناجائز کلام میں ایسی لگی ہوئی ہے جس طرح درانتی گھاس کاٹتے وقت یہ تمیز نہیں کرتی کہ وہ کس قسم کی گھاس کاٹ رہی ہے۔ آیا نافع بھی ہے یا زہر قاتل ہے بہرحال یہاں زبان کے خطرات کو نہایت بلیغ انداز سے سمجھایا گیا ہے کیونکہ زبان خیر وشر کی جڑ ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ؎۴

احفظ لسانك ایها الانسان لا یلدغنك انه ثعبان ؎۵

اے انسان اپنی زبان کی حفاظت کرو تا کہ یہ تجھے ڈنگ نہ مار دے کیونکہ یہ اژدھا سانپ ہے۔

ایمان کامل کیا ہے؟

﴿۲۸﴾ وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰی لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ.

(رَوَاهُ اَبُوْ دَاوُدَ وَرَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ مَعَ تَقْدِیْمٍ وَتَاْخِیْرٍ وَفِیْهِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ اِیْمَانَهُ) ؎۶

؎۱ المرقات ۱/۱۹۵ ؎۲ المرقات ۱/۱۹۵ ؎۳ المرقات ۱/۱۹۶

؎۴ المرقات ۱/۱۹۶ ؎۵ المرقات ۱/۱۹۶ ؎۶ اخرجه ابوداؤد: ۴۶۸۱ والترمذی: ۲/۶۵

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ ہی کے لئے محبت کرے اور اللہ ہی کے لئے بغض و عداوت رکھے اور اللہ ہی کے لئے خرچ کرے اور اللہ ہی کے لئے خرچ بند کرے تو یقیناً اس نے ایمان کو کامل کیا۔
ابوداؤد اور ترمذی نے اس روایت کو معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے کسی قدر تقدیم و تاخیر کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں، پس یقیناً اس نے اپنے ایمان کو کامل کیا۔

توضیح: من احب لله ای من احب شیئا لله وابغض شیئا لله واعطی شیئا لله ومنع شیئا لله:
نبی اکرم ﷺ نے یہاں تکمیل ایمان کی چار چیزیں بطور علامت بیان فرمائی ہیں۔ ان چار چیزوں کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ یہ چاروں چیزیں لذائذ نفس کے قبیل سے ہیں اس لئے اس میں اخلاص پیدا کرنا بڑا ہی مشکل ہے جب کوئی شخص لذائذ نفس میں اخلاص پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو دوسری چیزوں میں بدرجہ اولیٰ مخلص ہوگا اور یہی کمال ایمان ہے۔
یا یوں سمجھیں کہ ان چار خصلتوں کو اس لئے خاص کیا کہ یہ تمام کیفیات قلبیہ سے متعلق ہیں جب قلب سدھر گیا تو پورا نظام سدھر گیا گویا یہ کہا گیا کہ اعمال قلبی اور اعمال قالبی کا درست ہونا کامل ایمان ہے ظاہر ہے کہ جب کسی انسان کے احساسات وجذبات، حرکات وسکنات اس کے خیالات وتصورات اس کے ایجابی وسلبی رجحانات اور اس کے جوڑ اور توڑ کے تعلقات خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے تابع ہوجائیں تو اس کا ایمان کامل درجے میں مکمل ہوجائے گا۔[1]

سب سے افضل عمل کیا ہے

﴿۲۹﴾ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ۔ (رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ)[2]

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (باطنی) اعمال میں سب سے افضل مرتبہ اس عمل کا ہے کہ اللہ ہی کے لئے کسی سے محبت ہو اور اللہ ہی کے لئے کسی سے بغض و عداوت رکھی جائے۔ (ابوداؤد)

توضیح: ان اعمال کو اس لئے سب سے افضل قرار دیا کہ یہ اعمال قلبیہ ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں اس لئے ریاکاری سے محفوظ ہیں کیفیت قلبی ہونے کی وجہ سے دکھاوے کا امکان نہیں۔

سچا مومن کون اور جہاد کا مفہوم کیا ہے

﴿۳۰﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَیَدِهٖ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَائِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ. وَزَادَ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ بِرِوَایَةِ فَضَالَةَ وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِیْ طَاعَةِ اللّٰہِ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَایَا وَالذُّنُوْبَ)[3]

[1] المرقات ۱/۱۹۷ [2] اخرجه ابو داؤد: ۴۵۹۹ [3] اخرجه الترمذی ۵/۱۷ والنسائی

ترجمہ: حضرت ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (کامل اور سچا) مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان کی ایذا سے مسلمان محفوظ رہیں اور (پکا وصادق) مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جانوں کو اور اپنے مالوں کو امن میں سمجھیں۔ یہ روایت ترمذی اور نسائی نے نقل کی ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں فضالہ رضی اللہ عنہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں اور مجاہد وہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت میں اپنے نفس سے جہاد کیا اور مہاجر وہ ہے جس نے تمام چھوٹے اور بڑے گناہوں کو ترک کردیا۔

توضیح: اس حدیث کے پہلے حصہ پر کلام حدیث نمبر ۴ میں ہوا ہے وہاں دیکھ لیا جائے یہاں مختصراً عرض ہے کہ حدیث میں حصر ادعائی ہے کہ مسلمان تو وہی ہے کہ جس کے ہاتھ وزبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں اور مومن تو وہی ہے جس کو لوگ اپنی جان ومال پر امین ومامون سمجھیں۔

یہاں مسلم اور مومن کے لغوی معنی سے مسئلہ کو واضح کیا گیا ہے کہ ہر ایک کا مبدأ اشتقاق ملحوظ رہنا چاہئے اب اگر کوئی کہتا ہے کہ میں مسلم ہوں اور اس میں سلامتی نہ ہو اور وہ **متصف بالسلامة** نہ ہو تو یہ ایسا ہے جیسا کہ وہ اپنے کو کریم سخی کہتا ہے اور اس میں کرم سخاوت نہیں ہے، اسی طرح مومن امن سے مشتق ہے تو مومن میں اگر امن نہ ہو تو یہ ایسا ہے کہ اپنے آپ کو کریم کہتا ہے اور کرم نہیں ہے تو چاہئے کہ مسلم اور مومن اپنے مبدأ اشتقاق سے اپنے آپ کو متصف کرے ورنہ ایمان و اسلام کا دعویٰ باطل ہوجائے گا **والمجاهد من جاهد نفسه فی طاعة الله**۔ جہاد کی لغوی تعریف اور پھر شرعی تعریف علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے **مرقات** میں کی ہے۔

چنانچہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **الجهاد بكسر الجيم هو المشقة لغة وشرعًا بذل الجهد فی قتال الكفار**۔[1]

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **الجهاد بكسر الجيم وهو المشقة لغة وشرعا بذل المجهود فی قتال الكفار**۔[2]

ان دونوں تعریفات میں قتال الکفار جہاد کی تعریف میں داخل ہے اصلی اور حقیقی شرعی تعریف یہی ہے اور مطلق جہاد اسی پر بولا جاتا ہے۔ کنز العمال کتاب الایمان میں حدیث ہے **قيل ما الجهاد قال ان تقاتل الكفار اذا لقيتهم**، اب اصطلاحی اور شرعی مفہوم اور تعارف وتعریف یہی ہے اس کو چھوڑ کر جہاد کی لغوی تعریف کی طرف جانا مناسب نہیں۔ لغوی تعریفات سے اسلامی احکامات کو نہیں پہچانا جاتا بلکہ مدار اصطلاحی تعریف پر ہے۔ اب یہاں اس حدیث میں لفظ مسلم اور لفظ مومن اور لفظ مہاجر سب کا مبدأ اشتقاق لغوی مفہوم کے اعتبار سے ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ کاہے کا مسلم جس میں سلامتی نہیں، وہ کاہے کا مومن جس میں لغوی مفہوم مبدأ امن نہیں، وہ کاہے کا مہاجر جس میں مبدأ ترک عن الخطایا نہیں، وہ کاہے کا مجاہد جس میں جہاد کا مبدأ اشتقاق **جهد نفس فی طاعة الله** نہیں۔ اب اگر سلامتی مسلمان کی تعریف

[1] فتح الباری [2] المرقات

اصطلاحی نہیں اور امن مومن کی شرعی تعریف نہیں اور **ھجران الخطایا** مہاجر کی شرعی تعریف نہیں تو جہاد نفس بھی جہاد اور مجاہد کی اصطلاحی شرعی تعریف نہیں۔

افسوس اس پر ہے کہ ہر جگہ شرعی تعریف ہوتی ہے اور اس کو جامع مانع بنانے کے لئے سب حضرات کوشش کرتے ہیں فاعل کی تعریف مفعول کی تعریف استثنیٰ اور تنازع فعلان کی تعریف مبتدأ اور خبر وغیرہ کی تعریف کو تو جامع مانع بنایا جاتا ہے مگر جہاد کی تعریف کی زحمت نہیں کی جاتی ہے اور نہ اس کو جامع مانع بنانے کی فکر ہوتی ہے بس لفظ جہاد جہاں آ گیا دنیا کی ساری چیزیں اس میں داخل ہوگئیں ہر نیکی اس کا مصداق بن گئی اور ہر بھلائی جہاد میں داخل ہوگئی اور اسی اژدہام معانی میں جہاد گم ہو کر رہ گیا اور خارج میں اس کا مفہوم آنے سے پہلے اس کو دبا دیا گیا اور قرآن کی آیت کا خیال نہیں آیا کہ "**وفضل الله المجاهدين على القاعدين اجرًا عظيمًا**" وہاں بیٹھنے والوں کو مجاہد نہیں کہا گیا حالانکہ وہ تمام نیکیاں کرنے والے تھے ان کے عمل نفس اور مجاہدۂ نفس کو جہادِ اکبر نہیں کہا گیا بلکہ اعلیٰ فضیلت ان حضرات کو دی گئی جو میدانِ جہاد میں نکل گئے تھے انہیں کو مجاہد کہا گیا اور پیچھے بیٹھ کر نیکی کرنے والے کو قاعد کہا گیا مجھے کسی پر اعتراض کرنا نہیں۔ میں تمام شارحین کی قدر کرتا ہوں اور انہیں سے خوشہ چیں ہوں اور ان کو قلبی طور پر واجب الاحترام سمجھتا ہوں لیکن میں نہایت ادب سے ان سے دیگر احکام کی طرح جہاد کی شرعی اصطلاحی تعریف بھی چاہتا ہوں جیسا کہ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ نے کی جس سے تمام شبہات دور ہو جاتے ہیں میں تفصیل میں نہیں جا سکتا یہ مسئلہ انشاء اللہ کتاب الجہاد میں تفصیل سے آ جائے گا۔ یہاں صرف یہ عرض ہے کہ "**والمجاهد من جاهد نفسه**" یہ صرف لغوی مفہوم کی روشنی میں مبدأ اشتقاق کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اگر مجاہد ہو اور واقعی جہاد کے بڑے کام کرنے کا دعویٰ ہے تو اس نفس کو کیوں قابو نہیں کرتے ہو؟ کافر دشمن کو تو مار دیا لیکن نفس کی خواہش کے سامنے شکست کھا گئے یہ تو ایسا ہے کہ "**صلت على الاسد وبلت من النقد**" کہ شیر پر حملہ کر دیا اور بکری کو دیکھ کر پیشاب نکل گیا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے کوکب الدری میں اس جملے کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے۔

ولا يخفى ما بين الجهادين من الالتأم والاتصال فان مجاهدة الكفار لا تخلو عن مجاهدة النفس ولا تتصور دونها ومجاهدة النفس اذا كملت لا تكاد الرجل لا يجاهد الكفار بلسانه اوبسنانه. (کوکب الدری ص ۲۲۵)[1]

یعنی جہاد نفس اور جہاد کفار دونوں میں جو اتصال اور توافق ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہ رہے کیونکہ کفار سے جہاد کے ضمن میں نفس کا جہاد بھی پڑا ہے بلکہ نفس کے جہاد کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، اور ادھر نفس کا مجاہدہ جب مکمل ہو جاتا ہے تو آدمی تلوار یا زبان سے کفار کے ساتھ جہاد کے بغیر نہیں رہ سکتا، اس تصریح کے بعد یہ زور لگانا کہ نفس کا جہاد اصلی جہاد ہے وہ جہاد اکبر ہے وہ قریبی دشمن ہے پہلے اس سے لڑو اس سے قتال کرو، تو اس سے ایک عام آدمی اپنے اصل مقصد سے دور نکل جاتا ہے اگر

[1] کوکب الدری ۱/۲۲۵

کفار کے مقابلے کے بجائے جہاد کا کسی اور چیز پر لغوی اطلاق ہوا ہے یا نفس کے خطرات سے بچنے کے لئے کوئی تنبیہ آگئی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اصل شرعی جہاد ہی کو غائب کر دو۔

والمهاجر: ہجرت کے متعلق پہلی حدیث میں کلام گزر چکا ہے۔ **الخطايا خطيئة** چھوٹے گناہ اور **الذنوب** بڑے گناہ مراد ہیں بعض اہل لغت نے یہ ترتیب رکھی ہے ① سیئات ② خطایا ③ ذنوب ④ معاصی۔ اسی ترتیب سے چھوٹے اور پھر بڑے گناہ ہیں خطایا میں عمد نہیں ذنوب میں عمد ہے۔

دیانت اور ایفائے عہد کی اہمیت

﴿۳۱﴾ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِلاَّ قَالَ لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ۔ (رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ)[1]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ نے شاذ و نادر کوئی خطبہ ایسا دیا ہوگا جس میں یہ نہ فرمایا ہو کہ جس شخص میں امانت نہیں اس کا ایمان بھی نہیں اور جس میں وفائے عہد نہیں اس کا دین بھی کچھ نہیں۔

توضیح: ① شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے **لمعات** اور **اشعة اللمعات** میں فرمایا ہے کہ اگر اس حدیث میں امانت سے مراد وہ امانتیں ہیں جو لوگوں کے آپس میں اموال اور مجالس وکلام کی راز داری اور حفاظت سے متعلق ہیں اور عہد سے مراد بھی لوگوں کے آپس کے وعدے اور معاہدے ہیں تو پھر بطور تغلیظ وتشدید ایمان میں نفی کمال ایمان کی ہے کہ وہ شخص کامل مسلمان نہیں جو لوگوں کی امانتوں میں خیانت کرتا ہو۔

② اور اگر امانت سے مراد تکالیف شرعیہ ہیں جس کی طرف آیت "**انا عرضنا الامانة على السموات والارض**" میں اشارہ کیا گیا ہے اور عہد سے مراد عالم ارواح کا وعدہ "**الست بربکم قالوا بلی**" ہے تو پھر ایمان کی نفی میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ وہ تو پورا دین ہے تو اس قسم کی امانت اور عہد اگر کسی شخص میں نہیں ہے تو اس میں ایمان ہی نہیں ہے تو اصل ایمان کی نفی ہے۔

③ بعض علماء نے امانت سے مراد فرائض، دین، اور حدود اللہ لیا ہے۔

④ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ امانت سے مراد ایمان وہدایت کا ایک تخم اور استعداد ہے جو قلوب بنی آدم میں بکھیر دیا گیا ہے جس کی طرف حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت اشارہ کرتی ہے وہ فرماتے ہیں "**الامانة نزلت من السماء على جذر قلوب الرجال الخ**"، فرمایا پھر قرآن کریم اترا تو وہ استعداد زیادہ اجاگر ہوئی اس روایت کے اعتبار سے امانت وہ خلقی اور طبعی استعداد ہے جس کو فطرت کہا گیا ہے اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

⑤ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ عام خیانت اور بدعہدی کے عادی ہو جاتے ہیں اور پھر اسی بدعہدی اور

[1] اخرجه البيهقي

خیانت میں ترقی کرتے کرتے کفر تک پہنچ جائیں تو ممکن ہے کہ اسی قسم کے لوگ اس حدیث میں مراد ہوں تو پھر یہ حکم باعتبار مایؤل الیہ ہو جائے گا کہ جس میں آخر کار دیانت اور ایفائے عہد نہ رہے بلکہ وہ درجۂ کفر تک پہنچ جائے تو نہ اس کا ایمان ہے نہ اس کا دین ہے، امانت مع اللہ یہ ہے کہ اس کے اوامر اور نواہی کا پورا خیال رکھا جائے اور **امانت مع الخلق** یہ ہے کہ معاملات میں ان کے حقوق کا خیال رکھا جائے تو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا لحاظ رکھنا کامل ایمان ہے۔[1]

اب یہاں ایک اشکال ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے پہلے گزرا ہے کہ ایمان اور دین ایک ہیں پھر ایمان اور دین کو الگ الگ معنی کے ساتھ کیوں پیش کیا گیا جس سے تباین کا پتہ چلتا ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ ایمان اور دین واسلام میں ایک رائے کے مطابق تباین ہے تو یہاں تباین کے طور پر بیان کیا گیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ معنوی اعتبار سے ایمان اور دین متحد ہیں یہاں دونوں کا ذکر کرنا معنوی تکرار ہے جو تاکید کے لئے ہے لفظی تکرار نہیں ہے۔

الفصل الثالث

ابدی نجات کی ضمانت

﴿۳۲﴾ عَنْ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ النَّارَ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[2]

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے (سچے دل سے) اس بات کی گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ (اپنے فضل وکرم سے) اس پر دوزخ کی آگ (ابتداءً یا انتہاءً) حرام کردے گا۔ (حدیث کی تشریح پہلے ہو چکی ہے)

توحید کی اہمیت

﴿۳۳﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[3]

ترجمہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے اس اعتقاد پر وفات پائی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی (بھی حاجت روا مشکل کشا) معبود نہیں تو وہ شخص جنتی ہو گیا۔

توضیح: وهو يعلم: علم سے مراد علم یقینی اور عقد جازم ہے، صرف معرفت نہیں اور عقد جازم انقیاد و تسلیم کو مستلزم ہے عقد

[1] المرقات ۱/۲۰۰ [2] اخرجه مسلم ۱/۴۲ [3] اخرجه مسلم ۱/۴۱

جازم اور اس عقیدہ کے رکھنے کے بعد اس میں کوئی حرج نہیں کہ اس شخص کو زبانی اقرار کا وقت نہیں ملا یا وقت تو ملا مگر فوراً زبان سے اقرار نہ کیا یا زبانی اقرار پر قادر نہیں ہوا اور یا اقرار کے واجب ہونے کا اس کو علم نہیں تھا یا کسی نے اقرار کا ان سے مطالبہ نہیں کیا اور یہ شخص پہلے مر گیا ان تمام صورتوں میں یہ شخص جنتی ہے اور یہی عقیدہ کافی ہے **وھو یعلم** کا مفہوم یہی ہے۔[1]

لا الٰہ الا اللہ: اس جملہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کا جملہ مستلزم ہے خواہ کوئی اس کو ذکر کرے یا نہ کرے۔ کیونکہ **لا الٰہ الا اللہ** شہادتین کے لئے بطور علم ہے تو ایمان بالرسالۃ بھی اس میں آ گیا جیسا کہ پہلے تحقیق گزر چکی ہے۔

دخل الجنۃ: دخول اولی یا ثانوی ہو یہ تمام مباحث گزر چکی ہیں۔

جنت اور دوزخ کو واجب کرنے والی باتیں

﴿۳۴﴾ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْمُوْجِبَتَانِ قَالَ مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ وَمَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[2]

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو باتیں (جنت و دوزخ کو) واجب کرنے والی ہیں ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! (جنت و دوزخ کو) واجب کرنے والی وہ دو باتیں کون سی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا پہلی بات تو یہ کہ جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا تھا تو وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا اور (دوسری بات یہ کہ) جس کی وفات اس حال میں ہوئی کہ اس نے کسی کو اللہ کا شریک نہ کیا تھا تو وہ جنت جائے گا۔ (مسلم)

توضیح: ثنتان: یہ صفت ہے اس کا موصوف محذوف ہے یعنی **خصلتان ثنتان**۔

موجبتان: محاورہ ہے: "**اوجب الرجل اذا عمل مایجب بہ الجنۃ او النار ویقال للحسنۃ موجبۃ وللسیئۃ موجبۃ**، اب واجب کرنے والا اور وجوب اہل سنت والجماعۃ کے ہاں اللہ تعالیٰ کے اپنے وعدہ اور احسان واکرام کے طور پر ہے اور معتزلہ کہتے ہیں کہ خود یہ عمل واجب کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ پر بدلہ دینا واجب اور لازم ہوتا ہے۔[3]

حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جس شخص نے شرک جلی کا ارتکاب کیا اور اسی پر مرا تو دوزخ اس کے لئے واجب ہے اور جس شخص نے شرک نہیں کیا اور توحید اسلام کے عقیدہ پر مرا تو اس کے لئے جنت واجب ہے ہاں اگر گناہوں کا ارتکاب کیا اور سزا کا مستحق ہو کر دوزخ میں چلا گیا تو ہمیشہ وہاں نہیں رہے گا پھر نکل کر جنت میں جائے گا تو جنت کا دخول ہوگا خواہ اولیٰ ہو خواہ ثانوی ہو۔[4]

۲۳ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ چھٹی کے بعد:

جنت کی بشارت

﴿۳۵﴾ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كُنَّا قُعُوْدًا حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَمَعَنَا اَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ فِيْ نَفَرٍ فَقَامَ

[1] المرقات ۲/۲۰۱ [2] اخرجہ مسلم ۱/۶۱ [3] المرقات ۱/۲۰۲ [4] المرقات ۱/۲۰۲

رَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ بَيْنِ اَظْهُرِنَا فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا وَخَشِيْنَا اَنْ يُقْتَطَعَ دُوْنَنَا وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَخَرَجْتُ اَبْتَغِيْ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ حَتّٰى اَتَيْتُ حَائِطًا لِلْاَنْصَارِ لِبَنِي النَّجَّارِ فَدُرْتُ بِهٖ هَلْ اَجِدُ لَهٗ بَابًا فَلَمْ اَجِدْ فَاِذَا رَبِيْعٌ يَدْخُلُ فِيْ جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَةٍ وَالرَّبِيْعُ الْجَدْوَلُ قَالَ فَاحْتَفَزْتُ فَدَخَلْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَقَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ فَقُلْتُ نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ مَا شَانُكَ قُلْتُ كُنْتَ بَيْنَ اَظْهُرِنَا فَقُمْتَ فَاَبْطَاْتَ عَلَيْنَا فَخَشِيْنَا اَنْ تُقْتَطَعَ دُوْنَنَا فَفَزِعْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَاَتَيْتُ هٰذَا الْحَائِطَ فَاحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ وَهٰؤُلَاءِ النَّاسُ وَرَائِيْ فَقَالَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ وَاَعْطَانِيْ نَعْلَيْهِ فَقَالَ اِذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ فَمَنْ لَقِيَكَ مِنْ وَرَاءِ هٰذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ فَكَانَ اَوَّلَ مَنْ لَقِيْتُ عُمَرَ فَقَالَ مَا هَاتَانِ النَّعْلَانِ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ فَقُلْتُ هَاتَانِ نَعْلَا رَسُوْلِ اللهِ ﷺ بَعَثَنِيْ بِهِمَا مَنْ لَقِيْتُ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ بَشَّرْتُهٗ بِالْجَنَّةِ فَضَرَبَ عُمَرُ بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَخَرَرْتُ لِاِسْتِيْ فَقَالَ اِرْجِعْ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ فَرَجَعْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَاَجْهَشْتُ بِالْبُكَاءِ وَرَكِبَنِيْ عُمَرُ وَاِذَا هُوَ عَلٰى اَثَرِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَا لَكَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ قُلْتُ لَقِيْتُ عُمَرَ فَاَخْبَرْتُهٗ بِالَّذِيْ بَعَثْتَنِيْ بِهٖ فَضَرَبَ بَيْنَ ثَدْيَيَّ ضَرْبَةً خَرَرْتُ لِاِسْتِيْ فَقَالَ اِرْجِعْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَا عُمَرُ مَا حَمَلَكَ عَلٰى مَا فَعَلْتَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ اَبَعَثْتَ اَبَا هُرَيْرَةَ بِنَعْلَيْكَ مَنْ لَقِيَ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ بَشَّرَهٗ بِالْجَنَّةِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ فَاِنِّيْ اَخْشٰى اَنْ يَّتَّكِلَ النَّاسُ عَلَيْهَا فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَخَلِّهِمْ۔ (رواہ مسلم)[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم چند صحابہ رسول اللہ ﷺ کے گرد بیٹھے تھے اور ہمارے ساتھ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے کہ رسول اللہ ﷺ اچانک ہمارے درمیان سے اٹھے اور کہیں باہر تشریف لے گئے جب آپ ﷺ کو گئے ہوئے بہت دیر ہوگئی تو ہمیں سخت تشویش ہوئی کہ کہیں ہماری غیر موجودگی میں کسی دشمن کی جانب سے آپ ﷺ کو کوئی ایذا نہ پہنچ جائے ہم گھبرائے اور اٹھ کھڑے ہوئے چونکہ سب سے پہلا شخص میں تھا جو گھبرا اٹھا اس لئے میں رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں باہر نکلا اور ڈھونڈتا ہوا قبیلہ بنی نجار کے ایک انصاری کے باغ کے قریب پہنچ گیا۔ (اس خیال سے کہ شاید آپ ﷺ اس باغ کے اندر ہوں) میں نے اندر جانے کے لئے چاروں طرف دروازہ تلاش کیا۔ مگر دروازہ نظر نہیں آیا اچانک ایک نالی نظر آئی جو باہر کے کنوئیں سے باغ کے اندر جارہی تھی لہٰذا میں سمٹ سکڑ کر اس نالی میں داخل ہوا اور اس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں پہنچ گیا آنحضرت ﷺ نے فرمایا ابو ہریرہ تم؟ میں نے کہا جی ہاں یا رسول اللہ!

[1] اخرجہ مسلم ۱/۴۴

آپ ﷺ نے فرمایا کیا بات ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے پھر آپ ﷺ اٹھے اور چل دیئے۔ جب بہت دیر ہوگئی اور واپس نہیں ہوئے تو ہم گھبرا گئے کہ کہیں ہماری غیر موجودگی میں آپ کسی حادثہ سے دوچار نہ ہو جائیں اور سب سے پہلے گھبراہٹ مجھ پر طاری ہوئی چنانچہ آپ کو ڈھونڈتا ہوا اس باغ تک آنکلا (یہاں دروازہ نظر نہیں آیا) تو لومڑی کی طرح سکڑ کر (نالی کے راستہ سے) اندر گھس آیا باقی ماندہ لوگ بھی میرے پیچھے آرہے ہیں (یہ سن کر) آپ ﷺ نے اپنی دونوں جوتیاں نکال کر مجھے دے دیں، اور فرمایا اے ابو ہریرہ! جاؤ اور ان جوتیوں کو ساتھ لے جاؤ (تاکہ لوگ جان لیں کہ تم میرے پاس آئے ہو) اور باغ کے باہر جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد سے یہ گواہی دیتا ہوا تمہیں ملے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس کو جنت کی بشارت دے دو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے اس پیغام کو لے کر میں باہر نکلا تو سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے میری ملاقات ہوئی انہوں نے پوچھا ابو ہریرہ یہ جوتیاں کیسی ہیں؟ میں نے کہا یہ جوتیاں رسول اللہ ﷺ کی ہیں آپ ﷺ نے مجھے یہ جوتیاں (نشانی کے طور پر) دے کر اس لئے بھیجا ہے کہ جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ یہ گواہی دیتا ہوا ملے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس کو جنت کی بشارت دے دو یہ سنتے ہی عمر رضی اللہ عنہ نے میرے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل نیچے گر پڑا اور پھر انہوں نے کہا ابو ہریرہ! جاؤ واپس چلے جاؤ چنانچہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں واپس لوٹ آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ادھر عمر رضی اللہ عنہ کا خوف مجھ پر سوار ہی تھا کہ اب کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آپہنچے سرکار دو عالم ﷺ نے یہ حالت دیکھ کر پوچھا ابو ہریرہ کیا ہو گیا؟ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کا پیغام لے کر باہر نکلا تو سب سے پہلے میری ملاقات عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئی میں نے آپ ﷺ کا پیغام ان تک پہنچایا انہوں نے اس کو سنتے ہی میرے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل زمین پر آپڑا! اور پھر اس نے کہا کہ واپس چلے جاؤ۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے (حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا) عمر! تم نے ایسا کیوں کیا انہوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان کیا واقعی آپ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنی جوتیاں دے کر اس لئے بھیجا تھا کہ جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ **لا الٰہ الا اللہ** کہتا ہوا ملے اس کو یہ جنت کی بشارت دے دیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ہاں" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ایسا نہ کیجئے مجھے ڈر ہے کہ لوگ کہیں اسی بشارت پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں (اور عمل کرنا نہ چھوڑ دیں) اس لئے آپ ان کو زیادہ سے زیادہ عمل میں لگا رہنے دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اگر تمہارا یہی مشورہ ہے تو پھر لوگوں کو عمل میں لگا رہنے دو۔ (مسلم)

توضیح: **کنا قعوداً:** **ای قاعدین فی نفر** تین سے دس تک کی جماعت پر نفر کا اطلاق ہوتا ہے پھر مطلقاً قوم اور جماعت پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔[1]

بین اظهرنا: اس کلمہ میں یا تو لفظ بین مقحم یعنی زائد ہے ای **"من اظهرنا"** اور یا لفظ اظهر زائد ہے تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے **"ای من بیننا"** **اظهر ظهر** کی جمع ہے پشت کے معنی میں ہے لوگ جب بیٹھتے ہیں تو پشتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔[2]

---

[1] المرقات ۱/۲۰۲ [2] المرقات ۱/۲۰۳

وخشینا ان یقتطع دوننا: خشیت خوف مع التعظیم کو کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ "خشیة الله" کہہ سکتے ہیں اور "هبت الله" نہیں کہہ سکتے ہیں، **یقتطع:** ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے معنی میں ہے۔ **دوننا:** کا لفظ یہاں متجاوزاً اور بعیداً کے معنی میں ہے "دون" کا لفظ ورے ورے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور "ادون" کم تر کے لئے بھی بولا جاتا ہے "**ای خشینا ان یصاب بمکروه من عدو اوغیره متجاوزاً عنا وبعیداً منا**"۔ ۱

وفزعنا: سوال یہ ہے کہ **خشینا** پہلے آیا ہے اس کے بعد **فزعنا** کی کیا ضرورت تھی جب کہ دونوں کا مفہوم ایک ہے تو علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دو مترادفین کا ایک دوسرے پر عطف ہے اور اس سے گھبراہٹ کا تسلسل بتانا مقصود ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خشیت اور فزع میں فرق ہے کہ خشیت تو دل کا خوف ہے جس کا اثر ابھی ظاہری جسم پر ظاہر نہ ہوا ہو لیکن فزع اس اضطراب کا نام ہے جس میں آدمی اس طرح بے چین ہو کہ جسم کے ظاہر پر اس کا اثر ظاہر ہو جائے جیسے یہاں بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہونا اور تلاش میں پھیلنا ظاہر ہوا، ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں تاکید کے بجائے تاسیس ہے اور تاسیس تاکید سے بہتر ہے۔ ۲

حائطا: جس باغ کے اردگرد چاردیواری ہوتی ہے اسے حائط کہتے ہیں گویا **محاط بالجدران** ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو غالب گمان ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ادھر ہوں گے۔ **اشعة اللمعات** میں لکھا ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی محبت نے محبوب کی خوشبو سونگھ لی تو وہاں گئے۔ ۳

فدرت به: دار، یدور اردگرد گھومنے کے معنی میں ہے۔ **هل اجد بابا ای قائلاً فی نفسی هل اجد... الخ** ۴

فلم اجد: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو انتہائی بے چینی اور اضطراب کی وجہ سے دروازے کا علم ہی نہ ہو سکا ورنہ دروازہ تو ہوگا یا **فلم اجد** یعنی کھلا دروازہ نہ مل سکا، جو تھے وہ سب بند تھے۔ ۵

فاذا ربیع: ربیع نہر صغیر یعنی چھوٹا سا نالہ پانی کا جو باہر کے کنوئیں سے دیوار کے جوف میں ہوتا ہوا اندر کو جا رہا تھا اسی راستہ سے میں اندر داخل ہوا ربیع کی تفسیر کسی راوی نے جدول سے کی ہے دونوں ایک ہی چیز ہے۔ **من بئر خارجة:** یہ جملہ تین طرح پڑھا جاتا ہے اول احتمال یہ کہ بئر موصوف اور خارجہ صفت ہے یعنی یہ نالہ ایک ایسے کنوئیں سے اندر کو آ رہا تھا کہ وہ کنواں باہر تھا یہ توجیہ سب سے اچھی اور سب سے زیادہ مناسب اور واضح ہے۔ دوسرا احتمال یہ کہ بئر مضاف ہو اور خارجہ مضاف الیہ ہو اور خارجہ آدمی کا نام ہو یعنی خارجہ صاحب کے کنوئیں سے یہ نالہ آ رہا تھا۔ تیسرا احتمال یہ کہ بئر تنوین کے ساتھ ہو اور خارجہ مرفوع ہو اور "ہ" ضمیر جدار کی طرف لوٹتی ہو یعنی **من بئر خارجه** یعنی ایک کنواں جو باہر تھا بہر حال اول احتمال مشہور ہے۔ ۶

---

۱ المرقات ۱/۲۰۳ ۲ المرقات ۱/۲۰۳ ۳ المرقات ۱/۲۰۳
۴ المرقات ۱/۲۰۳ ۵ المرقات ۱/۲۰۳ ۶ المرقات ۱/۲۰۳، ۲۰۴

فاحتفزت: احتفاز اعضاء کے سکڑنے کو کہتے ہیں **وهو ضم الاعضاء** یعنی [1]

پس گرد آور دم دست وپائے خود را [2]

لومڑی جب جسم کو سکیڑ کر تنگ جگہ میں داخل ہوتی ہے اس کو احتفاز کہتے ہیں یعنی میں سکڑ گیا اور داخل ہو گیا۔

فقال ابوهريرة؟ بطور تعجب آنحضرت ﷺ نے استفہام کے ساتھ پوچھا **انت ابوهريرة؟** آنحضرت ﷺ نے یہ سوال یا تو اس لئے کیا کہ آپ اس بشارت اور وحی کی وجہ سے بشریت سے غائب تھے تو استفہام حقیقت پر مبنی ہے کہ پہچانا نہیں یا استفہام تقریری ہے یعنی ابو ہریرہ ہی ہونا؟ اچھا ابو ہریرہ ہو؟ یا استفہام تعجب کے لئے ہے کہ سب راستے بند ہیں تم کیسے آ گئے تعجب ہے تم ابو ہریرہ ہو؟

وهولاء الناس ورائى: یہ اقتباس ہے قرآن کریم کی آیت "**قال هؤلاء على اثرى وعجلت اليك رب لترضى**"۔ [3]

واعطانى نعليه: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی خبر اگرچہ مفید یقین تھی مگر اس خبر کو مزید یقینی بنانے کے لئے بطور نشانی نعلین مبارکین دیئے تا کہ ہر سننے والے کو بلا تردد اس بشارت پر یقین آ جائے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شاید حضور اکرم ﷺ کو مقام نوری میں تجلی طوری حاصل ہوئی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ ﷺ نے "**فاخلع نعليك انك بالواد المقدس طوى**" [4] کے طور پر جوتے اتار دیئے۔

اب سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو جوتے کیوں دیئے کوئی اور چیز بطور نشان کیوں نہیں دی؟ تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اور کوئی چیز شاید اس وقت نہیں تھی۔ دوسرا جواب یہ کہ جوتوں سے اشارہ کیا **ثبات على الدين** کی طرف کیونکہ ثابت قدمی اور جوتوں کا خاص تعلق ہے۔ [5]

فبشره بالجنة: دیوار کے پیچھے کا لفظ اتفاقی طور پر آیا ہے مراد یہ ہے کہ جس کی یہ صفت ہو کہ یقین کے ساتھ کلمہ پڑھتا ہو وہ جنتی ہے خواہ وہ دیوار کے پیچھے ہو یا کسی اور جگہ ہو اور خواہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کو خوشخبری پہنچائے یا نہ پہنچائے کیونکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تمام لوگوں کو خوشخبری کہاں پہنچا سکتے تھے تو مراد وہی ہے کہ جس کی بھی یہ صفت ہو وہ جنتی ہے۔ [6]

فخررت لاستى: خریخر گرنے کے معنی میں ہے **وخر موسى صعقا. لاستى اى على مقعدى،** است مقعد اور سرین کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سینے میں مجھے مکا مارا تو میں ایڑی اور سرین کے بل پیچھے کو گرا۔ [7]

فاجهشت: جهش اور اجهاش مزید مجرد دونوں ایک ہی معنی میں ہیں یعنی گریہ وزاری کرتے ہوئے کسی کی پناہ میں جانا جیسا بچہ روتا ہوا ماں کے پاس جاتا ہے یہ رونا یا تو درد کی وجہ سے تھا یا بے احترامی کی وجہ سے تھا۔ [8]

---

[1] المرقات ۱/۲۰۴ [2] المرقات ۱/۲۰۴ [3] المرقات ۱/۲۰۴ [4] المرقات ۱/۲۰۴ والکاشف ۱/۱۸۶

[5] المرقات ۱/۲۰۵ [6] المرقات ۱/۲۰۵ [7] المرقات ۱/۲۰۵ [8] المرقات ۱/۲۰۶

ور کبنی عمر: یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ ایسا تعاقب کیا گویا وہ میرے کندھوں پر سوار آرہے ہوں مراد متصل مسلسل آنا ہے۔[1]

سوال: یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی بشارت کے مقابلے میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو مار کر کیوں گرایا؟ شیعہ روافض بھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پوری امت بڑے چھوٹے بے بس تھے اور ان کی مداخلت برابر دین میں جاری تھی لوگ تقیہ کرتے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی تقیہ کیا اور خلافت چھوڑ دی۔

جواب: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ اس بشارت کا اعلان تو واجب نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ چونکہ رحمۃ للعالمین تھے تو آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس پریشانی کا علاج بالضد کیا کہ یہ پریشان ہوئے ہیں اب ان کو جنت کی بشارت دینی چاہیے اور چونکہ ابن خالی باغ میں آنحضرت ﷺ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس طرح ہوا گویا آپ ﷺ عالم استغراق میں تھے تو یہ بشارت سنادی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کیفیت میں نہیں تھے بلکہ آپ پر جمال کے بجائے جلال کی صفت غالب تھی اس لئے انہوں نے سوچا تھا کہ شاید اس سے لوگ سستی میں پڑ کر نماز چھوڑ دیں گے اس مصلحت دینی اور اس امر شرعی کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بشارت کو کچھ مدت کے لئے مخفی رکھنا چاہتے تھے۔ ادھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت میں خود نبی اکرم ﷺ نے اس قسم کی بشارت سنانے سے روکا تھا تو امتثال امر نبی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو مار کر واپس کر دیا اور یہ مارنا لوجہ اللہ تھا اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مواخذہ نہیں کیا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے تحت ان کے فیصلے کو برقرار رکھا اور بشارت کو مخفی رکھا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو سختی سے لوٹایا کہ حضور اکرم ﷺ سے مشورہ کریں گے کہ اس بشارت کا ظاہر کرنا اگر ضروری نہ ہو تو مصلحت کے تحت اس کو مؤخر کر لیا جائے تاکہ لوگ سست نہ ہوں۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے لئے معلم اور شیخ واستاذ کی حیثیت رکھتے تھے کسی مصلحت کے تحت شاگرد کا مارا جانا جائز تھا ناجائز نہیں تھا۔[2]

بہر حال حضور اکرم ﷺ نے مواخذہ نہیں کیا اور آج ملحد و بے دین اٹھ کر اعتراض کرتے ہیں یہ محض فساد اور بغض صحابہ کی ایک نشانی ہے۔

مورخہ ۲۴ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ

جنت کی کنجی

﴿۳۶﴾ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَفَاتِيْحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔
(رواه احمد)[3]

---

[1] المرقات ۱/۲۰۶ [2] المرقات ۱/۲۰۵، ۲۰۶ الکاشف ۱/۱۸۶، ۱۸۷ [3] اخرجه احمد ۵/۲۴۲

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سچے دل سے اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جنت کی کنجیاں (حاصل کرنا) ہے۔

توضیح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مبتداء اور خبر میں مطابقت نہیں ہے کہ **شهادة ان لا اله الا الله...الخ** خبر ہے جو مفرد ہے اور **مفاتیح الجنة** جمع ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شہادت کے ساتھ معاملہ اسم جنس کا کیا گیا لہٰذا اس کا اطلاق قلیل وکثیر پر درست ہوا تو مطابقت ہوگئی یا شہادت کے ہر ہر جزء کو مفتاح قرار دیا لہٰذا مفاتیح کہنا درست ہوا اور مطابقت ہوگئی عبارت اس طرح ہو جائے گی **مفاتيح الجنة شهادات ان لا اله الا الله**۔ تو کلمہ توحید کی خاصیت یہی ہے کہ یہ جنت کی کنجی ہے بشرطیکہ کوئی اور خارجی عمل رکاوٹ نہ بن جائے کیونکہ حکم معجون مرکب پر ہوتا ہے یا یہ کہ کلمہ اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ مراد ہے یا یہ کہ دخول اوّلی یا ثانوی مراد ہے یا یہ کہ کلمہ توحید کے بعد عمل کا موقع ہی نہ ملا تو صرف کلمہ سے جنت میں جائے گا۔[1]

کلمہ توحید نجات کا ذریعہ ہے

﴿۳۷﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ إِنَّ رِجَالاً مِّنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ حِيْنَ تُوُفِّيَ حَزِنُوْا عَلَيْهِ حَتّٰى كَادَ بَعْضُهُمْ يُوَسْوِسُ قَالَ عُثْمَانُ وَكُنْتُ مِنْهُمْ فَبَيْنَا أَنَا جَالِسٌ مَرَّ عَلَيَّ عُمَرُ وَسَلَّمَ فَلَمْ أَشْعُرْ بِهِ فَاشْتَكٰى عُمَرُ إِلٰى أَبِيْ بَكْرٍ ثُمَّ أَقْبَلَا حَتّٰى سَلَّمَا عَلَيَّ جَمِيْعاً فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ مَا حَمَلَكَ عَلٰى أَنْ لَا تَرُدَّ عَلٰى أَخِيْكَ عُمَرَ سَلَامَهُ قُلْتُ مَا فَعَلْتُ فَقَالَ عُمَرُ بَلٰى وَاللهِ لَقَدْ فَعَلْتَ قَالَ قُلْتُ وَاللهِ مَا شَعَرْتُ أَنَّكَ مَرَرْتَ وَلَا سَلَّمْتَ قَالَ أَبُوْبَكْرٍ صَدَقَ عُثْمَانُ قَدْ شَغَلَكَ عَنْ ذٰلِكَ أَمْرٌ فَقُلْتُ أَجَلْ قَالَ مَا هُوَ قُلْتُ تَوَفَّى اللهُ تَعَالٰى نَبِيَّهُ ﷺ قَبْلَ أَنْ نَسْأَلَهُ عَنْ نَجَاةِ هٰذَا الْأَمْرِ قَالَ أَبُوْبَكْرٍ قَدْ سَأَلْتُهُ عَنْ ذٰلِكَ فَقُمْتُ إِلَيْهِ وَقُلْتُ لَهُ بِأَبِيْ أَنْتَ وَأُمِّيْ أَنْتَ أَحَقُّ بِهَا قَالَ أَبُوْبَكْرٍ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ مَا نَجَاةُ هٰذَا الْأَمْرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ قَبِلَ مِنِّي الْكَلِمَةَ الَّتِيْ عَرَضْتُ عَلٰى عَمِّيْ فَرَدَّهَا فَهِيَ لَهُ نَجَاةٌ۔ (رواہ احمد)[2]

ترجمہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت پر رنج وحزن کا اتنا غلبہ تھا کہ ان میں سے بعض لوگوں کے بارے میں تو یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں شک وشبہ میں گرفتار نہ ہو جائیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں میں ایک میں بھی تھا چنانچہ میں (غم کی حالت میں) بیٹھا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس سے گزرے اور مجھ کو سلام کیا (غم کی وجہ سے) مجھے پتہ نہیں چلا (کہ وہ کب میرے پاس سے گزرے اور

[1] الکاشف ۱/۱۸۸، ۱۸۹ [2] اخرجہ احمد ۱/۶

کب سلام کیا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کی شکایت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے اور دونوں حضرات نے مجھے سلام کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے پوچھا تم نے اپنے بھائی عمر کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے کہا نہیں نہیں ایسا نہیں ہوا (یعنی مجھے اس کا علم نہیں کہ عمر نے آکر مجھے سلام کیا ہو اور میں نے جواب نہ دیا ہو) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہاں خدا کی قسم ایسا ہی ہوا ہے (کہ تم نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا بخدا مجھے قطعاً اس کا احساس نہیں کہ آپ میرے پاس آئے تھے اور نہ ہی آپ نے سلام کیا ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا عثمان سچ کہتے ہیں (لیکن معلوم ہوتا ہے کہ) کسی خاص وجہ نے تمہیں اس سے باز رکھا (کہ نہ تو عمر رضی اللہ عنہ کے آنے کی تمہیں خبر ہوئی اور نہ تم ان کے سلام کا جواب دے سکے) میں نے کہا ہاں ہو سکتا ہے انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ میں نے کہا (سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہی کیا کم صبر آزما تھی کہ اب یہ غم کھائے جاتا ہے کہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن ہم آپ سے یہ دریافت نہ کر سکے کہ اس معاملہ (یعنی عبادت میں وسوسوں کا پیدا ہونا شیطان کا بہکانا یا دوزخ کی آگ) سے نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (تم غم نہ کھاؤ) میں اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہی پوچھ چکا ہوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں (بے اختیار) کھڑا ہو گیا اور بولا آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں واقعی آپ ہی (آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کمال قرب رکھنے اور حصول علم کے غلبہ شوق کی وجہ سے) اس بارے میں سوال کرنے کے لئے لائق تر تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ! اس معاملے میں نجات کی کیا صورت ہوگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جس شخص نے (خلوص دل کے ساتھ) ہم سے وہ کلمہ توحید قبول کر لیا جسے میں نے چچا ابوطالب کے سامنے پیش کیا تھا اور انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا تھا تو وہ کلمہ اس شخص کی نجات کا ضامن ہوگا۔ (احمد)

توضیح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سانحہ ارتحال بہت شدید تھا اس صدمے سے عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نڈھال اور حواس باختہ ہو گئے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر اور عالی ہمت صحابی نے تو موت کا ایک وقت تک انکار ہی کیا اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عزم وہمت کا پہاڑ بن کر سہارا نہ دیتے تو نہ معلوم کیا کچھ ہوتا اسی صدمہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی متاثر ہوئے تھے جو ارتحال رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشہ اس طرح پیش کر رہے ہیں۔

کاد بعضهم یوسوس: ای بان یقع فی نفسه انقضاء هذا الدین وانطفاء الشریعة الغراء بموته

یعنی دین کے مٹنے کے وساوس دل میں آنے لگے اور شریعت کی روشنی کی انتہاء کا خیال آیا۔ بعض تو بیٹھ ہی گئے اور بعض نے موت کا انکار کیا صرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ قائم اور دائم رہے۔[1]

فیهما: یعنی اسی اثناء اسی دوران **"فلم اشعربه ای بمرورہ اوبسلامه اوبهما وهوالاظهر"** یعنی مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گزرنے کا احساس تک نہ ہوا یا ان کے سلام کا شعور واحساس نہ ہو سکا، یا دونوں کا احساس نہ ہوا، یہی

---

[1] المرقات ۱/۲۰۸

مطلب زیادہ واضح ہے کہ نہ گزرنے کا پتہ چلا اور نہ سلام کا علم ہوا، خود مدہوشی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ ؎۱

فاشتکی عمر الی ابی بکر: اس بات کی شکایت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے کی کہ اتنا طویل عرصہ بھی نہیں گزرا ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ سلام کا جواب بھی نہیں دے رہے اس شکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خلیفہ بننے سے پہلے ہی اپنا بڑا سمجھ رہے تھے اور ممکن ہے کہ اس وقت خلیفہ بنے ہوں۔ یہی بات زیادہ واضح ہے۔

ما فعلت: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جب ابوبکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے پوچھا تو آپ نے صاف انکار کیا کہ مجھے کسی نے سلام نہیں کیا ہے یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے خیال کے مطابق سچ فرمایا کیونکہ وہ مدہوشی کے عالم میں تھے۔ ؎۲

فقال عمر بلی: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا حقیقت حال پر مبنی ہے۔ **ولا سلمت:** یہ تاکید ہے **مروت** کے لئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شکایت کا جواب ہے کہ قسم بخدا مجھے آپ کے گزرنے کا بھی احساس نہیں ہوا اور نہ سلام کا احساس ہوا ہے۔ ؎۳

قد شغلک: یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے عثمان رضی اللہ عنہ کیطرف التفات ہے۔ **امرٌ:** میں تنوین تعظیم کے لئے ہے یعنی کسی بڑے عظیم الشان کام نے آپ کو سلام کلام سے مشغول رکھا تھا، اس میں اشارہ ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ اس معاملے میں حق بجانب ہیں۔ ؎۴

فقلت اجل: یعنی ایسا ہی ہوا کہ ایک بڑی فکر اور بڑے تصور نے مجھے مدہوش رکھا۔ ؎۵

قال ما ھو: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بتاؤ وہ بڑی فکر کیا ہے؟ ؎۶

عن نجاۃ ھذا الامر: یعنی مجھے فکر یہ تھی کہ کاش میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتا کہ اس دین اسلام میں نجات کا مدار کس چیز پر ہے؟ تو اس حدیث میں **الامر** سے مراد دین اسلام ہے تو جواب میں یہ بات آگئی کہ دین اسلام میں نجات کا دارومدار کلمہ شہادت اور کلمہ توحید پر ہے کہ آخرت میں نجات اسی کی برکت سے ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان وساوس اور ان مہلکات وشہوات اور مرغوبات اور اغوائے شیطانی سے آدمی کس طرح نجات پاسکتا ہے کہ کامیاب ہوکر جنت چلا جائے۔ تو اس کا جواب بھی وہی ہے کہ کلمہ توحید کے تکرار واستمرار اور اس پر عقد جازم رکھنے سے انسان ان تمام اوہام وخیالات فاسدہ سے چھٹکارا حاصل کرسکتا ہے اور کامیاب ہوکر جنت جاسکتا ہے۔ اب اس حدیث پر یہ اشکال نہیں ہوگا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تو خود وہ حدیث نقل فرماتے ہیں جس میں ہے "**من مات وھو یعلم انہ لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ**" جب آپ خود یہ حدیث بیان فرما رہے ہیں تو پھر نجات سے متعلق اتنی پریشانی کا کیا مطلب ہوا؟ تو جواب یہی ہے کہ ان وساوس شیطانی سے چھٹکارا پانے کی پریشانی لاحق تھی اس کی تفصیل محمد بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں ہے جس کی تخریج علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع الجوامع میں کی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: ؎۷

؎۱ المرقات ۱/۲۰۸ ؎۲ المرقات ۱/۲۰۸ ؎۳ المرقات ۱/۲۰۹ ؎۴ المرقات ۱/۲۰۹

؎۵ المرقات ۱/۲۰۹ ؎۶ المرقات ۱/۲۰۹ ؎۷ المرقات ۱/۲۰۹، ۲۱۰

"یالیتنی سألت رسول الله اما ینجینا من هذا الحدیث الذی یلقی الشیطان فی انفسنا"۔

اور اشعة اللمعات میں جو لکھا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ

"دوست ندارم کہ بزبان آرم آن را" [1]

یعنی وہ ایسے وساوس وخیالات ہیں کہ میں اس کو زبان پر لانا نہیں چاہتا ہوں۔ اس پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "قد سألته" کہ میں نے یہ سوال آنحضرت ﷺ سے خود کیا تھا۔

انت احق بها: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں آپ اس سوال کرنے کے سب سے زیادہ حق دار تھے، یا آپ اس خصلت کے زیادہ حق دار ہیں، یا آپ اس نجات کے زیادہ حق دار ہیں۔ [2]

من قبل منی: یعنی کلمہ توحید کو دل کی خوشی اور رغبت سے قبول کرے اور دل میں نفاق نہ رکھے جس کو میں نے اپنے چچا پر پیش کیا تھا۔

فهی له نجاة: ای ابتداءً وانتهاءً. یعنی حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو کلمۂ توحید میں اپنے چچا ابو طالب پر پیش کر چکا تھا جس کو اس نے رد کر دیا تھا اگر وہ قبول کر لیتا تو باوجود ستر سالہ گناہوں اور شرکیات کے وہ معاف ہو جاتا تو ایک مسلمان جس کے دل ودماغ اور رگ وریشہ میں کلمہ توحید پیوست ہے اگر وہ صدق دل سے پڑھتا ہے تو وہ بطریق اولیٰ نجات یافتہ بن جائے گا۔

اس طرز بیان میں حضور اکرم ﷺ نے نہایت بلیغ انداز سے کلمہ توحید کی شان اور اہمیت واضح فرمادی ہے اگر آپ صرف یہ فرمادیتے کہ اس سے نجات کا ذریعہ کلمہ توحید ہے تو یہ اہمیت واضح نہ ہوتی۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ابو طالب کا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوا شیعہ رافضی کہتے ہیں کہ مولا علی کے والد تو سب سے بڑے ایمان والے تھے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مولا علی کا والد ایمان پر نہ ہو؟

اللہ کے بندے اس کو نہیں سوچتے کہ انبیاء کرام میں سے بڑے بڑے نبیوں کے آباء واجداد جب ایمان پر نہیں آئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ میں کیا اشکال ہے۔ [3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کچھ تذکرہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ابتدائے اسلام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکے تھے حبشہ کی طرف دو مرتبہ ہجرت کی بدر میں بوجہ معذوری حاضر نہ ہو سکے مگر بدری قرار پائے صلح حدیبیہ میں ان کا بدلہ لینے کے لئے بیعت رضوان ہوئی آنحضرت ﷺ نے اپنا مبارک ہاتھ عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دے کر بیعت فرمادی ان کو ذوالنورین اس لئے کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے آپ کے نکاح میں آئیں آپ کا رنگ سفید تھا قد درمیانہ تھا یکم محرم ۲۴ھ میں خلیفہ ثالث بنے اور بارہ سال تک خلافت کی، **اسود تجیبی مصری** نے آپ کو شہید کیا،

[1] المرقات ۱/۲۱۰ [2] المرقات ۱/۲۱۰ [3] المرقات ۱/۲۱۰

اس وقت آپ کی عمر ۸۲ سال تھی، جنت البقیع میں مدفون ہیں۔قبر نمایاں ہے۔

رضی الله عنه وعن جميع الصحابة۔

پوری دنیا میں اسلام کے غلبے کی پیشگوئی

﴿۳۸﴾ وَعَنِ الْمِقْدَادِ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَذُلِّ ذَلِيْلٍ اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا اَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا قُلْتُ فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ (رواه احمد)[1]

ترجمہ: اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ زمین کے اوپر کوئی گھر خواہ وہ مٹی کا ہو یا خیمہ کا، ایسا باقی نہیں رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو معزز کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی رسوائی کے ساتھ داخل نہ کرے۔ (پس جو لوگ خوشی سے اسلام قبول کریں گے) ان کو اللہ تعالیٰ معزز بنا کر اس کلمہ کا اہل قرار دے گا۔ (اور جو لوگ بخوشی قبول نہ کریں) ان کو اللہ تعالیٰ ذلیل کر کے رکھ دے گا تو وہ لوگ اس کلمہ کے مطیع وفرماں بردار ہونے پر مجبور ہوں گے (بایں طور کہ وہ جزیہ ادا کر کے اسلامی ریاست میں رہ سکیں گے) میں نے یہ سن کر کہا پھر تو چاروں طرف اللہ ہی کا دین ہوگا۔ (احمد)

توضیح: بیت مدر: یہ مدرۃ کی جمع ہے اینٹ اور پتھر مراد ہیں۔[2]

وبر: پشم کو کہتے ہیں خیمے مراد ہیں۔ "بیت مدر" یہ شہری آبادی کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں لوگ پکے مکانات میں رہتے ہیں اور ''وبر'' سے صحرائی اور دیہاتی آبادی کی طرف اشارہ ہے جہاں زیادہ تر خیمے بطور گھر استعمال ہوتے ہیں۔ اور **الارض،** سے مراد جزیرۂ عرب اور اس کے ارد گرد علاقے ہیں یعنی پورے عرب میں صرف ایک دین یعنی اسلام کا دور دورہ ہوگا۔ اب یہ اعتراض نہیں آئے گا کہ چین کے دور دراز علاقوں تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچی اور غلبہ نہیں آیا کیونکہ جواب واضح ہے کہ یہ شہر اور دیہات اور یہ خیام ومحلات صرف جزیرۂ عرب کے ہیں جہاں تک مکمل اسلام پھیل جائے گا اور یہ پیشن گوئی پوری ہوگئی یا "الارض" سے مراد دنیا کی عام زمین ہے اس کی تفصیل ابھی آرہی ہے۔

بعز عزیز: ای الکلمة متلبس بعز شخص عزیز، یعنی جو لوگ اطاعت وخوشی سے اسلام قبول کرلیں گے اور مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کریں گے تو عزت سے رہیں گے۔ **وذل ذلیل:** یعنی جو مقابلہ کرے گا تو یہ کلمہ وہاں بھی داخل ہوجائے گا مگر مقابلہ کرنے والے اس ذلیل شخص کی ذلت کے ساتھ جس کو اللہ تعالیٰ خوار کردے گا اور وہ قید وبند اور جزیہ وغلامی کی ذلتوں کے بعد گردن جھکالے گا۔[3]

[1] اخرجه احمد ۶/۴ [2] المرقات ۱/۲۱۱ [3] المرقات ۱/۲۱۱

فیدینون لہا ای یطیعون لہا: یعنی سب لوگ اس کلمہ توحید کے سامنے مطیع وفرمانبردار بن جائیں گے اس حدیث سے علماء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ حربی شخص کا اسلام تلوار کے زور اور اس کے خوف سے صحیح ہے۔ [1]

قلت فیکون الدین کلہ للہ: سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں آپ کے سامنے نہیں کہا، اسی لئے آنحضرت ﷺ کی طرف سے جواب نہیں آیا یا آپ نے اسی مجلس میں کہہ دیا مگر حضور اکرم ﷺ نے جواب دینے کو ضروری نہیں سمجھا۔

سوال: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے غلبۂ اسلام کی پیشگوئی فرمائی ہے اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ پیشگوئی پوری ہوگئی ہے یا پورا ہونا باقی ہے؟

جواب: پہلا جواب تو گزر گیا ہے کہ غلبہ اسلام کی یہ پیشگوئی جزیرۂ عرب کے لئے تھی اور وہاں پر یہ غلبہ حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں حاصل ہوگیا تھا پوری دنیا پر غلبہ مراد نہیں۔

دوسرا جواب یہ کہ پوری دنیا پر غلبہ مراد ہے اور یہ غلبہ عمومی طور پر خلفاء راشدین کے دور میں آچکا تھا اسلام غالب دین کے طور پر مشرق ومغرب میں پھیل چکا تھا قیصر وکسریٰ کا تصور ختم ہو چکا تھا اور دین کا بول بالا تھا حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی کافر نہیں رہے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ دین غالب ہوگا اور یہ حدیث قرآن کریم کی اس آیت سے اقتباس ہے:

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ غلبہ دلائل اور قوت استدلال کے اعتبار سے ہے اور اس طریقے پر تو اسلام روز اول سے آج تک غالب ہی چلا آرہا ہے دلائل کی دنیا میں کون اس کا مقابلہ کرسکتا ہے یہ جواب بہت اچھا ہے لیکن اسی کے آسرہ پر بیٹھ کر غلبۂ اسلام کے لئے عملی میدان میں نہ اترنا جہاد کو ترک کرنا اور اسلامی سیاسی قوت وخلافت کے حصول سے پیچھے رہنا قرآن وحدیث کے واضح نصوص کی خلاف ورزی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ کو پس پشت ڈالنا ہے لہٰذا معطل ہو کر بیٹھنا جائز نہیں۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ غلبہ مکمل طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں حاصل ہوگا اس وقت تو جزیہ کا نظام بھی بحکم شریعت محمدی موقوف ہو جائے گا پھر یا اسلام ہوگا یا کافر کی موت ہوگی۔ [2]

کلمہ توحید کے ساتھ نیک اعمال کی ضرورت

﴿۳۹﴾ وَعَنْ وَهْبِ بْنِ مُنَبِّهٍ قِيلَ لَهُ أَلَيْسَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لَيْسَ مِفْتَاحٌ إِلَّا وَلَهُ أَسْنَانٌ فَإِنْ جِئْتَ بِمِفْتَاحٍ لَهُ أَسْنَانٌ فُتِحَ لَكَ وَإِلَّا لَمْ يُفْتَحْ لَكَ.

(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ فِي تَرْجَمَةِ بَابٍ) [3]

---

[1] المرقات ۱/۲۱۱ [2] المرقات ۱/۲۱۱ [3] اخرجہ البخاری ۲/۸۹

ترجمہ: حضرت وھب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ کسی نے ان سے سوال کیا، کہ کیا لا الٰہ الا اللہ جنت کی کنجی نہیں ہے؟ وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کیوں نہیں لیکن کوئی کنجی ایسی نہیں ہوتی جس کے دندانے نہ ہوں پس اگر تم ایسی کنجی لے کر آؤ گے جس میں دندانے موجود ہوں تو تمہارے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے ورنہ نہیں کھولے جائیں گے۔

توضیح: وھب بن منبہ تابعی ہیں فارسی النسل ہیں حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایتیں کرتے ہیں یہ ایک دفعہ وعظ فرمارہے تھے کہ کسی نے ان سے سوال کیا کہ **الیس لا الہ الا اللہ مفتاح الجنة** تو آپ نے یہ جواب دیا کہ کنجی کے لئے دندان بھی تو ہوتے ہیں تب چابی کام کرتی ہے اور دندانے اعمال صالحہ اور ارکان اسلام ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۱۴ھ میں ہوا۔[۱]

لیس مفتاح: یعنی خواہ لوہے کی ہو یا لکڑی کی ہو **الا وله اسنان:** اسنان دانت کو کہتے ہیں اور چابی کے دندانوں سے اسلام کے بقیہ چار ارکان یعنی نماز زکوٰۃ روزہ اور حج بیت اللہ مراد ہیں تو یہ نیک اعمال جب ہوں گے تب جنت کے دروازے کھلیں گے۔[۲]

فتح لك: خواہ دخول اوّلی کے ساتھ ہو یا سزا بھگتنے کے بعد دخول ہو یہ قید احترازی بہت ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کے بارے میں جو عقیدہ معتزلہ اور خوارج کا ہے کہ سب لوگ اسلام سے بوجہ گناہ خارج ہوگئے ان پر رد ہوجائے ایسے ہی طبقات اور ایسے ہی افراد پر اس حدیث میں بلیغ ترین تردید ہے۔ **لم یفتح:** میں بھی دخول اوّلی یا ثانوی مراد ہے۔[۳]

ایک نیکی کا ثواب سات سو تک بڑھ سکتا ہے

﴿۴۰﴾ وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُكُمْ اِسْلَامَهٗ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِمِثْلِهَا حَتّٰى لَقِىَ اللّٰهَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۴]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص (اچھی نیت واخلاص سے) اپنے ایمان کو اچھا بنالیتا ہے۔ پھر وہ جو نیکی کرے گا اس کے لئے دس گنا زیادہ لکھی جاتی ہیں سات سو گنا تک اور جو برائی وہ کرتا ہے وہ اس کی مانند اور برابر لکھی جاتی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: اذا احسن احدکم اسلامه: حسن اسلام سے مراد باطنی طور پر اخلاص اور عقد جازم ہے جو تصدیق قلبی مع الاعمال ہے یعنی **ظاھرًا وباطنًا** حسن ہو باطن بھی اچھا ہو ظاہر بھی اچھا ہو۔[۵]

الی سبعمائة ضعف: یعنی اخلاص اور حسن نیت کی وجہ سے سات سو گنا تک ثواب میں اضافہ ہوگا اخلاص اور نیت کے تفاوت سے ثواب میں تفاوت آئے گا۔[۶]

---

[۱] المرقات ۱/۲۱۱ [۲] المرقات ۱/۱۱۲ [۳] المرقات ۱/۱۱۲

[۴] اخرجه البخاری ۱/۱۷ ومسلم ۱/۸۲ [۵] المرقات ۱/۱۱۳ [۶] المرقات ۱/۱۱۲

علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دس گنا تک ثواب تو یقینی ہے اور اضافہ سات سو گنا تک ہے اب اس سے آگے مزید ثواب نہیں ملے گا مگر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آگے کا ثواب بھی ملے گا اور اضافہ بھی ہوگا۔ چاہے کروڑوں کی تعداد تک نوبت پہنچ جائے یہاں سات سو کے عدد تک پہنچنے کا ذکر صرف کثرت کی بنیاد پر ہے نہ کہ حد بندی کی بنیاد پر اور آیت: **واللہ یضاعف لمن یشاء** بتارہی ہے کہ یہ اضافہ لامحدود ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ جہاں شریعت نے تعین نہیں کیا وہاں آدمی از خود تعین نہ کرے یعنی یہ نہ کہے کہ انچاس کروڑ ملے گا بلکہ یہ کہے کہ کروڑوں بھی مل سکتا ہے۔[1]

ایمان کی علامت

﴿۴۱﴾ وَعَنْ اَبِي اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا الْاِيْمَانُ قَالَ اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَمَا الْاِثْمُ قَالَ اِذَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ شَيْءٌ فَدَعْهُ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ)[2]

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! ایمان (کی سلامتی کی علامت) کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب تیری نیکی تجھ کو خوش کردے اور تیری برائی تجھے غمگین کردے تو سمجھ لو کہ تم پکے مؤمن ہو۔ پھر اس شخص نے پوچھا کہ یارسول اللہ! گناہ (کی علامت) کیا ہے آنحضرت ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ جب کوئی (کام) تمہارے دل میں کھٹک کر تردد پیدا کرے تو سمجھ لو کہ وہ گناہ ہے لہٰذا اس کو چھوڑ دو۔ (احمد)

توضیح: ما الایمان؟: سائل نے حقیقت ایمان کے بارے میں سوال نہیں کیا ہے بلکہ ایمان کی علامات اور آثار کا پوچھا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جواب میں علامات اور آثار کا ذکر فرمایا ہے۔[3]

اذا سرتك حسنتك: یعنی جب تک دل میں یہ کیفیت ہے کہ نیکی کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے اور برائی پر غم محسوس ہوتا ہے تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو اور اگر نیکی یا برائی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تو سمجھ لو کہ ایمان کا پارہ بجھ گیا۔[4]

اذا حاك: یعنی دل میں کھٹکے کہ یہ کام گناہ کا ہے تو اسے چھوڑ دے یہ روایت اسی طرح ہے جیسے "**الحلال بین والحرام بین وبینهما متشابهات**" یا جیسے **دع ما یریبك الی ما لا یریبك** اور **استفت نفسك الخ**۔ یہ حکم اور یہ فیصلہ اور یہ معیار و کسوٹی ان قلوب کیلئے ہے جو صاف اور روشن ہوں، جن کی باطنی صفائی مکمل ہو چکی ہو تو وہ اس میں فرق کرسکیں گے عوام الناس کے دلوں کا فیصلہ مراد نہیں ہے۔[5]

ہفتہ ۶ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ

ایمان واسلام کا تعارف

﴿۴۲﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ مَّعَكَ عَلٰى هٰذَا

[1] المرقات ۱/۱۱۳ [2] اخرجه احمد ۵/۲۵۱ [3] المرقات ۱/۱۱۳ [4] المرقات ۱/۱۱۳ [5] المرقات ۱/۱۱۳

الْاَمْرِ قَالَ حُرٌّ وَعَبْدٌ قُلْتُ مَا الْاِسْلَامُ قَالَ طِيْبُ الْكَلَامِ وَاِطْعَامُ الطَّعَامِ قُلْتُ مَا الْاِيْمَانُ قَالَ اَلصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ قَالَ قُلْتُ اَىُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ قَالَ قُلْتُ اَىُّ الْاِيْمَانِ اَفْضَلُ قَالَ خُلُقٌ حَسَنٌ قَالَ قُلْتُ اَىُّ الصَّلٰوةِ اَفْضَلُ قَالَ طُوْلُ الْقُنُوْتِ قَالَ قُلْتُ اَىُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ قَالَ اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ قَالَ قُلْتُ فَاَىُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ عُقِرَ جَوَادُهٗ وَاُهْرِيْقَ دَمُهٗ قَالَ قُلْتُ اَىُّ السَّاعَاتِ اَفْضَلُ قَالَ جَوْفُ اللَّيْلِ الْاٰخِرِ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ)[۱]

ترجمہ: عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یا رسول اللہ! (دعوت اسلام کے آغاز میں) اس دین اسلام پر آپ کے ساتھ کون ہیں؟ فرمایا ایک آزاد (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) اور ایک غلام (بلال رضی اللہ عنہ) میں نے عرض کیا اسلام کی علامت کیا ہے فرمایا پاکیزہ کلامی اور مساکین کو کھانا کھلانا، میں نے عرض کیا ایمان کی باتیں کیا ہیں؟ فرمایا صبر اور سخاوت، میں نے کہا کون سا مسلمان بہتر ہے؟ فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذاء سے مسلمان محفوظ رہیں، میں نے کہا ایمان میں بہتر چیز کیا ہے فرمایا اچھے اخلاق، میں نے کہا نماز میں کون سی چیز بہتر ہے؟ فرمایا دیر تک کھڑے رہنا، میں نے کہا کون سی ہجرت بہتر ہے؟ فرمایا کہ تم اس چیز کو چھوڑ دو جس سے تمہارا پروردگار ناخوش ہوتا ہو۔ میں نے کہا جہاد میں افضل کون ہے؟ فرمایا وہ شخص افضل ہے جس کا گھوڑا مارا جائے اور وہ خود بھی شہید ہو جائے میں نے کہا سب سے افضل کون سا وقت ہے آپ نے فرمایا نصف شب کا آخری حصہ۔ (احمد)

توضیح: حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ چوتھے مسلمان ہیں ابتداء میں اسلام قبول کر کے اپنی قوم بنی سلیم میں جا کر رہے اور سات ہجری میں جنگ خیبر کے موقع پر ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے آپ شامی ہیں آپ سے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ جب سنو کہ میں نے ہجرت کر لی تو پھر تم بھی آجانا آپ کی کنیت **ابو نجیح سلمی** ہے۔[۲]

اتیت: یعنی طلب علم کے لئے میں نبی اکرم ﷺ کے پاس چلا آیا۔

من معك على هذا الامر: امر سے مراد دین ہے یعنی آپ جس دین پر ہیں اس میں کون لوگ آپ کا ساتھ دے رہے ہیں؟ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحابی اس بات کو معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اس دین کو قبول کرنے والے لوگ کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں کہیں کوئی مخصوص طبقہ تو نہیں جو اس دین کو قبول کرتا ہو اور دوسرے لوگ مخالف ہوں یہ صورت اس وقت ہوا کرتی ہے جب کوئی تحریک کسی خاص گروہ کے خاص مقاصد کے لئے شروع کی جاتی ہے دعوت الٰہیہ میں یہ چیز نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ پوری امت کے لئے اور ان کے فوائد کے لئے عام ہوتی ہے۔[۳]

قال حر وعبد: **ای کل حر وعبد مامور بالموافقة** یعنی یہاں کوئی خاص طبقہ نہیں بلکہ ہر کہتر و مہتر اور ہر غلام و شریف کو موافقت کی کھلی دعوت ہے، جیسے کہا گیا ہے:[۴]

---

[۱] اخرجه احمد ۴/۱۱۴ [۲] المرقات ۱/۱۱۴ [۳] المرقات ۱/۱۱۴ [۴] المرقات ۱/۱۱۴

درِ فیض محمد وا ہے آئے جس کا جی چاہے نہ آئے آتش دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے
مریضان گناہ کو دو خبر فیضِ محمد کی بلا قیمت دوا ملتی ہے آئے جس کا جی چاہے

اس جملہ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ میری موافقت میں ایک آزاد ہے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے اور ایک غلام ہے جو بلال رضی اللہ عنہ ہے اس مفہوم کی تائید مسلم شریف کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں "**ومعه یومئذ ابوبکر وبلال**" کے الفاظ ہیں۔
اب سوال یہ ہے کہ اس وقت تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی مسلمان تھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے ان کا ذکر کیوں نہ کیا؟
جواب یہ ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو خواتین میں سے تھیں اس لئے ان کا ذکر نہیں آیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ چھوٹے تھے۔[۱]
قلت ما الاسلام؟ ای شعبه او کماله او علامته: تو حقیقت اسلام اور ماہیت اسلام کا سوال نہیں بلکہ علامت اسلام کا سوال تھا، **قال طیب الکلام واطعام الطعام** اس جملہ میں جزء اول سے غذائے روحانی اور جزء ثانی سے غذائے جسمانی مراد ہے ان دونوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے تو حقوق اللہ کا اہتمام بطریق اولی ہوا ہے ان دونوں جملوں سے جمیع محامد اور خصائل حسنہ مقصود ہیں مگر ان دو کی تخصیص فرمادی کیونکہ اول میں تو تواضع ہے اور ثانی میں سخاوت واکرام کا ذکر ہے اور یہ دونوں صفات مخلوق خدا کی خدمت کے لئے اصل ہیں۔[۲]
قلت ما الایمان؟ اس جملہ سے بھی علامت ایمان، ثمرۂ ایمان اور نتیجۂ ایمان کا سوال پوچھا گیا ہے ماہیت ایمان کا سوال نہیں ہے۔
قال الصبر: ای الصبر علی الطاعة والصبر علی المصیبة والصبر عن المعصیة صبر کی ان تینوں قسموں سے متعلق تفصیلات اور توضیحات حدیث نمبر ۳۰ میں گزر چکی ہیں۔
السماحة: حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سماحۃ سے مراد فرائض کی ادائیگی ہے بعض نے کہا ہے کہ ہر معدوم کے نہ ملنے پر صبر کرنا تو صبر ہے اور ہر موجود پر سخاوت کرنے کا نام سماحہ ہے۔ تو ایک ترک فعل ہوا اور ایک وجود فعل ہوا تو گویا ایمان دو قسم کے افعال کا نام ہوا ایک سلبی افعال اور دوسرے وجودی اعمال دونوں سے مل کر کامل ایمان بنتا ہے اور اسی مجموعہ کی طرف خلق حسن سے اشارہ کیا گیا ہے۔
ای الاسلام افضل؟: یہاں سوال اشخاص کے بارے میں ہے یعنی **ای اهل الاسلام افضل یا ای ذو الاسلام افضل** تو جواب میں "**من سلم المسلمون**" کہنا درست ہوا اور حمل درست نہیں ہے یا **من سلم** سے پہلے لفظ اسلام کو محذوف مانا جائے "**ای اسلام من**" تو سوال وجواب مطابق ہو جائے گا۔[۳]
من سلم المسلمون: اس جملہ سے پہلے **طیب الکلام** اور **اطعام الطعام** کا ذکر تھا جس میں **تحلیه بالفضائل** کا ذکر تھا اور اس جملہ میں **تخلیه عن الرذائل** کا ذکر ہے **طیب الکلام** کے جملہ کو حقوق العباد کی اہمیت کی وجہ سے مقدم کیا ورنہ طبعاً وعرفاً تخلیہ کا مقام تحلیہ سے مقدم ہوتا ہے کہ پہلے گندگی ہٹاؤ پھر زیب وزینت کر کے عطر لگاؤ۔

---
[۱] المرقات ۱/۱۱۳ [۲] المرقات ۱/۱۱۳ [۳] المرقات ۱/۱۱۳

ای الایمان افضل؟: یہاں بھی سوال اشخاص کے بارے میں ہے **ای اھل الایمان افضل یا ای اخلاق الایمان یا ای خصال الایمان یا ای شعب الایمان افضل۔**[1]

آنحضرت ﷺ نے لفظ "ای" کے ساتھ کئے گئے سوالات کے جواب میں مختلف جوابات دیئے ہیں یا تو سائل کی حالت کا تقاضا تھا یا زمانے کا تقاضا تھا یا مقام و مکان کا تقاضا تھا یا افضل ایک کلی ہے جس کی بہت انواع ہیں تو جس افضل کا ذکر ہوا وہ اسی کلی کی نوع میں سے ایک نوع ہے آپس میں تضاد نہیں پہلے اس پر کلام ہو چکا ہے۔ اس میں وضاحت اور تفصیل ہے اس کو دیکھ لیا جائے۔

خلق حسن کی تعریف:

قال خلق حسن: بلند و بالا خصلتوں اور اعلیٰ سیرت کے لئے جامع ترین صفت حسن اخلاق کی صفت ہے، کئی حدیثوں میں ایمان اور حسن اخلاق کو ایک ساتھ جوڑا گیا ہے، چنانچہ ابوداؤد شریف میں ایک حدیث ہے:

"**اکمل المؤمنین ایمانا احسنھم خلقا**"۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے "**وانك لعلی خلق عظیم**" حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ حضور اکرم ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ تو آپ نے فرمایا "**کان خلقه القرآن**" یعنی **اوامر و نواھی** کا پورا پورا لحاظ رکھنا اخلاق حسنہ ہے، قرآن کریم نے جس چیز کو اچھا کہا نبی اکرم ﷺ اس کو طبعاً اچھا سمجھتے تھے اور قرآن نے جس کام کو برا کہا نبی اکرم ﷺ طبعاً اس کو ناپسند فرماتے تھے "**کان خلقه القرآن**" کا یہی مطلب ہے۔

بعض محققین کا قول ہے کہ:

الخلق الحسن ھو بسط المحیا وبذل الندی و کف الاذی وان لا یخاصم لمعرفة الله تعالیٰ ولذا قیل الصوفی لا یخاصم ولا یخاصم۔[2]

الندی: عطیہ و سخاوت کو کہتے ہیں اور **المحیا** چہرہ کو کہا جاتا ہے۔

بعض نے حسن خلق کی اس طرح تعریف کی ہے "**ارضاء الخالق والمخلوق فی السراء والضراء**"۔

بعض نے کہا کہ حسن خلق یہ ہے کہ تزکیۂ نفس عن الرذائل ہو جائے اور تحلیہ نفس بالفواضل ہو جائے، رذائل کے دس اصول ہیں:

① زائد طعام ② فضول کلام ③ غضب ④ حسد ⑤ بخل ⑥ حب المال ⑦ حب الجاہ ⑧ تکبر ⑨ خود پسندی ⑩ ریاکاری۔

اسی طرح فواضل کے بھی دس اصول ہیں: ① توبہ ② خوف خدا ③ زہد و تقویٰ ④ صبر ⑤ شکر ⑥ اخلاص ⑦ توکل ⑧ محبت ⑨ رضا بالقضاء ⑩ ذکر الموت۔

---

[1] المرقات ۱/۲۱۴ [2] المرقات ۱/۲۱۴، ۲۱۵

قلت ای الصلوٰۃ افضل یعنی ای رکن الصلوٰۃ افضل **قال طول القنوت** علامہ انباری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قنوت چار معنوں میں آتا ہے: ① **الصلوٰۃ** ② **طویل القیام** ③ **الطاعۃ** ④ **السکوت**۔

بعض نے قرأت یا خشوع مراد لیا ہے، احناف کے نزدیک طول القنوت سے طول قیام مراد ہے اور یہ ان کے ہاں سجود سے افضل ہے۔ شوافع کے ہاں سجدہ قیام سے افضل ہے۔ اسی پر طول قیام اور کثرت سجود کی افضلیت کا اختلاف متفرع ہے۔

قلت ای الھجرۃ افضل: ہجرت پر کلام مشکوٰۃ شریف کی پہلی حدیث میں ہو چکا ہے۔ ہجرت کی کئی اقسام ہیں:

❶ **من دار الکفر الی دار الامن** جیسے مکہ سے حبشہ کی ہجرت تھی۔

❷ **من دار الکفر الی دار الاسلام** جیسے مکہ سے مدینہ کی ہجرت تھی۔

❸ **من دار الفسق الی دار التقوی** جیسے افغانستان میں طالبان کی اسلامی خلافت کی طرف ہجرت۔

❹ **ھجرۃ القبائل لتعلّم المسائل** جیسے آج کل دینی مدارس کے طلبہ کرتے ہیں۔ اور حضور ﷺ کے زمانے میں اور بعد میں مدینہ کی طرف علم سیکھنے کے لئے جو لوگ آتے تھے وہ اسی قسم کی ہجرت تھی۔

❺ **ھجرۃ من ھجر الخطایا والذنوب** یہ آخری نوع عام تر ہے۔

فای الجھاد افضل: یعنی **ای ذوی الجھاد افضل یا ای اھل الجھاد افضل؟** اس تقدیر سے کلام کے سوال وجواب میں مطابقت آجائے گی اور **من عقر جوادہ** صحیح ہو جائے گا۔[1]

اس قسم کے جہاد کو سب سے افضل اس لئے قرار دیا گیا کہ مجاہد نے اس میں مال وجان دونوں کو قربان کر دیا اور مال غنیمت وغیرہ میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا گویا ثواب خالص رہ گیا ہے:

جو پاس تھا وہ سب لٹا ہی دیا   حق تو یہ ہے کہ حق ادا ہی کیا

جہاد سے متعلق کلام انشاء اللہ کتاب الجہاد میں ہوگا۔

عقر: فعل مجہول ہے زخمی ہو کر مارا جانا۔ **"جوادہ":** عمدہ گھوڑا۔[2]

اھریق: یہ لفظ تین ابواب سے آتا ہے ① **ھراق یھریق ھراقۃ** یعنی اراق یریق۔ ② **اھرق یھرق اھراقاً**۔ ③ **اھراق یھریق اھراقۃ** بمعنی خون بہانا۔[3]

ای الساعات: یعنی حصول ثواب کے لئے سب سے اچھا وقت کونسا ہے۔

قال جوف اللیل: کیونکہ یہ **ابعد عن الریاء** ہے اور **اقوم قیلاً** ہے معدہ کے تمام فضلات اس وقت تحلیل ہو جاتے ہیں تو تصورات خالص ہو جاتے ہیں اور سحری کا وقت نسبتاً پر سکون بھی ہو جاتا ہے۔[4]

حسن حدیث: علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے متعلق خلق حسن کے تحت لکھا ہے: **ھذا حدیث حسن رواہ الحسن عن الحسن عن ابی الحسن عن جد الحسن ان احسن الخلق الخلق الحسن**۔[5]

---

[1] المرقات ۱/۲۱۵ [2] المرقات ۱/۲۱۵ [3] المرقات ۱/۲۱۵ [4] المرقات ۱/۲۱۶ [5] المرقات ۱/۲۱۳

ایمان واسلام پر مرنے والا جنتی ہے

﴿۴۳﴾ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ لَقِيَ اللهَ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَيُصَلِّي الْخَمْسَ وَيَصُوْمُ رَمَضَانَ غُفِرَ لَهُ قُلْتُ أَفَلَا أُبَشِّرُهُمْ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ دَعْهُمْ يَعْمَلُوْا.

(رَوَاهُ أَحْمَدُ)[۱]

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی طرف اس حال میں کوچ کیا کہ اس نے کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ٹھہرا رکھا تھا پانچوں وقت نماز پڑھتا تھا اور رمضان کے روزے رکھتا تھا تو وہ بخش دیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں لوگوں کو خوشخبری سنا دوں؟ آپ نے فرمایا کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو اور عمل میں لگا رہنے دو۔ (احمد)

توضیح: لا یشرك به شیئًا: یعنی شرک جلی اور شرک خفی دونوں سے محفوظ رہتا ہے۔[۲]

ویصوم رمضان: یعنی پانچ وقتہ نماز پڑھتا ہے اور روزے رکھتا ہے یہ جنتی ہے۔ زکوۃ اور حج کا ذکر اس روایت میں نہیں ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کے پیش نظر بطور مثال چند اعمال کا بیان کرنا تھا سب کا نہیں تھا یا اس لئے کہ اب تک حج کا حکم نہیں آیا تھا اور شاید زکوۃ کا بھی نہیں آیا ہوگا یا اس لئے دونوں کو ذکر نہیں کیا کہ مخاطبین میں مالی اعتبار سے دونوں کی ادائیگی کی قدرت نہیں تھی۔[۳]

غفر له: یعنی اس رمضان سے آئندہ رمضان تک مثلاً تمام صغائر گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اور اگر سچے دل سے توبہ کی تو کبائر بھی معاف ہو جائیں گے یا اللہ تعالیٰ اگر معافی دے دے تو تمام صغائر وکبائر معاف ہو جائیں گے یا صغائر معاف ہو جائیں گے تو کبائر کمزور پڑ جائیں گے۔[۴]

دعهم یعملوا: یعملوا مجزوم ہے کیونکہ امر کے جواب میں مضارع مجزوم ہوتا ہے۔ یعنی ان کو چھوڑ دو کہ عمل میں خوب محنت کریں عبادات میں اضافہ کریں اور حدیث کی اس اجمالی بشارت پر بھروسہ کر کے گناہ میں نہ پڑ جائیں۔ یہ عوام کا طریقہ اور عادت ہوتی ہے ورنہ خواص کو بشارت سنانے کے بعد چھوڑ دو تو وہ عبادت میں مزید پختہ ہو جاتے ہیں اگر چہ جنت ودوزخ کا تصور اور خیال اٹھ جائے وہ پھر بھی زہد وتقویٰ میں رہیں گے جیسے فرمایا گیا "**رحم الله صهيبًا لو لم يخف الله لم يعصه**" یعنی اگر خدا کے عذاب کا خوف نہ بھی ہو تو وہ پھر بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرے گا۔

دیکھئے اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اس اجمالی بشارت کو سنانے سے منع کر دیا ہے تو اگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو منع کیا تو کیا اعتراض ہے انہوں نے تو حضور اکرم ﷺ کے حکم کو نافذ کیا۔[۵]

---

[۱] اخرجه احمد ۵/۲۳۲ [۲] المرقات ۱/۲۱۶ [۳] المرقات ۱/۲۱۶ [۴] المرقات ۱/۲۱۶ [۵] المرقات ۱/۱۲۶

افضل ایمان کونسا ہے؟

﴿۴۴﴾ وَعَنْهُ اَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ اَفْضَلِ الْاِيْمَانِ قَالَ اَنْ تُحِبَّ لِلّٰهِ وَتُبْغِضَ لِلّٰهِ وَتُعْمِلَ لِسَانَكَ فِيْ ذِكْرِ اللّٰهِ قَالَ وَمَاذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَتَكْرَهَ لَهُمْ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ)[1]

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ ایمان کی اعلیٰ ترین باتیں کیا ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کسی سے تمہاری محبت بھی اللہ کے لئے ہو اور بغض وعداوت بھی اللہ ہی کے لئے ہو اور تم اپنی زبان کو (خلوص دل سے) اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ! اس کے علاوہ اور کیا ہیں آپ نے فرمایا دوسروں کے لئے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور جو چیز اپنے لئے ناپسند کرتے ہو وہ دوسروں کے لئے بھی ناپسند کرو۔ (احمد)

توضیح: افضل الایمان: اس سے مراد افضل ایمانیات ہیں یعنی مقتضیات، ایمان میں سب سے افضل کونسی چیز ہے آپ نے جواب میں حب فی اللہ، بغض فی اللہ اور کثرت ذکر اللہ کو بتایا اس پر کلام ہو چکا ہے۔[2]

قال وماذا: یعنی اس کے علاوہ اور کیا باتیں ہیں میں اور کیا کیا کروں؟

قال ان تحب للناس: یعنی جو چیز اپنی ذات کے لئے پسند ہے وہ سارے لوگوں کے لئے پسند کرو۔ یہاں یہ سوال ہوگا کہ آدمی کو اپنا مرغوب پسند تر ہوتا ہے تو یہ بہت مشکل ہو جائے گا کہ جو چیز مرغوب ہے وہ دوسروں کو دے دو۔ گاڑی دیدو، گھر دیدو، ہر من پسند چیز دیدو، یہ کیسے ہوگا۔؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اپنے نفس کے لئے جو چیز اچھی لگتی ہے اس کی نظیر اس کا مثل اور اس کی مانند چیز دوسروں کے لئے پسند کرو دل میں تمنا رکھو کہ کاش میرے پاس جو علم ہے مال ہے جاہ ہے جلال ہے اس کی مانند فلاں کے پاس بھی ہو۔[3]

"ان تحب ای مثل ما تحب" یہ بڑی خیر خواہی ہے اور مخلوق خدا کے لئے سہولت اور بڑی رہنمائی ہے اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو آپس میں ایسا ہی بنادے۔ آمین[4]

الحمد للہ آج ۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ میں بندۂ عاجز مشکوٰۃ شریف کی کتاب الایمان کی ۱۴۳ احادیث کی توضیحات وتشریحات سے فارغ ہوا۔ مولائے کریم میری مدد فرما جو لکھا اسے قبول فرما اور قلم کی ہر لغزش سے محفوظ فرما۔ (آمین)

---

[1] اخرجه احمد ۵/۲۴۷ [2] المرقات ۱/۲۱۶
[3] المرقات ۱/۲۱۷ [4] المرقات ۱/۱۲۷

تحفہ لا الٰہ الا اللہ

کتاب الایمان اور کلمہ توحید **لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کی مناسبت سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام آخر میں آجائے:

جہان فکر ونظر لا الٰہ الا اللہ　　متاع اہل خبر لا الٰہ الا اللہ

یہ ذکر حق کی متاع عزیز کیا شے ہے　　نہیں کسی کو خبر لا الٰہ الا اللہ

زہے نصیب یہ دولت اگر مجھے مل جائے　　ہو لب پہ شام وسحر لا الٰہ الا اللہ

نجوم وشمس وقمر بھی فریب دے نہ سکے　　خلیل کی ہے نظر لا الٰہ الا اللہ

کہیں بھی بحر معاصی میں غرق ہوجاتے　　نہ ہوتا ساتھ اگر لا الٰہ الا اللہ

ہر ایک ذرہ ہے مصروف یادِ حق کیفی　　وہ برگ ہو کہ شجر لا الٰہ الا اللہ

۲۷ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ

باب الكبائر وعلامات النفاق

گناہ کبیرہ اور نفاق کا بیان

اس باب میں مؤلف رحمۃ اللہ علیہ دو موضوعات سے متعلق احادیث پیش فرمائیں گے، ایک موضوع کبائر گناہوں کے متعلق ہے اور دوسرے نفاق کی علامات کے متعلق، لیکن اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ گناہوں کی تقسیم کس طرح ہے کبیرہ اور صغیرہ کی تعریف کیا ہے اور علماء کے اقوال کیا ہیں۔

صغیرہ اور کبیرہ کی تقسیم:

قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ "**كل شيء نهى الله عنه فهو كبيرة**" استاذ ابو اسحاق اسفرائنی شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں "**كل شيء نهى الله عنه فهو كبيرة**" نیز قیاس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخالفت کو اللہ تعالیٰ کی عظمت کے پیش نظر گناہ کبیرہ ہونا چاہیے۔

اس لئے یہ محققین حضرات کبیرہ اور صغیرہ کی طرف گناہ کی تقسیم نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک سارے گناہ کبیرہ ہیں لیکن جمہور امت سلفاً خلفاً کے نزدیک گناہ میں صغیرہ اور کبیرہ کی تقسیم جاری ہے۔ بدلیل قول اللہ تعالیٰ "**ان تجتنبوا كبائر ما تنهون عنه الآية۔ اى كبائر الذنوب. نكفر عنكم سيئاتكم اى نغفر لكم صغائركم. كما في البيضاوی**۔ اس قرآنی آیت کے علاوہ احادیث الباب کی کئی احادیث بھی اس پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ گناہ کی تقسیم صغیرہ وکبیرہ کی طرف ہوتی ہے اسی لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب البسیط میں لکھا ہے کہ کبیرہ گناہ اور صغیرہ میں فرق نہ کرنا یا اس فرق کا انکار کرنا، نادانی اور ناسمجھی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کا جواب یہ ہے کہ انہی سے یہ قول بھی منقول ہے:

"**كل ذنب ختم الله عليه بالنار او العذاب او اللعنة او الغضب فهو كبيرة والا فهو صغيرة**"۔

ان کے قیاس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کی دو نسبتیں ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی نسبت ہے، اس نسبت کی وجہ سے اگرچہ سب گناہ کبیرہ ہیں لیکن گناہوں کی دوسری نسبت ان کے آپس میں ہے، اس میں بعض گناہ بعض دوسرے گناہوں سے بڑے یا چھوٹے ہوتے ہیں، اسی اعتبار سے جمہور کے ہاں گناہوں کی تقسیم کبیرہ اور صغیرہ کی طرف ضروری ہے۔

صغیرہ اور کبیرہ گناہ کی تعریف میں اختلاف:

پھر جمہور کے ہاں آپس میں کبائر اور صغائر کی تعریف میں بڑا اختلاف ہے اور مختلف اقوال ہیں۔

اول:
یہ کہ جو گناہ نماز روزہ حج وغیرہ حسنات سے معاف نہیں ہوتے وہ کبائر ہیں، اور جو گناہ اعمال حسنہ سے معاف ہوجاتے ہیں وہ صغیرہ ہیں۔

دوم:
بعضے محققین ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کی روشنی میں کبیرہ ہر اس گناہ کو کہتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کا حتمی وعدہ کیا ہو یا عذاب یا لعنت اور یا غضب کا قطعی حکم دیا ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ صغیرہ ہے۔

سوم:
علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

"الاقرب ان الكبيرة كل ذنب كتب الشارع عليه حدًا او صرح بالوعيد فيه والا فصغيرة"۔

چہارم:
بعض حنفیہ نے فرمایا کہ ہر وہ گناہ جس کے لئے شریعت نے "فاحشة" کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس پر منصوص طور سے دنیوی یا اخروی عقوبت کو مقرر کیا ہے وہ کبیرہ ہے ورنہ صغیرہ ہے۔

پنجم:
امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہر گناہ اپنے مافوق کے اعتبار سے صغیرہ ہے اور اپنے ماتحت کے اعتبار سے کبیرہ ہے۔

ششم:
ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو گناہ دوسرے گناہوں کے لئے وسیلہ اور ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے، وہ صغیرہ ہے جیسے "النظر الى الاجنبية واللمس" جو ذریعہ زنا ہے یہ جب تک ذرائع کے درجہ میں ہیں تو صغیرہ ہیں۔ اور جو گناہ مقصود بالذات ہو جیسے زنا تو وہ کبیرہ ہے، اس تعریف کو حضرت قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے پسند فرمایا۔ اور شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ نساء آیت نمبر ۳۱ کی تفسیر میں کبیرہ اور صغیرہ پر جو مفصل محقق مدقق کلام کیا ہے وہ بھی اسی تعریف کے قریب قریب ہے۔

ہفتم:
ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی رجال وافراد کے احوال کے پیش نظر گناہ کی حالت کبیرہ یا صغیرہ کی ہوجاتی ہے ایک گناہ ایک فرد کے لئے کبیرہ ہے تو دوسرے کے لئے صغیرہ ہے مثلاً غیر عالم کے لئے ایک گناہ صغیرہ سمجھا جاتا ہے مگر وہی

گناہ عالم کے لئے کبیرہ تصور کیا جاتا ہے، ایک گناہ مقبول بندہ بارگاہ الٰہی کے لئے کبیرہ شمار کیا جاتا ہے، مگر غیر مقبول بندہ کے لئے وہی گناہ صغیرہ سمجھا جاتا ہے اسی لئے کہا گیا ہے "حسنات الابرار سیئات المقربین" اور کہا گیا ہے:[۱]

لَا يَحْقِرُ الرَّجُلُ الْكَبِيْرُ دَقِيْقَةً فِي السَّهْوِ فِيْهَا لِلْوَضِيْعِ مَعَاذِرُ

فَكَبَائِرُ الرَّجُلِ الصَّغِيْرِ صَغَائِرُ وَصَغَائِرُ الرَّجُلِ الْكَبِيْرِ كَبَائِرُ

ترجمہ: بڑا آدمی کسی چھوٹے گناہ کو حقیر نہ سمجھے کیونکہ ان کی بھول کو بھی کمتر آدمی اپنے لئے عذر اور جواز بنادے گا۔ پس چھوٹے آدمی کے کبائر بھی صغائر سمجھے جاتے ہیں مگر مقتدا اور بڑے آدمی کے صغائر کو بھی کبائر سمجھا جاتا ہے۔

ہشتم:

بعض نے کہا ہے کہ حالات اور مکان کے اعتبار سے گناہ میں فرق آجاتا ہے، مثلاً بیت اللہ کے اندر اور زمین حرم میں دل کا وسوسہ بھی بڑا گناہ ہے، مگر حرم سے باہر کچھ نہیں یا ایک گناہ مسجد کے اندر کیا گیا تو وہ کبیرہ ہے لیکن وہی گناہ مسجد سے باہر صغیرہ بن جاتا ہے۔

اس کے بعد یہ بات سمجھ لیں کہ کبائر کی تعداد جو احادیث میں وارد ہے یہ کوئی حتمی نہیں ہے بلکہ لوگوں کے احوال کے مطابق کبھی کم اور کبھی زیادہ کو بیان کی گئی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ عدد ستر تک جا پہنچتا ہے، مظاہر حق والے نے کبائر کی تعداد ۸۴ لکھی ہے اور مظاہر حق نے سب کو ذکر بھی کیا ہے بعض احادیث میں سات کا ذکر آتا ہے۔

وعلامات النفاق: یہ تخصیص بعد تعمیم ہے کیونکہ کبائر میں علامات نفاق بھی داخل ہیں نفاق: **اظہار خلاف ما ابطن** کا نام ہے تفصیل آرہی ہے۔[۲]

الفصل الاوّل

سب سے بڑے گناہ

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الذَّنْبِ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ قَالَ اَنْ تَدْعُوَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ قَالَ ثُمَّ اَيٌّ قَالَ اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ اَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ قَالَ ثُمَّ اَيٌّ قَالَ اَنْ تُزَانِيَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَصْدِيْقَهَا وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ الْاٰيَةَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۳]

---

[۱] المرقات ۱/۱۱۷ [۲] المرقات ۱/۱۱۷ [۳] اخرجه البخاری ۶/۲۲ ومسلم ۱/۵۰

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سوال کیا۔ یارسول اللہ! اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہ جس اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے تم کسی کو اس کا شریک ٹھہراؤ پھر اس شخص نے پوچھا اس کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس خیال سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔ پھر اس نے پوچھا اس کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا! یہ کہ تم اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرو۔ (حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) سرکار ﷺ کے اسی ارشاد کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی (جس کا ترجمہ یہ ہے) وہی بندگان خاص ہیں جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہیں ٹھہراتے اور جس جاندار کو قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں (اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ گناہ کے وبال میں پڑ جائے گا)۔

(بخاری و مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ)

توضیح: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوعبدالرحمان ہے، قدیم الاسلام ہیں، بعض نے کہا چھٹے مسلمان ہیں جو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ لگے رہے، یہاں تک کہ لوگ ان کو گھر کا آدمی سمجھنے لگے، وضوء جائے نماز مسواک کی خدمت آپ کے ذمہ تھی، حضور ﷺ کے راز دان بھی تھے، حبشہ کی ہجرت کی، پھر بدر میں شریک ہوئے اور بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے، حضور ﷺ نے ان کے جنتی ہونے کی شہادت دی، آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

"رضیت لامتی مارضی لها ابن ام عبد وسخطت لها ماسخط لها ابن ام عبد"۔

آپ رضی اللہ عنہ چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے اور سیرت میں آنحضرت ﷺ کے مشابہ تھے، کوفہ کے قاضی اور معلم مقرر ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ سے فرمایا کہ میں نے اپنے آپ پر تمہیں ترجیح دے دی کہ ابن مسعود تمہیں دے دیا، پھر فرمایا: "کُنَیْفٌ مُلِئَ عِلْمًا" یعنی علم کا بھرا ہوا کمرہ ہے علم کا کھٹلہ ہے، ۳۲ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے آپ کی عمر ساٹھ سال سے کچھ زیادہ تھی۔

ای ذنب اکبر: "الذنب ما یذم به الاٰتی" ذنب کی چار قسمیں ہیں:

❶ ایک قسم وہ ہے جو کہ بغیر توبہ وایمان معاف نہ ہو وہ کفر ہے۔

❷ دوسری قسم وہ ہے جس کی مغفرت کی امید استغفار اور حسنات کے ذریعہ سے کی جاتی ہے وہ صغائر ہیں۔

❸ اور تیسری قسم وہ ہیں جو اللہ کی مشیت کے تحت ہو جو توبہ اور بغیر توبہ دونوں صورتوں میں معاف ہو سکتے ہیں وہ حقوق اللہ ہیں۔

❹ اور چوتھی قسم وہ گناہ ہیں جو بدلہ دینے یا معاف کرانے کے بغیر معاف نہیں ہوتے ہیں وہ حقوق العباد ہیں۔[1]

ندًا: "ای مثلًا ونظیرا فی الدعاء والعبادة" کفر کی اقسام میں شرک کو خاص کر بیان فرمایا، اس لئے کہ "ان الشرك لظلم عظیم" میں شرک کو عظیم ظلم کہا گیا ہے۔[2]

---

[1] المرقات ۱/۲۱۸ [2] المرقات ۱/۲۱۸

وھو خلقك: میں شرک کی مزید شناعت وقباحت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ تم نہ تھے اس نے وجود بخشا جب بولنے لگے تو شرک کیا، یہ جملہ حالیہ ہے۔[1]

ثم ای: یہاں ای کا لفظ استفہام کے لئے ہے ای "**ای الشیء اکبر من الذنب بعد الکفر**"۔ یہاں یہ ثم تراخی زمانہ یا تراخی رتبہ کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ یہ تراخی فی الاخبار کے لئے ہے۔[2]

تقتل ولدك: شرک کے بعد نفس مسلم کا قتل سب سے بڑا گناہ ہے، پھر چھوٹے معصوم کو قتل کرنا دوسرا گناہ ہے پھر قتل بھی بدترین انداز سے کہ زندہ درگور کر دیا یہ تیسرا اجرم ہے۔ پھر خوف رزق سے قتل کرنا کہ میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کیوں کھائے؟ اور اللہ تعالیٰ کو رازق نہ سمجھنا یہ چوتھا جرم ہے، صلہ رحمی کو نظر انداز کر کے قتل کرنا یہ پانچواں گناہ ہے، اس لئے اس کو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا۔

زمانہ جاہلیت میں دو قسم کے عرب اولاد کو قتل کیا کرتے تھے، ایک تو وہ لوگ تھے جو فی الحال غریب ومفلس تھے ان کو اولاد کے پالنے کھلانے کا غم تھا قرآن کریم نے عجیب بلاغت سے ان کو سمجھایا: "**ولا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاھم**"۔ اولاد کے کھلانے کو مؤخر کیا کیونکہ ان لوگوں کو فی الحال اپنے کھانے کی پریشانی تھی پہلے اسی وہم کو قرآن نے دور کر دیا، دوسرے وہ لوگ اولاد کو مارتے تھے جو فی الحال تو مالدار تھے مگر آئندہ فقیر بننے کا خوف تھا ان کے لئے فرمایا۔ "**ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق۔ نحن نرزقھم وایاکم**" یہاں اولاد کے کھلانے کو مقدم کیا کہ تم کو ان کا زیادہ خوف ہے تو ہم ان کو بھی دیں گے اور تم کو بھی فی الحال دے رہے ہیں، یہ قرآن عظیم کی عظیم بلاغت اور عجیب اسلوب بیان ہے۔[3]

ان یطعم معك: یہ کوئی قید احترازی نہیں ہے بلکہ یا تو یہ قید اتفاقی ہے کہ وہ لوگ اسی کی وجہ سے اولاد کو مارتے تھے۔ یا یہ مزید شناعت وقباحت ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ تیرے پیالہ میں تیرے گوشۂ جگر نے ہاتھ ڈال کر ایک لقمہ اٹھایا اس پر اس کو قتل کر دیا، شرم کرو ڈوب مرو۔[4]

وان تزانی حلیلة جارك: **تزانی اور تزنی** دو لغت ہیں زنا کے معنی میں ہیں حلیلہ بیوی کو کہتے ہیں تزانی میں بھی مفاعلہ کا معنی پڑا ہے اور زنا طرفین ہی سے ہوتا ہے اور حلیلہ یا حلال سے ہے یا حلول سے ہے اور بیوی شوہر کے لئے حلال بھی ہوتی ہے اور اس میں حلول بھی ہوتا ہے۔

اس گناہ کو اکبر الکبائر میں سے اس لئے شمار کیا ہے کہ ایک تو اس میں زنا ہے دوسرا اس جگہ میں ہے جو اسی کی پناہ و پڑوس میں ہے تو اس میں ایک تو ابطال حق جوار آ گیا، دوسرا اس میں خیانت آ گئی، تیسرا اس سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے کیونکہ پڑوسی اگر خائن اور چور بن جائے تو اس سے بچاؤ بہت مشکل ہے، پھر ہر آدمی اپنے گھر کا چوکیدار بن جائے گا اور کسی کام کے لئے باہر نہیں جا سکے گا۔[5]

---

[1] المرقات ۱/۲۱۸ [2] المرقات ۱/۲۱۸ [3] المرقات ۱/۲۱۹ [4] المرقات ۱/۲۱۹ [5] المرقات ۱/۲۱۹

اب سوال یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ہاں کبائر کی تعداد (۷۰) ستر ہے، سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس کی تعداد سات سو ہے، ابو طالب مکی کے ہاں سترہ ہے، مذکورہ حدیث میں تین کا ذکر ہے، بعض میں چار کا ذکر آیا ہے اور کسی روایت میں سات کا ذکر آیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟[1]

اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطب کی احتیاج کے تحت کبائر کا ذکر فرمایا ہے، احصاء اور پوری گنتی مقصود نہ تھی، نہ تحدید کا آپ نے ارادہ کیا ہے، نیز عدد میں تعارض نہیں ہوتا، یہاں ہر گناہ کے ساتھ جو قید لگی ہوئی ہے یہ مزید تقبیح اور تشنیع وشناعت کے لئے ہے جیسا کہ اس کی تشریح ہوگئی ہے۔

۲۸ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ

چار بڑے گناہ

﴿۲﴾ وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْكَبَائِرُ اَلْاِشْرَاكُ بِاللهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِيْنُ الْغَمُوْسُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِيْ رِوَايَةِ أَنَسٍ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ بَدَلَ الْيَمِيْنِ الْغَمُوْسِ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا۔ ماں باپ کی نافرمانی کرنا، ناحق کسی کو مار ڈالنا اور جھوٹی قسم کھانا بڑے گناہ ہیں (بخاری علیہ السلام) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں جھوٹی قسم کھانا، کے بجائے ''جھوٹی گواہی دینا'' کے الفاظ ہیں۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: الاشراك بالله: یہاں شرک سے مراد مطلقاً کفر ہے لیکن شرک کا لفظ اس لئے اختیار کیا گیا کہ عرب لوگ کفر کے درجۂ شرک اور شعبۂ شرک میں مبتلا تھے۔ مشرک اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہوتا ہے اللہ کی قدرتوں کا بھی انکار نہیں کرتا ہے مگر وہ ذات یا صفات یا عبادات میں دوسروں کو حصہ دار بناتا ہے۔ اور کافر یا تو اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتا ہے یا ضروریات دین میں سے کسی اہم ضرورت کا انکار کرتا ہے، شرک اور کفر اور مشرک وکافر میں یہی فرق ہے۔

شرک کی دو قسمیں ہیں: شرک اکبر جو اوپر بیان ہوا، دوسرا شرک اصغر: ریاکاری دکھاوے اور تصنع وسمع فی العبادۃ کا نام ہے جو مخلوق کو دکھانے کے لئے کی جائے۔[3]

وعقوق الوالدین: "**العق هو الشق والعاق يقطع حقوق ابويه**" ایذاء رسانی کا ہر قول وعمل عقوق والدین میں داخل ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے، ہاں والدین کے خلاف شرع حکم کا ماننا جائز نہیں ہے کیونکہ "**لاطاعة لمخلوق فى معصية الخالق**" والدین سے مراد مؤمن والدین ہیں اور پھر اس میں اجداد وجدات سب داخل ہیں۔

عقوق والدین کو اشراک باللہ کے ساتھ جوڑ دیا جس سے اشارہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے وجود کا حقیقی خالق ومالک ہے،

---

[1] المرقات ۱/۲۱۹ [2] اخرجہ البخاری: ۸/۱۷۱ ومسلم ۱/۵۱ [3] المرقات ۱/۲۲۰

اس کے بعد مجازی طور پر والدین اپنے بیٹے کے وجود کے لئے ظاہری سبب ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق کو جوڑ کر ذکر فرمایا: "**وقضی ربك ان لا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانًا**" [1]

والیمین الغموس: غموس غمس سے غوطہ کھانے کے معنی میں ہے چونکہ یمین غموس کے لئے کوئی کفارہ نہیں ہوتا تو بس دوزخ کی آگ میں غوطہ ہی کھائے گا، یہی اس کی سزا ہے یمین غموس اس قسم کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص زمانہ ماضی کے کسی فعل یا واقعہ پر دانستہ طور پر جھوٹی قسم کھائے، یہ قسم اس لئے کبیرہ گناہ ہے کہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ کا نام بطور ضمانت استعمال کیا اور اس میں جھوٹ کہہ دیا۔ [2]

ایک یمین منعقدہ ہے جس میں کفارہ دینا پڑتا ہے، وہ اس کو کہتے ہیں کہ ایک شخص مستقبل میں کسی فعل کے کرنے نہ کرنے کی قسم کھاتا ہے اور پھر اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تیسری قسم یمین لغو ہے وہ زبان پر چڑھے ہوئے ان کلمات کا نام ہے جن سے قسم کا ارادہ نہیں کیا جاتا ہے بس تکیہ کلام ہوتا ہے جیسے عربی میں **لا واللہ** وغیرہ کلمات ہوتے ہیں، اردو میں کہتے ہیں: "قسم سے کہہ رہا ہوں" "قسم ہے خدا کی" وغیرہ وغیرہ، ان کلمات کا ارتکاب بھی مناسب نہیں ہے تاہم اس قسم میں باقاعدہ گرفت نہیں ہے۔

قسم کھانے کی اسلام میں اجازت ہے لیکن اس کی حفاظت کا بھی اسلام حکم دیتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی توہین نہ ہو، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے زندگی میں کبھی نہ سچی قسم کھائی ہے نہ جھوٹی۔ باب الایمان میں تمام قسموں کی تفصیل مذکور ہے۔

وشهادة الزور: جھوٹی شہادت یہ ہے کہ جس سے کسی کا حق باطل کیا جائے یا مال دبا دیا جائے یہ بھی کبائر میں سے ایک کبیرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاضر جان کر جھوٹ بولتا ہے اور وہ بھی ناحق مال دبانے کے لئے۔ [3]

سات مہلکات سے بچو

﴿۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا هُنَّ قَالَ اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَكْلُ الرِّبَا وَاَكْلُ مَالِ الْیَتِیْمِ وَالتَّوَلِّیْ یَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ۔

(مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ) [4]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (لوگو!) سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، پوچھا گیا یارسول اللہ! وہ سات ہلاک کرنے والی چیزیں کون سی ہیں؟ فرمایا! ① کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا ② جادو کرنا

[1] المرقات ۱/۲۲۰ [2] المرقات ۱/۲۲۰ [3] المرقات ۱/۲۲۰ [4] اخرجه البخاری ۴/۱۲ ومسلم ۱/۵۱

③اس جان کو مار ڈالنا جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا④سود کھانا⑤یتیم کا مال کھانا۔⑥جہاد کے میدان میں دشمن کو پیٹھ دکھانا⑦پاکدامن، ایمان والی اور بے خبر عورتوں کو زنا کی تہمت لگانا۔ (بخاری ومسلم)

شرک کی تعریف:

توضیح: قال الشرك بالله: شرک ایک گھناؤنا جرم ہے جو عقل ودانش کے حوالہ سے فطرت انسانی پر ایک بدنما داغ ہے اور جناب باری تعالیٰ کی ذات وصفات کی عظمت میں بڑی کوتاہی اور بڑا ظلم ہے، جس میں غیر شعوری طور پر ایک شخص گویا یہ تصور قائم کرتا ہے کہ میرا فلاں کام فلاں بزرگ کرے گا، اس کے کرنے میں نہ دیر ہے نہ اندھیر ہے اور اللہ تعالیٰ یہ کام یا نہیں کرتا ہے یا نہیں کرسکتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں عظیم تنقیص وتوہین اور ظلم عظیم ہے کیونکہ جس پروردگار کے ہاتھ میں ذرہ ذرہ کا تصرف اور اختیار کلی اور قدرت کاملہ موجود ہے اس کو غیر شعوری طور پر کمزور بلکہ مفلوج جان کر مشرک اوروں کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے، مشرک یہ عقیدہ رکھے یا نہ رکھے لیکن اس کے فعل اور طرز عمل کا نتیجہ یہی ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جس گناہ پر ناراض ہوتا ہے وہ شرک کا گناہ ہے فرمایا: "**ان الشرك لظلم عظيم**"۔[1]

اور "**ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء**"۔[2]

اور فرمایا: "**ومن يشرك بالله فكأنما خر من السماء**"۔[3]

خلاصہ یہ کہ شرک انسانی فطرت سے سعادت کا تخم اور استعداد جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور انسان کی روحانی ترقی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے شرک سے ایک انسان اپنے خالق پر سب سے بڑا افتراء باندھتا ہے اور اپنی تخلیق اور فطری استعداد کے خلاف بغاوت کرتا ہے اس لئے حدیث پاک میں اس کو بڑے بڑے مہلکات میں سرفہرست رکھا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ شرک کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ شریعت کی اصطلاح میں شرک اسے کہتے ہیں کہ جو صفات خاص اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور میں ثابت کرنا شرک ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو بھی عالم الغیب کہا جائے یا کسی دوسرے کو بھی کائنات میں متصرف اور قادر مانے، یا مصائب اور مشکلات کے وقت غائبانہ طور پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پیر وفقیر کو مدد کے لئے پکارے یا عبادات مالیہ اور عبادات قولیہ اور عبادات بدنیہ میں سے کسی عبادت کو غیر اللہ کے لئے کرے یہ سب شرک کی صورتیں ہیں۔ جس کو آج کل کے مشرک لوگ کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں:

بندہ قادر کا بھی قادر بھی ہے عبدالقادر　　سرّ باطن بھی ہے ظاہر بھی ہے عبدالقادر
ذی تصرف بھی ہے ماذون بھی ہے مختار بھی ہے　　کارِ عالم کا مدبر بھی ہے عبدالقادر

ایک موحد کو شرک سے بیزاری کے لئے سلطان باھو کے یہ اشعار یاد رکھنے چاہئیں:

---

[1] سورۃ لقمٰن الایہ ۱۳　[2] سورت النساء الایہ ۴۸　[3] سوۃ الحج الایہ ۳۱

یقین دانم دریں عالم کہ لامعبود الا ھو ولا مقصود فی الکونین ولا موجود الا ھو

چوں تیغ لا بدست آری بیا تنہا چہ غم داری مجواز غیر حق یاری لا فتاح الا ھو

جادو کی تعریف واقسام:

والسحر ① "کل ما لطف مأخذہ ودق فھو سحر" ② "اخراج الباطل فی صورۃ الحق". ③ "ما یفعل الانسان من الحیل"

سحر وجادو کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ چند خوارق عادت چیزوں کا ذکر ہو جائے چنانچہ خوارق عادت چیزیں کل سات ہیں:

❶ اول **"ارھاصات"** ہیں: یہ ایسے خارق عادت افعال ہوتے ہیں جو کسی نبی کی نبوت سے پہلے بطور تمہید اور نبی کی آمد سے پہلے آمد آمد کے اعلان کے لئے پیش آتے ہیں جیسے نبوت سے پہلے پتھروں اور درختوں کا حضور اکرم ﷺ کو سلام کرنا بادل کا سایہ کرنا پیدائش کے وقت عالم انسان پر انقلابی واقعات کا پیش آنا سب **"ارھاصات"** پر تھے۔

❷ دوم **"معجزات"** ہیں: یہ ایسے خارق عادت امور ہیں جو کسی نبی کی دعوت نبوت کے اثبات اور اس کی تصدیق کے لئے اور مخالفین کو عاجز کرنے کے لئے مدعی نبوت کے ہاتھ پر ظاہر ہو جاتے ہیں جیسے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر قمر اور چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا اور انگلیوں سے پانی کے چشمے پھوٹنا وغیرہ وغیرہ سارے معجزات ہیں۔

❸ سوم **"کرامات"** ہیں: یہ ایسے خارق عادت امور ہیں جو متبع سنت اور صاحب ایمان شخص کے ہاتھ پر اس کے اعزاز واکرام کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں، پیغمبر کو اپنے معجزہ کا علم بھی ہوتا ہے اور قصد بھی ہوتا ہے مگر ولی کے لئے یہ ضروری نہیں۔

❹ چہارم **"معونات"** ہیں: یہ ایسے خارق عادت امور ہیں جو کسی مسلمان کی مدد واعانت کے لئے ظاہر ہوں جیسے حالت مجبوری ومخمصہ میں کسی کے سامنے کھانا آنا یا پانی پر چلنا یا ہوا میں اڑنا وغیرہ وغیرہ سب اعانت ومدد کی صورتیں ہیں۔

❺ پنجم **"استدراج"** ہے: یہ ایسے خارق عادت امور کو کہتے ہیں جو کسی کافر کے ہاتھ یا فاسق فاجر کے ہاتھوں اس کے مقصود کے مطابق ظاہر ہو جائیں جیسے دجال کے احوال میں عجیب تصرفات کا ذکر ہے۔ یا اسود عنسی جھوٹے مدعی نبوت کے ہاتھوں سے عجائب کا ظاہر ہونا یہ سب استدراج ہے۔

❻ **ششم "اھانت"** ہے: یہ ایسے خارق عادت امور ہیں جو کسی کافر کے ہاتھوں ظاہر ہوں لیکن اس کے مطلوب ومقصود کے خلاف ظاہر ہوں جیسے مسیلمہ کذاب نے کسی کانے یک چشم کی آنکھ پر ہاتھ پھیرا تا کہ یہ آنکھ درست ہو جائے تو اس شخص کی صحیح آنکھ بھی اندھی ہو گئی یا باغ میں وضو کا بچا ہوا پانی پھینکا تا کہ برکت آجائے تو باغ کے سارے درخت سوکھ گئے۔ یا کلی کر کے کنوئیں میں پانی پھینکا تو جو کچھ کنوئیں میں تھا وہ بھی خشک ہو گیا یا ایک بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے دماغ نے کام چھوڑ دیا وغیرہ وغیرہ۔

۷ ہفتم ''سحر اور جادو'' ہے: مگر اس کی حقیقت میں اختلاف ہے معتزلہ کے ہاں سحر کی کوئی حیثیت نہیں ہے یہ صرف وہم اور خیال وتصور ہے اور اس کے اثرات بھی اسی وہم کا ایک حصہ ہے، مگر جمہور اہل سنت کے ہاں سحر ایک نفس الامری حقیقت کا نام ہے جس کے ذریعہ سے انسان پر مخصوص کیفیات واثرات طاری کئے جاسکتے ہیں۔

سحر وساحر کا حکم:

سحر وساحر کے حکم میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ واحمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مطلقاً ساحر کافر ہے واجب القتل ہے اور جادو کا سیکھنا سکھانا بھی کفر ہے، حرام ہے۔

میرے استاذ حضرت مولانا فضل محمد سواتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع میں ایک جامع کلام ارشاد فرمایا تھا، کہ جو سحر ضروریات دین کے انکار پر مبنی ہو وہ کفر ہے کسی کا اس میں اختلاف نہیں اور جس میں کلمات شرکیہ ہوں وہ شرک ہے اور اگر سحر منافی اعمال صالحہ ہو تو گناہ کبیرہ ہے۔اور اگر کوئی غلط عمل اس میں نہ ہو بلکہ اصلاح اور غرض صحیح کے لئے ہو مثلاً اصلاح بین الزوجین وغیرہ وغیرہ کے لئے ہو تو یہ جادو مباح ہے (گویا یہ جادو مسلمان ہوگیا مگر دنیا میں ایسا صالح جادو کہاں ہے؟)

التولی یوم الزحف: یعنی میدان جہاد سے بھاگنا یہ کبیرہ گناہ ہے، اول عزیمت ہے کہ مجاہد میدان سے بالکل نہ بھاگے کیونکہ اس موت میں زندگی پڑی ہوئی ہے جب یہ عقیدہ ہو کہ موت میں حیات ہے تو کون بھاگے گا؟[1]

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے ۔۔۔ شہید کا جو خون ہے وہ خون کی زکوٰۃ ہے

دوم رخصت ہے کہ دو سے زیادہ کافروں سے بوقت مقابلہ بھاگنا جائز ہے دو سے کم سے بھاگنا یا دو سے بھاگنا کبیرہ ہے۔

وقذف المحصنات: قذف گول پتھر اٹھا کر کسی کے سر پر دے مارنا یہ قذف ہے پھر عفیفہ پاک دامن عورت پر تہمت باندھنے کے لئے استعمال ہونے لگا، یعنی پاک دامن، مسلمان اور آزاد شریف عورت پر تہمت لگانا کبیرہ میں سے ہے اگر عورت کافرہ ہے تو اس پر تہمت لگانا کبیرہ نہیں بلکہ صغیرہ ہے یہ کل سات مہلکات اور تباہ کن گناہ ہیں جن سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔[2]

وہ بدترین گناہ جن کے ارتکاب سے ایمان جاتا ہے

﴿۴﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا يَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَنْتَهِبُ نُهْبَةً يَرْفَعُ النَّاسُ إِلَيْهِ فِيْهَا أَبْصَارَهُمْ حِيْنَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَغُلُّ أَحَدُكُمْ حِيْنَ يَغُلُّ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَإِيَّاكُمْ إِيَّاكُمْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَلَا يَقْتُلُ حِيْنَ يَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ قَالَ عِكْرَمَةُ قُلْتُ

---

[1] المرقات ۱/۲۲۳ [2] المرقات ۱/۲۲۳

لِابْنِ عَبَّاسٍ كَيْفَ يُنْزَعُ الْإِيمَانُ مِنْهُ قَالَ هٰكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ ثُمَّ أَخْرَجَهَا فَإِنْ تَابَ عَادَ إِلَيْهِ هٰكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ وَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ لَا يَكُونُ هٰذَا مُؤْمِنًا تَامًّا وَلَا يَكُونُ لَهُ نُورُ الْإِيمَانِ۔ (هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! زنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا۔ شراب پینے والا جب شراب پیتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا اور چھینا جھپٹی کرنے والا جبکہ لوگ اس کو (کھلم کھلا) چھینا جھپٹی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں (لیکن خوف و دہشت کے مارے بے بس ہو جاتے ہیں اور چیخ و پکار کے علاوہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے) تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا پس تم (ان گناہوں سے بچو)۔ (بخاری و مسلم)

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ قتل کرنے والا جب ناحق قتل کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا۔

عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے (یہ حدیث سن کر) پوچھا کہ اس سے ایمان علیحدہ کس طرح کر لیا جاتا ہے تو انہوں نے کہا اس طرح (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کیں اور پھر ان انگلیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا اس کے بعد انہوں نے فرمایا اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو ایمان اس طرح واپس آ جاتا ہے۔ اور (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنی انگلیوں کو پھر ایک دوسرے میں داخل کر لیا نیز ابو عبداللہ (یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص (ارتکاب معصیت کے وقت) مؤمن کامل نہیں رہتا اور اس سے ایمان کا نور نکل جاتا ہے۔

(بخاری)

توضیح: لایزنی الزانی الخ: یہ مسئلہ پہلے کتاب الایمان میں گزر چکا ہے کہ معتزلہ و خوارج کے ہاں مرتکب کبیرہ خارج عن الاسلام مخلد فی النار ہے پھر معتزلہ کے ہاں داخل فی الکفر نہیں ہے کیونکہ ان کے ہاں منزلۃ بین المنزلتین، ہے کہ نہ مسلمان ہے کیونکہ اسلام سے نکل گیا ہے نہ کافر ہے کیونکہ اس میں داخل نہیں ہے ان کے ہاں دوزخ میں بھی اسی طرح منزلۃ بین المنزلتین، کا مقام ہوگا۔ خوارج نے تو داخل فی الکفر بھی مان لیا، اہل سنت والجماعۃ کے نزدیک مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، یہ حدیث معتزلہ اور خوارج کی دلیل ہے اور بظاہر یہ حدیث دیگر نصوص قرآنیہ اور فرامین نبویہ سے متعارض ہے مثلاً:[2]

❶ "ان الله لايغفر ان يشرك به ويغفر مادون ذلك لمن يشاء" اگر شرک کے علاوہ کبائر کفر ہوتے تو ان کی مغفرت کی گنجائش کہاں ہوتی۔ معلوم ہوا مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج نہیں ہے۔

❷ "وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فاصلحوا بينهما" یہاں آپس میں لڑنے والوں کو مؤمن کے نام سے یاد کیا ہے۔ حالانکہ لڑنا کبیرہ گناہ ہے۔[3]

[1] اخرجه البخاری ۱/۴۳، ۸/۲۰۴ ومسلم ۱/۴۳ [2] المرقات ۱/۲۲۳ [3] المرقات ۱/۲۲۴

③ حدود اللہ اور قصاص کی جتنی آیتیں ہیں ان میں مرتکب کبیرہ کے لئے ایک سزا مقرر ہے اگر وہ خارج اسلام ہوتا تو مرتد کی سزا اس پر نافذ ہوتی معلوم ہوا مرتکب کبیرہ خارج اسلام نہیں۔

④ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ کی حدیث "**وان زنی وان سرق**" جیسی احادیث سے بھی جمہور نے استدلال کیا ہے تو یہ جمہور کے مستدلات بھی ہیں اور زیر بحث حدیث سے معارض بھی ہیں اس لئے اس حدیث کی توجیہ اور تاویل اور اس کو صحیح محمل پر حمل کرنا ضروری ہے تاکہ تمام نصوص میں توافق اور تطابق آجائے دو مطلب تو خود حدیث میں مذکور ہیں دیگر یہ ہیں۔

① توجیہ اول یہ کہ یہاں زانی کے ایمان کی جو نفی آئی ہے یہ کمال ایمان کی نفی ہے اصل ایمان کی نفی نہیں ہے۔[1]

② علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کلام لفظوں میں خبر ہے مگر معنوی طور پر انشاء ہے یعنی زانی اگر مؤمن ہے تو وہ زنا نہ کرے اس توجیہ کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں "**لایزن**" جزم اور **لا** نہی کے ساتھ ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ بھی یہی توجیہ کرتے ہیں مگر اس پر یہ اعتراض ہے کہ حین ظرف اس توجیہ کا انکار کرتا ہے کیونکہ زنا کی نہی **مطلقًا** ہے **حین یزنی** کے ساتھ مقید کرنے کا کیا فائدہ؟

③ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے یہ توجیہ کی ہے کہ یہاں ایمان کے ایک اہم شعبہ حیاء کی نفی ہے کہ جو یہ قبیح فعل کرتا ہے وہ مومن نہیں یعنی باحیاء نہیں رہتا ہے ایمان کا اہم شعبہ حیاء اس سے چلا جاتا ہے۔[2]

④ توجیہ چہارم یہ کہ یہاں نور ایمانی کی نفی مراد ہے امام نووی رحمہ اللہ نے بھی یہی توجیہ کی ہے کہ نور ایمانی باقی نہیں رہتا۔

⑤ توجیہ پنجم یہ کہ اس سے ایمان شہودی کی نفی مراد ہے کہ اگر یہ شخص اللہ کو حاضر ناظر مانتا تو اس حضوری کی حالت میں کبھی یہ حرکت نہ کرتا۔ جبکہ چھوٹے بچے کی موجودگی میں ایسی حرکت نہیں کرسکتا ہے۔

⑥ توجیہ ششم یہ کہ یہ حکم زجر و توبیخ اور تغلیظ و تشدید پر محمول ہے کہ اس قبیح حرکت کا مرتکب مؤمن نہیں رہا بلکہ فاسق فاجر بن گیا۔[3]

ینتهب: انتہاب کسی کا مال زبردستی چھیننا "نهبة" لوٹے ہوئے مال کو کہتے ہیں۔ **یرفع الناس الیها ابصارهم:** یعنی اس کی جرأت پر تعجب کریں گے اس کے ظلم سے ڈرتے ہوئے صرف اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گے اور کچھ کر نہیں سکیں گے۔ کیونکہ ڈاکہ ڈالنے والے سے ڈرتے ہیں۔[4]

ولا یغل: غلول مال غنیمت میں خیانت کو کہتے ہیں پھر مطلق خیانت پر اسکا اطلاق ہوا ہے اور بدعہدی پر بولا جانے لگا ہے:[5]

---

[1] المرقات [2] الکاشف ۱/۲۰۱ [3] المرقات ۱/۲۲۳ [4] المرقات ۱/۲۲۴ [5] المرقات ۱/۲۲۴

فایاکم ایاکم: تاکید کے لئے ہے یا تحذیر ہے کہ بچو بچاؤ ''بچو بچاؤ''، اس حدیث میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا ذکر آ گیا ہے یعنی حالت ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ شخص ان حقوق میں حدود اللہ سے ذرہ برابر تجاوز نہ کرے۔[1]

۲۹ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ

منافق کی علامتیں

﴿۵﴾ وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ زَادَ مُسْلِمٌ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهُ مُسْلِمٌ ثُمَّ اتَّفَقَا اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اُؤْتُمِنَ خَانَ۔[2]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا! منافق کی تین علامتیں ہیں۔ اس کے بعد مسلم نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ کیا ''اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے'' اس کے بعد بخاری و مسلم دونوں متفق ہیں۔ (وہ تین علامتیں یہ ہیں) جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

توضیح: آية المنافق ثلاث: آیۃ کی جمع آیات ہے، علامت اور نشانی کے معنی میں ہے، یہ علامت یا حسی ہوگی یا معنوی ہوگی یعنی محسوسات اور معقولات دونوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے، حسی اور محسوسات کی مثال جیسے **آية الطريق،** ''سنگ میل'' اور معنوی و معقولات کی مثال جیسے **آية الله** وہ شخص جو دین کی حفاظت کی نشانی ہو یا جیسے معجزہ کو **آية الله** اور اللہ کے اور کسی حکم کو آیۃ اللہ کہا جاتا ہے، یہ سب معقولات کی مثالیں ہیں۔

نفاق کی تعریف یہ ہے کہ ''**اظهار خلاف ما ابطن**'' یعنی زبان پر کچھ ہے اور دل میں کچھ اور ہے یہ دوغلی پالیسی ہے اسی کو نفاق کہتے ہیں۔ یہاں ایک فنی اشکال ہے کہ ''**اٰية**'' مفرد ہے اور یہ مبتدأ ہے اور ''**ثلاث**'' خبر ہے جو جمع ہے، تو مبتدا اور خبر میں مطابقت نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیۃ کے ساتھ جنس کا معاملہ کیا گیا ہے تو اب مطابقت ہوگئی کیونکہ جنس قلیل و کثیر پر بولی جاتی ہے۔ دوسرا جواب یہ کہ یہاں تین علامات میں سے ہر ہر علامت الگ الگ نفاق کی علامت ہے۔ اور ایک روایت میں ''**علامات المنافق ثلاث**'' کے الفاظ آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیۃ سے مفرد کا ارادہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ جمع کا معاملہ کیا گیا ہے۔[3]

سوال: شبہ یہ ہے کہ اس حدیث میں منافق کی علامات کا تین میں حصر ہے جب کہ بعد والی روایت میں چار کا ذکر ہے تو حصر کیسے صحیح ہوگا؟

جواب: یہاں حصر مقصود نہیں ہے بلکہ ذکر کرنے کے اعتبار سے کبھی تین اور کبھی چار کا ذکر آ گیا ہے۔ دوسرا جواب یہ کہ اعداد میں ایک عدد کا دوسرے سے تعارض نہیں ہوتا ہے کیونکہ عدد اکثر عدد اقل کا منافی نہیں ہے عدد اقل اکثر کے ضمن میں ہی ہوتا ہے۔ تیسرا جواب یہ کہ وحی کے ذریعہ سے اضافہ ہوگیا۔ تو پہلے تین کا ذکر آیا پھر چار کا آ گیا۔[4]

---

[1] المرقات ۱/۲۲۴ [2] اخرجه البخاري ۱/۱۵ ومسلم ۱/۴۴ [3] المرقات ۱/۲۲۵ [4] المرقات ۱/۲۲۵

سوال: یہاں ایک مشہور اشکال ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص مسلمان ہے کلمۂ شہادت پر قائم ہے مگر اس میں یہ تین علامات بھی ہیں تو کیا وہ منافق ہو کر "فی الدرك الاسفل من النار" میں رہے گا پھر تو مسلمان ختم ہو جائیں گے یا بہت کم رہ جائیں گے؟

جواب: اس سوال کا:

❶ پہلا جواب یہ ہے کہ ان تین خصلتوں پر جب طبیعت مطبوع ہو جائے اور بیک وقت ایک ساتھ یہ تینوں ایک دل میں جمع ہو جائیں تو یہ ایمان کے منافی ہے اس پر حدیث میں لفظ "اذا" دلالت کر رہا ہے جو استمرار کے لئے ہے یعنی جب بھی بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے وغیرہ وغیرہ گویا یہ اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے تو یہ منافق ہے۔[1]

❷ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کلام میں تشبیہ ہے یعنی یہ خصلتیں اگر کسی مسلمان میں آگئیں تو منافق حقیقی کی طرح ہوگا۔

❸ تیسرا جواب یہ کہ یہ شخص پوری شریعت کے اعتبار سے تو منافق نہیں ہے ہاں جس کے ساتھ معاملہ جھوٹ کا ہوا ہے یا معاملہ بدعہدی کا ہوا ہے یا خیانت کا معاملہ ہوا ہے تو اسی کے لئے یہ منافق ہے۔

❹ جو شخص ان خصلتوں کو جائز سمجھتا ہے اور پھر اپناتا ہے تو وہ حقیقی منافق ہے۔

❺ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ اس حدیث نے میری معیشت اور زندگی برباد کر دی کیونکہ جب بھی کوئی کام کرتا ہوں تو ڈرتا ہوں کہ ان خصلتوں میں نہ پڑ جاؤں حضرت ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ ہنسے اور کہنے لگے کہ مجھے بھی یہی ہوا تو میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا وہ دونوں ہنسنے لگے اور کہا کہ ہم کو بھی یہی کچھ ہوا تو ہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور پھر فرمایا کہ تم کو ان خصلتوں سے کیا سروکار ہے میرا یہ کہنا کہ "اذا حدث کذب" تو یہ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق ہے "واللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون" اور "اذا وعد اخلف" اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق ہے "فاعقبھم نفاقا فی قلوبھم الی یوم یلقونہ بما اخلفوا اللہ ما وعدوہ وبما کانوا یکذبون"۔[2] اور میرا یہ کہنا کہ "اذا اؤتمن خان" تو یہ اس آیت کی وجہ سے ہے۔ "انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان"۔ ای خان الانسان وانتم براء منھن۔[3]

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں "المنافق" میں جو الف لام ہے وہ عہدی ہے اور یہ علامات اور نشانیاں منافقین حقیقی کی ہیں نہ منافقین عملی کی یعنی حقیقی اور اعتقادی منافق ان خصلتوں سے پہچانا جاتا ہے پھر شبہ ہوتا ہے کہ آنے والی روایت میں اسی کو منافق خالص کہا گیا ہے جس میں یہ صفات ہوں تو جواب یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حقیقی منافق کی علامات یہی تھیں اور بعد میں نفاق فی العقیدہ نہیں رہا کیونکہ اس کا معلوم کرنا مشکل ہے تو صرف نفاق عملی رہ گیا لہٰذا

[1] المرقات ۱/۲۲۷ [2] توبہ ۷۷ [3] المرقات ۱/۲۲۸

حضور ﷺ کے زمانہ میں یہ خصلتیں منافق حقیقی ہی کے لئے بیان ہوئیں **اذا حدث کذب** یہ صفت سب سے زیادہ قبیح ہے اور دیگر قبائح کے لئے اصل ہے۔ اسی لئے اس کو مقدم رکھا ہے۔

منافق بنانے والی چار باتیں

﴿۶﴾ وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا إِذَا اُؤْتُمِنَ خَانَ وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص میں چار باتیں ہوں گی وہ پورا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات پائی جائے گی (تو سمجھ لو) کہ اس میں نفاق کی ایک خصلت پیدا ہوگئی تا وقتیکہ اس کو چھوڑ نہ دے۔ (اور وہ چار باتیں یہ ہیں) ① جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ ② جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ ③ جب قول و قرار کرے تو اس کے خلاف کرے۔ ④ جب جھگڑے تو گالیاں بکے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: واذا عاهد غدر: یعنی جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے دھوکہ دیتا ہے غداری کرتا ہے وعدہ خلافی نفاق کی علامات میں سے ایک علامت ہے قرآن کریم نے وعدہ پورا کرنے کا حکم دیا ہے "**اوفوا بالعقود**" اور فرمایا "**ان العهد كان مسئولا**"، "**وكان صادق الوعد وكان رسولا نبيا**" اسی طرح احادیث میں وعدہ پورا کرنے کا حکم ہے اور وعدہ پورا نہ کرنے کو منافق کی نشانی بتایا ہے۔[2]

خلاف وعدہ کام کرنے پر جو وعید آئی ہے یہ اس وقت ہے جب کہ ایک آدمی وعدہ کرتے کرتے دل میں پکا ارادہ رکھتا ہے کہ وعدہ پورا نہیں کروں گا لیکن اگر دل میں پکا ارادہ ہے کہ وعدہ پورا کروں گا لیکن پھر کوئی عذر پیش آیا اور مجبوری آگئی تو یہ وعید اس شخص کے لئے نہیں ہے۔

منافق کی مثال

﴿۷﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ تَعِيْرُ إِلٰى هٰذِهِ مَرَّةً وَإِلٰى هٰذِهِ مَرَّةً. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[3]

ترجمہ: حضرت بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! منافق کی مثال اس بکری کی سی ہے۔ جو دو ریوڑوں کے درمیان (ماری ماری) پھرتی ہے کہ (اپنے نر کی تلاش میں) کبھی اس طرف مائل ہو جاتی ہے اور کبھی اس طرف۔ (مسلم)

[1] اخرجه البخاری: ۱/۱۵، ۳/۱۶۷ ومسلم: ۱/۴۳ [2] المرقات ۱/۲۲۹ [3] اخرجه مسلم: ۸/۱۲۴، ۱۲۵

توضیح: کالشاۃ العائرۃ: عائرہ جفتی چاہنے والی اونٹنی کو کہا جاتا ہے یہ اس کی صفت ہے پھر بکری کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے اس میں دیوثی کی طرف اشارہ ہے کہ منافق کبھی مسلمانوں اور کبھی کفار کے پاس آتا جاتا ہے تذبذب اور تردد میں پڑا ہوا ہے شہوت کا قیدی ہے رجولیت سے عاری ہے یہ شخص اس بکری کی طرح ہے جو شہوت پوری کرنے کے لئے کبھی اس ریوڑ اور کبھی اس ریوڑ میں ادھر ادھر دوڑتی پھرتی رہتی ہے یہاں تمثیل ہے یعنی تشبیہ مرکب بالمرکب ہے کہ ایک طرف منافق کا ایک پس منظر ہے اور دوسری طرف جفتی چاہنے والی بکری کا ایک پس منظر اور ہیئت ہے دونوں ہیئتوں کو ایک دوسرے سے تشبیہ دی گئی ہے جو تمثیل ہے جیسے: [1]

كأن مثار النقع فوق رؤسنا واسيافنا ليل تهاوى كواكبه

تحریک اسلام کی ابتداء:

یہاں یہ بات بھی سمجھنا چاہیئے کہ کوئی بھی تحریک ہو اس کی ابتداء میں دو قسم کے لوگ میدان میں ہوتے ہیں ایک اس تحریک کے لانے والے اور اس کو پیش کر کے پھیلانے والے اور کامیاب بنانے والے لوگ ہوتے ہیں وہ جان کی بازی لگاتے ہیں اور اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے مقابلے میں دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس نئی تحریک کو قطعاً برداشت نہیں کرتے ہیں وہ مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں مگر اس تحریک کو آگے بڑھنے نہیں دیتے ہیں یہ دونوں فریق اپنے اپنے موقف میں واضح حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں کسی لاگ لپیٹ سے کام نہیں لیتے ہیں، اس تحریک میں ایک تیسرا فریق اس وقت پیدا ہو جاتا ہے جب کچھ امید اس تحریک کی کامیابی کی پیدا ہو جاتی ہے یہ فریق خالص مفاد پرست ہوتا ہے اور ہر وقت دیکھتا رہتا ہے کہ کون لوگ غالب آتے ہیں اگر تحریک کے لانے والے کامیاب نظر آنے لگتے ہیں تو یہ مفاد پرست ٹولہ ان کے پاس جاتا ہے اور ساتھ دینے کا اعلان کرتا ہے اور اگر تحریک میں کچھ ناکامی نظر آنے لگتی ہے تو یہ ٹولہ اس تحریک کے مخالفین کے پاس دوڑ کر جاتا ہے اور وفاداری کا اعلان کرتا ہے اسی مفاد پرست ٹولہ کو منافقین کے نام سے اسلام نے یاد کیا ہے۔

جب اسلام مکہ مکرمہ میں ظاہر ہوا تو وہاں یہ ٹولہ نہیں تھا کیونکہ وہاں دونوں طرف سے قربانی کی ضرورت تھی اور یہ مفاد پرست لوگ قربانی والے نہیں تھے جب مدینہ منورہ میں اسلام پھیلنے لگا اور یہ امید پیدا ہوگئی کہ اب اسلام غالب آسکتا ہے تو مدینہ منورہ میں منافقین کا یہ ٹولہ پیدا ہو گیا اور اپنے مفادات کے تحت کبھی مسلمانوں کے پاس اور کبھی کافروں کے پاس دوڑ دوڑ کر جاتا رہا حدیث پاک میں اس طبقہ کی تشبیہ جفتی چاہنے والی بکری سے دی گئی ہے جس سے ان کی مٹی ہی پلید ہوگئی یہ طبقہ ابتداء اسلام سے لے کر آج تک مسلسل چلا آرہا ہے اور اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے عبداللہ بن ابی ابن سلول کے بعد اسلام میں ان کی پارٹی کی طرح کے منافقین شیعہ روافض آغا خانی وغیرہ ہیں۔

[1] المرقات ۲۲۹/۱، ۲۳۰

الفصل الثانی

نو واضح احکام سے متعلق یہود کا سوال

﴿۸﴾ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ قَالَ قَالَ یَهُودِیٌّ لِصَاحِبِهِ اِذْهَبْ بِنَا اِلٰی هٰذَا النَّبِیِّ فَقَالَ لَهُ صَاحِبُهُ لَا تَقُلْ نَبِیٌّ اِنَّهُ لَوْ سَمِعَكَ لَكَانَ لَهُ اَرْبَعُ اَعْیُنٍ فَاَتَیَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَسَاَلَاهُ عَنْ تِسْعِ آیَاتٍ بَیِّنَاتٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَیْئًا وَلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا تَمْشُوْا بِبَرِیْءٍ اِلٰی ذِیْ سُلْطَانٍ لِیَقْتُلَهُ وَلَا تَسْحَرُوْا وَلَا تَاْكُلُوا الرِّبَا وَلَا تَقْذِفُوْا مُحْصَنَةً وَلَا تُوَلُّوْا لِلْفِرَارِ یَوْمَ الزَّحْفِ وَعَلَیْكُمْ خَاصَّةً الْیَهُوْدَ اَنْ لَا تَعْتَدُوْا فِی السَّبْتِ قَالَ فَقَبَّلَا یَدَیْهِ وَرِجْلَیْهِ وَقَالَا نَشْهَدُ اَنَّكَ نَبِیٌّ قَالَ فَمَا یَمْنَعُكُمْ اَنْ تَتَّبِعُوْنِیْ قَالَا اِنَّ دَاوٗدَ عَلَیْهِ السَّلَامُ دَعَا رَبَّهُ اَنْ لَّا یَزَالَ مِنْ ذُرِّیَّتِهِ نَبِیٌّ وَاِنَّا نَخَافُ اَنْ تَبِعْنَاكَ اَنْ یَقْتُلَنَا الْیَهُوْدُ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْ دَاوٗدَ وَالنَّسَائِیُّ)[1]

ترجمہ: حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ایک یہودی نے اپنے ایک (یہودی) ساتھی سے کہا کہ آؤ اس نبی ﷺ کے پاس چلیں! اس کے ساتھی نے کہا! انہیں نبی نہ کہو کیونکہ اگر انہوں نے سن لیا (کہ یہودی بھی مجھے نبی کہتے ہیں) تو ان کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے) بہر حال وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ ﷺ سے "۹" واضح احکام کے بارے میں سوال کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! ① کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ ② چوری نہ کرو ③ زنا نہ کرو ④ جس جان کو مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل نہ کرو ⑤ کسی بے گناہ کو قتل کرانے کے لئے (اس پر غلط الزام عائد کر کے) حاکم کے پاس مت لے جاؤ۔ ⑥ جادو نہ کرو ⑦ سود نہ کھاؤ ⑧ پاک دامن عورت پر (زنا کی) تہمت نہ لگاؤ ⑨ میدان جنگ میں دشمن کو پیٹھ نہ دکھاؤ۔ اور اے یہودیو! تمہارے لئے خاص طور پر واجب ہے کہ یوم شنبہ کے معاملہ میں (حکم الٰہی) سے تجاوز نہ کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ (یہ سن کر) دونوں یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پیر چوم لئے اور بولے ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ واقعی نبی ہیں نبی پاک نے فرمایا! جب تمہیں میری رسالت پر یقین ہے تو میری اتباع سے تم کو کونسا امر مانع ہے؟ انہوں نے کہا! حقیقت یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ نبی ہوا کرے لہٰذا ہم ڈرتے ہیں کہ اگر آپ کی پیروی کریں تو یہودی ہمیں مار ڈالیں گے۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

توضیح: لکان له اربع اعین: چار آنکھیں کنایہ ہے شدت فرح اور خوشی کی انتہاء سے کیونکہ خوشی میں آنکھیں اتنی کھل جاتی ہیں کہ ہر آنکھ میں دو کونے بن جاتے ہیں تو دو آنکھیں بڑی ہو کر گویا چار بن جاتی ہیں اس سے یہودیوں کے

[1] اخرجه الترمذی ۷۷/۵ وابو داؤد

بغض وعناد کا اندازہ ہوتا ہے کہ نجی مجلس میں چھپ کر اقرار کرتے ہیں مگر ضد میں آکر سب بھول جاتے ہیں۔ [۱]

عن تسع اٰیات بینات: ان آیات بینات سے کیا مراد ہے اس میں علماء کی دو آراء ہیں، مگر پہلے یہ سمجھ لو کہ قرآن کریم نے دو مقامات پر تسع آیات کا ذکر کیا ہے سورۃ نمل آیت ۱۲ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اس طرح ذکر آیا ہے "**وادخل يدك في جيبك تخرج بيضاء من غير سوء في تسع آيات الى فرعون وقومه**" اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل میں آیت ۱۰۱ میں اس طرح ذکر آیا ہے "**ولقد اٰتينا موسى تسع آيات بينات**" اب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ قرآن کریم میں آیات بینات سے مراد معجزات ہیں یعنی وہ نو مشہور معجزات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملے تھے۔ جو یہ ہیں عصا، ید بیضاء، دم، طوفان، جراد، قمل، ضفادع، نقص ثمرات اور سنین یعنی قحط خشک سالی، علامہ مظہری کا خیال ہے کہ سورت نمل میں تو معجزات مراد ہیں مگر سورۃ بنی اسرائیل میں احکامات مراد ہیں۔ [۲]

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اور تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ آیات تسع سے احکامات مراد ہیں سورۃ بنی اسرائیل میں بھی اور نمل میں بھی ان کی دلیل یہ مذکورہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامات کا ذکر فرمایا ہے اب قرآنی آیات سے اس حدیث کی طرف آئیں تو یہاں بھی سائلین نے جو آیات تسع کا سوال کیا ہے تو علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ علماء کی رائے یہ ہے کہ اس سے احکامات مراد ہیں اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ حدیث میں دونوں احتمال ہیں کہ سوال احکامات سے بھی ہو اور معجزات سے بھی ہو، اب اگر سوال معجزات سے ہوا ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے معجزات بیان فرمائے ہوں گے، اس کے بعد احکامات بیان فرمائے، راوی نے معجزات کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ قرآن کریم میں موجود ومحفوظ تھے اور احکامات کا ذکر کر دیا اور اگر آیات بینات سے مراد بقول بعض علماء احکامات ہی ہیں اور ترمذی کی جلد ثانی کتاب التفسیر ص ۱۴۶ کی حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے کیونکہ وہاں یہ لفظ ہے **فسألاه عن قول الله تعالیٰ ولقد اٰتينا موسى تسع آيات بينات**۔ [۳]

معلوم ہوا سوال بھی احکامات سے تھا معجزات سے نہیں تھا تو پھر بات صاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احکامات کا جواب دیا ہے جو تمام شرائع میں مشترک تھے۔

اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر یہ سوال احکامات کا تھا تو نو احکامات کا جواب دینا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نو کے جواب میں دس احکامات کیوں بیان فرمائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت ان لوگوں نے ان نو احکامات کا سوال کیا تھا جو مشہور اور تمام ملل ومذاہب میں مشہور تھے اور ایک حکم جو یہود کے ساتھ خاص تھا اس کو دل میں چھپا رکھا تھا تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لے لیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس کا بھی جواب دیا تب انہوں نے ہاتھ پاؤں چومے اور نبوت کا اعتراف کیا اقرار کیا مگر مانے نہیں۔ [۴]

---

[۱] المرقات ۱/۲۳۰ [۲] المرقات ۱/۲۳۰، ۲۳۱ [۳] الکاشف ۱/۲۰۷، ۲۰۸ المرقات ۱/۲۳۱ [۴] المرقات ۱/۲۳۱

انك نبی: اس میں اقرار و اعتراف ہے لیکن اس میں ایک فریب بھی ہے وہ یہ کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اُمّیین کے نبی تھے یعنی صرف عرب کے لئے نبی تھے سب جہاں کے لئے نہیں تھے تو "انك نبی ای الی العرب خاصة" یہ دھوکہ تھا اسی طرح یہود نے دوسرا دھوکہ دینے کی یہ کوشش کی کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ نبی ہمیشہ انہی کی اولاد میں سے ہو، اور آپ ان میں سے نہیں ہیں اگر ہم اتباع کریں گے تو مارے جائیں گے یہ بھی انہوں نے جھوٹ بولا داؤد علیہ السلام نے کبھی ایسا نہیں کہا اور یہ بھی جھوٹ بولا کہ اتباع کریں گے تو مارے جائیں گے دین اسلام تو امن لاتا ہے امن چاہتا ہے امن پھیلاتا ہے فتنہ وفساد تو دین کے مخالفین کا شیوہ ہے بہر حال سچے نبی کے انکار کے باوجود بھی یہود قتل سے نہ بچ سکے بلکہ جنگ خیبر اور جنگ قریظہ میں مارے گئے۔ اس حدیث کو باب الکبائر والنفاق میں اس مناسبت سے ذکر کیا ہے کہ دونوں یہودیوں نے زبان سے اسلام کا اقرار کیا اور دل میں نفاق چھپائے رکھا۔[1]

۳۰ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ

تین باتیں ایمان کی جڑ ہیں

﴿۹﴾ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثَلَاثٌ مِنْ اَصْلِ الْاِيْمَانِ اَلْكَفُّ عَمَّنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ لَا تُكَفِّرْهُ بِذَنْبٍ وَلَا تُخْرِجْهُ مِنَ الْاِسْلَامِ بِعَمَلٍ وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِيَ اللهُ اِلٰى اَنْ يُقَاتِلَ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الدَّجَّالَ لَا يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ وَالْاِيْمَانُ بِالْاَقْدَارِ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ)[2]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین باتیں ایمان کی جڑ ہیں: ① جو شخص لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرے اس سے جنگ ومخاصمت ختم کردو اب کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر مت کہو اور نہ کسی عمل کی وجہ سے اس پر اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ لگاؤ ② جب سے کہ اللہ پاک نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے جہاد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ اس امت کے آخر میں ایک شخص آکر دجال سے جنگ کرے گا۔ کسی عادل (بادشاہ) کے عدل یا کسی ظالم کے ظلم کا بہانہ لے کر جہاد ختم نہیں کیا جاسکتا ③ اور تقدیر پر ایمان لانا۔ (ابوداؤد)

توضیح: ثلاث من اصل الایمان: اصل سے اصول دین مراد ہیں لیکن تین میں انحصار مقصود نہیں بلکہ یہ تین ان میں سے بعض ہیں اسی لئے من تبعیضیہ لایا گیا ہے یا فروع پر عمل کرنے کے لئے یہ تین اصول ہیں **لا تکفرہ بذنب** یہ جملہ **الکف عمن الخ** کی تفسیر وتوضیح ہے یعنی کلمہ گو مسلمان کو بوجہ گناہ اسلام سے خارج کر کے کافر مت کہو اس سے زبان روک لو اور نہ اس کو اسلام سے خارج مانو، پہلے جملہ میں خوارج پر واضح رد ہے اور جملہ ثانیہ میں معتزلہ کی واضح تردید ہے کیونکہ اول فرقہ مرتکب کبیرہ کو کافر کہتا ہے اور **داخل فی الکفر** مانتا ہے اور دوسرا فرقہ معتزلہ اس کو خارج از اسلام مانتا ہے اگرچہ وہ اس کو **داخل فی الکفر** نہیں کہتا ہے۔[3]

[1] المرقات ۱/۲۳۲ [2] اخرجہ ابو داؤد ۳/۱۸ [3] المرقات ۱/۲۳۳

سوال: یہاں شبہ یہ ہے کہ ایک شخص مثلاً ضروریات اسلام کا انکار کرتا ہے اور ساتھ ہی کلمہ گو بھی ہے تو کیا اس کی تکفیر نہیں ہوگی؟

جواب: یہ ہے کہ یہاں حدیث میں **لا تخرجه من الاسلام بعمل** میں عمل سے مراد وہ گناہ ہیں جو کفر یا امارات کفر کے علاوہ ہیں اگر کوئی شخص کفر کرتا ہے یا ضروریات دین کا انکار کرتا ہے یا امارات کفر اپناتا ہے مثلاً زنار پہنتا ہے یا مصحف شریف کی توہین کرتا ہے اسے گندگی میں پھینکتا ہے تو ایسا شخص کافر ہے اس کی تکفیر ہوگی اگر چہ سوبار کلمہ پڑھے، ہاں بے گناہ مسلمان کو کافر کہنا بہت بڑا جرم ہے۔

والجهاد ماض: یہ دوسری اصل ہے اس سے پہلے **وثانیها** محذوف نکالنا بہتر ہوگا۔ مطلب یہ کہ جہاد کا فریضہ کوئی شخص موقوف یا منسوخ نہیں کرسکتا ہے بلکہ یہ فریضہ جاری رہے گا شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ بعض منافقین نے کہا کہ بھائی! کچھ صبر کرو یہ نبی جب مرجائے گا تو اس کے بعد ہم اپنے پرانے مذہب کی طرف واپس چلے جائیں گے آنحضرت ﷺ کو جب معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ جہاد جاری رہے گا اگر یہ منافقین اسلام کو چھوڑیں گے تو جہاد کی تلوار موجود رہے گی جو انہیں کاٹ کر رکھے گی علامہ طیبی رحمہ اللہ کی عربی عبارت اس طرح ہے:

الجهاد ماض "فيه رد على المنافقين وبعض الكفرة لانهم زعموا ان دولة الاسلام تنقرض بعد ايام قلائل كأنه قيل الجهاد ماض اى اعلام دولته منشورة واوليائه منصورة واعدائه مقهورة الى يوم الدين"۔ [1]

اس حدیث کو علامات النفاق میں لانے کی مناسبت بھی یہی ہے کہ منافقین نے اعتراض کیا تھا "**والجهاد ماض**" کا مطلب یہ ہوا کہ خروج دجال تک جہاد جاری رہے گا اس سے لڑ کر مسلمان غالب آجائیں گے پھر یاجوج ماجوج آئیں گے ان سے مقابلہ ممکن نہ ہوگا اس کے بعد پھر کوئی کافر نہیں رہے گا تو جہاد نہیں ہوگا اور پھر اس کے بعد تو سب کافر ہوں گے جن پر قیامت قائم ہوگی تو جہاد کیسے ہوگا لہٰذا جہاد قرب قیامت تک جاری رہے گا۔

پھر علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جاری رہنے سے اس کا عقیدہ باقی رہنا اور اس کے حکم کا باقی رہنا اور اس کی مشروعیت کا باقی رہنا مراد ہے کیونکہ ہر وقت ہر گھڑی تو میدان جنگ گرم نہیں رہتا ہے اگر چہ ہر مسلمان ملک پر واجب ہے کہ وہ سال میں دو دفعہ کفار سے جنگ کرے اور یہ ادنیٰ درجہ ہے فرض کفایہ سے بھی مراد یہ ہے کہ دنیا کے کسی کونے میں جہاد کا وجود عملاً باقی رہنا چاہیے اگر پوری دنیا نے جہاد ترک کردیا تو مجموعی طور پر لوگ گناہ گار ہوجائیں گے، کیونکہ **الجهاد ماض** اٹل حکم ہے۔

مذ بعثنی الله: اس جملہ کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جب سے میرے رب نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے اس وقت سے جہاد جاری ہوا ہے دوسرا مفہوم یہ کہ جب سے میرے رب نے مجھے مکہ سے مدینہ کی طرف بھیجا ہے اس وقت سے جہاد کا حکم آگیا ہے یہاں تک کہ اس امت کا آخری شخص دجال سے آکر جنگ لڑے اس آخری شخص سے مراد (عیسیٰ علیہ السلام) ہیں اور حضرت

---

[1] الکاشف ۱/۲۱۰

عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد وہ اس امت کے افراد میں سے ایک فرد ہوں گے اگرچہ نبوت ساتھ ہوگی تو "آخر هذه الامة" کا مطلب صحیح ہوگیا احادیث میں واضح طور پر آیا ہے کہ دجال کو قتل کرنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے ہجرت کے بعد عملی طور پر مشروعیت جہاد کا حکم آگیا اور یہ مشروعیت قرب قیامت تک برابر جاری رہے گی اس سے ہر مسلمان کو سوچنا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ نے جہاد کو ایمان کی اصل اور اس کی جڑ قرار دیا ہے تو اس کو کمزور کرنے سے احتراز کرنا چاہیے اور برسر منبر جہاد کے خلاف زہر اگلنا تو بہت بڑا گناہ ہے۔[1]

لا يبطله جور جائر: یعنی ایک سربراہ اسلامی مملکت کا مثلاً بڑا ہی ظالم ہے لیکن وہ جب جہاد کا اعلان کرے تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ جہاد کے لئے نکل جائیں اور یہ بہانہ نہ بنائیں کہ سربراہ ظالم ہے ہم جہاد نہیں کریں گے بلکہ حدیث میں ہے:

"**الجهاد واجب عليكم مع كل امير برا كان اوفاجرًا وان عمل الكبائر**"۔ (مشکوۃ ص۱۰۰)[2]

ولا عدل عادل: یعنی ایک کافر حکومت کا سربراہ بڑا ہی عادل ہے تو اس کی عدالت اور منصف مزاجی اپنی جگہ مگر جہاد کو اس کے انصاف وعدل کی وجہ سے نہیں روکا جاسکتا بلکہ شوکت اسلام بڑھانے کے لئے اور کلمۃ اللہ پھیلانے کے لئے اس منصف مزاج بادشاہ اور اس کی قوم سے جہاد کیا جائے گا۔[3]

والايمان بالاقدار: یہ تیسری اصل ہے جو ایمان بالقدر ہے یعنی جو چیز تفصیل میں آتی ہے وہ پہلے سے اجمالی طور پر مقدر ہو چکی ہے اور تقدیر میں لکھی جاچکی ہے جس طرح ایک انجینئر ایک نقشہ ذہن میں بناتا ہے پھر اس کا خارجی وجود تفصیل سے وجود میں آتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک اجمالی خاکہ ہے اسی کے مطابق تفصیلات آرہی ہیں تقدیر تسلی کے لئے ایک عظیم سبب ہے سخت صدمہ میں ایک مسلمان کہتا ہے چلو تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا اللہ نے یہی مقدر کیا تھا اس تسلی سے کفار محروم ہیں ایمان بالقدر کی تفصیل آرہی ہے۔[4]

ارتکاب زنا کے وقت ایمان باہر آجاتا ہے

﴿۱۰﴾ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِذَا زَنَى الْعَبْدُ خَرَجَ مِنْهُ الْاِيْمَانُ فَكَانَ فَوْقَ رَاسِهٖ كَالظُّلَّةِ فَاِذَا خَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ الْعَمَلِ رَجَعَ اِلَيْهِ الْاِيْمَانُ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ)[5]

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! جب بندہ زنا کرتا ہے تو ایمان اس سے نکل جاتا ہے، اور اس کے سر پر سائباں کی طرح معلق رہتا ہے پھر جب وہ اس معصیت سے فارغ ہوجاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔ (ترمذی ابوداؤد)

توضیح: خرج منه الايمان: سوال یہ ہے کہ جب ایمان خارج ہوگیا تو کیا یہ آدمی کافر ہوگیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان شہودی غائب ہوجاتا ہے۔ دوم یہ کہ نور ایمانی جاتا ہے۔ سوم یہ کہ کمال ایمان نکل جاتا ہے۔

[1] المرقات ۱/۲۳۳ [2] المرقات ۱/۲۳۳ [3] المرقات ۱/۲۳۳، ۲۳۴ [4] المرقات ۱/۲۳۴ [5] اخرجه الترمذی وابوداؤد ۴/۲۲۱

چہارم یہ کہ حیاء ایمانی چلی جاتی ہے۔ پنجم یہ کہ یہ تغلیظ وتشدید کے طور پر فرمایا۔ ششم یہ کہ وقتی طور پر ایمان ہٹ گیا ابھی اس قباحت سے فارغ ہو کر ایمان واپس آجائے گا ارتکاب کبیرہ کے وقت بھی یہ شخص ایمان کے سائے تلے ہے ہاں علماء نے لکھا ہے کہ اگر اسی وقت یہ آدمی مر گیا تو ایمان کے بغیر مر کر چلا گیا کیونکہ ایمان تو سائبان بنا تھا اندر سے چلا گیا تھا اور واپس آنے کا موقع نہیں ملا۔ (اعاذنا اللہ منہ)

الفصل الثالث

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو دس باتوں کی وصیت

﴿۱۱﴾ عَنْ مُعَاذٍ قَالَ اَوْصَانِیْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِعَشْرِ كَلِمَاتٍ قَالَ لَاتُشْرِكْ بِاللهِ شَيْئًا وَاِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ وَلَا تَعُقَّنَّ وَالِدَيْكَ وَاِنْ اَمَرَاكَ اَنْ تَخْرُجَ مِنْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ وَلَا تَتْرُكَنَّ صَلَاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّدًا فَاِنَّ مَنْ تَرَكَ صَلَاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللهِ وَلَا تَشْرَبَنَّ خَمْرًا فَاِنَّهُ رَاسُ كُلِّ فَاحِشَةٍ وَاِيَّاكَ وَالْمَعْصِيَةَ فَاِنَّ بِالْمَعْصِيَةِ حَلَّ سَخَطُ اللهِ وَاِيَّاكَ وَالْفِرَارَ مِنَ الزَّحْفِ وَاِنْ هَلَكَ النَّاسُ وَاِذَا اَصَابَ النَّاسَ مَوْتٌ وَاَنْتَ فِيْهِمْ فَاثْبُتْ وَاَنْفِقْ عَلٰى عِيَالِكَ مِنْ طَوْلِكَ وَلَا تَرْفَعْ عَنْهُمْ عَصَاكَ اَدَبًا وَاَخِفْهُمْ فِی اللهِ۔ (رواہ احمد)[۱]

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دس باتوں کی وصیت فرمائی چنانچہ فرمایا ① اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اگرچہ تمہیں جان سے مار ڈالا جائے اور جلا دیا جائے۔ ② اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو اگرچہ وہ تمہیں اپنے اہل اور مال چھوڑنے کا حکم دیں۔ ③ جان بوجھ کر کوئی فرض نماز نہ چھوڑنا کیونکہ جو شخص عمداً نماز چھوڑ دیتا ہے اللہ اس سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ④ شراب مت پیو کیونکہ شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ ⑤ اللہ کی نافرمانی اور گناہ سے بچو کیونکہ نافرمانی کرنے سے اللہ کا غصہ اتر آتا ہے۔ ⑥ جہاد میں دشمنوں کو ہرگز پیٹھ نہ دکھلاؤ اگرچہ تمہارے ساتھ کے تمام لوگ ہلاک ہو جائیں۔ ⑦ جب لوگوں میں موت (وباء کی صورت میں) پھیل جائے اور تم ان میں موجود ہو تو ثابت قدم رہو (یعنی ان کے درمیان سے بھاگو مت)۔ ⑧ اپنے اہل وعیال پر اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرتے رہو۔ ⑨ تادیباً اپنا ڈنڈا ان سے نہ ہٹاؤ۔ ⑩ اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں انہیں ڈراتے رہو (یعنی اہل وعیال میں سے کسی کو سزاءً یا تادیباً کچھ مارنا پیٹنا ضروری ہو تو اس سے پہلو تہی نہ کرو اور ان کو اچھی اچھی باتوں کی نصیحت وتلقین کرتے رہا کرو اور دین کے احکام ومسائل کی تعلیم دیا کرو اور ان کو بری باتوں سے بچانے کی کوشش کرو)۔ (احمد)

توضیح: **اوصانی:** تاکیدی حکم اور اہم بیان کو وصیت کہتے ہیں جیسے قریب الموت شخص پس ماندہ گان کو اہم اہم اور ضروری باتوں کا تذکرہ کی وصیت کرتا ہے۔[۲]

[۱] اخرجہ احمد: ۵/۲۳۸ [۲] المرقات ۱/۲۳۵

وان قتلت وحرقت: سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں اکراہ کی صورت میں کفر وشرک کا زبانی اور ظاہری طور پر ارتکاب جائز قرار دیا گیا ہے تا کہ جان بچ جائے لیکن یہاں حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حالت اکراہ میں بھی اجازت نہیں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کلام فرضی طور پر ہے یعنی شرک نہ کرو فرض کرلو اگر تم جلائے بھی جاؤ یا قتل کے لئے پیش بھی کئے جاؤ مگر شرک سے بچو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک عزیمت ہے اور ایک رخصت ہے رخصت تو یہی ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے کہ دل سے مؤمن ہے صرف زبان سے اکراہی صورت میں کلمۂ کفر کہتا ہے تو جان بچانے کے لئے رخصت ہے اجازت ہے، ادھر حدیث میں آنحضرت ﷺ نے صحابی کو عزیمت پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے کہ جان دیدو مگر شرک کا ارتکاب نہ کرو تو عزیمت پر عمل شان صحابی کے شایان شان تھا۔ [1]

ولا تعقن والديك: عقوق والدین میں یہ تفصیل ہے کہ اگر والدین کا حکم امر شرعی کے کرنے سے متعلق ہے تو اس میں والدین کی اطاعت فرض ہے اور اگر کسی امر منکر کے کرنے سے والدین کا حکم متعلق ہے تو ان کی اطاعت نہ کرنا فرض ہے اور اگر کسی مباح امر سے متعلق ہو تو اطاعت کرسکتا ہے بشرطیکہ اطاعت سے فتنہ انگیزی کا خطرہ نہ ہو۔ [2]

برأت منه ذمة الله: ای امن اللہ۔ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ قصداً نماز چھوڑنے والے سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے یعنی اب یہ آدمی محفوظ الدم نہیں رہا بلکہ مھدور الدم ہوگیا۔ اس میں پھر فقہاء کرام کی رائیں مختلف ہوگئیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عمداً نماز چھوڑنے والا مرتد نہیں ہے البتہ واجب القتل ہے اور یہ سزا اس کے اس عمل کا ردعمل ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کو قتل کردیا جائے گا اور یہ ارتداد کی ایک شکل ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ کو جیل میں ڈال دیا جائے یہاں تک کہ یا توبہ کرے یا جیل میں مرے، بعض اہل اللہ فرماتے ہیں کہ بے نمازی کو مسلمانوں کے قبرستان میں نہ دفنایا جائے، بابا سعدی نے کہا ہے کہ بے نمازی کو قرض مت دو کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کا قرض ادا نہیں کرتا ہے وہ تمہارا کیا حق ادا کرے گا۔ [3]

فانه راس كل فاحشة: کیونکہ شراب پینے سے عقل زائل ہوتی ہے اور جب عقل گئی تو پھر ہر گناہ کا راستہ کھل گیا۔ [4] "**اذا فاتك الحياء فافعل ما شئت**" یعنی اب فاحشہ غیر فاحشہ میں تمیز ختم ہوگئی جو چاہو کرو۔

واذا اصاب الناس موت:

یعنی جہاں طاعون وغیرہ وبائی مرض ہو وہاں جانا شرعاً جائز نہیں اور وہاں سے بھاگنا بھی جائز نہیں یہ ایسا ہی ناجائز ہے جیسا کہ دشمن سے میدان جنگ میں بھاگنا ناجائز ہے۔ [5]

وانفق على عيالك من طولك: طول طاقت اور قدرت اور وسعت کے معنی میں ہے یعنی واجبی نفقات تو ذمہ پر ہیں زائد نفقات سے بھی اہل وعیال پر خرچ کیا کرو مگر اپنی وسعت کے مطابق ہو۔ [6]

---

[1] المرقات ۱/۲۳۵ [2] المرقات ۱/۲۳۵ [3] اشعۃ اللمعات ۱/۸۳ والمرقات: ۱/۲۳۶
[4] المرقات ۱/۲۳۶ [5] المرقات ۱/۲۳۶ [6] المرقات ۱/۲۳۷

عصاك ادبا: یعنی تادیب وتہذیب کے لئے ضروری ہے کہ ہر وقت عصا کندھے پر ہو اور اس سے بیوی بچوں کی اصلاح جاری رکھو مگر یہ مار پیٹ ادب کے طور پر ہو نہ کہ عذاب وتعذیب کے طور پر خلاصہ یہ کہ ان کی تادیب اور حسن تعلیم کے لئے زجر وتوبیخ اور مار پیٹ کرتے رہنا چاہیے۔[1]

اب یا کفر ہے یا ایمان

﴿۱۲﴾ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ إِنَّمَا النِّفَاقُ كَانَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَأَمَّا الْيَوْمَ فَإِنَّمَا هُوَ الْكُفْرُ وَالْإِيمَانُ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[2]

ترجمہ: اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نفاق کا حکم آنحضرت ﷺ کے عہد پر ختم ہو گیا لہٰذا اب دو ہی صورتیں ہوں گی یا کفر ہوگا یا ایمان۔ (بخاری)

توضیح: فاما الیوم: حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں چند مصلحتوں کی وجہ سے منافقین کو مسلمانوں کے حکم میں رکھا جاتا تھا اور ان کی تمام سازشوں کو برداشت کیا جاتا تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اب وہ معاملہ نہیں رہا اب فرض کرو اگر معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص منافق ہے تو اس پر ارتداد کا حکم جاری ہوگا اور اسلامی حکومت اس کو سزائے موت دے گی۔[3]

[1] المرقات ۱/۲۲۷ [2] اخرجه البخاری ۹/۷۲ [3] المرقات ۱/۲۲۷

یم محرم الحرام ۱۴۱۰ھ

باب فی الوسوسة

یہ باب وسوسہ کے بیان میں ہے

وسوسہ لغت میں نرم آواز اور زیورات کی جھنکار کو کہتے ہیں شاعر کہتا ہے:

ضَوْءُ الْجَبِيْنِ وَوَسْوَاسُ الْحُلِيِّ وَمَا يَفُوْحُ مِنْ عَرَقٍ كَالْعَنْبَرِ الْعَبِقِ

ترجمہ: چہرہ کی چمک اور زیورات کی جھنکار اور اسکے پسینے کی عنبرین خوشبو کا کیا کہنا۔

وسواس اور وسواس بھی وسوسہ کے معنی میں ہیں پھر وسواس وسوسہ ڈالنے والے شیطان کو بولا گیا **زید عدل** کے طرز پر یعنی مبالغہ کے طور پر شیطان کو وسواس کہا گیا۔ کیونکہ شریعت نے ہر بری نسبت شیطان کی طرف کی ہے تاکہ اس خطرناک دشمن کی نفرت وعداوت دلوں میں بیٹھ جائے اور ہر خیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے اگرچہ خالق خیر وشر اللہ ہی ہے۔ بہرحال خیالات فاسدہ اور وہ **افکار ردیئہ** جو شیطان کی مداخلت سے انسان کو کفر یا معصیت تک لے جائیں ان کا نام وسوسہ ہے۔

دوسری تعریف اس طرح ہے، جو قلبی خطرات رذائل کی طرف بلاتے ہوں وہ وسوسہ ہیں اور جو قلبی خطرات فضائل کی طرف داعی ہوں وہ الہام ہیں غیر معصوم ہستی کا الہام حجت نہیں ہے ہاں اگر شریعت کے موافق ہو تو باعث تسلی ہے۔[1]

اس سے ملتی جلتی ایک تعبیر اس طرح بھی ہے کہ جو خطرات شر کے ہوں وہ وسوسہ ہیں اور قلب پر آنے والے جو خطرات خیر کے ہوں وہ الہام ہیں وسوسہ کی پانچ اقسام ہیں جس کو کسی شاعر نے اس نظم میں پیش کیا ہے:

مراتب القصد خمس هاجس ذكروا فخاطر فحديث النفس فاستمعا

يليه هم فعزم كلها رفعت سوى الاخير ففيه الاخذ قد وقعا

❶ ''ھاجس'' جو خطرات دل پر ایک بار وارد ہو جائیں اور پھر رفع ہو جائیں یہ ھاجس ہیں۔

❷ ''خاطر'' جو خیال دل میں بار بار آتا جاتا ہے اور قرار نہیں پکڑتا وہ خاطر کہلاتا ہے۔

❸ اگر ان خطرات کا استقرار دل میں آ گیا مگر اتنا ضعیف ہے کہ فعل کے کرنے اور نہ کرنے میں کسی جانب ترجیح نہیں ہوئی تو یہ ''حدیث النفس'' کہلاتا ہے۔

❹ اگر خیالات کا استقرار دل میں اتنا مضبوط اور قوی ہو جائے کہ موجب فعل ہو، مگر جانب فعل مرجوح رہے تو یہ **''ھم''** کا درجہ ہے۔

---

[1] المرقات ۱/۲۳۸

۵ اور اگر "ھم" کا درجہ دل میں اتنا قوی ہوجائے کہ جانب فعل راجح ہوکر موجب فعل ہوجائے یعنی صرف موقع کا انتظار ہے تو یہ "عزم" ہے۔[1]

اول تین قسموں پر نہ ثواب ہے نہ عقاب ہے بالکل معاف ہیں کیونکہ یہ غیر اختیاری ہیں، "ھم" کے درجہ میں جو وسوسہ ہے یہ سیئہ اور کار شر میں معاف ہے، یہ اس امت کا اعزاز ہے اور کار خیر اور ثواب میں دس کے بجائے ایک نیکی ملے گی۔

اور عزم میں اگر گناہ کا عزم ہے تو عذاب کا مستحق ہوگا اور اگر حسنہ اور نیکی کا عزم ہے تو **من جاء بالحسنة فله عشر امثالها** حسب وعدہ دس گنا ثواب ملے گا پھر عزائم قلبیہ اگر اچھے عقائد ہیں تو اس پر ثواب ہے اور برے عقائد ہیں تو ان پر عذاب ہے اس میں اتفاق ہے۔

اور اگر یہی عزائم قلبیہ اخلاقیات کے قبیل سے ہوں تو اچھے اخلاق وصفات پر ثواب ملے گا اور برے پر عذاب ہوگا اس پر بھی اتفاق ہے اچھے اخلاق صبر، شکر، فکر آخرت، تواضع وغیرہ ہیں۔ برے اخلاق تکبر، عجب، کینہ وحسد وغیرہ ہیں اور اگر یہی عزائم قلبیہ اعمال جوارح سے متعلق ہیں تو اس میں اختلاف ہے بعض نے عزم کے درجہ میں مواخذہ کا قول کیا ہے اور بعض نے عدم مواخذہ کا قول کیا ہے راجح یہ ہے کہ مواخذہ ہوگا۔[2] واللہ اعلم

الفصل الاول

وسوسوں کی معافی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنَّ اللهَ تَعَالٰی تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَاوَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْتَتَكَلَّمْ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)[3]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لوگوں کے ان وسوسوں کو معاف کر دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب تک کہ وہ ان وسوسوں پر عمل نہ کریں اور ان کو زبان پر نہ لائیں۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: ماوسوست به صدورها: **صدورها** مرفوع ہے جو وسوست کا فاعل ہے اور یہی راجح ہے، یا منصوب ہے ظرفیت کی بنیاد پر اور فاعل محذوف ہے **ای ما وسوست الشیاطین به فی صدورها**۔ "ھا" ضمیر امت کی طرف لوٹتی ہے اور امت سے مراد امت اجابت ہے امت دعوت یعنی کفار مراد نہیں ہیں۔[4]

شیخ عبد الحق محدث دھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں عزم کے علاوہ وسوسہ مراد ہے عزم پر مواخذہ دیگر نصوص کی وجہ سے ہے مثلاً **والاثم ماحاك فی نفسك وتردد** اور یا حدیث **فالقاتل والمقتول فی النار قیل الخ** اس

[1] المرقات ۱/۲۳۸ [2] المرقات ۱/۲۳۹ [3] اخرجه البخاری ۳/۱۹۱ ومسلم ۱/۶۵، ۶۶ [4] المرقات ۱/۲۳۸

حدیث میں مقتول بھی مجرم ٹھہرا کیونکہ وہ حریص تھا اپنے بھائی کے قتل پر جو درجہ عزم ہے۔ خلاصہ یہ کہ مذکورہ حدیث سے بظاہر عزم کا درجہ بھی معاف ہے مگر دیگر نصوص کی وجہ سے عزم مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔[1]

مالم تعمل به: اگر وہ کام فعل سے تعلق رکھتا ہو تو جب تک فعل کا ارتکاب نہیں کیا معاف ہے۔[2]

او تتكلم: ای لم تتکلم یعنی اگر وہ کام قول سے تعلق رکھتا ہو تو جب تک کلام نہیں کیا صرف وسوسہ ہی ہے تو یہ معاف ہے۔ معلوم ہوا کہ جو اقوال وافعال اعمال جوارح کے علاوہ قلبی عقائد وغیرہ سے متعلق ہوں وہ ہر وقت گناہ ہی ہیں۔[3]

وسوسہ آنا دلیل ایمان ہے

﴿۲﴾ وَعَنْهُ قَالَ جَاءَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَسَاَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِي اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ اَوَقَدْ وَجَدْتُمُوْهُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذَاكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ.

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[4]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ کے چند صحابی بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم اپنے دلوں میں بعض ایسی باتیں (وسوسے) پاتے ہیں جس کا زبان پر لانا بھی ہم برا سمجھتے ہیں، سرکار دو عالم ﷺ نے پوچھا کیا تم واقعی ایسا پاتے ہو (کہ جب کوئی ایسا وسوسہ تمہارے اندر پیدا ہوتا ہے تو خود تمہارا دل اس کو ناپسند کرتا ہے اور اس کا زبان پر لانا بھی تم برا سمجھتے ہو؟) صحابہ نے عرض کیا! جی ہاں۔ تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ کھلا ہوا ایمان ہے۔

(مسلم)

توضیح: مايتعاظم: یعنی اس کا تصور اور اس کو زبان پر لانا ہی ہم بہت بڑا جرم سمجھتے ہیں جیسے کوئی کہے "من خلق الله" "کیف هو؟ این هو؟ تعاظم باب تفاعل سے مبالغہ کے لئے آیا ہے "ای نستعظم غاية الاستعظام" قاعدہ یہ ہے کہ باب مفاعلہ جب مغالبہ یعنی جانبین کے لئے مستعمل نہ بھی ہو تب بھی مبالغہ اس میں ہوتا ہی ہے تو یہاں مبالغہ کے لئے ہوا۔[5]

اوقد وجدتموه: یہ مقدر پر عطف ہے "ای اوقد حصلتموه وقد وجدتموه"۔[6]

ذاك صريح الايمان: وسوسہ آنا صریح ایمان نہیں ہے بلکہ وسوسہ کو اتنا بڑا اور اتنا برا سمجھنا یہ صریح ایمان ہے یعنی زبان پر نہیں لاسکتا ہے تو دل میں کتنا متنفر ہوگا، اس جملہ میں آنحضرت ﷺ نے امت کو تسلی دی ہے اور گویا وساوس کا علاج ہے کہ وسوسہ آئے یا جائے کچھ بھی ہو تمہارے ایمان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تم کوئی پروا نہ کرو کیونکہ خالی گھر میں جو ویران پڑا ہو کوئی نہیں جاتا یا بے پھل درخت کو پتھر نہیں مارا جاتا بلکہ جس درخت پر پھل ہوتا ہے وہاں پتھر مارا جاتا ہے جہاں پھل ہوگا اور جہاں کچھ ہو تو وہاں چور آئے گا۔[7]

---

[1] اشعة اللمعات: ۱/۸۵ المرقات ۱/۲۳۹ [2] المرقات ۱/۲۳۸ [3] المرقات ۱/۲۳۸

[4] اخرجه مسلم: ۱/۶۷ [5] المرقات ۱/۲۴۱ [6] المرقات ۱/۱۳۱ [7] المرقات ۱/۲۴۱

شیطانی وسوسوں سے اللہ کی پناہ مانگو

﴿۳﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَأْتِي الشَّيْطَانُ اَحَدَكُمْ فَيَقُولُ مَنْ خَلَقَ كَذَا مَنْ خَلَقَ كَذَا حَتّٰى يَقُولَ مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ فَإِذَا بَلَغَهُ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَهِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۱]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے بعض آدمیوں کے پاس شیطان آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا۔ اور اس چیز کو کس نے پیدا کیا؟ تا آنکہ پھر وہ یوں کہتا ہے کہ تیرے پروردگار کو کس نے پیدا کیا؟ جب نوبت یہاں تک آجائے تو اس کو چاہیے کہ اللہ سے پناہ مانگے اور اس سلسلہ کو ختم کردے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: **فاذا بلغه:** اس میں فاعل ضمیر مرفوع ہے جو احدکم کی طرف راجع ہے اور "ہ" ضمیر مفعول بہ کی ہے "ای اذا بلغ احدکم هذا القول" یا ضمیر مرفوع شیطان کی طرف راجع ہے یعنی جب شیطان ورغلاتے ورغلاتے یہاں تک پہنچ جائے تو تم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو شیطان مردود سے۔[۲]

فلیستعذ باللہ: علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اغوائے شیطانی اور اس کے وساوس کا سلسلہ غیر متناہی ہے اگر ان کو مہلت دے دی تو معاملہ ختم نہ ہوگا بلکہ خطرناک بنتا چلا جائے گا لہٰذا استعاذہ کر کے معاملہ ختم کرے کیونکہ تعوذ سے وہ بھاگتا ہے یعنی اعوذ باللہ اور معوذتین کو پڑھ کر یہ تصور قائم کرے کہ بڑے بادشاہ کی پناہ میں آیا ہوں وہ شیطان سے میری حفاظت کرے گا اس سے وسوسہ ختم ہو جائے گا۔[۳]

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے تعوذات کے لئے دس وظائف کا تعین فرمایا ہے۔ ① تعوذ باللہ ② قرأت معوذتین ③ آیۃ الکرسی ④ قرأت سورۃ بقرۃ ⑤ **اٰمن الرسول** پڑھنا ⑥ **حم المؤمن والیه المصیر** تک پڑھنا ⑦ کثرت ذکر اللہ ⑧ کثرت سے لا الہ الا اللہ کا پڑھنا ⑨ مداومت وضو ⑩ اجنبیات پر غلط نظر سے اپنی نگاہیں محفوظ رکھنے سے وساوس کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

وساوس دفع کرنے کا وظیفہ

﴿۴﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَا يَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُونَ حَتّٰى يُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۴]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ ہمیشہ (اپنے دل میں مخلوقات وغیرہ

[۱] اخرجه البخاری ۴/۱۳۹، ومسلم ۱/۶۸ [۲] المرقات ۱/۲۳۲

[۳] الکاشف ۱/۲۱۸ والمرقات ۱/۲۳۲ [۴] اخرجه البخاری: ۴/۱۳۹ ومسلم: ۱/۶۸

کے بارے میں) خیالات پکاتے رہیں گے یہاں تک کہ کہا جائے گا (یعنی دماغ میں وسوسہ آئے گا) کہ اس تمام مخلوق کو خدا نے پیدا کیا ہے (تو) خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس شخص کے دل و دماغ میں اس قسم کا کوئی خیال اور وسوسہ پیدا ہو تو وہ یہ کہے کہ میں خدا تعالیٰ پر اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لایا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: **یتساء لون:** یعنی انسان آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے رہتے ہیں یا مراد یہ کہ انسان شیطان سے معاملہ کرتا ہے مگر یہ احتمال بعید ہے کہ انسان اور شیطان کے درمیان یہ مکالمہ ہو تیسرا احتمال یہ کہ انسان اپنے نفس سے سوال کرتا رہتا ہے **یقال ھذا خلق اللہ الخلق ھذا مبتداء** ہے خبر محذوف ہے جو معروف یا مشہور ہے یعنی **ھذا القول مشھور ومسلم وھو ان اللہ خلق الخلق فما تقول فی اللہ فان اللہ شئی وکل شئی مخلوق فمن خلق اللہ؟ (طیبی) فلیقل آمنت باللہ ورسلہ** یعنی یہ سوال وجواب اور یہ خیال کفر کا ہے اس لئے مسلمان کو چاہیے کہ فوراً کہہ دے **امنت باللہ ورسلہ** تا کہ اس سے اس کے ایمان کی تجدید ہو جائے، وسوسہ دفع کرنے کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ ہر نماز کے بعد سات مرتبہ یہ آیت پڑھ کر دم کرے تو وسوسہ نہیں آئے گا۔ وہ آیت یہ ہے:[1]

وَقُل رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ۔ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ۔

ہر انسان کے ساتھ جن اور فرشتہ مقرر ہے

﴿۵﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَامِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِيْنُهٗ مِنَ الْمَلَائِكَةِ قَالُوْا وَاِيَّاكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ وَاِيَّايَ وَلٰكِنَّ اللهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمُ فَلَا يَاْمُرُنِيْ اِلَّا بِخَيْرٍ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کے ساتھ ایک ہمزاد جنوں (شیطان) میں سے اور ایک ہمزاد فرشتوں میں سے مقرر نہ کیا گیا ہو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ کے ساتھ بھی؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی، لیکن خدا نے مجھ کو اس (جن مؤکل) سے مقابلہ کرنے میں مدد دے رکھی ہے اس لئے میں اس کے مکر و فریب اور اس کی گمراہی سے محفوظ رہتا ہوں (بلکہ یہاں تک کہ) وہ بھی مجھے بھلائی کا مشورہ دیتا ہے۔ (مسلم)

توضیح: **وکل بہ قرینہ:** یہ مجہول کا صیغہ ہے قرین ہمزاد کو کہتے ہیں جو پیدائش کے وقت سے انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے تا کہ اس کو مسخر کر کے اپنا تابع بنائے جس وقت انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کے لئے ایک شیطان اور ایک فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے فرشتہ تو ہوا **ملھم الخیر** اور شیطان ہوا **وسواس الشر**۔[3]

[1] المرقات ۱/۲۴۳ [2] اخرجہ مسلم ۸/۱۳۹ [3] المرقات ۱/۲۴۴

اعانني عليه: یعنی اس کے مقابلہ میں میری مدد اور نصرت اللہ نے کی ہے۔[1]

فاسلم: اسلم کا یہ لفظ میم کے فتح کے ساتھ ماضی کا صیغہ بھی پڑھا گیا ہے اور میم کے ضمہ کے ساتھ متکلم کا صیغہ بھی پڑھا گیا ہے اب سوال یہ ہے کہ اسلم اگر ماضی کا صیغہ ہے تو پھر شیطان کیسے مسلمان ہو گیا؟ تو اسی اعتراض کی وجہ سے علماء کا اس لفظ کے مفہوم میں اختلاف ہو گیا۔ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ اس کو متکلم ہی کے معنی میں لیتے ہیں یعنی میں اس کے شر سے محفوظ ہوا ہوں اور بعض دوسرے علماء اسلم ماضی کے صیغے کو راجح قرار دیتے ہیں اور اسلام لانے کا مطلب یہ کہ وہ منقاد و مطیع و فرمانبردار ہو گیا یہی رائے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی ہے اور ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے علاوہ توجیہات کو تحریف قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اسلم بمعنی استسلم وانقاد ہے فلا یامرنی الا بخیر بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔[2]

شیطان انسان کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے

﴿۶﴾ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[3]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا! انسان کے اندر شیطان اس طرح دوڑتا پھرتا ہے جیسے رگوں میں خون گردش کرتا رہتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: يجري مجري الدم: خون رگوں میں جہاں جہاں جاری ہوتا ہے اسی کو مجری الدم کہہ دیا ہے یہ کلام یا تو تشبیہ ہے تو مجاز پر محمول ہوگا اور مجری مصدر میمی ہوگا یعنی شیطان وہاں تک وسوسے ڈالتا رہتا ہے جہاں تک خون جاتا ہے اور یا یہ کلام حقیقت پر مبنی ہے کہ شیطان خود اندر گھس کر خون کے ساتھ دوڑتا ہے جہاں خون جاتا ہے وہاں شیطان جاتا ہے پھر کلام اس طرح ہوگا يجري من الانسان کجریان الدم او يجري في مجاري الدم تو خود اندر جا کر وسوسہ ڈالتا ہے یہ اس خبیث کو اللہ تعالیٰ نے ایک قوت وسطوت اور انسانوں پر قابو پانے کا اختیار دیا ہے جو آزمائش ہے۔[4]

شیطان بچوں کی پیدائش کے وقت کچوکے لگاتا ہے

﴿۷﴾ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ بَنِيْ آدَمَ مَوْلُوْدٌ اِلَّا يَمَسُّهُ الشَّيْطَانُ حِيْنَ يُوْلَدُ فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّيْطَانِ غَيْرَ مَرْيَمَ وَابْنِهَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[5]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا! بنی آدم کے یہاں جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو چھوتا ہے جس کی وجہ سے بچہ چیخ اٹھتا ہے لیکن ابن مریم (حضرت عیسیٰ) اور ان کی ماں کو شیطان نے نہیں چھوا۔ (بخاری و مسلم)

---

[1] المرقات ۱/۲۲۵ [2] المرقات ۱/۲۲۵ [3] اخرجه البخاری ومسلم

[4] المرقات ۱/۲۲۵، ۲۶ [5] اخرجه البخاری ۴/۱۹۹ ومسلم ۷/۹۶

توضیح: یستھل صارخا: شیطان اگر ظاہری طور پر بچہ کو چھوتا ہے تو اس کچو کے لگنے سے اور ٹھونگ مارنے سے بچہ چیخ اٹھتا ہے۔ اور اگر مس ظاہری نہیں بلکہ باطنی ہے تو چونکہ بچہ معصوم اور پاک طینت ہوتا ہے شیطان کے وساوس سے ناواقف ہوتا ہے تو اس کو غیر مانوس جان کر چیخ اٹھتا ہے استھلال نومولود بچے کے چیخنے کو کہتے ہیں۔ [1]

غیر مریم وابنھا: حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے یہ دعا مانگی تھی "انی اعیذھا بك وذریتھا من الشیطان الرجیم" اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی تو محفوظ ہوگئے باقی متکلم عادۃً محاورہ کلام سے خود خارج ہوتا ہے ورنہ حضور اکرم ﷺ بھی اس مس سے محفوظ تھے یہ جزئی فضیلت ہے جس سے کوئی اعتراض واقع نہیں ہوتا۔ [2]

﴿۸﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ صِيَاحُ الْمَوْلُودِ حِيْنَ يَقَعُ نَزْغَةٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ.

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) [3]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا! ولادت کے وقت بچہ اس لئے چلاتا ہے کہ شیطان اس کو کچو کے لگاتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

گھرانہ تباہ کرنا شیطان کا پسندیدہ عمل ہے

﴿۹﴾ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اِبْلِيْسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ يَفْتِنُوْنَ النَّاسَ فَاَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً اَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً يَجِيْءُ اَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا فَيَقُوْلُ مَا صَنَعْتَ شَيْئًا قَالَ ثُمَّ يَجِيْءُ اَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ مَا تَرَكْتُهُ حَتّٰى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ امْرَاَتِهٖ قَالَ فَيُدْنِيْهِ مِنْهُ وَيَقُوْلُ نِعْمَ اَنْتَ قَالَ الْاَعْمَشُ اُرَاهُ قَالَ فَيَلْتَزِمُهُ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ) [4]

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! ابلیس اپنا تختِ حکومت پانی (یعنی سمندر) پر رکھتا ہے۔ پھر وہاں سے اپنی فوجوں کو روانہ کرتا ہے تا کہ وہ لوگوں کو فتنہ اور گمراہی میں مبتلا کریں۔ ابلیس کی فوجوں میں اس کا سب سے مقرب وہ ہے جو سب سے بڑا فتنہ انداز ہو، ان میں سے ایک واپس آ کر کہتا ہے میں نے فلاں فلاں فتنے پیدا کئے ہیں۔ ابلیس اس کے جواب میں کہتا ہے! تو نے کچھ نہیں کیا آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے میں نے (ایک بندہ کو گمراہ کرنا شروع کیا اور) اس وقت تک اس شخص کا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی نہ ڈلوادی۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ ابلیس (یہ سن کر) اس کو اپنے قریب بٹھالیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے اچھا کام کیا (حدیث کے ایک راوی) اعمش رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ نے بجائے **فیدنیه فیلتزمه** (پس ابلیس اس کو گلے لگاتا ہے) کے الفاظ نقل کئے تھے۔ (مسلم)

[1] المرقات ۱/۲۴۶ [2] المرقات ۱/۲۴۷ [3] اخرجه البخاری ومسلم: ۱/۹۷ [4] اخرجه مسلم: ۸/۱۳۸

توضیح: **یضع عرشه علی الماء:** بعض حضرات نے ابلیس کے تخت پانی پر رکھنے کی پوری صورت کو مجاز پر حمل کیا ہے کہ یہاں تسلط وقدرت مراد ہے مگر یہ راجح نہیں دوسرے شارحین نے اس کلام کو حقیقت پر حمل کیا ہے۔ کہ ابلیس سمندر پر تخت بچھاتا ہے اس پر بیٹھتا ہے اپنی اولاد کو کارروائی پر روانہ کرتا ہے گویا یہ خبیث اپنی حیثیت کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے پر پیش کرتا ہے اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو مشکوۃ ص ۴۷۸ پر ہے۔اس میں جب ابن صیاد سے آپ ﷺ نے پوچھا:[۱]

"ماذا تری قال اری عرشا علی الماء فقال تری عرش ابلیس علی البحر". (مشکوۃ ص ۴۷۸)

فرقت بينه وبين امرأته: اس سے ابلیس زیادہ خوش اس لئے ہوتا ہے کہ تنازع بین زوجین ایسا متعدی عمل ہے جس سے طرفین میں وسیع تنازعات اور فسادات پیدا ہوجاتے ہیں تو یہ ایک فساد نہیں بلکہ کئی فسادات کا پیش خیمہ ہے جس سے شیطان خوش ہوتا ہے اور آج کل این جی اوز کا بنیادی مقصد بھی یہی ابلیس کا پسندیدہ عمل ہے جو گھرانہ کو تباہ کر کے چھوڑتا ہے۔[۲]

نعم انت: یعنی ابلیس کہتا ہے کہ ہاں کام تو تم نے کیا اس صورت میں یہ حرف ایجاب ہاں کے معنی میں ہے یا یہ افعال مدح میں سے ہے یعنی **نعم الولد انت** تم کتنا اچھا بچہ ہو؟ کیا ہی اچھے ہو؟ اور پھر اس کو سینہ سے لگاتا ہے۔[۳]

جزیرہ عرب سے شیطان مایوس ہوگیا

﴿۱۰﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ أَيِسَ مِنْ أَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّونَ فِي جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَلٰكِنْ فِي "التَّحْرِيْشِ بَيْنَهُمْ". (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[۴]

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا! شیطان اس بات سے مایوس ہوگیا ہے کہ جزیرہ عرب میں مصلین (یعنی مسلمان) اس کی پرستش کریں۔لیکن ان کے درمیان فتنہ وفساد پھیلانے سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ (مسلم)

توضیح: **المصلون:** یعنی نماز پڑھنے والے اس سے مراد مسلمون ہیں تو مسلمان کی اہم عبادت اور اسلام کے اہم جزء نماز کا ذکر کیا اور یہ اشارہ کیا کہ مسلمان وہ ہے جو نماز پڑھتا ہے۔شیطان کی عبادت سے مراد شرک اور عبادۃ الاصنام ہے۔[۵]

سوال: شبہ یہ ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے انتقال کے بعد جزیرۂ عرب میں ۷۵ فی صد لوگ اسلام سے پھر گئے تھے کسی نے زکوۃ کا انکار کیا کسی نے مسیلمہ کذاب یا اسود عنسی یا طلیحہ یا سجاح کی جھوٹی نبوتوں کا ساتھ دیا اور فتنۂ ارتداد عام ہوگیا تو پھر یہ کیسے فرمایا کہ شیطان مایوس ہوگیا ہے کہ پھر سے جزیرہ عرب میں اس کی عبادت شروع ہوجائے۔

---

[۱] المرقات ۱/۲۳۸ [۲] المرقات ۱/۲۳۹ [۳] المرقات ۱/۲۳۹ [۴] اخرجه مسلم: ۱۳۸/۸ [۵] المرقات ۱/۲۴۹، ۲۵۰

پہلا جواب: اس کا آسان جواب یہ ہے کہ یہ مایوسی بت پرستی کی عبادت سے ہے کہ جزیرہ میں پھر بتوں کی عبادت شروع ہو جائے اور یہ عمل آج تک نہیں ہوا کہ کسی نے وہاں بت کھڑے کئے ہوں اس وقت فتنہ ارتداد کے دور میں بھی کسی نے کفر وشرک کی اس قسم کو نہیں اپنایا تھا۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ جزیرہ عرب میں انقلاب اسلام کے بعد انقلاب کفر سے مایوس ہو گیا ہے کہ اب یہاں دور جاہلیت اور کفر کا انقلاب نہیں آسکتا اگرچہ گناہ وفساد ہوں گے جزیرہ کی قید اس لئے لگادی کہ اس وقت اسلام صرف وہاں پر تھا۔[1]

فی جزیرۃ العرب: "جزیرہ" زمین کے اس خشک حصہ کا نام ہے جس کو چاروں طرف سے پانی نے گھیر رکھا ہو چونکہ عرب کے تین اطراف پانی ہے اس لئے اس کو حکم اکثری کے اعتبار سے جزیرہ کہہ دیا گیا ہے کیونکہ عرب کے شمال میں ملک شام واقع ہے جو پانی سے خالی ہے ہاں اکثر جوانب پر پانی کا احاطہ ہے مثلاً بحر ہند، بحر قلزم اور دجلہ وفرات نے اس ملک کا احاطہ کیا ہوا ہے حدود اربعہ اس طرح ہیں عرب کی مشرقی جانب میں خلیج فارس اور بحر عمان واقع ہے مغربی جانب میں بحیرۂ قلزم اور نہر سویز واقع ہے جنوب میں بحر ھند واقع ہے اور شمال میں ملک شام ہے۔[2]

جزیرہ عرب پانچ حصوں پر مشتمل ہے: ① تہامہ ② نجد ③ حجاز ④ عروض ⑤ یمن، جزیرہ عرب جب بولا جاتا ہے تو اس کا اطلاق لمبائی میں عدن سے عراق تک ہوتا ہے اور چوڑائی میں جدہ سے شام تک ہوتا ہے۔[3]

لکن فی التحریش: یعنی آپس میں لڑانے اور فتنہ فساد ڈالنے سے شیطان مایوس نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں سرگرم رہے گا چنانچہ واقعۂ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ شہادت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر جنگوں میں یہی اغوائے شیطانی کارفرما ہے آج کل یہود ونصاریٰ کی شکل میں ابلیس جزیرہ میں آچکا ہے۔ "تحریش" دھوکہ فریب اور ابھارنے کو کہتے ہیں۔[4]

ہفتہ ۳ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ

الفصل الثانی

وسوسہ سے پریشان نہ ہو

﴿۱۱﴾ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنِّیْ اُحَدِّثُ نَفْسِیْ بِالشَّیْءِ لَاَنْ اَکُوْنَ حُمَمَةً اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَتَکَلَّمَ بِهٖ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَدَّ اَمْرَهٗ اِلَی الْوَسْوَسَةِ۔ (رواہ ابوداود)[5]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے حاضر ہو کر عرض

[1] المرقات ۱/۲۵۰ [2] المرقات ۱/۲۵۰ [3] الکاشف ۱/۲۲۵ والمرقات ۱/۲۵۰

[4] المرقات ۱/۲۵۰ [5] اخرجہ ابو داؤد ۴/۳۳۲

کیا۔ (یارسول اللہ) میں اپنے اندر ایسا (برا) خیال پاتا ہوں کہ زبان سے اس کے اظہار کے بجائے جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے زیادہ پسند ہے۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا! اللہ کا شکر ادا کرو جس نے اس خیال کو وسوسہ کی حد تک رکھا۔ (ابوداود)

توضیح: احدث نفسی بالشیئ: "ای فی شان اللہ ووجودہ وصفاتہ" یہ ھاجس غیر اختیاری ہے۔ **حُمَمَۃً** یعنی جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے پسند ہے لیکن اس وسوسہ کا تصور کرنا گوارا نہیں اس میں ہواجس سے شدید نفرت کا اظہار ہے جو ایمان کی پختگی کی علامت ہے۔ [۱]

ردّ امرہ: ضمیر مجرور کا مرجع شیطان ہے تو مطلب یہ ہوا کہ الحمد للہ شیطان کا معاملہ اب صرف وسوسہ کے اندر منحصر ہو کر رہ گیا پہلے تو وہ کفر میں مبتلا کرتا تھا اب ایمان کی مقاومت ومزاحمت سے صرف وسوسہ ڈال سکتا ہے جو معاف ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں کرسکتا ہے یعنی **ھم وعزم** کا معاملہ نہیں رہا بلکہ صرف قلبی خطرات رہے **مع الاستقباح والکراھیۃ وذاك صریح الایمان۔** یا یوں سمجھ لیجئے کہ **امرہ:** کی ضمیر مجرور اس آنے والے آدمی کو راجع ہے یعنی الحمد للہ کہ اس رجل کا معاملہ وسوسہ تک محدود ہو کر رہ گیا اور وسوسہ معاف ہے۔ [۲]

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ شیطان کے وساوس اور اس کی تاثیر کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں اور یہ تغیر وسوسہ زدہ شخص کی وجہ سے ہوتا ہے بڑا وسوسہ یہ ہے کہ کفر کا القاء کرے جب اس میں ناکام ہو جاتا ہے اور وسوسہ زدہ شخص قوت ایمانی کے ساتھ اپنے آپ کو بچالیتا ہے۔ تو شیطانی وسوسہ اب عام فساد کی طرف لوٹ آتا ہے اور تدبیر منزل کو خراب کرتا ہے سیاست مدنیہ کو خراب کرتا ہے اگر وہ شخص اس حملہ سے بھی بچ جاتا ہے تو پھر خواطر کی صورت میں شیطان تاثیر ڈالتا رہتا ہے دل میں خیال آتا جاتا رہتا ہے اور یہ معاف ہے نفوس قدسیہ پر تو یہ اثر بھی نہیں ڈال سکتا ہے۔

اپنے اندر نیکی کی تحریک پر اللہ کا شکر ادا کرو

﴿۱۲﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ لِلشَّيْطَانِ لَمَّةً بِابْنِ آدَمَ وَلِلْمَلَكِ لَمَّةً فَأَمَّا لَمَّةُ الشَّيْطَانِ فَإِيعَادٌ بِالشَّرِّ وَتَكْذِيبٌ بِالْحَقِّ وَأَمَّا لَمَّةُ الْمَلَكِ فَإِيعَادٌ بِالْخَيْرِ وَتَصْدِيقٌ بِالْحَقِّ فَمَنْ وَجَدَ ذٰلِكَ فَلْيَعْلَمْ أَنَّهُ مِنَ اللّٰهِ فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَجَدَ الْأُخْرٰى فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ثُمَّ قَرَأَ: اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ) [۳]

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان پر ایک تصرف تو شیطان کا ہوا کرتا ہے۔ اور ایک تصرف فرشتہ کا۔ شیطان کا تصرف تو یہ ہے کہ وہ برائی پر ابھارتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے

---

[۱] المرقات ۱/۲۵۰، ۲۵۱ [۲] المرقات ۱/۲۵۱ [۳] اخرجہ الترمذی ۵/۲۱۹

اور فرشتہ کا تصرف یہ ہے کہ وہ نیکی پر ابھارتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔ لہٰذا جو شخص (نیکی پر ابھارنے کی) یہ کیفیت اپنے اندر پائے تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے (ہدایت) ہے۔ اس پر اس کو اللہ کا شکر بجالانا چاہیے۔ اور جو شخص دوسری کیفیت (یعنی شیطان کی وسوسہ اندازی) اپنے اندر پائے۔ تو اس کو چاہیئے کہ شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔ پھر آپ نے یہ قرآنی آیت پڑھی (جس کا ترجمہ ہے) شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور گناہ کے لئے اکساتا ہے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

توضیح: لمة: بالفتح من الالمام نزول خفیف کو کہتے ہیں اس سے مراد درجہ خاطر کا وسوسہ ہے جو غیر مستقرہ ہوتا ہے پھر یہ المام اور یہ لمہ اگر فرشتوں کی طرف سے ہو تو اس کو الہام کہتے ہیں اور شیطان کی طرف سے ہو تو وسوسہ ہے۔[1]

بابن آدم: یعنی اس جنس کے ساتھ مراد انسان ہے علماء نے لکھا ہے کہ الہام اور وسوسہ میں فرق حرام کھانے والے لوگ نہیں کر سکتے ہیں۔[2]

فایعاد بالشر: شر سے کفر و شرک اور دیگر معاصی مراد ہیں وعد اور ایعاد سے متعلق فراء نحوی فرماتے ہیں کہ لفظ "**وعد**" خیر اور شر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے "**وعدته خیرا**" "**ووعدته شرا**" ہاں اگر مفعول بہ مذکور نہ ہو جیسے "**وعدته**" تو اس صورت میں وعد کا لفظ صرف خیر کے لئے بولا جاتا ہے۔

اور "**ایعاد**" اور "**وعید**" شر کے لئے استعمال ہوتے ہیں البتہ شاذ و نادر کہیں ایعاد خیر کے لئے بھی بولا جاتا ہے وعدہ خلافی کی جتنی وعیدیں ہیں یہ اس صورت میں ہیں کہ وعدہ کرنے والا وعدہ کرتے وقت مخالفت کا ارادہ رکھتا ہو۔[3]

فلیحمد اللہ: یعنی اللہ کی نعمت اور اس قوت و کمال ایمان پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ **فلیتعوذ** یعنی بطور علاج **اعوذ باللہ** پڑھے۔

مطلب:

فرشتہ کے ابھارنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نیکی کا جذبہ اس کی اہمیت اور اس پر انعام و اکرام کا شعور دل میں ڈالتا ہے کہ اللہ کے دین میں کامیابی ہے اور احکام الٰہی پر چلنے میں آخرت کی کامیابی پوشیدہ ہے اگر کامیابی چاہتے ہو تو نیکی کے راستے پر آجاؤ اور شیطان کے شر پر ابھارنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق کو تاریک کر کے دکھاتا ہے عقائد میں شک ڈالتا ہے برائی کو خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے وہ انسان کو ڈراتا رہتا ہے کہ نیکی کے راستے پر چلو گے تو ہمیشہ پریشانیاں اٹھاؤ گے گویا وہ کہتا ہے:

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اہل تصوف علماء فرماتے ہیں کہ دل کے اندرونی حصہ میں چھوٹے چھوٹے سوراخ اور گوشت کے خانے بنے ہوئے ہیں یہی جگہیں خیر و شر کے پھینکنے کی جگہیں ہیں اس پر جو مخلوق قابض ہوئی پورا دل اور جسم اس کا ہے اس پر یا شیطان غالب آتا ہے یا فرشتے کبھی یہ اور کبھی وہ اسی لئے قلب کے احوال بدلتے رہتے ہیں۔[4]

[1] المرقات ۱/۲۵۱ [2] المرقات ۱/۲۵۱ [3] المرقات ۱/۲۵۱ [4] المرقات ۱/۲۵۲

شیطانی وسوسوں سے بچنے کے تین طریقے

﴿۱۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا یَزَالُ النَّاسُ یَتَسَاءَلُوْنَ حَتّٰی یُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ فَاِذَا قَالُوْا ذٰلِكَ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ثُمَّ لِیَتْفُلْ عَنْ یَسَارِهٖ ثَلَاثًا وَلْیَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔

(رَوَاهُ اَبُوْ دَاوُدَ وَسَنَذْكُرُ حَدِیْثَ عَمْرِو بْنِ الْاَحْوَصِ فِیْ بَابِ خُطْبَةِ یَوْمِ النَّحْرِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی) [1]

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ لوگ (پہلے تو مخلوقات وغیرہ کے بارے میں) پوچھا پاچھی کریں گے۔ اور پھر آخر میں یہ سوال اٹھایا جائے گا کہ ساری مخلوقات کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ تو خود اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ جب یہ سوال اٹھایا جائے تو تم کہو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہے۔ اور کوئی اس کا ہمسر (یعنی جوڑ) نہیں ہے۔ پھر اپنی بائیں طرف تین بار تھتکار دو اور شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو (ابوداؤد) اور (صاحب مشکوۃ کہتے ہیں) کہ عمرو بن احوص کی روایت (جس کو صاحب مصابیح نے یہاں نقل کیا تھا) ہم اس کو "خطبہ یوم النحر" کے باب میں نقل کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ (کیونکہ وہ روایت اسی باب کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے)۔

توضیح: **فقولوا الله الصمد:** چونکہ یہ وسوسہ توحید کے منافی تھا تو تنزیہ وتقدیس کے لئے اور تحمید وتوحید کے لئے حکم ہوا کہ سورت اخلاص پڑھو۔ [2]

ثم لیتفل: یہ نصر ینصر سے ہے پھونک کے ساتھ خفیف تھوک شامل کر کے پھینکنے کو کہتے ہیں یہ شیطان سے اظہار نفرت کے لئے ہے اس کو قبیح اور مکروہ جاننے کے لئے ہوتا ہے جس سے وہ بھاگ جاتا ہے ویسے دل بائیں جانب ہے اور شیطان کا حملہ بھی بائیں جانب دل پر ہوتا ہے جبکہ فرشتہ دائیں جانب ہوتا ہے بہر حال توحید کا اعلان واقرار شیطان سے نفرت کا عملی اظہار، اور تعوذ کا وظیفہ، یہ تین چیزیں وساوس سے بچنے کے لئے علاج ہیں۔ [3]

الفصل الثالث

شیطانی وسوسوں سے چوکنّا رہو

﴿۱۴﴾ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَنْ یَبْرَحَ النَّاسُ یَتَسَاءَلُوْنَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا هٰذَا اَللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَلِمُسْلِمٍ قَالَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِنَّ اُمَّتَكَ لَا یَزَالُوْنَ یَقُوْلُوْنَ مَا كَذَا مَا كَذَا حَتّٰی یَقُوْلُوْا هٰذَا اَللّٰهُ خَلَقَ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ۔ [4]

---

[1] اخرجه ابو داؤد ۴/۲۳۱ [2] المرقات ۱/۲۵۳ [3] المرقات ۱/۲۵۳ [4] اخرجه البخاری ۱/۱۱۹ ومسلم ۱/۶۸

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! لوگ آپس میں پوچھا پاچھی کرتے رہیں گے (یعنی شیطانی وسوسوں کی صورت میں ان کے اندر اس طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہیں گے) کہ جب ہر چیز کو خدا نے پیدا کیا (تو) خدائے بزرگ و برتر کو کس نے پیدا کیا؟ (بخاری اور مسلم کی روایت یوں ہے! انس رضی اللہ عنہ نے کہا۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ کی امت کے لوگ (اگر شیطان کی وسوسہ اندازی سے چوکنا نہ رہے تو) پہلے یوں کہیں گے کہ یہ کیا ہے؟ اور یہ کیسے ہوا؟ (یعنی مخلوقات کے بارے میں تحقیق و تجسس کریں گے) اور پھر آخر میں یوں کہیں گے کہ تمام چیزوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو خدائے بزرگ و برتر کو کس نے پیدا کیا؟

توضیح: یقولون ما کذا ما کذا: یہ الفاظ کثرت سوال سے کنایہ ہے یعنی کائنات کی چیزوں کے بارے میں سوال و تحقیق کرتے کرتے پھر اللہ کے بارے میں سوال کریں گے کہ جب سب چیزوں کو اللہ نے پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا؟

شیطان بتدریج یہ سوال دلوں میں بطور وسوسہ ڈالتا ہے کہ جب اور چیزوں کا خالق ہے تو اللہ کے لئے بھی خالق ہونا چاہیئے؟ یہ وسوسہ چونکہ کفر کی طرف لے جانے والا تھا اس لئے فرمایا کہ استعاذہ کرو اور آئندہ تصورات و خیالات اور اس قسم کے وساوس کا سلسلہ بند کردو توجہ دوسری طرف ہٹالو کیونکہ بندہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خالق میں سوچے بلکہ اس کو چاہیئے کہ مخلوق میں سوچا کرے، وساوس سے بچنے کے لئے ذکر اللہ عمدہ ترنسخہ ہے۔[1]

نماز کے دوران شیطان کی خلل اندازی

﴿۱۵﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِي الْعَاصِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ حَالَ بَيْنِي وَبَيْنَ صَلَاتِي وَبَيْنَ قِرَاءَتِي يُلَبِّسُهَا عَلَيَّ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ ذَا الشَّيْطَانُ يُقَالُ لَهُ خِنْزَبٌ فَاِذَا أَحْسَسْتَهُ فَتَعَوَّذْ بِاللهِ مِنْهُ وَاتْفُلْ عَلَى يَسَارِكَ ثَلَاثًا فَفَعَلْتُ ذٰلِكَ فَأَذْهَبَهُ اللهُ عَنِّي. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[2]

ترجمہ: 'حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے اور میری نماز میری قرات کے درمیان شیطان حائل ہو جاتا ہے اور ان چیزوں میں شبہ ڈالتا رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! یہ وہ شیطان ہے جس کو "خنزب" کہا جاتا ہے۔ پس جب تمہیں اس کا احساس ہو (کہ شیطان وساوس و شبہات میں مبتلا کرے گا) تو تم اس (شیطان مردود) سے خدا کی پناہ مانگو اور بائیں طرف تین دفعہ تھتکار دو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق) میں نے اس طرح کیا تو خدا تعالیٰ نے مجھے اس کے وساوس و شبہات سے محفوظ رکھا۔ (رواہ مسلم)

توضیح: بینی وبین صلاتی: مراد یہ ہے کہ مجھے نماز پڑھنے سے روکتا ہے اس کے وساوس کی وجہ سے میں نماز شروع بھی نہیں کرسکتا ہوں یہ توجیہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح کے مطابق ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہاں تین دفعہ تھوکنے کا حکم

[1] المرقات ۱/۲۵۴ [2] اخرجہ مسلم: ۲۰/۷

حدیث میں ہے اور مسلسل تین بار تھوکنا نماز میں جائز نہیں لہٰذا اس حدیث کا تعلق اس وسوسہ سے ہے جو نماز شروع کرنے سے پہلے ہوتا ہو۔[1]

وبین قرأتی: ایک مطلب یہ کہ قرأت شروع کرنے سے روکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ قرأت شروع کرنے کے بعد دل میں تشویش اور خلجان پیدا کرتا ہے تو قرأت میں گڑبڑ آجاتی ہے اس تشویش وتشکیک کے پیدا کرنے کے دو طریقے ہیں کہ جس کو شیطان استعمال کرتا ہے۔ اول یہ کہ وقت قرأت میں ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے کہ آگے قرأت کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ دوم یہ کہ تردد پیدا کر کے یہ کہتا ہے کہ جو پڑھا ہے وہ غلط ہے اب یہ شخص سوچتا ہے کہ میں نے جو پڑھا ہے وہ صحیح تھا یا غلط تھا۔[2]

خنزب: لغت میں **خنزب جری علی الشر** کے معنی میں ہے کسرۂ خا اور زا کے ساتھ "خِنْزِبْ" ہے اور دونوں کا فتحہ بھی ہے "خَنْزَبْ"۔

سوال: شبہ یہ ہے کہ حالت نماز وقرأت میں تھتکارنے اور تعوذ کا کیسے حکم ہوا جب کہ یہ منافی صلوٰۃ ہے؟

پہلا جواب: یہ حکم اس شخص کا ہے جس نے ابھی نماز شروع نہیں کی ہے۔

دوسرا جواب: یہ کہ یہ حکم اس وقت تھا جب نماز میں باتیں کرنا جائز تھیں پھر یہ منسوخ وموقوف ہو گیا۔

تیسرا جواب: یہ کہ یہ حکم اس نمازی کو ہے جو نماز سے فارغ ہو چکا ہے کہ شیطان تم سے جس طرح کھیل چکا ہے وہ ظاہر ہے اب آئندہ کی حفاظت کرو اور دوسری نماز کے لئے تیار ہو جاؤ۔[3]

وسوسہ کا خیال نہ کرو نماز پڑھو

﴿۱۶﴾ وَعَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَهُ فَقَالَ إِنِّي أَهِمُ فِي صَلَاتِي فَيَكْثُرُ ذٰلِكَ عَلَيَّ فَقَالَ لَهُ اِمْضِ فِي صَلَاتِكَ فَإِنَّهُ لَنْ يَّذْهَبَ ذٰلِكَ عَنْكَ حَتّٰى تَنْصَرِفَ وَأَنْتَ تَقُولُ مَا أَتْمَمْتُ صَلَاتِي۔
(رَوَاهُ مَالِكٌ)[4]

ترجمہ: اور حضرت قاسم بن محمد سے ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھے اپنی نماز میں وہم ہوتا رہتا ہے (یعنی کبھی تو یہ شک ہوتا ہے کہ میری نماز درست ادا نہیں ہوئی کبھی یہ وہم ہو جاتا ہے کہ ایک رکعت پڑھنے سے رہ گئی ہے) اس کی وجہ سے مجھے گرانی ہوتی ہے؟ انہوں نے فرمایا (تم اس طرح کے خیال پر دھیان نہ دو اور) اپنی نماز پوری کرو اس لئے کہ وہ (شیطان) تم سے جب ہی دور ہوگا کہ تم اپنی نماز پوری کرلو اور کہو کہ ہاں میں نے اپنی نماز پوری نہیں کی۔ (مالک)

توضیح: انی اھم فی صلوتی: اس سے مراد نماز میں وہم ہے کہ آیا ایک رکعت ہوئی یا دو ہوئیں نماز کم ہوئی یا زیادہ ہوگئی۔[5]

فیکثر ذالک علی: ایک نسخہ میں یکبر بھی ہے اول نسخہ اور تلفظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ صورت بکثرت آتی ہے۔ دوسرے کا

[1] المرقات ۱/۲۵۴ [2] المرقات ۱/۲۵۵ [3] المرقات ۱/۲۵۴، ۲۵۵ [4] اخرجہ مالک ۱/۱۰۰ [5] المرقات ۱/۲۵۵

مطلب یہ کہ مجھ پر یہ کیفیت بڑی گراں گزرتی ہے اور بہت بھاری محسوس ہوتی ہے۔[1]

فقال امض فی صلوتك: یہ اسلوب حکیم کے طور پر جواب ہے کہ تم اپنی نماز کو جاری رکھو یہ وساوس اور اوہام اس وقت تک ختم نہیں ہوں گے جب تک تم نماز سے فارغ ہو کر شیطان سے یہ خطاب نہ کرو گے کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ میری نماز نہیں ہوئی تو سمجھتے رہو، ٹھیک ہے میری نماز نہیں ہوئی مگر میں دوبارہ پڑھوں گا بھی نہیں اس عزم سے وسوسے دور ہوں گے۔[2]

خلاصہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کی نمازوں میں یہی فرق ہے کہ ان کی نمازوں میں وسوسے نہیں آتے اور ہماری نمازوں میں وسوسے آتے ہیں اس سے آپ رضی اللہ عنہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ مسلمان کا عمل زندہ وتابندہ اور قانونی ہے جس کو خراب کرنے کے لئے ابلیس وسوسے ڈالتا ہے اور یہودیوں کا عمل کسی کام کا نہیں تو اس میں وسوسہ ڈال کر شیطان کیا خرابی لائے گا عقلاء کہتے ہیں کہ جس درخت میں پھل لگے ہوں لوگ اسی پر پتھر مارتے ہیں خالی درخت کو عقلمند پتھر نہیں مارا کرتے شیطان بھی خالی اور ویران گلیوں میں محنت ضائع نہیں کرتا بلکہ جہاں ایمان ہے وہاں اس کا حملہ ہوتا ہے۔

قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ: سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن ابی بکر کے صاحبزادے ہیں آپ جلیل القدر تابعی ہیں ۱۰۱ھ میں ۷۰ سال کی عمر میں وفات پا گئے آپ مدینہ منورہ کے مشہور سات فقہاء میں سے تھے ان فقہاء سبعہ کے نام یہ ہیں شعر ملاحظہ ہو۔[3]

الا کل من لا یقتدی بأئمة فقسمته ضیزیٰ من الحق خارجه

فخذ هم عبید الله عروة قاسم سعید ابی بکر سلیمان خارجه

---

[1] المرقات ۱/۲۵۵، ۲۵۶ [2] المرقات ۱/۲۵۶ [3] المرقات ۱/۲۵۵

۴ محرم ۱۴۱۰ھ

باب الایمان بالقدر

تقدیر کا بیان

تقدیر کا مفہوم:

"القدر" دال متحرک بھی ہے اور ساکن بھی ہے یہ کسی چیز کا اندازہ کرنے اور کسی چیز میں تنگی کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے "انا کل شئی خلقناہ بقدر" یہ اسی اندازے اور تقدیر کی طرف اشارہ ہے تو لغت میں تقدیر اندازہ کے معنی میں ہے اور اصطلاح میں تقدیر سے متعلق علماء کی تعبیرات مختلف ہیں چنانچہ شرح فقہ اکبر میں ہے۔[1]

❶ "القدر تعیین کل مخلوق بمرتبته التی توجد من حسن و قبح و نفع و ضرر"۔

(شرح فقہ اکبر ص۱۵)

"یعنی تقدیر ہر مخلوق کی ہر حیثیت وصفت کے تعین کا نام ہے خواہ وہ نفع یا ضرر کی صفت ہو یا حسن اور قباحت کی ہو"۔

❷ کچھ دیگر علماء نے اس طرح کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش عالم سے پہلے جن چیزوں کا اندازہ فرمایا ہے اور لوح محفوظ میں ان کو مقرر کیا ہے اسی کے مطابق اس کا تفصیلی وجود ظاہر ہوگا یہی تقدیر ہے، اس میں یہ نہیں ہوسکتا کہ پہلے کسی چیز کا اندازہ نہ ہوا ہو اور تقدیر کی لکھت نہ ہوئی ہو اور تفصیل میں وہ چیز آجائے پس جو چیزیں اس کائنات میں تفصیلاً جاری ہیں وہ پہلے سے تقدیر میں عند اللہ معین و مقرر ہیں آپ یوں سمجھیں کہ مثلاً زید کے تفصیلی حالات پیدائش سے لے کر وفات تک اللہ تعالیٰ کے علم میں آگئے، تب اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کی تقدیر میں لکھ دیا، اب زید کے پیدا ہونے کے بعد اس کی تمام حرکات و سکنات اسی اجمالی لکھت کے مطابق ہوں گی لیکن تقدیر نے اس کو مجبور نہیں کیا بلکہ اسے اختیار دیا ہے اس آزادانہ اختیار کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا اور اللہ کے علم میں آگیا اسی کے مطابق اس کے تفصیلی حالات ظاہر ہوں گے۔

❸ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تعریف کی ہے "ھو ما یقدرہ اللہ من القضایا"۔[2]

تقدیر پر ایمان کا مطلب:

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ تقدیر پر ایمان لانا فرض ہے اور وہ اس طرح کہ بندہ یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے خواہ وہ عمل خیر کا ہو یا شر کا ہو، اور یہ سب کچھ بندوں کی پیدائش سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے اب جو کچھ ظاہر ہو رہا ہے سب اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور اس کے ارادے سے ہو رہا ہے، تاہم اللہ تعالیٰ کفر سے ناراض ہوتا ہے اس لئے کفر و معصیت کے لئے سزا کا وعدہ کیا ہے اور ایمان و طاعت پر ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔ (مرقاۃ)[3]

حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے "لا جبر ولا قدر ولکن الامر بین الامرین"۔

---

[1] المرقات ۱/۲۵۶ [2] المرقات ۱/۲۵۶ [3] المرقات ۱/۲۵۶

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے تقدیر کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا "من لم یؤمن بقدرہ من خیر و شر فقد کفر۔"

تقدیر کیا چیز ہے؟

تقدیر اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جس پر اللہ نے کسی مقرب فرشتہ یا کسی مقرب رسول کو بھی مطلع نہیں کیا ہے لہٰذا اس میں عقلی بحث و تمحیص جائز نہیں ہے بلکہ یہ عقیدہ رکھنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کر کے دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ایک گروہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے تحت جنت کے لئے بنادیا اور دوسرے گروہ کو اپنے عدل کے تحت دوزخ کے لئے بنادیا دونوں کو اختیار دیا کسی کو مجبور نہیں کیا، ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تقدیر جاننے کے لئے پوچھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

"طریق مظلم فلا تسلکه" ایک تاریک راستہ ہے اس پر نہ جاؤ، اس نے پھر سوال کیا آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"بحر عمیق فلا تلجه" ایک گہرا سمندر ہے اس میں نہ اترو، اس شخص نے پھر سوال کیا آپ نے فرمایا:[1]

"سر الله قد خفي علیك فلا تفشه" اللہ تعالیٰ کا ایک مخفی راز ہے اس کو فاش کرنے کی کوشش نہ کرو۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

کیفیة المرأ لیس المرأ یدرکها فکیف کیفیة الجبار فی القدم

ترجمہ: ایک انسان کی کیفیت کو دوسرا انسان نہیں پا سکتا تو قدیم بادشاہ قہار و جبار کے رازوں کو انسان کیسے پا سکے گا؟

اس موضوع سے متعلق دو شعر ملاحظہ ہو

ہزار نکتۂ باریک تر زمو این جا است نہ ہر کہ سر بتر اشد قلندری داند

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن

منکرین تقدیر کا فتنہ کب سے شروع ہوا؟

دور صحابہ میں کسی نے تقدیر کا انکار نہیں کیا اور نہ کسی کو اس میں تردد ہوا، صحابہ کرام کے بالکل آخری دور میں بعض لوگوں نے اس مسئلہ میں بحثیں شروع کیں، بصرہ میں ایک شخص معبد جہنی تھا اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کو مستقبل کے امور کا علم اس کے ظہور سے پہلے نہیں ہوتا ہے جب کوئی عمل ظاہر ہو جاتا ہے تب اللہ کو اس کا علم ہو جاتا ہے اس کی تعبیر ان کے ہاں یہ تھی "الامر انف ای مستأنف" یعنی پہلے سے کوئی نظام لکھت یا لوح محفوظ وغیرہ نہیں ہے جو ہو جاتا ہے اسی سے تقدیر بنتی ہے اس شخص کا رد خود صحابہ کرام میں سے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کیا، یہ عنوان چونکہ غلط بلکہ گمراہ کن تھا اس لئے اس پر تردید آنے کے بعد اس عنوان سے یہ مسئلہ آگے نہ چل سکا، ہاں معتزلہ نے اس کو ایک اور رنگ دیا اور اس کو آگے چلایا اور وہ عنوان یہ تھا کہ آیا بندوں میں اپنے افعال کے اختیار کرنے کی قدرت ہے یا نہیں یعنی بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں چنانچہ "خلق افعال العباد" کے عنوان سے انکار تقدیر کا مسئلہ خلفاء بنو عباس کے دور میں بہت آگے بڑھ گیا اور

[1] المرقات ۱/۲۵۶

اس کے اصول وفروع پر بہت جھگڑے ہوئے، اسی میں سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور معتزلہ حکام کا وہ بڑا مشہور معرکہ بھی ہے جو کئی سالوں تک آزمائش کا میدان بنارہا، معبد جھنی کا استاذ سوسن یہودی تھا جس نے تقدیر کا یہ جھگڑا کھڑا کیا، پھر معبد جھنی اور اس کے بعد غیلان نامی شخص نے اس عقیدہ کو عراق اور حجاز میں پھیلا دیا۔ عمرو بن عبد نے جب اس مسئلہ کو اچھالا تو حجاج بن یوسف نے اس کو قتل کیا۔

تقدیر وقضاء میں کیا فرق ہے؟؟

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قضاء وقدر کے معنی مشترک ہیں ایک کا اطلاق دوسرے پر ہوتا ہے اور کبھی کبھی مختلف معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں وہ اس طرح کہ قدر تو اللہ تعالیٰ کا وہ ازلی اجمالی فیصلہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں متعین ہوتا ہے اور قضاء اس کا خارجی تفصیلی خاکہ ہوتا ہے یا اس کی خارجی تکمیل ہوتی ہے جیسے "**فقضاھن سبع سمٰوات**" یہ سات آسمان اپنے وجود کے اعتبار سے اسی اجمالی تقدیر کے لئے خارجی تفصیلی خاکے ہیں اور بعض مرتبہ قضاء سے مراد علم اجمالی ازلی ہوتا ہے اور قدر سے مراد خارج میں اس کا تفصیلی وجود ہوتا ہے۔ [1]

بعض عارفین نے اس مسئلہ کو ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ جیسے ایک مصور انجینئر کے ذہن میں ایک خاکہ ہوتا ہے پھر وہ خارج میں اس کا ایک نقشہ بناتا ہے بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں ایک صورت معہودہ ہے اس کو قدر کہتے ہیں اسی کے مطابق خارج میں ایک صورت آتی ہے وہ قضاء ہے اس قضاء کے تابع ہو کر بندہ کا قدر کے مطابق عمل کرنا کسب کہلاتا ہے۔

مثال اس طرح ہے کہ ایک مصور انجینئر اپنی صورت ذھنیہ کے مطابق کاغذ پنسل سے ایک خاکہ بناتا ہے تلمیذ اس خاکہ میں خطوط کا لحاظ کرتے ہوئے رنگ بھرتا ہے تو صورت ذھنیہ قدر ہے خارج میں اس کا خاکہ قضاء ہے اور خاکہ میں رعایت کے ساتھ رنگ بھرنا عبد کا کسب ہے تو جس طرح یہ رنگ بھرنا صورت ذھنیہ کے عین مطابق ہے اسی طرح بندہ کا کسب تقدیر الٰہی کے عین مطابق ہے اور بندہ تقدیر کے خلاف نہیں کرسکتا، خلاصہ یہ کہ مکان بنانے سے پہلے جو خاکہ ذہن میں آتا ہے یہ بمنزلہ قدر ہے اور اسی نقشہ کے مطابق جو مکان تیار ہو کر موجود فی الخارج ہوا یہ قضاء ہے۔ تاہم اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ قضاء وقدر میں ترادف ہے دونوں ایک ہی ہیں۔

مسئلہ تقدیر میں مختلف مذاہب

تقدیر کے مسئلہ میں کل تین مذاہب ہیں ایک اہل حق کا اور دو اہل باطل کے ہیں، اہل حق اہل السنت والجماعہ ہیں اور اہل باطل جبریہ اور معتزلہ ہیں تفصیل اس طرح ہے:

❶ جبریہ کا مذہب:

تقدیر کے متعلق جبریہ کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض جماد کی طرح ہے اس کے افعال کا اعتبار نہیں اور

---

[1] اشعۃ اللمعات ۱/۹۲

تقدیر کے سامنے یہ بے بس اور بے حس پتھر ہے یہ لوگ ان نصوص سے استدلال کرتے ہیں جن میں تقدیر کا ذکر ہے جیسے **وما تشاء ون الا ان یشاء اللہ رب العالمین۔**

جواب: جبریہ کا مذہب صریح البطلان یعنی واضح طور پر باطل ہے کیونکہ اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت لازم آتی ہے کیونکہ جب انسان مجبور محض ہے اور اس کو اپنے فعل کا کچھ بھی اختیار نہیں بلکہ جو کچھ کیا وہ اللہ نے کیا تو پھر انسان کو جزا اور سزا کے محکمہ میں گھسیٹ کر لانا کہاں کا انصاف ہے تو جس مذہب اور عقیدہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت لازم آتی ہے اس کے باطل ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔

جبریہ کے مذہب کے باطل ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ہر عقلمند شخص اپنے وجدان سے اس بات کو سمجھتا ہے کہ افعال اختیاری اور غیر اختیاری میں فرق ہے مثلاً وجدان یہ فیصلہ کرتی ہے کہ حرکت ارتعاش یعنی ہاتھ کا شل ہو کر حرکت کرنا غیر اختیاری ہے اور حرکت بطش یعنی قصد کر کے حرکت کرنا اختیاری ہے اس سے معلوم ہوا کہ انسان اپنے افعال میں ایک حد تک بااختیار ہے اور ایک حد سے آگے بے اختیار ہے جبریہ کا انسان کو بالکل مجبور ومعذور اور بے بس و بے حس کہنا ضلالت بھی ہے اور حماقت بھی ہے اگر یہ اس طرح مجبور تھا تو اس کو افعال کرنے نہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم کیوں دیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کے شخص سے فرمایا کہ پاؤں اٹھاؤ اور کھڑے رہو اس نے پاؤں اٹھایا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا دوسرا پاؤں بھی اٹھاؤ اور کھڑے رہو، اس نے کہا یہ ممکن نہیں اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا بس انسان اتنا بااختیار ہے اور اتنا بے اختیار ہے تو خلاصہ یہ ہے کہ جس حد تک انسان جا سکتا ہے اسی حد تک یہ مکلف اور جوابدہ ہے اور جہاں سے آگے نہیں جا سکتا ہے وہاں کا جوابدہ نہیں۔

نیز اختیار اور بے اختیار کا فیصلہ تو ایک بے عقل کتا بھی کرتا ہے دیکھو جب کوئی انسان اس کو پتھر مارتا ہے تو وہ پتھر کو چھوڑ کر مارنے والے انسان کے پیچھے دوڑتا بھونکتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ پتھر بے جان کا کیا قصور ہے اصل قصور تو اس بااختیار انسان کا ہے جو اپنے فعل سے پتھر مارتا ہے۔

اختیار کس طرح ہے؟

جب یہ معلوم ہوا کہ عقل سلیم اور وجدان صحیح کا اٹل فیصلہ ہے اور دنیا کا یہ مشاہدہ ہے کہ بعض افعال اختیاری بھی ہیں تو وہ اختیار کس طرح ہے حالانکہ "**وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ**" آیت بتارہی ہے کہ انسان کا ارادہ نہیں ہے سب کچھ مشیت الٰہی کے تحت چل رہا ہے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو توجیہ الارادہ کا اختیار دیا گیا ہے یعنی جب وہ ارادہ کرتا ہے اور توجہ کرتا ہے تو مشیت الٰہی سے اس کی موافقت آتی ہے اس توجہ اور اس ارادہ میں یہ انسان بااختیار ہے اور یہی اس کے لئے قدرت متوہمہ ہے اور اسی قدرت متوہمہ پر مواخذہ ہوتا ہے یعنی یہ انسان جب کوئی فعل کرنا یا نہ کرنا چاہتا ہے اور قدم اٹھاتا ہے تو

کوئی رکاوٹ نہیں انسان حرکت ارادی کرتا ہے اور ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق آتی ہے تو اس میں یہ مختار ہے مجبور نہیں ہے۔ یہ اس کا اپنا فعل ہے ہاں جو کچھ کرتا ہے اس کی لکھت پہلے سے ہے کیونکہ اللہ کا علم ازلی ہے اس نے اس شخص کے اس با اختیار فعل کو پہلے معلوم کیا اور پھر لکھا اب جو کچھ ظاہر ہو رہا ہے وہ اسی لکھت کے مطابق ہے اس کی ایک مثال یہ سمجھ لیں کہ ایک ڈاکٹر نے کسی مریض سے کہہ دیا کہ فلاں چیز کھاؤ گے تو مر جاؤ گے اس شخص نے وہ چیز کھالی اور مر گیا تو ڈاکٹر نے علامات اجمالیہ وجود یہ سے بتایا تھا کہ مرو گے اب جو مر گیا تو ڈاکٹر کے قول سے تو نہیں مرا نہ ڈاکٹر کے لکھنے سے مرا بلکہ وہ تو اپنے اس فعل سے مرا ہے جس سے ڈاکٹر نے منع کیا تھا۔

بعینہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے علم میں جو اجمال ہے جس کا نام تقدیر ہے وہ پہلے سے موجود ہے خارج میں پایا جانے والا فعل بندہ کا اپنا فعل ہے یہ بے شک تقدیر کے موافق ہے لیکن یہ شخص تقدیر کے ہاتھوں مجبور نہیں بلکہ تقدیر کی لکھت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس کے احوال کو آزاد ماحول میں دیکھ کر پھر لکھ دیا۔ چنانچہ اب جو کچھ ہو رہا ہے اسی کے مطابق ہو رہا ہے۔

اس کی دوسری مثال اس طرح ہے کہ مثلاً ایک ریلوے ٹائم ٹیبل ہے جس میں لکھا ہے کہ فلاں گاڑی فلاں ٹائم فلاں جگہ سے چلے گی فلاں ڈرائیور ہوگا فلاں جگہ اتنی دیر رکے گی فلاں اسٹیشن پر فلاں وقت پہنچے گی اتنا ایندھن کھائے گی وغیرہ وغیرہ اس طرح پورے دن اور پورے سفر کا ٹائم ٹیبل تیار ہو کر سامنے آگیا اور مرتب ہو کر موجود ہوا تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ گاڑی ٹھیک اسی ٹائم ٹیبل کے مطابق انہیں ہدایات پر چلتی ہے لیکن یہ ٹائم ٹیبل اس گاڑی کو نہیں چلاتا بلکہ ڈرائیور یا گاڑی کا سسٹم ہے جس سے وہ چلتی ہے بالکل اسی طرح لوح محفوظ ہے جس پر انسان کی تقدیر لکھی ہوئی ہے وہ انسان کی زندگی کا ٹائم ٹیبل ہے (جس کا نام قدر و تقدیر ہے) جس کے مطابق انسان کی زندگی کی یہ گاڑی اس کے اپنے کسب و اختیار سے سفر کر رہی ہے فرق اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم چونکہ محیط ہے تو انسانی گاڑی اس علم و تقدیر سے مخالف نہیں ہو سکتی اور ریل گاڑی کے پروگرام میں تخالف و تغیر آسکتا ہے کبھی آہستہ کبھی کیسا کبھی کیسا۔

ان تشریحات و توضیحات کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ جبریہ کا مذہب باطل محض ہے اور انہوں نے جس آیت سے استدلال کیا ہے اہل سنت والجماعۃ فرماتے ہیں کہ اس میں انسان کے لئے مستقل اختیار کی نفی ہے جیسا کہ معتزلہ انسان کے لئے مستقل اختیار کے قائل ہیں اس آیت میں اس ضعیف غیر مستقل محدود اختیار کی نفی نہیں ہوتی ہے جو دیگر نصوص اور عقل سلیم اور وجدان صحیح سے انسان کو حاصل ہے۔

۲ معتزلہ قدریہ کا مذہب:

ان کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں آزاد ہے کسی تقدیر کا پابند نہیں بلکہ اپنے افعال کا انسان خود خالق ہے پہلے سے کوئی لکھت نہیں ورنہ مواخذہ محال ہو جائے گا۔

یہ مذہب بھی صریح البطلان ہے اور جبریہ کی طرح یہ لوگ بھی اہل باطل ہیں ان کا یہ مذہب جبریہ کی ضد ہے ان کے مذہب

کے باطل ہونے پر بہت نصوص موجود ہیں چند آیات ملاحظہ ہوں۔

❶ "وما تشاؤن الا ان یشاء الله رب العالمین"۔ [1] (تکویر)

اس سے واضح معلوم ہوا کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں ہے۔

❷ "انا کل شیء خلقناه بقدر"۔ [2]

اس سے تقدیر کا ثبوت ہوتا ہے۔

❸ "قل لا املك لنفسی نفعًا ولا ضرًا الا ما شاء الله"۔ [3]

اس سے بھی تقدیر کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

پہلا جواب: اہل حق نے معتزلہ کو کئی جواب دیئے ہیں۔ پہلا جواب یہ کہ تمہارا عقیدہ صریح نصوص کے خلاف ہے۔

دوسرا جواب: یہ کہ تمہارے عقیدے کے پیش نظر انسانی تخلیقات اللہ تعالیٰ کی تخلیقات سے زیادہ ہوجائیں گی اور یہ باطل ہے لہٰذا تمہارا عقیدہ باطل ہے کیونکہ طاعات سے معصیات زیادہ ہیں تو انسانی تخلیقات زیادہ ہوجائیں گی۔

تیسرا جواب: یہ کہ تمہارے عقیدہ سے لازم آتا ہے کہ کچھ معاصی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر موجود ہو رہے ہیں جو موجب عجز یا نقص ہے حالانکہ معاصی طاعات پر غالب ہیں تو اکثری افعال اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر آ گئے اور یہ عقیدہ غلط ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ معتزلہ اس بات سے بچنا چاہتے ہیں کہ "شر" کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوجائے تو عجیب بات یہ ہے کہ گناہ کی طرف نسبت سے بچنے کی کوشش میں صریح شرک میں پڑ گئے اور کہا کہ خالق خود انسان ہے یہ لوگ اس مثال کے مصداق بن گئے۔

"**فر من المطر ووقف تحت المیزاب**" ہم الزامی جواب میں کہتے ہیں کہ ابلیس شر اور شرارت کا پتلا ہے اس کو کس نے پیدا کیا؟ کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کا کوئی اور خالق ہے جس نے اس کو پیدا کیا؟ تو تخلیق شر کمال ہے جیسا کہ تخلیق خیر کمال ہے ہاں کسب شر مذموم ہے۔

تاہم عموماً شر کی نسبت شیطان کی طرف کی جاتی ہے یا نفس کی طرف نسبت ہوتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی شان میں بے ادبی اور گستاخی نہ ہوجائے۔

دلچسپ مکالمہ:

عبد الجبار ہمدانی معتزلی، ابو اسحاق اسفرائنی کی مجلس میں آ کھڑے ہوئے اور کہا "**سبحان من تنزه عن الفحشاء**" یعنی

[1] سورہ دھر ۳۰ [2] قمر ۴۹ [3] اعراف ۸۸

گناہ کی نسبت اللہ کے حق میں فحشاء ہے اس سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ استاذ اسفرائنی نے فرمایا "**سبحان من لا یجری فی ملکه الا ما یشاء**" ہمدانی نے کہا "**ایشاء ربنا ان یعصی**" استاذ نے کہا "**ایعصی ربنا قسرا**" **فبهت**، ہمدانی کا مطلب یہ تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کی نافرمانی کی جائے تو استاد اسفرائنی نے جواب میں فرمایا کہ کیا یہ اللہ کی نافرمانی جبری طور پر ہوتی ہے؟ اس پر ہمدانی لاجواب ہو گئے۔

قرآن کریم کی کئی آیات سے تقدیر کا ثبوت ملتا ہے جس سے واضح طور پر معتزلہ کا مذہب باطل ہو جاتا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

انا کل شئی خلقناہ بقدر [۱] **یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب** [۲]

و کل شیء فعلوہ فی الزبر و کل صغیر و کبیر مستطر [۳]

ان واضح آیات اور احادیث کی تصریحات کے بعد معتزلہ کا تقدیر سے انکار محض خرافات اور عقل کا فقدان ہے۔

''شر'' کی تخلیق میں حکمت:

تمام عقلاء و حکماء اس پر متفق ہیں کہ دنیوی بادشاہ میں دو صفات کا موجود ہونا ضروری ہے ایک صفت لطف و کرم اور دوسری صفت قہر و جلال، اول اس لئے کہ اپنوں پر رحم کرے الطاف و مہربانیاں کرے اگر یہ صفت نہیں تو ایسے بخیل اور کنجوس کو کون بادشاہ بنائے گا اور اس کی بادشاہت کو کون تسلیم کرے گا ایسا شخص اگر بادشاہ بن بھی گیا تو یہ نقص اور عیب جلد ہی اس سے بادشاہت چھین لے گا۔ دوم صفت قہر بھی ضروری ہے تا کہ لوگ بے جا تعدی و تجاوز اور بے جا جرأت نہ کریں کسی نے کہا ہے:

لطف سجن دم بدم قہر سجن گاہ گاہ   یہ بھی سجن واہ واہ وہ بھی سجن واہ واہ

اللہ تبارک و تعالیٰ بادشاہ علی الاطلاق ہے اس کے لطف و کرم کی صفت کے مظہر فرشتے ہیں اور قہر و غضب کا مظہر شیطان ہے اسی طرح انسانوں میں ابرار صفت لطف و کرم کے مظہر ہیں اور فجار صفت قہر کے مظہر ہیں یہ اس لئے ضروری ہے تا کہ دونوں صفات کا ظہور ہو سکے، اسی طرح ایک ایسی جگہ بھی ہونی چاہئیے جہاں صفت لطف و کرم اور جمال کا ظہور ہو اور وہ جگہ جنت ہے۔ ایسے ہی ایک جگہ ایسی بھی ہونی چاہیے جہاں صفت قہر و غضب کا ظہور ہو اور وہ جگہ دوزخ ہے۔ تو جنت اور دوزخ کا وجود، ابرار و اشرار کا وجود، خیر اور شر کا وجود، شہنشاہ مطلق کے لئے ضروری ہے تا کہ دنیا کی گاڑی آزمائش کے میدان میں خیر اور شر کی دو پٹریوں پر رواں دواں رہے اور حق و باطل کا مقابلہ گرم ہو کیونکہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز   چراغ مصطفوی سے شرار ابو لہبی

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ ایک ہے تخلیق اور دوسرا ہے کسب، تخلیق شر محمود ہے اور کسب شر مذموم ہے دونوں کے جداگانہ احکام ہیں مگر دونوں کی تخلیق تو کمال ہے مجموعہ عالم کی ترتیب میں حسن تب ہی آتا ہے جب اس میں خیر و شر کے دونوں رنگ موجود ہوں۔

---

[۱] قمر ۴۹ [۲] رعد ۳۹ [۳] قمر ۵۲، ۵۳

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

بہر حال بادشاہ علی الاطلاق رب تعالیٰ کی شئون مختلفہ اور صفات متنوعہ کا تقاضا تھا کہ خیر بھی ہو اور شر بھی ہو ابرار بھی ہوں اور اشرار بھی ہوں جنت بھی ہو اور دوزخ بھی ہو اور ہر ایک کے لئے افراد بھی ہوں۔

در کار خانہ عشق از کفر ناگزیر است دوزخ کرا بسوزد گر بو لہب نہ باشد

تنبیہ:

تقدیر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تقدیر معلق ہے اور دوسری تقدیر مبرم ہے تقدیر معلق میں تغیر آتا ہے مگر تقدیر مبرم میں کبھی فرق اور تغیر نہیں آتا، ان دونوں کو اجل معلق اور اجل مبرم بھی کہتے ہیں۔

اجل معلق کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں ایک فیصلہ لکھ دیا ہو مگر اس کے ساتھ کچھ شرائط بھی رکھ دیں مثلاً یہ لکھا کہ فلاں شخص کی عمر ساٹھ سال ہوگی لیکن اگر اس نے والدین کی خدمت کی یا متقی پرہیز گار رہا تو اس کی عمر اسی سال ہو جائے گی قسم دوم اجل مبرم ہے یہ اللہ تعالیٰ کا وہ اٹل فیصلہ ہے جس میں جو کچھ مقرر اور متعین ہے اس میں کبھی بھی تغیر ممکن نہیں جو فیصلہ تقدیر مبرم میں ہو چکا ہے وہی ہو کر رہے گا۔

۵ محرم ۱۴۱۰ھ

الفصل الاول

کائنات کی تخلیق سے پہلے تقدیر لکھی گئی

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ قَالَ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا ہے اور فرمایا'' (اس وقت) اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔ (مسلم)

توضیح: ''کتب اللہ'' یہ لکھت کسی دیوان خاص میں تھی ورنہ تقدیر تو اللہ تعالیٰ کے علم ازلی ابدی اجمالی کا نام ہے جو وقت کا پابند نہیں نیز اس لکھت سے پہلے اللہ تعالیٰ کا علم آئندہ حالات پر محیط تھا وہ علام الغیوب ہے اس نے تفصیلی حالات کے دیکھنے کے بعد یہ اجمالی خاکہ لکھا۔

پھر اس کتاب کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے لکھا بلکہ قلم کو لکھنے کا حکم دیا بعض نے ''کتب'' کا مطلب یہ لیا

[1] اخرجہ مسلم ۸/۵۱

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے لئے تقدیر مقرر فرمادی عربی لغت میں کتب بمعنی تعین وتقرر آتا ہے۔[1]

"خمسین الف سنة" سوال یہ ہے کہ بعض روایات میں چالیس ہزار سال کا ذکر ہے جو بظاہر اس حدیث سے متعارض ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فرق مختلف امور کے اعتبار سے ہے بعض امور کو پچاس ہزار سال اور بعض کو چالیس ہزار سال پہلے لکھا گیا ہے۔

اب ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت زمین وآسمان نہیں تھے زمانہ نہیں تھا تو پچاس ہزار سال کا تعین کیسے ہوگیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کلام تخمینہ کے طور پر ہے ایک اندازہ ہے کہ اگر زمانہ ہوتا تو اتنا وقت ہوسکتا تھا۔[2]

"وکان عرشه علی المآء" علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عرش پانی پر رکھا ہوا تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے درمیان حائل نہیں تھا اس سے اللہ کی ایک قدرت بتلانا مقصود ہے کہ اوپر عرش ہے نیچے پانی ہے اور پانی کے نیچے ہوا ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر قائم ہے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں دنیا کا پانی مراد نہیں بلکہ عرش کے نیچے کا دریا مراد ہے جس سے بارش برستی ہے۔[3]

بعض کتابوں اور حواشی میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک موتی بنایا پھر ہیبت کی نگاہ اس پر ڈال دی وہ پانی ہو گیا اب نیچے صرف پانی تھا اور اوپر عرش تھا "وکان عرشه علی المآء" کا منظر تھا پھر اللہ تعالیٰ نے غضب کی نگاہ سے اس پانی کو دیکھا تو پانی ابل کر خشک ہوگیا نیچے کچھ تلچھٹ رہ گئی اور اوپر ایک دھواں اٹھا اسی دھوئیں سے بعد میں آسمان بنایا گیا ارشاد ہے "ثم استوی الی السماء وهی دخان"[4] پھر نیچے اس تلچھٹ سے زمین پھیلا دی گئی ارشاد عالی ہے "والارض بعد ذلك دحاها"۔[5]

ہر چیز تقدیر کے تحت ہے

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتّٰى الْعَجْزُ وَالْكَيْسُ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[6]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر چیز تقدیر سے ہوتی ہے یہاں تک کہ دانائی اور نادانی۔ (مسلم)

توضیح: اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ ہوشیاری اور کمزوری کی جو صفات ہیں یہ بھی تقدیر کے احاطہ سے باہر نہیں ہیں بلکہ قضاء وقدر انسان کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے صرف جنت ودوزخ تک تقدیر محدود نہیں بلکہ دنیا وآخرت کے تمام فیصلے اور تمام معاملات اسی قضا وقدر کے تحت ہیں۔

اب یہاں سوال یہ ہے کہ یہاں حدیث میں "عجز" کے مقابل "کیس" کا لفظ آیا ہے حالانکہ قاعدہ کے مطابق عجز کا

[1] المرقات ۱/۲۵۷ [2] المرقات ۱/۲۵۷، ۲۵۸ [3] المرقات ۱/۲۵۸
[4] سورۃ حم سجدہ ۱۱ [5] سورۃ النازعات ۳۰ [6] اخرجہ مسلم ۱/۵۱

مقابل ''قدرت'' ہے اور ''کیس'' کا مقابل ''بلادۃ'' ہے تو یہاں ایسا کیوں ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں فن بلاغت کے اصول کے تحت احد الضدین میں سے ایک کو ذکر کیا ہے اور اس پر اعتماد کرتے ہوئے دوسرے کو چھوڑا گیا ہے تو یہاں صنعت احتیاط سے کام لیا گیا ہے کہ **العجز** کو ذکر کر کے قدرت کو چھوڑا گیا اور الکیس کو ذکر کر کے بلادت کو چھوڑ دیا گیا ہے مراد احاطہ اور استغراق ہے عبارت اس طرح ہے **العجز والقدرۃ او الکیس والبلادۃ من قدرۃ اللہ**۔[1]

یعنی ضعف وقدرت ذکاوت و بلادت سب اللہ کے ہاں مقدر ہیں اور اسی کے مطابق ظاہر ہوتے ہیں حافظ تورپشتی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ **العجز** سے مراد عاجز و کمزور اور ضعیف ہے[2] اور **الکیس** سے مراد عقلمند آدمی ہے یعنی جو کوئی کمزور فی العقل والرائے ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے تقدیر کے تحت پیدا کیا اور جو الکیس اور چالاک وہوشیار مکار ہے اس کو بھی تقدیر کے تحت پیدا کیا گیا ہے کسی کمزور یا طاقت ور میں اپنی کوئی طاقت نہیں سب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے **لا حول ولا قوۃ الا باللہ**۔[3]

تقدیر میں دو نبیوں کی بحث

﴿۳﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِحْتَجَّ آدَمُ وَ مُوسٰى عِنْدَ رَبِّهِمَا فَحَجَّ آدَمُ مُوسٰى قَالَ مُوسٰى أَنْتَ آدَمُ الَّذِيْ خَلَقَكَ اللهُ بِيَدِهِ وَنَفَخَ فِيْكَ مِنْ رُوْحِهِ وَأَسْجَدَ لَكَ مَلَائِكَتَهُ وَأَسْكَنَكَ فِيْ جَنَّتِهِ ثُمَّ أَهْبَطْتَ النَّاسَ بِخَطِيْئَتِكَ إِلَى الْأَرْضِ قَالَ آدَمُ أَنْتَ مُوسٰى الَّذِي اصْطَفَاكَ اللهُ بِرِسَالَاتِهِ وَبِكَلَامِهِ وَأَعْطَاكَ الْأَلْوَاحَ فِيْهَا تِبْيَانُ كُلِّ شَيْءٍ وَقَرَّبَكَ نَجِيًّا فَبِكَمْ وَجَدْتَ اللهَ كَتَبَ التَّوْرَاةَ قَبْلَ أَنْ أُخْلَقَ، قَالَ مُوسٰى: بِأَرْبَعِيْنَ عَامًا قَالَ آدَمُ: فَهَلْ وَجَدْتَ فِيْهَا وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوٰى قَالَ نَعَمْ قَالَ أَفَتَلُوْمُنِيْ عَلٰى أَنْ عَمِلْتُ عَمَلاً كَتَبَهُ اللهُ عَلَيَّ أَنْ أَعْمَلَهُ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَنِيْ بِأَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَحَجَّ آدَمُ مُوسٰى۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[4]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (عالم ارواح میں) آدم و موسیٰ علیہما السلام نے اپنے پروردگار کے سامنے مناظرہ کیا اور حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ وہی آدم علیہ السلام ہیں جن کو خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا آپ میں اپنی روح پھونکی تھی۔ فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا تھا اور اپنی جنت میں آپ کو رکھا تھا اور پھر آپ نے اپنی خطا سے لوگوں کو زمین پر اتروا دیا۔ (یعنی اگر آپ خطا نہ کرتے تو یہاں زمین پر نہ اتارے جاتے اور آپ کی اولاد اس دنیا میں نہ پھیلتی بلکہ جنت میں رہتی) آدم علیہ السلام نے کہا تم وہی موسیٰ علیہ السلام تو ہو جن کو خدا نے اپنے منصب رسالت سے نواز کر برگزیدہ کیا اور ہم کلامی کے شرف سے مشرف فرمایا تھا۔ اور تم کو وہ تختیاں دی تھیں جن میں ہر چیز کا بیان تھا

[1] المرقات ۱/۲۵۸ [2] المرقات ۱/۲۵۸ [3] المرقات ۱/۲۵۸ [4] اخرجہ مسلم ۸/۵۰

اور پھر تم کو سرگوشی کے لئے قریب کرنے کی عزت بخشی تھی۔ پس کیا تم جانتے ہو خدا نے میری پیدائش سے کتنے عرصہ پہلے تورات کو لکھ لیا تھا موسیٰ علیہ السلام نے کہا چالیس سال پہلے، آدم علیہ السلام نے پوچھا کیا تم نے توریت میں یہ الفاظ لکھے ہوئے نہیں پائے **وعصی آدم ربہ فغوی** (یعنی آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بھٹک گیا)''۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہاں آدم علیہ السلام نے کہا پھر تم مجھ کو میرے اس عمل پر کیوں ملامت کرتے ہو جس کو خدا نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے میرے لئے لکھ دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا اس دلیل سے آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔

توضیح: احتج آدم وموسیٰ: یعنی دونوں کا مناظرہ ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ بحث ومباحثہ اور یہ مناظرہ ان دو نبیوں کا کہاں ہوا تو ایک احتمال یہ ہے کہ یہ مناظرہ عالم ارواح میں تجلیات رب میں ہوا حدیث میں "**عند ربھما**" لفظ موجود ہے، دوسرا احتمال یہ کہ یہ مکالمہ لیلۃ الاسری میں ہوا۔

"**بیدہ**" اور "**من روحہ**" میں اضافت تشریفیہ ہے۔[۱]

فحج آدم موسیٰ: یعنی آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر اس مناظرہ میں غالب آ گئے۔[۲]

"**فبکم**": یعنی میری پیدائش سے کتنے سال قبل اللہ تعالیٰ نے تورات لکھنے کا حکم دیا تھا؟[۳]

سوال: یہاں شبہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کا جواب اللہ تعالیٰ کے سامنے تقدیر کا حوالہ دے کر دیا اس سے معاصی کا دروازہ کھل جائے گا کیونکہ ہر مجرم تقدیر کا حوالہ دے کر کہے گا چلو جو گناہ میں نے کیا ہے تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا میرا اس میں کیا قصور ہے؟

جواب: اس سوال کا حقیقت پر مبنی جواب تو یہ ہے کہ تقدیر مصائب کے آنے کے بعد تسلی اور اطمینان اور سکون کے لئے ہوتی ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے درد اور مصائب کا اظہار فرمایا کہ دیکھو آپ نے لغزش کھائی سارا عالم آلام و مصائب میں مبتلا ہو گیا حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا کہ ہاں ایسا ہی ہوا لیکن کیا کریں تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا اب ان مصائب پر صبر ہی کرنا چاہیئے گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عمل پر اعتراض نہیں کیا صرف اظہار ہمدردی اور اظہار مصیبت کیا، مگر ظاہری نظر میں جب دیکھتے اور سنتے ہیں تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اعتراض ہے تو اس کا جواب تین مقدمات کے سمجھنے پر موقوف ہے۔

پہلا مقدمہ:

یہ کہ یہ سوال عالم ارواح میں ہوا ہے عالم اسباب میں نہیں۔

دوسرا مقدمہ:

یہ کہ بظاہر یہ اعتراض قبولیت توبہ کے بعد ہوا ہے۔

تیسرا مقدمہ:

یہ کہ مجرم کو ملامت کرنا عالم اسباب میں ہوتا ہے تاکہ خود مجرم توبہ کر کے باز آ جائے اور دوسرے لوگ عبرت پکڑیں۔

---

[۱] المرقات ۱/۲۵۹ [۲] المرقات ۱/۲۵۹ [۳] المرقات ۱/۲۶۱

جب یہ تین مقدمات تیار ہوگئے تو اب جواب سنو، عالم ارواح میں قبولیت توبہ کے بعد مجرم کے باز آنے کے امکان کے بغیر یا کسی کے فائدے اور حصول عبرت کے بغیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ کلام بظاہر محض الزام تھا جس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام نے بھی احتجاج بالتقدیر کر کے جواب دیا کہ میرا کیا قصور تھا تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا گویا آپ نے اشارہ کردیا کہ عالم ارواح میں قبول توبہ کے بعد غرض اصلاح کے بغیر سابقہ معصیت پر ملامت کرنے والے کا یہی جواب ہوسکتا ہے۔

عصی آدم اور **غوی آدم** کے جو الفاظ ہیں یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک مقرب بندے کے لئے **حسنات الابرار سیئات المقربین** کے اصول کے تحت معمولی لغزش پر شدید نکیر کے طور پر استعمال فرمائے ہیں کوئی انسان اس سے دھوکہ نہ کھائے اور خود اس طرح تبصرے ان نفوس قدسیہ کے خلاف شروع نہ کرے۔[1]

تقدیر کا لکھا ہوا غالب آتا ہے

﴿۵﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ إِنَّ خَلْقَ أَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِيْ بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللهُ إِلَيْهِ مَلَكًا بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ فَيَكْتُبُ عَمَلَهُ وَأَجَلَهُ وَرِزْقَهُ وَشَقِيٌّ أَوْ سَعِيْدٌ ثُمَّ يَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ فَوَالَّذِيْ لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صادق و مصدوق سرکار دو عالم ﷺ نے ہم سے فرمایا تم میں سے ہر شخص کی تخلیق اس طرح ہوتی ہے کہ (پہلے) اس کا نطفہ ماں کے پیٹ میں چالیس دن جمع رہتا ہے پھر اتنے ہی دنوں یعنی چالیس دن کے بعد وہ جما ہوا خون بنتا ہے پھر اتنے ہی دنوں کے بعد وہ لوتھڑا بن جاتا ہے، پھر خداوند تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتے کو چار باتوں کے لکھنے کے لئے بھیجتا ہے۔ چنانچہ وہ فرشتہ اس کا عمل، اس کی موت (کا وقت) اس کے رزق (کی مقدار) اور اس کا بدبخت و نیک ہونا (خدا کے حکم سے) اس کی تقدیر میں لکھ دیتا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تم میں سے ایک آدمی جنتیوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا آگے آتا ہے اور وہ دوزخیوں کے سے اعمال کرنے لگتا ہے اور دوزخ میں داخل ہوجاتا ہے۔ اور تم میں سے ایک آدمی دوزخیوں کے سے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ہاتھ بھر کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا سامنے آتا ہے اور

[1] المرقات ۱/۲۶۲ [2] اخرجہ البخاری ۴/۱۳۵، ۱۶۱ ومسلم ۸/۴۴

وہ جنتیوں کے سے کام کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

توضیح: حدثنا رسول الله: یہاں حدثنا کا وہ مبارک لفظ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے استعمال کیا ہے جو لاکھوں اولیاء اللہ اور محدثین عظام نے حرز جان بنایا ہے پھر لطف یہ کہ محدث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ اسی طرح واقعہ دجال کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مبارک لفظ کو "حدثنی تمیم الداری" فرما کر استعمال فرمایا ہے یہ محدثین کرام اور شیوخ الحدیث کے لئے بڑا اعزاز ہے۔

وهو الصادق المصدوق: بعض دفعہ ایک آدمی سچا ہوتا ہے مگر لوگ اسے سچا نہیں سمجھتے ہیں تو فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سچے بھی ہیں اور دنیا والے آپ کو سچا سمجھتے بھی ہیں چنانچہ کفار قریش آپ کو صادق الامین کہا کرتے تھے اور مکہ سے ہجرت کے آخری دن تک اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھتے تھے دشمنی اور زبانی عداوت اپنی جگہ پر تھی مگر قلب و دماغ کے اعتبار سے کفار آپ کو سب سے زیادہ سچا سمجھتے تھے یہ جملہ معترضہ ہے حالیہ نہیں ہے کیونکہ حال تو ایک حالت کے ساتھ وابستہ رہتا ہے یہاں صدق تمام شعبوں کو عام ہے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ **الصادق** کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام افعال میں سچے تھے یہاں تک کہ قبل نبوت بھی آپ سچے تھے اور **المصدوق** کا مطلب یہ کہ آنے والے تمام واقعات اور وحی کی تمام تفصیلات میں آپ سچے تھے یہاں پر یہ سوال ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی دیگر حدیثوں اور روایات میں یہ جملہ نہیں ہے تو یہاں اس کو کیوں ذکر کیا ہے۔[1]

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں چونکہ امور باطنیہ پر کلام تھا اور اشیاء مستورہ سے متعلق گفتگو تھی کسی کے لئے مشاہدہ ممکن نہ تھا نیز بعض اطباء نے اس کلام کو اپنے قواعد کے خلاف جانا ہے تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ شک کی گنجائش نہیں تمہارے قواعد کچھ بھی ہوں مگر یہ صادق و مصدوق کا کلام ہے۔ حقیقت وہی ہے جو صادق و مصدوق نے فرمایا ہے علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "**فما احسن موقعه هنا**"۔[2]

یجمع فی بطن امه: حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ذکر کی ہے جس میں مذکور ہے کہ نطفہ چالیس روز تک بچہ کی ماں کے تمام جسم میں حتیٰ کہ ہر ہر بال اور ہر ہر ناخن کے تحت گردش کرتا ہے اور اس کے بعد خون کی شکل میں رحم میں جا کر قرار پکڑتا ہے اسی حقیقت کو اس روایت میں **یجمع فی بطن امه** میں ذکر کیا گیا ہے۔[3]

فیعمل: اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے یہ تھا کہ یہ آدمی اپنے کسب و اختیار سے یہ فعل کرے گا جس کی وجہ سے مستحق جنت یا دوزخ بنے گا اس کے بعد لوح محفوظ میں بطور تقدیر لکھا گیا، فرشتے شکم مادر میں بچے سے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں وہ اسی تقدیر کے مطابق لوح محفوظ سے لے کر لکھتے ہیں۔ **فیعمل** سے یہ اشارہ کر دیا گیا کہ بندے کا کسب دخول جنت اور دخول دوزخ کے لئے ضروری سبب ہے صرف تقدیر کی لکھت پر دخول نہیں تو انسان نہ مجبور ہوا نہ مختار رہا۔

---

[1] المرقات ۱/۲۶۲ [2] الکاشف [3] المرقات ۱/۲۶۳

یہاں شبہ یہ ہے کہ بعض روایات میں پانچ کلمات کا ذکر ہے یہاں چار کا ذکر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اختصار راوی کی وجہ سے ہے کسی نے چار اور کسی نے پانچ کا ذکر کیا ہے۔

باقی بچہ کی پیدائش اور تخلیق کی یہ مرحلہ وار ترتیب اور یہ تدریجی عمل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ کو بھی ہر عمل تدریج کے ساتھ کرنا چاہئے نیز اس میں یہ حکمت ہے کہ تدریجی عمل سے بچہ کی ماں پر ایک دم بوجھ نہیں آئے گا۔[1]

فیسبق علیه الکتاب: معلوم ہوا اعمال امارات وعلامات اور اسباب ہیں اصل فیصلہ تقدیر الٰہی کی وجہ سے ہوتا ہے تو آخر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔[2]

فیدخلها: اس حدیث میں سالک کے لئے تنبیہ ہے کہ ہر وقت خوف ورجاء میں رہے عجب وتکبر اور برے اعمال سے اجتناب کرے اصل اعتبار خاتمہ کا ہے۔[3]

خاتمہ کا اعتبار ہے

﴿۵﴾ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ النَّارِ وَإِنَّهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَيَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ وَإِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[4]

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقائے نامدار ﷺ نے فرمایا بندہ دوزخیوں کے سے کام کرتا رہتا ہے لیکن وہ جنتی ہوتا ہے۔ اور جنتیوں کے سے کام کرتا رہتا ہے لیکن وہ دوزخی ہوتا ہے کیونکہ نجات وعذاب کا دارومدار خاتمہ کے عمل پر ہے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: لیعمل: یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ہر آدمی اپنے کسب واختیار سے یہ فعل کرے گا تو اگرچہ ظاہر میں وہ اہل جنت سے نظر آرہا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق وہ دوزخی تھا اور آخر میں اس نے اہل دوزخ کا عمل اپنے کسب واختیار سے کیا تو اہل دوزخ سے ہوا اسی طرح معاملہ دوسرے رخ کا بھی ہوا، تو دارومدار اعمال کے خاتمہ پر ہے تو عالم غیب میں کسی کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ دوزخی یا جنتی ہے یہ مطلب نہیں کہ کسی مسلمان کو خاتمہ کے اعتبار سے مسلمان کہنا چھوڑ دو، جب وہ پابند شریعت ہے تو معاملہ مسلم کا ہوگا ہاں عالم غیب کی بات الگ ہے وہاں کا فیصلہ کسی کافر مسلم کے لئے ابھی سے نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ دارومدار خاتمہ پر ہے حدیث نے طاعات کی کثرت کی تعلیم دے دی ہے اور عجب وتکبر سے روکدیا ہے نیز ظاہری اعمال کی وجہ سے کسی پر اہل جنت یا اہل نار کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے ظاہری اعمال صرف علامات ہیں، اصل فیصلہ وہی ہے جو تقدیر کر چکی ہے۔[5]

---

[1] المرقات ۱/۲۶۷ [2] المرقات ۱/۲۶۷ [3] المرقات ۱/۲۶۷

[4] اخرجه البخاری ۴/۴۴ ومسلم ۱/۴۲ [5] المرقات ۱/۲۶۸

کسی پر یقینی حکم نہیں لگانا چاہیے

﴿۶﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دُعِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلٰی جَنَازَةِ صَبِیٍّ مِنَ الْاَنْصَارِ فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ طُوْبٰی لِهٰذَا عُصْفُوْرٌ مِنْ عَصَافِیْرِ الْجَنَّةِ لَمْ یَعْمَلِ السُّوْءَ وَلَمْ یُدْرِکْهُ فَقَالَ اَوْ غَیْرُ ذٰلِكِ یَا عَائِشَةُ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ لِلْجَنَّةِ اَهْلاً خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِیْ اَصْلَابِ اٰبَائِهِمْ وَخَلَقَ لِلنَّارِ اَهْلاً خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِیْ اَصْلَابِ اٰبَائِهِمْ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[۱]

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک انصاری بچہ کے جنازہ پر سرکار دو عالم ﷺ کو بلایا گیا میں نے کہا یا رسول اللہ! اس بچہ کو خوشخبری ہو یہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے۔ جس نے کوئی برا کام نہیں کیا اور نہ برائی کی حد تک پہنچا آنحضرت ﷺ نے فرمایا، عائشہ کیا اس کے سوا اور کچھ ہوگا؟ یعنی اس کے جنتی ہونے کا جزم و یقین نہ کرو (کیونکہ) خدا نے جنت کے لئے مستحق لوگوں کو پیدا کیا ہے جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے اور دوزخ کے لئے بھی مستحق پیدا کیا ہے جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے۔ (مسلم شریف)

توضیح: عصفور من عصافیر الجنة: یہ تشبیہ نہیں کیونکہ جنت میں مشبہ بہ کے لئے عصافیر چڑیوں کا وجود نہیں ہے اسی طرح یہ کوئی استعارہ وغیرہ نہیں ہے بلکہ یہ کلام ایک دعویٰ ادعاء پر مبنی ہے کہ پہلے دعویٰ کیا گیا کہ جنت میں چڑیاں ہیں اور پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے دی گئی، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا خیال تھا کہ یہ جنتی ہے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ بلیغ ہے اور جنت میں عصافیر کا ہونا "**ولحم طیر مما یشتهون**" سے ثابت ہے۔[۲]

فقال او غیر ذلك: ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مشہور روایت کے مطابق یہ عبارت "واؤ" کے فتحہ "را" کے ضمہ اور "کاف" کے کسرہ کے ساتھ ہے گویا واؤ حالیہ ہے اصل عبارت اس طرح ہے "**اتعتقدین ما قلت والحق غیر ذلك**" اور وہ یہ کہ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بچہ اہل جنت میں سے ہے، یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ آپ ﷺ پر اطفال کے بارے میں کوئی وحی نہیں آئی تھی بعد میں وحی آئی کہ اطفال جنت میں ہوں گے یا نبی اکرم ﷺ نے یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ تعلیم دے دی کہ بغیر کسی قطعی علم کے قطعی حکم اور قطعی فیصلہ مناسب نہیں کیونکہ بچہ والدین کے تابع ہوتا ہے ہوسکتا ہے کہ باپ کا خاتمہ بالخیر نہ ہو بلکہ کچھ اور ہو۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے "**اوغیر ذلك**" میں واؤ کو 'او' کے معنی میں بھی لیا ہے یعنی "**الواقع هذا او غیر ذلك**" ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ واؤ بل کے معنی میں ہو۔[۳]

اصلاب آبائهم: یعنی اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں پہلے سے یہ معلوم تھا کہ یہ لوگ دوزخی ہیں یا جنتی ہیں اصلاب آباء کے

---

[۱] اخرجه مسلم: ۸/۵۴ [۲] المرقات ۱/۲۶۹ [۳] المرقات ۱/۲۷۰ والکاشف: ۱/۲۴۱

وقت سے معلوم تھا اور اسی طرح لوح محفوظ میں بھی لکھا گیا لیکن یہ سب کچھ ان اشخاص کے تفصیلی اعمال کو تفصیلاً دیکھ کر لکھا گیا ہے بالآخر وہ لوگ اپنے کسب واختیار سے اور اپنے افعال واعمال کی وجہ سے اپنے اپنے مقام پر جائیں گے۔[1]

۶ محرم ۱۴۱۰ھ

جنت ودوزخ میں ہر ایک کا ٹھکانہ لکھا گیا ہے

﴿۷﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ قَالُوا يَارَسُوْلَ اللهِ أَفَلَا نَتَّكِلُ عَلَى كِتَابِنَا وَ نَدَعُ الْعَمَلَ قَالَ اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ أَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ وَأَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ الشَّقَاوَةِ ثُمَّ قَرَأَ فَأَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى اَلْآيَةَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص کی جگہ اللہ تعالیٰ نے جنت ودوزخ میں لکھ دی ہے (یعنی یہ معین ہو گیا کہ کون لوگ جنتی اور کون لوگ دوزخی ہیں) صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا ہم اپنے نوشتہ تقدیر پر بھروسہ کر بیٹھیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں آپ نے فرمایا تم عمل کرو اس لئے کہ جو شخص جس چیز کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس پر اسے آسانی اور توفیق دی جاتی ہے لہٰذا جو شخص نیک بختی کا اہل ہوتا ہے خدا اس کو نیک بختی کے اعمال کی توفیق دیتا ہے۔ اور جو شخص بدبختی کا اہل ہوتا ہے اس کو بدبختی کے اعمال کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے یہ آیت پڑھی (ترجمہ) جس نے خدا کی راہ میں دیا، پرہیزگاری کی اور اچھی بات (دین اسلام) کو سچ مانا اس کے لئے ہم آسانی کی جگہ (جنت) آسان کر دیں گے لیکن جس نے بخل کیا اور خواہشات نفسانی اور دنیاوی چمک دمک میں پھنس کر آخرت کی نعمتوں سے بے پرواہی کی، نیز عمدہ بات (دین اسلام) کو جھٹلایا تو اس کے لئے ہم مشکل جگہ (دوزخ کی راہ) آسان کر دیں گے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: کتب مقعدہ من النار: یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی محیط میں لکھا کہ اس شخص کا اپنے کسب واختیار کے ساتھ خاتمہ کفر پر ہوگا تو اس کا ٹھکانہ جہنم لکھ دیا یا اپنے کسب واختیار سے خاتمہ ایمان پر ہوگا تو ٹھکانہ جنت لکھ دیا۔[3]

قال اعملوا: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق صحابہ کرام کے سوال کا منشاء یہ تھا کہ انہوں نے خیال کیا کہ جب ہر شخص کا ٹھکانہ پہلے سے جنت یا دوزخ ہے تو اعمال کی کیا ضرورت رہی اس لئے انہوں نے ترک عمل کی اجازت مانگی آنحضرت ﷺ نے جواب میں عمل کی ترغیب دی اور اہمیت بتائی کہ عمل اور عبادت ومعبودیت حق الوہیت ہے تو عبدیت کا تقاضا یہی ہے کہ عمل میں مشغول رہو اور اس سے اپنے آپ کو بری الذمہ خیال نہ کرو، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لئے ایک ٹھکانہ لکھا ہے لیکن تمہارے اعمال اس ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے ظاہری اسباب ہیں اور ہر شخص کو اس کے ٹھکانے کے

---

[1] المرقات ۱/۲۷۰ [2] اخرجہ البخاری ۲/۱۲۰ ومسلم ۸/۴۶ [3] المرقات ۱/۲۷۲

مطابق اعمال کی توفیق دی جاتی ہے تو اعمال علت نہیں مگر علامت ضرور ہیں کہ یہ شخص کس قسم کے ٹھکانہ کی تیاری میں لگا ہوا ہے تو ہر ایک کے عمل سے اس کے انتہاء سفر کا پتہ چلے گا۔ "ان خیرا فخیر وان شرا فشر" تو تقدیر تعطل اعمال کا ذریعہ نہیں بلکہ تیزی اعمال کا سبب ہے۔[1]

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ یہاں اصل میں دو چیزیں ہیں ایک تقدیر الٰہی ہے جو امر باطنی ہے اور یہی چیز موثر حقیقی ہے اور دخول جہنم یا جنت کا ذریعہ ہے دوسرا امر ظاہری ہے جو بندہ کے اعمال ہیں جو تقدیر پر مرتب ہونے کے لئے امارت ظاہریہ اور علامات ظاہریہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور خود فی نفسہ علت نہیں ہیں صحابہ نے چاہا کہ اس امر ظاہری یعنی اعمال کو چھوڑ کر امر باطنی یعنی تقدیر پر اکتفا کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ صحیح نہیں بلکہ اس امر ظاہری کو اختیار کرو کیونکہ اس سے امر باطنی کے لئے آسانی پیدا کی جاتی ہے اور اس کو امر باطنی پر بطور دلیل اور قرینہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

بدکاری کے مراتب

﴿۸﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم إِنَّ اللهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزِّنَا أَدْرَكَ ذٰلِكَ لَا مُحَالَةَ فَزِنَا الْعَيْنِ النَّظَرُ وَزِنَا اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَمَنّٰى وَتَشْتَهِيْ وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ وَيُكَذِّبُهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ كُتِبَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ نَصِيْبُهُ مِنَ الزِّنَا مُدْرِكٌ ذٰلِكَ لَا مُحَالَةَ الْعَيْنَانِ زِنَاهُمَا النَّظَرُ وَالْأُذُنَانِ زِنَاهُمَا الْإِسْتِمَاعُ وَاللِّسَانُ زِنَاهُ الْكَلَامُ وَالْيَدُ زِنَاهَا الْبَطْشُ وَالرِّجْلُ زِنَاهَا الْخُطَا وَالْقَلْبُ يَهْوٰى وَيَتَمَنّٰى وَيُصَدِّقُ ذٰلِكَ الْفَرْجُ وَيُكَذِّبُهُ.[2]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خدا نے انسان کی تقدیر میں جتنا حصہ زنا کا لکھ دیا ہے وہ ضرور اس کے عمل میں آئے گا، آنکھوں کا زنا (تو نامحرم کی طرف) دیکھنا ہے اور زبان کا زنا (نامحرم عورت سے شہوت انگیز) باتیں کرنا ہے۔ اور نفس آرزو و خواہش کرتا ہے اور شرم گاہ اس آرزو کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت ہے کہ آدمی کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصہ لکھ دیا گیا ہے وہ اس کو ضرور عمل میں لائے گا آنکھوں کا زنا (نامحرم کی طرف) دیکھنا ہے کانوں کا زنا (نامحرم عورت سے) شہوت انگیز باتیں سننا ہے۔ اور زبان کا زنا (نامحرم عورت سے شہوت انگیز) باتیں کرنا ہے اور ہاتھوں کا زنا (نامحرم عورت کو برے ارادہ سے) چھونا ہے پاؤں کا زنا (بدکاری کی طرف) جانا ہے اور دل خواہش و آرزو کرتا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔

توضیح: ان الله کتب الخ: حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "کتب" ثبت کے معنی میں ہے فرض اور واجب کے معنی میں نہیں ہے مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم میں ایسے حواس پیدا کئے ہیں جن کے ذریعہ سے وہ لذت زنا محسوس کرتا ہے اور اس کے بعد وہ فرج کے ذریعہ سے اس کی تکمیل کرتا ہے اب اگر اس نے عملاً زنا کیا تو حواس کے ان لذائذ

[1] الکاشف ۱/۲۴۳، ۲۴۴ [2] اخرجہ البخاری ۸/۶۸ ومسلم ۸/۵۲

کے بارے میں یہ فرج کی طرف سے تصدیق ہوئی اور اگر زنا کا اصلاً ارتکاب نہ کیا تو حواس کے بارے میں یہ فرج کی طرف سے تکذیب ہوئی "والفرج یصدق ذلك ویکذبه" کا یہی مطلب ہے۔[1]

بعض حضرات نے "کتب" کو "قدر" کے معنی میں لیا ہے "ای قدر فی الازل ان یجری علی ابن آدم الزنا" اس تقدیر ازلی سے وہ انسان اپنے کسب و اختیار سے اس قسم زنا کا ارتکاب کرے گا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زنا کے کئی مراتب ہیں جو زنا دون زنا ہے ایک زنا حظّ العین ہے ایک حظّ اللسان ہے ایک حظّ القلب ہے ایک زنا حظّ الاذنین ہے، ان سب کے آخر میں زنا کا آخری اور عملی درجہ ہے جس کو زنا بالفرج کہا جاتا ہے اس آخری درجہ میں جو مبتلا ہوا تو یہ الفرج یصدقه کا مصداق ہے اور جو اس آخری درجہ میں مبتلا ہونے سے بچ گیا تو یہ الفرج یکذبه کا مصداق ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس آخری درجہ کے عملی زنا سے پہلے وسائل اور ذرائع و اسباب ہیں جو صغائر میں داخل ہیں تاہم اگر آخری درجہ محقق ہو گیا تو وسائل کے تمام درجات کبائر میں شمار ہوں گے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک چور مسجد میں چوری کے لئے گیا مگر پھر اپنا ارادہ بدل کر توبہ کی تو سابقہ درجات کے تمام وسائل معاف ہوں گے اور اگر چوری کر لی تو سابقہ تمام اسباب بھی اس کے ساتھ چوری میں شمار ہوں گے اس حدیث سے قرآن عظیم کی آیت "الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم"[2] کی تفسیر مفسرین نے کی ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللمم کی سب سے اچھی تفسیر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔

المنطق: اجنبیات سے دل لگا کر شہوت انگیز باتیں کرنا مراد ہے۔[3]

یہ حدیث مسلمانوں کو آنکھ کان زبان "کہ ہاتھ اور دل کے زنا سے باز رکھنے کی تعلیم دے رہی ہے حالانکہ لوگ ان چیزوں کو زنا میں شمار نہیں کرتے بلکہ صرف عملی زنا کو جرم سمجھتے ہیں۔

نوشتہ تقدیر واقعات کے ظہور سے پہلے ہے

﴿۹﴾ وَعَنْ عِمْرَانَ ابْنِ حُصَيْنٍ أَنَّ رَجُلَيْنِ مِنْ مُزَيْنَةَ قَالَا يَا رَسُوْلَ اللهِ أَرَأَيْتَ مَا يَعْمَلُ النَّاسُ الْيَوْمَ وَيَكْدَحُوْنَ فِيْهِ أَشَيْءٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ وَمَضٰى فِيْهِمْ مِنْ قَدَرٍ سَبَقَ أَوْ فِيْمَا يُسْتَقْبَلُوْنَ بِهِ مِمَّا أَتَاهُمْ بِهِ نَبِيُّهُمْ وَثَبَتَتِ الْحُجَّةُ عَلَيْهِمْ فَقَالَ لَا بَلْ شَيْءٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ وَمَضٰى فِيْهِمْ وَتَصْدِيْقُ ذٰلِكَ فِيْ كِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[4]

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہ مزینہ کے دو شخص بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں یہ بتائیے کہ آج (دنیا میں) لوگ عمل کرتے ہیں اور اعمال کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کیا یہ وہی شئی

[1] المرقات ۱/۲۶۳ [2] سورة النجم الایہ ۳۲ [3] المرقات ۱/۲۶۳ [4] اخرجه مسلم ۸/۴۸

ہے جس کا حکم ہو چکا ہے اور نوشتہ تقدیر بن چکا ہے یا یہ عمل ان احکام کے موافق ہے جو آئندہ ہونے والے ہیں جن کو ان کا نبی لایا ہے اور جن پر دلیل قائم ہو چکی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نہیں یہ وہی شے ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے اور نوشتہ تقدیر بن چکا ہے اور اس کی تصدیق کتاب اللہ کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ **ونفس وما سواها فالهمها فجورها وتقواها۔** **(مسلم)**

توضیح: ارأیت: یہ کلمہ اخبرنی کے معنی میں ہے۔[۱] "یکدحون": کدح اس محنت و مشقت کو کہتے ہیں جس سے جسم میں نشان پڑ جائے۔[۲]

من قدر سبق: اس جملہ میں کلمہ من آیا ہے اس میں دو احتمال ہیں اول احتمال یہ کہ یہ بیان کے لئے ہے اس صورت میں قضاء اور قدر دونوں ہم معنی ہوں گے اور یہی معنی راجح بھی ہے۔ یا یہ، من، تعلیلیہ ہوگا "**ای قضی علیهم القضاء لاجل قدر سبق او فیما یستقبلون به**" **یستقبلون** کا صیغہ مشکوٰۃ شریف میں معروف پڑھا گیا ہے ہاں مسلم میں مجہول پڑھا گیا ہے۔

مما اتاهم به نبیهم: ای من الاحکام الشرعیة التکلیفیة وثبتت الحجة علیهم من الشارع ان دو اشخاص کے سوال کے دو شقوں میں سے حضور اکرم ﷺ نے اول شق کو اختیار کر کے جواب ارشاد فرمایا کہ جو کچھ رونما ہو کر آئندہ آ رہا ہے وہ سابقہ قضا و قدر کے تحت آ رہا ہے، اس پر بطور دلیل آپ ﷺ نے یہ آیت پیش فرمائی "**فالهمها فجورها وتقواها**" اس میں **الهمها** ماضی کا صیغہ ہے جس سے قضا و قدر کی سابقیت کی طرف اشارہ ہے۔[۳]

اس روایت کی ابتدائی عبارت میں ترکیب کو سمجھنے کے لئے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی **اخبرنی ای ما یعمل الیوم یجتهدون فیه اشئ یعنی اهو شئ قضی الخ** تو **هو** مبتدا ہے اور **شئی** اس کی خبر ہے، حدیث پاک کا حاصل مطلب یہ ہوا کہ پوچھنے والوں نے یہ پوچھا کہ پہلے سے کچھ لکھت یا تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے یا معاملہ نیا ہے آنحضرت ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ ہاں پہلے سے لکھت ہے پھر آپ ﷺ نے آیت سے استدلال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں پہلے سے سب کچھ مقدر ہو چکا ہے اور ماضی کا صیغہ اس پر دلیل ہے۔

تقدیر میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا

﴿۱۰﴾ وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ رَجُلٌ شَابٌّ وَاَنَا اَخَافُ عَلٰى نَفْسِي الْعَنَتَ وَلَا اَجِدُ مَا اَتَزَوَّجُ بِهِ النِّسَاءَ كَاَنَّهُ يَسْتَاْذِنُهُ فِي الْاِخْتِصَاءِ قَالَ فَسَكَتَ عَنِّي ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَكَتَ عَنِّي ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَكَتَ عَنِّي ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ فَاخْتَصِ عَلٰى ذٰلِكَ اَوْ ذَرْ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[۴]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ میں ایک جوان مرد

[۱] المرقات ۱/۲۷۶ [۲] المرقات ۱/۲۷۶ [۳] المرقات ۱/۲۷۶ [۴] اخرجه البخاری ۶/۵۹

ہوں اور میں اپنے نفس سے ڈرتا ہوں کہ بدکاری کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ اور میرے اندر اتنی استطاعت نہیں ہے کہ کسی عورت سے شادی کروں۔ گویا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے اندر سے قوت مردی ختم کردینے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے یہ سن کر سکوت فرمایا میں نے دوبارہ یہی کہا تو آپ ﷺ پھر خاموش رہے۔ میں نے پھر عرض کیا اس مرتبہ بھی آپ نے کچھ نہیں فرمایا۔ میں نے پھر اسی طرح عرض کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ابو ہریرہ جو کچھ ہونا ہے (اسے تمہارے مقدر میں لکھ کر) قلم خشک ہو چکا ہے۔ لہٰذا تمہیں اختیار ہے کہ قوت مردی ختم کرو یا نہ کرو۔ (بخاری)

توضیح: العنت: گناہ اور فجور وزنا کے معنی میں ہے۔[1]

ولا اجد ما اتزوج اس سے مراد نفقہ واجبہ ہے "**کانه یستأذنه فی الاختصاء**" یہ بیچ میں راوی کا کلام ہے۔

الاختصاء: خصیتین نکالنے کے معنی میں ہے۔[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بار بار سوال کے باوجود حضور اکرم ﷺ کا جواب نہ دینا اظہار کراہت کے لئے اور قباحت عمل کی وجہ سے تھا مگر آخر میں اسلوب حکیم کے طور پر فرمایا۔

جف القلم بما انت لاق: علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ **جف القلم** کنایہ ہے کہ مقدرات کی کتابت سے قلم فارغ ہو کر خشک ہو گیا ہے اب وہی چیز تفصیل میں آئے گی جو پہلے سے تقدیر میں لکھی جا چکی ہے اس لئے تمہارا اختصاء (خصی بننا) بیکار اور لایعنی ہے۔

اختص علی ذلك او ذر: اس کلام میں اختصاء کی اجازت نہیں بلکہ زجر و توبیخ اور ملامت و ناراضگی ہے کہ تقدیر میں جو لکھا ہے وہی ہوگا تو جو چاہو کرو "**او ذر**" میں **او** تسویہ اور برابری کے لئے ہے کہ تقدیر کے سامنے دونوں برابر ہیں آنحضرت ﷺ کا سکوت بھی ناراضگی پر دلالت کرتا ہے۔[3]

انسان ہر وقت خطرہ میں ہے

﴿۱۱﴾ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ قُلُوْبَ بَنِيْ آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ كَقَلْبٍ وَاحِدٍ يُصَرِّفُهُ كَيْفَ يَشَاءُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[4]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمام انسانوں کے دل خدا کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان اس طرح ہیں کہ جیسے ایک انسان کا دل ہے اور وہ (اپنی انگلیوں سے) جس طرح چاہتا ہے قلوب کو گردش میں لاتا ہے اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے (دعا کے طور پر یہ) فرمایا اے دلوں کو گردش میں لانے والے خدا ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ (مسلم)

[1] المرقات ۱/۱۶۸ [2] المرقات ۱/۱۶۸ [3] المرقات ۱/۱۶۸ [4] اخرجه مسلم: ۸/۵۱

توضیح: کلھا کی ضمیر قلوب کی طرف راجع ہے اس حدیث میں تعمیم ہے کہ **انبیاء اولیاء صلحاء** اور ابرار و اشرار سب کے دل اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔ [۱]

بین اصبعین: متشابہات دو قسم پر ہیں ایک معلوم المعنی غیر معلوم المراد ہیں جیسے **ید، وجہ، اصبع،** دوم غیر معلوم المعنی و المراد ہیں جیسے حروف مقطعات جو سورتوں کی ابتداء میں آتے ہیں۔

دونوں قسموں میں متقدمین کا مذہب یہ ہے کہ ان میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں بلکہ ان کے معنی و مطالب **مفوض الی اللہ** ہیں یعنی "**اللہ اعلم بمرادہ بذلک**" امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے "**الاستواء معلوم والکیفیۃ مجھولۃ والسوال عنھا بدعۃ**" امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ "**ید**" کی تاویل قدرت سے کرنا صفات میں تحریف ہے متاخرین اہل سنت نے مناسب تاویلات کی ہیں کیونکہ لوگ شکوک و شبہات کا شکار ہو گئے شیطانی وساوس عام ہو گئے تو عوام الناس کا ایمان بچانے کی غرض سے متاخرین نے مناسب تاویلیں کی ہیں تو یہاں مناسب تاویل قبضہ اور قدرت ہے کہ سب کچھ اللہ کے قبضہ و قدرت میں ہیں جس طرح مکمل قابو میں کرنے کے لئے کوئی چیز دو انگلیوں میں پکڑ کر آسانی سے گھمائی جاسکتی ہے اسی طرح یہاں ہے۔

کقلب واحد: یعنی جس طرح ایک دل کا کسی طرف مائل کر کے گھمانا آسان ہے اسی طرح یہ بھی آسان ہے کہ سب کے دلوں کو دو انگلیوں میں رکھ دے یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے متعدد قلوب اور قلب واحد میں انقلاب لانا یکساں اور برابر ہے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے حفاظت کے لئے وظیفہ بتایا ہے کہ اس کو پڑھا کریں۔ [۲]

۷ محرم ۱۴۱۰ھ

ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے

﴿۱۲﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ كَمَا تُنْتَجُ الْبَهِيْمَةُ بَهِيْمَةً جَمْعَاءَ هَلْ تُحِسُّوْنَ فِيْهَا مِنْ جَدْعَاءَ ثُمَّ يَقُوْلُ فِطْرَةَ اللهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) [۳]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کو فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے (یعنی امر حق کو قبول کرنے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے) پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں جس طرح ایک چوپایہ جانور پورا چوپایہ بچہ دیتا ہے کیا تم اس میں کوئی کمی پاتے ہو پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی (ترجمہ) یہ اللہ تعالیٰ کی اس بنائی کے موافق ہے جس پر اللہ نے آدمیوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی خلقت میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا یہ دین مستحکم ہے۔
(بخاری و مسلم)

---

[۱] المرقات ۱/۲۷۹ [۲] المرقات ۱/۲۸۰ [۳] اخرجہ البخاری ۲/۸ و مسلم ۱/۱۰۲

توضیح: **یولد علی الفطرۃ:** علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ "**الفطرۃ**" سے یہاں حدیث میں کیا مراد ہے امام احمد بن حنبل حافظ ابن عبدالبر اور ابن قیم رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک "فطرت" سے مراد دین اسلام ہے ان حضرات کا ایک استدلال تو قرآن کریم کی آیت سے ہے کہ "**فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا**" میں بالاجماع فطرت سے مراد دین اسلام ہے اور اسی کو **ذلک الدین القیم** سے تعبیر کیا گیا ہے معلوم ہوا کہ فطرت اور دین قیم ایک ہی چیز ہے۔

جواب: اس توجیہ پر دو اعتراض ہیں اول یہ کہ اگر فطرت سے مراد اسلام ہے اور ہر بچہ مسلمان ہے تو پھر میدان جہاد میں جنگ کے دوران پکڑا جانے والا بچہ غلام کیوں بنایا جاتا ہے اور کافر کے بچے کی نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھائی جاتی؟ اور اس کو **خیر الابوین** کے تابع کیوں کہا جاتا ہے جبکہ یہ ہر حال میں فطرت اور تخلیق کے اعتبار سے مسلمان ہے؟ نیز حضرت خضر علیہ السلام نے کیوں اس معصوم بچے کو قتل کیا؟

دوسرا اعتراض: یہ ہے کہ مذکورہ حدیث میں "**فابواہ یہودانہ**" آیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس فطرت سلیمہ کو ماں باپ بدل کر یہودی نصرانی مجوسی بناتے ہیں حالانکہ اسی جگہ جس آیت کو استشہاد میں پیش کیا گیا ہے اس میں "**لا تبدیل لخلق اللہ**" کا جملہ ہے کہ فطرت اسلام میں تغیر نہیں آتا ہے تو آیت اور حدیث میں تعارض آگیا۔ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ حضرات نے اپنے موقف کیلئے ایک حدیث قدسی سے بھی استدلال کیا ہے کہ حضرت عیاض بن حمار مجاشعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرمایا کہ "**انی خلقت عبادی حنفاء کلھم فاجتالتھم الشیاطین عن دینھم**" کہ میں نے تمام انسانوں کو خالص دین پر پیدا کیا تھا مگر شیطان نے ان کو ان کے دین سے ورغلا کر گمراہ کیا معلوم ہوا فطرت سے دین مراد ہے۔

نیز حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے سورۂ روم میں اس آیت کے ذیل میں فطرت سے دین اسلام مراد لیا ہے "**والفطرۃ الاسلام**"۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ حضرات کے یہ سب دلائل اپنی جگہ لیکن مذکورہ بالا کئی شقوں پر مشتمل دو اعتراضات نے ان حضرات کی اس توجیہ (کہ فطرت سے مراد اسلام ہے) کو مشکل میں ڈال دیا ہے اس لئے حافظ تورپشتی علامہ طیبی اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ اور دیگر علماء کرام نے فرمایا کہ حدیث میں فطرت سے مراد قبول حق کی استعداد اور صلاحیت و قابلیت و لیاقت ہے کہ اگر وہ بچہ اس استعداد کے ساتھ اسلام قبول کرنا چاہتا ہے تو اس میں اس کی صلاحیت ہے اور وہ بالکل اس کے لئے تیار ہے ہاں اگر وہ بچہ غلط ماحول میں پڑ کر اس استعداد کو خراب کرتا ہے اور اس سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ اردگرد کے ماحول کا قصور ہے مگر پھر بھی استعداد قبول حق باقی رہتا ہے دیکھو فرعون جب غلط ماحول سے الگ ہوا تو اس نے قبول حق کا اقرار کیا یہی وہ فطری نعرہ تھا جو اس استعداد کے وجود کا نتیجہ تھا اگرچہ اس اقرار نے اس کو فائدہ نہیں پہنچایا کیونکہ فائدہ کا وقت

گزر چکا تھا۔ اسی کو فرمایا "لا تبدیل لخلق الله" کہ اس استعداد کو غلط استعمال کر کے مہر جباریت تو لگ جاتی ہے مگر استعداد پھر بھی موجود رہتی ہے ہاں مہر جباریت کے لگنے سے استعداد سے فائدہ اٹھانا ختم ہو جاتا ہے اور اس سے فائدہ ممکن نہیں رہتا ہے اصل استعداد کا موجود رہنا تو الگ چیز ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے کہ فطرت جو تخلیق کے معنی میں ہے اس سے مراد یہی استعداد قبول حق ہے۔[1]

جواب: یہاں اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے جس بچہ کو مارا تھا اس کے متعلق روایات میں آیا ہے "**طبع یوم طبع کافرا**" اگر استعداد باقی تھی تو کیسے اس کو **مطبوع علی الکفر** کہا گیا؟

جواب: یہ عالم غیب کے اعتبار سے فرمایا ہے اگر چہ عالم شہادت کے اعتبار سے اس میں استعداد تھی مگر اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کے مطابق انجام کے اعتبار سے اس کو کافر ہونا تھا اور اسی کا تذکرہ "**طبع یوم طبع کافرا**" میں ہوا ہے۔

مثال:

اس تخلیقی جبلی اور فطری استعداد کی مثال حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح دی ہے کہ مثلاً صفت رجولیت تمام افراد رجال میں ہوتی ہے مگر اس سے وہ افراد مستثنیٰ کئے جا سکتے ہیں جو رھبانیت اختیار کر کے اس صفت مردانگی کو ضائع کر دیتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں یہ صفت نہیں تھی، بعینہ اسی طرح استعداد قبول حق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام افراد انسانی میں رکھا ہے لیکن ان کے والدین کا اسکو یہودی نصرانی بنانا ایک ایسی آفت ہے جس سے اس کی استعداد کا مصرف تبدیل ہو گیا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شخص اس استعداد سے محروم تھا۔

البتہ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اپنے قدرتِ کاملہ کے ظہور کے لئے کسی بچہ کو اول وھلہ میں استعداد سے محروم و مسلوب کر دیتا ہے جس طرح خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو مارا گویا وہ اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ ہے۔

کما تنتج: یہ نتاج سے ہے بچہ جنم لینا پیدا کرنا، "**البھیمۃ**" جانور اور حیوان کو کہا جاتا ہے۔ "**جمعاء**" اس سے مراد تام الخلقت اور سلیم الاعضاء حیوان ہے جس کا کوئی عضو کٹا ہوا نہ ہو۔ "**الجدعاء**" یہ اس حیوان کو کہتے ہیں جس کے کان کٹے ہوں ناک کٹی ہو ناقص الخلقت ہو۔ کان کے کٹنے سے یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ یہ کافر لوگ حق کے سننے سے ایسے محروم ہیں گویا کان ہی کٹے ہوئے ہیں سماع حق کا آلہ ہی نہیں، یعنی جس طرح ایک جانور سے اسی کی طرح صحیح سالم بچہ پیدا ہوتا ہے کوئی کان کٹا نہیں ہوتا اسی طرح فطرت اسلام صحیح اور سالم ہوتی ہے مگر لوگ اپنے کسب و اختیار سے اس فطرت کو برباد کرتے ہیں جس طرح بت پرست لوگ جانوروں کے بھی کان وغیرہ کاٹ کر یا چیر پھاڑ کر خراب کرتے ہیں:[2]

"**ای یولد علی الفطرۃ ولادۃ مثل نتاج البھیمۃ و یغیر انہ تغییرا مثل تغییر ھم البھیمۃ**"۔

---

[1] الکاشف ۱/۲۵۴ و اشعۃ اللمعات ۱/۱۰۲ [2] المرقات ۱/۲۸۲

سو جانا اللہ کے شایان شان نہیں

﴿۱۳﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَامَ فِينَا رَسُولُ اللهِ بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ إِنَّ اللهَ لَا يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَنَامَ يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ حِجَابُهُ النُّورُ لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهَى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ.

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور پانچ باتیں ارشاد فرمائیں۔ خدائے تعالیٰ سوتا نہیں ہے اور سونا اس کی شان کے مناسب نہیں ہے۔ وہ ترازو کو بلند و پست کرتا ہے دن کے عمل سے پہلے رات کے عمل اور رات کے عمل سے پہلے دن کے عمل اس کے پاس پہنچا دیئے جاتے ہیں اور اس کا حجاب نور ہے جسے اگر وہ اٹھا دے تو اس کی ذات پاک کا نور مخلوقات کی تا حد نگاہ تمام چیزوں کو جلا کر خاکستر کر دے۔ (مسلم شریف)

توضیح: **قام فینا:** یہ وعظ اور بیان سے کنایہ ہے **ای قام خطیبا مذکرا لنا**[2] "**بخمس کلمات**" **ای متلبسا بخمس او قائلا بخمس کلمات** "**لاینام**" مراد کاسل اور ضعف ہے نوم میں یہ کامل ہوتا ہے۔[3] "**ولا ینبغی له**" اس لئے کہ وہ حاجت روا مشکل کشا ہے خالق و مالک ہے اگر وہ سو جائے تو ڈھائی بجے رات کو کسی مصیبت زدہ کی فریاد کون سنے گا؟[4]

امن یجیب المضطر الآیة "**یخفض القسط**" **خفض** جھکانے اور گرانے گھٹانے کے معنی میں ہے اور قسط سے مراد حصہ اور رزق ہے اور **یرفعه** سے رزق کا بڑھانا مراد ہے۔[5] "**یرفع الیه عمل اللیل**" رفع اعمال سے مراد قبولیت اعمال ہے استمرار کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ تمام اعمال ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے مستحضر ہیں اس میں دن رات کے نامہ اعمال کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

حجابه النور: حجاب سے مراد مانع ہے کوئی حسی مادی حجاب مراد نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے محیط نہیں بلکہ یہ حجاب نوری ہے جو مخلوق کے لئے خالق کی رؤیت اور دیکھنے سے مانع ہے جیسا حسی حجاب مانع ہوتا ہے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حجاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ صفت جلال ہے اور اس کا وہ نور اور عظمت ہے جو اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے لئے مانع بن رہی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کے انوارات کا ایک پرتو سورج پر پڑا ہے کوئی دیکھ تو لے کہ اس کی شعاعوں میں کیا زور ہے "**سبحات وجهه**" جمع سبحة ہے جیسے غرفات جمع غرفة ہے اس سے تجلیات الٰہی مراد ہیں یا مخصوص صفات ہیں جو انوار الٰہی اور تجلیات ربانی پر مشتمل ہیں "**بصره**" **ای نظره ما یلیق بشانه**، تو نظر عالم پر محیط ہے لہٰذا پورا عالم جل کر خاکستر ہو جائے گا ذات اقدس کے انوارات کے یہ حجاب ستر ہزار ہیں اس کو جب فرشتے دیکھتے ہیں تو تسبیح و تہلیل میں لگ جاتے ہیں۔[6]

---

[1] اخرجه مسلم ۱/۱۱۱ [2] المرقات ۱/۲۸۴ [3] المرقات ۱/۲۸۴
[4] المرقات ۱/۲۸۴ [5] المرقات ۱/۲۸۴، ۲۸۵ [6] المرقات ۱/۲۸۶

اس حدیث میں دن اور رات کے جن اعمال کا ذکر کیا گیا قرآن کریم نے اسے "الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ" سے بیان کیا ہے بعض نے القسط سے میزان مراد لیا اور میزان سے مراد رزق ہے۔

اللہ کے جُود کے خزانے بھرے ہوئے ہیں

﴿۱۴﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَدُ اللهِ مَلْأَى لَا تَغِيْضُهَا نَفَقَةٌ سَحَّاءُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْفَقَ مُنْذُ خَلَقَ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ فَإِنَّهُ لَمْ يَغِضْ مَا فِي يَدِهِ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ وَبِيَدِهِ الْمِيْزَانُ يَخْفِضُ وَيَرْفَعُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: يَمِيْنُ اللهِ مَلْأَى وَقَالَ ابْنُ نُمَيْرٍ مَلْآنُ سَحَّاءُ لَا يَغِيْضُهَا شَيْءٌ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ.[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ (یعنی اس کا خزانہ) بھرا ہوا ہے۔ دن اور رات ہر وقت خرچ کرنا بھی اس میں کمی پیدا نہیں کرتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو؟ کہ جب سے اس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا۔ اور جبکہ اس کا عرش (بھی) پانی پر تھا۔ کتنا خرچ کیا ہے۔ لیکن (اتنا زیادہ) خرچ کرنے کے باوجود جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے (یعنی اس کا خزانہ) اس میں کمی نہیں ہوئی ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں ترازو ہے۔ جسے وہ بلند و پست کرتا ہے۔ (بخاری ومسلم) اور مسلم کی روایت ہے "خدا کا داہنا ہاتھ بھرا ہوا ہے" اور ابن نمیر کی روایت میں ہے۔ خدا کا ہاتھ بھرا ہوا ہے۔ اور ہمیشہ دینے والا ہے۔ رات اور دن (خرچ ہونے کے باوجود) اس میں کوئی چیز کمی نہیں کرتی۔

توضیح: ید اللہ: ای ما یلیق بشانہ۔ ملآی: ای من الخزائن[2] یعنی خزانوں سے ہاتھ بھرے ہوئے ہیں قرآن میں ہے "وان من شیء الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم"۔ (سورۃ حجر)

لا تغیضھا ای لا تنقصھا سحاء اللیل یعنی پانی کی طرح طبعاً یہ سخاوت ٹپکتی ہے یہ کثرت سخاوت سے کنایہ ہے کیونکہ سحاء صحراؤں اور بیابانوں میں برسنے والی بارش کو کہتے ہیں "ھا" ضمیر ید اللہ کی طرف راجع ہے جس سے مراد خزائن اللہ ہیں جو لفظ[3] کن فیکون ہے اللیل والنھار دونوں منصوب ہیں اور ظرف واقع ہیں روایت کے آخر میں یمین اللہ بھی مسلم کی روایت میں ہے یمین اللہ ادباً کہا گیا ہے اور آخر میں لا یغیضھا ہے تو شئی فاعل ہے اور اللیل والنھار اس سے بدل واقع ہے۔[4] "ملآی" مملوۃ کے معنی میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی سخاوت بارش کی طرح دائم الصب ہے مسلسل اور موسلا دھار بارش کی طرح زمان اور مکان کو عام ہے۔ ارایتم سے اس کی عملی صورت بتائی گئی ہے۔

---

[1] اخرجہ البخاری ۶/۹۲ ومسلم ۷/۸۰ [2] المرقات ۱/۲۸۶ [3] المرقات ۱/۲۸۷ [4] المرقات ۱/۲۸۷

مشرکین کی اولاد کہاں ہوں گی؟

﴿۱۵﴾ وَعَنْهُ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ ذَرَارِي الْمُشْرِكِيْنَ قَالَ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ سے مشرکوں کی اولاد کے بارہ میں پوچھا گیا (کہ مرنے کے بعد دوزخ میں جائیں گے یا جنت میں) تو آپ ﷺ نے فرمایا خدا ہی بہتر جانتا ہے اگر وہ زندہ رہتے تو کیا عمل کرتے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: **اللہ اعلم بما کانوا عاملین:** یعنی اللہ ہی کو معلوم ہے تم کو کیا معلوم اور تمہارا کیا سوال؟ یہ جملہ اولاد مشرکین کی صحیح حقیقت نہ بتانے کا ایک انداز ہے اور اس سے لاعلمی کا اظہار ہے۔

جواب: شبہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اولاد مشرکین سے متعلق کوئی حتمی بات کیوں ظاہر نہ فرمائی؟

ترجمہ: اول یہ کہ اب تک حضور اکرم کو من جانب اللہ کوئی واضح حکم نہیں ملا تھا۔

ترجمہ: یہ کہ آپ ﷺ کو معلوم تو تھا مگر اظہار میں توقف کیا کہ اب تک اجازت نہیں تھی اس مسئلہ میں نصوص کے اختلاف کی وجہ سے فقہاء اسلام میں بھی اختلاف آیا ہے چند اقوال ملاحظہ ہوں۔

❶ اولاد مشرکین جن کا بچپن میں انتقال ہو گیا ہو ان کے متعلق ابن حجر رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ جنتی ہیں اور حضور اکرم ﷺ کو وحی جدید سے اس کا علم ہو گیا۔

❷ داخل جنت ہیں مگر مستقلاً نہیں بلکہ جنتیوں کے خدام کی حیثیت سے اور ان کے تابع کی حیثیت سے ہوں گے۔

❸ نہ جنت میں نہ دوزخ میں بلکہ اعراف میں ہوں گے۔

❹ والدین کے تابع ہو کر دوزخ میں جائیں گے۔

❺ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اکثر فقہاء کے ہاں راجح یہ ہے کہ اولاد مشرکین میں توقف کیا جائے۔[2]

الفصل الثانی

اللہ نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا؟

﴿۱۶﴾ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمُ فَقَالَ لَهُ أُكْتُبْ قَالَ مَا أَكْتُبُ قَالَ أُكْتُبِ الْقَدَرَ فَكَتَبَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى الْأَبَدِ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ إِسْنَادًا)[3]

[1] اخرجه البخاری ۲/۱۲۵ ومسلم: ۸/۵۳ [2] المرقات ۱/۲۸۸، ۲۸۹ [3] اخرجه الترمذی: ۲۱۵۵

ترجمہ: حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ خدا نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا کیا وہ قلم تھا پھر اس (قلم) کو لکھنے کا حکم دیا قلم نے کہا (الٰہ العالمین) کیا لکھوں؟ بارگاہ الوہیت سے جواب ملا تقدیر لکھو! لہٰذا اس قلم نے ان چیزوں کو لکھا جو (اب تک) ہو چکی ہیں۔ اور ان چیزوں کو لکھا جو آئندہ ہونے والی ہیں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے غریب ہے۔

توضیح: **ان اول ما خلق اللہ القلم:** اس روایت میں قلم کی تخلیق کا ذکر ہے کہ سب سے پہلے قلم پیدا کیا گیا ہے دوسری روایات میں "**اول ما خلق اللہ نوری**" بھی ہے اور "**اول ما خلق اللہ العقل**" بھی ہے تو روایات میں تعارض آ گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اولیت اضافی ہے نور کے لئے اولیت حقیقی ہے باقی کے لئے اضافی ہے یعنی نور کے بعد سب سے پہلے قلم پیدا کیا گیا اور پھر سب سے اول عقل پیدا کی گئی تو اولیت کی نسبت اس اعتبار سے صحیح ہوگی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اپنی اپنی نوع کے اعتبار سے اولیت کا حکم لگایا گیا ہے تو انوارات کی قسموں میں سب سے پہلے نور محمد ﷺ کو پیدا کیا گیا اور اقلام کی انواع میں سب سے پہلے قلم تقدیر پیدا کیا گیا ہے اور عقلیات کے آلات میں سب سے پہلے عقل پیدا کی گئی ہے۔

اکتب: اللہ تعالیٰ نے کائنات کو جس ترتیب سے پیدا فرمایا مثلاً آسمان ہے، زمین ہے، عرش ہے، کرسی، باطنی نظام چلانے کیلئے فرشتے ہیں ان تمام چیزوں کو اسی ترتیب کے ساتھ لکھنا مناسب تھا تو قلم کو حکم دیا کہ لکھ دو قلم نے لکھ دیا یہی قضاء وقدر ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ اس لکھت کی طرف محتاج نہ تھے مگر یہ ایک نظام ہے جس کا ہونا بہت ہی مناسب ہے۔[1]

فکتب ما کان وما ھو کائن: یہاں سوال یہ ہے کہ قلم تقدیر نے ازل میں کیا لکھا حالانکہ اس سے پہلے تو زمانہ ہی نہیں تھا لہٰذا "**ما کان**" کے الفاظ کا استعمال کرنا درست نہ ہوا۔

جواب یہ ہے کہ ماضی سے مراد رسول اللہ ﷺ سے پہلے کا زمانہ ہے یعنی آنحضرت ﷺ فرما رہے ہیں کہ جو کچھ آج سے پہلے ہوا وہ بھی قلم نے لکھ لیا ہے۔[2]

۹ محرم ۱۴۱۰ھ

انسان کی ابتداء آفرینش کا قصہ

﴿۱۷﴾ وَعَنْ مُسْلِمِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ سُئِلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ الْاٰيَةَ قَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُسْئَلُ عَنْهَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِيَمِيْنِهِ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَبِعَمَلِ أَهْلِ

[1] المرقات ۱/۲۹۰ [2] المرقات ۱/۲۹۰

الْجَنَّةِ يَعْمَلُونَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِيَدِهِ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَبِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُونَ فَقَالَ رَجُلٌ فَفِيمَ الْعَمَلُ يَارَسُولَ اللهِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِنَّ اللهَ إِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اِسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَمُوتَ عَلَى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلُهُ بِهِ الْجَنَّةَ وَإِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اِسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوتَ عَلَى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ النَّارِ فَيُدْخِلُهُ بِهِ النَّارَ۔ (رَوَاهُ مَالِكٌ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ)[1]

ترجمہ: حضرت مسلم بن یسار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اس آیت ﴿**واذ اخذ ربك من بنی ادم من ظهور هم ذريتهم واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا ان تقولوا يوم القيمة انا كنا عن هذا غافلين**۝﴾ (پ۹ ع۱۱) (ترجمہ): ''اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور (سب کچھ سمجھ عطا کر کے) ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں ہم سب (اس واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں تا کہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس توحید سے محض بے خبر تھے'' کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ جب اس آیت کے بارے میں سرکار دو عالم ﷺ سے سوال کیا گیا تو میں نے آپ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا پھر ان کی پیٹھ پر داہنا ہاتھ پھیرا اور اس میں سے ان کی اولاد نکالی اور فرمایا کہ میں نے ان کو جنت کیلئے اور جنتیوں کے سے اعمال کرنے کے لئے جو وہ کریں گے پیدا کیا ہے۔ پھر اپنا ہاتھ آدم کی پشت پر پھیرا اور اس میں سے ان کی اولاد نکالی اور فرمایا کہ میں نے ان کو دوزخ کے لئے اور دوزخیوں کے سے کام کرنے کیلئے جو وہ کریں گے پیدا کیا ہے یہ سن کر ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتیوں کے سے عمل صادر کراتا ہے یہاں تک کہ اس (بندہ) کی وفات جنتیوں جیسے اعمال پر ہو جاتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ ان اعمال کی بناء پر اسے جنت میں داخل کر دیتا ہے اور جب کسی بندہ کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے سے اعمال صادر کراتا ہے یہاں تک کہ وہ دوزخیوں جیسے اعمال پر مرجاتا ہے لہٰذا اسے ان اعمال کی بناء پر دوزخ میں ڈال دیتا ہے۔ (موطا مالک، ترمذی، ابوداود)

توضیح: واذ اخذ ربك: اس مقام میں کئی مباحث ہیں۔

بحث اول:

ذریت آدم علیہ السلام کو ان کی پشت سے کہاں نکالا گیا؟

❶ بعض نے کہا کہ عالم ارواح میں نکالا گیا۔ ❷ بعض نے کہا کہ دنیا میں آنے کے بعد نکالا۔

❸ بعض نے کہا کہ عرفات کے پاس نعمان پہاڑ پر یہ واقعہ ہوا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت اس پر دلالت بھی کرتی ہے۔[2]

[1] اخرجه مالک ۵۶۰ و ابو داود ۴۷۰۳ والترمذی: ۳۰۷۵ [2] المرقات ۱/۲۹۳

بحث دوم:

پشت آدم سے یہ اولاد کیسے نکالی گئی؟

امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ میں شگاف کر کے نکالا بعض نے کہا کہ جسم کے بالوں کے مسامات سے نکالا بعض نے کہا کہ ہر ایک کو اپنے باپ کی پیٹھ سے نکال کر یہ مکالمہ ہوا۔[1]

یہاں ایک مشہور اشکال ہے کہ قرآن کی آیت میں **من ظهورهم** کا لفظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اولاد اپنے اپنے آباء کی پیٹھوں سے نکالی گئی ہے اور مذکورہ حدیث میں **ثم مسح ظهره بيمينه** میں تصریح ہے کہ اولاد کا استخراج پشت آدم سے ہوا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ استخراج اولاد کے دو مرحلے ہیں ایک پشت آدم سے نکلنے کا مرحلہ ہے اور دوسرا ظہور بنی آدم سے نکلنے کا مرحلہ ہے۔ حدیث میں پشت آدم سے نکلنے کے مرحلے کا ذکر ہے اور آیت میں ظہور بنی آدم سے نکلنے کے مراحل کا ذکر ہے تو آیت و حدیث میں کوئی تعارض نہیں ایک میں بلا واسطہ اخراج ہے اور دوسری میں بالواسطہ اخراج کا ذکر ہے۔[2]

بحث سوم:

"**واشهدهم على انفسهم**" سے متعلق ہے کہ اس اشھاد سے کیا مراد ہے؟ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس تمام معاملہ کو ایک تمثیل پر محمول کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دلائل ربوبیت قائم کئے اور ادھر عقول میں ایک مادہ پیدا کیا جو اقرار توحید اور ربوبیت کے ماننے پر انسان کو آمادہ کرے تو انسان نے **قالوا بلى** کہہ دیا قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ تمام صوفیاء کرام، محدثین عظام اور اہل حق کے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ **اشهاد حقيقةً** فی الواقع ہوا ہے وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام بندوں کو پشت آدم سے نکال کر سب سے کلام کر کے قولاً یہ اقرار لیا ہے اور سب نے اقرار کر کے وعدہ کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے "**فكلمهم قبلا**" یعنی اللہ تعالیٰ نے آمنے سامنے ان لوگوں سے گفتگو اور کلام کیا یہ روایت ان حضرات کی دلیل ہے اور یہی مسلک حق پر ہے قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تمثیل اس روایت میں نہیں چل سکتی ہے۔[3]

جواب: اب شبہ یہ ہے کہ ہم کو یہ قول و قرار یاد کیوں نہیں؟

جواب: تم یاد رکھتے جیسے ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا "**كانه الان فى اذنى**"۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں وہاں کے دائیں بائیں کھڑے لوگوں کو بھی جانتا ہوں کہ کون کون تھے عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مجھے عہد الست کی شاگردی یاد ہے۔ چلو اگر تم بھول بھی گئے تو کوئی تعجب نہیں بڑے بڑے انقلاب آئے ہیں انسان پہلے نطفہ تھا پھر علقہ پھر مضغہ پھر عظام اور پھر لحم و شحم میں تبدیل ہوا پھر وجود میں آیا تو کیا آپ کے بھولنے سے اس تفصیل کی حقیقت ختم ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں ایسے ہی آپ کے بھولنے کی وجہ سے عہد الست کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ چلو تم بتاؤ کہ تم جو خط لکھنا

[1] المرقات ۱/۲۹۳ [2] الکاشف ۱/۲۶۶ [3] المرقات ۱/۲۹۲

جانتے ہو قرآن پڑھنا جانتے ہو تو ضرور بضرور ابتدا کہیں سے ہوئی ہوگی اب تم ہمیں بتاؤ وہ ابتدائی حروف اور کلمات کیا تھے کس کو یاد ہے حالانکہ وہ بھی ایک حقیقت ہے۔

آخر میں یہ سن لو کہ نبی آخر زمان صادق ومصدوق نے بتایا تو کیا آنحضرت ﷺ پر اعتماد اپنے او پر اعتماد سے کم ہے؟ اب اگر کوئی کہے کہ ہم نے جواب کیسے دیا؟ تو ہم کہیں گے زبان سے دیا کیا محال ہے اگر کوئی کہے پھر اقرار کے بعد انکار کیوں کرتے ہیں ہم کہیں گے کہ یہی تو مصیبت ہے اسی کا تو طعنہ مل رہا ہے تاہم مجبور تو نہیں کہ انکار کی طاقت نہیں بلکہ با اختیار ہے کوئی مانتا ہے کوئی نہیں مانتا۔

مسح بیدہ: اس سے پہلے مسح بیمینہ فرمایا کیونکہ وہاں مومن تھے تو اعزازی طور پر یمین کا ذکر کیا گیا اور یہاں بیدہ فرمایا کیونکہ یہ کافر ہیں ان کے لئے یمین کا اعزازی لفظ مناسب نہیں تھا اور شمال کا تصور نہ تھا تو بیدہ فرمایا۔

استعمله: یعنی اہل جنت کے عمل میں لگا دیا یعنی توفیق دے دی۔

تقدیر کے دو مکتوب

﴿۱۸﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَفِيْ يَدَيْهِ كِتَابَانِ فَقَالَ أَتَدْرُوْنَ مَاهٰذَانِ الْكِتَابَانِ قُلْنَا لَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ إِلَّا أَنْ تُخْبِرَنَا فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ أُجْمِلَ عَلٰى آخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيْهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَدًا ثُمَّ قَالَ لِلَّذِيْ فِيْ شِمَالِهِ هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ النَّارِ وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ أُجْمِلَ عَلٰى آخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيْهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَدًا فَقَالَ أَصْحَابُهُ فَفِيْمَ الْعَمَلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ إِنْ كَانَ أَمْرٌ قَدْ فُرِغَ مِنْهُ فَقَالَ سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا فَإِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنْ عَمِلَ أَيَّ عَمَلٍ وَإِنَّ صَاحِبَ النَّارِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ وَإِنْ عَمِلَ أَيَّ عَمَلٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدَيْهِ فَنَبَذَهُمَا ثُمَّ قَالَ فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْعِبَادِ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ باہر تشریف لائے آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں آپ نے (صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے) فرمایا جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیا ہیں! ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں کیا معلوم آپ ہی بتا دیجئے (کہ یہ کیا کتابیں ہیں) آپ ﷺ نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا جو داہنے ہاتھ میں تھی کہ یہ خدا کی جانب سے ہے جس میں اہل جنت، ان کے باپ اور ان کے قبیلوں کے نام لکھے ہوئے ہیں پھر آخر میں جمع بندی کر دی گئی ہے لہٰذا اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق فرمایا یہ خدا کی جانب سے ایک ایسی کتاب

[1] اخرجه الترمذی: ۲۱۴۱

ہے جس پر اہل دوزخ ان کے باپ اور ان کے قبیلوں کے نام لکھے ہیں پھر آخر میں جمع بندی کر دی گئی ہے لہٰذا اب نہ تو اس میں کمی ہوتی ہے اور نہ زیادتی (یہ سن کر) صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر یہ چیز پہلے ہی سے طے ہو چکی ہے (کہ جنت و دوزخ کا مدار نوشتہ تقدیر پر ہے تو) پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا (دین و شریعت کے مطابق اپنے اعمال کو) اچھی طرح مضبوط کرو اور (حق تعالیٰ کا) تقرب حاصل کرو اس لئے کہ جنتی کا خاتمہ اہل جنت کے اعمال پر ہوتا ہے خواہ (زندگی میں) اس نے کیسے ہی (نیک یا بد) عمل کئے ہوں اور دوزخی کا خاتمہ اہل دوزخ کے عمل پر ہوتا ہے خواہ اس کے اعمال جیسے بھی رہے ہوں۔ پھر آنحضرت ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور کتابوں کو رکھ دیا یعنی پیچھے ڈال دیا اور فرمایا تمہارا پروردگار بندوں کے بارے میں یہ پہلے سے طے کر چکا ہے کہ ایک جماعت جنتی ہے اور ایک جماعت دوزخی ہے۔ (ترمذی)

توضیح: وفی یدیہ کتابان: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا یہ دو کتابیں حسی تھیں یا تمثیل اور تصویر کے طور پر بتانا مقصود تھا اہل تاویل علماء نے کہا کہ یہ کوئی محسوس اور مشاہد اور مخصوص کتابیں نہیں تھیں بلکہ ایک مثال اور ایک تصویر بیان کرنا مقصود تھا وہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کو ان کتابوں سے متعلق کامل یقین اور قطعی علم تھا جو مشاہدۂ حسیہ سے بھی زیادہ قوی تھا تو آپ ﷺ نے ان غیر حسی کتابوں کو حسی بنا کر پیش فرمایا لیکن جمہور محدثین، حضرات علماء و اہل اللہ و اہل باطن سب کہتے ہیں کہ یہ دونوں حسی کتابیں تھیں جن کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس ہستی کو تسلسل کے ساتھ وحی آرہی ہو اگر عالم غیب سے اس کو دو حسی کتابیں لا کر دے دی گئیں تو اس میں کیا استبعاد اور کیا استعجاب ہے؟ اور چونکہ یہ عالم غیب کی کتابیں تھیں لہٰذا اس کی ضخامت پر اعتراض نہ کیا جائے ایک کتاب میں اہل جنت کے نام لکھے گئے تھے، دوسری میں اہل نار کے نام تھے دور جدید میں یہ بات سمجھنا اور آسان ہوگئی ہے بڑی بڑی تفاصیل سمٹ کر ایک معمولی سے آلے میں سما جاتی ہیں اور انگلی کے ایک اشارے سے نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ [1]

ثم اجمل علی آخرھم: اس کا مطلب یہ ہے کہ تفصیلی فہرست کے بعد آخر میں اس کی مجموعی تعداد لکھی ہوئی تھی جسے میزان اور میزانیہ کہتے ہیں۔ [2]

فقال سددوا وقاربوا: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مکمل عمل کرو، ورنہ قریب قریب چلو۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم عباد اور بندے ہو تم کو سوال کرنے کا حق نہیں بلکہ سیدھا سیدھا ٹھیک ٹھیک عمل کرو اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھو۔ [3]

ثم قال بیدیہ: قال کے صلہ میں مختلف حروف کے آنے سے اس کا معنی تبدیل ہوتا رہتا ہے **قال عنہ ای روی عنہ، قال فیہ ای عاب علیہ، قال براسہ ای قال نعم و اجاب، قال بیدہ ای اشار بیدہ** یہاں اسی اشارہ کے معنی میں آیا ہے **قال بثوبہ ای رفعہ، قال برجلہ ای مشی قالت عینہ ای اومأت کما قیل:**

[1] المرقات ۱/۲۹۴، ۲۹۵ [2] المرقات ۱/۲۹۶ [3] المرقات ۱/۲۹۶

وقالت له العينان سمعًا وطاعةً وَحَدَّرَتَا كالدر لما يثقب [1]

فنبذهما: اس پھینکنے میں کوئی توہین کی صورت نہیں نکلتی بلکہ عالم غیب کی کتابیں تھیں جونہی ہاتھ چھوڑ دیئے کتابیں بھی غائب ہوگئیں۔ عالم غیب کے لفظ کو یوں سمجھیں کہ عوالم تین ہیں ایک عالم مشاہدہ ہے جس میں جسم اور روح دونوں فعال ہیں جسم کے ساتھ صورت بھی ہے۔ دوم عالم مثال ہے جس میں صرف صورت ہوتی ہے جسم نہیں ہوتا۔ سوم عالم ارواح ہے جس میں صرف روح ہوتی ہے۔ [2]

یہاں **قال بیدیہ فنبذهما** درحقیقت **جف القلم بما انت لاق** کی طرح ہے معنی یہ ہے کہ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا اور "**فرغ ربکم**" اسی پر دال ہے۔

دوا اور علاج بھی تقدیر کے تحت ہے

﴿۱۹﴾ وَعَنْ أَبِيْ خِزَامَةَ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَرَأَيْتَ رُقًى نَسْتَرْقِيْهَا وَدَوَاءً نَتَدَاوٰى بِهٖ وَتُقَاةً نَتَّقِيْهَا هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللهِ شَيْئًا قَالَ هِيَ مِنْ قَدَرِ اللهِ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَة) [3]

ترجمہ: حضرت ابوخزامہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ وہ عملیات جن کو ہم (شفاء کے لئے) پڑھواتے ہیں اور وہ دوائیں جن کو ہم (حصول صحت کیلئے) استعمال کرتے ہیں اور وہ چیزیں جن سے ہم حفاظت حاصل کرتے ہیں (مثلاً ڈھال اور زرہ وغیرہ) ان کے بارے میں مجھے بتایئے کہ یہ سب چیزیں نوشتہ تقدیر میں کچھ اثر انداز ہو جاتی ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ چیزیں بھی نوشتہ تقدیر ہی کے مطابق ہیں۔
(احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

توضیح: رقی: جمع رقیة کی ہے جھاڑ پھونک دم اور معوذات کو کہتے ہیں۔ [4]

تقاۃ: وہ چیز جس سے پناہ اور بچاؤ حاصل کیا جاتا ہے خواہ ڈھال ہو اسلحہ ہو دیوار ہو یا انسان ہو۔ جھاڑ پھونک اور دم وغیرہ کے تفصیلی مسائل جلد ثانی میں انشاء اللہ آئیں گے یہاں اتنا جان لیں کہ جس دم اور تعویذ میں الفاظ کے معنی معلوم نہ ہوں یا اس میں شرکیہ الفاظ مذکور ہوں اس کا استعمال حرام ہے اور جس کا معنی صحیح ہو شریعت میں وہ دم استعمال کے لئے موجود ہو وہ جائز ہے اور جس کا معنی تو معلوم نہ ہو مگر رسول اللہ ﷺ نے اجازت دی ہو وہ بھی جائز ہے جیسے "**شجة قرنية ملحة بحر**" بچھو کے کاٹے کے لئے ایک منتر ہے یہ بھی جائز ہے بہر حال صحابی کے پوچھنے اور سوال کرنے کا منشاء یہ ہے کہ جب تمام امور مقدرات میں ہیں تو رقیہ ادویہ اور بچاؤ کی چیزوں کے استعمال کا کیا فائدہ ہے آنحضرت ﷺ نے جواب دیا کہ یہ اشیاء بھی تقدیر میں ہیں تقدیر سے باہر نہیں تو استعمال اور اشتغال بالاسباب جائز ہے۔ اتکال بالاسباب ناجائز ہے جائز تعویذات بھی اس وقت ممنوع ہو جاتے ہیں جب ان کو لوگ موثر بالذات ماننا شروع کر دیتے ہیں۔

[1] المرقات ۱/۲۹۷ [2] المرقات ۱/۲۹۷ [3] اخرجه احمد ۳/۴۲۱ والترمذی ۲۰۶۵ وابن ماجه ۳۴۳۷ [4] المرقات ۱/۲۹۸

۱۰ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ

تقدیر میں بحث نہ کرو

﴿۲۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِي الْقَدَرِ فَغَضِبَ حَتَّى احْمَرَّ وَجْهُهُ حَتَّى كَأَنَّمَا فُقِئَ فِي وَجْنَتَيْهِ حَبُّ الرُّمَّانِ فَقَالَ أَبِهٰذَا أُمِرْتُمْ أَمْ بِهٰذَا أُرْسِلْتُ إِلَيْكُمْ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِيْنَ تَنَازَعُوا فِي هٰذَا الْأَمْرِ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ أَنْ لَّا تَنَازَعُوا فِيْهِ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَى ابْنُ مَاجَةَ نَحْوَهُ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ)[۱]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ہم قضاء وقدر کے مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ سرکار دو عالم ﷺ تشریف لے آئے (ہمیں اس مسئلہ میں الجھا ہوا دیکھ کر) آپ ﷺ کا چہرہ انور غصہ کی وجہ سے سرخ ہو گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انار کے دانے آپ کے رخسار پر نچوڑ دیئے گئے ہیں (اسی حالت میں) آپ ﷺ نے فرمایا، کیا تمہیں اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے اور میں اسی لئے تمہارے پاس (رسول بنا کر) بھیجا گیا ہوں؟ جان لو! تم سے پہلے کے لوگ اس لئے ہلاکت کی وادی میں پھینک دیئے گئے کہ انہوں نے اس سلسلے میں الجھنا اپنا مشغلہ بنالیا تھا۔ لہٰذا میں تمہیں اس بات کی قسم دیتا ہوں (اور پھر دوبارہ) قسم دیتا ہوں کہ تم اس مسئلہ پر بحث نہ کیا کرو (ترمذی) اور ابن ماجہ نے اسی طرح کی روایت عمرو بن شعیب سے نقل کی ہے جوانہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے۔

توضیح: نتنازع: یعنی یہ بحث تھی مثلاً ایک فریق کہہ رہا تھا کہ جب سب کچھ اس عالم کائنات میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ تقدیر کے تحت ہو رہا ہے تو پھر گناہ گاروں کو عذاب کیوں دیا جاتا ہے۔ دوسرا فریق کہہ رہا تھا کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ بعض بندوں کو جنت کے لئے اور بعض کو دوزخ کے لئے پیدا کیا گیا۔[۲]

فغضب: حضور اکرم ﷺ کی ناراضی اس لئے تھی کہ مسئلہ تقدیر "سر من اسرار الله" ایک پوشیدہ راز ہے جہاں تک عقل انسانی کی رسائی ناممکن ہے اس میں جستجو گمراہی تک پہنچا دیتی ہے نیز جو چیز عقل انسانی کے دائرہ کار سے باہر ہو اس میں بحث مباحثہ کرنا بے سود ہے پھر انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ اور غلام ہے تو غلام اگر اپنے آقا کی حکمتوں کی جستجو شروع کر دے کہ یہ کیوں کیا یہ کیوں نہ کیا یہ کیسا کرنا ہے یہ کیسا کرو گے کیوں کرو گے یہ سوالات کرنا بڑی بے ادبی بھی ہے اور اس کا نتیجہ یا جبری ہے یا قدری ہے اور یا کفری ہے۔[۳]

اس لئے آنحضرت ﷺ سخت ناراض ہوئے اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک نوکر اپنے آقا سے کہتا ہے کہ آج آپ کیا کام کریں گے؟ کہاں کریں گے؟ کیوں کریں گے؟ اور شہر میں کہاں کریں گے اور کب کریں گے ان سوالات سے آقا اس کو کام سے فارغ کر دے گا کہ تم کو میں نے چوکیداری پر مقرر کیا تھا میرے کاموں میں حکمتیں اور علتیں

---

[۱] اخرجه الترمذی ۲۱۳۳ وابن ماجه ۸۵ [۲] المرقات ۱/۲۹۹ [۳] المرقات ۱/۲۹۹

ڈھونڈنے کے لئے نہیں رکھا تھا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ تقدیر کے مسئلہ میں مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں۔

لہٰذا تقدیر کا اثبات صرف مسلمانوں کے ذمہ نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ عقلیہ ہے اس کا سمجھنا سب کے ذمہ ہے۔

کانما فقئ فی وجنتیه: گویا کہ آنحضرت ﷺ کے رخسار میں انار کے دانے نچوڑے گئے ہوں یہ غضب اور غصہ کی وجہ سے ہوتا تھا، صاف دل لوگوں پر ایسا اثر ہوتا ہے اور اثر چہرہ پر بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔[1]

عزمت علیکم: یعنی میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ ایسا نہ کرو عربی محاورہ میں یہ ہوتا تھا کہ تمہیں قسم دیتا ہوں پشتونوں میں بھی یہ دستور ہے کہ مہمان کو قسم دے کر کہتے ہیں کہ اور کھاؤ۔[2]

انسان میں مٹی کی صفات نمایاں ہیں

﴿۲۱﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ إِنَّ اللهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيعِ الْأَرْضِ فَجَاءَ بَنُو آدَمَ عَلَى قَدْرِ الْأَرْضِ مِنْهُمُ الْأَحْمَرُ وَالْأَبْيَضُ وَالْأَسْوَدُ وَبَيْنَ ذٰلِكَ وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ وَالْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ)[3]

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکار دوعالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ایک مٹھی (مٹی) سے کی جو ہر جگہ کی زمین سے لی گئی تھی لہٰذا آدم علیہ السلام کی اولاد زمین کے موافق پیدا ہوئی چنانچہ (انسانوں میں) بعض سرخ، بعض سفید، بعض کالے، بعض درمیانہ رنگ کے، بعض نرم مزاج، بعض تند مزاج، بعض پاک اور بعض ناپاک ہیں"۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

توضیح: فجاء بنو آدم: یعنی اولاد آدم اس قبضۂ ارض کی کیفیات کے مطابق پیدا ہوئی جس قبضہ سے حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر تیار کیا گیا تھا، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان میں یہ چار رنگ مشہور تھے تو اس کا ذکر فرمایا۔ یعنی احمر ابیض اسود اور بین بین، یہ انسان کے ظاہری اوصاف ہیں اسی کے مطابق انسان پیدا ہوا ہے یعنی کیفیات ارضی اور خصوصیات خاکی حضرت آدم علیہ السلام میں آئیں تو پھر اولاد آدم میں بھی آئیں ان ظاہری اوصاف کے مقابلہ میں چار باطنی اوصاف کا ذکر بھی کیا گیا جنہیں[4] **والسهل والحزن** سے شروع کیا گیا، سہل نرم زمین اور حزن سخت زمین کو کہتے ہیں یہاں سہل سے نرم اخلاق کا مالک شخص مراد ہے اور الحزن سے تند مزاج اور سخت بداخلاق شخص مراد ہے[5] **الخبیث** نہایت کریہہ رائحہ رکھنے والی چیز کو کہتے ہیں اس سے مراد نہایت شریر بدبودار سڑا ہوا کافر ہے[6] **الطیب** خوشبودار اور رائحہ طیبہ رکھنے والی چیز کو کہتے ہیں یہاں اس سے مراد خیر وصلاح رکھنے والا مومن ہے۔[7]

[1] المرقات ۱/۲۹۹ [2] المرقات ۱/۲۹۹ [3] احمد ۴/۴۰۰ والترمذی ۲۹۵۵ ج وابو داؤد ۴۶۹۳
[4] الکاشف ۱/۲۷۵ مرقات ۱/۳۰۱ [5] المرقات ۱/۳۰۱ [6] المرقات ۱/۳۰۱ [7] المرقات ۱/۳۰۱

اب نور ہدایت صرف اسلام میں ہے

﴿۲۲﴾ وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ اِنَّ اللهَ خَلَقَ خَلْقَهُ فِيْ ظُلْمَةٍ فَأَلْقٰى عَلَيْهِمْ مِنْ نُوْرِهٖ فَمَنْ اَصَابَهُ مِنْ ذٰلِكَ النُّوْرِ اِهْتَدٰى وَمَنْ أَخْطَأَهُ ضَلَّ فَلِذٰلِكَ أَقُوْلُ جَفَّ الْقَلَمُ عَلٰى عِلْمِ اللهِ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ)[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دوعالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق (جن وانس) کو اندھیرے میں پیدا کیا پھر ان پر اپنے نور کا پرتو ڈالا، لہٰذا جس کو اس نور کی روشنی میسر آ گئی وہ راہ راست پر لگ گیا اور جو اس کی مقدس شعاعوں سے محروم رہا وہ گمراہی میں پڑا رہا، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ تقدیر الٰہی پر قلم خشک ہو چکا ہے (کہ اب تقدیر میں تغیر وتبدل ممکن نہیں)''۔ (احمد، ترمذی)

توضیح: فی ظلمة: حافظ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظلمة سے مراد وہ خواہشات اور شھوات ہیں جو انسان کی طبیعت میں ہیں اور انسان کی تخلیق کے وقت سے اس کے ساتھ ہیں اور[2] "خلق خلقه" سے مراد انسان اور جنات ہیں فرشتے اس سے خارج ہیں اور "من نوره" سے شریعت اور وہ براھین مراد ہیں جن سے ہدایت کی روشنی حاصل ہوتی ہے۔[3] شیخ عبدالحق محدث دھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظلمت سے مراد بچپن کا زمانہ ہے جس میں انسان پیدا ہوتا ہے اور نور سے مراد یہ کہ بڑا ہو کر براہین شریعت کو اپناتا ہے یہ اس کے لئے نور ہدایت ہے۔ بہر حال انسان بالطبع ہدایت وشریعت کا محتاج ہے ورنہ باولے کتے کی طرح ایک درندہ ہے۔[4]

من نوره: میں اضافت تشریفی ہے اور نور سے مراد اللہ کا پیدا کردہ نور ہدایت ہے اللہ کا جزء مراد نہیں ہے۔

انسان ہر وقت خطرہ میں ہے

﴿۲۳﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُكْثِرُ أَنْ يَقُوْلَ يَامُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ فَقُلْتُ يَانَبِيَّ اللهِ آمَنَّا بِكَ وَبِمَا جِئْتَ بِهٖ فَهَلْ تَخَافُ عَلَيْنَا قَالَ نَعَمْ اِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ اللهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه)[5]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ اکثر وبیشتر بطور دعا کے یہ فرماتے تھے ''اے قلوب کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ! میں نے کہا یا رسول اللہ! ہم آپ ﷺ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے دین وشریعت پر بھی ایمان لائے تو کیا اب بھی ہمارے بارے میں آپ ڈرتے ہیں (کہ کہیں ہم گمراہ نہ ہو جائیں)'' آپ ﷺ

[1] اخرجه احمد ۲/۱۶۷ والترمذی ۲۶۴۲ [2] المرقات ۱/۳۰۲ [3] المرقات ۱/۳۰۳

[4] اشعة اللمعات ۱/۱۱۰ [5] اخرجه الترمذی ۲۱۴۰ وابن ماجه ۳۸۳۴

نے فرمایا ہاں تم پر ڈرتا ہوں کیونکہ ''بے شک قلوب اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ (یعنی اس کے تصرف و اختیار میں ہیں) اور وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو گردش میں لاتا ہے''۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

توضیح: فهل تخاف علینا: یعنی آپ تو معصوم ہیں آپ نے اوروں کی ہدایت کے لئے دین وشریعت پیش کیا ہے آپ کے بارے میں احتمال نہیں کہ سرمو راہ ہدایت سے بھٹک جائیں تو اب ظاہر یہ ہے کہ یہ دعا آپ ہمارے لئے کرتے ہوں گے تو کیا شریعت پر ایمان لانے کے باوجود آپ کی موجودگی میں بھی ہمارے گمراہ ہونے کا احتمال ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا "نعم" ہاں تمہارے پھر جانے سے ڈرتا ہوں کیونکہ انسان کا دل رحمان کی دو انگلیوں کے درمیان ہے لہٰذا کسی وقت بھی بھٹکنے کا خطرہ ہے اس لئے ہر وقت حفاظت ایمان کی دعا کرنی چاہیئے۔[1]

﴿۲۴﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَثَلُ الْقَلْبِ كَرِيْشَةٍ بِأَرْضٍ فَلَاةٍ يُقَلِّبُهَا الرِّيَاحُ ظَهْرًا لِبَطْنٍ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[2]

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''دل کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پر کسی میدان میں پڑا ہوا ہو اور ہوائیں اسے پیٹھ سے پیٹ اور پیٹ سے پیٹھ کی طرف پھیرتی رہتی ہیں''۔ (احمد)

توضیح: کریشة: ریشہ پرندے کے پر کو کہتے ہیں اس حدیث میں یہ انسانوں کے دلوں کا حال بتایا کہ کبھی برائی سے بھلائی کی طرف رخ کرتے ہیں اور کبھی بھلائی سے برائی کے راستہ پر جا لگتے ہیں جیسا کہ چٹیل میدان میں ہواؤں کے سامنے پرندوں کا پر ہو جو ہواؤں سے الٹ پلٹ ہو رہا ہو اور کسی بھی وقت ادھر ادھر ہو سکتا ہو یہ دل کے بہت جلدی بدلنے کو بیان کیا ہے کہ خواہشات کی وجہ سے وساوس اور ہواجس وخطرات کی وجہ سے کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے لہٰذا آدمی کو چوکنا رہنا چاہیئے۔[3]

ظهرًا البطن: یعنی اوپر نیچے ہو رہا ہو کبھی پیٹھ اور کبھی پیٹ کی طرف پلٹتا رہتا ہو۔[4]

چار چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے

﴿۲۵﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِأَرْبَعٍ يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ وَيُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَيُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه)[5]

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے ① اس بات کی گواہی دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ② اور میں بلاشبہ خدا کی جانب سے بھیجا ہوا رسول ہوں اور حق (دین اسلام) لے کر اس دنیا میں آیا ہوں ③ موت اور مرنے کے بعد (میدان

[1] المرقات ۱/۳۰۲ [2] اخرجه احمد ۴/۴۱۹ [3] المرقات ۱/۳۰۲ [4] المرقات ۱/۳۰۲ [5] اخرجه الترمذی ۲۱۴۵ وابن ماجه ۸۱

محشر میں) اٹھنے پر ایمان ④ اور تقدیر پر ایمان لانا۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

توضیح: یؤمن باربع: اقرار شہادتین کے ساتھ تقدیر کو جوڑا گیا اس سے یہ اشارہ کیا گیا کہ تقدیر کا ماننا اور شہادت ووحدانیت کا ماننا ایک ہی مقام رکھتا ہے شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ مومن بننے کیلئے اقرار شہادتین تو ضروری ہو اور تقدیر پر ایمان ضروری نہ ہو جس طرح حقیقت ایمان کا تحقق شہادتین کے ماننے سے ہوتا ہے اسی طرح تقدیر کا ماننا حقیقت ایمان کے لئے ضروری ہے یہ نہیں کہ اگر تقدیر پر ایمان نہیں تو ایمان کامل نہیں ہوگا بلکہ ناقص ہوگا فرمایا ایسا نہیں بلکہ اگر تقدیر پر ایمان نہیں تو ایمان ہی نہیں ایمان بالموت کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا فانی ہے تمام چیزیں عارضی اور فانی ہیں اور ہر ذی روح کیلئے موت لازمی اور یقینی ہے اور یہ موت درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اگر چہ اس کی نسبت خارجی حوادث کی طرف ہوتی ہے۔[1]

سوال: یہاں پانچ چیزوں کا ذکر ہوا ہے اور حکم چار کا تھا؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ شہادتین میں "انی رسول اللہ" الگ نمبر نہیں بلکہ یہ شہادت کے ضمن میں ہے۔

والبعث: یعنی اس پر ایمان ہو کہ قیامت آئے گی ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا انسان جسد عنصری کے ساتھ وہاں حاضر ہوگا حساب دے گا اگر کامیاب ہوگیا تو جنت میں جائے گا ورنہ دوزخ میں جائے گا۔ **ویؤمن باللہ ایمان بالقدر** میں جو مباحث تھے وہ ابتداء میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تقدیر مقرر فرما کر تسلی اور صبر کا بڑا سامان فراہم کیا ہے پس جو لوگ تقدیر کو مانتے ہیں وہ ہر مصیبت پر یہ کہتے ہیں کہ بس تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا تقدیر کا فیصلہ تھا اس سے حادثہ کے وقت بہت ہی سہارا ملتا ہے لیکن جو لوگ تقدیر کو نہیں مانتے جیسے کافر یا منکرین تقدیر تو وہ حادثہ کے وقت سوائے درد وغم اور افسوس والم کے کیا حاصل کرسکتے ہیں ان کے پاس سہارے کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا چنانچہ غم برداشت کرتے کرتے پگھل جاتے ہیں۔[2]

۱۱ محرم ۱۴۱۰ھ

قدریہ جبریہ کون ہیں؟

﴿۲۶﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صِنْفَانِ مِنْ أُمَّتِي لَيْسَ لَهُمَا فِي الْإِسْلَامِ نَصِيْبٌ اَلْمُرْجِئَةُ وَالْقَدَرِيَّةُ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ)[3]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں دو فرقے ایسے ہیں جن کو اسلام کا کچھ بھی حصہ نصیب نہیں ہے اور وہ "مرجئہ" و "قدریہ" ہیں۔ ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

توضیح: صنفان من امتی: اس حدیث میں دو قسم کے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا کہ اگر چہ یہ لوگ

[1] اشعة اللمعات ۱/۱۱۱ [2] المرقات ۱/۳۰۵ [3] اخرجه الترمذی: ۲۱۳۹

اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کریں گے لیکن اسلام میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے ایک قدریہ کی جماعت اور دوسرے مرجۂ کی جماعت۔

امتی: امت کی دو قسمیں ہیں امت دعوت اور امت اجابت۔ امت دعوت میں وہ تمام جن و انس داخل ہیں جو حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے قیامت تک وجود میں آئیں گے اور جنہوں نے اسلام کو اب تک قبول نہیں کیا ہے جب تک وہ کفر پر قائم رہیں گے امت دعوت میں شمار ہوں گے امت اجابت سے مراد امت کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کو قبول کر لیا۔[1]

مرجئه: سے مراد جبریہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ بندہ مجبور محض ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ کوئی گناہ مضر نہیں ہے جس طرح کفر کے ساتھ کوئی نیکی معتبر نہیں ہے ان کے نزدیک انسان مجبور محض اور اپنے اعمال میں بے بس ہے یہ لوگ اسباب کے قائل نہیں، کہتے ہیں کہ اعمال کی نسبت انسان کی طرف ایسی ہے جیسے پتھر یا درخت کی طرف کسی عمل کو منسوب کیا جائے مرجئہ سے مشہور فرقہ مرجئہ مراد نہیں ہے۔[2]

قدریه: اس فرقہ کو یا تو اس لئے قدریہ کہتے ہیں کہ یہ تقدیر کے منکر ہیں یا اس لئے ان کو قدریہ کہتے ہیں کہ یہ زیادہ تر بحث تقدیر میں کرتے رہتے ہیں یا اس لئے ان کو قدریہ کہتے ہیں کہ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنے افعال کی تخلیق کی قدرت دے دی ہے افعال کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ افعال خیر کا خالق اللہ ہے اور افعال شر کا خالق نفس امارہ یا شیطان ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ قدریہ کا عقیدہ یہ ہے کہ افعال خیر کا خالق ''نور'' ہے اور افعال شر کا خالق ''ظلمت'' ہے دوسری حدیث میں ان کو اس امت کے مجوسی قرار دیا گیا ہے کیونکہ مجوسی بھی افعال کے دو خالق مانتے ہیں خیر کے افعال کا خالق ان کے ہاں ''یزدان'' اور شر کا خالق ''اہرمن'' ہے بہر حال یہ دونوں فرقے ایک حد تک گمراہ ہیں نور و ظلمت کی طرف افعال کو منسوب کرنے والوں کے بارے میں متنبی کہتا ہے۔[3]

وکم لظلام اللیل عندی نعمة تخبر ان المانویة تکذب

لیس لهما فی الاسلام نصیب: جبریہ اور قدریہ کے بارے میں سلف صالحین کی دو رائیں ہیں۔

بعض نے ان کو کافر قرار دیا ہے اور بعض نے کافر نہیں کہا بلکہ مبتدع اور فاسق فاجر کہا ہے دونوں قولوں پر اس مذکورہ حدیث کی وجہ سے اشکال اٹھتا ہے اگر ان کو کافر کہا جائے تو اعتراض یہ ہے کہ حدیث میں ان کو ''من امتی'' فرمایا ہے اگر ان کو صرف فاسق مبتدع کہا جائے تو اشکال یہ ہے کہ حدیث میں ان کے متعلق فرمایا کہ **''لیس لهما فی الاسلام نصیب''** جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کافر ہیں اسلام سے خارج ہیں۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اہل تاویل ہیں ان کی تکفیر نہیں کرنی چاہیئے جمہور اہل السنۃ بھی کہتے ہیں کہ ان کی تکفیر سے زبان کو روکا جائے کیونکہ یہ لوگ صریح کفر کا اقرار نہیں کرتے اور نہ کفر کا ارادہ رکھتے ہیں اگرچہ ان کے عقائد خطرناک حد تک جا پہنچے ہیں لیکن انہوں نے کفر کا ارادہ نہیں کیا ہے اور تاویل کرتے ہیں اس لئے ان کے متعلق احادیث

---

[1] اخرجه الترمذی ۱/۳۰۶ [2] المرقات ۱/۳۰۶ [3] المرقات ۱/۳۰۶، ۳۰۷

میں جو وعیدات ہیں یا تکفیر کے اشارات ہیں علماء اور محدثین اس میں تاویل کرتے ہیں۔ مثلاً مذکورہ حدیث میں نصیب سے مراد یا تو یہ ہے کہ کامل حصہ اسلام کا ان کو نہیں ملا یہ ناقص مسلمان ہیں یا نصیب بخت وقسمت کے معنی میں ہے کہ یہ بد بخت ہیں بدنصیب ہیں یا یہ تغلیظ وتشدید پر محمول ہے اب رہ گیا مذکورہ حدیث پر اوپر مذکور دوطرح کا اشکال تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے اوپر گزر چکا ہے کہ امت دو قسم پر ہے امت اجابت اور امت دعوت۔ حدیث میں ان کو امتی سے جو یاد کیا ہے اس سے امت دعوت مراد لی جاسکتی ہے اور یہ ان لوگوں کی رائے کے مطابق ہوگا جو ان کی تکفیر کرتے ہیں اور جو لوگ تکفیر نہیں کرتے وہ ''نصیب'' میں وہی تاویل کرتے ہیں جو اوپر متعدد اقوال میں گزر گئی ہے۔ [۱]

تقدیر کے منکرین کو سزا

﴿۲۳﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ يَكُوْنُ فِي أُمَّتِي خَسْفٌ وَمَسْخٌ وَذٰلِكَ فِي الْمُكَذِّبِيْنَ بِالْقَدَرِ۔ (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ نَحْوَهُ)[۲]

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دوعالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''میری امت میں (خدا کے دردناک عذاب) زمین میں دھنس جانا اور صورتوں کا مسخ ہو جانا بھی ہوگا اور یہ عذاب ان لوگوں پر ہوگا جو تقدیر کے منکر ہیں (ابوداؤد) امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

توضیح: خسف: زمین میں دھنس جانے کو خسف کہتے ہیں مسخ شکل بگڑ جانے کو مسخ کہتے ہیں "هو تحويل صورة الى ما هو اقبح منها"۔ اس مسخ کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ ابدان واجسام اور چہرے سب کچھ خنازیر اور بندروں کی شکل میں بدل جائیں جیسے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوموں میں ہوا بعض حضرات نے "خسف" سے چہروں کا سیاہ ہونا اور مسخ سے دلوں کا سیاہ ہونا مراد لیا ہے یہ "خسف" اور یہ "مسخ" تو روز روشن کی طرح اس امت میں عام ہے۔ [۳]

سوال: سوال یہ ہے کہ خسف اور مسخ کا عذاب سابقہ امتوں پر آتا تھا اس امت کے لئے آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی جو قبول ہوئی پھر خسف اور مسخ کیسے؟

جواب: اس کا ایک جواب یہ ہے کہ سابقہ امتوں میں یہ عذاب بطور عموم آتا تھا وہ اس امت کے لئے اب بھی منفی ہے حدیث میں جس عذاب کا ذکر ہے وہ ایک مخصوص فرقہ کے لئے مخصوص احوال میں ہے۔ [۴]

اس امت کے مجوس

﴿۲۸﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْقَدَرِيَّةُ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِنْ مَرِضُوْا فَلَا تَعُوْدُوْهُمْ وَإِنْ مَاتُوْا فَلَا تَشْهَدُوْهُمْ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ)[۵]

---

[۱] المرقات ۱/۳۰۶ [۲] اخرجه ابو داؤد ۴۶۱۳ والترمذی ۲۱۵۲ [۳] المرقات ۱/۳۰۷

[۴] المرقات ۱/۳۰۷ [۵] اخرجه احمد ۲/۱۲۵ وابو داؤد ۴۶۹۱

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "فرقہ قدریہ اس امت کے مجوس ہیں لہٰذا اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت کے لئے نہ جاؤ اور اگر وہ مر جائیں تو ان کے جنازہ میں شریک مت ہونا"۔ (احمد، ابوداؤد)

توضیح: القدریہ مجوس ھذہ الامۃ: قدریہ کو اس لئے مجوس کہا گیا کہ مجوس بھی تعدد خالق کے قائل ہیں ان کے ہاں ایک خالق خیر ہے جس کو وہ لوگ "یزدان" کہتے ہیں اور دوسرا خالق شر ہے جس کو وہ لوگ "اہرمن" کہتے ہیں یزدان گویا ان کے ہاں رحمان ہے اور اہرمن شیطان ہے قدریہ چونکہ تقدیر کے منکر ہیں اور بندوں کے افعال کا خالق بندوں کو قرار دیتے ہیں اس لئے ان کو اس امت کا مجوسی قرار دیا لیکن یہ مجوسیوں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ مجوسی صرف دو خداؤں کے قائل ہیں اور قدریہ معتزلہ بے شمار خالقوں کو مانتے ہیں۔[۱]

فلا تعودوھم: یعنی ان کی عیادت نہ کرو جو لوگ قدریہ کو کافر مانتے ہیں ان کے نزدیک تو یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ کافر ہیں تو ان کی عیادت نہ کرو بلکہ سوشل بائیکاٹ رکھو اور جو لوگ قدریہ کی تکفیر نہیں کرتے ان کے نزدیک یہ کلام تغلیظ و تشدید اور زجر و توبیخ پر مبنی ہے۔[۲]

وان ماتوا: یعنی مرنے کے بعد ان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کرو اس کا مطلب بھی وہی ہے جو پہلے جملے کا ہے۔[۳]

اہل باطل سے میل جول نہ رکھو

﴿۲۹﴾ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَا تُجَالِسُوْا أَهْلَ الْقَدَرِ وَلَا تُفَاتِحُوْهُمْ. (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ)[۴]

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "قدریہ کی ہم نشینی اختیار نہ کرو اور نہ ان کو اپنا حکم ثالث بناؤ"۔ (ابوداؤد)

توضیح: لا تجالسوا: یہ ایک نمونہ ہے جس سے امت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اہل باطل اہل نفاق اور بدعقیدہ اور گمراہ لوگوں کی مجالس سے اجتناب رکھو اور ان سے اختلاط نہ رکھو خاص کر جو لوگ دین اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں ان سے میل جول رکھنا تو درحقیقت ان کے اعمال میں شریک ہونا ہے۔[۵]

ولا تفاتحوھم: اس جملہ کے کئی مطالب ہیں: ① ان کے پاس فیصلے نہ لے جاؤ فتاحہ کا معنی فیصلہ ہے۔ ② ان سے ابتداء میں سلام کلام نہ کرو۔ ③ ان سے مناظرہ نہ کرو کیونکہ وقت ضائع ہوگا اور فائدہ کی امید نہیں بلکہ نقصان کا خطرہ ہے۔[۶]

چھ قسم کے لوگوں پر لعنت کی گئی ہے

﴿۳۰﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَكُلُّ نَبِيٍّ يُجَابُ. اَلزَّائِدُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَالْمُكَذِّبُ بِقَدَرِ اللّٰهِ وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبَرُوْتِ لِيُعِزَّ مَنْ أَذَلَّهُ اللّٰهُ وَيُذِلَّ مَنْ أَعَزَّهُ

[۱] المرقات ۱/۳۰۸ [۲] المرقات ۱/۳۰۹ [۳] المرقات ۹/۳۰۹ [۴] اخرجہ ابوداؤد ۴۷۱۰ [۵] المرقات ۱/۳۰۹ [۶] المرقات ۱/۳۰۹

اللهُ وَالْمُسْتَحِلُّ لِحَرَمِ اللهِ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عِتْرَتِي مَا حَرَّمَ اللهُ وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِي۔

(رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الْمَدْخَلِ وَرَزِيْنٌ فِي كِتَابِهِ)[1]

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''چھ شخص ایسے ہیں جن پر میں لعنت بھیجتا ہوں اور خدا نے بھی ان کو ملعون قرار دیا ہے اور ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے (پہلا) کتاب اللہ میں زیادتی کرنے والا (دوسرا) تقدیر الٰہی کو جھٹلانے والا (تیسرا) وہ شخص جو زبردستی غلبہ پانے کی بناء پر ایسے شخص کو معزز بنائے جس کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل کر رکھا ہو اور اس شخص کو ذلیل کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے عزت وعظمت کی دولت سے نواز رکھا ہو (چوتھا) وہ شخص جو حدود اللہ سے تجاوز کر کے اس چیز کو حلال جانے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہو۔ (پانچواں) وہ جو میری اولاد سے وہ چیز (قتل) حلال جانے جو اللہ نے حرام کی ہے اور (چھٹا) وہ شخص ہے جو میری سنت کو چھوڑ دے''۔ (بیہقی، رزین)

توضیح: وکل نبی یجاب: یعنی ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے تو میری بھی قبول ہوئی۔[2]

لعنتهم: لعنت دو قسم پر ہے: ① لعنت کفر وہ "ابعاد من رحمة الله" ہے جو کفار کے ساتھ خاص ہے۔

② دوم لعنت فسق ہے جو "ابعاد من رضاء الله" ہے یہ مسلم کے لئے ہے شریعت میں جو شخص قطعی طور پر کفر پر مرا ہے اس پر لعنت جائز ہے لیکن جس کی موت یقینی طور پر کفر پر نہ ہو تو اس پر لعنت بھیجنا جائز نہیں ہے مثلاً فرعون ابو جهل کی موت کفر پر یقینی ہے اور یزید کی موت کفر پر یقینی نہیں ہے تو اول پر لعنت جائز ثانی پر نہیں اسی طرح اسلام میں کسی معین شخص کو ملعون نہیں قرار دیا جا سکتا ہاں اعمال وافعال کی وجہ سے اجمالی طور پر لعنت فسق احادیث میں آئی ہے مذکورہ حدیث میں یہ چھ باتیں اگر کفار کے لئے ہیں تو یہ لعنت کفر ہے اور اگر یہ لوگ دائرہ اسلام میں ہیں تو یہ لعنت فسق ہے حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ تغلیظاً تشدیداً ہے۔[3]

❶ **الزائد فی کتاب الله:** اگر کتاب اللہ کے الفاظ میں کوئی زیادتی کرتا ہے یا اس کا قائل ہے تو وہ کافر ہے اور اگر معنوی طور پر تاویل وتحریف کرتا ہے تو وہ مبتدع اور فاسق فاجر ہے کہ مخالف شرع تاویل کرتا ہے۔[4]

❷ **المکذب بقدر الله:** یہ وہی معتزلہ خوارج اور قدریہ ہیں۔

❸ **المتسلط بالجبروت:** یعنی انتہائی تکبر اور غرور وتجبر سے حکومت پر غلبہ پانے والا ''لیعز'' یعنی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی وجہ سے عزت دی ان کو ذلیل کرے اور جن کو اللہ نے فسق کی وجہ سے ذلت دی اس کو عزت دے۔[5]

❹ **والمستحل لحرم الله:** ای بیت الله کہ حرم کعبہ میں قتل کرے شکار کرے اور گھاس کاٹے۔[6]

❺ **والمستحل من عترتی:** یعنی اہل بیت کے احترام کو پامال کرے ان کی تعظیم میں کوتاہی کرے ان کے حقوق کو غصب کرے ان کو ایذا پہنچائے۔[7]

---

[1] اخرجه البیهقی [2] المرقات ۱/۳۱۰ [3] المرقات ۱/۱۱ [4] المرقات ۱/۳۱۰

[5] المرقات ۱/۳۱۰ [6] المرقات ۱/۳۱۱ [7] المرقات ۱/۳۱۱

❻ التارك لسنتي: ترک سنت علی طریق الاهانه مراد ہے جیسے داڑھی کا مذاق اڑائے تو روح ایمان نہیں رہے گی اگرچہ کلمہ گو ہے۔[1]

جہاں موت آئے گی انسان وہاں جائے گا

﴿۳۱﴾ وَعَنْ مَطَرِ بْنِ عُكَامِسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا قَضَى اللّٰهُ لِعَبْدٍ أَنْ يَّمُوْتَ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهُ إِلَيْهَا حَاجَةً۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت مطر بن عکامس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کی موت کو کسی زمین میں مقدر کر دیتا ہے تو اس زمین کی طرف اس کی حاجت کو بھی پیدا کر دیتا ہے (تاکہ وہاں جانے پر مجبور ہو) اور وہاں جا کر موت کا شکار ہو"۔ (احمد، ترمذی)

توضیح: جعل له اليها حاجة: جس طرح اکثر لوگ کہتے ہیں کہ مجھے یہاں مٹی لے آئی ہے تو تقدیر کے تحت آدمی اس جگہ پہنچتا ہے جہاں اس کی موت مقدر ہوتی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر کا قصہ مشہور ہے کہ ملک الموت نے گھور گھور کر اس کو دیکھا اس نے ڈر کر حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ مجھے دور کسی جزیرہ میں لے چلو جب یہ جزیرہ پہنچ گیا تو موت کے فرشتے نے روح لے لی حضرت سلیمان علیہ السلام کے پوچھنے پر فرشتہ نے بتایا کہ اس کی موت یہاں مقدر تھی وقت کم تھا یہ یہاں سے کوسوں میل دور بیٹھا تھا تو میں نے یہ حربہ استعمال کیا یہ ڈر گیا یہاں آ گیا تو موت بھی آ گئی۔[3]

فوت شدہ چھوٹے بچے کا حکم

﴿۳۲﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ذَرَارِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ مِنْ آبَائِهِمْ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بِلَا عَمَلٍ قَالَ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ قُلْتُ فَذَرَارِيُّ الْمُشْرِكِيْنَ قَالَ مِنْ آبَائِهِمْ قُلْتُ بِلَا عَمَلٍ قَالَ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[4]

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا "یا رسول اللہ! (جنت و دوزخ کے سلسلہ میں) مسلمان بچوں کا کیا حکم ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا وہ اپنے باپوں کے تابع ہیں (یعنی وہ اپنے باپوں کے ساتھ جنت میں ہیں)۔" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ بغیر کسی عمل کے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ بچے جو کچھ کرنے والے تھے۔" میں نے پھر پوچھا۔ "اچھا مشرکوں کی اولاد کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "وہ بھی اپنے باپوں کے تابع ہیں" میں نے (تعجب سے) پوچھا۔ "بغیر کسی عمل کے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ بچے جو کچھ کرنے والے تھے۔ (ابوداؤد)

[1] المرقات ۱/۳۱۱ [2] اخرجه احمد ۵/۲۲۷ والترمذی ۲۱۳۶ [3] المرقات ۱/۳۱۲ [4] اخرجه ابو داؤد ۴/۲۲۸

اپنے بچے کو قتل کرنے والی ماں کی سزا

﴿۳۳﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلْوَائِدَةُ وَالْمَوْؤُدَةُ فِي النَّارِ. (رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ)[1]

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''(زندہ بچہ کو) گاڑنے والی (عورت) اور وہ جس کو گاڑا گیا دونوں دوزخ میں ہیں۔'' (ابوداؤد)

توضیح: الوائدة: زمانہ جاہلیت میں اولاد کو زندہ درگور کرنے کا عمل عرب کے امیر وغریب دونوں گھرانوں میں ہوتا تھا مگر دو قسم کے نظریات کے تحت یہ عمل ہو رہا تھا ① کہ فقر وفاقہ ہے یا آئندہ آجائے گا ② کہ میری بچی ہے کل کسی کی بیوی بنے گی اس کو کیسے برداشت کروں گا یہ شرم وعار کی بات ہے (حالانکہ خود بھی کسی کی بیوی سے پیدا ہوا تھا)[2]

جواب: شبہ یہ ہے کہ **وائدہ** زندہ درگور کرنے والی عورت تو ظاہری طور پر قاتلہ ہے جو دوزخی ہے لیکن یہ **موؤدة** مقتولہ کیوں دوزخ کی مستحق بن گئی؟ مقتولہ مظلومہ کا کیا قصور ہے۔

ترجمہ: **الوائدہ** سے مراد قابلہ دایہ ہے اور **الموودۃ** سے مراد **موؤدۃ لھا** ہے جو ماں ہے تو یہ دایہ اور ماں دونوں اس جرم میں شریک ہیں اس لئے اصحاب نار ہیں۔

ترجمہ: یہ کہ ظاہر حدیث سے اولاد کی تبعیت معلوم ہوتی ہے کہ ماں کافرہ دوزخی ہے تو بچی بھی اسی طرح ہے۔

ترجمہ: یہ کہ اس سے زندہ درگور ہونے والی بالغہ لڑکی مراد ہے تو اس وقت وہ خود کافرہ تھی۔[3]

۱۲ محرم ۱۴۱۰ھ

الفصل الثالث

پانچ چیزوں کا فیصلہ ہو چکا ہے

﴿۳۴﴾ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ فَرَغَ إِلٰى كُلِّ عَبْدٍ مِنْ خَلْقِهِ مِنْ خَمْسٍ مِنْ أَجَلِهِ وَعَمَلِهِ وَمَضْجَعِهِ وَأَثَرِهِ وَرِزْقِهِ. (رَوَاهُ اَحْمَدُ)[4]

ترجمہ: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اپنے ہر ایک بندے کے متعلق پانچ باتوں سے (تقدیر لکھ کر) فارغ ہو گیا ہے۔ ① اس کی موت (کہ کب آئے گی) ② اس کے (نیک وبد) اعمال۔ ③ اس کے رہنے کی جگہ۔ ④ اسکی واپسی کی جگہ ⑤ اور اس کا رزق۔ (احمد)

توضیح: **فرغ الی کل عبد: فرغ انتھی** کے معنی کو متضمن ہے اس لئے صلہ میں، الی، کا کلمہ آگیا ہے۔ مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے ہر بندے کے متعلق پانچ باتوں سے تقدیر لکھ کر فارغ ہو گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم ان پانچ چیزوں تک منتھی ہو گیا ہے۔[5]

---

[1] اخرجہ ابو داؤد ۴۷۱۷ [2] المرقات ۱/۳۱۲ [3] المرقات ۱/۳۱۳ [4] اخرجہ احمد: ۸/۱۹۷ [5] المرقات ۱/۳۱۶

خلقه: تخلیق کے معنی میں ہے یعنی ہر بندہ کی تخلیق کے پانچ کاموں سے فراغت ہوئی، یعنی دنیا میں جو چیزیں جس طرح آنے والی ہیں ازل میں اس کا فیصلہ ہوگیا ہے اس میں اب کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی ہے اور نہ اس میں کوئی تغیر آسکتا ہے چنانچہ ہرانسان کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے:

❶ کہ اس کی عمر کتنی ہے اور موت کب آئے گی اس میں ایک سیکنڈ کی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

❷ اسی طرح انسان کے اچھے اور برے اعمال کے بارے میں اس کی پیدائش سے پہلے لکھا جاچکا ہے کہ اس کا انجام خیر پر ہوگا یا شر پر ہوگا بعض نے کہا کہ **مضجع** سے مراد سکون وقرار ہے اور **اثر** سے مراد حرکت ہے انسان کی تمام کیفیات ان دو لفظوں میں آگئیں۔ یا **اثرہ** سے اقدام مراد ہیں کہ تقدیر میں لکھا جاچکا ہے کہ اس کے قدم کہاں کہاں پڑیں گے آیت "**ونکتب ما قدموا و آثارهم**" اس پر دلالت کرتی ہے۔

❺ اسی طرح انسان کے رزق کا مسئلہ تقدیر میں پہلے سے لکھا جاچکا ہے کہ کتنا رزق اس کو ملے گا کہاں کہاں سے کمائے گا کم ملے گا یا زیادہ ملے گا حلال ملے گا یا حرام ملے گا سب کچھ تقدیر میں پہلے سے لکھا گیا ہے۔[1]

تقدیر میں گفتگو نہ کرو

﴿۳۵﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ تَكَلَّمَ فِيْ شَيْءٍ مِنَ الْقَدَرِ يُسْئَلُ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَمْ يَتَكَلَّمْ فِيهِ لَمْ يُسْئَلُ عَنْهُ۔ (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه)[2]

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے "جو شخص تقدیر کے مسئلہ میں بحث ومباحثہ کرے گا قیامت میں اس سے باز پرس ہوگی اور جو (شخص اس پر ایمان لاکر) خاموشی اختیار کرے گا وہ اس مواخذہ سے بچ جائے گا"۔ (ابن ماجہ)

توضیح: من تکلم: مباحثہ غیر ضروری مراد ہے کیونکہ اس کا انجام یا قدری ہے یا جبری ہے یا کفری ہے اس لئے اس میں گفتگو سے منع کیا گیا ہے ہاں جس کو اعتماد ہو اور اس کو علمی پختگی کا مقام حاصل ہو اور وہ تردد سے پاک ہو تو اس کے لئے فرق باطلہ کے شکوک وشبہات دور کرنے کے لئے اور ان سے مباحثہ کرنے کے لئے ضروری حد تک مباحثہ جائز ہے تا کہ حق واضح ہوجائے علماء کرام اسی پختگی کے مقام پر تھے تو علم الکلام میں کلام کیا اور کتب تصنیف فرمائیں۔[3]

وہی ہوگا جو تقدیر میں لکھا ہے

﴿۳۶﴾ وَعَنِ ابْنِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ أَتَيْتُ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ لَهُ قَدْ وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ شَيْءٌ مِنَ الْقَدَرِ فَحَدِّثْنِيْ لَعَلَّ اللهَ أَنْ يُذْهِبَهُ مِنْ قَلْبِيْ فَقَالَ لَوْ أَنَّ اللهَ عَذَّبَ أَهْلَ سَمٰوَاتِهِ وَأَهْلَ أَرْضِهِ عَذَّبَهُمْ هُوَ

[1] المرقات ۱/۳۱۶ [2] اخرجہ ابن ماجہ [3] المرقات ۱/۳۱۶

غَيْرُ ظَالِمٍ لَهُمْ وَلَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْرًا لَهُمْ مِنْ أَعْمَالِهِمْ وَلَوْ أَنْفَقْتَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا فِي سَبِيْلِ اللهِ مَا قَبِلَهُ اللهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ وَتَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَإِنَّ مَا أَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ وَلَوْ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ قَالَ ثُمَّ أَتَيْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ قَالَ ثُمَّ أَتَيْتُ حُذَيْفَةَ بْنَ الْيَمَانِ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ أَتَيْتُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَحَدَّثَنِي عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِثْلَ ذٰلِكَ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَه) [۱]

ترجمہ: حضرت ابن دیلمی رحمہ اللہ (تابعی) سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (صحابی) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ شبہات پیدا ہو رہے ہیں (کہ جب تمام چیزیں نوشتہ تقدیر کے مطابق ہیں تو پھر یہ ثواب یا عذاب کیسا؟) تو اس بابت آپ مجھے کچھ بتائیں شاید اللہ تعالیٰ میرے دل کو اس شبہ سے پاک کردے (یہ سن کر) انہوں نے فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ آسمان والوں اور زمین والوں کو عذاب میں مبتلا کرے تو وہ ان پر کسی طرح کا ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ (یعنی وہ اہل زمین اور اہل آسمان کو کتنا ہی عذاب دے اسے ظالم نہیں کہا جائے گا) اور اگر وہ ان کو اپنی رحمت سے نواز دے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے یقیناً بہتر ہوگی۔ اور اگر تم خدا کی راہ میں احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو تو تمہارا یہ عمل خیر خدا کے نزدیک اس وقت تک قبول نہیں ہوگا جب تک کہ تم تقدیر پر کامل اعتقاد و ایمان نہ رکھو اور یہ سمجھ لو کہ جو کچھ تم کو پہنچا ہے وہ (رکنے) اور خطا کرنے والا نہ تھا اور جو چیز رک گئی اور تمہیں نہیں پہنچی تو (سمجھو کہ) وہ تمہارے مقدر میں نہیں تھی۔ اور اگر تم اس حالت میں مرجاؤ کہ اس کے خلاف عقیدہ ہو (یعنی تقدیر پر کامل ایمان نہ ہو) تو یقیناً دوزخ میں جاؤ گے۔" ابن دیلمی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا یہ بیان سن کر میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے بھی یہی بیان کیا پھر حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو انہوں نے بھی یہی کہا اور پھر میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا انہوں نے بھی اس قسم کی حدیث کو رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا۔ (احمد، داؤد، ابن ماجہ)

توضیح: شيئ من القدر: یعنی میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ شبہات پیدا ہو گئے ہیں کہ جب سب کچھ پہلے سے مقدر میں لکھا جا چکا ہے تو پھر ثواب وعتاب کا قانون کس لئے ہے؟

یعنی یہ اضطرابی کیفیات اور یہ ہواجس باعث پریشانی ہیں اگرچہ باعث مواخذہ نہیں۔ [۲]

فحدثني: یعنی کوئی تسلی والی بات بیان کریں یا کوئی حدیث نبوی بیان کردیں۔ [۳]

"وهو غير ظالم لهم": کیونکہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اس لئے اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے تصرف کا حق حاصل ہے اور اپنی ملکیت میں کسی قسم کا تصرف ظلم نہیں اس سے فرقۂ قدریہ اور خوارج کی تردید مقصود ہے کہ وہ ہر تصرف کو اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں سمجھتے ہیں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے جب اس تابعی نے پوچھا تو آپ نے

[۱] اخرجہ احمد ۸۲/۵ وابو داؤد وابن ماجہ:۷۷ [۲] المرقات ۱/۳۱۸ [۳] المرقات ۱/۳۱۸

اس حدیث کو مرفوع حدیث کے طور پر بیان کیا۔[1]

ولو رحمهم: اس سے معلوم ہوا کہ دخول جنت کے لئے علت اعمال نہیں بلکہ رحمت خدا ہے اعمال صرف علامات ہیں۔

و تعلم: یہ توقن کے معنی میں ہے یعنی یقین کرلو۔[2]

لم یکن لیخطئك: یعنی وہ چیز ایسی نہیں تھی کہ تجھ کو نہ پہنچتی تو یہ خیال نہ کرو کہ یہ میری محنت وکوشش کی وجہ سے مجھے حاصل ہوئی ہے بلکہ وہ تقدیر میں پہلے سے لکھی ہوئی تھی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں اور انسانی محنت وکوشش تقدیر کے ماتحت ہے۔[3]

منکرین تقدیر پر پتھر برسیں گے

﴿۳۷﴾ وَعَنْ نَافِعٍ أَنَّ رَجُلاً أَتَى ابْنَ عُمَرَ فَقَالَ إِنَّ فُلاَناً يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلاَمَ فَقَالَ إِنَّهُ بَلَغَنِي أَنَّهُ قَدْ أَحْدَثَ فَإِنْ كَانَ قَدْ أَحْدَثَ فَلاَ تُقْرِئْهُ مِنِّي السَّلاَمَ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ يَكُونُ فِي أُمَّتِي أَوْ فِي هٰذِهِ الْأُمَّةِ خَسْفٌ وَمَسْخٌ أَوْ قَذْفٌ فِي أَهْلِ الْقَدَرِ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُودَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ)[4]

ترجمہ: حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ''فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے۔'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس شخص نے دین میں (کوئی) نئی بات نکالی ہے۔ اگر واقعی اس نے دین میں (کوئی) نئی بات پیدا کی ہے تو میری طرف سے (جواب میں) اسے سلام نہ پہنچاؤ۔ اس لئے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت میں سے یا یہ فرمایا کہ اس امت میں سے (خدا کے) دردناک عذاب زمین میں دھنس جانا اور صورت کا مسخ ہوجانا یا سنگباری، اہل قدر (یعنی تقدیر کا انکار کرنے والوں) پر ہوں گے۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ) اور امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح وغریب ہے۔

توضیح: فلا تقرئه مني السلام: سلام کے مسائل وفضائل انشاء اللہ مشکوٰۃ کے باب السلام میں آئیں گے یہاں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کے سلام کے پیغام کے جواب میں قاصد سے فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سلام بھیجنے والے نے کچھ نئے نظریات اور نئی بدعات ایجاد کی ہیں اگر ایسا ہے تو میرا سلام ان کو نہ کہنا، اس سے معلوم ہوا کہ دین اسلام میں بدعت گھڑنے والے کو سلام کرنا جائز نہیں، اسی لئے فقہاء کرام نے اہل بدعت کے ساتھ اختلاط اور ان کے اکرام وتعظیم کو مکروہ لکھا ہے۔[5]

او قذف: یعنی تقدیر کے منکرین پر آسمان سے پتھر برسیں گے قوم لوط کی لواطت کی وجہ سے اس قوم پر آسمان سے

[1] المرقات ۱/۳۱۸ [2] المرقات ۱/۳۱۸ [3] المرقات ۱/۳۱۹

[4] اخرجه الترمذی ۲۱۵۲ وابو داؤد ۴۶۱۳ وابن ماجه ۴۰۶ [5] المرقات ۱/۳۱۸

پتھروں کی بمباری ہوئی تھی یہاں منکرین تقدیر کے بارے میں پتھروں کے برسنے کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیح عمل منکرین تقدیر میں بھی بڑے پیمانے پر ہوگا۔[1]

اپنے بچوں کے بارے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا سوال

﴿۳۸﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ سَأَلَتْ خَدِيجَةُ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ وَلَدَيْنِ مَاتَا لَهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ هُمَا فِي النَّارِ قَالَ فَلَمَّا رَأَى الْكَرَاهَةَ فِي وَجْهِهَا قَالَ لَوْ رَأَيْتِ مَكَانَهُمَا لَأَبْغَضْتِهِمَا قَالَتْ يَا رَسُولَ اللهِ فَوَلَدِي مِنْكَ قَالَ فِي الْجَنَّةِ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِنَّ الْمُؤْمِنِينَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي الْجَنَّةِ وَإِنَّ الْمُشْرِكِينَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي النَّارِ ثُمَّ قَرَأَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ۔

(رواہ احمد)[2]

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سرکار دو عالم ﷺ سے اپنے ان دو بچوں کے بارے میں پوچھا جو زمانہ جاہلیت میں (اسلام سے پہلے) مر گئے تھے (کہ وہ جنتی ہیں یا دوزخی) سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ وہ دونوں (بچے) دوزخ میں ہیں۔" حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے چہرہ کا رنگ (اپنے بچوں کے بارے میں یہ سن کر) بدلا ہوا (یعنی ان کو رنجیدہ) دیکھا تو فرمایا "اگر تم ان (بچوں) کے ٹھکانے اور ان کا حال دیکھو کہ وہ کس طرح خدا کی رحمت سے دور ہیں تو تم کو ان (بچوں) سے نفرت ہو جائے گی پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا "یا رسول اللہ! اچھا میری وہ اولاد جو آپ ﷺ سے پیدا ہوئی ہے (یعنی قاسم اور عبداللہ) آپ ﷺ نے فرمایا وہ جنت میں ہیں اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ "مومنین اور ان کی اولاد جنت میں ہیں۔ اور مشرکین اور ان کی اولاد دوزخ میں ہیں اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

والذین امنوا واتبعتهم ذریتهم بایمان الحقنا بهم ذریتهم۔ (الطور)

ترجمہ: (جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ان کی اطاعت کی (تو) ہم ان کی اولاد کو (جنت میں) انہیں کے ساتھ رکھیں گے۔ (احمد)

توضیح: عن ولدین: حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے ان دو بچوں کے متعلق پوچھا جو پہلے شوہر "ہالہ" سے تھے اور جاہلیت میں مر چکے تھے آنحضرت ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ وہ دونوں دوزخ میں ہیں، اس روایت سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ اولاد اپنے والدین کے تابع ہوگی۔ یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔[3]

لو رأیت مکانهما: یعنی ان بچوں کے مستقبل کو اگر تو دیکھ لیتی اور ان کا مبغوض عند اللہ ہونا تمہیں معلوم ہوتا تو تم خود ان کو مبغوض سمجھتی کیونکہ ان کا مستقبل تقدیر کے حوالہ سے انتہائی تاریک اور ڈراونا تھا۔[4]

---

[1] المرقات ۱/۳۲۰ [2] اخرجه احمد: ۱/۱۳۴ [3] المرقات ۱/۳۲۱ [4] المرقات ۱/۳۲۱

واتبعتھم ذریتھم: آنحضرت ﷺ نے بطور استشہاد یہ آیت تلاوت فرمائی کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے وہ بچے ملا دیئے جائیں گے جن بچوں نے والدین کی طاعت کی تا کہ جنت میں والدین کو کمال خوشی حاصل ہو جائے اور مشرکین کی اولاد کو دوزخ میں ان کے ساتھ ملا دیا جائے گا تا کہ کفار کو دوزخ میں کمال غم حاصل ہو جائے اب سوال یہ ہے کہ بیوی بچوں کے اس ملانے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت تو کمال درجہ کی ہوئی لیکن غیر نبی کو نبی کے مقام میں کیسے پہنچایا جائے گا مثلاً انبیاء کرام کی زوجات محترمات کو اور ان کی اولاد کو برابر کا درجہ کیسے حاصل ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے درجات تو بلند ہوں گے مگر لذت و استلذاذ میں فرق ہوگا مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کھانے میں وہ لذت نہیں پائیں گی جو نبی اکرم ﷺ کو نبوت کے درجہ کی وجہ سے حاصل ہوگی۔[1]

حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی کچھ عمر دے دی

﴿۳۹﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَمَّا خَلَقَ اللهُ آدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَسَقَطَ مِنْ ظَهْرِهِ كُلُّ نَسَمَةٍ هُوَ خَالِقُهَا مِنْ ذُرِّيَّتِهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَجَعَلَ بَيْنَ عَيْنَيْ كُلِّ إِنْسَانٍ مِنْهُمْ وَبِيصًا مِنْ نُورٍ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى آدَمَ فَقَالَ أَيْ رَبِّ مَنْ هٰؤُلَاءِ قَالَ ذُرِّيَّتُكَ فَرَأَى رَجُلًا مِنْهُمْ فَأَعْجَبَهُ وَبِيصُ مَا بَيْنَ عَيْنَيْهِ قَالَ أَيْ رَبِّ مَنْ هٰذَا قَالَ دَاوُدُ فَقَالَ أَيْ رَبِّ كَمْ جَعَلْتَ عُمْرَهُ قَالَ سِتِّينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ زِدْهُ مِنْ عُمْرِي أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَلَمَّا انْقَضَى عُمْرُ آدَمَ إِلَّا أَرْبَعِينَ جَاءَهُ مَلَكُ الْمَوْتِ فَقَالَ آدَمُ أَوَلَمْ يَبْقَ مِنْ عُمْرِي أَرْبَعُونَ سَنَةً قَالَ أَوَلَمْ تُعْطِهَا ابْنَكَ دَاوُدَ فَجَحَدَ آدَمُ فَجَحَدَتْ ذُرِّيَّتُهُ وَنَسِيَ آدَمُ فَأَكَلَ مِنَ الشَّجَرَةِ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهُ وَخَطَأَ آدَمُ وَخَطَأَتْ ذُرِّيَّتُهُ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا (تو) ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا (یعنی فرشتے کو ہاتھ پھیرنے کا حکم دیا) چنانچہ ان کی پشت سے وہ تمام جانیں نکل پڑیں جن کو آدم علیہ السلام کی اولاد میں اللہ تعالیٰ قیامت تک پیدا کرنے والا تھا اور ان میں سے ہر ایک شخص کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھی پھر ان سب کو آدم علیہ السلام کے روبرو کھڑا کیا (ان سب کو دیکھ کر) آدم علیہ السلام نے پوچھا "پروردگار! یہ کون ہیں؟ پروردگار نے فرمایا "یہ سب تمہاری اولاد ہے" آدم علیہ السلام نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا جس کی آنکھوں کے درمیان غیر معمولی چمک ان کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ پوچھا پروردگار یہ کون ہے؟ فرمایا یہ داؤد (علیہ السلام) ہیں۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا "میرے پروردگار! تو نے ان کی عمر کتنی مقرر کی ہے؟" فرمایا "ساٹھ برس" حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا "میرے پروردگار اس کی عمر میں میری عمر سے چالیس سال زیادہ کر دے۔ (راوی کہتے ہیں کہ) سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر میں چالیس سال باقی رہ گئے

---

[1] المرقات ۱/۳۲۲ [2] اخرجہ الترمذی ۳۰۷۶، ۳۰۷۸

تو موت کا فرشتہ ان کے پاس آیا حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے کہا ''کیا ابھی میری عمر میں چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ ملک الموت نے کہا ''کیا آپ نے اپنی عمر میں سے چالیس سال اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دیئے تھے؟'' چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے انکار کیا اور ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے اور آدم علیہ السلام (اپنے عہد) کو بھول گئے، انہوں نے شجر ممنوعہ کو کھالیا اور ان کی اولاد بھی بھولتی ہے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام نے خطاء کی تھی اور ان کی اولاد بھی خطاء کرتی ہے۔'' (ترمذی)

توضیح: وبیصًا: "ای لمعانًا وشعاعًا من نور" اس نور کی چمک سے مراد ہدایت کی وہ استعداد ہے جو اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو عطا کی ہے حضرت داؤد علیہ السلام میں یہ نور زیادہ چمک دمک کے ساتھ روشن تھا اب سوال یہ ہے استعداد کی یہ روشنی حضرت داؤد علیہ السلام میں اگر زیادہ تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا کہا جائے گا اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ ایک جزئی فضیلت تھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کلی فضیلت حاصل ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ محاورہ کلام کا دستور ہے کہ متکلم اپنے کلام سے خارج اور مستثنیٰ ہوتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کی روشنیوں کا ذکر فرمایا ہے خود آپ کی روشنی اعلیٰ وارفع ہوگی مگر وہ محل بحث نہیں تھی اس لئے اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ [1]

قال داؤد: یعنی استعداد کی یہ روشنی حضرت داؤد علیہ السلام کی پیشانی میں سب سے زیادہ تھی تو حضرت آدم علیہ السلام نے ان کو پسند کر کے ان کے بارے میں سوال کیا۔

جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ داؤد ہے، حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام میں خلافت ارضی کی قدر مشترک مناسبت موجود تھی اور ان دونوں کو خلیفہ کے لقب سے اس طرح یاد کیا گیا **"یا داؤد انا جعلناك خليفة فى الارض"** اور **"انى جاعل فى الارض خليفة"** اسی مناسبت کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی نظر انتخاب حضرت داؤد علیہ السلام پر پڑی۔ [2]

اربعين سنة: اس حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ آیا ہے کہ آپ نے اپنی عمر سے چالیس سال حضرت داؤد علیہ السلام کو دے دیئے تھے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر ساٹھ سال تھی لیکن مشکوٰۃ شریف جلد دوم باب السلام فصل سوم ص ۴۰۰ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس طرح آیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر چالیس سال تھی اور حضرت آدم علیہ السلام نے ان کو ساٹھ سال دے دیئے تو دونوں حدیثوں میں واضح تعارض اور تضاد ہے۔ [3]

اس کے جواب میں علماء نے لکھا ہے کہ مذکورہ حدیث اور اس کا عدد صحیح ہے اور جلد دوم میں کسی راوی سے سھو ہوگیا ہے اس نے چالیس کو ساٹھ کی جگہ رکھ دیا اور ساٹھ کو چالیس کی جگہ بیان کیا ہے۔

فجحد آدم: یہ جحود عنادی نہیں تھا بلکہ جحود نسیانی تھا چونکہ عالم ارواح کا معاملہ تھا تو زمانے کے گزرنے سے ذہول آ گیا، باقی یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ معاملہ عالم ارواح کا تھا اب عالم شہود میں اگر کوئی شخص اپنی عمر کسی کو دینا چاہتا ہے تو یہ ناجائز بھی ہے اور ناممکن بھی ہے کیونکہ تعین عمر اور تعین موت دونوں امور تکوینیہ میں سے ہیں اس میں کسی کو مداخلت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

---

[1] المرقات ۱/۳۲۳ [2] المرقات ۱/۳۲۳ [3] المرقات ۱/۳۲۴

نکتہ:

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد انبیاء کرام میں نبوت اور خلافت کو اللہ تعالیٰ نے الگ الگ رکھا تھا کہ جو نبی ہوتا وہ خلیفہ نہیں ہوتا تھا اور جو خلیفہ ہوتا وہ نبی نہیں ہوسکتا تھا اللہ تعالیٰ نے نبوت اور خلافت کو حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام پر جمع فرمادیا۔[1]

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد

﴿۴۰﴾ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ خَلَقَ اللهُ آدَمَ حِيْنَ خَلَقَهُ فَضَرَبَ كَتِفَهُ الْيُمْنٰى فَأَخْرَجَ ذُرِّيَّةً بَيْضَاءَ كَأَنَّهُمُ الذَّرُّ وَضَرَبَ كَتِفَهُ الْيُسْرٰى فَأَخْرَجَ ذُرِّيَّةً سَوْدَاءَ كَأَنَّهُمُ الْحُمَمُ فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَمِيْنِهِ إِلَى الْجَنَّةِ وَلَا أُبَالِيْ وَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ كَتِفِهِ الْيُسْرٰى إِلَى النَّارِ وَلَا أُبَالِيْ۔

(رَوَاهُ أَحْمَدُ)[2]

ترجمہ: حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کے داہنے مونڈھے پر ہاتھ (یعنی دست قدرت) مارا (یا مارنے کا حکم دیا) اور اس سے سفید اولاد نکالی گویا کہ وہ چیونٹیاں ہوں پھر بائیں مونڈھے پر ہاتھ مارا اور اس سے سیاہ اولاد نکالی گویا کہ وہ کوئلہ ہوں پھر خدا نے دائیں طرف والی اولاد کے بارے میں فرمایا کہ یہ جنتی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں اور ان (آدم) کے بائیں مونڈھے والی اولاد کے بارے میں فرمایا کہ یہ دوزخی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔ (ترمذی)

توضیح: فضرب علی کتفه: یہ تجلیات ربانی کے القاء کی ایک صورت تھی جیسے سورج کی شعاعیں کسی چیز پر پڑتی ہیں تو اس کا اثر ہوتا ہے۔

بیضاء: یہ سفیدی اور یہ روشنی نور ایمان اور استعداد تام کی نشانی تھی کہ دنیا میں آنے کے بعد یہ شخص نور ایمان کو اپنائے گا اور ہدایت پر آئے گا اس کے برعکس ظلمت اور سیاہی کی جھلکی تھی جو کفر کی نشانی تھی کہ دنیا میں آنے کے بعد یہ شخص اپنے اختیار سے کفر کی ظلمت اور گمراہی میں جا پڑے گا لہٰذا یہ دونوں تصویریں عالم ارواح میں ایمان اور کفر کی علامت بن گئیں۔[3]

فقال: یہ اشار کے معنی میں ہے۔

الی الجنة: معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ پر کوئی چیز واجب اور لازم نہیں اور نہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے کسی فعل کے مقاصد و اغراض کے بارے میں کوئی سوال کرسکتا ہے وہ بے نیاز ہے، کسی کے جہنم میں جانے سے اس کو خوف و اندیشہ نہیں اور نہ کسی کے جنت میں جانے سے اس کی کوئی غرض و مطلب وابستہ ہے بس وہ "فعال لما یرید" ہے۔[4]

الذر: بضم الذال وفتحها چھوٹی چیونٹی کو کہتے ہیں یہ تشبیہ یا چھوٹے ہونے میں ہے یا سفید اور صاف ہونے میں ہے۔[5]

الحمم: جمع حممة کوئلہ کے معنی میں ہے۔[6]

---

[1] المرقات ۱/۳۲۲ [2] اخرجه احمد ۶/۴۴۱ [3] المرقات ۱/۲۳۳ [4] المرقات ۱/۳۲۶ [5] المرقات ۱/۱۲۵ [6] المرقات ۱/۳۲۵

تقدیر کے معاملہ میں خوف رکھنا چاہیے؟

﴿۴۱﴾ وَعَنْ أَبِي نَضْرَةَ أَنَّ رَجُلاً مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ يُقَالُ لَهُ أَبُوْعَبْدِاللّٰهِ دَخَلَ عَلَيْهِ أَصْحَابُهُ يَعُوْدُوْنَهُ وَهُوَ يَبْكِي فَقَالُوا لَهُ مَا يُبْكِيكَ أَلَمْ يَقُلْ لَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خُذْ مِنْ شَارِبِكَ ثُمَّ أَقِرَّهُ حَتّٰى تَلْقَانِيْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ قَبَضَ بِيَمِيْنِهِ قَبْضَةً وَأُخْرٰى بِالْيَدِ الْأُخْرٰى وَقَالَ هٰذِهِ لِهٰذِهِ وَهٰذِهِ لِهٰذِهِ وَلَا أُبَالِيْ. وَلَا أَدْرِيْ فِيْ أَيِّ الْقَبْضَتَيْنِ أَنَا.

(رَوَاهُ أَحْمَدُ)[۱]

ترجمہ: حضرت ابونضرہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے صحابہ میں سے ایک شخص جن کا نام ابوعبداللہ تھا (رضی اللہ عنہ) کے پاس ان کے دوست ان کی عیادت کے لئے گئے۔ (تو انہوں نے دیکھا کہ) وہ (ابوعبداللہ رضی اللہ عنہ) رو رہے تھے۔ انہوں نے کہا "کہ آپ کو کس چیز نے رونے پر مجبور کیا۔ آپ سے سرکار دو عالم ﷺ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا تھا کہ تم اپنے لب (مونچھوں) کے بال پست کرو اور اسی پر قائم رہو۔ یہاں تک کہ تم مجھ سے (جنت میں) ملاقات کرو۔" ابوعبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا "ہاں! لیکن میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ (بھی) فرماتے سنا کہ 'اللہ بزرگ و برتر نے اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں ایک جماعت لی اور فرمایا کہ یہ (یعنی داہنے ہاتھ کی جماعت) جنت کے لئے ہے اور بائیں ہاتھ کی جماعت دوزخ کے لئے ہے اور مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔' یہ کہہ کر ابوعبداللہ نے فرمایا 'میں نہیں جانتا کہ میں کس مٹھی میں ہوں'۔ (یعنی دائیں مٹھی میں ہوں یا بائیں مٹھی میں ہوں)۔ (احمد)

توضیح: ثم اقرہ: یعنی لبوں کے بال کاٹ کر اس پر قائم دائم رہو، معلوم ہوا سنت پر قائم دائم رہنا بہت ہی فائدہ مند ہے اگرچہ معمولی سنت کیوں نہ ہو اور سنت سے اعراض کرنا زندقہ کی طرف لے جاتا ہے۔ (طیبی)[۲]

حتی تلقانی: یعنی مجھ سے تیری ملاقات ہو جائے حوض کوثر پر یا کسی اور مقام پر، اس جملہ میں دخول جنت کی بشارت ہے کیونکہ کافروں سے آپ کی ملاقات نہیں ہوگی۔[۳]

ولا ادری: یعنی میں نہیں جانتا کہ میں کس مٹھی میں ہوں اس لئے رو رہا ہوں یہ **"الایمان بین الخوف والرجاء"** کا نقشہ ہے۔[۴]

مطلب:

اس حدیث کا مطلب اور خلاصہ یہ ہے کہ ابوعبداللہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے وہ بیمار ہو گئے دوسرے حضرات ان کی عیادت کے لئے گئے تو وہ رو رہے تھے انہوں نے ان کے رونے پر تعجب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کیوں رو رہے ہو حالانکہ آپ کو تو نبی کریم ﷺ نے جنت اور کامیابی کی بشارت دی تھی؟ اس پر صحابی نے قصہ سنایا اور دو مٹھیوں کی بات بیان کی اور پریشانی

[۱] اخرجہ احمد ۴/۱۷۶ [۲] الکاشف ۱/۲۹۷ [۳] المرقات ۱/۳۲۷ [۴] المرقات ۱/۳۲۷

کی وجہ بتائی کہ "الایمان بین الخوف و الرجاء" میں بے خوف نہیں ہوسکتا ہوں۔[1]

سؤال: اشکال یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ کی بشارت ان کو ملی تو پھر رونے اور اس بشارت میں شک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: بہت ممکن ہے کہ آپ اس وقت یہ بشارت بھول گئے ہوں مگر اس سے بہتر جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق اور مختار علی العموم بادشاہ ہیں آپ کے وعدے اور تمام معاہدے بیشک سچے ہیں لیکن آپ کسی چیز کے پابند نہیں اور نہ کوئی چیز آپ پر واجب العمل ہے آپ کا احسان اپنی جگہ مگر آپ کا جلال اور شان جبروت و کبریائی ایسی چیز ہے جس نے ہر فرد بشر کو ہیبت میں ڈال رکھا ہے صحابی نے اللہ تعالیٰ کی اسی بے نیازی کی طرف اشارہ کیا۔[2]

عہد اَلَسْتُ کا قصہ

﴿۴۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ أَخَذَ اللهُ الْمِيثَاقَ مِنْ ظَهْرِ آدَمَ بِنَعْمَانَ يَعْنِي عَرَفَةَ فَأَخْرَجَ مِنْ صُلْبِهِ كُلَّ ذُرِّيَّةٍ ذَرَأَهَا فَنَثَرَهُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ كَالذَّرِّ ثُمَّ كَلَّمَهُمْ قُبُلًا قَالَ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِينَ أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[3]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے میدان عرفات کے قریب مقام نعمان میں آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ساری اولاد کو نکالا جن کو (ازل سے ابد تک) پیدا کرنا تھا اور ان سب کو چیونٹیوں کی طرح آدم علیہ السلام کے سامنے پھیلا دیا۔ پھر خدا نے ان سے روبرو گفتگو کی اور فرمایا۔ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" آدم علیہ السلام کی اولاد نے کہا "بے شک آپ ہمارے رب ہیں" پھر خدا نے فرمایا "یہ شہادت میں نے تم سے اس لئے لی ہے کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے غافل و ناواقف تھے۔ یا تم یہ نہ کہہ دو کہ ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے شرک کیا تھا۔ اور ہم ان کی اولاد تھے۔ ہم نے ان کی اطاعت کی تھی کیا تو باطل پرستوں کے اعمال کے سبب ہمیں ہلاک کرتا ہے"۔ (احمد)

توضیح: بنعمان: علامہ جوہری رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ نعمان نون کے فتح کے ساتھ ایک وادی کا نام ہے جو طائف سے عرفات جاتے ہوئے راستہ میں واقع ہے صاحب قاموس لکھتے ہیں کہ نعمان عرفات کے پیچھے ایک وادی کا نام ہے اس کو نعمان الاراک کہتے ہیں جیسے شاعر نے کہا۔[4]

اما والراقصات بذات عرق ومن صلی بنعمان الاراك

ابن اثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نعمان عرفات کے پاس ایک پہاڑ کا نام ہے جس کو نعمان سحاب کہتے ہیں۔ انہیں احتمالات کے پیش نظر راوی نے حدیث میں تعین کے لئے "ای عرفة" کہہ دیا۔

[1] المرقات ۱/۳۲۷ [2] المرقات ۱/۳۲۷ [3] اخرجه احمد ۱/۲۷۲ [4] المرقات ۱/۳۲۸

ذرأ: خلق کے معنی میں ہے "**نثر**": پھیلانے اور بکھیرنے کو کہتے ہیں "**قبلا**" آمنے سامنے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ کوئی تمثیل یا تشبیہ نہیں ہے بلکہ یہ امر واقعی حقیقی ہے **قبلا** کے الفاظ اس پر دال ہیں۔[1]

قالوا بلی شهدنا: یعنی ارواح نے اقرار ربوبیت کیا پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ اقرار ربوبیت و شہادت تم سے اس لئے لیا تا کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم بے خبر تھے یہ توجیہ و مفہوم اس صورت میں لیا جائے گا کہ جب **شهدنا** بھی مقولہ **قالوا بلی** کا ہو جائے ای **قالوا بلی و قالوا شهدنا**۔[2]

دوسرا احتمال یہ ہے کہ **شهدنا** استیناف ہو نیا کلام ہو اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہو جس کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ ارواح نے اقرار ربوبیت کیا پھر ہم ان کے اقرار ربوبیت پر گواہ بن گئے **ان تقولوا ای لئلا تقولوا یوم القیامة انا کنا عن هذا غافلین**۔[3]

غریب و مالدار کیوں؟ اقرار کے بعد انکار کیوں؟

﴿۴۳﴾ وَعَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رضی اللہ عنہ فِي قَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ قَالَ جَمَعَهُمْ أَزْوَاجًا ثُمَّ صَوَّرَهُمْ فَاسْتَنْطَقَهُمْ فَتَكَلَّمُوْا ثُمَّ أَخَذَ عَلَيْهِمُ الْعَهْدَ وَالْمِيْثَاقَ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى قَالَ فَإِنِّيْ أُشْهِدُ عَلَيْكُمُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَالْأَرَضِيْنَ السَّبْعَ وَأُشْهِدُ عَلَيْكُمْ أَبَاكُمْ آدَمَ أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَمْ نَعْلَمْ بِهٰذَا اِعْلَمُوْا أَنَّهُ لَا إِلٰهَ غَيْرِيْ وَلَا رَبَّ غَيْرِيْ وَلَا تُشْرِكُوْا بِيْ شَيْئًا إِنِّيْ سَأُرْسِلُ إِلَيْكُمْ رُسُلِيْ يُذَكِّرُوْنَكُمْ عَهْدِيْ وَمِيْثَاقِيْ وَأُنْزِلُ عَلَيْكُمْ كُتُبِيْ قَالُوْا شَهِدْنَا بِأَنَّكَ رَبُّنَا وَإِلٰهُنَا لَا رَبَّ لَنَا غَيْرُكَ وَلَا إِلٰهَ لَنَا غَيْرُكَ فَأَقَرُّوْا بِذٰلِكَ وَرُفِعَ عَلَيْهِمْ آدَمُ يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ فَرَأَى الْغَنِيَّ وَالْفَقِيْرَ وَحَسَنَ الصُّوْرَةِ وَدُوْنَ ذٰلِكَ فَقَالَ رَبِّ لَوْلَا سَوَّيْتَ بَيْنَ عِبَادِكَ قَالَ إِنِّيْ أَحْبَبْتُ أَنْ أُشْكَرَ وَرَأَى الْأَنْبِيَاءَ فِيْهِمْ مِثْلَ السُّرُجِ عَلَيْهِمُ النُّوْرُ خُصُّوْا بِمِيْثَاقٍ آخَرَ فِي الرِّسَالَةِ وَالنُّبُوَّةِ وَهُوَ قَوْلُهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ إِلٰى قَوْلِهِ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ كَانَ فِيْ تِلْكَ الْأَرْوَاحِ فَأَرْسَلَهُ إِلٰى مَرْيَمَ عَلَيْهَا السَّلَامُ فَحُدِّثَ عَنْ أُبَيٍّ أَنَّهُ دَخَلَ مِنْ فِيْهَا۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[4]

ترجمہ: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس آیت (**واذ اخذ ربك من بنی آدم من ظهور هم ذریتهم**) (ترجمہ) جب تمہارے پروردگار نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد نکالی) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ خدا نے (اولاد آدم کو) جمع کیا اور ان کو طرح طرح کا قرار دیا (یعنی کسی کو مالدار کسی کو غریب کرنے کا ارادہ کیا) پھر ان کو شکل و صورت عطا کی

[1] المرقات ۱/۳۲۸ [2] المرقات ۱/۳۲۸ [3] المرقات ۱/۳۲۸ [4] اخرجه احمد ۵/۱۳۵

اور پھر گویائی بخشی اور انہوں نے باتیں کیں پھر ان سے عہد و پیمان کیا۔ اور پھر ان کو اپنے اوپر گواہ قرار دے کر پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اولاد آدم نے کہا "بے شک! آپ ہمارے رب ہیں" خدائے تعالیٰ نے فرمایا میں ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو تمہارے سامنے گواہ بناتا ہوں اور تمہارے باپ آدم کو بھی شاہد قرار دیتا ہوں۔ (اس لئے کہ قیامت کے دن) کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے ناواقف تھے۔ (اس وقت) تم اچھی طرح جان لو کہ نہ تو میرے سوا کوئی معبود ہے اور نہ میرے سوا کوئی پروردگار ہے (اور خبردار) کسی کو میرا شریک قرار نہ دینا۔ میں تمہارے پاس عنقریب اپنے رسول بھیجوں گا جو تمہیں میرا عہد و پیمان یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں نازل کروں گا (یہ سن کر) اولاد آدم نے کہا ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ کہ تو ہمارا رب ہے اور تو ہی ہمارا معبود ہے۔ تیرے سوا نہ تو ہمارا کوئی پروردگار ہے۔ اور نہ تیرے علاوہ ہمارا کوئی معبود ہے۔ چنانچہ آدم کی ساری اولاد نے اس کا اقرار کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے اوپر بلند کر دیا گیا۔ وہ (اپنی نگاہیں بلند کئے ہوئے) اس منظر کو دیکھ رہے تھے آدم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کی اولاد میں امیر بھی ہیں اور فقیر بھی، خوبصورت بھی ہیں اور بدصورت بھی (یہ دیکھ کر) انہوں نے عرض کیا "پروردگارا اپنے تمام بندوں کو تو نے یکساں کیوں نہیں بنایا؟" اللہ تعالیٰ نے فرمایا "میں اسے پسند کرتا ہوں کہ میرے بندے میرا شکر ادا کرتے رہیں" پھر آدم علیہ السلام نے انبیاء کو دیکھا جو چراغوں کی مانند روشن تھے۔ اور نور ان کے اوپر جلوہ گر تھا۔ ان سے خصوصیت کے ساتھ رسالت و نبوت کے عہد و پیمان لئے گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے **واذ أخذنا من النبيين ميثاقهم ومنك ومن نوح وابراهيم وموسیٰ وعيسیٰ ابن مريم۔** (الاحزاب) (ترجمہ) اور جب ہم نے پیغمبروں سے ان کا عہد و پیمان لیا اور آپ ﷺ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ بن مریم سے (بھی) عہد و پیمان لیا ان روحوں کے درمیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ چنانچہ ان کی روح کو اللہ تعالیٰ نے (حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے) حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بھیج دیا۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ کہ یہ روح حضرت مریم علیہا السلام کے منہ کی طرف سے ان کے جسم میں داخل ہوگئی۔ (احمد)

توضیح: **خصوا بميثاق اٰخر:** یہ عہد و پیمان اور یہ میثاق میثاق نبوت تھا جو خدمت خاص یعنی تبلیغ رسالت کے لئے لیا گیا۔ [1]

فرأى الغني والفقير: حضرت آدم علیہ السلام کو تعجب ہوا کہ ان کی اولاد میں اتنا فرق کیوں ہے کہ ایک سرمایہ دار تو دوسرا نان جویں کا محتاج قلاش چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی وجہ پوچھ لی۔ [2]

جبل گردد جبلت نہ گردد

﴿۴۴﴾ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ نَتَذَاكَرُ مَا يَكُوْنُ إِذْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهِ فَصَدِّقُوْهُ وَإِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خُلُقِهِ فَلَا۔

[1] المرقات ۱/۳۳۳ [2] المرقات ۱/۳۳۲

تُصَدِّقُوا بِهٖ فَإِنَّهٗ يَصِيْرُ إِلٰى مَا جُبِلَ عَلَيْهِ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[1]

ترجمہ: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم سرکار دو عالم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے آئندہ وقوع پذیر ہونے والی باتوں پر گفتگو کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے (ہماری باتوں کو سن کر) فرمایا جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گیا ہے تو اسے سچ مان لو لیکن جب تم یہ سنو کہ کسی شخص کی خلقت بدل گئی ہے۔ تو اس کا اعتبار نہ کرو۔ اسلئے کہ انسان اسی چیز کی طرف جاتا ہے۔ جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔ (احمد)

توضیح: **اذا سمعتم:** اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پہاڑ کا اپنی جگہ سے منتقل ہونا اور زائل ہونا ممکن ہے بشرطیکہ اس کے متعلق کوئی بتادے اور کوئی قرینہ انکار بھی نہ کرے تو تصدیق کرلو چنانچہ بعض مغربی ممالک کے بعض پہاڑ ہل کر اپنی جگہ سے سرک جاتے ہیں اس کے مقابلے میں اگر کوئی تم سے کہہ دے کہ فلاں شخص اپنی جبلت سے پھر گیا ہے تو اس کی تصدیق مت کرو کیونکہ طبیعت اور جبلت سے پھرنا ممکن نہیں ہے ہاں ظاہری عارضی تبدیلی تو ہو جائے گی مگر حقیقی تبدیلی نہیں ہوگی سچ ہے ''جبل گردد جبلت نہ گردد''۔[2]

﴿۴۵﴾ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَا يَزَالُ يُصِيْبُكَ فِيْ كُلِّ عَامٍ وَجَعٌ مِنَ الشَّاةِ الْمَسْمُوْمَةِ الَّتِيْ أَكَلْتَ قَالَ مَا أَصَابَنِيْ شَيْءٌ مِنْهَا إِلَّا وَهُوَ مَكْتُوْبٌ عَلَيَّ وَآدَمُ فِيْ طِيْنَتِهٖ۔

(رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه)[3]

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ نے جو زہر آلود بکری کھائی تھی (جو خیبر میں ایک یہودیہ نے کھلائی تھی) ہر سال اس کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جو چیز (یعنی اذیت و تکلیف یا بیماری) مجھ کو پہنچتی ہے۔ وہ میرے لئے اسی وقت لکھی گئی تھی۔ جب کہ آدم مٹی کے اندر تھے۔ (یعنی میری تقدیر میں یہ اس وقت سے لکھا تھا جبکہ آدم اپنی تخلیق کے مراحل میں تھے)۔ (ابن ماجہ)

[1] اخرجہ احمد: ۶/۴۴۳ [2] المرقات ۱/۳۴۴ [3] اخرجہ ابن ماجہ ۳۵۴۶

مورخہ ۱۳ محرم ۱۴۱۰ھ
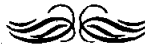
باب اثبات عذاب القبر

عذاب قبر کے ثبوت کا بیان

قبر میں جس طرح گنہگاروں کو عذاب ہوتا ہے وہاں نیک لوگوں کو ثواب بھی ہوتا ہے۔ حضرت مصنف علیہ الرحمہ نے صرف عذاب کا ذکر کیا اور ثواب کا ذکر نہیں کیا اس کا ایک جواب یہ ہے کہ چونکہ کفار اور فساق کی تعداد زیادہ ہے اس لئے ان کے جزاوسزا کا ذکر کیا اور متن وعنوان میں ان کو اہمیت دی۔ دوسرا جواب یہ کہ لفظ عذاب القبر کے ذکر کرنے سے ثواب القبر خود بخود سمجھ آتا ہے کیونکہ یہ دونوں ضدین ہیں تو ایک ضد کو ذکر کر دیا دوسرا جو ثواب ہے وہ خود بخود سمجھ میں آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عذاب قبر کی حدیثوں میں صرف عذاب کا ذکر نہیں بلکہ ثواب کا ذکر عموماً پہلے آتا ہے اور پھر عذاب کا آتا ہے۔

القبر: لفظ قبر کا اطلاق حقیقۃ اسی ظاہری حسی گڑھے پر ہوتا ہے جس میں میت کو دفن کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی اسی ظاہری حسی مقام کو قبر کہا ہے "**ولا تقم علی قبره**" اور "**ثم اماته فاقبره**" مجازی طور پر قبر کے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے مرنے کے بعد پورے برزخی مقام کو قبر کہا جاتا ہے لیکن اس سے ظاہری قبر کی نفی نہیں ہوگی بلکہ قبر سے شروع ہو کر اگلے تمام مراحل تا قیام قیامت برزخ ہیں لہٰذا اگر کوئی آدمی جل جائے یا کھایا جائے یا فضاؤں میں اڑ کر ختم ہو جائے وہ برزخ سے غائب نہیں ہو سکتا بلکہ وہیں حاضر ہو جاتا ہے اور اس کا حساب وکتاب ہوتا ہے۔

عوالم: عالم کل تین ہیں: ① عالم دنیا ② عالم برزخ ③ عالم آخرت۔

عالم دنیا میں احکام کا تعلق اولاً اور بالذات جسم سے ہوتا ہے اور تبعاً روح سے ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کو کسی نے دنیا میں مراقبہ اور روحانی تصرف سے قتل کر دیا تو قصاص نہیں ہوگا کیونکہ جسم نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

عالم برزخ میں احکام کا تعلق اولاً اور بالذات روح سے ہوتا ہے اور ثانیاً وتبعاً بدن سے ہوتا ہے۔

سوم عالم آخرت ہے وہاں احکام کا تعلق روح وبدن سے ہوتا ہے کیونکہ روح راکب اور بدن مرکوب ہے۔

اور دنیا میں عمل دونوں کے اشتراک سے سرزد ہوا ہے تو حکم کا اجراء بھی دونوں پر ہوگا روح یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں تو عالم بالا سے آئی تھی میں مجرم نہیں بلکہ مجرم بدن اور جسم ہے ان دونوں کے اشتراک عمل کی مثال لنگڑے اور اندھے کی چوری کی ہے کہ لنگڑا چل نہیں سکتا مگر دیکھ سکتا ہے اور اندھا دیکھ نہیں سکتا مگر چل سکتا ہے لہٰذا دونوں میں اتفاق ہو گیا لنگڑا اندھے پر سوار ہو گیا اور راستہ دکھاتا رہا اور اندھا اس کو اٹھا کر چلتا رہا یہاں تک کہ باغ میں پہنچ کر لنگڑے نے خوب پھل توڑ دیئے اور پھر دونوں نے مل کر کھایا اب باغ والا جب دونوں کو پکڑ لیتا ہے تو دونوں کو سزا دیتا ہے نہ لنگڑا بچ سکتا ہے اور نہ اندھا بہانہ کر کے بچ سکتا ہے اسی طرح جب آخرت میں جسم اور روح کا معاملہ پیش ہوگا تو دونوں مجرم ہوں گے دونوں کو ثواب وعقاب ہوگا یہی وجہ ہے کہ مراقبہ اور روحانی تصرف سے اگر کسی کو کسی نے مارا تو آخرت میں بدلہ لیا جائے گا۔

عالم برزخ کی مثال:

عالم برزخ کی سب سے زیادہ مناسب حسی مثال خواب اور خواب کی کیفیت ہے۔ مثلاً دو آدمی ایک جگہ سوئے ہوئے ہیں ایک کو اپنے خواب میں راحت اور دوسرے کو زحمت ہوتی ہے وہ دونوں اپنے اپنے خواب میں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہیں کوئی مکہ، کوئی مدینہ، کوئی زمین، کوئی آسمان میں گھومتا ہے کوئی راحت اور کوئی زحمت محسوس کرتا ہے لیکن ان کے قریب پاس بیٹھنے والے کو کچھ بھی معلوم نہیں کہ کس کو راحت ہے اور کس کو زحمت ہے، اس خواب میں کبھی سونے والا ہنستا ہے کبھی روتا ہے کبھی دوڑتا ہے کبھی اڑتا ہے مگر کسی کو کچھ محسوس نہیں ہوتا کہ سونے والے کی کیفیت کیا ہے ہاں کبھی کبھی کچھ حرکات مثلاً ہنسنا بولنا معلوم بھی ہو جاتا ہے بعینہ اسی طرح عالم برزخ میں روح کا معاملہ جسم اور بدن کے ساتھ ہے وہاں سب کچھ ہوتا ہے مگر کسی دیکھنے والے کو محسوس نہیں ہوتا بس صرف میت کو احساس ہوتا ہے عام حالات میں بدن بالکل بے حس معلوم ہوتا ہے ہاں کبھی کبھی روح کا اثر بدن پر ظاہر بھی ہو جاتا ہے۔

قبر میں بدن کے ساتھ روح کا تعلق

قبر میں بدن کے ساتھ روح کا تعلق تین قسم پر ہے:

قسم اول: یہ کہ روح کا تعلق بدن کے ساتھ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ بدن کے صحیح سالم رہنے کے ساتھ ساتھ اس کا اثر دنیا پر بھی پڑتا ہے جیسے انبیاء کرام کی ارواح ہیں ان کی ارواح کا تعلق بدن سے اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ قبر سے متجاوز ہو کر دنیا پر بھی اثر انداز ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کا مال بطور میراث تقسیم نہیں ہوتا ان کی ازواج مطہرات سے کسی کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اور جسم مبارک قطعی طور پر خاک سے متاثر نہیں ہوتا۔

قسم دوم: یہ کہ روح کا تعلق بدن کے ساتھ اتنا تو ہوتا ہے کہ ان کا جسد خاکی متاثر نہ ہو لیکن اس تعلق کا اثر دنیا پر نہیں پڑتا جیسے شہداء کی ارواح کہ ان کا جسم تو سلامت رہتا ہے لیکن میراث تقسیم ہوتی ہے اور ان کی بیویوں سے نکاح بھی کیا جاتا ہے۔

قسم سوم: یہ ہے کہ روح کا تعلق جسم کے ساتھ کمزور تر ہوتا ہے جو نہ دنیا پر اثر انداز ہوتا ہے اور نہ قبر میں جسم کو محفوظ رکھ سکتا ہے یہ عام مسلمانوں کی ارواح کا تعلق ان کے اجسام سے ہے ہاں بعض مومنین کی ارواح کا تعلق قوی ہوتا ہے جس سے ان کے اجسام محفوظ رہتے ہیں، لیکن یہ بہت کم ہوتا ہے اگر کسی شہید کا جسد خاک نے خراب کر دیا تو اس کی وجہ یا شہادت میں نقصان ہوتا ہے اور یا موسمی اور ارضی حالات سے متاثر ہو کر جسم خراب ہو جاتا ہے یہ ایک عارضی معاملہ ہے۔

عذاب قبر کی کیفیت میں اختلاف:

عذاب قبر یا راحت قبر کے تعین اور اس کی کیفیت میں کافی اختلاف ہے چند اقوال ملاحظہ ہوں۔

❶ پہلا قول: یہ کہ قبر میں چونکہ جسد ہے اور وہ مثل جماد ہے لہٰذا قبر میں نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے کیونکہ ثواب وعقاب

حیات پر متفرع ہیں اور وہ حیات قبر میں نہیں ہے۔ یہ عقیدہ خوارج، بعض معتزلہ اور بعض مرجئہ کا ہے یہ عقیدہ اور یہ مسلک قرآن وحدیث اور اجماع امت کے صریح نصوص کے خلاف ہے لہٰذا قابل التفات نہیں۔

❷ **دوسرا قول:** یہ ہے کہ قبر میں ثواب وعقاب کا تعلق صرف بدن اور جسم سے ہے روح کا اس سے کوئی تعلق نہیں یہ مسلک محمد بن جریر کرامی اور عبداللہ بن کرام کا ہے علامہ خیالی نے کہا ہے کہ روح کے بغیر خالی جسم کے عذاب کی بات محض حماقت والی بات ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: **"جوز بعضهم تعذيب غير الحي ولا شك انه سفسطة"** بعض نے غیر زندہ کے عذاب کو جائز مانا ہے اس میں شک نہیں کہ یہ ایک احمقانہ نظریہ ہے۔

❸ **تیسرا قول:** یہ کہ قبر میں عذاب صرف روح کو ہوتا ہے کیونکہ اجسام تو اکثر وبیشتر ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں یا جل جاتے ہیں یا جانور کھا جاتے ہیں یہ مسلک بعض صوفیا اور ابن حزم ظاہری کا ہے مگر احادیث سے اس کی بھی تردید ہوتی ہے۔

❹ **چوتھا قول:** یہ کہ قبر میں ثواب وعقاب جسم اور روح دونوں کو ہوتا ہے اور روح کا بدن کے کسی جزء سے اتصال ہوتا ہے یہ اتصال سورج کی شعاعوں کی طرح اشراق واشراف کے طور پر بھی ہوسکتا ہے کہ روح کا اثر تو جسم کے کسی جزء پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ روح کا جسم کے کسی جزء سے تعلق واتصال ہوجاتا ہے جس سے بدن راحت والم کو محسوس کرتا ہے اور اسی سے فرشتوں کو جواب دیتا ہے یہ مسلک اہل حق اہل السنۃ والجماعۃ کا ہے۔

اہل حق کے دلائل:

اہل سنت والجماعت نے اثبات عذاب قبر پر قرآن کریم کی چند آیات سے استدلال کیا ہے مثلاً:

❶ **النار يعرضون عليها غدوا وعشيا ويوم تقوم الساعة ادخلوا آل فرعون اشد العذاب۔** [1]

اس آیت میں واضح طور پر دو عذابوں کا ذکر ہے ایک قیامت کا عذاب اور ایک قیامت سے پہلے کا عذاب اور یہی عذاب قبر ہے۔

❷ **مما خطيئاتهم اغرقوا فادخلوا نارا فلم يجدوا لهم من دون الله انصارًا۔** [2]

یہاں فا تعقیب مع الوصل کے لئے ہے یعنی قوم نوح ادھر پانی میں غرقاب ہوگئی اور ادھر آگ میں داخل کی گئی، ظاہر ہے یہ قیامت سے پہلے برزخی عذاب ہے اور یہی عذاب قبر ہے کیونکہ قبر برزخ کا پہلا مرحلہ ہے۔

❸ **ولو ترى اذ الظلمون فى غمرات الموت والملائكة باسطوا ايديهم اخرجوا انفسكم اليوم تجزون عذاب الهون بما كنتم تقولون على الله غير الحق و كنتم عن اياته تستكبرون۔** [3]

اس آیت کا تعلق بھی اس عذاب سے ہے جو اخراج روح کے وقت فرشتے انسان کو دیتے ہیں ظاہر ہے یہ قیامت سے پہلے عذاب قبر ہے۔

---

[1] سورۃ المؤمن ۴۶ [2] نوح الایہ ۲۵ [3] الانعام الایہ ۹۳

❹ ولنذيقنهم من العذاب الادنى دون العذاب الاكبر۔

عذاب اکبر یعنی آخرت کے بڑے عذاب سے پہلے دنیا کا چھوٹا عذاب مراد ہے اس میں عالم برزخ کا عذاب (جو بڑے عذاب کے مقابلہ میں کم ہے) بھی آیت کے مصداق میں آسکتا ہے۔

❺ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے عذاب قبر پر اجماع امت نقل کیا ہے۔

❻ مذکورہ باب کی تمام احادیث اثبات عذاب قبر پر دال ہیں جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں اگر لفظی تواتر نہ ہوتو معنوی تواتر یقینا موجود ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے عذاب قبر کے اثبات پر ۳۵ روایات نقل فرمائی ہیں۔ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ستر ۷۰ تک روایات نقل کی ہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے چھ روایات جمع کی ہیں مجموعی طور پر یہ ایک سو گیارہ روایات بنتی ہیں۔

ترجمہ: شبہ یہ ہے کہ اتنی روایات اور نصوص کے منکرین کی تکفیر کیوں نہیں کی جاتی ہے؟

جواب: بعض نے تکفیر کی ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کف لسان کا فتویٰ دیا ہے کہ تاویل کرتے ہیں اس لئے **مُتَأَوِّلِیْن** کو کافر مت کہو۔

منکرین عذاب قبر کے شبہات اور ان کے جوابات

سوال نمبر ❶:

پہلا شبہ اور اعتراض ان لوگوں کا یہ ہے کہ دیکھو عذاب قبر کی جو کیفیات احادیث میں وارد ہیں کہ سانپ اور اژدھے کاٹتے ہیں بچھو ڈنگ مارتے ہیں فرشتے گرز اور ہتھوڑے مارتے ہیں مردے کو بٹھایا جاتا ہے وہ چیختا ہے چلّاتا ہے اور ہم کچھ بھی نہیں سنتے ہیں میت کے سینہ پر سامان رکھ دو وہ اسی طرح مدت تک پڑا رہتا ہے اس کے ساتھ قبر میں ٹیپ رکھ دو کچھ پتہ نہیں چلتا تو کیسے عذاب ہو رہا ہے؟

جواب: ہم پہلے اس کا جواب دے چکے ہیں کہ برزخ کا معاملہ خواب کی طرح ہے اس کو دنیا پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے نیز اس عذاب کا اولاً اور اصلاً تعلق روح سے ہے بدن اس کا تابع ہے درد و تکلیف تو بدن محسوس کر رہا ہے لیکن اصل میں عذاب روح سے متعلق ہے تو بدن پر اثرات ہم محسوس نہیں کرتے کبھی کبھی بدن پر اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں مگر عام طور پر ایسا نہیں ہوتا لہٰذا دنیا سے برزخ کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا ہے تو انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

سوال نمبر ❷:

دوسرا شبہ یہ ہے کہ ہم نے اس عذاب کو دیکھا نہیں ہے اگر دیکھ لیتے تو مان لیتے بن دیکھے ہم نہیں مانتے۔

جواب: جس چیز کو تم نے نہیں دیکھا تو کیا اس کا انکار کرو گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دے دی اللہ کے رسول ﷺ نے

خبر دے دی اجماع امت نے بتادیا پھر بھی انکار کرو گے تو پھر جنات کو تم نے نہیں دیکھا اس کا بھی انکار کرو تا کہ کافر ہو جاؤ کیونکہ قرآن میں اس کا ثبوت ہے فرشتے تم نے نہیں دیکھے ان کے وجود کا منکر کافر ہے۔ بدن انسان میں لوہا ہے، چونا ہے، تم نے نہیں دیکھا تو کیا اس کا انکار کرو گے، ماچس کی تیلی میں مسالہ ہے اس میں آگ ہے تم نے کب دیکھا ہے دودھ اور دہی میں مکھن ہے تم نے کب دیکھا ہے تو انکار کرو گے؟ بے ہوش آدمی کے احوال کا تم کو کیا معلوم تو اس کا انکار کرو گے کہ نظر نہیں آتا یہ تو ایک بے کار قاعدہ ہے جس کو سر سید احمد خان نے ایجاد کیا اور لوگوں کو دھریہ بنا دیا۔

سوال نمبر ۳:

تیسرا شبہ یہ ہے کہ مردے کے اجزاء کبھی درندوں پرندوں کا کھانا بنتے ہیں، کبھی سمندر میں مچھلیوں کی خوراک بنتے ہیں کبھی جل کر راکھ ہو جاتے ہیں تو عذاب قبر کیسے ہوگا؟

جواب: ہم نے پہلے کہا تھا کہ قبر سے مراد عالم برزخ ہے صرف یہ مخصوص گڑھا نہیں بلکہ اس قبر سے شروع ہو کر آگے قیامت تک سب عالم برزخ ہے جہاں ہر جاندار کا لوٹنا اور پہنچنا ضروری ہے خواہ کسی بھی صورت میں ہو لہٰذا مردہ جہاں بھی ہو برزخی عذاب کے لئے اس کا کوئی نہ کوئی جزء موجود ہوگا ہم کو نظر نہیں آئے گا مگر اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوگا جیسا کہ ایک آدمی کے تحریق جسد کا واقعہ مشکوٰۃ شریف میں آنے والا ہے کہ ہواؤں نے اور سمندر نے اس کے جسم کے اجزاء کو اکٹھا کیا پھر حساب ہوا اس نے وصیت کی تھی کہ مجھے مرنے کے بعد جلا دو اور راکھ سمندر اور صحرا میں اڑا دو۔

سوال نمبر ۴:

چوتھا شبہ یہ ہے کہ دوسرے جاندار تمہارے کہنے کے مطابق عذاب قبر کا ادراک کرتے ہیں تو انسان اور جنات کیوں نہیں کرتے؟ اگر عذاب واقعی ہوتا تو انسان و جن بھی احساس کر لیتے۔

جواب: انسان و جنات چونکہ ایمان بالغیب کے مکلف ہیں اس لئے ان سے یہ عذاب پوشیدہ رکھا گیا ہے ان پر ظاہر ہوتا تو ایمان بالغیب کہاں رہتا نیز دہشت کی وجہ سے اپنے مردوں کو دفنانا بند کر دیتے۔

سوال نمبر ۵:

پانچواں شبہ یہ کہ وقت واحد میں لاکھوں انسان مدفون ہوتے ہیں تو فرشتے سب کو عذاب کیسے دیتے ہیں؟

پہلا جواب: یہ کہ وہاں پہنچ کر معلوم ہو جائے گا کہ کیسے عذاب دیتے ہیں۔

دوسرا جواب: یہ کہ منکر نکیر چند فرشتوں کا نام نہیں بلکہ یہ ایک محکمہ اور نوع کا نام ہے اس کے ماتحت بے شمار فرشتے ہیں جو یہ کام سر انجام دیتے ہیں جیسے روح قبض کرنے پر بہت فرشتے مقرر ہیں یہ عذاب قبر کے ابتدائی مباحث تھے آئندہ سماع موتیٰ کا مسئلہ مختصراً آرہا ہے۔

۱۴ محرم ۱۴۱۰ھ

الفصل الاول

کلمۂ شہادت سے قبر میں استقامت ملتی ہے

﴿۱﴾ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اَلْمُسْلِمُ إِذَا سُئِلَ فِي الْقَبْرِ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالٰى يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ. وَ فِي رِوَايَةٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ نَزَلَتْ فِي عَذَابِ الْقَبْرِ يُقَالُ لَهُ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ وَنَبِيِّيْ مُحَمَّدٌ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۱]

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جس وقت قبر میں مسلمان سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور یہی مطلب ہے اس ارشاد ربانی کا ''یثبت اللّٰہ الذین اٰمنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ۔'' (ابراھیم ۲۷)
(ترجمہ) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ثابت و قائم رکھتا ہے جو ایمان لاتے ہیں مضبوط و محکم طریقہ پر ثابت رکھنا دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ آیت یثبت اللّٰہ الذین اٰمنو بالقول الثابت عذاب قبر کے بیان میں نازل ہوئی ہے (چنانچہ قبر میں مردہ سے) سوال کیا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور میرے نبی محمد ﷺ ہیں۔ (بخاری، ومسلم)

توضیح: مسلمان عورت ہو یا مرد وہ قبر میں منکر نکیر کے سوال کے جواب میں اقرار شہادتین کرتے ہیں اور منافق کہتا ہے ''لاادری اقول ما یقول الناس'' اور کافر ''ھاہ ھاہ لا ادری'' کہتا ہے۔
علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اور ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال منافق اور مؤمن سے قبر میں ہوتا ہے خالص کافر سے نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہ سوال امتیاز کے لئے ہوتا ہے اور کافر تو کفر میں ممتاز ہوتا ہے وہاں امتیاز کی ضرورت نہیں اور جہاں احادیث میں آیا ہے کہ کافر سے قبر میں سوال ہوتا ہے وہاں منافق مراد ہے مگر شاہ انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر محققین نے کہا ہے کہ یہ سوال سب سے ہوگا اور کافر کو ملزم ٹھہرانے کے لئے یہ سوال ہوگا جو ذلیل ہوکر کہے گا ''ھاہ ھاہ لاادری''۔[۲]
یہاں سوال یہ ہے کہ قیامت میں کفار اور منافقین طرح طرح کے بہانے بنا کر انکار کریں گے حالانکہ وہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہوگا تو قبر اور برزخ میں کیوں اس طرح صفائی سے جواب دے کر اقرار کرتے ہیں؟

---
[۱] اخرجہ البخاری ۲/۱۲۲ ومسلم ۸/۱۶۲ [۲] المرقات ۱/۳۳۸

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ قبر میں معاملہ فرشتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو تکوینی طور پر یہاں سچ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کفار و منافقین جھوٹ نہیں بول سکیں گے تاکہ فرشتوں پر معاملہ پوشیدہ اور مبہم نہ ہو اور میدان محشر میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اگر جھوٹ بولیں گے تو اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے نامہ اعمال موجود ہے اعضاء بدن بھی گواہی کے لئے حاضر ہیں اس لئے وہاں میدان کھلا رکھا گیا ہے۔

بالقول الثابت: اس سے مراد کلمۂ توحید اور اقرار شھادتین ہے دنیا میں بھی اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ مسلمان کے پائے استقامت کو استقلال بخشا ہے اور آخرت میں بھی اس کی بدولت قوت و توانائی اور استقامت و رحمت عطا کرتا ہے۔[1]

نزلت: اس جگہ بظاہر یہ اعتراض آتا ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے لئے عذاب قبر کا کوئی ذکر نہیں ہے پھر یہ کیسے فرمایا کہ یہ آیت عذاب قبر کے بارے میں اتری ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں یثبت کا ذکر ہے اور تثبیت فرع ہے تعذیب کی تو مطلب یہ ہوا کہ جب مسلمان کو عذاب قبر کا سامنا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو قول ثابت کے ساتھ ثبات عطا فرماتا ہے۔[2]

مردے جوتوں کی آہٹ سنتے ہیں

﴿۲﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وُضِعَ فِي قَبْرِهِ وَتَوَلَّى عَنْهُ أَصْحَابُهُ إِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ أَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِهِ فَيَقُولَانِ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُولُ أَشْهَدُ أَنَّهُ عَبْدُ اللهِ وَرَسُولُهُ فَيُقَالُ لَهُ اُنْظُرْ إِلَى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ قَدْ أَبْدَلَكَ اللهُ بِهِ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ فَيَرَاهُمَا جَمِيعًا وَأَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُ فَيُقَالُ لَهُ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ فَيَقُولُ لَا أَدْرِي كُنْتُ أَقُولُ مَا يَقُولُ النَّاسُ فَيُقَالُ لَهُ لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ وَيُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً فَيَصِيحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيهِ غَيْرُ الثَّقَلَيْنِ.

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَلَفْظُهُ لِلْبُخَارِيِّ)[3]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب بندہ قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اعزہ و احباب واپس آتے ہیں تو وہ (مردہ) ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے اور اس کے پاس (قبر میں) دو فرشتے آتے ہیں اور ان کو بٹھا کر پوچھتے ہیں کہ تم اس شخص (محمد ﷺ) کے بارے میں کیا کہتے تھے اس کے جواب میں بندۂ مومن کہتا ہے میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ (محمد ﷺ) بلاشبہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں پھر اس بندہ سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنا ٹھکانا دوزخ میں دیکھو جس کو خدا نے بدل دیا ہے اور اس کے بدلے میں تمہیں جنت میں جگہ دی گئی ہے چنانچہ وہ مردہ دونوں مقامات (جنت و دوزخ) کو دیکھتا ہے اور جو مردہ منافق یا کافر ہوتا ہے اس سے بھی یہی سوال کیا جاتا ہے کہ اس شخص (یعنی

[1] المرقات ۱/۳۳۸ [2] المرقات ۱/۳۳۸ [3] اخرجه البخاری ۲/۱۱۳ ومسلم ۸/۱۶۲

محمد ﷺ) کے بارے میں تو کیا کہتا تھا؟ وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا، جو اور لوگ (مؤمن) کہتے تھے وہی میں بھی کہہ دیتا تھا اس سے کہا جاتا ہے نہ تو نے عقل سے پہچانا اور نہ تو نے قرآن شریف پڑھا، یہ کہہ کر اس کو لوہے کے گرزوں سے مارا جاتا ہے کہ اس کے چیخنے اور چلانے کی آواز سوائے جنوں اور انسانوں کے قرب وجوار کی تمام چیزیں سنتی ہیں۔

(بخاری ومسلم، الفاظ بخاری کے ہیں)

توضیح: وتولی: مردہ دفن کرنے کے بعد عادتاً لوگ جاتے ہیں اس لئے **وتولی** فرمایا اگر لوگ نہ بھی جائیں تو پھر بھی مردہ جوتوں کی چھاپ کی آواز سنتا ہے یہاں سماع موتی کی بحث چھیڑی جاتی ہے حالانکہ عام شارحین نے یہاں اس مسئلہ کو ذکر نہیں کیا ہے میں باب کے آخر میں انشاء اللہ مختصر طور پر بیان کروں گا۔[1]

حضرت رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں **اتاہ ملکان** کا عجیب مفہوم بیان کیا ہے فرمایا کہ یہ سرعت اتیان ملک کی طرف اشارہ ہے "**انہ لیسمع قرع نعالھم اتاہ ملکان**" یعنی وقت اتنا قریب ہوتا ہے کہ گویا ابھی مردہ جوتوں کی آہٹ سنتا ہے کہ فرشتے سوال وجواب کے لئے آجاتے ہیں۔

فی ھذا الرجل: اس جملہ میں اشارہ نبی اکرم ﷺ کی طرف ہے اور اشارہ حاضر اور محسوس کے لئے ہوتا ہے لہٰذا فرشتوں کا سوال قبر میں ایک وقت میں لاکھوں انسانوں سے ہوتا ہے اور حضور اکرم ﷺ وہاں پر ہر قبر میں حاضر ہوں گے لہٰذا ہر جگہ حاضر وناظر ہوگئے یہ استدلال بریلوی حضرات اس جملہ سے کرتے ہیں اور حاضر ناظر کا مسئلہ ثابت کرتے ہیں اس استدلال کے کئی جواب ہیں۔

❶ **پہلا جواب:** یہ کہ یہ اشارہ ذھنیہ ہے اور صاحب کافیہ نے اشارہ ذھنیہ کا تذکرہ کیا ہے ہرقل نے ابوسفیان سے کہا "**ما تقول فی ھذا الرجل**" کلام عرب میں یہ عام محاورہ ہے اس سے کوئی کسی کو حاضر ناظر نہیں سمجھتا۔

❷ **دوسرا جواب:** یہ کہ قبر میں حضور اکرم ﷺ کی شبیہ پیش کر کے اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

❸ **تیسرا جواب:** یہ کہ **ھذا الرجل** کے ساتھ کچھ اضافی تفصیل بھی ہے یعنی **الذی بعث فیکم** یعنی جو شخص تم میں رسول بنا کر بھیجے گئے تھے ان کے بارے میں تم کیا کہتے ہو بعد میں یہ لفظ صریح طور پر حدیث میں آرہا ہے۔

❹ **چوتھا جواب:** یہ کہ میت اور آنحضرت ﷺ کے درمیان سے حجابات ہٹا کر براہ راست نبی اکرم ﷺ کو دکھا کر سوال کیا جاتا ہے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس جواب کو رد کیا ہے کہ یہ محض ایک احتمال ہے بہرحال شارحین نے یہ جوابات اس لئے دیئے ہیں کہ قرآن کریم نے حاضر ناظر کا عقیدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے بتایا ہے۔[2]

مقعدك: مفسرین نے لکھا ہے کہ ہر مومن وکافر کے لئے جنت ودوزخ دونوں جگہ میں ایک ایک سیٹ تیار ہے اگر کوئی شخص جہنم میں گیا تو جنت والی سیٹ خالی ہو کر کسی اور کو میراث میں دی جاتی ہے اور اگر جنت میں گیا تو دوزخ والی سیٹ کسی اور کے لئے میراث میں رہ گئی۔ ہر انسان اور ہر مکلف کے لئے ایک سیٹ جنت میں اور ایک سیٹ دوزخ میں ہونے کی

---

[1] المرقات ۱/۳۳۹ [2] المرقات ۱/۳۴۰

بات شیخ عبدالحق عشائلله نے لمعات میں لکھی ہے جس کو مشکوٰۃ ص ۴۸۵ کے حاشیہ ۴ میں ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔ [۱]

غیر الثقلین: اس عالم کائنات پر دو ثقیل مخلوق قائم ہیں ایک انسان اور دوسرے جنات ہیں ان کو ثقلین کہا گیا مردوں کی چیخ و پکار اور فریاد کی آواز انسان اور جنات اس لئے نہیں سن سکتے ہیں کہ اگر یہ سن لیں تو پھر ایمان بالغیب ختم ہو جائے گا جبکہ یہ لوگ ایمان بالغیب کے مکلف ہیں۔

دوسری وجہ یہ کہ اگر یہ ہنگامہ قبر سن لیں گے تو دہشت کی وجہ سے یا مر جائیں گے یا گھر بار چھوڑ دیں گے اور صحراؤں میں گم ہو جائیں گے اور یا مردوں کو دفنانا چھوڑ دیں گے۔ [۲]

ما بین المشرق والمغرب: کے الفاظ بھی آرہے ہیں اس سے بھی مراد یہی ثقلین ہیں۔

مطارق: جمع مطرقة ہتھوڑے کو کہتے ہیں۔ "حدید": لوہے کو کہتے ہیں یعنی یہ ہتھوڑے لکڑی وغیرہ کے نہیں بلکہ لوہے کے ہوں گے۔ [۳]

لا دریت ولا تلیت: لغت اور قیاس کے مطابق تلوت لفظ آنا چاہئے تھا مگر **دریت** کی پڑوس اور اس کے اثر کی وجہ سے **تلیت** لایا گیا ہے جیسے **عشایا** کی وجہ سے **غدایا** لایا جاتا ہے اور **خزایا** کے وزن پر **ندامی** لایا جاتا ہے جیسا وفد عبدالقیس کی حدیث میں تشریح گزری ہے۔ [۴]

مُردے کو اپنا ٹھکانہ نظر آتا ہے

﴿۳﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا مَاتَ عُرِضَ عَلَيْهِ مَقْعَدُهٗ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ، اِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَمِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ، وَاِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَمِنْ اَهْلِ النَّارِ فَيُقَالُ هٰذَا مَقْعَدُكَ حَتّٰى يَبْعَثَكَ اللهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) [۵]

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی مرتا ہے تو (قبر کے اندر) صبح اور شام اس کا ٹھکانہ اس کے سامنے لایا جاتا ہے اگر وہ جنتی ہوتا ہے تو جنت میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اور اگر دوزخی ہوتا ہے تو دوزخ میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا ٹھکانہ اس کا انتظار کر، یہاں تک کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تجھے اٹھا کر وہاں بھیجے۔ (بخاری و مسلم)

قبر کا عذاب حق ہے

﴿۴﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ يَهُوْدِيَّةً دَخَلَتْ عَلَيْهَا فَذَكَرَتْ عَذَابَ الْقَبْرِ فَقَالَتْ لَهَا اَعَاذَكِ اللهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَسَاَلَتْ عَائِشَةُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ عَنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَقَالَ نَعَمْ عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ

[۱] استعه المعات ۱/۱۲۴ [۲] المرقات ۱/۳۲۳ [۳] المرقات ۱/۲۲۲ [۴] ۱/۳۳۱ [۵] اخرجه البخاری ۲/۱۲۴ ومسلم ۸/۱۶۰

قَالَتْ عَائِشَةُ فَمَا رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَعْدُ صَلّٰی صَلَاةً اِلَّا تَعَوَّذَ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ۔

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۱]

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ ایک یہودی عورت ان کے پاس آئی اور اس نے قبر کے عذاب کا ذکر کیا اور پھر اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا "(عائشہ!) اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب قبر سے محفوظ رکھے!" حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سرکار دو عالم ﷺ سے عذاب قبر کا حال پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! قبر کا عذاب حق ہے!" حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ نے کوئی نماز پڑھی ہو اور قبر کے عذاب سے پناہ نہ مانگی ہو۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: فقال نعم: یعنی یہودیہ عورت نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا کہ تجھے اللہ عذاب قبر سے بچائے تو اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا ہاں عذاب قبر حق ہے اب سوال یہ ہے کہ اس یہودیہ کو عذاب قبر کا علم کیسے ہوگیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کیسے معلوم نہ ہوسکا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہودیہ کو اس کا علم تورات سے ہوا تورات کی تعلیم اسی طرح تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس لئے معلوم نہ تھا کہ اب تک اسلام میں اس کا حکم بذریعہ وحی آنحضرت ﷺ پر نہیں اترا تھا بلکہ مسند احمد اور مسلم شریف کی ایک روایت میں تو اس طرح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"کذب یهود لا عذاب دون عذاب یوم القیامة وانما تفتن الیهود"۔

پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ ﷺ کو عذاب قبر کے متعلق معلوم ہوا تو آپ تعوذ فرماتے تھے یہ تعوذ تعلیم امت کے لئے تھا ورنہ آنحضرت ﷺ کو خود عذاب قبر کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

عذاب قبر کا مشاہدہ

﴿۵﴾ وَعَنْ زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ بَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِیْ حَائِطٍ لِبَنِی النَّجَّارِ عَلٰی بَغْلَةٍ لَهٗ وَنَحْنُ مَعَهٗ اِذْ حَادَتْ بِهٖ فَكَادَتْ تُلْقِیْهِ وَاِذَا اَقْبُرٌ سِتَّةٌ اَوْ خَمْسَةٌ فَقَالَ مَنْ یَعْرِفُ اَصْحَابَ هٰذِهِ الْاَقْبُرِ قَالَ رَجُلٌ اَنَا قَالَ فَمَتٰی مَاتُوْا قَالَ فِی الشِّرْكِ فَقَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ تُبْتَلٰی فِیْ قُبُوْرِهَا فَلَوْلَا اَنْ لَا تَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ اللّٰهَ اَنْ یُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِیْ اَسْمَعُ مِنْهُ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَیْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالُوْا

---

[۱] اخرجه البخاری ۲/۱۲۴ ومسلم ۸/۹۷

نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (ایک روز) جب کہ آنحضرت ﷺ بنی نجار کے باغ میں اپنے خچر پر سوار تھے اور ہم بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھے کہ اچانک خچر بدک گیا اور قریب تھا کہ آپ ﷺ کو گرا دے، ناگہاں پانچ چھ قبریں نظر آئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''ان قبر والوں کو کوئی جانتا ہے؟'' ایک شخص نے کہا ''میں جانتا ہوں!'' آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ کب مرے ہیں؟'' (یعنی حالت کفر میں مرے ہیں یا ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں) اس شخص نے عرض کیا ''یہ تو شرک کی حالت میں مرے ہیں'' آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ امت اپنی قبروں میں آزمائی جاتی ہے (یعنی ان لوگوں پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے) اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ تم (مردوں کو) دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں ضرور اللہ سے یہ دعا کرتا کہ وہ تم کو بھی عذاب قبر (کی اس آواز) کو سنا دے جس کو میں سن رہا ہوں'' اس کے بعد آپ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا آگ کے عذاب سے خدا کی پناہ مانگو'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''ہم آگ کے عذاب سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں'' آپ ﷺ نے فرمایا'' قبر کے عذاب سے خدا کی پناہ مانگو'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''ہم عذاب قبر سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں!'' آپ ﷺ نے فرمایا ''ظاہری اور باطنی فتنوں سے خدا کی پناہ مانگو'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''ہم ظاہری اور باطنی فتنوں سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں'' آپ ﷺ نے فرمایا ''دجال کے فتنہ سے خدا کی پناہ مانگو'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''ہم دجال کے فتنہ سے خدائے تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔'' (مسلم)

توضیح: **من الفتن ما ظهر منها وما بطن:** ظاہری فتنہ وہ ہے جو محسوس ہو جائے اور جس کے اسباب بھی معلوم ہوں اور باطنی فتنہ وہ ہوتا ہے جو محسوس نہ ہو اور نہ اس کے اسباب ظاہر ہوں۔ یا اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری فتنہ وہ ہوتا ہے جو ظاہری بدن سے متعلق ہو اور باطنی فتنہ وہ ہوتا ہے جو ایمان وعقیدہ کے فساد سے متعلق ہو۔[2]

الفصل الثانی

قبر میں منکر نکیر کا سوال

﴿۶﴾ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا أُقْبِرَ الْمَيِّتُ أَتَاهُ مَلَكَانِ أَسْوَدَانِ أَزْرَقَانِ يُقَالُ لِأَحَدِهِمَا الْمُنْكَرُ وَلِلْآخَرِ النَّكِيْرُ فَيَقُوْلَانِ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ فَإِنْ كَانَ مُؤْمِنًا فَيَقُوْلُ هُوَ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ فَيَقُوْلَانِ قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُوْلُ هٰذَا ثُمَّ يُفْسَحُ لَهُ فِي قَبْرِهِ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فِي سَبْعِيْنَ ثُمَّ يُنَوَّرُ لَهُ فِيْهِ ثُمَّ يُقَالُ

[1] اخرجه مسلم ۸/۱۶۰ [2] المرقات ۱/۳۲۷

لَهٗ ثُمَّ فَيَقُوْلُ اَرْجِعُ اِلٰى اَهْلِيْ فَاُخْبِرُهُمْ فَيَقُوْلَانِ نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ الَّذِيْ لَا يُوْقِظُهٗ اِلَّا اَحَبُّ اَهْلِهٖ اِلَيْهِ حَتّٰى يَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهٖ ذٰلِكَ وَاِنْ كَانَ مُنَافِقًا قَالَ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ قَوْلًا فَقُلْتُ مِثْلَهٗ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْلُ ذٰلِكَ فَيُقَالُ لِلْاَرْضِ الْتَئِمِيْ عَلَيْهِ فَتَلْتَئِمُ عَلَيْهِ فَتَخْتَلِفُ اَضْلَاعُهٗ فَلَا يَزَالُ فِيْهَا مُعَذَّبًا حَتّٰى يَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهٖ ذٰلِكَ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جب مردہ کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے پاس کالے رنگ کے نیلی آنکھوں والے دو فرشتے آتے ہیں جن میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں وہ دونوں اس مردہ سے پوچھتے ہیں کہ تو اس شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کیا کہتا تھا؟ اگر وہ شخص مؤمن ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور اس کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بلاشبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں" (یہ سن کر) وہ دونوں فرشتے کہتے ہیں "ہم جانتے تھے کہ تو یقیناً یہی کہے گا۔" اس کے بعد اس کی قبر لمبائی اور چوڑائی میں ستر ۷۰ ستر ۷۰ گز کشادہ کردی جاتی ہے اور اس مردہ سے کہا جاتا ہے کہ "سو جاؤ!" مردہ کہتا ہے (میں چاہتا ہوں) کہ اپنے اہل و عیال میں واپس چلا جاؤں تا کہ ان کو (اپنے اس حال سے) باخبر کردوں۔" فرشتے اس سے کہتے ہیں "تو اس دلہن کی طرح سو جا جس کو صرف وہی شخص جگا سکتا ہے جو اس کے نزدیک سب سے محبوب ہو (یعنی ہر کسی کا جگانا اچھا نہیں لگتا کیونکہ اس سے وحشت ہوتی ہے البتہ جب محبوب جگاتا ہے تو اچھا لگتا ہے) یہاں تک کہ خدا تعالیٰ اس کو اس جگہ سے اٹھائے۔" اور اگر وہ مردہ منافق ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو جو کچھ کہتے سنا تھا وہی میں کہتا تھا لیکن میں (اس کی حقیقت کو) نہیں جانتا (منافق کا یہ جواب سن کر) فرشتے کہتے ہیں "ہم جانتے تھے کہ یقیناً تو یہی کہے گا۔" (اس کے بعد) زمین کو مل جانے کا حکم دیا جاتا ہے چنانچہ زمین اس مردہ کو اس طرح دباتی ہے کہ اس کی دائیں پسلیاں بائیں اور بائیں پسلیاں دائیں طرف نکل جاتی ہیں اور اسی طرح ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس جگہ سے اٹھائے"۔ (ترمذی)

توضیح: اذا اقبر المیت: یہ عام عادت کے مطابق فرمایا ورنہ قبر سے مراد برزخ ہے اب کوئی دفن ہو یا نہ ہو فرشتے برزخ میں اس میت کو پالیتے ہیں اور ان کے پاس آتے ہیں۔[2]

المنکر والنکیر: یعنی نا آشنا مکروہ اور ناپسندیدہ، یہ صفات ان کی ڈراؤنی شکل ظاہر کرنے کے لئے ہیں کافر و منافق کے لئے یہی فرشتے آتے ہیں اور مؤمنین کے لئے جو آتے ہیں، ان میں ایک کا نام بشیر ہے، دوسرے کا نام نذیر ہے۔

اسودان: کالے سیاہ ازرقان: نیلی آنکھوں والے یہ صفت عرب کے ہاں نہایت مقبوح اور ہیبت ناک ہوتی ہے۔[3]

سبعون: یہ وسعت سے کنایہ ہے تعین مراد نہیں ہے مد بصر اور سبعون میں تعارض نہیں ہے کیونکہ سبعون میں تکثیر اور وسعت

[1] اخرجه الترمذی ۱۰۷۱ [2] المرقات ۱/۳۲۷ [3] المرقات ۱/۳۲۸

کی طرف اشارہ ہے جو مدبصر کے منافی نہیں ہے۔ سبعون فی سبعین میں عدد دوسرے عدد کے لئے ظرف ہے جس سے ہر چار اطراف کی مقدار مراد ہے وسعت قبر باعتبار اشخاص بھی ہوتی ہے۔[1]

کنا نعلم: یعنی چہروں سے ہمیں اندازہ ہو گیا تھا یا الہام کے طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ تم ایسا جواب دو گے۔[2]

نم: یہ توجہ ہٹانے کے لئے کہہ دیا کہ جاؤ آرام کرو۔[3]

قبر میں سوال وجواب

﴿۷﴾ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ يَأْتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهِ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَا دِيْنُكَ فَيَقُوْلُ دِيْنِيَ الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَيَقُوْلَانِ لَهُ وَمَا يُدْرِيْكَ فَيَقُوْلُ قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ فَاٰمَنْتُ بِهٖ وَصَدَّقْتُ فَذٰلِكَ قَوْلُهُ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ الْاٰيَةَ. قَالَ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِّنَ السَّمَاءِ اَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ فَاَفْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهُ بَابًا اِلَى الْجَنَّةِ فَيُفْتَحُ لَهُ قَالَ فَيَأْتِيْهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيْبِهَا وَيُفْسَحُ لَهُ فِيْهَا مَدَّ بَصَرِهٖ وَاَمَّا الْكَافِرُ فَذَكَرَ مَوْتَهُ قَالَ وَيُعَادُ رُوْحُهُ فِيْ جَسَدِهٖ وَيَأْتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهِ فَيَقُوْلَانِ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَا دِيْنُكَ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِّنَ السَّمَاءِ اَنْ كَذَبَ فَاَفْرِشُوْهُ مِنَ النَّارِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ النَّارِ وَافْتَحُوْا لَهُ بَابًا اِلَى النَّارِ قَالَ فَيَأْتِيْهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُوْمِهَا قَالَ وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهُ حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيْهِ اَضْلَاعُهُ ثُمَّ يُقَيَّضُ لَهُ اَعْمٰى اَصَمُّ مَعَهُ مِرْزَبَّةٌ مِّنْ حَدِيْدٍ لَوْ ضُرِبَ بِهَا جَبَلٌ لَصَارَ تُرَابًا فَيَضْرِبُهُ بِهَا ضَرْبَةً فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اِلَّا الثَّقَلَيْنِ فَيَصِيْرُ تُرَابًا ثُمَّ يُعَادُ فِيْهِ الرُّوْحُ. (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْ دَاوٗدَ)[4]

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "(قبر میں) مردے کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا کر اس سے پوچھتے ہیں کہ "تیرا رب کون ہے؟" وہ جواب دیتا ہے "میرا رب اللہ ہے" پھر فرشتے پوچھتے ہیں "تیرا دین کیا ہے؟" وہ جواب میں کہتا ہے "میرا دین اسلام ہے" پھر فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں "جو شخص (خدا کی طرف سے) تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ کون ہے؟" وہ کہتا ہے "وہ خدا کے رسول ہیں" پھر فرشتے اس سے پوچھتے ہیں "یہ تجھے کس نے بتایا؟" وہ کہتا ہے "میں نے خدا کی کتاب پڑھی اور اس پر ایمان لایا اور اس کو سچ جانا (یعنی جو کلام اللہ

[1] المرقات ۱/۳۳۸ [2] المرقات ۱/۳۳۸ [3] المرقات ۱/۳۳۸ [4] اخرجہ احمد ۴/۲۸۷ وابو داؤد

پر ایمان لائے گا وہ رسول اللہ پر پہلے ایمان لائے گا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا ﴿یثبت الله الذین اٰمنوا بالقول الثابت﴾ (الآیۃ) یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ثابت قدم رکھتا ہے جو ثابت بات پر ایمان لائے (اخیر آیت تک) آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ آسمان سے پکارنے والا (یعنی اللہ تعالیٰ یا اس کے حکم سے فرشتہ) پکار کر کہتا ہے "میرے بندے نے سچ کہا لہٰذا اس کے لئے جنت کا فرش بچھاؤ اور اس کو جنت کی پوشاک پہناؤ" اور اس کے واسطے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو، چنانچہ جنت کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا (اس جنت کے دروازے سے) اس کے پاس جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آتی ہیں اور حد نظر تک اس کی قبر کو کشادہ کر دیا جاتا ہے اب رہا کافر! تو آنحضرت ﷺ نے اس کی موت کا ذکر کیا اور اس کے بعد فرمایا "پھر اس کی روح اس کے جسم میں ڈالی جاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں "تیرا رب کون ہے؟" وہ کہتا ہے "ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا" پھر وہ پوچھتے ہیں "تیرا دین کیا ہے؟" وہ کہتا ہے "ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا" پھر وہ پوچھتے ہیں یہ شخص کون ہے جو (خدا کی جانب سے) تم میں بھیجا گیا تھا وہ کہتا ہے "ہاہ ہاہ میں نہیں جانتا" پھر آسمان سے ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا "یہ جھوٹا ہے اس کے لئے آگ کا فرش بچھاؤ، آگ کا لباس اسے پہناؤ اور اس کے واسطے ایک دروازہ دوزخ کی طرف کھول دو" آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ "دوزخ سے اس کے پاس گرم ہوائیں اور لوئیں آتی ہیں" اور فرمایا اور اس کی قبر اس کے لئے تنگ کر دی جاتی ہے یہاں تک کہ ادھر کی پسلیاں ادھر اور ادھر کی پسلیاں ادھر نکل آتی ہیں پھر اس پر ایک اندھا بہرا فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے جس کے پاس لوہے کا ایسا گرز ہوتا ہے کہ اس کو اگر پہاڑ پر مارا جائے تو وہ مٹی ہو جائے اور وہ فرشتہ اس کو اس گرز سے اس طرح مارتا ہے کہ (اس کے چیخنے چلانے کی آواز) مشرق سے مغرب تک تمام مخلوقات سنتی ہے مگر جن وانسان نہیں سنتے اور اس مارنے سے وہ مردہ مٹی ہو جاتا ہے اس کے بعد پھر اس کے اندر روح ڈالی جاتی ہے۔ (احمد وابوداؤد)

توضیح: وما یدریك: اس جملہ سے معلوم ہوا کہ قبر میں فرشتے کئی مختلف سوالات کرتے ہیں صرف وہ مشہور تین سوالات نہیں جو مشہور ہیں۔

مد بصرہ: یعنی حد نگاہ تک قبر میں وسعت آتی ہے دنیا میں اس کی مثال بعض شیش محل سونے کی دکانیں ہیں جن میں آدمی تا حد نگاہ وسعت محسوس کرتا ہے حالانکہ وہ چھ فٹ کی دکان ہوتی ہے۔[1]

ھاہ ھاہ: یہ عربی لغت میں ایک لفظ ہے جو انتہائی دہشت اور تحیر وتحسر کے وقت آدمی بولتا ہے جیسے اردو میں ہائے وائے کے الفاظ آتے ہیں **لا ادری** اسی کا بیان ہے۔[2]

الذی بعث فیکم: جن لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کو مانا ہو آپ ﷺ کی شریعت پر عمل کیا ہو سنت پر چلے ہوں وہ فوراً پہچان لیں گے کہ اس مبعوث سے مراد محمد عربی ﷺ ہیں اور جو لوگ دنیا میں بعثت وشریعت سے اندھے بہرے رہے وہ وہاں بھی اسی طرح اندھے بہرے رہیں گے۔[3]

---

[1] المرقات ۱/۳۵۲ [2] المرقات ۱/۳۵۲ [3] المرقات ۱/۳۵۳

فینادی مناد: جیسے ریڈیو پر اعلان فوراً پہنچ جاتا ہے ایسا ہی یہ اعلان ہوگا۔ "ان کذب": یعنی یہ شخص باطل پڑھتا یہی مطلب ہے ورنہ یہاں جھوٹ نہیں ہے نہ اس نے یہاں جھوٹ کہا ہے۔[1]

اعمی اصم: یعنی بمنزلہ اعمیٰ ہے کہ ترس نہیں آتا اور بمنزلہ بہرا ہے گویا سنتا ہی نہیں، یہ اس لئے تا کہ مجرم پر نہ ترس آئے نہ احساس ہو۔

مرزبة: گرز کو کہتے ہیں جو لوہے کا ہوتا ہے۔ **ثم یعاد:** یعنی روح پھر تازہ کی جاتی ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روح دوبارہ ڈالی جاتی ہے۔[2]

قبرستان رونے کی جگہ ہے

﴿۸﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ كَانَ إِذَا وَقَفَ عَلَى قَبْرٍ بَكَى حَتّٰى يَبُلَّ لِحْيَتَهُ فَقِيلَ لَهُ تَذْكُرُ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ فَلَا تَبْكِي وَتَبْكِي مِنْ هٰذَا فَقَالَ إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ إِنَّ الْقَبْرَ أَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الْآخِرَةِ فَإِنْ نَجَا مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَيْسَرُ مِنْهُ وَإِنْ لَمْ يَنْجُ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَشَدُّ مِنْهُ قَالَ وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَا رَأَيْتُ مَنْظَرًا قَطُّ إِلَّا وَالْقَبْرُ أَفْظَعُ مِنْهُ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ)[3]

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تو (خوف خدا سے) اس قدر روتے کہ ان کی داڑھی (آنسوؤں سے) تر ہو جاتی، ان سے کہا گیا کہ آپ جب جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو نہیں روتے اور اس جگہ کھڑے ہو کر روتے ہیں (اس کے جواب میں) انہوں نے کہا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے "آخرت کی منزلوں میں سے قبر پہلی منزل ہے لہٰذا جس نے اس منزل سے نجات پائی اس کو اس کے بعد آسانی ہے اور جس نے اس منزل سے نجات نہیں پائی اس کو اس کے بعد سخت دشواری ہے۔" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "میں نے کبھی کوئی منظر قبر سے زیادہ سخت نہیں دیکھا۔" (ترمذی ابن ماجہ۔ اور ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے)

توضیح: بکی: الایمان بین الخوف والرجآء: کی بنیاد پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ذوالنورین روتے تھے مقربین بارگاہ الٰہی زیادہ رویا کرتے ہیں یہ رونا اس کے منافی نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے بلکہ بشارت والے تو عبادات و اعمال میں زیادہ چست ہو جاتے ہیں۔ اور ہر موقع و مقام کو اس کا حق دیتے ہیں نہ یہ کہ عبادات و اعمال میں سستی کرتے ہیں قبر تو ایسا مقام ہے جو تمام لذات کو بھلا دیتا ہے۔[4]

فما بعدہ اشد منہ: کہتے ہیں کہ دنیا کے ۹۰۰ مصائب اور حالت نزع کے ایک مصیبت برابر ہے، نزع کے ۹۰۰ مصائب اور قبر کی ایک مصیبت برابر ہے، قبر کے ۹۰۰ مصائب اور محشر کی ایک مصیبت اور محشر کے ۹۰۰ مصائب اور دوزخ کی ایک مصیبت برابر ہے۔[5]

---

[1] المرقات ۱/۳۵۳ [2] المرقات ۱/۳۵۴ [3] اخرجہ الترمذی ۲۳۰۸ وابن ماجہ ۴۲۶۷ [4] المرقات ۱/۳۵۵ [5] المرقات ۱/۳۵۵

تدفین کے بعد دعا کا ثبوت

﴿۹﴾ وَعَنْهُ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ اِسْتَغْفِرُوْا لِأَخِيْكُمْ ثُمَّ سَلُوْا لَهُ بِالتَّثْبِيْتِ فَإِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ. (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ)[1]

ترجمہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو کر (لوگوں سے) فرماتے اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی دعا مانگو (یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت اس کو ثابت قدم رکھے) اس لئے کہ اس وقت اس سے سوال کیا جاتا ہے۔ (ابوداؤد)

توضیح: استغفروا لاخیکم: حدیث شریف کے ان جملوں سے قبر پر استغفار اور قبرستان میں دعاء کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے لہٰذا دفن میت کے بعد عام طور پر دعاء مانگی جاتی ہے علماء ربانیین نے اس دعاء میں ہاتھ اٹھانے کو خلاف اولیٰ لکھا ہے کیونکہ مردہ سے مانگنے کا شبہ ہوسکتا ہے ہاں اگر ہاتھ نہ اٹھانے کی وجہ سے فتنہ اٹھتا ہو تو ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے لیکن مردہ کے محاذات میں کھڑا نہ ہو، اگر اپنے ماحول میں اپنے احباب کے ساتھ ہو تو ان کو ارسال یدین کا حکم دے دے۔ کیونکہ یہ افضل ہے۔[2]

بالتثبیت: تثبیت کی دعاء اس طرح ہے "**اللّٰھم ثبتہ اللّٰھم اغفرلہ اللّٰھم ارحمہ** وغیرہ وغیرہ" یہ حنفیہ کا مسلک ہے شوافع حضرات نے اس حدیث سے مردہ کی تدفین کے بعد تلقین کا مسئلہ بھی نکالا ہے، تاہم تلقین کا مسئلہ سماع موتی پر متفرع ہے جو حضرات سماع موتی کے قائل ہیں وہ تلقین کے بھی قائل ہیں اور جو حضرات سماع موتی کے قائل نہیں وہ اس تلقین کے بھی قائل نہیں۔ جو تدفین کے بعد قبر پر ہوتی ہے، سورہ بقرہ کی ابتداء اور انتہاء سے ایک ایک رکوع پڑھنا اتفاقی مسئلہ ہے۔
قائلین تلقین نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس کو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع الجوامع میں **طبرانی** سے نقل کیا ہے اور ابن نجار، ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ اور دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی انتقال کر جائے اور تم اس کو دفن کر دو تو ایک شخص قبر کے سرہانے کھڑا ہو جائے اور کہے اے فلاں ابن فلانہ اے فلاں بن فلانہ، مردہ جواب دیتا ہے اگرچہ تم نہیں سنتے ہو پھر کہے اے فلاں! اس کلمہ کو یاد کرو جس پر تم اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے اور وہ "**اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و ان محمدا عبدہ ورسولہ**" کی گواہی ہے نیز تم اس پر راضی ہوئے کہ خدا تمہارا پروردگار ہے اور محمد ﷺ تمہارے پیغمبر ہیں اور قرآن تمہارا رہبر و امام ہے، جب یہ کہا جاتا ہے تو منکر نکیر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہتے ہیں کہ چلو اس بندہ کے سامنے سے باہر نکلو ہمیں اس سے کیا سروکار ہے کیونکہ اللہ کی جانب سے اس کو تلقین کی جارہی ہے۔ (مظاہر حق ج ۱ ص ۱۴۹)[3]
یہ حدیث ضعیف ہے اور اس تلقین میں اختلاف ہے لیکن ایک اور تلقین ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے مشکوٰۃ شریف ص ۱۴۹ پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب تمہارا کوئی

---
[1] اخرجہ ابو داؤد: ۳۲۲۱ [2] المرقات ۱/۳۵۶ [3] المرقات ۱/۳۵۶

مر جائے تو اس کو گھر میں مت روکو بلکہ جلدی اس کو قبر میں دفن کے لئے لے چلو پھر اس مردہ کی قبر کے سرہانے سورۂ بقرہ کی ابتداء سے پڑھو، اور پاؤں کی جانب سورت بقرہ کے آخر (آمن الرسول) سے پڑھو۔ بیہقی نے اس روایت کی تخریج کی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے ایک تلقین حالت نزع میں شہادتین کی تلقین ہے تاکہ قریب الموت آدمی سن کر پڑھنے لگ جائے چنانچہ حکم ہے لقنوا موتاکم الخ۔

قبر میں (۹۹) اژدھے

﴿۱۰﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَيُسَلَّطُ عَلَى الْكَافِرِ فِي قَبْرِهِ تِسْعَةٌ وَتِسْعُونَ تِنِّينًا تَنْهَسُهُ وَتَلْدَغُهُ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ لَوْ أَنَّ تِنِّينًا مِنْهَا نَفَخَ فِي الْأَرْضِ مَا أَنْبَتَتْ خَضِرًا۔

(رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ نَحْوَهُ وَقَالَ سَبْعُونَ بَدَلَ تِسْعَةٌ وَتِسْعُونَ)[1]

ترجمہ: حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کافر کے اوپر اس کی قبر میں ننانوے اژدھے مسلط کئے جاتے ہیں جو اسکو قیامت تک کاٹتے اور ڈستے ہیں اور وہ اژدھے ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک اژدھا زمین پر پھنکار مارے تو زمین سبزہ اگانے سے محروم ہو جائے'' (دارمی) اور ترمذی سے بھی اسی قسم کی روایت منقول ہے لیکن اس میں بجائے ننانوے کے ستر کا عدد ہے۔

توضیح: **تنینا**: اس بڑے سانپ کو کہتے ہیں جس کو اژدھا کہا جاتا ہے **تنهسه وتلدغه** بعض شارحین نے ان دونوں الفاظ کا معنی ایک ہی بتایا ہے یعنی کاٹنا ڈسنا ڈنگ مارنا، بعض شارحین نے اس میں فرق کیا ہے کہ **تنهسه** اس کاٹنے کو کہتے ہیں جس سے کھال اتر جائے اور **تلدغه** صرف ڈسنے کو کہتے ہیں۔[2]

اب یہاں سوال یہ ہے ۹۹ اژدھوں کے مسلط کرنے کی حکمت کیا ہے؟

پہلا جواب: تو یہ ہے کہ یہ شارع کا کلام ہے اس میں کسی تعداد کی خصوصیات یا حکمتیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا جواب: یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام ہیں ہر نام کی الگ خصوصیت ہے کافر جب کفر کرتا ہے تو سب کا انکار کرتا ہے لہٰذا ہر نام کے انکار پر ایک ایک اژدھا مقرر کیا جاتا ہے۔

تیسرا جواب: یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت کائنات میں تقسیم ہو گئی ہے اور ۹۹ رحمتیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں جو عالم آخرت میں ظاہر ہوں گی اور مؤمنین کے ساتھ خاص ہوں گی کافر چونکہ ان سب کا انکار کرتا ہے تو مؤمنین کے برعکس کفار پر ۹۹ اژدھے مسلط کئے جائیں گے۔

ترمذی کی روایت میں ۹۹ کے بجائے ستر کا ذکر آیا ہے جو عربی کلام میں تکثیر کے لئے آتا ہے مراد وہی ۹۹ ہے۔

---

[1] اخرجه الترمذی والدارمی ۲۸۱۸ [2] المرقات ۱/۳۵۶

۱۵ محرم ۱۴۱۰ھ:

الفصل الثالث

قبر کا تنگ ہو جانا

﴿۱۱﴾ عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِلٰی سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ حِیْنَ تُوُفِّیَ فَلَمَّا صَلّٰی عَلَیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَوُضِعَ فِیْ قَبْرِهٖ وَسُوِّیَ عَلَیْهِ سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَسَبَّحْنَا طَوِیْلًا ثُمَّ كَبَّرَ فَكَبَّرْنَا فَقِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَ سَبَّحْتَ ثُمَّ كَبَّرْتَ فَقَالَ لَقَدْ تَضَایَقَ عَلٰی هٰذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُهٗ حَتّٰی فَرَّجَهُ اللّٰهُ عَنْهُ. (رَوَاهُ اَحْمَدُ)[1]

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہم آنحضرت ﷺ کے ہمراہ ان کے جنازہ پر گئے جب آنحضرت ﷺ جنازہ کی نماز پڑھ چکے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو قبر میں اتار کر قبر کی مٹی برابر کر دی گئی تو سرکار دو عالم ﷺ تسبیح (یعنی سبحان اللہ) پڑھتے رہے تو ہم نے بھی دیر تک تسبیح پڑھی پھر آپ ﷺ نے تکبیر (یعنی اللہ اکبر) کہی ہم نے بھی تکبیر کہی، پھر آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ آپ نے تسبیح کیوں پڑھی اور پھر تکبیر کیوں کہی؟ فرمایا "اس بندۂ صالح پر اس کی قبر تنگ ہو گئی تھی پھر خدا نے (ہماری تسبیح و تکبیر کی وجہ سے) اسے کشادہ کر دیا"۔ (احمد)

﴿۱۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هٰذَا الَّذِیْ تَحَرَّكَ لَهُ الْعَرْشُ وَفُتِحَتْ لَهٗ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَشَهِدَهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِنَ الْمَلَائِكَةِ لَقَدْ ضُمَّ ضَمَّةً ثُمَّ فُرِّجَ عَنْهُ. (رَوَاهُ النَّسَائِیُّ)[2]

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "یہ (یعنی سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ) وہ شخص ہیں جن کے لئے عرش نے حرکت کی (یعنی اس کی پاک روح جب آسمان پر پہنچی تو اہل عرش نے خوشی و مسرت کا اظہار کیا) اور ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے گئے اور ان کے جنازے پر ستر ۷۰ ہزار فرشتے حاضر ہوئے (لیکن پھر بھی) ان کی قبر تنگ کی گئی پھر یہ تنگی دور ہوئی (اور آنحضرت ﷺ کی برکت سے ان کی قبر کشادہ ہو گئی)۔ (نسائی)

توضیح: تحرك له العرش: دونوں حدیثوں میں اشارہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف ہے جو جنگ خندق کے موقع پر زخمی ہوئے تھے اور بعد میں شہید ہو گئے تھے عرش کی حرکت خوشی کے طور پر تھی کہ اس عظیم الشان انسان کی روح سے عرش کی ملاقات ہو جائے گی عرش اگرچہ جماد ہے مگر اپنے انداز سے تو آسمان بھی روتا ہے اور دوسرے جمادات بھی روتے ہیں جب کوئی نیک آدمی دنیا سے اٹھ جاتا ہے لہذا عرش کا خوش ہو کر حرکت کرنا کوئی مستبعد امر نہیں علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات پر بطور غم و افسوس عرش میں یہ حرکت آئی ہو اور یہ غم سے کنایہ ہو۔[3]

[1] اخرجه احمد ۳/۳۶۰ [2] اخرجه النسائی ۴/۱۰۰ [3] المرقات ۱/۳۵۹

لقد ضم ضمة: یہ قبر کے دبانے سے کنایہ ہے، اس حدیث میں قبر کے ہیبت ناک اور خوفناک منظر سے ڈرانا مقصود ہے کہ اتنے بڑے درجات اور اتنی بڑی شان والے صحابی کو دیکھو کہ عرش ان کے لئے جھومنے لگا، ستر ہزار فرشتے جنازہ میں شریک ہوئے، شہادت کا عالی درجہ پایا اور آسمان کے سارے دروازے استقبال کے لئے کھل گئے مگر پھر بھی قبر نے دبوچنے کی کوشش کی تو دوسروں کا کیا حال ہوگا اس لئے کسی کو اپنے انجام سے بے خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ بعض نے کہا کہ قبر نے محبت میں دبایا جس سے ظاہری تکلیف ہوتی ہے مگر باطنی لذت ہوتی ہے۔ احباب وابرار کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے اگرچہ فجار کے ساتھ ایذا کا معاملہ ہوتا ہے یہ کلام بہت ہی بعید ہے حدیث کا سیاق وسباق اس کو قبول نہیں کرتا ہے بعض نے کہا کہ ابتداء میں کچھ زحمت کا اشارہ کر دیا تا کہ بعد میں سرور وراحت کا اچھی طرح احساس ہو واللہ اعلم۔ [۱]

قبر کا فتنہ دجال کے فتنے کے برابر ہے

﴿۱۳﴾ وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ قَالَتْ قَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ خَطِيبًا فَذَكَرَ فِتْنَةَ الْقَبْرِ الَّتِي يُفْتَنُ فِيهَا الْمَرْءُ فَلَمَّا ذَكَرَ ذٰلِكَ ضَجَّ الْمُسْلِمُونَ ضَجَّةً. (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ) [۲]

هٰكَذَا وَزَادَ النَّسَائِيُّ حَالَتْ بَيْنِي وَبَيْنَ أَنْ أَفْهَمَ كَلَامَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَلَمَّا سَكَنَتْ ضَجَّتُهُمْ قُلْتُ لِرَجُلٍ قَرِيبٍ مِنِّي أَيْ بَارَكَ اللهُ فِيكَ مَاذَا قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي آخِرِ قَوْلِهِ قَالَ قَالَ قَدْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّكُمْ تُفْتَنُونَ فِي الْقُبُورِ قَرِيبًا مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ.

ترجمہ: حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک دن سرکار دو عالم ﷺ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے اور قبر کے فتنہ کا ذکر فرمایا جس میں انسانوں کو مبتلا کیا جاتا ہے چنانچہ اس ذکر سے مسلمان خوف زدہ ہو کر روتے اور چلاتے رہے یہ روایت بخاری کی ہے اور نسائی نے اتنا اور زیادہ بیان کیا ہے کہ (خوف ودہشت کی وجہ سے) مسلمانوں کے چیخنے اور چلانے کے سبب میں آنحضرت ﷺ کے الفاظ کو نہ سن سکی جب یہ چیخنا چلانا بند ہوا تو میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا "خدا تمہیں برکت عطا فرمائے (یعنی تمہارے علم وعمل میں زیادتی ہو) آخر میں آنحضرت ﷺ نے کیا فرمایا؟ اس شخص نے کہا آپ ﷺ نے فرمایا مجھ پر یہ وحی آئی ہے کہ تم قبروں کے اندر فتنہ میں ڈالے جاؤ گے (یعنی تم کو آزمایا جائے گا) اور یہ آزمائش وامتحان فتنۂ دجال کے قریب قریب ہوگا۔

قبر میں نماز پڑھنے کی خواہش

﴿۱۴﴾ وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِذَا أُدْخِلَ الْمَيِّتُ الْقَبْرَ مُثِّلَتْ لَهُ الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوبِهَا فَيَجْلِسُ يَمْسَحُ عَيْنَيْهِ وَيَقُولُ دَعُونِي أُصَلِّي. (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه) [۳]

[۱] المرقات ۱/۳۶۰ والکاشف ۱/۳۲۰ [۲] اخرجه البخاری ۲/۱۲۳ والنسائی ۴/۱۰۳ [۳] اخرجه ابن ماجه ۴۲۷۲

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب مردہ (مومن) کو قبر کے اندر دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے سامنے غروب آفتاب کا وقت پیش کیا جاتا ہے چنانچہ وہ مردہ ہاتھوں سے آنکھوں کو ملتا ہوا اٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے مجھے چھوڑ دو تا کہ میں نماز پڑھ لوں"۔ (ابن ماجہ)

توضیح: دعوئی اصلی: یہ مداومت صلوٰۃ کی دلیل ہے کہ جو لوگ پابندی سے نماز پڑھتے ہیں ان کو ہوش بے ہوشی اور موت وحیات کے ہر لمحہ میں نماز کی فکر لگی رہتی ہے اور یہ ایمان کامل کی نشانی ہے۔[1]

مثلت له الشمس: یعنی سورج غروب کا نظارہ پیش کرتا ہوا مردے کو نظر آئے گا یہ وقت مسافر کے لئے پریشان کن ہوتا ہے وہ سوچتا ہے کہ رات کہاں گزاروں گا یہ شخص بھی عالم شہود عالم دنیا سے عالم غیب اور عالم آخرت کا مسافر ہے اس کو پریشانی ہے کہ سورج غروب ہو رہا ہے نماز بھی ابھی پڑھنی ہے مکان تلاش کر کے رات گزارنی ہے کسی سے واقفیت نہیں ہے زبان بھی ناآشنا ہے مکان بھی ناآشنا ہے لوگ بھی ناآشنا ہیں سوال وجواب بھی ناآشنا ہے کتاب بھی ناآشنا ہے امتحان بھی ناآشنا ہے کسی نے پشتو میں کہا:[2]

نا شنا وطن نا شنا مکان دے   نا شنا کتاب نا شنا تپوس رانہ کوینہ

کسی فارسی والے نے کہا:

تو زلف راکشادی وتاریک شد جہاں   اکنوں فتاد شام، غریباں کجا روند

احوال قبر

﴿۱۵﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنَّ الْمَيِّتَ يَصِيرُ إِلَى الْقَبْرِ فَيَجْلِسُ الرَّجُلُ فِي قَبْرِهِ غَيْرَ فَزِعٍ وَلَا مَشْعُوبٍ ثُمَّ يُقَالُ فِيمَ كُنْتَ فَيَقُولُ كُنْتُ فِي الْإِسْلَامِ فَيُقَالُ مَا هٰذَا الرَّجُلُ فَيَقُولُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ جَاءَنَا بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَصَدَّقْنَاهُ فَيُقَالُ لَهُ هَلْ رَأَيْتَ اللّٰهَ فَيَقُولُ مَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يَرَى اللّٰهَ فَيُفَرَّجُ لَهُ فُرْجَةٌ قِبَلَ النَّارِ فَيَنْظُرُ إِلَيْهِ يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا فَيُقَالُ لَهُ أُنْظُرْ إِلَى مَا وَقَاكَ اللّٰهُ ثُمَّ يُفَرَّجُ لَهُ فُرْجَةٌ قِبَلَ الْجَنَّةِ فَيَنْظُرُ إِلَى زَهْرَتِهَا وَمَا فِيهَا فَيُقَالُ لَهُ هٰذَا مَقْعَدُكَ عَلَى الْيَقِينِ كُنْتَ وَعَلَيْهِ مُتَّ وَعَلَيْهِ تُبْعَثُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالَى وَيَجْلِسُ الرَّجُلُ السُّوْءُ فِي قَبْرِهِ فَزِعًا مَشْعُوبًا فَيُقَالُ لَهُ فِيمَ كُنْتَ فَيَقُولُ لَا أَدْرِي فَيُقَالُ لَهُ مَا هٰذَا الرَّجُلُ فَيَقُولُ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُولُونَ قَوْلًا فَقُلْتُهُ فَيُفَرَّجُ لَهُ فُرْجَةٌ قِبَلَ الْجَنَّةِ فَيَنْظُرُ إِلَى زَهْرَتِهَا وَمَا فِيهَا فَيُقَالُ لَهُ أُنْظُرْ إِلَى مَا صَرَفَ اللّٰهُ عَنْكَ ثُمَّ يُفَرَّجُ لَهُ فُرْجَةٌ إِلَى النَّارِ فَيَنْظُرُ إِلَيْهَا يَحْطِمُ بَعْضُهَا

---

[1] المرقات ۱/۳۶۱ [2] المرقات ۱/۳۵۱

بَعْضًا فَيُقَالُ هٰذَا مَقْعَدُكَ عَلَى الشَّكِّ كُنْتَ وَعَلَيْهِ مُتَّ وَعَلَيْهِ تُبْعَثُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى.

(رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه)[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب مردہ قبر کے اندر پہنچتا ہے (یعنی اسے دفن کردیا جاتا ہے) تو (نیک) بندہ قبر کے اندر اس طرح اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے کہ نہ تو وہ خوفزدہ ہوتا ہے اور نہ گھبرایا ہوا پھر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کس دین میں تھے وہ کہتا ہے میں دین اسلام میں تھا پھر اس سے پوچھا جاتا ہے یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ وہ کہتا ہے ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں جو خدا کے پاس سے ہمارے لئے کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے اور ہم نے ان کی تصدیق کی“ پھر اس سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا تم نے اللہ کو دیکھا ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ ”خدا تعالیٰ کو تو کوئی نہیں دیکھ سکتا“ اس کے بعد اس کے لئے ایک روشن دان دوزخ کی طرف کھولا جاتا ہے اور وہ ادھر دیکھتا ہے اور آگ کے شعلوں کو اس طرح بھڑکتا ہوا پاتا ہے گویا اس کی لپٹیں ایک دوسرے کو کھا رہی ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے ”اس چیز کو دیکھو جس سے اللہ نے تجھے بچایا ہے“ پھر اس کے لئے ایک کھڑکی جنت کی طرف کھول دی جاتی ہے وہ جنت کی تروتازگی اور اس کی چیزوں کو دیکھتا ہے پھر اس سے کہا جاتا ہے ”یہ تمہارا ٹھکانہ ہے کیونکہ (تمہارا اعتقاد مضبوط اور اس پر) تمہیں کامل یقین تھا اور اسی (یقین واعتماد) کی حالت میں تمہاری وفات ہوئی اور اسی حالت میں تمہیں (قیامت کے دن) اٹھایا جائے گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا، اور بدکار بندہ اپنی قبر میں خوف زدہ اور گھبرایا ہوا اٹھ کر بیٹھتا ہے پس اس سے پوچھا جاتا ہے تو کس دین میں تھا؟ وہ کہتا ہے میں نہیں جانتا پھر اس سے پوچھا جاتا ہے یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کون تھے وہ کہتا ہے میں لوگوں کو جو کچھ کہتے سنتا تھا وہی میں کہتا تھا اس کے بعد اس کے لئے بہشت کی طرف ایک روشن دان کھولا جاتا ہے جس سے وہ بہشت کی تروتازگی اور اس کی چیزوں کو دیکھتا ہے پھر اس سے کہا جاتا ہے اس چیز کی طرف دیکھو جسے خدا نے تجھ سے پھیر لیا ہے پھر اس کے لئے دوزخ کی طرف ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ آگ کے تیز شعلے ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانہ ہے اس شک کے سبب جس میں تو مبتلا تھا اور جس پر تو مرا اور اسی پر تو اٹھایا جائے گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔

توضیح: غیر فزع: بغیر گھبرائے ہوئے **ولا مشغوب:** غیر فتنہ رسیدہ یہ دوسرا کلمہ پہلے کے لئے تاکید بھی بن سکتا ہے **هل رایت ربك** چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق سوال کے جواب میں فرشتوں کو میت نے کہا تھا کہ **”جاء نا بالبینات“** اس لئے فرشتہ نے سوال کیا کہ کیا تو نے اپنے رب کو دیکھا ہے کہ **من عند الله** کہتے ہو؟ اس سے معلوم ہوا کہ قبر میں مشہور تین سوالات کے ضمن میں کچھ اور سوالات بھی ہوں گے جیسے یہ مذکورہ سوال ہے **”علی الیقین کنت“** یعنی تمہارا عقیدہ مضبوط تھا ایمانی کیفیات میں کوئی تزلزل نہیں تھا اور اسی پر اٹھائے جاؤ گے ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ الگ ایک مستقل جملہ ہے۔[2]

---

[1] اخرجہ ابن ماجہ ۴۲۶۲ [2] المرقات ۱/۳۲۲، ۳۲۳

۱۶ محرم ۱۴۱۰ھ:

سماع موتی کا مسئلہ

"باب اثبات عذاب القبر" کی بعض احادیث میں ایسے جملے آئے ہیں جن سے مردوں کا قبروں میں سننا ثابت ہوتا ہے بالخصوص اس باب کی دوسری حدیث جو "حدیث قرع النعال" کے نام سے مشہور ہے اس میں مُردوں کا سننا واضح طور پر مذکور ہے اس لئے اس مسئلہ کا مختصر طور پر ذکر کرنا فائدہ سے شاید خالی نہ ہولیکن یہاں یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ سماع موتی سے ان اموات کا سماع یا عدم سماع مراد ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ ہیں اس لئے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے سماع میں کسی کا قابل ذکر اختلاف نہیں ہے بلکہ انبیائے کرام کا اپنی قبور میں سننا اہل السنت والجماعۃ کے تمام ائمہ کے نزدیک متفق علیہ ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلہ میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ انبیاء کو اسی وجہ سے مستثنیٰ کیا ہے سماع میں کسی کا اختلاف نہیں۔ (فتاوی رشیدیہ ص ۵۹ بحوالہ اشرف التوضیح)

بندہ نے جب بھی اس مسئلہ میں بحث کی ہے تو اپنے شاگردوں سے کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ انبیائے کرام کے علاوہ اموات کے سماع و عدم سماع میں جو تحقیق کرو وہ کرو مگر انبیائے کرام کے سماع میں خدا کے لئے بحث نہ کرو کیونکہ بے ادبی کا خطرہ ہے۔ جب ایک حدیث سے ثابت ہے کہ "من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علی نائیا ابلغته" (مشکوٰۃ ص ۸۷) اب یہ ایک حدیث ہے اس کو خواہ مخواہ ضعیف کرنے کی مجبوری کیا ہے؟ آیا کوئی ایسی روایت یا حدیث صحیح یا اجماع امت ہے جو ہمیں عدم سماع النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مجبور کر رہا ہو جس کی وجہ سے ہم مذکورہ روایت کو ترک کریں اور اس حدیث یا اجماع کو لے لیں۔ مشکوٰۃ ص ۱۲۰ اور صفحہ ۱۲۱ پر بھی دو حدیثیں ہیں جو حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر دال ہیں بہرحال انبیائے کرام کے علاوہ موتی میں سماع و عدم سماع کی بحث ہے کہ اگر کوئی شخص ان کی قبروں کے پاس جا کر کچھ کہے تو کیا یہ مردے اس کہنے کو سنتے ہیں یا نہیں سنتے اس مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک سے اب تک اختلاف چلا آرہا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کا ایک طبقہ اس کا قائل ہے کہ مردے سنتے ہیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک طبقہ اس کا قائل ہے کہ مردے نہیں سنتے ہیں فتاویٰ رشیدیہ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار لکھا ہے ملاحظہ ہو۔

سؤال: سماع موتی ثابت ہے یا نہیں در صورت جواز یا عدم جواز قول راجح کیا ہے اور تلقین بعد دفن ثابت ہے یا نہیں؟

جواب: یہ مسئلہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مختلف فیہا ہے اس کا فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ تلقین کرنا بعد دفن کے اسی پر ہی مبنی ہے جس پر عمل کرے درست ہے۔

سوال: میت قبر میں سنتی ہے یا نہیں؟

جواب: اموات کے سننے میں اختلاف ہے اور بعض کے نزدیک سنتی ہے بعض کے نزدیک نہیں سنتی۔

(فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۰۸)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاویٰ میں اس کے قریب قریب فرمایا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس مسئلہ میں ایک طرف جزمی فیصلہ اور حتمی حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے۔

طرفین کے دلائل

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر قائلین سماع موتی کے استدلالات یہ ہیں۔

❶ "**باب عذاب القبر**" کی دوسری حدیث ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں **انه لیسمع قرع نعالهم** کے الفاظ آئے ہیں۔

❷ قلیب بدر کا واقعہ اور تفصیلی حدیث ہے جس میں یہ الفاظ ہیں **والذی نفس محمد بیده ما انتم باسمع لما اقول منهم وفی روایة ما انتم باسمع منهم۔** (مشکوٰۃ ص ۳۴۵)

❸ مردوں کو قبروں میں سلام کرنا، ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے **السلام علیکم یا اهل القبور** والی حدیث کو صحیح کہا ہے۔

❹ طبرانی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ مردہ جس کو جانتا ہے وہ نہلاتے وقت اس نہلانے والے کو پہچانتا ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کی احادیث اپنی تفسیر میں جمع فرمادی ہیں جو ایک طویل فہرست ہے۔

❺ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے عالم برزخ میں مردوں کے علم پر اجماع نقل کیا ہے یہ اگرچہ محل نظر ہے مگر انہوں نے شرح مقاصد میں لکھا ہے۔

❻ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ احادیث سے ثابت ہے کہ مردہ جانتا ہے کہ کون اس کو کفن پہناتا ہے کون نماز پڑھتا ہے کون اس کو اٹھاتا ہے کون دفن کرتا ہے ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مردہ کھٹ کھٹ کی آواز سنتا ہے اور اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ قبر میں مردہ زندہ ہے ورنہ احساس کے بغیر حیات محال ہے بعض نے کہا روح لوٹائی جاتی ہے اور مردہ کو زندہ کیا جاتا ہے یہ قائلین سماع موتی کے دلائل ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دیگر عدم سماع کے قائلین نے قرآن عظیم کی تین آیتوں سے استدلال کیا ہے۔

❶ سورۂ نمل کی آیت (۸۰) **انك لا تسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین۔** [۱] سے استدلال کیا ہے۔

❷ سورۂ روم کی آیت (۵۲) **فانك لا تسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین** [۲] سے استدلال کیا ہے۔

[۱] نمل الآیہ ۸۰ [۲] روم الآیہ ۵۲

❸ سورۂ فاطر کی آیت (۲۲) وما یستوی الاحیآء ولا الاموات ان اللہ یسمع من یشآء وما انت بمسمع من فی القبور [1] سے استدلال کیا ہے۔

❹ عدم سماع اموات پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سماع اموات سے انکار یا توقف کے قول سے استدلال کیا ہے۔

❺ فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ کسی نے قسم کھائی کہ فلاں سے بات نہیں کروں گا اس نے مرنے کے بعد اس سے بات کی تو حانث نہیں ہوگا۔ کیونکہ مردہ نہیں سنتا اس مسئلہ کو مسئلہ ایمان سے یاد کیا جاتا ہے اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ مردے نہیں سنتے ہیں شیخ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے خوب عدم سماع کے اثبات کی کوشش کی ہے۔

''ایک دوسرے کو جوابات''

قائلین سماع موتی نے کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف عدم سماع کی نسبت صحیح نہیں ہے اور فقہاء احناف نے مردہ سے کلام کی وجہ سے حانث نہ ہونے کا جو مسئلہ لکھا ہے وہ قسم اور ایمان کا مسئلہ ہے جس کا مدار عرف پر ہے جس سے عدم سماع پر استدلال نہیں کیا جاسکتا ہے۔

قرآنی آیات کے بارے میں قائلین سماع موتی نے فرمایا کہ ان تینوں آیتوں میں نفی اسماع یعنی سنانے کی نفی ہے کہ آپ سنا نہیں سکتے نفس سماع کی نفی نہیں کہ وہ سنتے نہیں ہیں سننا اپنی جگہ پر ہے البتہ سنانے کی نفی کی گئی ہے۔

سؤال: شبہ یہ ہے کہ جب مردے سنتے ہیں تو پھر اسماع اور سنانے کی نفی قرآن کریم نے کیوں کی؟

جواب: ہر وہ عمل جو خارق عادت یا مافوق العادۃ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی طرف فرماتے ہیں اور مخلوق سے اس کی نفی کرتے ہیں مثلاً کسی شخص نے کسی کو گولی ماردی اور وہ مرگیا تو نسبت مارنے والے کی طرف کی جاتی ہے کہ اس نے مار کر قتل کردیا کیونکہ عادت کے مطابق اس سے آدمی مارا جاتا ہے اور موت واقع ہوجاتی ہے لیکن بدر کے میدان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر مٹی کافروں کی طرف پھینک دی جس سے عادت کے مطابق موت واقع نہیں ہوسکتی تھی مگر اس مٹی نے مافوق العادت اثر دکھادیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف فرمادی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی فرمادی اور فرمایا: "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی"۔

اسی طرح عادت کے مطابق مردہ کو قبر میں ظاہری اسباب کے تحت نہیں سنایا جاسکتا ہے اس لئے اس اسماع کی نفی کی گئی۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس میں سماع و عدم سماع کی بات نہیں بلکہ یہ عدم انفاع اور عدم انتفاع کی نفی ہے کہ نہ سنانے والے کے سنانے سے ان کفار کو فائدہ ہے اور نہ سننے سے اب ان کو فائدہ ہوسکتا ہے کیونکہ وہ دار العمل سے جاچکے ہیں اسی لئے عام علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ ان آیات میں اسماع کی جو نفی ہے یہ تشبیہ ہے کہ عدم انتفاع میں یہ کفار مردوں کی طرح ہیں کہ یہ کافر سنتے تو ہیں مگر فائدہ نہیں اٹھاتے تو مردے بھی سنتے ہیں مگر فائدہ نہیں اٹھاسکتے

---

[1] فاطر الآیہ ۲۲

ہیں باقی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں "یعلمون" بھی آیا ہے جس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ان مردوں کو اس سنانے کا علم ہوجاتا ہے تو **یسمعون** اور **یعلمون** میں تعارض آ گیا لہٰذا استدلال تام نہیں رہا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں "**ان تسمع الا من یؤمن**" بھی آیت کا حصہ ہے تو جو لوگ عام سماع کی نفی ان آیات سے نکالتے ہیں وہ اس آیت کے ساتھ کیا کریں گے کیا وہ یہ کہیں گے کہ کفار نہیں سنتے ہیں اور مؤمنین قبروں میں سنتے ہیں؟ یہ تو عجیب بات ہوگی۔

غلط نتیجہ:

مثبتین سماع موتی کے مندرجہ بالا دلائل کو دیکھ کر کمزور عقائد کے ایک طبقہ نے مردوں سے خطابات شروع کر دیئے اور ان سے طرح طرح کی حاجتیں مانگنی شروع کیں اور مردوں کو مرجع حوائج بنا دیا حالانکہ یہ ایک علمی بحث ہے جو اپنی جگہ پر ہے غیر اللہ سے استمداد اور غائبانہ حاجات میں ان کو پکارنا قرآن وحدیث کی رو سے ویسے بھی حرام ہے نیز یہ کیا ضروری ہے کہ جو سنے وہ حاجت پوری کرنے والا بھی ہو۔ زندہ لوگوں میں کتنے ہیں جو سنتے ہیں مگر بے بس ہیں۔ ادھر اس جانب سماع موتی کے منکرین نے جب قرآن کی آیتوں کو دیکھا کہ اس میں ظاہری طور پر عدم سماع ہے نیز امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف عدم سماع کی نسبت کو دیکھا اور مسئلہ ایمان کو دیکھا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے واضح انکار کو دیکھا تو انہوں نے مطلقاً سماع موتی کا انکار کیا ان حضرات نے قرآن کی آیتوں کے مقابلے میں احادیث کو پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا اس لئے احادیث ثبوت سماع میں انہوں نے تاویل کی اور کہا کہ قلیب بدر والی روایت یا تو نبی اکرم ﷺ کا معجزہ تھا تو یہ خصوصیت پیغمبری تھی اور یا تبکیت و تذلیل کے لئے ان کو زندہ کیا گیا یہ خصوصی جزئی واقعہ ہے جس پر دوسرے مواقع کو قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے۔ **قرع نعال** والی روایت کے بارے میں انہوں نے ابن منیر کے قول کے مطابق کہا کہ اس میں ذاذان راوی ضعیف ہے یا **قرع نعال** والی روایت سرعت اتیان ملائکہ سے کنایہ ہے اور یہ ایک تشبیہی کلام ہے جو وقت دفن کے ساتھ خاص ہے اسی طرح دیگر روایات سماع موتی میں یا تاویل کی یا ان کی تضعیف کی اور معاملہ یہ کہہ کر صاف کرنے کی کوشش کی کہ سماع موتی کی نفی سے شرک کا راستہ بند ہوجائے گا اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ جہاں شرک کا خطرہ ہو وہاں نفی سماع موتی ضروری ہے ان حضرات نے یہ بھی کہا کہ اصل عدم سماع ہے جہاں سماع موتی ثابت ہے وہ عارضی ہے اصل اپنی جگہ پر برقرار رہے گی۔

دوسرا غلط نتیجہ:

عدم سماع موتی کے دلائل کو دیکھ کر ایک طبقہ نے مردوں کو جمادات کے قبیلہ سے قرار دے کر عذاب قبر کا انکار کیا کہ جب حیات نہیں سنتے نہیں تو پھر عذاب کیسے ہوگا اسی نظریہ پر معتزلہ اور دیگر کٹر قسم کے لوگ ڈٹ گئے اور انہوں نے عذاب قبر کا انکار کیا حالانکہ عذاب قبر قرآن وحدیث سے قطعی طور پر ثابت ہے اس کا انکار کرنا گمراہی ہے۔

بحث سماع موتی کا خلاصہ

خلاصۂ کلام یہ کہ جہاں جہاں احادیث صحیحہ میں سماع موتی کا ثبوت ہے اس کو ماننا چاہیئے جیسے **سلام عند القبور** ہے اور مدفون کے دفن کا وقت ہے ان میں سماع کا ثبوت ملتا ہے تو ماننا چاہیئے اسی طرح قلیب بدر میں سماع ثابت ہوا تو ماننا چاہیئے لیکن جہاں سماع کا ثبوت نہیں وہاں نہیں ماننا چاہیئے جیسے کوئی سلام کرتا ہے تو ہم کہیں گے سن لیا اور جب کلام و درخواست شروع کی تو ہم کہیں گے نہیں سنتے ہیں کیونکہ سماع اموات کی نص غیر **معقول المعنی** اور خلاف القیاس ہے تو یہ اپنے مورد میں بندر ہنا چاہیئے جیسا کہ اصول کا قاعدہ ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ لطائف رشیدیہ میں اس پر طویل کلام فرمایا ہے یہ رسالہ تالیفات رشیدیہ میں شامل ہے اور تالیفات رشیدیہ ص ۲۷۶ پر یہ مسئلہ مذکور ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، مسئلہ سماع موتی قرن اول میں مختلف ہوا ہے اب اس کا فیصلہ تو ممکن ہی نہیں مگر بتقلید اپنے مجتہد مقلد کوئی ترجیح کی جانب اگر میلان کرے تو مضائقہ نہیں " **الی ان قال** " الحاصل ارجح مذہب عدم سماع کا ہے حسب قواعد پس احادیث سماع میں تاویل مناسب ہے ورنہ دوسری جانب بھی مذہب قوی ہے۔ (تالیفات رشیدیہ ص ۲۷۶)

اگر سماع موتی میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ فی الجملہ سماع موتی ثابت ہے اور فی الجملہ نہیں ہے تو اس سے تمام نصوص میں تطبیق ہو جائے گی اور اختلاف میں نرمی آجائے گی ورنہ ایک طرف پر جم کر دوسری طرف کی تذلیل و تضلیل اگر شروع ہو جائے تو علماء حق کے ہاں اور سلف صالحین کے ہاں شاید یہ طریقہ مناسب نہیں ہوگا آج کل اسلام کو کتنے بڑے خطرات کا سامنا ہے مگر اہل حق آپس میں سماع موتی میں ایسے الجھے ہوئے نظر آرہے ہیں گویا اسلام میں کوئی اختلافی مسئلہ اگر ہے تو وہ صرف یہی ہے اور اسی پر جھگڑنا فرض ہے حالانکہ ایک طرف پر جم جانا دوسری جانب کے بزرگوں کی بے ادبی کا قوی خطرہ ہے۔

اس مسئلہ میں شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کس طرح اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے جواہر القرآن میں فرماتے ہیں۔

سماع موتی کا مسئلہ زمانہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مختلف فیہ چلا آرہا ہے یہ مسئلہ اعتقادات ضروریہ میں سے نہیں جن کی نفی یا اثبات پر کفر و اسلام کا مدار ہے بلکہ یہ ایک علمی اور تحقیقی بحث ہے جس میں بحث و تمحیص اور نظر و تحقیق کی گنجائش ہے امت محمد یہ **علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام** کے علماء کے درمیان اس مسئلہ میں ہمیشہ دو رائے رہی ہیں کچھ علمائے کرام کی یہ رائے رہی ہے کہ مردے سنتے ہیں جبکہ دوسرے علماء نے اپنی تحقیق کی بنیاد پر سماع موتی کی نفی کی ہے۔

علمائے کرام کی ان دونوں جماعتوں کے پاس دلائل ہیں جن پر انہوں نے اپنی اپنی رائے اور تحقیق کی بنیادیں استوار کی ہیں۔ جو علماء سماع موتی کی نفی کرتے ہیں ان کا استدلال ظواہر قرآن سے اور احادیث صحیحہ سے ہے جب کہ قائلین سماع بھی صحیح حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ (جواہر القرآن ج ۲ ص ۹۰۲)

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سورۂ روم کی آیت ۵۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

اب نصوص سے جن باتوں کا اس غیر معمولی طریقہ سے سننا ثابت ہو جائے گا اسی حد تک ہم کو سماع موتی کا قائل ہونا چاہئے۔ محض قیاس کر کے دوسری باتوں کو سماع کے تحت نہیں لاسکتے۔ بہر حال آیت میں اسماع کی نفی سے مطلقاً سماع کی نفی نہیں ہوتی واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی ص ۵۴۵)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق اور فیصلہ بھی یہی ہے کہ فی الجملہ اثبات سماع کو مانا جائے اور فی الجملہ عدم سماع کو مانا جائے۔ اس سے تمام نصوص میں تطبیق آ جائے گی۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ نے احکام القرآن کے نام سے قرآن عظیم کی عربی زبان میں ایک تفسیر لکھی ہے جو حکیم الامۃ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فوائد ہیں اور آپ کے حکم سے لکھی گئی ہے۔

اس میں حضرت مفتی صاحب نے بہت ہی تفصیل سے سماع موتی کا مسئلہ بیان فرمایا ہے اور اثبات سماع موتی کو راجح قرار دیا ہے لیکن ایک جگہ لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں نے جب طرفین کے دلائل کو دیکھا تو پریشان ہو گیا اسی پریشانی میں رات کو خواب میں ایک اللہ والے نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کیوں اس مسئلہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں عالم برزخ ایک مستقل عالم ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو زندوں کا کلام مردوں تک پہنچا دیتا ہے اور جب نہیں چاہتا تو نہیں پہنچاتا۔

حضرت مفتی صاحب نے اس خواب کے بعد لکھا ہے کہ "**فاصبحت منشرحا صدری**" یعنی میں شرح صدر کی حالت میں صبح کو اٹھا کہ واقعی عالم برزخ کا فیصلہ یہاں عالم دنیا سے نہیں ہو سکتا ہے۔

اس کلام سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فی الجملہ سماع ہے اور فی الجملہ عدم سماع ہے لہٰذا ایک جانب پر ڈٹ کر دوسری جانب کی **تضلیل و تجھیل** مناسب نہیں ہے اگر چہ مسئلہ میں اختلاف ہے اختلاف تو موت میں بھی ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے ؂

تخالف الناس حتی لا اتفاق لهم — الاعلی شجب والخلف فی الشجب

فقیل تخلص نفس المرأ سالمة — وقیل تشرك نفس المرأ فی العطب

یعنی انسانوں کا موت کے سوا ہر چیز میں اختلاف ہے لیکن موت میں بھی اختلاف ہے کیونکہ بعض کہتے ہیں کہ روح نہیں مرتی ہے مگر بعض کہتے ہیں کہ جسم کے ساتھ روح بھی مر جاتی ہے۔

۷ محرم ۱۴۱۰ھ

باب الاعتصام بالکتاب والسنة

کتاب وسنت کا بیان

اعتصام باب افتعال سے چنگ زدن اور چنگل مار کر مضبوطی سے کسی چیز کو پکڑنے کے معنی میں آتا ہے۔[۱]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "**واعتصموا بحبل الله جميعا**" **ای تمسکوا بالقرآن والسنة**۔[۲]

یعنی قرآن کریم اور سنت نبویہ کے اوامر اور نواہی اور اس کے سارے احکام کو دل وجان سے مان کر اس پر عمل کرنا اعتصام بالکتاب والسنۃ ہے۔

"**الکتاب**" سے مراد وحی متلو اور وحی جلی ہے "**والسنة**" سنت سے مراد وحی غیر متلو اور وحی خفی ہے تو کتاب بمعنی قرآن مجید ہے اور سنت بمعنی سیرت ہے یہ نبی اکرم ﷺ کے اس مسلوکہ مسنونہ طریقہ کا نام ہے جس پر آنحضرت ﷺ نے مواظبت فرمائی ہے یا سنت سے مراد **اقوال النبی وافعاله واحواله المعبر عنها بالشريعة والطريقة والحقيقة، وما سلك عليها الصحابة والتابعون**۔[۳]

یہ بات جان لینی چاہیئے کہ شریعت کا مدار ذات رسول اللہ ﷺ پر ہے چنانچہ کبھی احکام بعد میں آئے ہیں اور عمل ذات رسول کی وجہ سے پہلے ہوتا رہا ہے جیسے وضو کا مسئلہ ہے کہ اس کا حکم کئی سال بعد میں آیا اور اس پر عمل ذات رسول کی وجہ سے پہلے سے ہوتا رہا کتاب وسنت کی مثال متن اور شرح کی ہے۔ کتاب مجمل متن ہے اور سنت اس کی تفصیل اور شرح ہے۔ اب اگر اس مجمل متن سے اس شرح کو الگ رکھا جائے تو کتاب مجمل بلکہ مہمل رہ جائے گی کیونکہ حج وزکوۃ، روزہ ونماز کا حکم تو کتاب اللہ میں ہے لیکن ہیئت وکیفیات کی تفصیلات وتشریحات تو سنت ہی سے ثابت ہوئی ہیں۔

پھر ان دونوں کے ظاہری احکام کے لئے دستور العمل چاہیئے وہ فقہ ہے جو الگ الگ عملی دفعات کا نام ہے اور اسی قرآن وسنت سے مستنبط ہے کوئی الگ چیز نہیں ہے اب اگر فقہ کو قرآن وحدیث سے الگ کیا جائے تو یہ دونوں ادلہ بغیر دستور کے رہ جائیں گے اور باطنی احکام کے لئے دستور العمل تصوف اور سلوک واحسان ہے تو یہی شریعت وحقیقت وطریقت ہے۔

اس باب کی روایات نہایت واضح اور مؤثر انداز سے "**ترغیب الی السنة**" اور "**تحذیر عن البدعة**" کی تعلیم پر مشتمل ہیں دین میں نو ایجاد بدعات کی قلع قمع کے لئے اس سے بہتر کوئی نسخہ ممکن نہیں۔

---

[۱] المرقات ۱/۳۶۵ [۲] المرقات ۱/۳۶۵ [۳] المرقات ۱/۳۶۵

الفصل الاوّل

دین میں نئی بات نکالنا بدعت ہے

﴿۱﴾ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۱]

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں تو وہ مردود ہے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: من احدث۔ "ای اوجد وابتدع وزعم کو نہ دینا"۔[۲]

فی امرنا: اس سے دین اسلام اور شریعت مطہرہ مراد ہے۔ **ھذا۔** یہاں اشارہ قریب کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اگرچہ دین محسوس و مبصر نہیں ہے۔ اس سے دین اسلام کے نہایت واضح اور روشن ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ کہ دلائل اور یقینیات کے اعتبار سے یہ دین ایسا روشن ہے جس طرح کوئی محسوس اور مبصر چیز ہوتی ہے۔[۳]

بدعت کی تعریف اور اس کی شناخت:

احدث: اور احداث فی الدین بدعت کے معنی میں ہے۔ لغوی طور پر بدعت نئی چیز اور نئے کام کے کرنے کو کہتے ہیں۔ اور اصطلاح شرع میں بدعت وہ نیا کام ہے جو خیر القرون میں نہ ہو اور سلف خلف اس کی طرف محتاج ہوں۔ اور کوئی شخص حصول ثواب کی نیت سے اسے کرے۔

بدعت کی اس تعریف شرعی کے پیش نظر اس کا کوئی فرد حسنہ نہیں بلکہ اس کا ہر فرد قبیح اور سیئہ ہی ہے۔ ہاں بدعت کے لغوی مفہوم میں ہر نو ایجاد شے داخل ہو جاتی ہے جس سے بدعت لغوی کی بہت ساری قسمیں بن جاتی ہیں۔ لیکن وہ ایجادات کے قبیلے سے ہیں بدعت اصطلاحی و شرعی نہیں۔

اس تعریف سے عادات نکل گئیں جیسے نئے طرز کے کپڑے، رہن سہن اور کھانے پینے اور فیشن کے نئے نئے طریقے وغیرہ وغیرہ۔ نیز وسائل و ذرائع میں بدعات نہیں آتیں بلکہ مقاصد میں آتی ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص مثلاً نماز وغیرہ کے لئے سوار ہو کر جاتا ہے۔ یا پیدل جاتا ہے یا اڑ کر جاتا ہے جس وسیلے اور ذریعہ کو استعمال کرنا چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ سلف یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم بعد میں آنے والوں کی طرح اس کام کی طرف محتاج ہوں اور پھر بھی نہ کیا ہو۔

اور اگر صحابہ کسی خاص طرز اپنانے کی طرف محتاج نہ ہوں اور بعد میں آنے والے لوگ اس کی طرف محتاج ہوں مثلاً خاص طرز پر مدارس کا قیام، مساجد کے انداز اور صرف و نحو وغیرہ فنون کی تعلیم۔ یہ ایجاد بھی بدعت نہیں کیونکہ سلف کے ہاں اس کا

---

[۱] اخرجه البخاری ۳/۲۴۱ ومسلم ۵/۱۳۲ [۲] المرقات ۱/۳۶۵ [۳] المرقات ۱/۳۶۵

وجود اس لئے نہیں تھا کہ وہ اس کی طرف محتاج نہ تھے، اگر اس خاص انداز اور خاص طریقۂ کار ہی میں ثواب ہوتا تو وہ اس کو اپناتے کیونکہ ثواب کی طرف تو وہ بھی محتاج تھے۔ ''ثواب کی نیت'' شرط ہے کیونکہ بدعت اسی ثواب کی نیت سے بنتی ہے۔ اور شرک اور بدعت ہمیشہ محبت اور ثواب کے راستے سے آتے ہیں۔ شرک اور کفر کے بعد بدعت کا نمبر ہے۔

اس لئے اب کہا گیا ہے "البدعة شرك الشرك"۔ یعنی بدعت شرک کا ایک تسمہ اور شاخ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام مکمل ہو چکا ہے اور "الیوم اکملت لکم دینکم" قرآنی آفاقی اعلان ہو چکا ہے۔ اب جو شخص دین میں کوئی نیا جز سیہ لاتا ہے تو ہم ان سے پوچھیں گے۔ کہ یہ نو ایجاد ثواب کا کام حضور ﷺ کو معلوم تھا یا نہیں؟ اگر وہ کہے کہ معلوم نہ تھا تو علم میں افضلیت کا دعویٰ کر کے یہ شخص کافر ہو گیا۔ اور اگر کہے کہ حضور ﷺ کو معلوم تھا تو ہم پوچھیں گے کہ امت کو اس کی تبلیغ کی یا نہیں؟ اگر وہ کہے کہ تبلیغ نہیں کی تو پھر بھی کافر ہو گیا۔ کیونکہ فریضۂ رسالت پر اعتراض کیا اور اگر کہے کہ تبلیغ کی ہے تو بتاؤ کہاں ہے؟ کہ حضور ﷺ نے میلاد کا حکم دیا ہو یا جلوس کا حکم دیا ہو یا اذان سے پہلے خاص نمائشی درود کا حکم دیا ہو۔ یا عرسوں یا میلوں کا حکم دیا ہو۔ یا جمعہ کے بعد حلقہ باندھ کر کھڑے کھڑے خود ساختہ سلام پڑھنے کا حکم دیا ہو وغیرہ وغیرہ۔

اگر وہ کہے کہ ہم عمومات سے استدلال کرتے ہیں کہ درود پڑھنے کا عام حکم ہے تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ "الاستدلال بالعمومات عند وجود سنة مخصوصة باطل"۔ ''یعنی مخصوص سنت کی موجودگی میں عمومات اور عام نصوص سے استدلال کرنا باطل ہے''۔

اچھا ہم کو یہ بتلا دو کہ آپ نے جن عمومات سے استدلال کیا ہے کیا آنحضرت کو ان عمومات کا علم تھا یا نہیں؟ اور اس کو آپ سمجھتے تھے یا نہیں؟ اگر سمجھتے تھے تو بتاؤ کہ عمل ان عمومات پر کہاں کیا ہے؟ تو جن عمومات سے آنحضرت ﷺ نے استدلال نہیں کیا بلکہ عمومات کے برعکس آپ کی خاص سنت موجود ہے۔ تو تم کو کس نے عمومات کی پٹی پڑھا کر بدعت میں لگا دیا؟ یہاں یہ بات سمجھنا بھی ضروری ہے کہ بدعت اور رسم میں فرق یہ ہے کہ بدعت کو ثواب کی نیت سے کیا جاتا ہے اور رسم ادا کرنے میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ بدعت میں عقیدہ اور عمل دونوں کی خرابی ہوتی ہے اور رسم میں صرف عمل کی خرابی ہوتی ہے۔ بدعت کی مندرجہ بالا تشریحات کے لئے علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تفسیری عبارت بطور تائید بہت مناسب ہوگی۔ فرماتے ہیں۔

واما اهل السنة والجماعة فيقولون فى كل قول وفعل لم يثبت عن الصحابة رضى الله عنهم، هو بدعة لانه لو كان خيرا لسبقونا اليه لانهم لم يتركوا خصلة من خصال الخير الا وقد بادروا اليها۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۱۵۶)

علامہ جرجانی رحمۃ اللہ علیہ میر سید سند شریف نے اپنی کتاب "التعریفات: ص۴۷" میں بدعت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"البدعة هی الامر المحدث الذی لم یکن علیه الصحابة والتابعون ولم یکن مما اقتضاه الدلیل الشرعی۔ (التعریفات ص۴۷)

یعنی بدعت اس نو ایجاد کام کا نام ہے جس کو نہ صحابہ نے کیا ہو نہ تابعین نے کیا ہو اور نہ کسی شرعی دلیل نے اس کا تقاضہ کیا ہو۔

بدعت کی ان شرعی تعریفات کو دیکھ کر ہر شخص یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ بدعت ایک قبیح عمل ہے۔ اور اس کا کوئی فرد اچھا اور حسنہ نہیں ہے۔ ہاں لغوی مفہوم جو مطلق ایجاد کے معنی میں ہے۔ اس میں اقسام بن سکتی ہیں لیکن شرعی بدعت میں کوئی تقسیم نہیں ہے۔ جن حضرات نے تقسیم کی ہے وہ شرعی بدعت کی تقسیم نہیں بلکہ لغت کے حوالے سے ہے۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"اما این فقیر دریں مسئلہ بایشاں موافقت ندارد و ہیچ فرد بدعت را حسنہ نمی داند و جز ظلمت و کدورت در آں احساس نمی نماید"۔

قال علیه وعلی آله الصلوٰة والسلام کل بدعة ضلالة۔ (مکتوبات ج۲ ص۳۸)

ترجمہ: بہرحال یہ فقیر تقسیم بدعت کے مسئلے میں ان لوگوں کے ساتھ موافقت نہیں رکھتا اور بدعت کے کسی فرد اور قسم کو حسنہ نہیں سمجھتا، بلکہ بدعت میں تاریکی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہیں پاتا، آنحضور ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مبارک کلام کا مطلب یہ ہوا کہ اصطلاحی اور شرعی بدعت میں کوئی تقسیم نہیں کہ بدعت بھی ہو اور اچھی بھی ہو بلکہ بدعت شرعی ہر ہر فرد کے اعتبار سے قبیح اور گمراہی ہے۔

ہر بدعت گمراہی ہے

﴿۲﴾ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا "بعد ازاں جاننا چاہیئے کہ بے شک سب سے بہتر بات خدا کی کتاب ہے سب سے بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے اور سب سے بدترین چیز وہ ہے جس کو (دین میں) نیا نکالا گیا ہو اور ہر بدعت (اپنی طرف سے دین میں پیدا کی ہوئی نئی بات) گمراہی ہے۔

توضیح: اما بعد: آنحضرت ﷺ شاید خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اس لئے اما بعد کا کلمہ ادا فرمایا اس کلمے کے متعلق ابتدا میں پوری تفصیل گزر چکی ہے۔[2]

[1] اخرجه مسلم ۱/۳۹۲ [2] المرقات ۱/۳۶۷

وكل بدعة ضلالة: ایک روایت میں آیا ہے، "وکل ضلالة فی النار" یعنی گمراہی کے اہل لوگ سب دوزخ میں ہوں گے۔ دین اسلام میں بدعت ایک خطرناک چیز ہے جس سے دین کے مسخ ہونے کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے اور دین فاسد ہوکر رہ جاتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:[1]

وهل افسد الدين الا الملوك واحبار سوء ورهبانها

بے دین ملحد بادشاہ اور بدعت پسند علماء سوء اور جہالت سے لبریز باطل پرست درویش دین کے بگاڑنے کے ذمہ دار ہیں۔ بعض نے کہا:

وخير امور الدين ما كان سنة وشر الامور المحدثات البدائع

سب سے زیادہ مبغوض لوگ

﴿۲۳﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبْغَضُ النَّاسِ إِلَى اللهِ ثَلَاثَةٌ مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ وَمُبْتَغٍ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَمُطَّلِبُ دَمِ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِغَيْرِ حَقٍّ لِيُهْرِيقَ دَمَهُ. (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دوعالم حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض (جن سے اللہ سخت ناراض ہے) تین لوگ ہیں: ① حرم میں کجروی کرنے والا، ② حاسلام میں ایامِ جاہلیت کے طریقوں کو ڈھونڈنے والا، ③ کسی مسلمان کے خون ناحق کا طلبگار تاکہ اس کے خون کو بہائے"۔ (بخاری)

توضیح: ملحد فی الحرم: الحاد راہِ راست سے ہٹنے اور کجروی کو کہتے ہیں اور ملحد فی الحرم وہ شخص ہے جو حرم شریف میں احکام شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ خدا کے حرم کی بے حرمتی کرتا ہے۔ اور وہاں پر بدامنی پھیلاتا ہے، جھگڑا کرتا ہے اور وہاں شکار کرتا ہے۔ کہتے ہیں حرم شریف میں گناہ کا تصور کرنا بھی گناہ ہے۔ اور صغیرہ بھی کبیرہ شمار ہوتا ہے۔[3]

سنة الجاهلية: یعنی اسلام قبول کرنے کے بعد بدبختی سے جاہلیت کے رسم ورواج کو اسلام میں رائج کرتا ہے۔ مثلاً نوحہ کرنا، گریبان چاک کرنا، ماتم کرنا، بال نوچنا، قومی تعصب کو ہوا دینا اور جاہلیت کی بدعت کو اسلام میں داخل کرنا وغیرہ وغیرہ۔[4]

مطلب دم امرء: یعنی ایک مسلمان کے ناحق خون کی تلاش میں لگا رہنا بڑا گناہ ہے علماء نے لکھا ہے کہ اس جملہ اور اس سے ماقبل جملے کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص ان گناہوں کی تلاش کی وجہ سے گناہگار بن گیا تو جو لوگ یہ گناہ کرنے والے ہوں ان کا کیا ٹھکانہ ہوگا؟

[1] المرقات ۱/۳۶۷ [2] اخرجه البخاری ۹/۱۱۴ [3] المرقات ۱/۳۷۰ [4] المرقات ۱/۳۶۹

ان تینوں خصلتوں کو خاص کیا کیونکہ اول میں تخصیص مرکز اور اس کا احترام ہے۔ دوسرے میں حدود اسلام کی رعایت ہے اور تیسرے میں خصوصیت امن عامہ ہے۔ یا یوں کہہ دیں کہ اول میں قباحت اور شناعت بوجہ محل ہے۔ دوسرے میں شناعت بوجہ فاعل ہے اور تیسرے میں شناعت بوجہ فعل ہے۔ تو فعل و فاعل ومحل تینوں آ گئے۔ [1]

﴿۴﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى قِيْلَ وَمَنْ أَبَى قَالَ مَنْ اَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ) [2]

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی مگر وہ شخص جس نے انکار کیا اور سرکشی کی'' (جنت میں داخل نہ ہوگا) پوچھا گیا کہ وہ کون شخص ہے جس نے انکار کیا اور سرکشی کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری اطاعت اور فرمانبرداری کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا اور سرکشی کی۔ (بخاری)

توضیح: الا من ابی: یہاں امتی سے اگر امت دعوت یعنی کفار مراد لیا جائے تو "الا من ابی" سے مراد کافر ہوں گے۔ اس صورت میں استثنیٰ متصل ہو جائے گا یعنی جن کافروں نے ایمان سے انکار کیا وہ جنت میں نہیں جائیں گے۔

اور اگر امت سے مراد امت اجابت یعنی مسلمان ہیں تو پھر "الا من ابی" میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اعتقاداً انکار کیا تو وہ کافر ہو گیا اور استثنیٰ منقطع ہوگا۔ یعنی سب مسلمان امتی جنت میں جائیں گے۔ لیکن جنت کا عقیدہ نہ رکھنے والا نہیں جائے گا۔ اور اگر عصیاناً انکار ہے تو پھر استثنیٰ متصل ہے یعنی سب مسلمان امت جنت میں جائے گی۔ مگر انکار کرنے والا مسلمان نہیں جائے گا۔ یعنی دخول اولیٰ کے ساتھ نہیں جائے گا کیونکہ گناہ کا ارتکاب کیا ہے سزا بھگتنے کے بعد ہی جائے گا۔ [3]

فرشتوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو واضح کر دیا

﴿۵﴾ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَتْ مَلَائِكَةٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ نَائِمٌ فَقَالُوا إِنَّ لِصَاحِبِكُمْ هٰذَا مَثَلًا فَاضْرِبُوا لَهُ مَثَلًا قَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّهُ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوا مَثَلُهُ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى دَارًا وَجَعَلَ فِيهَا مَأْدُبَةً وَبَعَثَ دَاعِيًا فَمَنْ أَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَأَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ فَقَالُوا أَوِّلُوهَا لَهُ يَفْقَهُهَا قَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّهُ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوا الدَّارُ الْجَنَّةُ وَالدَّاعِي مُحَمَّدٌ فَمَنْ أَطَاعَ مُحَمَّدًا فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ وَمَنْ عَصَى مُحَمَّدًا فَقَدْ عَصَى اللهَ وَمُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَيْنَ النَّاسِ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ) [4]

---

[1] المرقات ۱/۳۶۹ [2] اخرجه البخاری ۹/۱۱۲ [3] المرقات ۱/۳۷۰ [4] اخرجه البخاری ۹/۱۱۲

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ (کچھ) فرشتے آنحضور ﷺ کے پاس اس وقت آئے جب آپ سور ہے تھے فرشتوں نے آپس میں کہا "تمہارے اس دوست (یعنی آنحضرت) کے متعلق ایک مثال ہے اس کو ان کے سامنے بیان کرو"۔ دوسرے فرشتوں نے کہا "وہ تو سوئے ہوئے ہیں"۔ (لہٰذا بیان کرنے سے کیا فائدہ؟) ان میں سے بعض نے کہا "بے شک آنکھیں سورہی ہیں لیکن دل تو جاگتا ہے" پھر اس نے کہا "ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے گھر بنایا اور لوگوں کو کھلانے کے لئے دستر خوان چنا اور پھر لوگوں کو بلانے کے لئے آدمی بھیجا لہٰذا جس نے بلانے والے کی بات کو مان لیا وہ گھر میں داخل ہوگا اور کھانا کھائے گا۔ اور جس نے بلانے والے کی بات کو قبول نہ کیا وہ نہ گھر میں داخل ہوگا اور نہ کھانا کھائے گا"۔ یہ سن کر فرشتوں نے آپس میں کہا "اس کو (وضاحت کے ساتھ) بیان کریں۔ تاکہ یہ سمجھ لیں"۔ بعض فرشتوں نے کہا (بیان کرنے سے کیا فائدہ کیونکہ) وہ تو سوئے ہوئے ہیں۔ دوسروں نے کہا بے شک آنکھیں سوئی ہوئی ہیں لیکن دل تو جاگتا ہے۔ اور پھر کہا "گھر سے مراد تو جنت ہے۔ اور بلانے والے سے مراد حضور اکرم ﷺ ہیں۔ جس نے محمد ﷺ کی فرمانبرداری کی اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی۔ اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور محمد ﷺ لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔ (بخاری)

توضیح: فاضربوا له مثلاً: یہ گفتگو فرشتوں کی آپس کی گفتگو ہے بطور مثال یہ حدیث بیان کی ہے تو یہ مرفوع حدیث ہے۔ [1]

والقلب یقظان: عام لوگوں کی نیند کا اثر ظاہری اور باطنی تمام اعضاء پر ہوتا ہے اور آنکھوں کے ساتھ دل بھی سو کر ادراک وشعور سے غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن نبی کی نیند سے صرف ظاہری اعضاء متاثر ہوتے ہیں دل کے ادراک وشعور پر نیند کا اثر نہیں ہوتا۔

متعدد احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے کرام کے دل نہیں سوتے۔ کیونکہ نبی کے دل پر ہر وقت عالم بالا سے وحی کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ تو نیند اور بیداری میں علوم وحی کے حصول کے لئے اس دل کا تیار رہنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کا خواب وحی کی ایک مستقل قسم ہے۔ جو قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب ہی کی وجہ سے اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کا فیصلہ کیا اگر خواب کی حیثیت یقینی اور قطعی نہ ہوتی تو قتلِ اولاد جیسے عمل کا ارتکاب کیسے ہو سکتا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ نبی کو خواب سے جگانا جائز نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وحی ہو رہی ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام کی نیند ناقض وضو نہیں ہے۔ [2]

سوال: یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آئندہ کتاب الصلوٰۃ میں **لیلة التعریس** کے نام سے ایک حدیث آرہی ہے۔ اس میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور سب لشکر والے سو گئے۔ آنحضرت ﷺ بھی سو گئے۔ اور طلوع آفتاب کے بعد آنکھ کھل گئی اور نمازِ فجر قضاء ہو گئی، اگر آنحضرت ﷺ کا دل جاگ رہا تھا تو نماز کیوں قضاء ہو گئی؟ اور وقت پر جاگ کیوں نہ آئی؟

---

[1] المرقات ۱/۳۷۱ [2] المرقات ۱/۳۷۱

جواب: اس سوال کا اکثر شارحین نے یہ جواب دیا ہے کہ انسانی جسم میں ہر عضو کا اپنا الگ کام اور ذمہ داری ہے۔ صبح کا ادراک کرنا اور اسے دیکھنا اور معلوم کرنا یہ دل کی ذمہ داری نہیں بلکہ آنکھوں کی ذمہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص آنکھیں بند کرے تو جاگنے کی حالت میں بھی وہ صبح صادق کا ادراک نہیں کرسکتا حالانکہ دل بیدار ہے۔ مگر آنکھیں بند ہیں۔ یہاں بھی اسی طرح کا معاملہ ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ کا دل جاگ رہا تھا لیکن صبح کا ادراک دل کا کام نہ تھا بلکہ آنکھوں کا تھا اور ظاہری طور پر آنکھیں نیند کی وجہ سے متاثر تھیں۔ تو صبح کا ادراک اس وقت ہوا جب سورج نے جسم کو احساس کے ساتھ متاثر کیا اور جسم کی قوتِ حاسہ نے محسوس کیا کہ صبح کا وقت نکل گیا بلکہ دھوپ نکل آئی ہے۔

اولوھا له: یعنی اس مثال کی تفسیر بیان کرو تا کہ نبی اکرم ﷺ بھی اس کو سمجھ لیں۔[1]

الداعی محمد: بعض دیگر روایات میں "داعی" سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ اور "مادبة" سے مراد جنت ہے۔ اور "دار" سے مراد اسلام لیا گیا ہے۔ جس سے بظاہر تعارض معلوم ہورہا ہے شارحین نے لکھا ہے کہ اس میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ اصل اور بلا واسطہ داعی اللہ تعالیٰ ہے۔ اور نبی کریم ﷺ بالواسطہ داعی ہیں۔ تو کبھی نسبت بلا واسطہ اور کبھی بالواسطہ کردی گئی ہے۔

اسی طرح اسلام چونکہ جنت کے لئے سبب ہے اور خود جنت مسبب ہے تو دار کی تفصیل کہیں پر اسلام سے کی گئی جو جنت کے لئے سبب ہے اور کہیں پر دار کی تفصیل جنت سے کی گئی جو مسبب ہے۔ اور سبب کا اطلاق مسبب پر اور مسبب کا سبب پر عام اور معروف ہے۔

محمد فرق بین الناس: یعنی آنحضرت ﷺ مومن اور کافر کے درمیان فارق ہیں کہ آپ ﷺ کو ماننے والا مومن اور نہ ماننے والا کافر ہے۔ جو محمدی ہے وہ مومن ہے اور جو محمدی نہیں وہ مسلمان نہیں۔ کیونکہ میدانِ حقانیت میں اب محمدیت کا دور دورہ ہے۔[2]

عمل میں اپنے نبی ﷺ سے آگے نہ بڑھو

﴿۶﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا أُخْبِرُوْا بِهَا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا أَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ فَقَالَ أَحَدُهُمْ أَمَّا أَنَا فَأُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَدًا وَقَالَ الْآخَرُ أَنَا أَصُوْمُ النَّهَارَ وَلَا أُفْطِرُ وَقَالَ الْآخَرُ أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا فَجَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ فَقَالَ أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا أَمَا وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ لَكِنِّي أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[3]

---

[1] المرقات ۱/۳۷۲　[2] المرقات ۱/۳۷۲　[3] اخرجه البخاری ۷/۲ ومسلم

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ تین شخص آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ آنحضرت ﷺ کی عبادت کا حال دریافت کریں اور جب ان لوگوں کو آپ ﷺ کی عبادت کا حال بتلایا گیا تو انہوں نے آپ ﷺ کی عبادت کو کم خیال کر کے آپس میں کہا ''آنحضرت ﷺ کے مقابلے میں ہم کیا چیز ہیں اللہ تعالیٰ نے تو ان کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیئے ہیں''۔ ان میں سے ایک نے کہا ''اب میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا''۔ دوسرے نے کہا ''میں دن کو ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا''۔ تیسرے نے کہا ''میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی بھی نکاح نہ کروں گا'' (ان میں آپس میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ (آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا ''تم لوگوں نے ایسا ویسا کہا ہے، خبردار! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ تقویٰ اختیار کرتا ہوں لیکن (اس کے باجود) میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں میں (رات میں) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (یہی میرا طریقہ ہے لہٰذا) جو شخص میرے طریقے سے انحراف کرے گا وہ مجھ سے نہیں (میری جماعت سے خارج ہے)''۔

(بخاری ومسلم)

توضیح: جاء ثلاثة رهط: ان تین آدمیوں کو جب آنحضرت ﷺ کی عبادت کا علم ہوا تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ نبی اکرم ﷺ تو معصوم ہیں اور ہم گنہگار ہیں۔ حضور ﷺ مامون العاقبۃ ہیں اور ہم اپنے انجام کے بارے میں مامون نہیں ہیں۔ لہٰذا ہمیں عبادت میں بہت زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔ چنانچہ اسی محنت کا ذکر آگے آتا ہے کہ ایک نے کہا میں رات بھر نماز پڑھتا رہوں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے رکھوں گا، **ولا افطر** یعنی ایام ممنوعہ منھیہ کے سوا روزہ رکھوں گا اور کبھی بھی افطار نہ کروں گا۔ تیسرے نے عدم نکاح کا عہد کیا۔[۱]

فلیس منی: ای لیس من اشیاعی ولا تعلق له منی بشیء۔

سوال: اس قسم کے جملوں سے متعلق ایک مشہور اشکال ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہ مجھ سے یا ہم میں سے نہیں ہے تو اس کا ظاہر مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ اس کام کے ارتکاب کے بعد وہ شخص مسلمان نہیں رہے گا بلکہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

جواب: اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ کلام اسلوب حکیم کے طریقہ پر ہے کہ اس طرح بیزاری کا اعلان جب ایک مسلمان سنے گا تو وہ چیخے گا چلائے گا اور روئے گا کہ میں تو اپنے نبی اور اپنے عقیدہ سے کٹ گیا لہٰذا توبہ کرے گا اور اس معصیت کے قریب بھی نہ جائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ **فلیس منی** کا جو جملہ ہے اس کا تعلق عام اسلام وایمان سے نہیں بلکہ یہ ہے کہ اسی جزئیہ اور اس عمل میں یہ شخص مجھ سے نہیں اور نہ مسلمانوں کے طریقہ پر ہے بلکہ اس جزئی میں یہ شخص کسی اور مذہب والوں کی طرح ہے مسلمانوں کی طرح نہیں ہے۔

---

[۱] المرقات ۱/۳۶۷

عصمتِ انبیائے کرام کا مسئلہ

وقد غفر الله له: اس جملہ سے عصمتِ انبیاء کا مطلب نکلتا ہے بطور اشارہ چند جملے عرض کرتا ہوں۔ عصمت اس حفاظت کا نام ہے کہ قدرت واختیار کے موجود ہوتے ہوئے کسی کو بالفعل گناہ سے محفوظ رکھنا، علماء کے ہاں اس پر اتفاق ہے کہ انبیائے کرام سے قبل النبوۃ اور بعد النبوۃ شرک وکفر کا صدور نہیں ہوتا اس سے وہ معصوم ہیں اور کبائر کے بارے میں بعد النبوۃ معصوم ہونے میں اہل السنۃ کا اجماع ہے۔ اور قبل النبوۃ بعض علماء کے نزدیک کبائر کا صدور ممکن ہے لیکن یہ مسلک مرجوح ہے ارجح نہیں ہے۔ اور صغائر کے بارے میں اشاعرہ کہتے ہیں کہ اس کا صدور قبل النبوۃ اور بعد النبوۃ جائز ہے۔ لیکن ماترید یہ مطلق نفی کرتے ہیں اور یہی عام علماء کے نزدیک راجح ہے۔ کیونکہ نبی عام انسانوں اور گناہگاروں کی ہدایت کے لئے آتا ہے جب خود وہ گناہوں سے محفوظ نہیں تو اوروں کی کیا رہنمائی کر سکے گا؟[1]

عالم کہ تن آسانی و تن پروری کند　　　　او خویشتن گم است کرا رہبری کند

''فرقہ حشویہ انبیائے کرام کو معصوم نہیں سمجھتا ہے''۔

حضرات انبیائے کرام کی طرف قرآن کریم میں ذنب ومعصیت کی جو نسبتیں ہوئی ہیں وہ **"حسنات الابرار سیئات المقربین"** کے طور پر ہیں۔ نیز ان کی شان عالی کے پیش نظر کبھی کبھی اللہ تعالیٰ نے الفاظ کی حد تک سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ یہ اپنوں کے ساتھ اپنوں کا اندازِ کلام ہوتا ہے۔ کسی اور کو اس کی اجازت نہیں ہے بلکہ قرآنِ عظیم کی تفسیر وتحقیق کے ضمن میں اگر ان زلّات اور لغزشوں کا ذکر آتا ہے تو ایک آدمی اس پر کلام کر سکتا ہے۔ ورنہ مستقلاً انبیائے کرام کی لغزشوں کے قصے بیان کرنا جائز نہیں ہے۔[2]

سورۃ طٰہٰ میں حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کے تذکرہ میں مفسرین لکھتے ہیں۔

قال ابو بكر بن العربي في احكام القرآن واضعًا اساسًا لادب الانبياء وقاعدة غريبة . يقول "لا يجوز لاحدنا اليوم ان يخبر بذلك عن آدم الا اذا ذكرناه في اثناء قوله تعالى عنه او قول نبيه. فاما ان يبتدأ ذلك من قبل نفسه فليس بجائز لنا في آبائنا الادنين الينا المماثلين لنا فكيف في ابينا الاقدم الاعظم الاكرم النبي الاقدم الذي عذره الله سبحانه وتاب عليه وغفر له. (قرطبی، بحر محیط، معارف القرآن)

ایک جواب یہ بھی ہے کہ ذنب کی نسبت کے مختلف درجات ہیں نبی کی طرف نسبت ہو تو خلافِ اولیٰ کا ارتکاب مراد ہوتا ہے، یا ذنوب امت مراد ہیں۔

---

[1] المرقات ۱/۳۷۳، ۳۷۴　　[2] المرقات ۱/۱۷۳

حضور اکرم ﷺ کی اطاعت میں کامیابی ہے

﴿۶﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ صَنَعَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَرَخَّصَ فِيهِ فَتَنَزَّهَ عَنْهُ قَوْمٌ فَبَلَغَ ذٰلِكَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَطَبَ فَحَمِدَ اللّٰهَ ثُمَّ قَالَ مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَتَنَزَّهُونَ عَنِ الشَّيْءِ أَصْنَعُهُ فَوَاللّٰهِ إِنِّي لَأَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ وَأَشَدُّهُمْ لَهُ خَشْيَةً۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک کام کیا اور اس کی اجازت دے دی لیکن کچھ لوگوں نے اس سے پرہیز کیا جب آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور خدا کی حمد وتعریف کے بعد فرمایا "لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ اس چیز سے پرہیز کرتے ہیں جسے میں کرتا ہوں خدا کی قسم! میں اللہ تعالیٰ کی مرضی ونامرضی کو ان سے زیادہ جانتا ہوں اور ان سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں"۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: **صنع:** یعنی آنحضرت ﷺ نے ایک کام کیا اور لوگوں کو بھی کام کرنے کی اجازت دی مگر کچھ لوگوں نے اس احتیاط کے پیش نظر پرہیز کیا جس پر نبی اکرم ﷺ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

ممکن ہے کہ اس کام سے مراد روزہ کی حالت میں بوس وکنار کی اجازت ہو آپ ﷺ نے خود عمل کیا لوگوں کو رخصت پر چھوڑا مگر کچھ لوگوں نے اس سے پرہیز کو احتیاط تصور کیا آپ ﷺ نے فرمایا۔[2]

انی لاعلمهم: یعنی میں ان سب سے زیادہ جاننے والا بھی ہو اور سب سے زیادہ متقی اور سب سے زیادہ خوف خدا رکھنے والا بھی ہو۔ اور حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی ادا کرتا ہو۔ اور یہ کام اور یہ چیزیں خوف خدا اور تقویٰ کے منافی نہیں ہیں۔ کچھ لوگ حضور اکرم ﷺ سے عمل میں آگے بڑھنا چاہتے تھے اور رخصت کو چھوڑ کر عزیمت پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تو معتوب ہوئے کیونکہ کثرت عبادت مطلوب ومقصود نہیں ہے بلکہ شدت اطاعت مقصود ومطلوب ہے۔[3]

مورخہ ۱۸ محرم ۱۴۱۰ھ

تابیر نخل میں آنحضرت ﷺ کا ایک حکم

﴿۸﴾ وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ قَدِمَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِينَةَ وَهُمْ يُؤَبِّرُونَ النَّخْلَ فَقَالَ مَا تَصْنَعُونَ قَالُوا كُنَّا نَصْنَعُهُ قَالَ لَعَلَّكُمْ لَوْ لَمْ تَفْعَلُوا كَانَ خَيْرًا فَتَرَكُوهُ فَنَقَصَتْ قَالَ فَذَكَرُوا ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ أَمْرِ دِينِكُمْ فَخُذُوا بِهِ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِي فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[4]

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ (جب) سرکار دو عالم ﷺ مدینہ تشریف لائے اس

[1] اخرجه البخاری ۱/۱۱ ومسلم [2] المرقات ۱/۳۷۶ [3] المرقات ۱/۳۷۶ [4] اخرجه مسلم ۲/۹۵

وقت مدینہ کے لوگ کھجور کے درختوں میں تابیر کیا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا ''یہ تم کیا کرتے ہو؟'' ۔ اہل مدینہ نے عرض کیا ''ہم ایسا ہی کرتے رہے ہیں'' ۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''اگر تم ایسا نہ کرو تو شاید بہتر ہو (چنانچہ لوگوں نے آپ کا یہ ارشاد سن کر) اسے چھوڑ دیا اور اس سال پھل کم آیا۔ روای کہتے ہیں کہ اس کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''میں بھی ایک آدمی ہوں لہٰذا میں جب بھی تمہیں ایسی بات کا حکم دوں جو تمہارے دین کی ہو تو اسے قبول کرلو اور جب کوئی بات اپنی عقل سے تمہیں بتاؤں تو سمجھ لو کہ میں بھی انسان ہوں'' ۔ (مسلم)

توضیح: یأبرون النخل: تأبیر باب تفعیل سے اصلاح کے معنی میں ہے۔ نیز یہ تلقیح اور پیوند کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس کے دو طریقے ہوتے ہیں ایک طریقہ یہ ہے کہ نر کھجور کے درخت کے گابھے کو مادہ درخت کے گابھے میں جوڑ دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نر کھجور کے درخت کے پھول مادہ کے پھول پر جھاڑ دیا جائے تاکہ پھل کثرت سے آجائے۔ مدینہ منورہ کے لوگ یہ عمل مدینہ کے باغات میں کیا کرتے تھے کیونکہ کھجور کا درخت حضرت آدم علیہ السلام کے مٹی کے ما بقیہ حصہ سے بنا ہے اس لئے اس میں وہی عادات ہیں جو انسان میں مذکر اور مؤنث میں ہیں جس باغ میں نر کھجور نہیں ہوتا وہاں پھل نہیں آتا پھر اس تابیر کے عمل سے فصل میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور پھل بھی عمدہ آتا ہے۔ [1]

لعلکم لو لم تفعلوا: آنحضرت ﷺ نے یہ خیال فرمایا کہ یہ بھی جاہلیت کا طریقہ ہے اللہ تعالیٰ نے جیسا لکھا ہے ویسا ہی ہوگا۔ تو اس طریقۂ کار کی کیا ضرورت ہے؟ نیز اس میں تکلف اور محنت بھی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے نہ نفی فرمائی نہ منع کیا بلکہ اس عمل کی ضرورت کو سلب کیا جواز تو پھر بھی باقی۔ ادھر اللہ تعالیٰ کے ہاں تکوینی طور پر عالم اسباب میں اس عمل اور اس محنت کی بھی ضرورت تھی اس لئے اس عمل کے چھوڑنے سے پھل بھی کم آگئے۔ [2]

انما انا بشر: یعنی میں ایک انسان ہوں اور جب میں کوئی حکم دین سے متعلق تمہیں دوں تو اس کو اختیار کرو کیونکہ وہ لامحالہ وحی سے ہوگا اور جب میں تمہیں کوئی حکم اپنی رائے اور اجتہاد سے دے دوں تو ہوسکتا ہے کہ اس میں خطا آجائے۔ کیونکہ میں بشر ہوں تو صحیح اور خطا دونوں کا احتمال بہر حال موجود ہے۔ [3]

امرتکم بشیء من رأیي: ایک سلسلہ تشریعات اور شرعی امور کا ہے اس میں آنحضرت ﷺ سے غلطی کا امکان نہیں کیونکہ ''**وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی**''۔ آیت موجود ہے دوسرا سلسلہ دنیوی معاملات اور سلسلۂ اسباب کا ہے تو اس میں خطا کا احتمال ہوسکتا ہے۔ کیونکہ جب تمام توجہات آخرت کی طرف ہوں تو دنیا کی پریشانیوں میں پڑنے کی کہاں فرصت تھی؟ ادھر دنیوی مشقتیں حصولِ دنیا کے ساتھ لگی ہوئی تھیں جس کو دنیا دار جانتے تھے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''**انتم اعلم بامور دنیاکم**: یعنی یہ سبب اور مسبب کا جوڑ اور محنت و مشقت کے ترک کرنے پر نقصان کا ظہور تم دنیا دار خوب جانتے ہو۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ حضور اکرم ﷺ اپنی امت کو اقتصادیات کے میدان میں اور معاملات میں شریعت کے قواعد سے آزاد کرنے کا اعلان فرمارہے ہیں جیسا کہ بعض ملحدین

---

[1] المرقات ۱/۳۷۷ [2] المرقات ۱/۳۷۷ [3] المرقات ۱/۳۷۷

نے اس سے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر حضور ﷺ کا مقصد یہ ہوتا تو آپ ﷺ نے معاملات اور خرید و فروخت کے ہزاروں مسائل کیوں بیان فرمائے ہیں؟

حضور اکرم ﷺ کی مثال

﴿۹﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَتَى قَوْماً فَقَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي رَأَيْتُ الْجَيْشَ بِعَيْنَيَّ وَإِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْعُرْيَانُ فَالنَّجَاءَ النَّجَاءَ فَأَطَاعَهُ طَائِفَةٌ مِنْ قَوْمِهِ فَأَدْلَجُوا فَانْطَلَقُوا عَلَى مَهَلِهِمْ فَنَجَوْا وَكَذَّبَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ فَأَصْبَحُوا مَكَانَهُمْ فَصَبَّحَهُمُ الْجَيْشُ فَأَهْلَكَهُمْ وَاجْتَاحَهُمْ فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ أَطَاعَنِي فَاتَّبَعَ مَا جِئْتُ بِهِ وَمَثَلُ مَنْ عَصَانِي وَكَذَّبَ مَا جِئْتُ بِهِ مِنَ الْحَقِّ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا میری اور اس چیز کی مثال جسے دے کر خدا نے مجھے بھیجا ہے (دین و شریعت) اس شخص کی سی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہا "اے قوم میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر کو دیکھا ہے اور میں ننگا (یعنی بے غرض) ڈرانے والا ہوں۔ لہٰذا تم اپنی نجات کو تلاش کرو چنانچہ اس قوم کی ایک جماعت نے اس کی فرمانبرداری کی اور راتوں رات آہستہ آہستہ نکل گئی اور نجات پالی ان میں سے ایک گروہ نے اس کو جھٹلایا اور صبح تک اپنے گھروں میں رہا صبح کو لشکر نے آکر ان کو پکڑ لیا اور ہلاک کر ڈالا۔ (یہاں تک کہ) ان کی جڑیں کھود ڈالیں (یعنی ان کی نسل تک کا خاتمہ کر دیا) چنانچہ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے میری فرمانبرداری کی اور جو (احکام) میں لایا ہوں ان کی پیروی کی اور اس شخص کی مثال بھی یہی ہے جس نے میری نافرمانی کی اور جو حق کی بات (یعنی دین اور شریعت) میں لے کر آیا ہوں اس کی تکذیب کی"۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: **وانی انا النذیر العریان:** یعنی میں ننگا ڈرانے والا ہوں۔ یہ ایک عام ضرب المثل ہے عرب کے لوگ اس کو شدت خوف اور قرب آفت ومصیبت کے وقت کہتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کوئی شخص اپنے کپڑے چیر پھاڑ کر اتار لیتا تھا اور سر پر یا لکڑی پر لٹکا کر بالکل ننگا ہو کر چیختا چلاتا رہتا تھا تاکہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی بات کو غور سے سنیں بعد میں یہ صرف ضرب المثل رہ گئی جس کو واضح اعلان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے فرمان کا یہ مقصد ہے کہ جس طرح وہ شخص خطرے سے اپنی قوم کو آگاہ کرتا ہے میں تم کو بھی اسی طرح سے آگاہ کرتا ہوں۔ سرزمین عرب اور خاص کر قریش میں "نذیر" کا لفظ رسول سے زیادہ مشہور تھا۔ کاہن لوگ اس کو زیادہ استعمال کرتے تھے۔ ایک کاہنہ عورت نے جب رسول اللہ ﷺ کی والدہ کو دیکھا تو کہنے لگی کہ یہ عورت یا تو خود نذیرہ ہے یا نذیر کو جننے والی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں لفظ نذیر کثرت سے حضور اکرم ﷺ کے لئے استعمال ہوا ہے۔[2]

---

[1] اخرجه البخاری ۸/۱۲۶ ومسلم ۷/۶۳ [2] المرقات ۱/۳۷۸

النجاء النجاء: منصوب علی الاغراء ہے ای اطلبو النجائ۔ یعنی نجات کو تلاش کرو بچنے کی کوشش کرو۔[1]

فادلجوا: رات کے پہلے حصے میں چپکے سے نکلنے کو کہتے ہیں شاعر ساحر کہتا ہے:[2]

فالحمد قبل له والحمد بعد لها وللقنا ولا دلاجی وتاویبی

اجتاح: بیخ کنی اور جڑیں اکھیڑنے کے معنی میں ہے۔[3] **مهلهم** بمعنی مہلت، اطمینان اور سکون۔[4]

فذلك مثل من: اس مثال میں تشبیہ ہیئت اور تمثیل کی صورت بن سکتی ہے۔ کہ ایک ہیئت کی تشبیہ دوسری ہیئت سے دی گئی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:[5]

کأن مثار النقع فوق رؤسنا واسیافنا لیل تهاوی کواکبه

ہدایت کے لئے حضور اکرم ﷺ کی مثال

﴿۱۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِي كَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهَا جَعَلَ الْفَرَاشُ وَهٰذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِي تَقَعُ فِي النَّارِ يَقَعْنَ فِيهَا وَجَعَلَ يَحْجُزُهُنَّ وَيَغْلِبْنَهُ فَيَتَقَحَّمْنَ فِيهَا فَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ وَأَنْتُمْ تَقَحَّمُونَ فِيهَا. هٰذِهِ رِوَايَةُ الْبُخَارِيِّ وَلِمُسْلِمٍ نَحْوُهَا وَقَالَ فِي آخِرِهَا قَالَ فَذٰلِكَ مَثَلِي وَمَثَلُكُمْ أَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ فَتَغْلِبُونِّي تَقَحَّمُونَ فِيهَا. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[6]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ "میری مثال اس شخص کی مانند ہے جس نے آگ روشن کی چنانچہ جب آگ نے چاروں طرف روشنی پھیلا دی تو پروانے اور دوسرے وہ جاندار جو آگ میں گرتے ہیں آ کر آگ میں گرنے لگے آگ روشن کرنے والے شخص نے ان کو روکنا شروع کر دیا، لیکن وہ (نہیں رکتے بلکہ اس کی کوششوں پر) غالب رہتے ہیں اور آگ میں گر پڑتے ہیں اسی طرح میں بھی تمہاری کمریں پکڑ کر تمہیں آگ میں گرنے سے روکتا ہوں اور تم آگ میں گرتے ہو۔ یہ روایت بخاری کی ہے اور مسلم میں بھی ایسی ہی روایت ہے البتہ مسلم کی روایت کے آخری الفاظ یہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بالکل ایسی ہی مثال میری اور تمہاری ہے میں تمہاری کمریں پکڑے ہوئے ہوں کہ تمہیں آگ سے بچاؤں اور یہ کہتا ہوں کہ دوزخ سے بچو میری طرف آؤ دوزخ سے بچو میری طرف آؤ لیکن مجھ پر تم غالب آتے ہو اور آگ میں گر پڑتے ہو"۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: کمثل رجل: کمثل کاف زائد ہے۔ یعنی مثلی مثل رجل۔

استوقد: آگ روشن کرنے کے معنی میں ہے۔ سین تا مبالغہ کے لئے ہے اصل میں "اوقد" تھا۔ استیقاد نار سے

[1] المرقات ۱/۳۷۹ [2] المرقات ۱/۳۷۹ [3] المرقات ۱/۳۷۹

[4] المرقات ۱/۳۷۹ [5] المرقات ۱/۳۸۰ [6] اخرجه البخاری ۱/۳۰۱ ومسلم ۶/۶۳

ہدایت اور اس کی تبلیغ کی روشنی مراد ہے۔ یعنی آگ روشنی کا سبب ہے اور اندھیرے میں نفع بخش چیز ہے۔ لیکن جب اس سے اعراض کیا جائے گا تو یہ سبب ہلاکت بنے گی۔ جس طرح چراغ پروانوں کے لئے روشنی اور رہنمائی کا سبب ہے مگر پھر یہی مفید چیز ان کی ہلاکت کا ذریعہ بنتی ہی ہے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے جس نورِ اسلام کو پیش کیا ہے اس نفع بخش اور خالص نافع چیز سے جو کوئی اعراض کرے گا تو یہی چیز اس کی ہلاکت کا باعث بھی بنے گی۔[1]

فانا اٰخذ بحجزکم: حجز حجزۃ کی جمع ہے۔ "**معقد الازار**" ازار بند کی جگہ یعنی پتلی کمر کو کہتے ہیں۔ **حجز یحجز نصر** سے روکنے اور منع کرنے کے معنی میں ہے۔ **الفراش:** پروانوں کو کہتے ہیں۔[2]

"**فیتقحمن: تقحم** کسی مشکل کام میں گھسنے کے معنی میں ہے، یہاں آگ میں گرجانا اور گھسنا مراد ہے، یہاں بھی تمثیل ہے۔ یعنی ایک ہیئت کی دوسری ہیئت سے تشبیہ دی گئی ہے کہ ایک شخص کا آگ روشن کرنا پھر لوگوں کا آنا اور اس میں گرجانا یہ ایک ہیئت ہے اور محمد ﷺ کا راستے میں کھڑا ہونا اور لوگوں کو کمر سے پکڑ پکڑ کر پیچھے دھکیل کر بچانا یہ دوسری ہیئت ہے۔[3]

ھلم عن النار ای ھلم الی وابعد عن النار: میری طرف آؤ اور آگ سے دور رہ کر خود کو بچانے کی کوشش کرو۔[4]

وحی کی مثال

﴿۱۱﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ أَصَابَ أَرْضًا فَكَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ فَأَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوا وَسَقَوْا وَزَرَعُوا وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً أُخْرَىٰ إِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِي دِينِ اللّٰهِ وَنَفَعَهُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[5]

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "اس چیز کی مثال جسے خدا نے مجھے دے کر بھیجا یعنی علم اور ہدایت کثیر بارش کی مانند ہے جو زمین پر ہوئی ہو چنانچہ زمین کے اچھے ٹکڑے نے اسے قبول کرلیا (اپنے اندر جذب کرلیا) اور اس سے بہت زیادہ خشک و ہری گھاس پیدا ہوئی۔ اور زمین کا ایک ٹکڑا ایسا سخت تھا کہ اس کے اوپر پانی جمع ہوگیا۔ اللہ نے اس سے بھی لوگوں کو نفع پہنچایا۔ لوگوں نے اسے پیا اور پلایا اور کھیتی کو سیراب کیا۔ اور یہ (بارش کا پانی) زمین کے ایسے ٹکڑے پر (بھی) پہنچا جو چٹیل میدان تھا نہ تو اس نے پانی کو روکا اور نہ گھاس کو اگایا لہٰذا یہ سب (مذکورہ مثالیں) اس شخص کی مثال ہے جس نے خدا کے دین کو سمجھا اور جو چیز خدا نے میری وساطت سے بھیجی تھی اس نے اس سے نفع اٹھایا پس اس نے خود سیکھا اور

[1] المرقات ۱/۳۸۰ [2] المرقات ۱/۳۸۱ [3] المرقات ۱/۳۸۱ [4] المرقات ۱/۳۸۱ [5] أخرجه البخاري ۱/۳۰۱ ومسلم ۶۳/۶

دوسروں کو سکھایا اور اس شخص کی مثال جس نے خدا تعالیٰ کے دین کو سمجھنے کے لئے (تکبر کی وجہ سے) سر نہیں اٹھایا اور خدا تعالیٰ کی ہدایت کو جو میرے ذریعہ بھیجی گئی قبول نہیں کیا"۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: الکلاء: **کلاء، عشب، حشیش** گھاس کی تین اقسام ہیں۔ کلاء، سبز اور خشک دونوں کے لئے بولا جاتا ہے اور عشب صرف سبز گھاس کو کہتے ہیں۔[1] اور حشیش صرف خشک گھاس کو کہا جاتا ہے۔ **الغیث:** اس بارش کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ خشک سالی اور قحط کے بعد آجائے۔[2] "**اجادب**" اس سخت زمین کو کہتے ہیں جہاں پانی تو جمع ہو سکے لیکن سبز گھاس نہ اگ سکے۔[3] "**طائفة**" زمین کا ایک حصہ اور ٹکڑا مراد ہے۔[4] "**قیعان**" یہ قاع کی جمع ہے اور قاع صاف میدان کو کہتے ہیں یہاں ایسا چٹیل میدان مراد ہے جہاں پانی نہ ٹھہر سکے اور نہ سبزہ اگ سکے۔ **لا تمسك ماء** اسی **قیعان** کی تفسیر ہے۔[5]

مطلب حدیث:

اس حدیث میں بلیغ تشبیہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل جب کفر و جہالت کی خشک سالی تھی تو لوگ رشد وہدایت کے پیاسے تھے۔ حضورِ اکرم ﷺ کے لائے ہوئے نظام اسلام نے ان کے لئے ایسی بارش کا کام کیا جو مردہ زمینوں کو حیاتِ نو عطا کرتی ہے اس لئے آپ ﷺ نے دین کو "غیث" سے تشبیہ دی ہے۔

مثال اور ممثل لہ کی وضاحت:

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے زمین کے تین حصوں کا ذکر فرمایا۔

1. اول قسم ممسک ماء کے ساتھ ساتھ **منبت کلاء** بھی ہے۔
2. دوسری قسم ''ممسک ماء'' ہے۔ لیکن "**منبت کلاء**" نہیں ہے۔
3. تیسری قسم نہ ''ممسک ماء'' ہے اور نہ ہی "**منبت کلاء**" ہے۔

ان تینوں قسموں کو یہاں مثال یا بالفاظ دیگر مشبہ بہ کی حیثیت سے سمجھنا چاہیئے۔ اس کے بعد ممثل لہ یا مشبہ کا ذکر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے جو دو قسم کے انسان ہیں۔

① اول جو فقیہ فی الدین ہو۔ ② دوسرا وہ جو سر اٹھا کر التفات نہ کرے۔ بلکہ متکبر ومغرور ہو۔[6]

سوال: اب یہاں یہ شبہ ہے کہ اس تشبیہ میں مشبہ بہ یعنی اقسام زمین تین ہیں اور مشبہ یعنی اقسام انسان دو ہیں۔ تو مشبہ اور مشبہ بہ میں مطابقت نہیں یا یہ کہو کہ ممثل لہ اور مثال میں توافق نہیں ہے۔

جواب: حافظ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مشبہ بہ میں بھی دو چیزیں ہیں۔

اول: ''ارض نافع'' ہے جس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک اعلیٰ درجے میں نافع ہے اور ایک ادنیٰ درجے میں نافع ہے۔ مگر نافع ہر صورت میں ہے۔

[1] المرقات ۱/۳۸۳ [2] المرقات ۱/۳۸۳ [3] المرقات ۱/۳۸۳ [4] المرقات ۱/۳۸۴ [5] المرقات ۱/۳۸۳ [6] المرقات ۱/۳۸۵، ۳۵۴

دوم: ''ارض غیر نافع'' ہے۔اب مشبہ میں بھی دو چیزیں ہیں ایک استفادہ کرنے والا انسان جو نافع ہے اور دوسرا استفادہ سے محروم انسان جو غیر نافع ہے۔اور مشبہ بہ میں بھی دو چیزیں ہیں تو کوئی اعتراض نہیں۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ مشبہ میں بھی تین اقسام کے انسان ہیں۔اول وہ انسان جو خود بھی **متعلم** اور **منتفع** ہے۔اور دوسروں کے لئے بھی معلم و نافع ہے۔یہ فقہائے کرام ہیں۔ان کی مثال میں زمین کی پہلی قسم کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا وہ انسان ہے جو اپنے لئے تو نافع ہے خوب ذخیرہ جمع کرنے والا ہے مگر دوسرے کے لئے نہیں یعنی متعلم تو ہے مگر معلم نہیں ہے۔یہ محدثین کرام کی جماعت ہے جنہوں نے احادیث کو جمع تو کر دیا مگر استدلال و استنباط نہیں کیا۔اسی کی طرف امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کر کے فرمایا: **"یا معشر الفقهاء انتم الاطباء ونحن الصيادلة"** ''اے فقہاء! تمہاری مثال طبیب وڈاکٹر کی ہے جو نسخہ تجویز کرتا ہے۔اور ہماری مثال دوائی رکھنے والوں کی ہے''۔[1]

تیسرے وہ لوگ ہیں جو نہ خود اس دولت سے منتفع ہوئے ہیں اور نہ دوسروں کے لئے نافع ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی شریعت کو دیکھنا گوارہ نہیں کیا۔

اب تشبیہات اس طرح ہو گئیں حضور اکرم ﷺ بمنزلہ سحاب و بادل ہیں۔وحی آسمانی بمنزلہ بارش ہے۔عام بارش جب کسی زمین پر ہوتی ہے تو زمین کی تین قسمیں بن جاتی ہیں۔یا تو بالکل بنجر اور بیکار زمین ہوتی ہے اس سے کچھ بھی نہیں بنتا۔کسی نے کہا:[2]

زمین شورہ سنبل بر نیارد — درو تخم عمل ضائع مگرداں

یا وہ زمین پتھریلی ہوتی ہے جو پانی کو تالابوں اور حوضوں کی صورت میں محفوظ کر لیتی ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تیسری قسم وہ زمین ہے جو پانی کو اندر جذب کر کے حاصلات اور ثمرات کی شکل میں رنگا رنگ سبزہ اگاتی ہے اور براہ راست دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتی ہے۔زمین کی اسی اختلافی تقسیم کے بارے میں شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے:

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روئید ودر شورہ بوم وخس

اب ان تشبیہات کو اس طرح سے سمجھ لیں کہ حضور اکرم ﷺ کی ذات بمنزلہ سحاب فیاض ہے۔اور وحی آسمانی بمنزلہ بارانِ رحمت ہے۔وحی کی تعلیمات کے آنے کے بعد لوگ تین قسموں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ایک قسم اعلیٰ اور نافع فقہاء کی ہے۔ دوسری قسم نافع محدثین کی ہے اور تیسری قسم محرومین کی ہے جو اس میدان رحمت سے باہر ہیں۔

فقہاء و محدثین اور کفار کے درمیان جو لوگ ہیں ان کا تذکرہ اس حدیث میں نہیں کیونکہ اگر وہ نیک ہوں گے تو قسم اول میں ہیں ورنہ پھر قسم ثانی میں عارضی طور پر شمار ہوں گے۔[3]

---

[1] المرقات ۱/۳۸۵ [2] المرقات ۱/۳۸۵ [3] المرقات ۱/۳۸۵، ۳۸۶

مورخہ ۱۹ محرم ۱۴۱۰ھ

محکمات ومتشابہات کی بحث

﴿۱۲﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ تَلاَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ وَقَرَأَ إِلَى وَمَا يَذَّكَّرُ إِلاَّ أُولُوا الْأَلْبَابِ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا رَأَيْتِ۔ وَعِنْدَ مُسْلِمٍ۔ رَأَيْتُمُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَأُولٰئِكَ الَّذِينَ سَمَّاهُمُ اللّٰهُ فَاحْذَرُوهُمْ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: **هو الذی انزل علیك الکتب منه آیت محکمات**۔ (ترجمہ) اللہ تعالیٰ وہ (خدا) ہے جس نے آپ ﷺ پر کتاب نازل کی۔ جس کی بعض آیات محکم ہیں اور آخر آیت **وما یذ کر الا اولو الالباب**۔ اور نہیں نصیحت پکڑتے مگر صاحب عقل، تک پڑھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ (یہ آیت پڑھ کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جس وقت تو دیکھے اور مسلم کی روایت میں ہے کہ جب تم دیکھو کہ لوگ ان آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں جو متشابہ ہیں (تو تم سمجھو کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کا نام اللہ تعالیٰ نے (کجرو یا گمراہ) رکھا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں سے بچتے رہو"۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: منه آیات محکمات: قرآن کریم میں دو طرح کی آیتیں ہیں اول محکمات ہیں یہ وہ آیتیں ہیں جن کے معنی ومطالب مضبوط، واضح، غیر منسوخ اور ظاہر ہوتے ہیں۔ جن میں کسی قسم کا ابہام یا اخفاء نہیں ہوتا ہے۔

دوسری آیات متشابہات ہیں۔ متشابہات پھر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک قسم کی وہ آیات ہیں جو معلوم المعنی ہیں مگر معلوم المراد نہیں۔ جیسے **ید الله، وجه الله استوی علی العرش، جاء ربك** وغیرہ۔

اس قسم متشابہات کے متعلق علماء سلف صالحین کا عقیدہ ہے کہ اس میں کوئی تاویل نہ کی جائے بلکہ جو الفاظ ہیں ان کو بغیر تاویل کے اسی طرح رکھا جائے ہاں "**مایلیق بشانه**" کے الفاظ کو ساتھ کر دیا جائے یعنی **ید الله ما یلیق بشانه، استوی ما یلیق بشانه** یعنی جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جب **استوی علی العرش** کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: "**الاستواء معلوم والکیفیة مجهولة والسوال عنها بدعة**"۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "**ید الله**" میں ید کا ترجمہ قدرت سے کرنا صفاتِ باری تعالیٰ میں تحریف ہے۔ لہٰذا جو الفاظ ہیں اسی طرح سے ترجمہ کر کے **ما یلیق بشانه** کہا جائے۔

دوسری قسم متشابہات کی وہ آیات ہیں جن کے نہ لفظی معنی معلوم ہیں اور نہ مرادی معنی معلوم ہیں جیسے حروف مقطعات ہیں۔

[1] اخرجه البخاری ۲/۴۲ ومسلم ۸/۵۶

جو سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں اس کے متعلق علماء فرماتے ہیں کہ "الله اعلم بمراده بذلك" سلف صالحین کا عقیدہ رکھا جائے اور کسی قسم کی تاویل نہ کی جائے۔

جو لوگ نیک اور صالح ہیں اور جن کے قلوب ایمان سے منور ہوتے ہیں وہ لوگ آیات محکمات پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ اور انہی کو مدارِ احکام بناتے ہیں اور متشابہات کو انہی محکمات کی روشنی میں دیکھ کر مانتے ہیں۔ مثلاً قرآن اعلان کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ بشر ہیں اور اس پر آیات محکمات موجود ہیں۔ مثلاً "قل انما انا بشر مثلکم" محکم آیت ہے اس کے مقابلے میں اگر کہیں لفظ "نور" آیا ہے تو وہ ذو معانی ہے جو متشابہ ہے۔ اس کو اس محکم کی روشنی میں دیکھنا پڑے گا۔ بہر حال صاف دل لوگ متشابہات کو مانتے ہیں مگر اسکے معنی اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔

اور جن لوگوں کے دلوں میں "زیغ" اور کجروی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اس میں بے جا تاویلیں کرتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو لوگ متشابہات میں عقلی گھوڑے دوڑاتے ہیں اور ان کے اصلی معانی پانے کی کوشش کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے کجرو اور گمراہ قرار دیا ہے۔

حروف مقطعات کے معنی اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو سمجھائے ہیں۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک راز ہے جس پر کسی اور کو مطلع نہیں کیا گیا۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لیں کہ اعجاز کے اعتبار سے سارا قرآن متشابہ یعنی "متشابه فی الفصاحة والبلاغة والحسن" ہے۔ اور تاویل وتفسیر کے اعتبار سے بعض محکم اور بعض متشابہ ہے۔ مگر مدار حکم محکم پر ہے۔[1]

﴿۱۳﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ هَجَّرْتُ إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا قَالَ فَسَمِعَ أَصْوَاتَ رَجُلَيْنِ اِخْتَلَفَا فِي آيَةٍ فَخَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْرَفُ فِي وَجْهِهِ الْغَضَبُ فَقَالَ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِاخْتِلَافِهِمْ فِي الْكِتَابِ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[2]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے دو آدمیوں کی آوازیں سنیں جو ایک (متشابہ) آیت میں اختلاف کر رہے تھے۔ (یعنی اس کے معنی میں جھگڑ رہے تھے) آنحضرت ﷺ ہمارے درمیان تشریف لائے (اس وقت) آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر غصہ کے آثار نمایاں تھے آپ ﷺ نے فرمایا "تم سے پہلے کے لوگ کتاب (الٰہی) میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں"۔ (مسلم)

توضیح: هجرت: ای ذهبت وقت الهجيرة: یعنی میں عین دوپہر کے وقت حاضر ہوا۔

فسمع اصوات رجلين: یعنی دو آدمی قرآن کریم کی ایک آیت میں اختلاف کر رہے تھے اس سے وہ اختلاف رائے مراد ہے جس میں ایک دوسرے پر اعتراض ہو۔ جس سے قرآن کریم میں تردد اور شک پیدا ہوتا ہو۔ اور قرآن پر اعتراض

---

[1] المرقات ۱/۳۸۷، ۳۸۸ [2] اخرجه مسلم ۸/۵۶

لازم آتا ہو۔ اور بدعت وکفر تک نوبت پہنچتی ہو۔ یہ اختلاف باعث ہلاکت ہے۔ جوممنوع ہے۔ اور اختلاف منشاء منع نہیں ہے۔ جومجتہدین آیات کے معانی کو دیکھ کر کیا کرتے تھے۔ وہ تو احسن ہے اور "اختلاف امتی رحمة" کے درجہ میں ہے۔[۱]

بلاضرورت مسائل میں نہیں الجھنا چاہیئے

﴿۱۴﴾ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِيْنَ فِي الْمُسْلِمِيْنَ جُرْمًا مَنْ سَأَلَ عَنْ شَيْءٍ لَمْ يُحَرَّمْ عَلَى النَّاسِ فَحُرِّمَ مِنْ أَجْلِ مَسْأَلَتِهِ.

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔[۲]

ترجمہ: اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "مسلمانوں میں سب سے بڑا گنہگار وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کا سوال کیا ہو جو حرام نہ تھی مگر اس کے سوال کرنے سے وہ حرام ہوگئی"۔

(بخاری ومسلم)

توضیح: ان اعظم المسلمین جرمًا: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بلاضرورت کسی شے کا سوال کرکے اس کی حرمت نازل کرانے والا شخص مسلمانوں کے لئے بدترین مجرم ہے۔ کیونکہ نزول وحی کے وقت ضروری احکام خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماتے تھے۔ سکوت اس بات پر ہوتا تھا جو معاف اور غیر ضروری ہوتی، تو اس طرح کی باتوں میں کھود کرید کر اور پوچھ پوچھ کر سوال کرنا منع کردیا گیا تاکہ عام مسلمانوں پر تنگی نہ آجائے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل نے گائے کے متعلق سوال کرتے کرتے تنگی پیدا کردی تو اس قسم کے تصنع اور سرکشی پر مبنی سوال منع کیا گیا ہے۔ ورنہ اچھے سوال کو تو قرآن نے "فاسئلو اھل الذکر" سے جائز قرار دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے سوال کو نصف علم فرمایا ہے۔ وہ منع نہیں ہے۔[۳]

دجالوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے

﴿۱۵﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَكُوْنُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ يَأْتُوْنَكُمْ مِّنَ الْأَحَادِيْثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوْا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ فَإِيَّاكُمْ وَإِيَّاهُمْ لَا يُضِلُّوْنَكُمْ وَلَا يَفْتِنُوْنَكُمْ.

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)۔[۴]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آخری زمانے میں ایسے فریب دینے والے اور جھوٹے لوگ ہوں گے جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں لائیں گے جنہیں نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے باپوں نے سنا ہوگا لہٰذا ان سے بچو اور ان کو اپنے آپ سے بچاؤ تاکہ وہ تمہیں نہ گمراہ کریں اور نہ فتنہ میں ڈالیں"۔ (مسلم)

توضیح: دجالون: دجال دجل سے مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت بڑا فراڈی اور فریب دینے والا۔ دجل اس

[۱] المرقات ۱/۳۸۸ [۲] اخرجہ البخاری ۹/۱۱۷، ومسلم ۷/۹۲ [۳] الکاشف ۱/۳۳۶ المرقات ۱/۳۸۹ [۴] اخرجہ مسلم ۱/۹

"تلبیس" کا نام ہے جس میں حق وباطل کے درمیان فرق کرنا دشوار ہو۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین اسلام میں منشاء صحیح کے بغیر محض اپنی رائے سے اختراع کرتے ہیں۔ آخر زمانہ میں ایسے لوگوں کی کثرت ہوگی کیونکہ یہ فتنوں کا دور ہوگا۔

ان دجالوں میں وہ نام نہاد علماء سوء اور مصنوعی مشائخ بھی داخل ہیں جو لوگوں سے کہیں گے کہ ہم علماء اور مشائخ ہیں تم کو دین کی طرف بلاتے ہیں مگر وہ لوگ حدیثیں گھڑتے رہیں گے۔ اور لوگوں کے سامنے بیان کریں گے غلط عقائد کی ترویج کریں گے اور عجیب عجیب نئی نئی باتیں کریں گے۔ جو غیر دین کی طرف لے جائیں گی۔ ایسے لوگوں سے بچو تاکہ وہ اپنے مکر وفریب سے تم کو گمراہ نہ کریں۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ دین کے معاملے میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے نیز بدعتی اور دین میں دھوکہ دینے والوں کی مجلس سے بھی دور رہنا چاہیے۔ (مظاہر حق تغیر کے ساتھ)

﴿۱۶﴾ وَعَنْهُ قَالَ كَانَ اَهْلُ الْكِتَابِ يَقْرَأُونَ التَّوْرَاةَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ وَيُفَسِّرُونَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لِأَهْلِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُصَدِّقُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَقُوْلُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا الْآيَةَ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھا کرتے تھے (جو یہودیوں کی زبان ہے) اور مسلمانوں کے لئے اس کی تفسیر عربی زبان میں کیا کرتے تھے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے (ان کا یہ عمل دیکھ کر) صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: "تم اہل کتاب کو نہ تو سچا جانو اور نہ ان کو جھٹلاؤ صرف یہ کہو کہ ہم اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم پر نازل کی گئی ہے ایمان لائے۔ (آخر آیت تک)"۔ (بخاری)

توضیح: لا تصدقوا: کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ جھوٹ ہو محرف ہو جیسا کہ تحریف ان کی عادت ہے۔[3]

ولا تکذبوھم: کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ سچ ہو **منزل من اللہ** ہو۔[4]

وقولوا امنا باللہ: یعنی سابقہ تمام ادیان جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ تھے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اب صرف دینِ اسلام عمل کے لئے باقی ہے۔ "**ان الدین عند اللہ الاسلام**"۔[5]

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سابقہ ادیان کی روایت اگر ہمارے دین کے موافق ہیں تو وہ درحقیقت ہمارے دین میں ہیں اس کی طرف محتاج نہیں اور اگر وہ مخالف ہیں تو ہم اپنے معصوم نبی کی اطاعت کریں گے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جن امور میں آدمی پر اشتباہ آجائے اور علمی مسئلے کا حل مشکل ہو جائے تو وہ توقف کرے۔[6]

---

[1] المرقات ۱/۳۹۰ [2] اخرجہ البخاری ۶/۲۵ [3] المرقات ۱/۳۹۱

[4] المرقات ۱/۳۹۱ [5] المرقات ۱/۳۹۲ [6] المرقات ۱/۳۹۲

ہر سنی سنائی بات کو نقل کرنا صحیح نہیں ہے

﴿۱۷﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ جس بات کو سنے (بغیر تحقیق کے) اسے نقل کر دے''۔ (مسلم)

توضیح: کفی بالمرأ: یعنی یہ شخص جب ہر سنی سنائی بات کو نقل کرے گا تو یقیناً اس میں بہت ساری غلط باتیں بھی آجائیں گی اور یہ ناقل خواہ کذب کا ارادہ نہ رکھتا ہو مگر پھر بھی بلا تصدیق بات نقل کرنے پر کاذب شمار ہوگا۔
اس حدیث میں مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ ہر سنی سنائی بات بلا تحقیق بیان نہ کریں اور اس حدیث میں شدید زجر اور وعید ہے اس شخص کے لئے جو ایسی بات نقل کرتا ہے جس کی اس کو تحقیق و تصدیق نہ ہو خصوصاً جب احادیث نبوی ﷺ نقل کر رہا ہو۔[2]

وقت گزرنے کے ساتھ دجال لوگ پیدا ہوں گے

﴿۱۸﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللهُ فِيْ أُمَّتِهٖ قَبْلِيْ إِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ أُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِأَمْرِهٖ ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[3]

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''مجھ سے پہلے کسی قوم میں خدا نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے مددگار اور دوست اس قوم سے نہ ہوں جو اس (نبی) کے طریقہ کو اختیار کرتے اور اس کے احکام کی پیروی کرتے، پھر ان (دوست و مددگار) کے بعد ایسے ناخلف (نالائق) لوگ پیدا ہوتے جو لوگوں سے ایسی بات کہتے جس کو خود نہ کرتے اور وہ کام کرتے جن کا انہیں حکم نہیں ملا تھا (جیسا کہ علماء سوء اور امراء و سرداروں کا طریقہ ہے) لہٰذا (تم میں سے) جو شخص ان لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو شخص ان لوگوں سے اپنی زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو شخص ان لوگوں سے اپنے دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور اس کے علاوہ (جو شخص ان کے خلاف اتنا بھی نہ کر سکے اس) میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہے''۔ (مسلم)

[1] اخرجه مسلم ۱/۸ [2] المرقات ۱/۳۹۲ [3] اخرجه مسلم ۱/۵۰

توضیح: حواریون: اس سے مراد خاص ساتھی اور مددگار و ناصرین ہیں اور ایسے مخلص دوست مراد ہیں جن کے دل عیب اور میل سے خالی ہوں بعض نے خاص رازدار لوگ مراد لیے ہے۔[1]

خلوف: جمع خلف کی ہے خا کا فتح ہے اور لام ساکن ہے۔ یہ برے جانشین کے معنی میں ہے۔ اگر لام مفتوح ہو جائے تو وہ اچھے جانشین پر بولا جاتا ہے۔[2]

فمن جاهدهم: جہاد بالید تو معروف ہے۔ اور جہاد باللسان یہ ہے کہ اس کو سمجھائے اس پر رد وقدح کرے اور زور دار انداز سے ان پر نکیر کرے اور دل سے جہاد یہ ہے کہ اس کو برا مانے اور یہ ارادہ رکھے کہ ہاتھ کا موقع آئے گا تو ہاتھ سے کام چلاؤں گا اس میں اول درجہ والا شخص ایمان میں کامل ہے۔ دوسرے کا ایمان متوسط درجے کا ہے اور تیسرے کا ایمان ناقص ہے اور اس کے بعد ایمان نہیں ہے۔[3]

ولیس وراء ذلك: یعنی رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے کیونکہ یہ شخص راضی بالمعاصی ہو گیا۔ اور معاصی کے ساتھ مباح کا معاملہ کرنے لگا جس سے آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے۔ یعنی اس وقت اس کا احساس اتنا مردہ ہو چکا ہے کہ غلط چیزوں کو دل سے بھی برا نہیں مانتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے ایمان کا پارہ بجھ چکا ہے لہٰذا اس کے دل میں ایمان کی روشنی باقی نہیں رہی۔[4]

ھدایت یا گمراہی کی طرف بلانے والے کا حکم

﴿۱۹﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ دَعَا إِلَى هُدًى كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلَ أُجُورِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا وَمَنْ دَعَا إِلَى ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلَ آثَامِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[5]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس شخص نے (کسی کو) ہدایت کی طرف بلایا تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس کو جو اس کی پیروی اختیار کرے۔ اور اس (پیروی کرنے والے) کے ثواب میں کچھ بھی کم نہ ہوگا۔ اور جو (کسی کو) گمراہی کی طرف بلائے تو اس کو اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا کہ اس کو جو اس کی اطاعت کرے اور ان کے گناہوں میں کچھ بھی کم نہ ہوگا"۔ (مسلم)

توضیح: مثل اجور من تبعه: یعنی ایک نے نیک کام پر خود بھی عمل کیا اور دوسروں کو بھی بلایا اب جس نے بھی اس نیک کام میں اس کی پیروی کی تو اس کے عمل کا ثواب بھی اس بلانے والے کو ملے گا اور اس پیروی کرنے والے کے عمل میں بھی کمی نہیں آئے گی۔ کیونکہ "الدال علی الخیر کفاعله" اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو امت کے اچھے اعمال سے وہ خزانے ملیں گے جن کا حساب نہیں لگایا جا سکتا۔ اسی طرح طبقہ

[1] المرقات ۱/۳۹۳، والکاشف ۱/۳۵۰ [2] المرقات ۱/۳۹۳ [3] المرقات ۱/۳۹۳، ۳۹۴ [4] المرقات ۱/۳۹۴ [5] اخرجه مسلم ۸/۶۲

صحابہ کو بعد والوں کے اعمال میں سے کتنا بڑا ثواب پہنچتا ہوگا۔ اسی طرح سلف کا حال خلف کے اعتبار سے کتنا بلند ہوگا اور اسی طرح ائمہ مجتہدین کے درجات بھی کتنے بلند ہوں گے۔ بلکہ ہر آنے والے کی نسبت جانے والے کے کتنے بلند درجات ہوں گے یہ اللہ ہی کے علم میں ہے۔[1]

اسلام کو گمنام لوگ اپناتے ہیں

﴿۲۰﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[2]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اسلام غربت میں شروع ہوا اور آخر میں بھی ایسا ہی ہوجائے گا لہذا غرباء کے لئے خوشخبری ہے"۔ (مسلم)

توضیح: بدأ الاسلام غریبًا: غریب عربی زبان میں نا آشنا اور غیر معروف اور پرے کو کہتے ہیں۔ تو ابتداء میں اسلام کے حاملین معاشرہ میں اوپرے تھے پورے معاشرے سے کٹے ہوئے سمجھے جاتے تھے کہ نہ غم میں اور نہ خوشی میں ان کو شریک کیا جاتا تھا اور نہ کسی قومی اور اجتماعی کام میں ان کو یاد کیا جاتا تھا۔ آئندہ بھی ایسا ہی ہوجائے گا چنانچہ اب بھی یہی حال ہے کہ محلہ میں ہر شخص کو خوشی اور غمی کے موقعوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن اہل دین کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔
اس حدیث کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ تھوڑے ہوں گے کمزور ہوں گے، گمنام ہوں گے ان کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ انہی لوگوں نے اسی طرح کمزور حالت میں ابتدا میں اسلام کو قبول کیا تھا اور آئندہ ایسے ہی لوگ اسلام پر ہوں گے۔
ان کو مبارکباد ہو البتہ بیچ کے ادوار میں الحمد للہ اسلام کو بہت ترقی ہوگئی تھی چنانچہ مشرق و مغرب میں اسلام کا جھنڈا خلفائے راشدین اور خلفائے بنو امیہ اور آخر میں خلفائے بنو عباس کے دور میں اکثر عالم پر بلند ہوگیا۔ الحمد للہ۔[3]

آخر وقت میں اسلام مدینہ میں پناہ لے گا

﴿۲۱﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الْإِيْمَانَ لَيَأْرِزُ إِلَى الْمَدِيْنَةِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ إِلٰى جُحْرِهَا. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ذَرُوْنِيْ مَا تَرَكْتُكُمْ فِيْ كِتَابِ الْمَنَاسِكِ وَحَدِيْثَيْ مُعَاوِيَةَ وَجَابِرٍ لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِيْ فِيْ بَابِ ثَوَابِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى.[4]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "ایمان مدینہ کی طرف اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف سمٹتا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

---

[1] المرقات ۱/۳۹۴، ۳۹۵ [2] اخرجہ مسلم ۱/۹۰ [3] المرقات ۱/۳۹۵، ۳۹۶ [4] اخرجہ البخاری ۳/۲۷، ومسلم ۱/۹۰

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: "ذرونی ما ترکتم" ہم کتاب مناسک (حج) میں ذکر کریں گے۔ نیز معاویہ رضی اللہ عنہ اور جابر رضی اللہ عنہ کی دونوں حدیثیں "لایزال من امتی الخ" اور "لا یزال طائفة من امتی" بھی اس امت کے ثواب کے باب میں ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ (یعنی یہ حدیثیں صاحب مصابیح نے اسی باب میں ذکر کی تھیں لیکن ہم نے ان کو ان بابوں میں ذکر کیا ہے)۔ (فللہ الحمد)

توضیح: لیأرز: اَرَزَ یَأْرِزُ ضرب یضرب سے ٹھکانہ پکڑنے اور سکڑ کر اپنے مقام پر جانے کو کہتے ہیں۔ زیادہ تر سانپ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ وہ اپنے بل اور سوراخ میں سکڑ کر جاتا ہے۔ سانپ تیز دوڑ کر اپنے بل میں داخل ہونے اور ٹھکانہ پکڑنے میں مشہور ہے اس لئے اس سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اسلام کی یہ حالت یا تو ابتداء ہجرت میں تھی کہ مکہ وغیرہ سے سارے مسلمان مدینہ منورہ میں جا کر اکٹھے ہو گئے تھے اور ایمان نے وہاں ٹھکانہ پکڑ لیا۔ یا اس سے مراد وہ آخری دور ہے جب مسلمان تھوڑے رہ جائیں گے اور سب سمٹ کر مدینہ منورہ چلے جائیں گے۔ اور پھر حضرت مہدی علیہ الرضوان کا ظہور بھی ہو جائے گا۔[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خروج دجال کے وقت ہوگا۔ بہر حال حدیث سے مدینہ منورہ کے لئے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مدینہ منورہ مشکل وقت میں بھی دین اسلام کے لئے مرکز بنا رہے گا۔[2]

صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ **باب ثواب هذه الامة** کے تحت میں دو حدیثیں لاؤں گا۔ ایک حدیث حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اور دوسری حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ہے لیکن وہاں پر صاحب مشکوٰۃ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ذکر نہیں فرمایا ہے، بلکہ بھول گئے کیونکہ وخلق الانسان ضعیفا۔ مشکوٰۃ ص ۵۸۳ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۰ محرم ۱۴۱۰ھ

الفصل الثانی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال

﴿۲۲﴾ عَنْ رَبِيْعَةَ الْجُرَشِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ أُتِيَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْلَ لَهُ لِتَنَمْ عَيْنُكَ وَلِتَسْمَعْ أُذُنُكَ وَلِيَعْقِلْ قَلْبُكَ قَالَ فَنَامَتْ عَيْنَايَ وَسَمِعَتْ أُذُنَايَ وَعَقَلَ قَلْبِي قَالَ فَقِيْلَ لِيْ سَيِّدٌ بَنٰى دَارًا فَصَنَعَ مَأْدُبَةً وَأَرْسَلَ دَاعِياً فَمَنْ أَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَأَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَرَضِيَ عَنْهُ السَّيِّدُ وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَسَخِطَ عَلَيْهِ السَّيِّدُ قَالَ فَاللّٰهُ السَّيِّدُ وَمُحَمَّدٌ الدَّاعِيْ وَالدَّارُ الْإِسْلَامُ وَالْمَأْدُبَةُ الْجَنَّةُ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[3]

---

[1] المرقات ۱/۳۹۶ [2] اشعة اللمعات ۱/۱۳۶ [3] اخرجه الدارمی: ۱۱

ترجمہ: حضرت ربیعہ الجرشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو خواب میں فرشتے دکھلائے گئے اور آپ ﷺ سے کہا گیا (یعنی فرشتوں نے کہا) چاہیئے کہ آپ کی آنکھیں سوئیں اور آپ کے کان سنیں اور آپ کا دل سمجھے آپ ﷺ نے فرمایا "میری آنکھیں سوئیں، میرے کانوں نے سنا اور میرے دل نے سمجھا"۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا (یعنی مثال کے طور پر فرشتوں نے میرے سامنے بیان کیا) کہ ایک سردار نے گھر بنایا اور کھانا تیار کیا، پھر ایک بلانے والے کو بھیجا (تاکہ وہ لوگوں کو بلائے) لہٰذا جس نے بلانے والے کی دعوت کو قبول کیا وہ گھر میں داخل ہوا اور کھانے میں سے کھایا اور سردار اس سے خوش ہوا۔ اور جس نے بلانے والے کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ نہ گھر میں داخل ہوا اور نہ کھانے میں سے کھایا اور نہ ہی سردار اس سے خوش ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس مثال میں سردار سے مراد خدا ہے، بلانے والے سے مراد محمد ہیں، گھر سے مراد اسلام ہے اور کھانے سے مراد جنت ہے"۔ (دارمی)

توضیح: لتنم عينك ولتسمع: یہ کلمات لفظوں میں انشاء ہیں اور معنی میں اخبار ہیں یعنی چاہیئے کہ آپ کی آنکھیں سوئی ہوئی ہوں، مطلب یہ ہے کہ اپنی آنکھوں سے اور کچھ نہ دیکھیں اور کانوں سے اور کچھ نہ سنیں یعنی غور وخوض سے یہ مثال سننا اور سمجھنا چاہئے، یہ خواب کا معاملہ تھا فرشتوں نے ایک مثال سے سمجھانے کے لئے پورا کلام سنا دیا۔ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کلام بطور الہام ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ فرشتوں نے حقیقتاً یہ کلام آپ ﷺ کو مخاطب بنا کر کیا ہو۔ بہر حال آپ ﷺ نے قال سے جواب دیا کہ میں سننے کے لئے ہمہ تن تیار ہوں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اس باب میں اس سے پہلے حدیث نمبر ۵ گزر چکی ہے۔ مذکورہ حدیث کا اس حدیث سے بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہاں پر "دار" جنت کو ٹھہرایا ہے اور یہاں دار اسلام کو کہا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام جنت کے لئے ایک سبب ہے اور جنت مسبب ہے۔ تو کہیں پر سبب کا ذکر ہے اور کہیں پر مسبب کا ذکر آیا ہے۔ یہ تعارض نہیں ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں "السيد" کا لفظ آیا ہے جس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور داعی کا لفظ نبی کریم ﷺ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور کہیں پر داعی سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ تو اس میں بھی تعارض نہیں کیونکہ اصلاً داعی تو اللہ تعالیٰ ہے جو بے نیاز ہے اور بالواسطہ داعی حضور اکرم ﷺ ہیں۔ [1]

منکرین حدیث کی تردید

﴿۲۳﴾ وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا أُلْفِيَنَّ أَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلَى أَرِيكَتِهِ يَأْتِيهِ الْأَمْرُ مِنْ أَمْرِي مِمَّا أَمَرْتُ بِهِ أَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُولُ لَا أَدْرِي. مَا وَجَدْنَا فِي كِتَابِ اللهِ اتَّبَعْنَاهُ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ) [2]

ترجمہ: اور حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تم میں سے کسی کو اس حال

---

[1] المرقات ۱/۳۹۷ [2] اخرجه احمد ۶/۸ وابو داؤد: ۴۶۰۵

میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے ہوئے ہو اور میرے ان احکام میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے کوئی حکم اس کے پاس پہنچے اور وہ (اسے سن کر) یہ کہہ دے کہ میں کچھ نہیں جانتا، جو کچھ ہمیں خدا کی کتاب میں ملا ہم نے اس کی تائید کی۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی)

توضیح: لا الفین احد کم: یعنی تم ایسی حالت میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ میں تم کو اس حالت میں پالوں۔

متکأ علی اریکته: تخت شاہی کو اریکۃ کہتے ہیں جس کی جمع ارائک ہے۔ اس کو چھپر کھٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اس شخص کی نہایت غرور و تکبر کی کیفیت کا بیان ہے نیز اس میں عیش و ترفہ اور ناز و نعم کی طرف بھی اشارہ ہے۔[1]

امر: یہاں مطلق دین اسلام مراد ہے امر ہو یا نہی ہو یا کوئی اور حکم ہو۔[2]

اس حدیث میں منکرین حدیث پر بلیغ رد و تردید ہے۔ جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں اور جہالت کی وجہ سے احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ نہایت غرور و تکبر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے بس صرف قرآن ہی کافی ہے۔ اس کا مشاہدہ علماء حق نے اس وقت کیا تھا جب وہ وفد کی شکل میں عبداللہ چکڑالوی منکر حدیث کے پاس گئے تھے وہ چھپر کھٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور غرور کے ساتھ علماء سے کہہ رہا تھا کہ "حسبنا کتاب اللہ" کہ بس ہمارے لئے صرف قرآن ہی کافی ہے۔

قرآن کی طرح احادیث بھی واجب العمل ہیں

﴿۲۴﴾ وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا إِنِّيْ أُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ أَلَا يُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلَى أَرِيْكَتِهِ يَقُوْلُ عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَجَدْتُّمْ فِيْهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَحِلُّوْهُ وَمَا وَجَدْتُّمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ وَإِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ أَلَا لَا يَحِلُّ لَكُمُ الْحِمَارُ الْأَهْلِيُّ وَلَا كُلُّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَلَا لُقَطَةُ مُعَاهِدٍ إِلَّا أَنْ يَسْتَغْنِيَ عَنْهَا صَاحِبُهَا وَمَنْ نَزَلَ بِقَوْمٍ فَعَلَيْهِمْ أَنْ يَقْرُوْهُ فَإِنْ لَمْ يَقْرُوْهُ فَلَهُ أَنْ يُعْقِبَهُمْ بِمِثْلِ قِرَاهُ۔ (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَرَوَى الدَّارِمِيُّ نَحْوَهُ وَكَذَا ابْنُ مَاجَه إِلَى قَوْلِهِ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ)[3]

ترجمہ: اور حضرت مقداد بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "آگاہ رہو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا مثل، خبردار عنقریب اپنے چھپر کھٹ پر پڑا ایک شخص کہے گا کہ اس قرآن کو اپنے اوپر لازم جانو (یعنی فقط قرآن ہی سمجھو اور اس پر عمل کرو) اور جو چیز تم قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال جانو اور جس چیز کو تم قرآن میں حرام پاؤ اس کو حرام جانو۔ حالانکہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے حرام فرمایا ہے وہ اس کے مانند ہے جسے خدا نے حرام کیا۔ خبردار! تمہارے لئے نہ اہلی (گھریلو) گدھا حلال کیا ہے اور نہ کچلی رکھنے والے درندے، اور نہ تمہارے لئے معاہد (یعنی وہ قوم جس سے معاہدہ کیا گیا ہو) کا

---

[1] المرقات ۱/۳۹۹ [2] المرقات ۱/۳۹۹ [3] اخرجہ ابوداؤد ۳۸۰۴ والدارمی؛

لقطہ حلال کیا ہے مگر وہ لقطہ حلال ہے جس کی پرواہ اس کے مالک کو نہ ہو اور جو شخص کسی قوم کا مہمان ہو اس قوم پر لازم ہے کہ اس کی مہمانی کریں۔ اگر وہ مہمانی نہ کریں تو اس شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ مہمانی کے مانند ان سے حاصل کرے۔

(ابوداؤد، دارمی، ابن ماجہ)

توضیح: اوتیت القرآن ومثلہ: یعنی قرآن کی طرح احکام کے اثبات کے لئے مجھے احادیث بھی دی گئی ہیں۔ ہاں فرق اتنا ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور احادیث وحی غیر متلو ہے۔ واجب العمل دونوں ہیں حلت وحرمت دونوں سے ثابت ہوتی ہے۔[1]

رجل شبعان: اس لفظ سے اس شخص کی بلادت وحماقت وجہالت اور عیش وعشرت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ بھرے پیٹ والا بلید اور بے وقوف ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اس بلادت وجہالت کی وجہ سے احادیث کا انکار کرے گا۔[2]

وان ما حرم: "ای والحال أن ما حرم رسول الله كما حرم الله" یعنی رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے اسی طرح چیزیں حرام ہوئی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ کی ذات حقیقت میں اسی طرح شارع ہے جس طرح اللہ تعالیٰ شارع ہے۔ کیونکہ "وما ينطق عن الهوى ان هو الا وحي يوحى" واضح آیت ہے۔[3]

الا لا یحل: یہاں سے ان اشیاء کا بیان شروع کیا گیا ہے جن کی حرمت سنت رسول اللہ میں مذکور ہے اور قرآن کریم میں نہیں ہے۔ یہ کل چار چیزیں ہیں۔

1. پالتو گدھا نہ کہ وحشی گدھا کیونکہ وہ صحرائی ہے اور حلال ہے۔ جس کو زیبرا کہتے ہیں اب پالتو گدھے کی حرمت کا حکم حدیث میں ہے اور قرآن کریم میں نہیں ہے۔
2. **ذی ناب:** یعنی ڈاڑھوں اور کچلی سے شکار کرنے والے جانوروں کی حرمت کا ذکر قرآن میں نہیں ہے احادیث میں ہے۔
3. **معاهد** کا لقطہ استعمال کرنا، معاہد یا ذمی ہوتا ہے اور یا حلیف کافر ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ غیر ذمی مسلمان کا لقطہ استعمال کرنا بطریق اولیٰ حرام ہے ہاں "معمولی چیز جو کوئی خود ہی پھینک دے یا گرنے کے بعد اس کے اٹھانے کی ضرورت محسوس نہ کرے" تو وہ مستثنیٰ ہے۔

4. **ومن نزل:** یہ چوتھی چیز ہے کہ کوئی مسلمان کسی قوم پر اتر آیا تو اس قوم پر ان کی ضیافت واجب ہے ورنہ ضیف اپنی ضیافت کی مانند ان لوگوں سے اس کا عوض لے لے۔

سؤال: یہاں یہ شبہ ہے کہ کسی کے مال میں تعرض کرنا یا چھین کر زبردستی لینا کہاں جائز ہے اس حدیث میں یہ اجازت کیسی ہے؟

جواب: اس سوال کے کئی جواب ہیں: پہلا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ اہل کتاب کے ساتھ جزیہ کا معاہدہ ہوتا تھا۔ اس معاہدہ میں یہ طے ہوتا تھا کہ اگر مسلمانوں کا تمہارے گاؤں پر گزر ہو تو تم ان کو کھانا کھلاؤ گے۔ لہٰذا یہ جزیہ اور ٹیکس کا حصہ تھا نہ دینے پر زبردستی لینا اور چھیننا جائز تھا۔

[1] المرقات ۱/۴۰۰ [2] المرقات ۱/۴۰۱ [3] المرقات ۱/۴۰۲

دوسرا جواب: یہ ہے کہ یہ حالتِ اضطرار کا حکم ہے۔ کہ جو شخص مخمصہ اور اضطرار میں ہو وہ جان بچانے کے لئے یہ لے سکتا ہے۔ پھر عوض واپس کرے گا یہی مطلب اعقاب کا ہے۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ یہ حکم ابتداء اسلام کا تھا پھر منسوخ ہو گیا پہلا جواب واضح ہے اور آنے والی روایت بھی اسی پر محمول ہے۔ جو حضرت عرباض رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یاد رہے کہ حجیت حدیث پر کلام ابتداء میں ہو چکا ہے۔[1]

بھرے پیٹ والے غافل لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں

﴿۲۵﴾ وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَيَحْسَبُ أَحَدُكُمْ مُتَّكِئًا عَلَى أَرِيْكَتِهِ يَظُنُّ أَنَّ اللهَ لَمْ يُحَرِّمْ شَيْئًا إِلَّا مَا فِي الْقُرْآنِ أَلَا وَإِنِّي وَاللهِ قَدْ أَمَرْتُ وَوَعَظْتُ وَنَهَيْتُ عَنْ أَشْيَاءَ إِنَّهَا لَمِثْلُ الْقُرْآنِ أَوْ أَكْثَرُ وَإِنَّ اللهَ لَمْ يُحِلَّ لَكُمْ أَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا بِإِذْنٍ وَلَا ضَرْبَ نِسَائِهِمْ وَلَا أَكْلَ ثِمَارِهِمْ إِذَا أَعْطَوْكُمُ الَّذِيْ عَلَيْهِمْ۔

(رواه ابوداؤد)[2]

ترجمہ: حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ (خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے ہوئے یہ خیال کرتا ہے کہ خدا نے وہی چیزیں حرام کی ہیں جو قرآن میں ذکر کی گئی ہیں۔ خبردار! خدا کی قسم بلاشک میں نے حکم دیا، میں نے نصیحت کی اور میں نے منع کیا چند چیزوں سے جو مثل قرآن کے ہیں۔ بلکہ زیادہ ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمہارے لئے حلال نہیں کیا کہ تم اہل کتاب کے گھروں میں اجازت حاصل کئے بغیر چلے جاؤ۔ اور نہ تمہارے لئے ان کی عورتوں کا مارنا حلال ہے۔ اور نہ تمہارے لئے ان کے پھلوں کا کھانا جائز ہے۔ جبکہ وہ اپنا مطالبہ ادا کردیں جو ان کے ذمہ تھا۔

(ابوداؤد) اور اس کی سند میں اشعث بن شعبہ حصیصی ہیں جن کے بارے میں کلام ہے کہ وہ ثقہ ہیں یا نہیں؟

توضیح: او اکثر: یہ "او" بمعنی "بل" ہے۔ یہ شک کے لئے نہیں بلکہ پہلی وحی سے متصل دوسری وحی آئی تو بل اکثر فرمایا۔ علماء اصول نے لکھا ہے کہ احکام پر مشتمل قرآنی آیات پانچ سو ہیں اور اسی طرح احادیث بھی پانچ سو ہیں۔[3]

ولا ضرب نسائهم: اس سے مراد مفتوح قوم کی عورتوں کے مارنے کی ممانعت ہے۔ نیز ان کے گھروں کی بےحرمتی کی ممانعت ہے۔ جیسا کہ عام فاتحین کی عادت ہوتی ہے۔ دونوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسے احکام بہت سارے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں لیکن احادیث سے ثابت ہیں۔ جس کی تفصیل حجیت حدیث کے ضمن میں گزر چکی ہے۔[4]

---

[1] المرقات ۱/۴۰۳ [2] اخرجه ابوداؤد [3] المرقات ۱/۴۰۵ [4] المرقات ۱/۴۰۶

ہر بدعت گمراہی ہے

﴿۲۶﴾ وَعَنْهُ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَوَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَأَنَّ هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا فَقَالَ أُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا فَإِنَّهٗ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اِخْتِلَافاً كَثِيْراً فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه إِلَّا أَنَّهُمَا لَمْ يَذْكُرَا الصَّلَاةَ)[1]

ترجمہ: حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر بیٹھ گئے اور ہم کو نہایت موثر انداز میں نصیحت کی کہ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور دلوں میں خوف پیدا ہو گیا۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) گویا نصیحت کرنے والے کی یہ آخری نصیحت ہے۔ لہٰذا ہم کو بھی وصیت فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ خدا سے ڈرتے رہو اور تم کو (مسلمان سردار کے) حکم سننے اور بجالانے کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ وہ (سردار) حبشی غلام ہو۔ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ اختلاف بھی دیکھے گا۔ ایسی حالت میں تم پر لازم ہے کہ تم میرے اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریق کو لازم جانو اور اسی طریقہ پر بھروسہ رکھو۔ اور اس کو دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے رہو۔ اور تم (دین میں) نئی نئی باتیں پیدا کرنے سے بچو اس لئے کہ ہر نئی بات بدعت ہے۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)۔ مگر اس روایت میں ترمذی اور ابن ماجہ نے نماز پڑھنے کا ذکر نہیں کیا۔ (یعنی ان کی روایات میں حدیث کے الفاظ صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مذکور نہیں ہیں بلکہ حدیث وعظنا موعظۃ سے شروع ہوتی ہے)

توضیح: ذرفت: آنسو بہنے کے معنی میں ہے۔ وجلت۔ دل کی گھبراہٹ اور خشوع اور خوف کو کہتے ہیں۔[2]

موعظۃ مودع: جامع نصیحت کو موعظۃ مودع کہہ دیا کہ اس میں تمام ایسی باتیں ذکر فرمائیں گویا حضور اکرم ﷺ جا رہے ہیں۔ اسی لئے صحابی نے مزید نصیحت اور وصیت کی درخواست کی۔[3]

بتقوی اللہ: ظاہراً اور باطناً اپنا معاملہ اپنے رب کے ساتھ صاف رکھنے کا نام تقویٰ ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب تقویٰ کے متعلق حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ اے امیر المومنین! تقویٰ کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح کوئی شخص کانٹوں اور جھاڑیوں والے راستے پر جا رہا ہو اور اپنے جسم اور کپڑوں کو کانٹوں سے بچا رہا ہو بس احتیاط کی یہی صورت تقویٰ ہے۔[4]

---

[1] اخرجه احمد ۱۲۶/۴ وابوداؤد: ۴۶۰۷ [2] المرقات ۱/۴۰۷ [3] المرقات ۱/۴۰۷ [4] المرقات ۱/۴۰۷

عبدا حبشیا: سوال یہ ہے کہ اسلام میں غلام بادشاہ نہیں بن سکتا ہے۔ بلکہ حدیث میں تو آیا ہے کہ "**الائمة من قریش**" تو پھر حبشی غلام کی بادشاہت کو کیسے واجب الاطاعت قرار دیا گیا؟

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ یہ **علی سبیل المبالغه** ہے کہ گویا معمولی آدمی بھی ہو جس کا سر کشمش کے دانے کے برابر ہی کیوں نہ ہو مگر تم اطاعت کرو تا کہ انتظام باقی رہے اور انتشار نہ آنے پائے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ بادشاہ بننا علی سبیل المغالبہ ہے کہ یہ حبشی غلام تم پر زبردستی مسلط ہوا ہو۔ تو پھر اطاعت کرو یہ وقتی ضرورت ہے صبر کرو۔ بشرطیکہ یہ غلام اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلے سنائے نہ کہ اپنے حکم پر چلائے۔ "**ای مالم یامر بمعصیة**" [1] **وسنة الخلفاء الراشدین:** خلفائے راشدین سے مراد خلفاء اربعہ ہیں۔ مشہور یہی چار ہیں۔ اس کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی خلافت کی ہے۔ وہ بھی خلفاء تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو بھی علماء نے خلفائے راشدین میں شمار کیا ہے۔ یہاں چار خلفاء کی امتیازی شان بیان کی گئی ہے۔ اس سے ان کی تخصیص مراد ہے۔ دیگر خلفاء کی خلافت کی نفی مراد نہیں ہے۔ قیامت تک خلفاء آئیں گے مگر یہاں خلافت علی منہاج النبوۃ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ [2]

عضوا علیها: ڈاڑھوں سے پکڑنا اہتمام کے ساتھ عمل کرنے سے کنایہ ہے یعنی ڈاڑھوں سے ان کے فرامین کو مضبوط پکڑو تا کہ چھوٹ نہ جائیں۔ کیونکہ یہ لوگ حق پر ہیں اور اس کے علاوہ بدعات سے بچو۔ کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔ اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کو بھی لازم پکڑنے کا حکم فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ خلفائے راشدین کی سنت بھی معیار حق ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ خلفائے راشدین کا مقام تشریع اور اجتہاد کے درمیان ہے۔ تشریع نبی کا مقام ہوتا ہے۔ اور اجتہاد ائمہ مجتہدین کا کام ہے۔ خلفائے راشدین کا مقام نہ تو تشریع والا ہے بلکہ اس سے نیچے ہے۔ اور نہ مجتہدین والا ہے بلکہ اس سے اوپر ہے بلکہ دونوں کے درمیان ہے۔ [3]

سنت کے روشن شاہراہ پر چلو

﴿۲۷﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا ثُمَّ قَالَ هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَالَ هٰذِهٖ سُبُلٌ عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُوْ اِلَيْهِ وَقَرَأَ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ الْاٰيَةَ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ) [4]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہمیں سمجھانے کے لئے) ایک (سیدھا) خط کھینچا اور فرمایا، یہ اللہ کا راستہ ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خط کے دائیں اور بائیں کئی (یعنی سات چھوٹے اور ٹیڑھے)

[1] المرقات ۱/۴۰۸ [2] المرقات ۱/۴۰۸، ۴۰۹ [3] المرقات ۱/۴۱۰ [4] اخرجه احمد ۱/۴۳۵ والدارمی ۲۰۸ والنسائی ۱۱۱۷۴

خطوط کھینچے اور فرمایا۔ یہ بھی راستے ہیں جن میں سے ہر ایک راستہ پر شیطان (بیٹھا ہوا) ہے۔ جو اپنے راستے کی طرف بلاتا ہے پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیله۔ ترجمہ: اور بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا اس کی پیروی کرو (دوسرے) راستے کی پیروی نہ کرو تاکہ کئی راستے تمہیں منتشر نہ کردیں۔ (احمد، نسائی، دارمی)

توضیح: تقریب فہم کے لئے اور سمجھانے کے لئے خطوط کھینچے ہیں تاکہ آدمی افراط وتفریط سے بچ جائے۔ کیونکہ اسلام کا خط وسط میں مستقیم اور معتدل ہے۔ اور یہی شریعت کی شاہراہِ اعظم ہے۔ اس کے علاوہ ٹیڑھے خطوط بدعات اور گمراہی کے ہیں۔ جو شیطان کے راستے ہیں۔ [1]

دین اطاعت کا نام ہے

﴿۲۸﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ۔

(رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ قَالَ النَّوَوِيُّ فِيْ اَرْبَعِيْنِهٖ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ رَوَيْنَاهُ فِيْ كِتَابِ الْحُجَّةِ بِاِسْنَادٍ صَحِيْحٍ) [2]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس چیز (یعنی دین وشریعت) کی تابع نہ ہوجائیں جس کو میں (خدا کی جانب سے) لایا ہوں۔ اس حدیث کو "شرح السنۃ" میں روایت کیا گیا ہے۔ اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی چہل حدیث میں لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ جس کو ہم نے کتاب الحج میں صحیح سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

توضیح: لا یؤمن احدکم: علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ نفی کمال کی ہے کہ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کو ہر چیز میں مقدم رکھتا ہے۔ تو جب تک اس نے اپنی طبیعت وجبلت اور خواہش کو شریعت کا تابع نہ کیا اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا۔ [3]

لیکن شیخ مظہر وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہاں اصل ایمان کی نفی ہے۔ یعنی مدار ایمان اتباع شریعت پر ہے۔ تو جو شخص اطاعت کرتا ہے وہ اس لئے کرتا ہے کہ یہ اس کا دین ہے اگرچہ طبیعت نہیں چاہتی ہے اس پر اس کو ثواب بھی ملتا ہے۔

لیکن اگر کوئی مسئلہ ایسا ہے کہ وہ خواہش کے مطابق ہے اور دل چاہتا ہیکہ اس پر عمل کرے اور وہ شخص عمل کرتا ہے مگر اتباع کا ارادہ نہیں تھا بلکہ خواہش پوری کرنے کا ارادہ تھا تو اس شخص کا یہ عمل دین نہیں رہا لہٰذا وہ مومن نہیں ہوا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اتباع شریعت اصل مقصود ہے۔ [4]

[1] المرقات ۱/۴۱۱ [2] اخرجه البغوی فی شرح السنة ۱/۲۱۳ [3] المرقات ۱/۴۱۲ [4] المرقات ۱/۴۱۲

مورخہ ۲۱ محرم ۱۴۱۰ھ

سنت زندہ کرنے کا ثواب

﴿۲۹﴾ وَعَنْ بِلَالِ بْنِ حَارِثِ الْمُزَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْيَا سُنَّةً مِنْ سُنَّتِيْ قَدْ أُمِيْتَتْ بَعْدِيْ فَإِنَّ لَهُ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلَ أُجُوْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ اَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَمَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَةَ ضَلَالَةٍ لَا يَرْضَاهَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئًا۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَه عَنْ كَثِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ) [1]

ترجمہ: حضرت بلال بن حارث المزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس شخص نے میری کسی ایسی سنت کو زندہ کیا (یعنی رائج کیا) جو میرے بعد چھوڑ دی گئی تھی تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس سنت پر عمل کرنے والے کو ملے گا، بغیر اس کے کہ ان (سنت پر عمل کرنے والوں) کے ثواب میں کچھ کمی کی جائے۔ اور جس شخص نے گمراہی کی کوئی ایسی نئی بات (بدعت) نکالی جس سے اللہ اور اس کا رسول خوش نہیں ہوتا تو اس کو اتنا ہی گناہ ملے گا جتنا کہ اس بدعت پر عمل کرنے والوں کو گناہ ہوگا، بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کمی کی جائے"۔ (ترمذی) اور ابن ماجہ نے اس روایت کو کثیر بن عبداللہ بن عمرو سے اور کثیر نے اپنے والد عبداللہ سے اور عبداللہ نے کثیر کے دادا عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے۔

توضیح: سنت سے مراد مطلق حکم اسلام ہے۔ خواہ فرائض سے ہو یا واجبات کے قبیل سے ہو یا سنن کی قسم سے ہو۔ اس کے احیاء اور زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خود بھی اس پر عمل کرے اور دوسروں کو بھی اس کی خوب تبلیغ کرے۔ ایسے شخص کو ایک اپنے عمل اور ایک دوسرے کے لئے سبب بننے کا ثواب ملے گا۔

بدعة: بدعت کے ساتھ جو قیودات لگی ہوئی ہیں یہ احترازی نہیں۔ بلکہ مزید تقبیح کے لئے صفات کاشفہ ہیں۔

دینِ اسلام حجاز میں ٹھکانا پکڑے گا

﴿۳۰﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الدِّيْنَ لَيَأْرِزُ اِلَى الْحِجَازِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ اِلٰى جُحْرِهَا وَلَيَعْقِلَنَّ الدِّيْنُ مِنَ الْحِجَازِ مَعْقِلَ الْاُرْوِيَّةِ مِنْ رَأْسِ الْجَبَلِ اِنَّ الدِّيْنَ بَدَأَ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ وَهُمُ الَّذِيْنَ يُصْلِحُوْنَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِيْ مِنْ سُنَّتِيْ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ) [2]

---

[1] اخرجه الترمذی ۲۶۷۷ وابن ماجه ۲۰۹ [2] اخرجه الترمذی ۲۶۳۰

ترجمہ: حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ دین (اسلام) حجاز (مکہ ومدینہ اور اس کے متعلقات) کی طرف اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح کہ سانپ اپنے بل کی طرف سمٹ آتا ہے اور دین حجاز میں اس طرح جگہ پکڑے گا جیسے کہ بکری پہاڑ کی چوٹی پر جگہ پکڑ لیتی ہے اور دین ابتداء میں غریب پیدا ہوا تھا اور آخر میں ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ ابتداء میں تھا۔ چنانچہ خوشخبری ہو غریبوں کے لئے وہی اس چیز (یعنی میری سنت) کو درست کریں گے جس کو میرے بعد لوگوں نے خراب کر دیا ہوگا"۔ (ترمذی)

توضیح: جحرها: جحر سوراخ کو کہتے ہیں اور ضمیر "حية" کی طرف لوٹتی ہے۔ سانپ اپنے بل کی طرف لوٹنے اور تیز چلنے اور محفوظ ہو کر بیٹھنے میں مشہور ہے۔ اس لئے اس سے تشبیہ دی گئی ہے۔

وليعقلن: جگہ پکڑنے کے معنی میں ہے۔ اصل میں عقال سے ہے اور عقال رسی کو کہتے ہیں اونٹ کو جس رسی سے باندھا جاتا ہے اس کو بھی عقال کہتے ہیں۔[1]

الحجاز: مکہ مدینہ اور اس کے قرب وجوار کے شہروں کو حجاز کہتے ہیں یہاں مراد مکہ اور مدینہ ہے۔[2]

معقل: عقل سے یا تو مصدر میمی ہے یا ظرف مکان کا صیغہ ہے۔ یہاں پہاڑ کی چوٹی پر محفوظ مقام مراد ہے۔ اور کلام میں تشبیہ ہے۔[3]

الاروية: پہاڑی بکری کو ارویہ کہتے ہیں۔ منجد نے ارویہ کی جو تصویر دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشک نافہ ہے۔ اور وعل کی جو تصویر دی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پہاڑی بکرا ہے۔ جس کے سیدھے اور بلند سینگ ہوتے ہیں۔ اور نہایت ہی مشکل پہاڑی مقامات پر رہتا ہے انسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پاؤں میں پتھروں اور چٹانوں کے ساتھ چپکنے کا مادہ اور مصالحہ لگا ہوا ہے۔ یہ سحری کے وقت چرنے کے لئے چراگاہ میں ریوڑ بن کر آتے ہیں اور اندھیرے ہی میں سیدھے ایک لائن میں واپس چلے جاتے ہیں۔ شکاری لوگ ان کی بہت سی خصوصیات بیان کرتے ہیں اور پشتو میں اس کو "غرخہ" کہتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں **ارویہ** مؤنث کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہ جگہ پکڑنے میں مذکر اور نر سے زیادہ محتاط ہوتی ہے۔ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشن گوئی فرمائی کہ قرب قیامت کے وقت فتنے زیادہ ہو جائیں گے اس ظہور فتن کے زمانے میں دین سمٹ کر پھر حجاز مقدس کی طرف لوٹ آئے گا اور حجاز میں اس کو پناہ لینے اور حفاظت کے لئے محفوظ مقام ملے گا۔ حضرت مہدی علیہ الرضوان کے زمانے میں ان واقعات کا ظہور ہوگا کہ معاشرہ سے ان کو ہر لحاظ سے کاٹ کر رکھ دیا جائے گا۔ نہ کسی خوشی میں ان کو کوئی پوچھنے والا ہوگا اور نہ کسی غم میں۔[4]

فطوبیٰ للغرباء: یعنی ان کو مبارکباد ہو اور ان کو جنت طوبیٰ کی بشارت ہے۔[5]

وهم الذين: یہ ان کی نشانی ہے کہ سنت پر عمل پیرا ہوں گے۔ اور لوگوں نے دین میں جو بگاڑ پیدا کیا ہوگا اس کی اصلاح

---

[1] المرقات ۱/۴۱۴ [2] المرقات ۱/۴۱۴ [3] المرقات ۱/۴۱۴ [4] المرقات ۱/۴۱۵ [5] المرقات ۱/۴۱۵

کریں گے۔ الحمدللہ اس نقشے پر علماء دیو بند قائم ہیں۔ ''غرباء'' کے لفظ سے غیر مقلدین نے اپنے ایک گروپ کا نام ''غرباء اہل حدیث'' رکھا ہے۔ مگر نام سے کام نہیں چلتا بلکہ کردار وعمل سے تاریخ بنتی ہے۔ [1]

یہ امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی

﴿۳۱﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِيْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ أُمَّتِيْ مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ وَاِنَّ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ اُمَّتِيْ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ اِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً قَالُوْا مَنْ هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِيْ رِوَايَةِ أَحْمَدَ وَأَبِيْ دَاوٗدَ عَنْ مُعَاوِيَةَ ثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ فِي النَّارِ وَوَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَهِيَ الْجَمَاعَةُ وَاِنَّهٗ سَيَخْرُجُ فِيْ أُمَّتِيْ أَقْوَامٌ تَتَجَارٰى بِهِمْ تِلْكَ الْاَهْوَاءُ كَمَا يَتَجَارَى الْكَلْبُ بِصَاحِبِهٖ لَا يَبْقٰى مِنْهُ عِرْقٌ وَلَا مَفْصَلٌ اِلَّا دَخَلَهٗ. [2]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''بلاشبہ میری امت پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا (اور دونوں میں ایسی مماثلت ہوگی) جیسا کہ دونوں جوتے بالکل برابر اور ٹھیک ہوتے ہیں یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں سے اگر کسی نے اپنی ماں کے ساتھ بدفعلی کی ہوگی تو میری امت میں بھی ایسے ہی لوگ پیدا ہوں گے جو ایسا کریں گے۔ اور بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی اور وہ تمام فرقے جہنمی ہوں گے۔ ان میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ جنتی فرقہ کونسا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جس میں میں اور میرے صحابہ ہوں گے'' (ترمذی)۔ اور احمد اور ابوداؤد نے جو روایت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ بہتر گروہ دوزخ میں جائیں گے اور ایک گروہ جنت میں جائے گا۔ اور وہ گروہ ''جماعت'' ہے اور میری امت میں کئی قومیں پیدا ہوں گی۔ جن میں خواہشات (یعنی عقائد واعمال میں بدعات) اس طرح سے سرایت کر جائیں گے جس طرح سے ہڑک والے میں ہڑک سرایت کر جاتی ہے کہ کوئی رگ اور کوئی جوڑ اس سے باقی نہیں رہتا۔

توضیح: بنی اسرائیل: اس سے یہود ونصاریٰ مراد ہیں۔ **امتی:** اس سے مراد امت اجابت ہے نہ کہ امت دعوت۔ [3]

حذو النعل بالنعل: یعنی جس طرح ایک جوتا دوسرے جوتے سے بالکل مشابہ ہوتا ہے اسی طرح امت محمدیہ یہود ونصاریٰ کی مشابہت اختیار کرے گی یہ محاورہ کمال مطابقت اور کمال مشابہت کے وقت کہا جاتا ہے۔ [4]

[1] المرقات ۱/۴۱۷ [2] اخرجه الترمذی ۲۶۴۱ [3] المرقات ۱/۴۱۸ [4] المرقات ۱/۴۱۷

اتی امه علانیة: اس سے سوتیلی ماں مراد ہے۔ کیونکہ حقیقی ماں کے ساتھ بدکاری سے طبع مانع ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ شاید اس سے سوتیلی ماں مراد ہو۔ ان حضرات کا کہنا اپنی جگہ صحیح ہے لیکن آج کل واقعات بتارہے ہیں کہ اس سے حقیقی اور سوتیلی دونوں مائیں مراد ہوسکتی ہیں کیونکہ یورپ نے فحاشی سے انسان کو حیوان بنادیا ہے۔ جہاں ماں، بیٹی اور بیوی کا فرق نہیں رہا۔[1]

وتفترق امتی: اس سے مراد امت اجابت ہے کیونکہ امت دعوت یعنی غیر مسلموں میں تو بے شمار فرقے ہیں۔ یعنی امت اجابت کے تہتر فرقے بنیں گے۔ یہ افتراق اور فرقہ بندی فروعات کے اعتبار سے نہیں بلکہ بنیادی عقائد کے اعتبار سے مراد ہے اسی لئے ان فرقوں پر دوزخ کا حکم لگایا گیا ہے۔ کہ یہ لوگ بداعتقادی اور غلط نظریات کی وجہ سے دوزخ میں جائیں گے۔ اور صرف ایک فرقہ ناجیہ ہوگا جو اپنے اچھے عقائد کی وجہ سے دوزخ سے بچ جائے گا۔[2]

یہاں یہ بات ذہن نشین ہو کہ فرقہ ناجیہ کے علاوہ یہ بہتر فرقے اپنے اصول اور عقائد کے اعتبار سے چھ ہیں۔ پھر انہی میں سے فروعات کے اعتبار سے ۷۲ فرقے نکل آئے ہیں۔ وہ چھ یہ ہیں:

① معتزلہ ② مرجئہ ③ مجسمہ ④ جبریہ ⑤ شیعہ ⑥ خوارج

معتزلہ کے اندر بارہ فرقے ہیں۔ شیعہ میں ۳۲ فرقے ہیں[3]، خوارج میں پندرہ ہیں اور جبریہ یعنی جہمیہ میں تین ہیں، مرجئہ میں ۵ ہیں، اور مجسمہ میں بھی پانچ ہیں، تو یہ کل ۷۲ فرقے ہوگئے۔ اور ایک اہل سنت والجماعۃ ہے تو کل ۷۳ فرقوں میں امت بٹی ہوئی ہے۔

سوال: یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ناجیہ جماعت صرف اہل سنت ہے اور باقی غیر ناجیہ دوزخی ہیں۔

جواب: یہ امتیاز عقلی دلائل سے ہوگا نقلی دلائل اور علامات سے بھی ہوجائے گا۔ وہ اس طرح کہ اس جماعت ناجیہ کی یہ شان ہوگی کہ حفاظ قرآن انہی میں ہوں گے۔ محدثین کی کثرت ان میں ہوگی۔ فقہاء بھی ان میں ہوں گے۔ باعمل علماء زہاد اور اہل تصوف اور خداترس متقی اور پرہیزگاران میں ہوں گے اور صحابہ کرام ایسے ہی تھے۔

دیگر فرقوں میں یہ چیزیں موجود نہیں ہوں گی تو وہ صحابہ کے نقش قدم پر نہیں ہوں گے۔ اور آنحضرت ﷺ نے **"ما انا علیه واصحابی"** فرمایا ہے۔[4]

بدعت کی مثال:

وهی الجماعة: اس سے جماعت حقہ جماعت ناجیہ کی طرف اشارہ ہے۔ پھر اس کا پورا نام **"اهل السنة والجماعة"** پڑ گیا۔ یہ پورا نام اصل میں ان کا نہیں تھا بلکہ اچھے عقائد، نیک اعمال وافعال، اچھے کردار اور صحیح راستے پر چلنے کی وجہ سے ان کا نام بعد میں اہل السنۃ والجماعۃ پڑ گیا۔ اہل سنت کا مطلب یہ ہے کہ سنت نبوی ﷺ پر چلنے والے لوگ اور الجماعۃ کا مطلب یہ ہے کہ جماعت صحابہ کے پیروکار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے لوگ اہل سنت و

---

[1] المرقات ۱/۳۱۸ والکاشف ۱/۳۶۸ [2] المرقات ۱/۳۱۸ [3] المرقات ۱/۳۱۹ [4] المرقات ۱/۳۱۹

الجماعت ہیں۔ جولوگ سنت پر چلنے والے نہ ہوں یا جماعت صحابہ سے عقیدت نہ رکھتے ہوں وہ اہل السنت والجماعۃ سے خارج ہیں خواہ وہ اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھتے ہوں۔ [۱]

تتجاری بھم: یعنی خواہشات وبدعات ان میں ایسی جاری ہوں گی جیسے ہڑک کی بیماری جس کو "**داء الکلب**" کہتے ہیں۔ "**الکلب**" کاف اور لام کے فتحہ کے ساتھ اس خوفناک بیماری کا نام ہے جو باؤلے کتے کے کاٹنے کی وجہ سے پورے جسم میں سرایت کر جاتی ہے۔ [۲]

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کے اہل باطل کے جسم وجاں میں اور ان کے رگ وریشہ میں خواہشات اور بدعات ایسے گھس کر داخل ہو جائیں گی جس طرح سے ہڑک کی بیماری باؤلے کتے کے رگ وریشہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ تو وہ کتا مجنون ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ پانی سے بھاگتا ہے نہ پانی دیکھ سکتا ہے نہ پی سکتا ہے اور جس کو کاٹتا ہے وہ بھی اسی طرح مجنون ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بدعتی ہے کہ خود بدعت کی بیماری اس کے رگ وریشہ میں داخل ہو جاتی ہے تو وہ حق کے قریب نہیں جا سکتا بلکہ حق سے دور بھاگتا ہے۔ اور جب کسی دوسرے سے ملتا ہے تو بدعت کی یہ بیماری اس کے اندر بھی داخل ہو جاتی ہے۔ اور اسے بھی بدعتی بنا دیتی ہے۔ اسی لئے بدعتی واجب الاجتناب ہے۔ [۳]

ما انا علیه واصحابی: یہ فرقہ ناجیہ کی وضاحت ہے **ما انا علیه** سے اشخاص مع القانون مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے آسمانی مذاہب بھیجے ہیں ان کے ساتھ بطور نمونہ انبیائے کرام بھی بھیجے ہیں۔ آسمانی قانون کے بغیر اشخاص کی پیروی شرک ہے۔ اور اشخاص کے بغیر قانون بھی معتبر نہیں ہے۔ [۴]

اجماع امت حجت ہے

﴿۲۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَجْمَعُ اُمَّتِيْ اَوْ قَالَ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ عَلٰى ضَلَالَةٍ وَيَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ وَمَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ) [۵]

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ میری امت کو یا (بجائے میری امت کے) یہ فرمایا کہ امت محمدیہ کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ اور جو شخص جماعت سے الگ ہے وہ (جنتیوں کی جماعت سے) الگ کر کے تنہا دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ (ترمذی)

توضیح: لا یجمع امتی: یعنی اس امت کے افراد کی رائے تو غلط ہو سکتی ہے مگر جس بات پر تمام علماء وفقہاء اور مجتہدین اکٹھے ہو جائیں وہ بات غلط نہیں ہو سکتی۔ امت سے مراد "امت اجابت" ہے۔ کیونکہ امت کفریہ تو "**الکفر ملة واحدة**" کے اصول کے تحت سب کفر پر جمع ہو سکتی ہے۔ "امتی" میں اضافت تشریفیہ ہے۔ جس سے اس امت کی شرافت

---

[۱] المرقات ۱/۴۱۹، ۴۲۰ [۲] المرقات ۱/۴۲۰ [۳] المرقات ۱/۴۲۰ [۴] المرقات ۱/۴۱۹ [۵] اخرجه الترمذی ۲۱۶۷

معلوم ہوتی ہے۔ نیز اس میں اشارہ ہے کہ اجماع امت کا یہ شرف صرف نبی کریم ﷺ کی امت کو ہی حاصل ہے۔ سابقہ امتوں کو یہ امتیاز حاصل نہیں تھا۔ پھر اس اجماع سے علماء وفقہاء کا اجماع مراد ہے۔ عوام کے اجماع کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ شارحین حدیث نے لکھا کہ اس حدیث سے اجماع امت کا ثبوت ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اجماع ادلہ اربعہ میں سے ایک دلیل ہے۔ اجماع امت کی حجیت قرآن کریم سے بھی ثابت ہے اللہ تعالی نے فرمایا:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولی ونصله جهنم۔ [1]

یہاں سبیل المومنین کا سب سے بڑا مصداق اجماع ہی ہے۔

اجماع کی حجیت میں یہ حکمت ضرور ہے کہ دین اسلام میں اختلاف اور رخنہ اندازی کی صورت میں دین کی حفاظت کے لئے ایک قوت حافظہ اور قوت معصومہ کا وجود ضروری ہے۔ جس کی بات حرف آخر ہو اور اس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ اصل میں یہ قوت معصومہ تو نبوت ہوتی ہے۔ سابقہ امتوں میں تو موقع بموقع نبی آتے تھے اور اس ضرورت کو پورا فرماتے تھے۔ لیکن اس امت میں ختم نبوت کی وجہ سے نیا نبی نہیں آسکتا ہے تو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قرآن وحدیث کی روشنی میں اجماع امت کا وجود ہے۔ اس امت کے اس طویل دورانیہ میں تغیر احوال کی وجہ سے جو نئے نئے مسائل اٹھیں گے تو شریعت کی روشنی میں اس کا حل صرف علماء امت کا اجماع ہے تا کہ شریعت کی حفاظت کے لئے اجماع کی یہ قوت حافظہ ہر وقت نئے مسائل کا حل پیش کرے۔

اسی ضرورت کے پیش نظر اس امت کو نبی اکرم ﷺ نے اجماع کی یہ اتھارٹی عنایت فرمادی اور پھر ان کی محفوظ و مامون حیثیت کی طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس امت کو گمراہی پر اکٹھا نہیں فرمائے گا۔ اجماع کی یہ امتیازی شان صرف اس امت کو ختم نبوت کی برکت سے ملی ہے۔ [2]

ید الله علی الجماعة: یعنی اللہ تعالیٰ کی مدد جماعت حقہ کے ساتھ ہے۔ یعنی جماعت من حیث الجماعۃ جب سنت پر قائم رہے گی کتاب اللہ پر محکم رہے گی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی اعانت کی جائے گی۔ [3]

ومن شذ: یعنی جماعت حقہ سے الگ ہوا عقائد وخیالات کے اعتبار سے کتاب وسنت سے دور جانکلا۔ [4]

شذ فی النار: یعنی جنتیوں کی جماعت سے الگ کر کے جہنم میں تنہا ڈال دیا جائے گا۔ [5]

سواد اعظم کا کیا مطلب ہے

﴿۲۳﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ۔

(رواہ ابن ماجہ) [6]

[1] سورۃ النساء ۱۱۵ [2] المرقات ۱/۴۲۰، ۴۲۱ [3] المرقات ۱/۴۲۱ [4] المرقات ۱/۴۲۱ [5] المرقات ۱/۴۲۱ [6] اخرجہ ابن ماجہ ۳۹۵۰

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''بڑی جماعت کی پیروی کرو اس لئے کہ جو جماعت سے الگ ہوا وہ تنہا آگ میں ڈالا جائے گا''۔ ابن ماجہ نے یہ حدیث کتاب السنۃ سے انس اور ابن عاصم سے روایت کی ہے۔

توضیح: السواد الاعظم: اس کا مطلب یہ ہے کہ اصول وقواعد میں انہیں اعتقادات ونظریات کی پیروی کرنی چاہیئے جو اکثر علماء کے نزدیک حق ہوں اسی طرح ان اقوال وافعال کو قبول کرنا چاہیئے جو جمہور علماء امت سے ثابت ہوں۔ فروعات میں اختلاف تو جائز ہے لیکن اصول میں نہیں۔ [۱]

سوال: اہل حق ہر زمانے میں اہل باطل کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں پھر ان کو ''سواد اعظم'' یعنی بڑی جماعت کیسے کہہ دیا؟

جواب: سواد اعظم سے صرف ایک زمانے کے لوگ مراد نہیں بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جتنے لوگ حق پر قائم چلے آئے ہیں وہ اہل حق سواد اعظم ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بڑی جماعت ہے اور ہر زمانے کے اہل باطل سے زیادہ ہے۔ اس کے برعکس کفر ایک جماعت نہیں ہے بلکہ ہر زمانے کی ہر ہر جماعت الگ الگ کفر میں مبتلا رہی ہے۔ جس میں تسلسل نہیں تو وہ سواد اعظم نہیں اس توجیہ سے اہل بدعت کا سوال بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ ہم زیادہ ہیں تو ہم سواد اعظم ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اہل بدعت سواد اعظم نہیں کیونکہ ان کی جماعت کا تسلسل نہیں کیونکہ ہر زمانے اور ہر علاقے کے مطابق بدعت کی الگ الگ صورتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ مگر اہل حق تو حق سے وابستہ ہیں ان کا ایسا تسلسل ہے جو سب سے زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پہاڑ کی چوٹی پر اگر ایک آدمی بھی اہل حق سے وابستہ ہو تو وہ اکیلا شخص بھی سواد اعظم ہے۔

دل کو کھوٹ سے پاک رکھنا بہت اہم ہے

﴿۳۴﴾ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا بُنَيَّ اِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِيَ وَلَيْسَ فِيْ قَلْبِكَ غِشٌّ لِأَحَدٍ فَافْعَلْ ثُمَّ قَالَ يَا بُنَيَّ وَذٰلِكَ مِنْ سُنَّتِيْ وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِيْ فَقَدْ أَحَبَّنِيْ وَمَنْ أَحَبَّنِيْ كَانَ مَعِيْ فِي الْجَنَّةِ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ). [۲]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا۔ ''اے میرے بیٹے! اگر تم اس پر قدرت رکھتے ہو کہ صبح سے شام تک اس حالت میں بسر کرو کہ تمہارے دل میں کسی سے کینہ نہ ہو تو ایسا ہی کرو'' پھر فرمایا اے میرے بیٹے! یہی میری سنت ہے لہٰذا جس شخص نے میری سنت کو محبوب رکھا اس نے مجھ کو محبوب رکھا اور جس نے مجھ کو محبوب رکھا وہ میرے ساتھ ہی جنت میں داخل ہوگا''۔

(ترمذی)

توضیح: غش: ضد الصلاح ہے اس میں قلبی کھوٹ کینہ تباغض حسد وغیرہ بری صفات سب داخل ہیں۔ [۳]

[۱] المرقات ۱/۴۲۱ [۲] اخرجہ الترمذی: ۲۶۷۸ [۳] المرقات ۱/۴۲۲

كان معي في الجنة: یعنی سنت کو محبوب رکھنا اور اس کو پسند کرنا حضور ﷺ کو محبوب رکھنا ہے۔ اور حضور ﷺ سے محبت جنت میں حضور اکرم ﷺ کی معیت کو لازم کرتی ہے۔ سنت سے محبت کا یہ مقام ہے تو سنت پر عمل کرنے کا کیا مقام ہوگا؟[1]

ایک سنت کو زندہ کرنے سے سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے

﴿۳۵﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِي عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِي فَلَهُ أَجْرُ مِائَةِ شَهِيدٍ. (رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "میری امت کے بگڑنے کے وقت جس شخص نے میری سنت کو دلیل بنایا اس کو سو ۱۰۰ شہیدوں کا ثواب ملے گا"۔ بیہقی نے یہ روایت کتاب الزہد میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

توضیح: عند فساد امتي: کہ اغلباً واکثراً لوگوں میں جہالت پھیلی ہوئی ہو اور ہر طرف بدعات وشرکیات کا اندھیرا چھایا ہوا ہو، اور یہ بندۂ خدا سنت کو مضبوطی سے پکڑ کر اس پر عمل کرتا ہو اور ہر طرف سے یہ شخص لوگوں کا نشانہ بن رہا ہو تو شہید تو ایک تیر یا گولی لگنے سے شہید ہو جاتا ہے مگر اس بیچارے پر تو تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور یہ مضبوط ڈٹا ہوا ہے تو عادتاً سو اعتراض ہوتے ہیں۔ تو سو تیر ان پر چلے تو سو شہیدوں کے برابر ثواب ملے گا۔ یاد رہے یہ آخرت اور ثواب کا شہید ہے اس پر شہید کے دنیوی احکام جاری نہیں ہوں گے لہٰذا ان کو غسل دیا جائے گا اور کفن پہنایا جائے گا۔ نیز اس سنت سے مراد ایسی سنت ہے جن کے زندہ کرنے میں دنیا کے لوگوں کے جھگڑے مول لینے پڑتے ہیں۔ باقاعدہ اہل باطل سے مقابلہ ہوتا ہے لوگ اس سنت کو زندہ نہیں کرنے دیتے مگر یہ شخص ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے اور سنت کو زندہ کرتا ہے اور معاشرہ کی پرواہ نہیں کرتا ہے جیسے ڈاڑھی رکھنے اور احیائے جہاد کی سنت کی یہی حیثیت ہے۔[3]

قرآن وحدیث کی موجودگی میں تورات وانجیل کو دیکھنا منع ہے

﴿۳۶﴾ وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ أَتَاهُ عُمَرُ فَقَالَ إِنَّا نَسْمَعُ أَحَادِيثَ مِنْ يَهُودَ تُعْجِبُنَا أَفَتَرَى أَنْ نَكْتُبَ بَعْضَهَا فَقَالَ أَمُتَهَوِّكُونَ أَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً وَلَوْ كَانَ مُوسَى حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِي.

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ)[4]

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم یہود کی حدیثیں سنتے ہیں اور وہ ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں کیا آپ ﷺ اجازت دیتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض کو

[1] المرقات ۱/۴۲۲ [2] اخرجه البیهقی [3] المرقات ۱/۴۲۲، ۴۲۳ [4] اخرجه احمد ۳/۳۳۸، ۲۸۷

لکھ لیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کیا تم بھی اس طرح حیران ہو جس طرح یہود ونصاریٰ حیران ہیں؟ (جان لو) کہ میں بلاشبہ تمہارے پاس صاف اور روشن شریعت لایا ہوں۔ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو وہ بھی میری پیروی پر مجبور ہوتے''۔ (احمد، بیہقی)

توضیح: انا نسمع: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش صرف اس لئے تھی کہ وہ کلمۂ خیر وحکمت کے متلاشی تھے۔[1]

امتهوكون: یہ صیغہ باب تفعل سے ہے اور ابتدا میں الف استفہامیہ لگا ہوا ہے۔ یہ تحیر وحیرانگی کے معنی میں ہے۔ یعنی ان کی کتابیں محرف ہونے کی وجہ سے وہ حیران و پریشان ہیں اب وہ احکامات اپنے راہبوں کی رائے سے لیتے ہیں۔ کیا تم ان کی طرح اپنے دین اور اپنی کتاب کے بارے میں حیران و پریشان ہو کہ اس کو چھوڑ کر دوسروں کی کتاب کو پڑھنا شروع کرنا چاہتے ہو لو تم تو قرآن کریم کو اپنے پاس رکھتے ہو کیا تم اس میں پریشان وحیران ہو گئے کہ آیا یہ وہی آسمانی کتاب ہے یا نہیں؟ اس تہدید سے معلوم ہوا کہ اب خیر وہدایت قیامت تک قرآن کریم میں منحصر ہے۔[2]

بيضاء نقية: یعنی روشن، بے عیب واضح اور افراط وتفریط اور شک وشبہ اور ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔[3]

۲۲ محرم ۱۴۱۰ھ

کامیابی کی تین باتیں

﴿۳۷﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أَكَلَ طَيِّباً وَعَمِلَ فِي سُنَّةٍ وَأَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُولَ اللهِ إِنَّ هٰذَا الْيَوْمَ لَكَثِيرٌ فِي النَّاسِ قَالَ وَسَيَكُونُ فِي قُرُونٍ بَعْدِي۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[4]

ترجمہ: حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے حلال رزق کھایا سنت کے طریقہ پر عمل کیا اور لوگ اس کی زیادتیوں سے امن میں رہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا''، ایک شخص نے عرض کیا، یارسول اللہ! ایسے لوگ تو آج کل بہت ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''اور میرے بعد بھی ایسے لوگ ہوں گے''۔ (ترمذی)

توضیح: من اكل طيبًا: اس حدیث میں حلال رزق کو مقدم کیا اور عمل بالسنہ کو مؤخر کیا۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ سنت پر عمل وہی شخص کر سکتا ہے جو حلال رزق کھاتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "**يا ايها الرسل كلوا من الطيبت واعملوا صالحا**" یہاں "**طيبات**" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے حرام کا لفظ نہیں بولا گیا کیونکہ طیبا خوشبو کو متضمن ہے۔ اور حلال رزق سے بھی تقویٰ کی معنوی خوشبو اٹھتی ہے۔ "**طيبًا**" سے یہ اشارہ بھی ہے کہ وہ شخص مشتبہ اشیاء سے بھی بچتا ہے۔ اس حدیث میں یہ دو عجیب جملے ہیں جس میں "**اكل طيبًا**" سے تمام حقوق اللہ کی طرف اشارہ ہے اور "**وامن الناس بوائقه**" سے تمام حقوق العباد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کے مجموعے کا نام اسلام اور شریعت ہے اور شریعت پر عمل سے جنت ملتی ہے۔[5]

[1] المرقات ۱/۴۲۳ [2] المرقات ۱/۴۲۳ [3] المرقات ۱/۴۲۳ [4] اخرجه الترمذی: ۲۵۲۰ [5] المرقات ۱/۴۲۲

بوائقه: بائقة کی جمع ہے جو بڑی مصیبت اور ایذا رسانی کو کہتے ہیں۔[1]

دخل الجنة: یعنی دخول جنت کا حکم ہو گیا یہاں ماضی کا صیغہ لا کر دخول کو یقینی بنایا گیا ہے۔[2]

فقال رجل: یعنی آج کل تو عہد نبوی ﷺ کی برکت سے ایسے لوگ بہت ہیں آیا آئندہ بھی ایسے لوگ ہوں گے یا کم ہو کر ختم ہو جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آئندہ بھی ایک مدت تک ایسے لوگ ہوں گے یعنی صرف تمہارے زمانے تک خاص نہیں بلکہ خیر القرون کے زمانے تک بھی ہوں گے۔

شیخ عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ نے اشعۃ اللمعات میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ خیر و بھلائی قیامت تک باقی رہے گی۔[3]

دورِ اول میں تبلیغ کی زیادہ ضرورت تھی

﴿۳۸﴾ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّكُمْ فِيْ زَمَانٍ مَنْ تَرَكَ مِنْكُمْ عُشْرَ مَا أُمِرَ بِهِ هَلَكَ ثُمَّ يَأْتِيْ زَمَانٌ مَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ بِعُشْرِ مَا أُمِرَ بِهِ نَجَا. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[4]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم ایسے زمانے میں ہو کہ اگر تم میں سے کوئی شخص ان احکام کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دے جو دیئے گئے ہیں تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔ لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ اگر کوئی شخص ان احکام کے دسویں حصے پر بھی عمل کرے گا تو نجات پائے گا"۔ (ترمذی)

توضیح: عشر ما امر به: اس حدیث مبارک کا مطلب سمجھنے کے لئے پہلے یہ سوال سمجھنا ضروری ہے کہ اگر یہاں مامور بہ سے فرائض اسلام مراد لیا جائے تو حدیث کا پہلا جز تو صحیح ہوگا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اگر فرائض کا دسواں بھی چھوڑ دیا تو ہلاکت کا خطرہ ہے مگر حدیث کا دوسرا جز صحیح نہیں ہو سکے گا کیونکہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے بھی فرائض اسلام کا ایک جز بھی چھوڑنا جائز نہیں چہ جائیکہ ۹ حصے چھوڑ کر دسویں پر عمل کریں اور کامیاب ہو جائیں۔ اور اگر مامور بہ سے مستحبات اور سنن مراد لیا جائے تو حدیث کا دوسرا حصہ تو صحیح رہے گا کہ سنتوں کے دسویں پر عمل کرنے والا بھی کامیاب ہے مگر حدیث کا پہلا حصہ صحیح نہیں رہے گا کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی سنتوں کے معاملہ میں عام امت کی طرح تھے۔ کیونکہ سنتیں چھوڑنے سے آدمی وعید و تہدید کے اس درجہ میں نہیں آتا ہے خواہ وہ دور اول کے لوگ ہوں یا دور ثانی کے ہوں۔

اس سوال کا جواب شارحین نے یہ دیا ہے کہ یہاں ماموارت سے عام ماموارت اور فرائض مراد نہیں بلکہ یہاں امر بالمعروف ونہی عن المنکر مراد ہے۔ جس کو دوسرے الفاظ میں امورِ تبلیغ سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ تو فرمایا کہ امر بالمعروف اور تبلیغ کے حوالے سے تم ایسے زمانے میں ہو کہ اگر ایک جز بھی چھوڑ دیا تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ کیونکہ اس وقت حق کے حامی زیادہ ہیں اور عہد نبوی کا مبارک دور ہے اگر تم دین کی تبلیغ واشاعت میں سستی کرو گے تو اسلام جزیرۂ عرب میں محدود ہو کر رہ جائے گا۔[5] خلاصہ یہ ہے کہ انصار اسلام بھی زیادہ تھے اور مخلص بھی تھے اور ضرورت تبلیغ بھی زیادہ تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان بھی

---

[1] المرقات ۱/۲۲۴ [2] المرقات ۱/۲۲۴ [3] المرقات ۱/۲۲۴ اشعة المعات ۱/۱۵۵ [4] اخرجه الترمذی: ۲۲۶۷ [5] المرقات ۱/۲۲۵

عالی تھی تو ان سے دس بٹے دس کا مطالبہ کیا گیا بعد میں اسلام کے حامی برائے نام رہ گئے، اخلاص وقربانی بھی کم ہوکر رہ گئی، اعمال بھی کمزور ہو گئے اور دین اسلام بھی پھیل گیا اور انصار اسلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہ جیسے نہ رہے تو فرمایا کہ وہ لوگ اگر دین کے اس شعبہ میں امر بالمعروف کے دسویں حصے پر بھی عمل کریں تو کامیاب ہوجائیں گے۔

اگر ہدایت ہاتھ سے چلی گئی تو جھگڑے رہ جائیں گے

﴿۳۹﴾ وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوْا عَلَيْهِ إِلَّا أُوْتُوا الْجَدَلَ ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ هٰذِهِ الْاٰيَةَ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ۔

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه)[۱]

ترجمہ: حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہدایت پانے اور ہدایت پر قائم رہنے کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی مگر (اس وقت جب) اس میں جھگڑا پیدا ہوا'' پھر آنحضرت ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ (**ما ضربوه لك الا جدلا بل هم قوم خصمون**) ترجمہ: وہ تمہارے لئے نہیں بیان کرتے مثال مگر جھگڑنے کے لئے بلکہ وہ جھگڑالو قوم ہی ہے۔

(احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

توضیح: الجدل: یعنی لوگ جب سنت چھوڑنے کی وجہ سے گمراہ ہوجاتے ہیں۔ تو بطور سزا اور عذاب ان کو جدل، جھگڑا اور تنازعہ بدلے میں دے دیا جاتا ہے پھر وہ عناد اور تعصب سے اپنے مؤقف کی بے جا حمایت کرتے ہیں۔ مکابرہ و محاربہ پر اتر آتے ہیں جو حرام ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جدل سے مراد عناد اور جھگڑے ہیں اور اسی طرح اپنے مذہب اور مسلک کی ترویج کے لئے تعصب کرنا جدل ہے۔ اپنے مشائخ اور بزرگوں کی رائے اور ان کے اقوال پر سختی سے کاربند رہنا جبکہ شریعت ان کے اقوال وافعال کی تائید نہیں کرتی ہو۔ یہ جدل ہے جو حرام ہے۔

ہاں اگر کسی مسئلہ کی وضاحت کے لئے یا صحیح صورتحال جاننے کے لئے یا معلومات میں اضافہ کی غرض سے یا سامعین کو تعلیم دینے یا آگاہ کرنے کی غرض سے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ممنوع جدال میں داخل نہیں ہے۔[۲]

ما ضربوه لك الا جدلا: یعنی آپ کے مقابلے میں کہا کہ **أ آلهتنا خير ام هو**، اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ انہوں نے بطور جدال ایک جھگڑا کھڑا کر دیا ہے۔[۳]

اعمال میں تشدد اختیار کرنے سے اجتناب کرو

﴿۴۰﴾ وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ فَيُشَدِّدُ اللهُ عَلَيْكُمْ فَإِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللهُ عَلَيْهِمْ فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ فِي

---

[۱] اخرجه احمد ۵/۲۵۲ والترمذی: ۳۲۵۳ وابن ماجه ۴۸ [۲] المرقات ۱/۴۲۶ والكاشف ۱/۳۷۶ [۳] المرقات ۱/۴۲۶

الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ رَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ۔ (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ)[1]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "تم اپنے نفس پر سختی نہ کرو اس لئے کہ پھر خدا بھی تم پر سختی کرے گا، ایک قوم (یعنی بنی اسرائیل) نے اپنے نفس پر سختی کی تھی چنانچہ اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ پس آج جو لوگ صومعوں اور دیار میں پائے جاتے ہیں یہ انہی لوگوں نے پیدا کیا ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی"۔ (ابوداؤد)

توضیح: لا تشددوا: یعنی مستحبات کے ترک پر تشدد اور سختی مت کرو کیونکہ زمانہ وحی میں تشدد اختیار کرنے کا یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ حکم فرض ہو جائے گا اور پھر اس کو پورا کرنے کی بھی طاقت نہ ہوگی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہود و نصاریٰ کی مثال بھی دی کہ انہوں نے اپنے اوپر سختی کر کے رہبانیت اختیار کی چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے انہیں اپنی نگرانی میں پال کر راہب بنایا اور زمین پر پیروں سے چلنے کے بجائے منہ کے بل چلتے پھرتے تھے۔ عورتوں سے قریب ہونے کو گناہ اور بڑی معصیت سمجھتے تھے اور بالوں سے اپنے آپ کو روزانہ چھت کے ساتھ باندھا کرتے تھے۔ ہنسلی کی ہڈی میں سوراخ کر کے رسیوں سے اپنے آپ کو چھت کے ساتھ باندھا کرتے تھے۔ لذائذ اکل وشرب سے اور مجامعت نساء سے اپنے آپ کو دور رکھا کرتے تھے۔[2]

صومعہ: نصاریٰ کے راہب کی کوٹھری کو کہتے ہیں جمع صوامع، دیار کی جمع دَیز ہے۔ یہود کی اصطلاح میں ان کے عبادت خانہ کو کہتے ہیں۔[3]

بقایاھم یعنی ذریتھم وبقیتھم: یعنی خالی مکانات اور غاروں میں بمنزلہ آثار قدیمہ چند راہب رہ گئے باقی پوری ملت ہی ختم ہو گئی۔[4]

رھبانیۃ: یہ لفظ ابتدعوا عامل کی وجہ سے منصوب ہے، بیوی بچوں اور عام معاشرہ کو چھوڑ کر غاروں میں عبادت کے لئے تنہا زندگی گذارنے کے عمل کو رہبانیت کہتے ہیں عیسائیوں نے اس بدعت کو اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے، اسلام اس طرح زندگی گذارنے کی اجازت نہیں دیتا، کسی شاعر نے بہت اچھا شعر کہا ہے:[5]

مصلحت در دینِ ما جنگ وشکوہ مصلحت در دینِ عیسیٰ غار وکوہ

قرآن پر عمل کرنے کا طریقہ

﴿۴۱﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلَى خَمْسَةِ أَوْجُهٍ حَلَالٍ وَحَرَامٍ وَمُحْكَمٍ وَمُتَشَابِهٍ وَأَمْثَالٍ فَأَحِلُّوا الْحَلَالَ وَحَرِّمُوا الْحَرَامَ وَاعْمَلُوا بِالْمُحْكَمِ وَآمِنُوا بِالْمُتَشَابِهِ وَاعْتَبِرُوا بِالْأَمْثَالِ۔

(هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيحِ وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ وَلَفْظُهُ فَاعْمَلُوا بِالْحَلَالِ وَاجْتَنِبُوا الْحَرَامَ وَاتَّبِعُوا الْمُحْكَمَ۔)[6]

---

[1] اخرجه ابوداؤد: ۴/۲۷۸ [2] المرقات ۱/۴۲۷ [3] المرقات ۱/۴۲۸

[4] المرقات ۱/۴۲۷ [5] المرقات ۱/۴۶۷ [6] اخرجه

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قرآن کریم پانچ صورتوں پر نازل ہوا ہے۔ ① حلال ② حرام ③ محکم ④ متشابہ ⑤ امثال، لہٰذا تم حلال کو حلال جانو، حرام کو حرام جانو، محکم پر عمل کرو، متشابہ پر ایمان لاؤ اور امثال (قصوں) سے عبرت حاصل کرو"، یہ الفاظ مصابیح کے ہیں اور بیہقی نے جو روایت شعب الایمان میں نقل کی ہے اس کے یہ الفاظ ہیں۔ "لہٰذا حلال پر عمل کرو، حرام سے بچو، اور محکم کی پیروی کرو"۔

توضیح: متشابہ سے اگر مراد مقابل محکم ہے تو محکم پر عمل ہوگا اور متشابہ کو بلا تفتیش اور بلا کیف ماننا ہوگا اور یہ کہنا ہوگا "ما یلیق بشانه"۔ اور اگر متشابہ سے مراد یہ ہو کہ نہ صریح امر ہے نہ صریح نہی ہے دلائل میں تشابہ ہے کہ کچھ دلائل حلت کی طرف مشیر ہیں اور کچھ حرمت پر دلالت کرتے ہیں۔ تو اب اس کا فیصلہ مجتہد کر سکتا ہے کہ کس کو اجتہاد کی بنیاد پر ترجیح دے۔ عام لوگوں کو اس میں توقف کا حکم ہے۔ متشابہات پر کلام اس باب کی پہلی فصل میں ہوا ہے۔[1]

دین اسلام واضح مذہب ہے

﴿۴۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْاَمْرُ ثَلَاثَةٌ أَمْرٌ بَيِّنٌ رُشْدُهُ فَاتَّبِعْهُ وَأَمْرٌ بَيِّنٌ غَيُّهُ فَاجْتَنِبْهُ وَأَمْرٌ اُخْتُلِفَ فِيْهِ فَكِلْهُ إِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[2]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "امر تین طرح کے ہیں: ① وہ امر جس کی ہدایت ظاہر ہے اس کی پیروی کرو، ② وہ امر جس کی گمراہی ظاہر ہے اس سے بچو، ③ وہ امر جو مختلف فیہ ہے اس کو خدا کے سپرد کردو"۔ (احمد)

توضیح: **امر بین رشده:** یعنی جس کی ہدایت اور رشد واضح ہو جیسے فرائض صوم وصلوٰۃ۔[3]

امر بین غیه: یعنی ممنوع اور حرام ہونا بالکل ظاہر ہو جیسے شراب، سود، زنا وغیرہ۔[4]

وامر اختلف فیه: اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ اس کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ متشابہات میں سے ہے یا غیر متشابہات میں سے ہے۔ یا اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کا اس میں اپنی طرف سے اختلاف پایا گیا ہو جس کی وجہ سے اس کی حقیقت کا سمجھنا دشوار ہو گیا ہو کیونکہ اس کی اصل حقیقت گم ہو گئی ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو۔[5]

الفصل الثالث

اہلِ حق سے الگ ہونے کا نقصان

﴿۴۳﴾ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ الشَّيْطَانَ ذِئْبُ الْإِنْسَانِ كَذِئْبِ الْغَنَمِ يَأْخُذُ الشَّاذَّةَ وَالْقَاصِيَةَ وَالنَّاحِيَةَ وَإِيَّاكُمْ وَالشِّعَابَ وَعَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَالْعَامَّةِ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[6]

---

[1] المرقات ۱/۴۲۸ [2] اخرجه احمد [3] المرقات ۱/۴۲۹

[4] المرقات ۱/۴۲۹ [5] المرقات ۱/۴۲۹ والکاشف ۱/۳۷۹ [6] اخرجه احمد

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "شیطان آدمی کا بھیڑیا ہے جس طرح بکری کا بھیڑیا ہوتا ہے کہ وہ اس بکری کو اٹھالے جاتا ہے جو ریوڑ سے بھاگ نکلی ہو یا ریوڑ سے دور چلی گئی ہو یا ریوڑ کے کنارے پر ہو اور تم پہاڑ کی گھاٹیوں (یعنی گمراہی) سے بچو نیز جماعت اور مجمع کا ساتھ پکڑے رہو"۔ (احمد)

توضیح: ذئب الانسان: یہ تشبیہ افساد و اہلاک اور تباہی مچانے میں ہے کہ جس طرح بھیڑیا بکریوں کے لئے سبب ہلاکت و فساد ہے اسی طرح شیطان انسان کے لئے بمنزلہ بھیڑیا ہے۔ خصوصاً جب بکری ریوڑ سے الگ ہو جاتی ہے تو یہ ہلاکت و فساد زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتا ہے اسی طرح جب کوئی انسان جماعت حقہ سے الگ ہو جاتا ہے جمہور کا راستہ چھوڑ کر حق کی شاہراہ اعظم سے ہٹ کر طرح طرح کی گمراہیوں کی پگڈنڈیوں میں جا گھستا ہے تو شیطان کے لئے اس کا شکار کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ اہل حق کے کارواں کے ساتھ چلے تا کہ شیطان کے حملوں سے بچ جائے۔ دیگر احادیث میں سواد اعظم کے نام سے جس جماعت کا ذکر آیا ہے جماعت حقہ اسی کا نام ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک حق پر چلی آرہی ہے۔ جو تمام اہل باطل سے زیادہ ہے کیونکہ حق اور اہل حق تسلسل کے ساتھ آرہے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص صحابہ کی جماعت کو نظر انداز کرتا ہے تو وہ تابعین کی جماعت سے بھی محروم ہو جائے گا اور رفتہ رفتہ جماعت حقہ سے کٹ جائے گا جس طرح آنحضرت ﷺ نے بکریوں کی تین قسموں کا ذکر فرمایا ہے۔[1]

الشاذة: اس بکری کو کہتے ہیں جو غیر مانوس ہو کر جانوروں سے الگ ہو جائے۔[2]

القاصية: گھاس اور پانی کی تلاش میں دور نکل جانے والی بکری کو قاصیہ کہتے ہیں۔[3]

الناحية: غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے جب بکری ریوڑ سے الگ ہو جاتی ہے وہ ناحیہ کہلاتی ہے۔[4]

﴿۴۴﴾ وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوٗدَ)[5]

ترجمہ: اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی (یعنی ایک ساعت کے لئے بھی) جدا ہوا، اس نے اسلام کا پٹہ اپنی گردن سے نکال دیا"۔ (احمد ابوداؤد)

توضیح: من فارق الجماعة شبرًا: یعنی جماعت حقہ سے ایک بالشت جدا ہوا مطلب یہ کہ احکامات میں بہت تھوڑی مقدار میں الگ ہوا یا تھوڑے سے زمانے کے لئے الگ ہوا۔[6]

فقد خلع: یعنی اس نے گردن سے اسلام کا پٹہ نکال دیا یہ حکم تغلیظ و تشدید پر محمول ہے۔ یا اس سے مراد یہ ہیکہ جب الگ ہونا اس کی عادت ہے تو ایک نہ ایک دن وہ اسلام کو خیر باد کہہ دے گا۔ اور اس کا پٹہ گردن سے اتار پھینک دے گا۔[7]

---

[1] المرقات ۱/۴۳۰ [2] المرقات ۱/۴۳۰ [3] المرقات ۱/۴۳۰ [4] المرقات ۱/۴۳۰

[5] اخرجه احمد ۵/۱۸۰ و ابو داؤد: ۴۷۸۵ [6] المرقات ۱/۴۳۱ [7] المرقات ۱/۴۳۱

﴿۴۵﴾ وَعَنْ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهِ۔ (رَوَاهُ فِي الْمُوَطَّا)[1]

ترجمہ: حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے مرسلا روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے۔ وہ کتاب اللہ (قرآن مجید) اور سنت رسول اللہ (احادیث) ہیں''۔ (موطا)

توضیح: مرسلاً: مرسل اس روایت کو کہتے ہیں کہ کوئی تابعی براہ راست حضور اکرم ﷺ سے حدیث نقل کرے جیسے قال الاعمش قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اب یہاں یہ سوال ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تابعی نہیں بلکہ تبع تابعی ہیں۔ اب اس منقطع روایت کو مرسل کیسے کہہ دیا گیا؟ خطیب بغدادی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ توسعاً اور مسامحۃً فرمایا گیا۔

حدیث مرسل کی قبولیت میں اس طرح اختلاف ہے کہ اگر اس کے نقل کرنے والا راوی ثقہ ہو اور وہ ثقہ راوی سے روایت کرتا ہو تو امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ روایت مقبول ہوگی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مرسل روایت کی اگر دیگر صحیح روایات سے توثیق ہوتی ہو تو مقبول ہے ورنہ نہیں۔ یعنی کسی اور روایت سے اس کی توثیق وتائید ہوتی ہو خواہ خود وہ روایت مرسل کیوں نہ ہو۔[2]

ما تمسکتم بهما: یعنی جب تک تم مضبوطی سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو پکڑے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ساتھ ہدایت فراہم کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اب ہدایت کس صورت میں مہیا ہوگی؟ جبکہ نبی کریم ﷺ کی نبوت آخری نبی کی نبوت ہے، نیا کوئی نبی نہیں آسکتا ہے۔ لہٰذا ہدایت کے جاری رہنے کا حضور ﷺ نے یہ اعلان فرمایا کہ قرآن کریم اور میری سنت یعنی احادیث مقدسہ میرے بعد ہدایت کے لئے ہدایت کا سامان ہے اور قرآن کریم چونکہ ہر قسم کی تحریفات سے پاک ہے، احادیث مبارکہ بھی قرآن عظیم کی برکت سے محفوظ ہیں تو جو کوئی ہدایت کے ان سرچشموں کو مضبوط پکڑے گا وہ گمراہی سے بھی بچا رہے گا۔[3]

۲۴ محرم ۱۴۱۰ھ

بدعت کی نحوست

﴿۴۶﴾ وَعَنْ غُضَيْفِ بْنِ الْحَارِثِ الثُّمَالِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا أَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً إِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِنْ إِحْدَاثِ بِدْعَةٍ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[4]

[1] اخرجه موطا ۸۹۹ [2] المرقات ۱/۴۳۱ [3] المرقات ۱/۴۳۱ [4] اخرجه احمد: ۴/۱۰۵

ترجمہ: حضرت غضیف بن حارث ثمالی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب کوئی قوم (دین میں) نئی بات نکالتی ہے (یعنی ایسی بدعت جو سنت کے مزاحم ہو) تو اس کے مثل ایک سنت اٹھالی جاتی ہے لہٰذا سنت کو مضبوط پکڑنا نئی بات نکالنے (یعنی بدعت) سے بہتر ہے"۔ (احمد)

توضیح: الّا رفع: یعنی بدعت کے لانے اور اس کو رواج دینے سے اس کی مانند ایک سنت اٹھالی جائے گی۔ کیونکہ بدعت سنت کی ضد ہے اور جب بدعت کا غلبہ ہوجائے گا تو سنت اٹھ کر چلی جائے گی اور اسی طرح اس کا عکس ہے کہ جب بطور غلبہ سنت عام ہوجائے گی تو بدعت مٹ کر ختم ہوجائے گی یہ دونوں ضدیں ہیں جو یکجا جمع نہیں ہوسکتیں۔ [1]

فتمسك بسنة: یعنی سنت کو مضبوطی سے پکڑنا ایجاد بدعت سے بہتر ہے۔ یہاں لفظ خیر اسم تفضیل کے معنی میں نہیں بلکہ اصل صیغہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے "**الصيف احر من الشتاء**" یہاں **مثلها** کا لفظ ضدین کی نسبت تضاد کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ [2]

یہاں "**سنة**" میں تنوین تقلیل کے لئے ہے۔ یعنی چھوٹی سنت یا قلیل سنت "**بدعة**" یعنی بڑی بدعت تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ [3]

بدعت اپنانے والوں سے سنت چھینی جاتی ہے

﴿۴۷﴾ وَعَنْ حَسَّانَ قَالَ مَا ابْتَدَعَ قَوْمٌ بِدْعَةً فِيْ دِيْنِهِمْ اِلَّا نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ سُنَّتِهِمْ مِثْلَهَا ثُمَّ لَا يُعِيْدُهَا اِلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ) [4]

ترجمہ: حضرت حسان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "جب کوئی قوم اپنے دین میں نئی بات (یعنی ایسی بدعت سیئہ جو سنت کے مزاحم ہو) نکالتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی سنت میں سے اس کا مثل نکال لیتا ہے (یعنی جب کوئی بدعت سیئہ پیدا ہوتی ہے تو اس کے مثل سنت دنیا سے اٹھالی جاتی ہے) اور پھر وہ سنت قیامت تک اس کی طرف واپس نہیں کی جاتی"۔ (دارمی)

توضیح: ثم لا يعيدها اليهم: اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سنت اپنی جگہ پر پائیدار اور برقرار تھی اور اس نے درخت کی طرح زمین میں جڑیں پکڑلی تھیں پس جب اسے اکھیڑ کر زائل کردیا گیا تو وہ دوبارہ اس شکل میں قائم نہیں ہوسکتی ہے جس طرح ایک درخت زمین میں اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے۔ تو اکھیڑنے کے بعد وہ درخت اور اس کی جڑیں اپنی سابقہ اصلی حالت کی طرف واپس نہیں جاسکتی ہیں۔ اور نہ وہ درخت مضبوط ہوسکتا ہے۔ اسی طرح سنت مٹنے کے بعد دوبارہ اپنی پہلی حالت کی طرح مضبوط نہیں ہوسکتی ہے اگرچہ اس کو دوبارہ زندہ بھی کردیا جائے۔ [5]

بہرحال سزا کے طور پر ان سے بوجہ ناقدری یہ سنت چھین لی جاتی ہے پھر ان ناقدروں کو ان نعمتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم کردیا جاتا ہے۔

---

[1] المرقات ۱/۴۳۲ [2] المرقات ۱/۴۳۳ [3] المرقات ۱/۴۳۳ [4] اخرجه الدارمی: ۹۹ [5] المرقات ۱/۴۳۳

بدعتی کا اکرام کرنا بڑا گناہ ہے

﴿۴۸﴾ وَعَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ مَيْسَرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ أَعَانَ عَلَى هَدْمِ الْإِسْلَامِ۔ (رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ مُرْسَلًا)[1]

ترجمہ: حضرت ابراھیم بن میسرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جس شخص نے بدعتی کی تعظیم کی اس نے اسلام کے ستون کو گرانے میں اس کی مدد کی''۔ (بیہقی)

توضیح: من وقر: یعنی لوگوں میں اس کو مقبول بنادیا اس کی تعظیم کی اس کا اکرام واحترام کیا جس کی وجہ سے اس پر لوگوں کا اعتماد پیدا ہوگیا تو اس شخص نے اسلام کی سرحدات گرانے میں مدد کی۔[2]

ھدم الاسلام: ہر چیز اپنی حدود پر قائم رہتی ہے۔ اگر حدود نہیں تو وہ چیز بھی باقی نہیں رہتی بلکہ مٹ جاتی ہے۔ تو مبتدع آدمی اپنی بدعات اور نئی نئی چیزوں کو اسلام میں داخل کرنے سے اسلام میں نقب زنی کرتا ہے اور اس کی حدود کو گراتا ہے۔ وہ اپنی جہالت کے ذریعے سے سنت کو مٹاتا ہے اور اس کی جگہ بدعت کو لاتا ہے۔ تو ایسے بدعتی کو مقبول بنانا بعینہ اسلام کی عمارت ڈھانے کے مترادف ہے لہٰذا یہ شخص بھی اسلام کی حدود گرانے میں اس بدعتی کا معاون ہوا۔[3]

قرآن پر عمل کرنے والا گمراہ نہیں ہوتا

﴿۴۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَنْ تَعَلَّمَ كِتَابَ اللّٰهِ ثُمَّ اتَّبَعَ مَا فِيْهِ هَدَاهُ اللّٰهُ مِنَ الضَّلَالَةِ فِي الدُّنْيَا وَوَقَاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سُوْءَ الْحِسَابِ وَفِي رِوَايَةٍ قَالَ مَنِ اقْتَدٰى بِكِتَابِ اللّٰهِ لَا يَضِلُّ فِي الدُّنْيَا وَلَا يَشْقٰى فِي الْآخِرَةِ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْآيَةَ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى۔ (رَوَاهُ رَزِيْنٌ)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے کتاب اللہ کا علم حاصل کیا اور پھر اس چیز کی پیروی کی جو اس (کتاب اللہ) کے اندر ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں گمراہی سے ہٹا کر راہ ہدایت پر لگائے گا (یعنی اس کو ہدایت کے راستے پر ثابت قدم رکھے گا اور گمراہی سے بچائے گا) اور قیامت کے دن اس کو برے حساب سے بچائے گا۔ (یعنی اس سے مواخذہ نہیں ہوگا) اور ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے کتاب اللہ کی پیروی کی تو نہ وہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں بدبخت ہوگا (یعنی اسے عذاب نہیں دیا جائے گا) اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: **فمن اتبع ھدای فلا یضل ولا یشقی۔**
ترجمہ: جس شخص نے میری ہدایت (قرآن) کی پیروی کی نہ وہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت میں) بدبخت ہوگا۔ (رزین)

[1] اخرجہ البیھقی ۶۱/۷ [2] المرقات ۱/۴۳۳ [3] المرقات ۱/۴۳۴

اپنے ایمان کی حفاظت ہر آدمی کی ذمہ داری ہے

﴿۵۰﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً صِرَاطًا مُسْتَقِيْمًا وَعَنْ جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ سُوْرَانِ فِيْهِمَا أَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ وَعَلَى الْأَبْوَابِ سُتُوْرٌ مُرْخَاةٌ وَعِنْدَ رَأْسِ الصِّرَاطِ دَاعٍ يَقُوْلُ اِسْتَقِيْمُوْا عَلَى الصِّرَاطِ وَلَا تَعْوَجُّوْا وَفَوْقَ ذٰلِكَ دَاعٍ يَدْعُوْ كُلَّمَا هَمَّ عَبْدٌ أَنْ يَفْتَحَ شَيْئًا مِنْ تِلْكَ الْأَبْوَابِ قَالَ وَيْحَكَ لَا تَفْتَحْهُ فَإِنَّكَ إِنْ تَفْتَحْهُ تَلِجْهُ ثُمَّ فَسَّرَهُ فَأَخْبَرَ أَنَّ الصِّرَاطَ هُوَ الْإِسْلَامُ وَأَنَّ الْأَبْوَابَ الْمُفَتَّحَةَ مَحَارِمُ اللّٰهِ وَأَنَّ السُّتُوْرَ الْمُرْخَاةَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَأَنَّ الدَّاعِيَ عَلَى رَأْسِ الصِّرَاطِ هُوَ الْقُرْآنُ وَأَنَّ الدَّاعِيَ مِنْ فَوْقِهِ هُوَ وَاعِظُ اللّٰهِ فِيْ قَلْبِ كُلِّ مُؤْمِنٍ۔

(رَوَاهُ رَزِيْنٌ وَأَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ وَكَذَا التِّرْمِذِيُّ عَنْهُ إِلَّا أَنَّهُ ذَكَرَ أَخْصَرَ مِنْهُ) [۱]

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے (وہ یہ ہے کہ) ایک سیدھا راستہ ہے اور ان کے دونوں طرف دیواریں ہیں اور ان دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور راستے کے سرے پر پکارنے والا کھڑا ہوا ہے جو پکار پکار کر کہتا ہے ''سیدھے راستے پر چلے آؤ، غلط راستے پر نہ لگو''۔ اس پکارنے والے کے اوپر (یعنی اس کے آگے کھڑا ہوا) ایک دوسرا پکارنے والا ہے جب کوئی بندہ ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتا ہے تو وہ (دوسرا پکارنے والا) پکار کر کہتا ہے ''تجھ پر افسوس ہے! اس کو نہ کھول اگر تو اس کو کھولے گا تو اس کے اندر داخل ہو جائے گا'' (اور وہاں سخت تکلیف میں ہوگا) پھر آنحضرت ﷺ نے اس مثال کی وضاحت فرمائی اور فرمایا ''سیدھے راستے سے مراد اسلام ہے (جس کو اختیار کر کے لوگ جنت میں پہنچتے ہیں) اور کھلے ہوئے دروازوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ پاک نے حرام قرار دیا ہے۔ (جس کو اختیار کرنا تکمیل اسلام کے منافی ہے'' اور (دروازوں پر) پڑے ہوئے پردوں سے مراد اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود ہیں اور راستے کے سرے پر پکارنے والا جو کھڑا ہے اس سے مراد قرآن کریم ہے اور وہ دوسرا پکارنے والا جو پہلے پکارنے والے کے آگے کھڑا ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت کرنے والا فرشتہ ہے جو ہر مومن کے دل میں ہے''۔　　(رزین، احمد، بیہقی، ترمذی)

توضیح: ''ستور'': پردے کو کہتے ہیں [۲] اور ''مرخاۃ'' لٹکنے کو کہتے ہیں۔ یعنی لٹکے ہوئے پردے دروازوں پر پڑے ہیں۔ [۳]

ولا تعوجوا: یعنی غلط راستے پر نہ چلو۔ [۴] **تلجه:** یعنی تم اس میں داخل ہو جاؤ گے۔ [۵]

---

[۱] اخرجه احمد ۴/۱۸۲ والبیهقی: ۵/۴۴۴ [۲] المرقات ۱/۴۳۵ [۳] المرقات ۱/۴۳۵ [۴] المرقات ۱/۴۳۵ [۵] المرقات ۱/۴۳۶

واعظ اللہ: اس سے مراد وہ فرشتہ ہے جو ہر مومن کے دل میں ہوتا ہے اور مومن کے دل میں بھلائی کا الہام کرتا رہتا ہے۔ اس کی پوری تفصیل باب الوسوسہ میں گزر چکی ہے۔[1]

بہر حال پوری حدیث ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ انسان کا ایک خفیہ دشمن ہے جس کا نام شیطان ہے۔ جو ہر وقت ہماری تاک میں بیٹھا رہتا ہے کہ ذرا یہ مسلمان اہل حق کی جماعت سے ادھر ادھر ہو جائے تو شیطان اسے مکمل طور پر ہلاک کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پوشیدہ دشمن کے لئے فرشتوں کا ایک خفیہ پہرہ بٹھا رکھا ہے۔ جو بھلائی کی نصیحت اور الہام کرتا رہتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان

﴿۵۱﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْمَاتَ فَإِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ أُولٰئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا أَفْضَلَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَبَرَّهَا قُلُوْبًا وَأَعْمَقَهَا عِلْمًا وَأَقَلَّهَا تَكَلُّفًا اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلِإِقَامَةِ دِيْنِهٖ فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰى أَثَرِهِمْ وَتَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ أَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ فَإِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيْمِ۔ (رواہ رزین)

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی طریقے کی پیروی کر رہا ہے تو اس کو چاہئے کہ ان لوگوں کی راہ اختیار کرے جو مر گئے ہیں کیونکہ زندہ آدمی (دین میں) فتنہ سے محفوظ نہیں ہوتا اور وہ لوگ جو مر گئے ہیں (اور جن کی پیروی کرنی چاہئے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جو اس امت کے بہترین لوگ تھے، دلوں کے اعتبار سے انتہا درجے کے نیک، علم کے اعتبار سے انتہائی کامل اور بہت کم تکلف کرنے والے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لئے منتخب کیا تھا لہٰذا تم ان کی بزرگی کو پہچانو اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرو اور جہاں تک ہو سکے ان کے آداب و اخلاق کو بھی اختیار کرتے رہو (اس لئے کہ) وہی لوگ ہدایت کے سیدھے راستے پر ہیں۔" (رزین)

توضیح: مستنًا: استنان کسی کی پیروی اور کسی کے نقش قدم پر چلنے کو کہا جاتا ہے۔ اسی سے سنت ہے۔[2]

اعمقها علمًا: ای اکثرها غورًا فی حقائق العلم۔ یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا علم وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ گہرا اور عمیق بھی تھا۔ ہر صحابی علم و معرفت، فہم و فراست، تدبر و تفکر، عقل و دانش کا مینارۂ نور تھا۔ جن سے دنیا کے ظلم زدہ اور جہالت کدہ انسانوں نے تعلیم و ترقی، تہذیب و شرافت اور عظمت و انسانیت کا درس لیا۔ چنانچہ کوئی صحابی تفسیر و حدیث میں یکتا تھا تو کوئی فقہ و قرأت کا امام تھا کوئی تصوف کا علمبر دار تھا تو کوئی علم الفرائض اور علم الحلال والحرام کا امام تھا۔[3]

واقلها تكلفًا: یعنی علم و عرفان کے جبال ہونے کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ خواہ وہ عالی منصب پر فائز ہی کیوں نہ ہوں انہیں ننگے پاؤں پھرنے میں کوئی عار نہ تھا اور نہ زمین کے فرش پر نماز پڑھنے یا بیٹھنے لیٹنے

[1] المرقات ۱/۴۳۶ والکاشف ۱/۳۸۳ [2] المرقات ۱/۴۳۷ [3] المرقات ۱/۴۳۸

میں کوئی شرم محسوس ہوتی تھی۔ایک برتن میں دس دس مل کر کھانا کھاتے تھے اور موٹے موٹے کپڑے پہنتے تھے۔حلال کھانا جس قسم کا بھی آیا بلا تکلف کھایا جو کپڑا میسر ہوا اس کو پہن لیا۔غرض بناوٹ اور تکلف سے اتنے دور تھے کہ جس سے آگے کا تصور ناممکن تھا۔[1]

بہر حال عبادات ہوں یا معاملات، اخلاق و عادات ہوں یا معیشت و معاشرت، زندگی کے ہر پہلو میں ان کے ہاں خلوص و بے تکلفی اور سادگی تھی۔

فاعرفوا: یعنی ان کی فضیلت کو جان لو پہچان لو اس کا اعتراف کر لو اور ان کی پیروی کرو کیونکہ وہ ہدایت کی شاہراہ اعظم پر تھے۔

یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی گواہی ہے جو اپنے ساتھیوں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بارے میں آپ نے چند صحابہ اور عام تابعین کے سامنے بطور معیار اور کسوٹی دی۔[2]

بمن قد مات: اس سے آپ رضی اللہ عنہ نے ان صحابہ کرام کو مراد لیا جو دنیا سے انتقال کر گئے تھے اور **الحی:** سے آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے کے تابعین مراد لئے ہیں اس گواہی کے بعد کسی دشمن صحابہ کی کسی غلط بات کا اعتبار نہیں ہے۔[3]

یہ دور صرف اسلام کا دور ہے

﴿۵۲﴾ وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَتٰى رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنُسْخَةٍ مِنَ التَّوْرَاةِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ هٰذِهٖ نُسْخَةٌ مِّنَ التَّوْرَاةِ فَسَكَتَ فَجَعَلَ يَقْرَأُ وَوَجْهُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَغَيَّرُ فَقَالَ أَبُوْ بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ ثَكِلَتْكَ الثَّوَاكِلُ مَا تَرٰى مَا بِوَجْهِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَظَرَ عُمَرُ إِلٰى وَجْهِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ غَضَبِ اللهِ وَغَضَبِ رَسُوْلِهٖ رَضِيْنَا بِاللهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ بَدَا لَكُمْ مُوْسٰى فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَكْتُمُوْنِيْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِيْ لَاتَّبَعَنِيْ. (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[4]

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر ابن خطاب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تورات کا ایک نسخہ لے کر آئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ! یہ تورات کا نسخہ ہے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تورات کو پڑھنا شروع کر دیا ادھر (غصہ) سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہونے لگا (یہ دیکھ کر) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا عمر! گم کرنے والیاں تمہیں گم کریں۔کیا تم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کو نہیں دیکھتے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مقدس کی طرف نظر ڈالی اور (غصہ کے آثار دیکھ کر) کہا "میں اللہ کے غضب اور اس کے رسول کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں ہم اللہ

---

[1] المرقات ۱/۴۳۸ [2] المرقات ۱/۴۳۹ [3] المرقات ۱/۴۴۰ [4] اخرجه الدار قطنی ۱۳۵/۴

کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہیں"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات پاک کی کہ جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اگر موسیٰ تمہارے درمیان ظاہر ہوتے اور تم ان کی پیروی کرتے اور مجھے چھوڑ دیتے تو تم سیدھے راستے سے بھٹک کر گمراہ ہو جاتے اور (حالانکہ) اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور میرا زمانہ نبوت پاتے تو وہ (بھی) یقینا میری (ہی) پیروی کرتے"۔ (دارمی)

توضیح: ثکلتك الثواكل: ثکل کاف کے کسرہ کے ساتھ گم کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ **ثواكل ثاكلة** کی جمع ہے اس عورت کو کہتے ہیں جس کا بچہ گم ہو چکا ہو یا ہلاک ہو چکا ہو اور وہ زار وقطار رو رہی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تجھے گم کرنیوالی مائیں گم کردیں، یا بہنیں یا بیٹیاں گم کردیں۔

یہ محاورۂ عرب کے تحت عام گفتگو میں بولا جاتا ہے اس سے حقیقی معنی مراد نہیں لیا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ علم کے حریص اور شوقین تھے۔ حکمت ومعرفت کے قدردان تھے۔ یہود کے ہاں کبھی کبھی آتے جاتے تھے۔ پہلے کچھ نیک باتوں کو سننے کی اجازت مانگی تھی اب کچھ اچھی باتیں سنانے لگے خیال کیا کہ شاید یہ غیر محرف اور **منزل من الله** تورات کا حصہ ہوگا۔ آپ کو یہ خیال نہ تھا کہ حضور ﷺ غصہ ہو رہے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے خیالی میں پڑھتے رہے۔ تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رونے والی عورتیں تجھے روئیں یعنی تو گم ہو جائے، کسی فعل کے انکار پر اور ناراضگی کے وقت یہ جملہ محاورۂ عرب میں بولا جاتا ہے تو یہاں صرف انکار اور تعجب کے لئے استعمال ہوا ہے۔[1]

فنظر عمر: حضرت عمر تو پھر عمر تھے۔ **مُلْهَم ومحدث** تھے **اشدهم فى امر الله عمر** تھے فوراً توبہ کی اور غضب الٰہی اور غضب رسول ﷺ سے تعوذ کرتے رہے۔ آنحضرت ﷺ کا غصہ اسی سے ٹھنڈا ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو میری اطاعت کے سوا چارۂ کار نہیں تھا کیونکہ یہ دین اسلام کا دور ہے۔[2]

مورخہ ۲۵ محرم ۱۴۱۰ھ

ناسخ اور منسوخ کا مسئلہ

﴿۵۳﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ كَلَامِي لَا يَنْسَخُ كَلَامَ اللهِ وَكَلَامُ اللهِ يَنْسَخُ كَلَامِي وَكَلَامُ اللهِ يَنْسَخُ بَعْضُهُ بَعْضًا۔[3]

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "میرا کلام اللہ تعالیٰ کے کلام کو منسوخ نہیں کرتا اور کلام اللہ میرے کلام کو منسوخ کر دیتا ہے اور کلام اللہ کا بعض حصہ بعض کو منسوخ کر دیتا ہے"۔

توضیح: لغت میں نسخ کا معنی نقل کرنا مٹانا لکھنا وغیرہ آتا ہے۔ اور اصطلاح میں نسخ کی تعریف اس طرح ہے:
رفع الحکم الشرعی بدلیل شرعی متأخر۔ یعنی سابق شرعی حکم کو آنے والی دلیل سے اٹھانا ہٹانا۔

[1] المرقات ۱/۴۴۰ [2] المرقات ۱/۴۴۰ [3] اخرجه الدارمی: ۲/۴۱۵

کلامی لا ینسخ کلام اللہ: نسخ کی کل چار صورتیں ہیں:

❶ قرآن کریم قرآن کے لئے ناسخ ہو۔

❷ حدیث حدیث کے لئے ناسخ ہو۔

❸ قرآن کریم حدیث کے لئے ناسخ ہو۔

❹ حدیث شریف قرآن کریم کے لئے ناسخ ہو۔

پہلی تین صورتوں میں امت کا اتفاق ہے آخری صورت میں اختلاف ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حدیث سے قرآن کا نسخ جائز نہیں ہے۔
امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حدیث مشہور سے نسخ قرآن واقع ہو جاتا ہے۔ یہ حدیث بظاہر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ واحمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہے لیکن اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہاں کلامی سے مراد کلام اجتہادی ہے۔ جس سے نسخ کلام اللہ نہیں ہوسکتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ میرا کلام اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت کو منسوخ نہیں کرتا حکم کو منسوخ کرتا ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث خود منسوخ ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں ایک راوی جبرون بن واقد ہے جو نہایت ضعیف بلکہ **متہم بالکذب** ہے۔ لہٰذا یہ روایت نا قابل احتجاج ہے کیونکہ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ سنت مشہورہ متاخرہ سے کلام اللہ میں نسخ آسکتا ہے۔ [1]

سوال: بعض جہال یہ اعتراض کرتے ہیں کہ نسخ کے بارے میں ہم پوچھتے ہیں کہ پہلا نازل کردہ حکم صحیح تھا یا غلط تھا اگر صحیح تھا تو منسوخ کیوں ہوا؟ اور اگر غلط تھا تو پہلے سے کیسے نازل ہوا؟

جواب: اس کا جواب واضح ہے کہ نسخ کا مدار حکمت پر ہے۔ اور حکیم کی حکمت پر اعتراض نادانوں کا کام ہے۔ دیکھو مثلاً ایک مریض کو ایک حکیم ایک وقت میں ایک نسخہ دیتا ہے۔ اور دوسرے وقت میں وہی طبیب اس نسخے کو تبدیل کرتا ہے تو کیا یہ پہلا نسخہ غلط تھا یا غیر مفید تھا؟ نہیں بلکہ طبیب نے مریض کے مزاج کے مطابق نسخہ تبدیل کیا ہے۔ اسی طرح حالات و واقعات اور ضرورت کے تغیر سے نزول وحی کے دوران حکم میں تغیر آتا رہتا ہے۔ نماز وروزہ کے احوال میں تغیر آیا ہے۔ جہاد میں تعداد مقاتلین میں تغیر آگیا ہے تو یہ تغیر اور نسخ ہمارے علم کے اعتبار سے تھا اللہ تعالیٰ کے ہاں تو یہ حکم نزول کے وقت سے اتنے ہی وقت کے لئے اترا تھا جس وقت میں یہ منسوخ ہوگیا ہے بہر حال نسخ ہماری نسبت سے ہے، نیز نسخ کا ذکر قرآن عظیم میں اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔

﴿۵۰﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَادِيْثَنَا يَنْسَخُ بَعْضُهَا

---

[1] المرقات ۱/۴۴۱

بَعْضًا كَنَسْخِ الْقُرْآنِ۔ [1]

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہماری (بعض) احادیث بعض کو اس طرح سے منسوخ کرتی ہیں جیسا کہ (قرآن کے بعض حصوں کو) قرآن منسوخ کرتا ہے۔

توضیح: **كنسخ القرآن:** لفظ نسخ یہاں مصدر واقع ہوا ہے جو قرآن کی طرف مضاف ہے۔ اب اگر اس مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے تو ترجمہ اس طرح ہوگا جیسا کہ قرآن کا بعض حصہ بعض کو منسوخ کرتا ہے۔ اور اگر اضافت مفعول کی طرف ہو جائے تو ترجمہ اس طرح ہوگا کہ ہماری احادیث آپس میں ایک دوسرے کو ایسے ہی منسوخ کرتی ہیں۔ **كنسخ القرآن:** جس طرح کہ یہ حدیثیں قرآن کو منسوخ کرتی ہیں۔ اس ترجمہ کے مطابق یہ حدیث ماسبق حدیث کے لئے ناسخ بن جائے گی۔ اور پھر یہ احناف اور مالکیہ کی دلیل بن جائے گی لیکن اس روایت میں بھی ایک راوی محمد بن حارث کاذب ہے۔ [2]

حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو

﴿۵۴﴾ وَعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِنَّ اللهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا۔ (رَوَى الْأَحَادِيْثَ الثَّلَاثَةَ الدَّارَقُطْنِيُّ) [3]

ترجمہ: حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے چند فرائض کو فرض کیا ہے لہٰذا تم ان کو ضائع نہ کرو۔ (یعنی ان کو نہ چھوڑو یا ان کے شرائط و امکان کو ترک نہ کرو۔ یا یہ کہ ان فرائض میں نمائش وریا شک وشبہ اور غرور و تکبر نہ کرو) اور چند چیزیں اللہ پاک نے حرام قرار دی ہیں۔ (یعنی ان کو اختیار کرنا گناہ قرار دیا ہے) لہٰذا تم ان کے نزدیک بھی مت جاؤ۔ اور چند حدود مقرر کی ہیں۔ (مثلاً حدود و قصاص وغیرہ) لہٰذا تم ان سے تجاوز مت کرو۔ (یعنی ان میں اپنی طرف سے کمی وزیادتی مت کرو) اور چند چیزوں کے بارے میں بھول کر نہیں (بلکہ دانستہ) سکوت اختیار کیا ہے (یعنی کتنی چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ وہ حرام ہیں یا حلال اور یا واجب ہیں) لہٰذا ان چیزوں میں تم (اپنی طرف سے) بحث نہ کرو"۔ (مذکورہ تینوں حدیثیں دارقطنی نے روایت کی ہیں)۔

بدعت کی مثال

باب الاعتصام بالكتاب والسنة: کی یہ آخری حدیث ہے ان تمام احادیث سے روز روشن کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دین اسلام میں اپنی پسند کی چیز داخل کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ کیونکہ ہر زمانے میں کچھ لوگ ایسے آئے ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے کہ خواہشات سے مغلوب ہو کر انہوں نے اپنی پسند کی خواہشات کو اسلام کے ساتھ بطور

[1] اخرجه الدارقطنی ۴/۱۴۵ [2] المرقات ۱/۲۴۲ [3] اخرجه الدارقطنی ۴/۱۸۴

پیوند جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اسلام اپنی حدود و سرحدات کو سختی سے محفوظ نہ رکھتا تو نہ معلوم کتنے خواہش پرستوں کی کتنی خواہشات دین کا حصہ بن چکی ہوتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ لہٰذا اس امت میں ایسے علماء موجود ہیں جو ہر بدعت پسند شخص کی بدعت کو قرآن و حدیث کے مضبوط اصولوں سے مسترد کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ بدعت ایسا جرم ہے جو نا قابل معافی ہے۔ اس کی مثال آپ یہ سمجھیں کہ ایک پوسٹ آفس ہے اس سے ڈاکیہ خطوط اور رسیدوں پر مشتمل ایک تھیلی دوسرے ڈاکخانہ تک پہنچاتا ہے اب اگر یہ ڈاکیہ اس مہر شدہ تھیلی کو کھول کر اندر سے کوئی خط نکال لیتا ہے تو بھی حکومت وقت کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ اور اگر وہ اس تھیلی میں ایک عمدہ خط اپنی طرف سے داخل کرتا ہے تو پھر بھی مجرم ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ اندر کے خطوط پر حکومت کا سرکاری ٹھپہ لگا ہوا ہے ڈاکیہ غیر تصدیق شدہ بغیر مہر کا لفافہ اس میں داخل کرتا ہے تو یہ بغاوت وخیانت کی طرح بہت بڑا جرم ہے۔

بدعت کی دوسری مثال آپ یہ سمجھیں کہ اگر کوئی شخص کسی حکومت میں جعلی سکہ بناتا ہے اور پھر اس پر جعلی ٹھپہ لگا کر رائج الوقت سرکاری سکہ میں اس کو داخل کر کے چلاتا ہے تو وہ شخص حکومت اور قانون کی نظر میں کتنا بڑا مجرم ٹھہرے گا؟

بالکل اسی طرح ایک بدعتی شخص ہے جو مستند شریعت میں اپنی طرف سے غیر مستند عمل داخل کرتا ہے اور پھر لوگوں کو دھوکہ دے کر اس مصنوعی عمل کو اصلی عمل کی صورت میں رائج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ یہ شخص خدا اور خدا کے رسول اور قانون اسلام کے نزدیک کتنا بڑا مجرم بنے گا؟ لہٰذا ہر مسلمان کو بدعات گھڑنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

وخير امور الدين ما كان سنة　　وشر الامور المحدثات البدائع

ترجمہ: دین اسلام میں بہترین چیزیں وہ ہیں جو سنت ہیں اور بدترین چیزیں من گھڑت بدعات ہیں۔

۸ صفر ۱۴۱۰ھ (بعد امتحان سہ ماہی)

کتاب العلم

علم اور اس کی فضیلت کا بیان

کتاب العلم ای تعلمه وتعلیمه وفضله وفضل تعلمه[1]

باب الاعتصام بالکتاب والسنة کے بعد کتاب العلم کا لانا تعمیم بعد التخصیص ہے کیونکہ علم میں بے پناہ وسعت اور عموم ہے۔ جس کے ضمن میں اعتصام بالکتاب والسنة بھی ہے۔ یہاں علم کی حقیقت و ماہیت سے بحث نہیں بلکہ احادیث میں علم کی جو فضیلت اور ضرورت آئی ہے اس سے بحث کرنی ہے۔[2]

علم کی تعریف:

علم لغت میں دانستن کو کہتے ہیں۔ اور علم کی اصطلاحی تعریف میں علماء کی دو رائے ہیں۔ علماء کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ علم کی تعریف یا بالکل نہیں ہو سکتی اور یا مشکل ترین چیز ہے۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"نعم تحقیق حقیقته عسیر جدًا"۔

یعنی علم کی تہہ اور حقیقت تک پہنچنا بہت ہی دشوار ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چونکہ علم "اجلی البدیهیات" میں سے ہے اس لئے یہ نا قابل تحدید و تعریف ہے۔

علماء کے دوسرے طبقے جمہور کا خیال ہے کہ علم کی تحدید و تعریف ممکن ہے اور علوِّ رتبہ کی وجہ سے یہ تعریفات اٹھارہ تک جا پہنچی ہیں۔ جس سے علم کی شان کی بلندی کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فلاسفہ کے ہاں ایک تعریف "حصول صورة الشیئ" ہے، ایک تعریف: "الصورة الحاصلة عند العقل" ہے۔ ایک تعریف: "الحاضر عند المدرك" ہے۔

اہل شرع کے ہاں بھی علم کی کئی تعریفات ہیں۔ چنانچہ ماتریدیہ نے علم کی تعریف اس طرح کی ہے:

1. العلم صفة مودعة فی القلب کالقوة الباصرة فی العین والسامعة فی الاذن"۔
2. علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح تعریف کی ہے: العلم صفة توجب تمییزاً لا یحتمل النقیض۔
3. ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے علم کی تعریف اس طرح فرمائی ہے:

"العلم نور فی قلب المؤمن مقتبس من مصابیح مشکوٰة النبوة من الاقوال المحمدیة

---

[1] المرقات ۱/۴۴۵ [2] المرقات ۱/۴۴۵

والافعال الاحمدية يهتدى به الى الله وصفاته واحكامه"۔ [1]

❹ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علم کی تعریف اس طرح سے فرمائی ہے: "معرفة النفس مالها وما عليها"۔ اس تعریف میں علم فقہ اور تصوف بھی داخل ہو گیا۔

علم کی اقسام

مطلق علم دو قسم پر ہے: اول مبادی دوم مقاصد

قسم اول: جیسے علم لغت، علم صرف، علم نحو، علم معانی و بیان اور علم اشتقاق وغیرہ۔

قسم دوم: جیسے علوم شرعیہ، احکام وعقائد وغیرہ

یہ شرعی علوم پھر دو قسم پر ہیں: اول کسبی، دوم وہبی۔ وہبی وہ علوم ہوتے ہیں کہ جن کے حصول میں انسان کے اکتساب کا دخل نہ ہو، یہ وہبی علوم پھر دو قسم پر ہیں: اول وہ کہ جو بغیر واسطہ بذریعہ وحی حاصل ہو جائیں یہ **علوم النبوۃ** ہیں۔

ثانی وہ کہ جو کمال اتباع نبی کی وجہ سے مل جائیں۔ یہ الہام وکشف وفراست پر مشتمل علوم ہوتے ہیں۔ الہام کے لئے علامات نہیں ہاں کشف وفراست کے لئے علامات ہوتی ہیں۔ [2]

دوسری قسم کسبی علوم ہیں۔ یہ کسب بشر سے بواسطہ بشر حاصل ہونے والے علوم ہیں جو **علوم الشرعیات** کہلاتے ہیں۔ اس میں ایک **علم الاحکام** ہے جس سے مقبول اور غیر مقبول میں امتیاز ہوتا ہے۔ اگر قبولیت ظاہر سے متعلق ہو تو یہ **علم الفقه** ہے اور اگر باطن سے متعلق ہو تو یہ **علم التصوف** ہے۔ تو علم تصوف بھی علوم کسبیہ میں داخل ہے۔

پھر جو اشیاء فرض ہیں ان کا علم بھی فرض ہے، جو سنت ہیں ان کا علم بھی سنت ہے، جو اعمال واجب ہیں ان کا علم بھی واجب ہے، جو اشیاء حرام ہیں ان کا علم فرض ہے، جو مکروہ تحریمی ہیں ان کا علم واجب ہے۔ جو مکروہ تنزیہی ہیں ان کا علم سنت ہے۔

"**طلب العلم فريضة**" سے مراد یہی ضروری علم ہے، باقی دینی امور کا ماہر ایک بڑے عالم دین کا وجود علاقے میں ضروری ہے۔ یعنی ایک جید عالم دین کا علاقہ میں ہونا فرض کفایہ ہے۔ اگر سب لوگوں نے اس ضرورت کو نظر انداز کیا تو سب کے سب گنہگار ہو جائیں گے۔ درجۂ فرض سے آگے بڑھ کر علوم میں کمال پیدا کرنا مستحب ہے۔ بہر حال آدمی جس حالت میں بھی ہو اس حالت کا علم کہ آیا یہ حالت جائز ہے یا ناجائز ہے۔ اتنا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ [3]

علم کی فضیلت پر قرآن پاک کی آیات اور احادیث مقدسہ کے واضح فرامین بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ اس سے جتنا ممکن ہو فائدہ اٹھالینا چاہئے۔

علم کی فضیلت میں حضرت سعدی بابا رحمۃ اللہ علیہ نے چند تقابلی ابیات کہے ہیں ملاحظہ ہوں:

صاحبدلے بمدرسہ آمد زخانقاہ بشکستہ عہد صحبت اہل طریق را

---

[1] المرقات ۱/۴۴۵ [2] المرقات ۱/۴۴۵ [3] المرقات ۱/۴۴۵

گفتم میان عابد و عالم چہ فرق بود | کہ تو کر دی اختیار ازاں ایں فریق را
گفت آں گلیم خویش بروں می بردز موج | وایں جہد میکند کہ بگیرد غریق را [1]

۹ صفر ۱۴۱۰ھ

الفصل الاوّل

علم کو عام کرواور جھوٹ کو نہ پھیلاؤ

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً وَحَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ. (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ) [2]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "میری طرف سے پہنچاؤ اگر چہ ایک ہی آیت ہو۔ اور بنی اسرائیل سے جو قصے سنو لوگوں کے سامنے بیان کرو۔ یہ گناہ نہیں اور جو شخص قصداً میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں ڈھونڈ لے۔ (بخاری)

توضیح: بلغوا عني: یعنی علوم میرے ہوں گے پھیلانا تمہارا کام ہے۔ میری بات مستند طریقہ سے دوسروں تک پہنچاؤ۔ [3]

ولو آیة: اس جملہ میں آیت کے لفظ کے دو مفہوم ہیں اول یہ کہ آیت سے مراد قرآنی آیت ہے۔ یعنی میری طرف سے قرآنی آیت بھی پہنچاؤ۔ اگر چہ اس کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ اور جب ایسی محفوظ آیت کی تبلیغ ضروری ہے تو پھر میری احادیث کی تبلیغ تو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آیت بمعنی نشانی اور خبر اور کلام مفید ہے۔ اس سے مراد احادیث کے علاوہ دین کی تمام باتیں ہیں۔ حسب موقع وضرورت اس کو پہنچانا ہر جاننے والے پر لازم ہے۔ "آیة" "**شئ قلیل**" پر بولا گیا ہے۔ یعنی خواہ کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو اس کو بھی پہنچاؤ۔ یہ لفظ "کان" محذوف کے لئے خبر ہے۔

بہر حال تبلیغ باب تفعیل سے ہے۔ اس کا مفعول پورا دین ہے۔ یعنی **تبلیغ الدین**، اور پہنچانے کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ پہنچانے والا پہلے اس کو خود سمجھ چکا ہے تب ہی تو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور جو شخص خود نہیں سمجھتا تو وہ دوسروں تک صحیح بات کو کیسے پہنچا سکتا ہے۔ "**لکل فن رجال**" بہر حال حدیث میں علم کو عام کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور جھوٹ پھیلانے سے منع کیا گیا ہے۔

وحدثوا عن بني اسرائیل: باب الاعتصام بالکتاب میں حدیث ۳۶ سے بظاہر اس حدیث کا تعارض ہے۔ کیونکہ وہاں شدت سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ نے توریت کے اوراق پڑھنے سے منع کیا ہے۔

[1] اخرجه البخاری ۴/۲۰۷ [2] المرقات ۱/۴۴۶ [3] المرقات ۱/۴۴۶، ۴۴۷

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی حدیث میں جو ممانعت آئی ہے وہ احکام کے نقل کرنے سے متعلق ہے۔ اور یہاں جو اجازت ہے یہ قصص مواعظ و امثال کے نقل کرنے کی اجازت ہے جو تاریخی اعتبار سے منقول ہیں یا قرآن و حدیث میں بنی اسرائیل کے واقعات کا جو ذکر عبرت و نصیحت کے لئے آیا ہے اس کے بیان کرنے کی اجازت ہے احکام بیان کرنے کی نہیں کیونکہ وہ منسوخ ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر جو سرزنش ہوئی وہ اس لئے کہ وہ نسخہ تحریف شدہ تھا۔

حدیث گھڑنے کی شدید وعید:

فلیتبوأ: یہ امر انشاء بمعنی خبر ہے۔ یعنی اس شخص نے اپنے لئے دوزخ میں ٹھکانہ تیار کر لیا۔ اس حدیث میں احادیث گھڑنے کی شدید وعید آئی ہے۔ اسی کے پیشِ نظر علامہ ابو محمد جوینی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث گھڑنے والے کو کافر قرار دیا ہے۔ لیکن جمہور امت نے اس کو بہت بڑا گناہ کہا ہے۔ یعنی اگر کوئی اس گھڑنے کو جائز کہتا ہے پھر تو یہ کفر ہے ورنہ نہیں۔

جمہور امت اس پر بھی متفق ہیں کہ وضع حدیث مطلقاً ناجائز ہے۔ خواہ نیک ارادے سے ہو یا کسی بھی ارادہ سے ہو۔ بعض جاہل صوفی سمجھتے ہیں کہ ترغیب و ترہیب کے لئے حدیث گھڑنا جائز ہے۔ اس میں دین کا فائدہ ہے۔ لوگوں کو فائدہ ہے کوئی نقصان نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دین اسی راستے سے آتا ہے جو دین کا راستہ ہو بے دینی کے راستے سے دین نہیں آتا تو جو فائدہ دین پر جھوٹ باندھنے سے حاصل ہوا وہ کیا فائدہ ہوا؟ وہ تو نقصان ہی نقصان ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کسی کے فائدے کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ اس کو دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا آیا اس کی خوبصورت شکل کو برقرار رکھا گیا یا اسے بگاڑ دیا گیا۔

ایک مقام پر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقات میں لکھا ہے کہ حدیث کی عبارت پڑھنے والا طالب علم جب حدیث پڑھنے میں غلطی کرتا ہے تو وہ بھی اس وعید میں آتا ہے۔ کیونکہ وہ اس بات کو جانتا ہے کہ وہ عبارت میں غلطی کرتا ہے اور پھر بھی پڑھتا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آدھی حدیث نقل کرنا جائز ہے۔ جیسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کرتے ہیں۔ [1]

متعمداً: اس لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کذب عمد کے لئے وعید ہے۔ اگر غلطی سے ہو یا کتاب میں عبارت غلط ہو تو وہ اس سے خارج ہے۔ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ **متعمداً** کا لفظ بعض روایات میں ہے اور بعض میں یہ لفظ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ وعید عمداً غیر عمدٍ دونوں صورتوں کے لئے ہے۔ علامہ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حدیث میں **متعمداً** کا لفظ نہیں ہے لوگوں نے اس کو بڑھایا ہے۔ (بحوالہ مقدمہ موضوعات کبیر)

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ وعید عام ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت میں ہو یا مخالفت میں ہو دونوں صورتوں میں بڑا گناہ ہے۔ حدیث کے پہلے جملے میں تبلیغ کی ترغیب تھی تو خطرہ تھا کہ کوئی جوش میں آکر بے سروپا روایات بیان کرنا نہ شروع کر دے۔ اس لئے اس جملہ میں فرمایا کہ تبلیغ کرو مگر جس نے بے سند باتیں بیان کیں اور مجھ پر جھوٹ بولا تو وہ دوزخ میں جانے کے لئے تیار ہو جائے۔ [2]

---

[1] المرقات ۱/۲۲۷، ۲۲۸ [2] المرقات ۱/۲۲۸

جھوٹی حدیث بیان کرنے کی وعید

﴿۲﴾ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ وَالْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَا: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيْثٍ يُرٰى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[۱]

ترجمہ: حضرت سمرۃ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو شخص میری (طرف منسوب کر کے کوئی ایسی) حدیث بیان کرے جس کے بارے میں اس کا خیال یہ ہو کہ وہ جھوٹی ہے تو وہ جھوٹے آدمیوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔ (مسلم)

توضیح: یری: یہ صیغہ مجہول یظن کے معنی میں ہے۔ مجہول ہی مستعمل ہوتا ہے اور رؤیت سے مراد رؤیت قلبی ہے۔[۲]

احد الکاذبین: یہ جمع کا صیغہ ہے اور اسی کو راجح قرار دیا گیا ہے یعنی دیگر کذابین میں سے ایک یہ شخص بھی ہے۔ کیونکہ یہ بھی ان کی افتراء کی تائید کر کے نقل کرتا ہے بعض نے اس کو تثنیہ کا صیغہ مانا ہے۔ کہ ایک جھوٹا تو وہ ہے جس نے گھڑ لیا ہے اور دوسرا جھوٹا یہ بیان کرنے والا شخص ہے جو گھڑنے والے کا ساتھ دے رہا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ موضوعی حدیث بیان کرنا حرام ہے ہاں اگر کوئی نقل کر کے یہ بتاتا ہے کہ یہ موضوعی ہے تو یہ طرز صحیح ہے، موضوعات پر علماء نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔[۳]

علم بڑی دولت ہے

﴿۳﴾ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۴]

ترجمہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس شخص کے لئے خدا تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔ اور میں (علم کو) تقسیم کرنے والا ہوں۔ عطا کرنے والا تو خدا ہی ہے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: یفقهه فی الدین: اسرار احکام کے علم کا نام فقہ ہے۔ لہٰذا فقاہت اس ملکہ اور سمجھ بوجھ کا نام ہوا جس کے ذریعے سے انسان غیر حاصل معلومات کا استخراج کر سکتا ہے۔ یہ نعمت عظیمہ ہے۔ **ذلك فضل الله یؤتیه من یشاء۔**

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث متعارف فقہاء کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم عام ہے۔[۵]

حسن بصری رحمہ اللہ سے کسی نے کہا کہ فقہاء نے ایسا فرمایا ہے تو آپ نے کہا تیرا بھلا ہو تم نے کبھی کسی فقیہ کو دیکھا بھی ہے؟ فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو **زاهد عن الدنیا راغب فی الآخرة** ہو۔ اپنے دین کی بصیرت رکھتا ہو اور ہمیشہ اپنے رب کی

---

[۱] اخرجه مسلم ۱/۷ [۲] المرقات ۱/۴۴۹ [۳] المرقات ۱/۴۴۹ [۴] اخرجه البخاری: ۱/۲۷ ومسلم ۲/۹۵ [۵] المرقات ۱/۴۵۰

عبادت میں لگا رہتا ہو۔

وانما انا قاسم: یعنی وحی کے علوم کا میں قاسم ہوں اور میں علوم کو تقسیم کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کے سمجھنے کا فہم دیتا ہے۔ اس حدیث کا تعلق علوم نبوت کی تقسیم سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کو محدثین **کتاب العلم** میں لاتے ہیں۔[1]

واللہ یعطی: کا مطلب یہ ہے کہ پھر اللہ پاک انسانوں کو درجہ بدرجہ فہم اور ادراک بھی عطا کرتا ہے۔ تو کوئی اعلیٰ درجہ کا ذہین ہوتا ہے کوئی متوسط درجہ کا ہوتا ہے اور کوئی ادنیٰ درجے کا ہوتا ہے۔[2]

یہاں اس حدیث سے اہل بدعت یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس تقسیم سے مراد رزق و ارزاق کی تقسیم ہے۔ چنانچہ اہل بدعت کے امام احمد رضا خان صاحب نے کہا ہے:

خلق کے حاکم ہو تم رزق کے قاسم ہو تم   تم سے ملا جو ملا تم پہ کروڑوں درود

اس نے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ بھی کہا ہے:

کیوں نہ قاسم ہو کہ تم ابن ابی القاسم ہو   کیوں نہ قادر ہو کہ مختار ہے بابا تیرا

یہ سب اہل بدعت کی بدفہمی اور کج فہمی کا نتیجہ ہے۔ شارحین حدیث نے یہ شرح نہیں کی ہے۔ اور اگر احادیث میں کہیں تقسیم اور قاسم ہونے کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوئی ہے تو وہ مال غنیمت کی تقسیم کی بات ہے۔

انسانی ملکات کا ذکر

﴿۴﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوْا۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[3]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "انسانوں کی اسی طرح کانیں ہیں جس طرح سونے اور چاندی کی کان ہوتی ہے۔ جو لوگ ایامِ جاہلیت میں بہتر تھے، وہ زمانہ اسلام میں بھی بہتر ہیں۔ اگر وہ فقاہت حاصل کریں"۔ (مسلم)

توضیح: الناس معادن: یہ معدن کی جمع ہے کان کو کہتے ہیں یعنی جس طرح زمین کی کان میں سونا ہوتا ہے چاندی ہوتی ہے تانبہ لوہا زمرد اور جواہر وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح انسان بھی اپنے مکارمِ اخلاق سے متفاوت ہوتے ہیں۔ انسان کے اچھے اخلاق شجاعت مروت سخاوت علم وحیاء اور ذکاوت وذہانت وغیرہ ہیں۔

تو جس طرح کانوں میں دھاتوں اور سونے چاندی کے خزانوں میں اختلاف ہوتا ہے اسی طرح انسان بھی مختلف ہوتے ہیں۔ کانوں میں کہیں سونا چاندی زیادہ اور کہیں کم کہیں اعلیٰ کہیں ادنیٰ اسی طرح انسان بھی اپنی خوبیوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ ہوتے ہیں۔

---

[1] المرقات ۱/۴۵۰ [2] المرقات ۱/۴۵۰ [3] اخرجہ مسلم: ۷/۱۸۱

فخیارھم: یعنی اسلام قبول کرنے سے نسبی برتری کم یا ختم نہیں ہوگی۔ بلکہ جاہلیت میں جو اس کی نسبی خاندانی برتری اور شرافت تھی، اسلام قبول کر کے اگر فقاہت حاصل کرے اور عالم بن جائے تو وہ برتری اور بڑھ جائے گی۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ "**الاسلام یزید الشریف شرفاً**"۔ اسلام تو انسانی شرافت کو بڑھاتا ہے۔ ہاں یہ فضیلت اور برتری اس وقت ہے جبکہ اسلام میں فقاہت حاصل کرے اگر کسی اعلیٰ خاندان کے آدمی نے اسلام قبول کرنے کے بعد علم دین اور فقاہت حاصل نہیں کی اور دوسرے ادنیٰ درجے کے انسان نے اسلام میں آکر فقہ کا علم حاصل کیا تو اس اعلیٰ خاندان والے سے وہ ادنیٰ خاندان والا برتر ہو جائے گا۔ کیونکہ شرط فقاہت ہے۔[1]

اذا فقھوا: یعنی یہ ملکات پوشیدہ تھے اسلام نے ان کو چمکا دیا بشرطیکہ یہ انسان زیور تعلیم سے آراستہ ہو جائے۔ اس حدیث میں سونے چاندی سے انسان کی خوبیوں کو تشبیہ دی گئی ہے۔ جس سے اشارہ ملتا ہے کہ جس طرح ان مستور خزانوں کو نکالنے کے لئے محنت کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح سے انسان کی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں محنت اٹھانا پڑے گی نیز سونا چاندی آگ میں پگھل کر محنت برداشت کر کے زیور کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو علمی کمالات میں محنت کر کے اپنی خوبیوں کو ظاہر کرنا پڑے گا۔ اس حدیث نے ہر انسان کو احساسِ کمتری سے بچنے کی تعلیم دی ہے۔[2]

پئے علم چوں شمع باید گداخت　　　که بے علم نتواں خدارا شناخت

دو قابل رشک چیزیں

﴿۵﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلٰى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[3]

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "دو شخصوں کے بارے میں حسد کرنا ٹھیک ہے ایک تو وہ جسے خدا نے مال دیا ہے اور پھر اسے راہ حق میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ دوسرا وہ شخص جسے خدا نے علم دیا ہے چنانچہ وہ اس علم کے مطابق حکم کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: **لا حسد:** غیر کی نعمت کے زوال کی تمنا کرنا حسد کہلاتا ہے۔ خواہ اس کو ملے یا نہ ملے۔ مگر اس غیر سے زائل ہو جائے یہ بالاتفاق حرام ہے۔ دوسرا غبطہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی کی نعمت کو دیکھ کر یہ تمنا کرے کہ اس طرح کی چیز مجھے بھی مل جائے اور اس کے پاس بھی باقی رہے یعنی نعمت غیر کی تمنا کرے مگر اس غیر سے زوال مقصود نہ ہو۔

سوال: شبہ یہ ہے کہ حسد تو شرعاً جائز نہیں تو ان دو چیزوں میں اس کی اجازت کیسے دے دی گئی ہے؟

جواب: اس سوال کے دو جواب ہیں پہلا جواب تو وہی ہے کہ یہاں اس حدیث میں لفظ حسد آیا ہے لیکن یہ غبطہ کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ اس جواب پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر حسد سے مراد غبطہ اور رشک ہی تھا تو پھر صرف ان دو

[1] المرقات ۱/۴۵۱، ۴۵۲ [2] المرقات ۱/۴۵۲ [3] اخرجه البخاری ۱/۲۸ ومسلم ۲/۲۰۱

چیزوں میں رشک کی اجازت کا کیا مطلب ہوا؟ رشک جب جائز امر ہے تو پھر وہ ہر چیز میں جائز ہے۔
لہٰذا دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ کلام فرض اور تقدیر کے طور پر ہے، کہ حسد کسی چیز میں جائز نہیں ہے۔ مگر یہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اگر فرض کرلو کہ کسی چیز میں حسد جائز ہوتا تو ان دو چیزوں میں ہوتا لیکن حسد چونکہ کہیں بھی جائز نہیں تو ان دو میں بھی جائز نہیں۔
بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ دو خصلتیں اتنی بڑی ہیں کہ اس میں حسد کرنا بھی جائز ہے گویا یہ دو چیزیں حسد کے عام قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔[۱]

تین چیزیں صدقہ جاریہ ہیں

﴿۶﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[۲]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کے ثواب کا سلسلہ اس سے منقطع ہوجاتا ہے۔ مگر تین چیزوں کے ثواب کا سلسلہ باقی رہتا ہے۔ ① صدقۂ جاریہ۔ ② علم جس سے نفع حاصل کیا جائے۔ ③ صالح اولاد جو مرنے کے بعد اس کے لئے دعا کرتی ہے۔ (مسلم)

توضیح: **الا من ثلاثة:** دنیا دار العمل ہے۔ اور آخرت دار الجزاء ہے۔ انسان جب تک دنیا میں زندگی گزارتا ہے تو اس کا اچھا اور برا عمل جاری رہتا ہے۔ لیکن جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔ ہاں تین قسم کے اعمال ایسے ہیں کہ انسان کے مرجانے کے بعد بھی ان اعمال کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

❶ اول: صدقہ جاریہ ہے کہ کوئی شخص مثلاً ایک زمین وقف کرتا ہے یا کوئی کنواں یا تالاب تیار کرتا ہے اور وقف کرتا ہے۔ اب مرنے کے بعد ان چیزوں سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں تو اس کا ثواب مرحوم کو پہنچتا ہے۔

❷ دوم: علم نافع ہے۔ یعنی ایک عالم باعمل کا انتقال ہوگیا زندگی میں وہ مخلوقِ خدا کو علم دین سے فائدہ پہنچاتا رہا اور ثواب کماتا رہا جب وفات آئی تو پیچھے علمی ذخیرہ چھوڑ گیا یا تو اپنی تصنیفات سے یا تقریرات وتحریرات سے اور یا قابل قدر شاگردوں کے ذریعے سے یا کتب دینیہ کے وقف کردینے سے اور یا اپنی اولاد کو علم پڑھا کر علم نافع کا ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑ دینے سے جس کا فائدہ وفات کے بعد اس کو ملتا رہے گا۔

❸ سوم: کوئی شخص خود مرجاتا ہے اور اپنے پیچھے صالح اور نیک اولاد چھوڑ جاتا ہے وہ اپنے مرحوم والدین کے لئے دعائیں کرتے ہیں سبق پڑھ کر ایصال ثواب کرتے ہیں، صدقات دیتے ہیں، یہ سب چیزیں مرنے کے بعد مردے کے لئے باعثِ ثواب ہیں۔ یہاں حدیث میں "یدعوله" کے الفاظ ہیں بعض علماء کا کہنا ہے کہ نیک اولاد کی نیکی میں والدین کا حصہ ہے۔ خواہ وہ دعا کرے یا نہ کرے۔[۳]

---

[۱] المرقات ۱/۴۵۲ [۲] اخرجه مسلم: ۵/۷۳ [۳] المرقات ۱/۴۵۳، ۴۵۴

اسلامی تعلیمات

﴿۷﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيْهِ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهِ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جو شخص دنیا کی سختیوں میں سے کسی مسلمان کی کوئی سختی اور تنگی دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن وہاں کی سختیاں اس سے دور کرے گا۔ اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد کرتا ہے جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔ اور جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کے راستے کو آسان کر دیتا ہے۔ اور جب کوئی جماعت خدا کے گھر (مسجد یا مدرسہ) میں قرآن شریف پڑھتی اور پڑھاتی ہے تو اس پر خدا کی جانب سے تسکین نازل ہوتی ہے۔ رحمت خداوندی اس کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔ اور فرشتے اس کو گھیر لیتے ہیں۔ نیز اللہ پاک اس جماعت کا ذکر ان (فرشتوں) میں کرتا ہے۔ جو اس کے پاس رہتے ہیں۔ اور جس نے عمل میں تاخیر کی تو آخرت میں اس کا نسب کام نہیں آئے گا۔ (مسلم)

توضیح: اس حدیث میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور آفاقی ہدایات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی مصیبت زدہ مسلمان بھائی کی چھوٹی سی مصیبت کو دور کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک بڑی مصیبت اس سے ہٹا دے گا۔ یہاں مومن مسلمان کی خدمت کی بات ہے غیر مسلم کی نہیں۔ لہٰذا جو لوگ ایمان و اسلام کو نظر انداز کر کے صرف خدمتِ خلق کا جذبہ دل میں رکھ کر خدمت کرتے ہیں تو وہ اپنی جگہ جیسے بھی ہوں لیکن اس حدیث کے مصداق نہیں ہیں۔

دوسری تعلیم کسی تنگدست کی مدد سے متعلق ہے۔ یعنی کسی نادار کی ضرورت کو دنیا میں پورا کیا مثلاً وہ مقروض ہے تو یا تو قرض معاف کیا یا اس کی ادائیگی کا انتظام کیا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت کی تنگیوں سے اس شخص کو نجات دلائے گا۔

[1] اخرجه مسلم: ۸/۷۱

تیسری تعلیم: یہ ہے کہ کسی شریف آدمی سے بشری کمزوری ظاہر ہوگئی اور اس نے گناہ کا ارتکاب کیا تو اس کا ڈھنڈورا نہ پیٹو۔ بلکہ اس پر ستر کا پردہ ڈالو تا کہ اس کی زندگی بچ جائے ورنہ وہ ضائع ہو جائے گا۔ ہاں اگر وہ عادی مجرم ہے اور اس کا گناہ متعدی ہے تو اس کا چھپانا جائز نہیں ہے۔

چوتھی تعلیم: یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص کسی مسلمان کی مدد میں لگا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی مدد کرتا رہتا ہے اور یہ مدد و نصرت مسلسل جاری رہتی ہے۔

پانچویں تعلیم: یہ ہے کہ جو شخص علم دین سیکھنے کے راستے پر چل پڑتا ہے اور حصول تعلیم کے لئے محنت اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔

چھٹی تعلیم: یہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں کی جماعت کسی مسجد یا مدرسہ اور خانقاہ وغیرہ میں بیٹھ کر اللہ کی کتاب قرآن مجید کی تلاوت کرتی ہے اور اس کی تعلیم و تدریس میں لگی رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے خصوصی فرشتے اس کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ اور ان پر رحمت برستی رہتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے ہاں ان کا تذکرہ فرماتے ہیں۔

ساتویں تعلیم: یہ ہے کہ جس شخص کو اس کے نیک اعمال نے پیچھے دھکیل دیا یعنی وہ نیک اعمال سے پیچھے رہ گیا تو خاندان اور اونچا حسب نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے:[1]

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی   کہ درین راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

۱۰ صفر ۱۴۱۰ھ

ریا کاری بری بلا ہے

﴿۸﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْضَى عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ أُسْتُشْهِدَ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعْمَتَهُ فَعَرَفَهَا فَقَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا قَالَ قَاتَلْتُ فِيكَ حَتَّى أُسْتُشْهِدْتُّ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُقَالَ جَرِيٌّ فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَهُ وَقَرَأَ الْقُرْآنَ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا قَالَ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهُ وَقَرَأْتُ فِيكَ الْقُرْآنَ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ إِنَّكَ عَالِمٌ وَقَرَأْتَ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ فَقَدْ قِيلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللهُ عَلَيْهِ وَأَعْطَاهُ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهِ فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا قَالَ مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيلٍ تُحِبُّ أَنْ يُنْفَقَ فِيهَا إِلَّا أَنْفَقْتُ فِيهَا لَكَ قَالَ كَذَبْتَ

[1] المرقات ۱/۴۵۴، ۴۵۵

وَلٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَّادٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ أُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ.

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "قیامت کے دن پہلا شخص جس پر (خلوصِ نیت کو ترک کر دینے کا) حکم لگایا جائے گا وہ ہوگا جسے دنیا میں شہید کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ (میدانِ حشر میں) وہ پیش کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی (دی ہوئی) نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے یاد آجائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا کام کیا؟ یعنی اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں جتا کر الزاماً فرمائے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکرانے میں کیا اعمال کئے؟ وہ کہے گا "میں تیری راہ میں لڑا یہاں تک کہ شہید کر دیا گیا"۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹا ہے کیونکہ تو اس لئے لڑا تھا کہ تجھے بہادر کہا جائے۔ چنانچہ تجھے بہادر کہا گیا۔ (اور تیرا اصل مقصد مخلوق سے حاصل ہوا) اب مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل کھینچا جائے یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ دوسرا شخص وہ ہوگا جس نے علم حاصل کیا، دوسروں کو تعلیم دی اور قرآن مجید کو پڑھا چنانچہ اسے بھی خدا کے حضور میں لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو (اپنی عطا کی ہوئی) نعمتیں یاد دلائے گا، جو اسے یاد آجائیں گی۔ پھر خدا پوچھے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا اعمال کئے؟ وہ کہے گا "میں نے علم حاصل کیا، اور دوسروں کو سکھایا اور تیرے ہی لئے قرآن مجید پڑھا"۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے تو نے علم محض اس لئے حاصل کیا تھا تاکہ تجھے عالم کہا جائے۔ اور قرآن اس لئے پڑھا تھا کہ تاکہ تجھے لوگ قاری کہیں۔ چنانچہ تجھے (عالم قاری) کہا گیا۔ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ تیسرا شخص وہ ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے معیشت میں وسعت دی۔ اور ہر قسم کا مال عطا فرمایا۔ اس کو بھی خدا کے حضور میں لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی عطا کی ہوئی نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے یاد آجائیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا اعمال کئے؟ وہ کہے گا کہ میں نے کوئی ایسی راہ نہیں چھوڑی جس میں تو خرچ کرنا پسند کرتا ہو۔ اور تیری خوشنودی کے لئے میں نے اس میں خرچ نہ کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹا ہے تو نے خرچ اس لئے کیا تاکہ تجھے سخی کہا جائے۔ اور تجھے (سخی) کہا گیا۔ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے۔ یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسلم)

توضیح: اول الناس: یہاں یہ اشکال ہے کہ اس حدیث میں بتایا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے حساب اور فیصلہ اس نمائشی شہید کا ہوگا۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ سب سے پہلے فیصلہ ناحق خون کرنے والے قاتل اور مقتول کا ہوگا۔ تیسری حدیث میں مذکور ہے کہ سب سے پہلے فیصلہ قیامت کے دن نماز کا ہوگا۔ چنانچہ عام مساجد میں پہلے زمانے میں یہ فارسی شعر محراب کے پاس لکھا ہوتا تھا:

روزِ محشر کہ جان گداز بود اولین پرسش نماز بود

[1] اخرجہ مسلم ۶/۴۷

اس اشکال اور احادیث کے اس ظاہری تعارض کا جواب دیا گیا ہے کہ قیامت کے دن معاملات اور حقوق العباد میں سب سے پہلے فیصلہ ناحق خون کا ہوگا۔ اس کی ایک صورت تو ناحق قتل کی ہے اور دوسری صورت ریا کاری اور نمائشی خون کی ہے۔ جیسے اس حدیث میں اس ریا کار شہید کا خون ہے لہٰذا حقوق العباد میں سب سے پہلے اس قسم کے معاملات کے فیصلے ہوں گے اور حقوق اللہ اور عبادت میں سب سے پہلے فیصلے نماز کے ہوں گے۔ تو کوئی تعارض نہیں تو حدیث میں "اول الناس" کی جو اولیت ہے باعتبار انواع ہے۔ انواع عبادت کے فیصلے الگ ہوں گے۔ اور انواع معاملات کے فیصلے الگ ہوں گے۔[1]

فعرفه نعمته: اس جملہ میں یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ نعمتوں کا سلسلہ تو غیر متناہی ہے اس کو کیسے یاد دلایا جائے گا؟ جبکہ حدیث میں ہے کہ اس کو عام نعمتیں یاد دلائی جائیں گی اور وہ شخص اس کو یاد کر کے پہچان لے گا۔ اس کا جواب آج کل کے زمانے کی جدت اور جدید آلات نے آسان کر دیا ہے۔ کیونکہ کمپیوٹر سسٹم اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں اقوال و افعال، حرکات و سکنات مقامات و زمانیات سب کو محفوظ کر کے ضرورت کے مطابق کسی وقت بھی دہرایا جا سکتا ہے۔ تو قادرِ مطلق بادشاہ کے لئے نعمتوں کا دہرانا کیا مشکل ہے۔[2]

قرأت فيك: یعنی تیری رضا اور خوشنودی کے لئے میں نے قرآن پڑھا اور پڑھایا، علم سیکھا اور سکھایا، اس حدیث میں صرف تین آدمی مراد نہیں بلکہ یہ تین قسم کے لوگ ہیں جن کی تعداد اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے۔ اس حدیث سے ہمیں یہ تعلیم ملی کہ کسی بھی عمل کے لئے بنیادی چیز خلوص نیت ہے، اگر نیت خالص نہیں تو بڑے سے بڑا عمل بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ مثلاً بدنی قربانی کے میدان میں جان کی قربانی بہت بڑا عمل ہے۔ معرفت الٰہی کے میدان میں علم سب سے بڑا عمل ہے۔ اور مالی قربانی میں مال خرچ کرنا سب سے بڑا عمل ہے۔ لیکن اگر اخلاص میں نقصان ہو یا بالکل اخلاص نہ ہو، تو اتنے بڑے اعمال بھی رائیگاں جاتے ہیں۔

اس حدیث سے ریا کاری پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ بہر حال حدیث میں خرابی نیت کے خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔ مگر اس حدیث کو بعض حضرات اخلاص نیت کے لئے اس طور پر عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شہید اور شہادت کوئی چیز نہیں، علم اور علماء ریا کاری کا شکار ہیں۔ اس طرح کا بیان بہت ہی خطرناک ہے حالانکہ اخلاص کی ترغیب کے لئے اس حدیث کے علاوہ اور بہت ساری حدیثیں ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ بیان کریں۔[3]

لوگوں سے علم کیسے اٹھتا ہے

﴿۹﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعاً يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى اِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اِتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوْسًا

---

[1] المرقات [2] المرقات ۱/۴۵۹ [3] المرقات ۱/۴۵۹

جُهَّالًا فَسُئِلُوا فَأَفْتَوا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ علم کو (آخری زمانہ میں) اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ لوگوں (کے دل و دماغ) سے اسے نکال دے۔ بلکہ علم کو اس طرح اٹھائے گا کہ علماء کو (اس دنیا سے) اٹھا لے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم بھی باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو پیشوا بنالیں گے اس سے مسئلے پوچھے جائیں گے۔ اور وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ لہٰذا وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: لا یقبض العلم: اللہ تعالیٰ چونکہ فیاض اور سخی بادشاہ ہے اور عام عادت ہے کہ سخی آدمی جب سخاوت کر کے کسی پر فیاضی کرتا ہے تو پھر اس سے واپس نہیں لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی جب کسی پر علم کا انعام کرتا ہے تو پھر اس سے چھینتا نہیں ہے ہاں علم کے اٹھنے اور ختم ہونے کی صورت یہ ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ علماء کو اٹھا لیتا ہے تو جب بڑے علماء اٹھ جاتے ہیں تو ان کے بعد ان کی جگہ خالی رہ جاتی ہے اور چونکہ لوگ مسائل معلوم کرنے میں علماء کی طرف ہی رجوع کرتے ہیں تو جب علماء پورے عالم سے اٹھ جائیں گے تو مسائل معلوم کرنے میں لوگ جاہلوں کو اپنا بڑا اور پیشوا بنالیں گے۔ اور وہ چونکہ جاہل ہوں گے تو غلط مسائل بتائیں گے۔ اور غلط فتوے دیں گے۔ لہٰذا وہ خود بھی گمراہ ہو جائیں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیں گے۔[2]

رؤسا: یعنی جاہلوں کو سر اور پیشوا بنا دیں گے یہاں سر کا لفظ عجیب معنی خیز لفظ ہے۔ کیونکہ سر انسان کے جسم میں وہ حصہ ہے جس کو بلد العلماء کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ علم کے تمام وسائل اور ذرائع سر میں ہی ہیں۔ مثلاً قوت مدرکہ اور ادراک سر میں ہے۔ قوت باصرہ قوت سامعہ قوت شامہ قوت ذائقہ اور قوت لامسہ سب کے سب سر میں ہی ہیں۔ تو یہ علماء کا شہر ہوا، اس حدیث کا مطلب بھی یہ ہے کہ لوگ جاہلوں کو علم کا مرکز بنا دیں گے تو گمراہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ جاہل کا دماغ کسی کو روشنی نہیں دے سکتا بلکہ تاریکی ہی دے سکتا ہے۔[3]

ہر روز وعظ و نصیحت نہ کرو

﴿۱۰﴾ وَعَنْ شَقِيقٍ قَالَ كَانَ عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْعُودٍ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِي كُلِّ خَمِيسٍ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ لَوَدِدْتُ أَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا فِي كُلِّ يَوْمٍ قَالَ أَمَا إِنَّهُ يَمْنَعُنِي مِنْ ذٰلِكَ أَنِّي أَكْرَهُ أَنْ أُمِلَّكُمْ وَإِنِّي أَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[4]

ترجمہ: حضرت شقیق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کے روز لوگوں کے سامنے وعظ

[1] اخرجه البخاری ۱/۳۶ ومسلم ۸/۶۰ [2] المرقات ۱/۳۶۱ [3] اخرجه البخاری ۱/۲۷ [4] اخرجه البخاری ۱/۲۷ ومسلم ۸/۱۴۲

ونصیحت کیا کرتے تھے۔ (ایک روز) ایک شخص نے عرض کیا۔ ''اے ابوعبدالرحمان! میری خواہش ہے کہ آپ ہمارے درمیان روزانہ وعظ ونصیحت کیا کریں''۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں ایسا اس لئے نہیں کرتا کہ اس سے تم لوگ تنگ آ جاؤ گے۔ میں نصیحت کے معاملے میں تمہاری خبرگیری اس طرح سے کرتا ہوں جیسا کہ ہماری نصیحت کے معاملے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ اور ہمارے اکتا جانے کا بھی خیال رکھتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: حضرت شقیق رحمہ اللہ تابعی ہیں انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہر روز نصیحت اور وعظ کہنے کی درخواست کی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کے مطالبہ کو مسترد کر دیا۔ جس سے امت کو یہ تعلیم ملی کہ وعظ ونصیحت اور دعوت وتبلیغ کے معاملے میں اعتدال اور احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ ہر وقت اور ہر موقع پر وعظ ونصیحت نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس سے لوگوں کے دل اکتا جائیں گے اور وہ دین کی بات کو بوجھ محسوس کرنے لگیں گے۔ اور دین کی بات کو بوجھ محسوس کرنا درحقیقت نفرت کا ذریعہ ہے۔ اور دین کی بات سے نفرت کرنا باعث کفر ہے۔ تو کثرت وعظ یا طوالت وعظ کا انجام کتنا خطرناک ہو گیا اور رشد وہدایت کے بجائے دینِ رحمت زحمت بن کر گمراہی کا ذریعہ بن گیا۔

آج کل لوگ اس کا خیال نہیں کرتے اور مسلسل وعظ ونصیحت میں لگے رہتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ درس وتدریس کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ اس میں تسلسل مستند اور منقول ہے۔ جمعرات کا دن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن کی عظمت اور قرب کی وجہ سے منتخب کیا تھا۔[1]

﴿۱۱﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ وَإِذَا أَتٰى عَلٰى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات کہتے تو اس کو تین مرتبہ فرماتے۔ یہاں تک کہ لوگ اسے اچھی طرح سمجھ لیتے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جماعت کے پاس آتے اور سلام کرنے کا ارادہ فرماتے تو تین مرتبہ سلام کرتے۔ (بخاری)

توضیح: اعادھا ثلاثا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر بات کو تین مرتبہ نہیں دہراتے تھے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین بار بات دہرانے کی ضرورت اس وقت پیش آتی جب آپ کو سننے والوں کے نہ سمجھنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔

حدیث کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہم اور ضروری علمی بات کو آپ تین بار دہراتے تھے۔ تاکہ اول بار ذکی ذہین آدمی سمجھ لے دوسری بار متوسط ذہن کا آدمی سمجھ لے اور تیسری بار غبی آدمی بھی سمجھ لے۔ آپ ہر بات نہیں دہراتے تھے۔ حدیث میں قرینہ بھی موجود ہے۔ کہ لوگ آپ کی بات سمجھ سکیں۔ یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ ہر بات نہیں دہرائی جاتی تھی۔[3]

سلم علیھم ثلاثا: یعنی جب آپ مجمع میں آ کر سلام کرتے تو تین بار سلام کرتے تھے۔ یہ عادت شریفہ اس وقت ہوتی تھی جب مجمع کثیر ہوتا تھا۔ تو پہلا سلام آپ کی آمد پر تھا، دوسرا سلام مجمع کی جانب یمین اور تیسرا سلام جانب یسار میں ہوتا۔

[1] المرقات ۱/۴۶۱ [2] اخرجه البخاری ۱/۲۷ [3] المرقات ۱/۴۶۲

یا یوں مطلب ہے کہ مجمع کے پہلے حصے میں پہلا سلام اور بیچ کے حصے میں دوسرا سلام اور مقام مقصود پر پہنچنے کے بعد یا رخصت کے وقت تیسرا سلام ہوتا تھا۔ یہ آج کل بھی ہوتا ہے حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک ہی جگہ پر تین بار سلام دہراتے تھے۔[۱]

نیکی کی رہنمائی بھی نیکی ہے

﴿۱۲﴾ وَعَنْ اَبِي مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ اِنَّهٗ اُبْدِعَ بِيْ فَاحْمِلْنِيْ فَقَالَ مَا عِنْدِيْ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَا اَدُلُّهٗ عَلٰى مَنْ يَحْمِلُهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ دَلَّ عَلٰى خَيْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهٖ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[۲]

ترجمہ: حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری سواری چلنے سے عاجز ہوگئی ہے۔ آپ مجھے سواری عنایت فرما دیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے (کہ تمہیں دے دوں)" ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں ایسا شخص بتلاتا ہوں جو اسے سواری دے دے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی بھلائی کی طرف رہنمائی کرے تو اسے اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس بھلائی پر عمل کرنے والے کو۔ (مسلم)

توضیح: ابدع بی: یہ لفظ ابداع سے ماخوذ ہے بدیع نئے اور انوکھے کام کو کہتے ہیں۔ یعنی میرے ساتھ عجیب کھیل ہوگیا عجیب نئی بات ہوگئی، عربی محاورہ میں یہ لفظ اونٹ وغیرہ سواری کے راستے میں عاجز آنے اور تھک کر چلنے سے رک جانے کو کہتے ہیں۔ یہ حدیث "الدال علی الخیر کفاعله" کی طرح ہے۔[۳]

فقراء کے لئے چندے کی اپیل

﴿۱۳﴾ وَعَنْ جَرِيْرٍ قَالَ كُنَّا فِيْ صَدْرِ النَّهَارِ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَجَاءَهٗ قَوْمٌ عُرَاةٌ مُجْتَابِي النِّمَارِ اَوِ الْعَبَاءِ مُتَقَلِّدِي السُّيُوْفِ عَامَّتُهُمْ مِنْ مُضَرَ بَلْ كُلُّهُمْ مِنْ مُضَرَ فَتَمَعَّرَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا رَاٰى بِهِمْ مِنَ الْفَاقَةِ فَدَخَلَ ثُمَّ خَرَجَ فَاَمَرَ بِلَالًا فَاَذَّنَ وَاَقَامَ فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ فَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ اِلٰى اٰخِرِ الْاٰيَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا وَالْاٰيَةَ الَّتِيْ فِي الْحَشْرِ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ تَصَدَّقَ رَجُلٌ مِنْ دِيْنَارِهٖ مِنْ دِرْهَمِهٖ مِنْ ثَوْبِهٖ مِنْ صَاعِ بُرِّهٖ مِنْ صَاعِ تَمْرِهٖ حَتّٰى قَالَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ قَالَ فَجَاءَ رَجُلٌ

[۱] المرقات ۱/۳۶۲ [۲] اخرجه مسلم ۶/۴۱ [۳] المرقات ۱/۳۶۲، ۳۶۳

مِنَ الْأَنْصَارِ بِصُرَّةٍ كَادَتْ كَفُّهُ تَعْجِزُ عَنْهَا بَلْ قَدْ عَجَزَتْ ثُمَّ تَتَابَعَ النَّاسُ حَتَّى رَأَيْتُ كَوْمَيْنِ مِنْ طَعَامٍ وَثِيَابٍ حَتَّى رَأَيْتُ وَجْهَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَلَّلُ كَأَنَّهُ مُذْهَبَةٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز ہم دن کے ابتدائی حصے میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے۔ کہ ایک قوم آپ ﷺ کی خدمت میں آئی جو ننگے بدن تھی اور عبا یا کمبل لپیٹے ہوئے تھی۔ اور گلے میں تلواریں لٹکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے اکثر بلکہ سب کے سب قبیلہ مضر کے لوگ تھے۔ ان پر فاقہ کا اثر دیکھ کر آپ ﷺ کا چہرہ مبارک متغیر ہوگیا۔ آپ ﷺ (ان کے لئے کھانے کی تلاش میں) گھر تشریف لے گئے اور (جب گھر میں کچھ نہ ملا تو) واپس تشریف لائے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو (اذان کہنے کا حکم) دیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور تکبیر پڑھی اور (جمعہ کی یا ظہر کی) نماز پڑھی گئی۔ پھر آنحضرت ﷺ نے خطبہ دیا۔ اور یہ آیت پڑھی:

یا ایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة الایة. ترجمہ: ''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان (آدم) سے پیدا کیا ہے''۔ پوری آیت تلاوت کی جس کا آخری حصہ یہ ہے۔ ''البتہ اللہ تمہارا نگہبان ہے''۔ اور پھر یہ آیت آپ ﷺ نے پڑھی جو سورۂ حشر میں ہے: **ولتنظر نفس ما قدمت لغد...الایة**، ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اس نے کیا ذخیرہ بھیجا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا ''خیرات کرے آدمی اپنے دینار میں سے، اپنے درہم میں سے، اپنے کپڑے میں سے، اپنے گیہوں کے پیمانے میں سے'' یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''خیرات کرے اگرچہ کھجور کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو''۔

راوی کہتے ہیں کہ ایک انصاری شخص (دینار یا درہم سے بھری ہوئی تھیلی) لایا جس کے وزن سے اس کا ہاتھ تھکنے کے قریب تھا، بلکہ تھک گیا تھا پھر تو لوگوں نے پے درپے چیزوں کا لانا شروع کردیا یہاں تک کہ میں نے دو تودے غلہ اور کپڑے کے (جمع شدہ) دیکھے پھر میں نے دیکھا کہ آنحضرت کا چہرۂ اقدس (خوشی کی وجہ سے) کندن کی طرح چمک رہا تھا پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''جو شخص اسلام میں کسی نیک طریقہ کو رائج کرے تو اسے اس کا بھی ثواب ملے گا اور اس کا ثواب بھی جو کوئی اس کے بعد اس پر عمل کرے۔ لیکن عمل کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور جس شخص نے اسلام میں کسی برے طریقہ کو رائج کیا تو اسے اس کا بھی گناہ ہوگا۔ اور اس شخص کا بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کرے گا۔ لیکن عمل کرنے والے کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی''۔

(مسلم)

[1] اخرجه مسلم: ۳/۸۶، ۶۲

توضیح: قوم عراة: یعنی ایک قوم کے لوگ آئے اور وہ لوگ بدن سے ننگے تھے یعنی کپڑا کم تھا۔ پورے جسم کے لئے کپڑا پورا نہ تھا۔ وہ کپڑا اونی بھی تھا اور پھٹا ہوا بھی تھا۔[۱]

مجتابی النمار: اجتیاب کپڑا لپیٹنے کے معنی میں ہے۔ اور نمار نمر سے ہے یہ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس میں سفید دھاریاں ہوں۔ اور جو اون اور بکری کے بالوں سے ملا کر بنایا گیا ہو۔ یہ لوگ بنو مضر کے تھے۔ جو پہلے کافر تھے اور قبیلہ عبدالقیس کے دشمن تھے۔ یہ مجاہدین کپڑے تو نہیں رکھتے تھے، مگر جہاد کے لئے تلواریں لٹکائے رکھتے تھے۔ جس سے آج کے مسلمانوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ جو اسلحہ سے نفرت کرتے ہیں۔ اور دنیا کے تعیش سے محبت کرتے ہیں۔[۲]

فتمعر: چہرہ کے تغیر کو کہتے ہیں، آنحضرت ﷺ کو ان کے فاقوں سے دکھ ہوا۔[۳]

تصدق: یہ ماضی کا صیغہ ہے جو خبر ہے مگر یہاں انشاء کے معنی میں آیا ہے یعنی ہر آدمی سے جو کچھ ہو سکے وہ صدقہ کرے۔ علامہ ابن انباری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں تصدق میں لام امر محذوف ہے۔ اصل میں **لیتصدق** تھا۔ لہٰذا یہ امر غائب کا صیغہ ہوا۔ یعنی ہر آدمی کو صدقہ کرنا چاہیئے۔[۴]

رجل: نکرہ مفردہ ہے جو جمع کے مقام پر آیا ہے۔ "**ای لیتصدق کل احد من درهمه من دیناره**"۔

صرة: تھیلی کو کہتے ہیں چونکہ اس وقت درہم و دینار سکہ کی صورت میں ہوتے تھے اس لئے تھیلی اٹھانا اس شخص کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔[۵]

کومین: کوم ڈھیر کو کہتے ہیں چونکہ غلہ اور کپڑوں کے ڈھیر بن جاتے ہیں اس لئے یہاں تو دے اور ڈھیر کا ذکر آ گیا ہے۔ اور درہم و دنانیر کے ڈھیر عادتاً نہیں ہوتے ہیں اس لئے اس کا ذکر بھی نہیں کیا گیا۔[۶]

برائی کی بنیاد رکھنا بھی برائی ہے

﴿۱۴﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا إِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا لِأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. سَنَذْكُرُ حَدِيثَ مُعَاوِيَةَ لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي فِي بَابِ ثَوَابِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالَى۔[۷]

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص ظلم کے طریقے پر قتل کیا جاتا ہے تو اس کے خون کا ایک حصہ آدم کے پہلے بیٹے (قابیل) پر ہوتا ہے اس لئے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کا طریقہ نکالا۔ (بخاری، مسلم) اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جس کی ابتدا یہ ہے "**لا یزال طائفة من امتی**" ہم انشاء اللہ باب "**ثواب هذه الامة**" میں بیان کریں گے، (مگر حضرت بھول گئے)۔

[۱] المرقات ۱/۳۶۳ [۲] المرقات ۱/۳۶۳ [۳] المرقات ۱/۳۶۴ [۴] المرقات ۱/۳۶۵ والکاشف ۱/۳۰۵
[۵] المرقات ۱/۳۶۶ [۶] المرقات ۱/۳۶۶ [۷] اخرجه البخاری: ۴/۱۶۲ ومسلم

۱۱ صفر ۱۴۱۰ھ

الفصل الثانی

علماء اور طلباء کے فضائل

﴿۱۵﴾ عَنْ كَثِيْرِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا مَعَ أَبِي الدَّرْدَاءِ فِي مَسْجِدِ دِمَشْقَ فَجَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا أَبَا الدَّرْدَاءِ إِنِّي جِئْتُكَ مِنْ مَدِيْنَةِ الرَّسُوْلِ ﷺ لِحَدِيْثٍ بَلَغَنِي أَنَّكَ تُحَدِّثُهُ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا جِئْتُ لِحَاجَةٍ قَالَ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَطْلُبُ فِيْهِ عِلْمًا سَلَكَ اللهُ بِهِ طَرِيْقًا مِنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ وَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضًى لِطَالِبِ الْعِلْمِ، وَإِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالْحِيْتَانُ فِي جَوْفِ الْمَاءِ وَإِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ وَإِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَإِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ۔

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْ دَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَه وَالدَّارِمِيُّ وَسَمَّاهُ التِّرْمِذِيُّ قَيْسَ بْنَ كَثِيْرٍ) [1]

ترجمہ: حضرت کثیر ابن قیس سے روایت ہے کہ میں (ایک صحابی) حضرت ابولدردا رضی اللہ عنہ کے پاس دمشق (شام) کی ایک مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور کہا میں سرکار دو عالم ﷺ کے شہر سے آپ کے پاس ایک حدیث کے لئے آیا ہوں جس کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسے آپ سرکار دو عالم ﷺ سے نقل کرتے ہیں۔ آپ کے پاس میرے آنے کی اس کے علاوہ اور کوئی غرض نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے حضور اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے "جو شخص کسی راستے کو (خواہ وہ لمبا ہو یا مختصر) علم دین حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بہشت کے راستے پر چلاتا ہے۔ اور فرشتے طالب علم کی رضامندی کے لئے اپنے پروں کو بچھاتے ہیں۔ اور عالم کے لئے ہر وہ چیز جو آسمانوں کے اندر ہے (یعنی فرشتے) اور جو زمین کے اوپر ہے (یعنی جن وانس) اور مچھلیاں جو پانی کے اندر ہیں دعائے مغفرت کرتی ہیں۔ اور عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسے کہ چودھویں کا چاند تمام ستاروں پر فضیلت رکھتا ہے۔ اور عالم انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء وراثت میں دینار و درہم نہیں چھوڑ گئے ہیں۔ ان کا ورثہ علم ہے۔ لہٰذا جس نے علم حاصل کیا اس نے کامل حصہ پایا۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی اور ترمذی نے راوی کا نام قیس ابن کثیر ذکر کیا ہے۔ لیکن صحیح کثیر بن قیس ہی ہے۔ (جیسا کہ صاحب مشکوۃ نے نقل کیا ہے)۔

توضیح: فی مسجد دمشق: دمشق صحابہ کرام کا مرکز تھا۔ اور دین کے سپاہیوں کی گزرگاہ اور فوجیوں کی بندرگاہ تھا۔ یہیں سے صحابہ کرام گزر کر افریقہ میں جا کر جہاد کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ طرۂ امتیاز تھا کہ وہ علم اور طلب علم کے

[1] اخرجہ احمد ۵/۱۹۶ وابو داؤد ۳۶۴۱ ابن ماجہ ۲۲۳

لئے ہر قسم کی مشقتیں اٹھایا کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک صحابی کا یہ سفر ہے۔ شوق اور ذوق کو دیکھو کہ مدینہ منورہ سے شام تک تقریباً آٹھ سو کلومیٹر کا سفر صرف ایک حدیث کے لئے کیا۔ دوسرا کوئی مقصد نہ تھا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ صحابی سواری سے نیچے بھی نہیں اترے تا کہ علم کا یہ سفر خالص علم کے لئے ہو جائے۔ سبحان اللہ! خلوص نیت کا کیا مقام تھا۔[۱]

انك تحدثه: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجملاً ان کو حدیث معلوم تھی۔ تفصیل معلوم کرنے کی غرض سے یہ سفر کیا۔ یا واسطہ سے حدیث معلوم تھی اور انہوں نے چاہا کہ خود ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے سن کر عُلُوِّ سند بھی حاصل کرلیں اور سند کا واسطہ بھی ختم ہو جائے۔ کیونکہ "**الاسناد من الدين ولولا الاسناد لقال من شاء ما شاء**"۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے ان صاحب کا شوق علم دیکھ کر ان کو یہ حدیث بطور خوشخبری سنائی تا کہ وہ خوش ہو جائے۔ اور ان کی مطلوبہ حدیث شاید کوئی اور تھی۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ جس حدیث کے سننے کے لئے یہ صحابی دمشق کے طویل سفر پر گئے تھے، یہ وہی حدیث ہو اگر ایسا ہو تو یہ عجیب اتفاق ہوگا کہ حدیث بھی ملی اور مناسب حال بشارت بھی ملی "**وهذا هو اعجب واغرب والاول هو اقرب.**" (ملا علی قاری رحمہ اللہ)[۲]

يطلب فيه علما: اى علم الدين لوجه الله لا لاجل الدنيا.[۳]

لتضع: بطور اعزاز و اکرام اور بطور تواضع فرشتے پر بچھاتے ہیں جس طرح بادشاہ کے اعزاز کے لئے اس کی گاڑی کے سامنے کئی میل تک قالین بچھائے جاتے ہیں جس پر ان کی گاڑی گزرتی ہے۔

علامہ حافظ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی استبعاد نہیں کہ یہ کلام حقیقت پر محمول ہو جائے اور ہم کو اس کا مشاہدہ نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ کسی طالب علم نے اپنے پاؤں کو زور سے زمین پر مارا کہ فرشتے کے پر کہاں ہیں کہ میں انہیں کچل دوں تو اس کے پیر شل ہو گئے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ حدیث مجاز پر محمول ہو، یعنی فرشتے تواضع اور انکساری کرتے ہیں۔ یعنی پر بچھانا طلب علم پر نزول رحمت الٰہی سے کنایہ ہو۔[۴]

يستغفر له من فى السموات: میں فرشتے اور ارواح مومنین داخل ہیں۔ یہ مغفرت جنس علماء کے لئے مانگی جاتی ہے۔

سُوَال: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اشیاء مثلاً حشرات الارض بھائم اور حیتان فی البحر اور چیونٹیاں وغیرہ غیر ذی عقل ہیں تو ان کو علماء کا کیا علم ہو گیا کہ ان کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ نیز وہ علماء کے لئے استغفار اور دعا کی یہ مشقت اور زحمت کیوں کرتے ہیں؟

جَوَاب: سوال کی پہلی شق کا جواب تو یہ ہے کہ جن اشیاء کو وجود بخشا گیا ہے ان کو وجود کے ساتھ ساتھ محدود پیمانے پر کچھ علم بھی دیا گیا ہے۔ جس طرح پتھروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔

---

[۱] المرقات ۱/۱۶۹ [۲] المرقات ۱/۴۶۸ [۳] المرقات ۱/۴۶۸ [۴] المرقات ۱/۴۶۹

جانوروں اور حیوانات کو اپنے خالق اور مالک کا علم ہوتا ہے۔ نیز ان کو موت اور قیامت کا اجمالی علم بھی ہے۔ ان کے اجمالی علم میں یہ بھی ہے کہ ان کی بقاء اور کائنات کی بقاء دین کی بقاء سے وابستہ ہے۔ اور دین اسلام کی بقاء علم اور علماء کی بقاء سے وابستہ ہے۔ اگر دین نہیں رہا تو وجودِ کائنات بھی نہیں رہے گا۔

اس لئے ہر چرند پرند علماء کی بقاء کی دعا مانگتے ہیں۔ تاکہ ان کا اپنا وجود اور عالم کائنات کا وجود محفوظ رہے۔ عالم باللہ اور عالم بامر اللہ کے لئے یہ دعائیں ہوتی ہیں۔

علماء کی تین قسمیں :

① عالم بامر الله ② عالم بالله ③ عالم بالله وعالم بامر الله۔

اول قسم وہ ہے کہ جو مسائل میں بہت ماہر ہے لیکن مظہر جلال و جمال رب العالمین نہیں بنا ہے۔

دوم وہ ہے کہ احکام فرضیہ کو جانتا ہے مگر احکام کے مصادر و مناشی کو نہیں جانتا ہاں مظہر جلال و جمال رب العالمین بنا ہے۔

سوم وہ کہ ماہر احکام بھی ہے ور احکام کے مصادر و مناشی کو بھی جانتا ہے۔ اور مظہر جلال و جمال رب العالمین بھی بنا ہے۔

اول قسم کے عالم سے صرف مسائل پوچھے جائیں ان کی مجلس میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔

قسم دوم سے مسائل نہیں پوچھنے چاہئیں ہاں ان کی مجلس میں ضرور بیٹھنا چاہئے۔

اور قسم سوم کبریت احمر ہے۔ ان سے مسائل بھی پوچھے جائیں اور ان کی مجلس میں بھی بیٹھنا چاہیئے۔ کائنات کے حشرات و حیوانات انہی قسم سوم کے علماء کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔

وان فضل العالم: یعنی جن کو احکام کے مناشی و مآخذ کا علم بھی ہو اور ساتھ ساتھ عالم باللہ بھی ہوں۔ [1]

کفضل القمر: یہ عجیب تشبیہ ہے کیونکہ چاند کی روشنی سے جس طرح جہان منور ہوتا ہے تو اسی طرح عالم کے علم سے جہان روشن ہوتا ہے۔ جس طرح چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے حاصل اور مستفاد ہے۔ اسی طرح علماء کے علم کی روشنی علم نبوت کی روشنی سے مستفاد ہے۔

عوام کی مثال ستاروں کی سی ہے علماء چاند جیسے ہیں اور رسالت مآب ﷺ سورج جیسے ہیں جیسے چاند کے سامنے ستارے بے نور سے لگتے ہیں اور سورج کی موجودگی میں چاند چھپ جاتا ہے ایسے ہی علماء کی موجودگی میں عوام کا علم کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور رسول اللہ ﷺ کے علم کے سامنے علماء کے علم کی کوئی حیثیت نہیں۔ [2]

وان العلماء ورثة الانبياء: وارث وہ ہوتا ہے جو مورث کے تمام اموال اور جائیداد میں حصہ دار ہوتا ہے۔ اگر صرف ایک چیز میں حصہ دار ہے تو وہ وارث نہیں بلکہ قرض خواہ اور دائن ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ کے وارث وہ علماء ہوں گے جو آپ ﷺ کے اخلاقیات، آپ ﷺ کے معاملات، آپ ﷺ کے علوم و امانات و دیانات و معاشیات و معاشرات کے جامع ہوں گے۔ آپ ﷺ کی دعوت و جہاد اور آپ ﷺ کی عبادات و ریاضات کے امین ہوں

---

[1] المرقات ۱/۴۷۱ [2] المرقات ۱/۴۷۱

گے۔صرف ایک شعبہ کے پیچھے پڑنے والا وارث نہیں ہوسکتا ہے۔معلوم ہوا کہ علماء سے یہاں مراد عالم بامر اللہ اور عالم باللہ ہیں۔[1]

لم یورثوا دینارا: اس جملے سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام نے مادی میراث نہیں چھوڑی ہے بلکہ روحانی میراث یعنی علم کو چھوڑا ہے۔تو روافض اپنے اس قول میں غلطی پر ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضور اکرم ﷺ کی میراث نہیں دی گئی۔ہم پوچھتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ نے فرمایا میری میراث نہیں بٹے گی "ما ترکناہ فھو صدقة" جو ہم نے چھوڑا وہ سب مسلمانوں پر صدقہ ہے تو میراث کہاں سے آئی؟ چلو فرض کرو کہ میراث تھی تو آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی میں تقسیم کیوں نہ کی؟ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو آپ نے تقسیم کیوں نہ کی؟ اور فدک کا باغ واپس کیوں نہ لیا؟[2]

عابد پر عالم کی فضیلت

﴿۱۶﴾ وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ قَالَ ذُكِرَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ رَجُلَانِ أَحَدُهُمَا عَابِدٌ وَالْآخَرُ عَالِمٌ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِنَّ اللهَ وَمَلَائِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ حَتّٰى النَّمْلَةَ فِي جُحْرِهَا وَحَتّٰى الْحُوتَ لَيُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ مَكْحُولٍ مُرْسَلًا وَلَمْ يَذْكُرْ رَجُلَانِ وَقَالَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلٰى أَدْنَاكُمْ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْآيَةَ إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا وَسَرَدَ الْحَدِيْثَ إِلٰى آخِرِهِ.[3]

ترجمہ: حضرت ابی امامہ باھلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا جس میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا عالم تھا۔(یعنی آپ سے پوچھا گیا کہ ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ میری فضیلت اس شخص پر جو تم میں سے ادنیٰ درجے کا ہو"۔ پھر اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا "بلاشبہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے اور آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں اس شخص کے لئے دعائے خیر کرتی ہیں جو لوگوں کو بھلائی (یعنی علم دین) سکھاتا ہے"۔ ترمذی اور دارمی نے اس روایت کو مکحول سے مرسل طریقہ پر نقل کیا ہے جس میں لفظ رجلان کا ذکر نہیں ہے۔اور کہا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "عابد کو عالم پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی مجھے تمہارے ادنیٰ آدمی پر ہے"۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: **انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء**۔ ترجمہ:۔ "خدا کے بندوں میں علماء ہی خدا سے ڈرتے ہیں"۔اور پھر پوری حدیث آخر تک اسی طرح بیان کی ہے۔

توضیح: کفضلی علی ادناکم: اس سے پہلے جو حدیث گزری ہے اس میں مکمل تشریح آ گئی ہے یہ حدیث بھی

[1] المرقات ۱/۴۷۱ [2] المرقات ۱/۴۷۱، ۴۷۲ [3] اخرجہ الترمذی ۲۶۸۵ والدارمی

اسی طرح ہے صرف یہ مذکورہ جملہ الگ انداز سے ہے اس کی توضیح یہ ہے کہ یہ نسبت غیر متناہی نسبت ہے کیونکہ کائنات میں نبی کا درجہ اور رتبہ اس مقام تک بلند ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے ادنیٰ (امتی) اور اپنے بلند رتبے کے تفاوت سے عالم اور عابد کی تشبیہ دی ہے۔ لہٰذا جس طرح حدیث کی تشبیہ میں نسبت غیر متناہی ہے اسی طرح عالم اور غیر عالم عابد کی نسبت بھی غیر متناہی ہے۔ تو جس طرح آنحضرت ﷺ کی فضیلت کا اندازہ ایک ادنیٰ امتی کے مقابلے میں نہیں لگایا جاسکتا اسی طرح ایک عالم کی فضیلت کا اندازہ ایک غیر عالم کے مقابلے میں نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ [۱]

دینی مدارس کے طلباء مہمانانِ رسول ہیں

﴿۱۷﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ النَّاسَ لَكُمْ تَبَعٌ وَإِنَّ رِجَالًا يَأْتُونَكُمْ مِنْ أَقْطَارِ الْأَرْضِ يَتَفَقَّهُونَ فِي الدِّينِ فَإِذَا أَتَوْكُمْ فَاسْتَوْصُوا بِهِمْ خَيْرًا۔
(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ) [۲]

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "لوگ تمہارے یعنی صحابہ کے تابع ہیں اور بہت سے لوگ علم دین سمجھنے کے لئے اطراف عالم سے تمہارے پاس آئیں گے۔ لہٰذا جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو"۔ (ترمذی)

توضیح: ان الناس لکم تبع: یعنی دین میں تمہارے تابع ہیں۔ تم لوگ اپنے آنے والے لوگوں کے لئے متبوع ہو، وہ تمہارے نقش قدم پر چلیں گے اور تمہارے زمانے میں تمہارے پاس آکر وہ تم سے علم سیکھیں گے۔ اس حدیث سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوگئی کہ صحابہ کرام آنے والی امت کے لئے معیار حق ہیں۔ مودودی صاحب نے اس بات میں امت کا راستہ چھوڑ دیا ہے۔ [۳]

فاستوصوا: اس جملے کا ایک مطلب یہ ہے کہ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں تم ان کے بارے میں میری وصیت قبول کرلو اور ان کی بھلائی کرو، دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جب تمہارے سامنے آئیں تو ان کو خیر و بھلائی کی وصیت کرتے جاؤ اس میں کوتاہی نہ کرو، ان کی اچھی تربیت کرو۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دینی مدارس کے طلباء حضور اکرم ﷺ کے مہمان ہیں، لہٰذا ان کی ناقدری نہیں کرنی چاہئے، الحمد للہ حدیث کا یہ نقشہ دینی مدارس میں آج بھی موجود ہے۔ [۴]

علمی نکتہ متاع گمشدہ ہے

﴿۱۸﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْحَكِيمِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا۔
(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ وَإِبْرَاهِيمُ بْنُ الْفَضْلِ الرَّاوِي يُضَعَّفُ فِي الْحَدِيثِ) [۵]

---

[۱] المرقات ۱/۴۴۳ [۲] اخرجہ الترمذی ۲۶۵۰ [۳] المرقات ۱/۴۷۴ [۴] المرقات ۱/۴۷۴ [۵] اخرجہ الترمذی ۲۶۸۷ وابن ماجہ ۴۱۶۹

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''(دین میں) فائدہ دینے والی بات دانش مند کا مطلوب ہے لہٰذا وہ جہاں بھی اسے پائے وہ اس کا مستحق ہے۔ (ترمذی وابن ماجہ) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس حدیث میں ایک راوی ابراہیم بن فضل ہیں جن کو (روایت حدیث میں) ضعیف خیال کیا جاتا ہے۔

توضیح: الکلمۃ الحکمۃ: حافظ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد فقاہت ہے دانائی کی بات ہے علمی نکتہ اور علمی مسئلہ ہے۔[1]

فحیث وجدھا: یعنی جہاں بھی ملے تو یہ شخص زیادہ مستحق ہے کہ اس کو قبول کرلے کیونکہ پہلے وہ نا اہل کے پاس تھا اب اہل کو مل گیا تو قدر کر کے لے لے یا مطلب یہ ہے کہ دین کی بات ہے عمل کے لئے نیک اور مومن شخص جس کسی سے بھی اچھی بات سن لے اسے قبول کر کے عمل کرے، **انظروا الی ما قیل ولا تنظروا الی من قال۔** یہ نہ سوچے کہ یہ بات تو میں نے ایک کم تر آدمی سے سنی ہے اس پر کیا عمل کروں گا؟ کسی بزرگ سے سن لیتا تو عمل کر لیتا۔ شیخ سعدی بابا رحمہ اللہ نے اسی حقیقت کو ظاہر کیا ہے:[2]

مرد باید کہ گیرد اندر گوش — گر نوشت است پند بر دیوار

غلط است آنچہ مدعی گوید — خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

یعنی آدمی کو چاہئے کہ وہ نصیحت کو قبول کرے خواہ وہ دیوار پر لکھی ہوئی ہی کیوں نہ ہو۔ مدعی غلط کہتا ہے کہ سویا ہوا آدمی سوئے ہوئے کو کیسے جگا سکتا ہے۔ (دیکھو دیوار کی نصیحت سے فائدہ ہوا، خلاصہ یہ کہ علمی نکتہ مؤمن کا متاع گمشدہ ہے)

ایک عالم ایک ہزار عابدوں پر بھاری ہے

﴿۱۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه)[3]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''ایک فقیہ (یعنی عالم دین) شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے''۔ (ترمذی وابن ماجہ)

توضیح: فقیہ واحد: یعنی وہ عالم جو احکام اور مناشی احکام کو بھی جانتا ہو عالم باللہ اور عالم بامر اللہ ہو۔ فقاہت سے مراد دین اسلام کی سمجھ بوجھ ہے۔ خواہ وہ جہاں بھی ہو اور جس شعبہ میں ہو۔ عابد سے مراد وہ عابد ہے جو فرائض کو جانتا ہے۔ مگر احکام کے مناشی کو نہیں جانتا ہے۔ عابد سے مراد نرا جاہل عابد نہیں کیونکہ وہ تو خطرناک ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے:[4]

فساد کبیر عالم متھتك — واکبر منه جاھل متنسك

---

[1] المرقات ۱/۴۷۵ [2] المرقات ۱/۴۷۵ [3] اخرجہ الترمذی ۲۶۸۱ وابن ماجہ ۲۲۲ [5] المرقات ۱/۴۷۶

ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ خود ابلیس حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رات کے وقت آیا اور فضا کو رنگ برنگے قمقموں سے روشن کر کے کہا کہ میں فرشتہ ہوں اور اللہ نے مجھے بھیجا ہے کہ عبدالقادر نے بہت عبادت کی ہے اور اب وہ معاف ہے اسے مزید اور عبادت کی ضرورت نہیں ہے۔

شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ جاؤ مردود شیطان اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو موت تک عبادت کا پابند بنایا تو میں کون ہوں جو معاف ہو گیا۔ ابلیس نے کہا کہ ابھی ابھی چالیس پیروں کو میں نے اسی طرح سے گمراہ کیا ہے مگر آپ کے پاس بڑا علم تھا علم نے بچا لیا۔

شیخ نے کہا کہ جاؤ مردود علم سے نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے بچ گیا ہوں۔ شیخ سعدی بابا رحمۃ اللہ علیہ نے سچ فرمایا:

صاحب دلے بمدرسہ آمد زخانقاہ بشکست مہ عہد صحبت اہل طریق را

گفتم میان عابد وعالم چہ فرق بود کہ تو کردی اختیار ازاں ایں فریق را

گفت آں گلیم خویش بروں می بروز موج وایں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

ترجمہ: ایک عارف خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسہ آیا اور تصوف کے قدیم طور وطریق کو اس نے توڑ دیا میں نے ان سے پوچھا کہ عالم اور عابد میں کیا فرق تھا کہ تم نے صوفیوں کو چھوڑ کر علماء کی رفاقت کو اختیار کیا ہے اس نے کہا کہ صوفی لوگ سمندری موجوں میں صرف اپنی چادر بچاتے ہیں اور علماء محنت کر کے ڈوبنے والے کو بچاتے ہیں۔

نالائق کو علم سکھانا علم کی توہین ہے

﴿۲۰﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَوَاضِعُ الْعِلْمِ عِنْدَ غَيْرِ أَهْلِهِ كَمُقَلِّدِ الْخَنَازِيرِ الْجَوْهَرَ وَاللُّؤْلُؤَ وَالذَّهَبَ. (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ إِلَى قَوْلِهِ مُسْلِمٍ وَقَالَ هٰذَا حَدِيثٌ مَتْنُهُ مَشْهُورٌ وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ، وَقَدْ رُوِيَ مِنْ أَوْجُهٍ كُلُّهَا ضَعِيفَةٌ)[1]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے اور نا اہل کو علم سکھانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سؤر کے گلے میں جواہرات، موتی اور سونے کا ہار ڈال دے (ابن ماجہ) اور بیہقی نے اس روایت کو شعب الایمان میں لفظ "مسلم" تک نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کا متن مشہور ہے اور اسناد ضعیف ہے اور یہ حدیث مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے جو سب ضعیف ہیں۔

توضیح: طلب العلم فریضة: علوم ضروریہ تو ہر مسلمان پر فرض ہیں یعنی ہر عاقل بالغ مسلمان مرد و زن پر حالت راہنہ کی حد تک علم فرض ہے۔ حالت راہنہ کا مطلب یہ ہے کہ جس حالت میں بھی مسلمان ہے اس حالت کے جائز یا ناجائز ہونے کی حد تک علم کا حاصل کرنا فرض ہے۔ اس کے علاوہ مناشی اور مصادر اور مآخذ کا معلوم کرنا فرض کفایہ ہے کہ

[1] اخرجه ابن ماجه ۲۲۴ والبيهقي

علاقہ میں اس قسم کے جید عالم کا موجود ہونا فرض کفایہ ہے ورنہ سب کے سب لوگ گنہگار رہوں گے۔[1]

غیر اهله: نا اہل لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو طالب دینار اور اہل اھواء واہل بدعت ہیں یا نا اہل سے مراد وہ نالائق طالبعلم ہیں جن میں علم دین کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ تو ان کے سامنے علم کو پیش کرنا علم کی ناقدری ہے جیسا کہ خنزیر کے گلے میں پھولوں کا ہار یا جواہرات اور موتیوں کا یا سونے کا ہار ڈال دیا جائے۔[2]

اس حدیث میں علم سے مراد علم دین ہے۔ جو مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو قرآن وحدیث کا علم ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے سکول و کالج کے علوم وفنون کی ترغیب نہیں دی ہے اور نہ یہ علوم وفنون اس وقت دنیا میں موجود تھے، جو لوگ اس قسم کی احادیث کو سکول و کالج کی جدید انگریزی تعلیمات کے حصول کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ دین اسلام میں تحریف کرتے ہیں۔ ان کو خدا کا خوف کرنا چاہئے۔

ممالک اسلامیہ میں جتنے اسکول و کالج ہیں یہ یہود ونصاریٰ کے نظریاتی مدرسے ہیں۔ جس طرح مسلمان اور علماء کرام دینی مدارس کی حفاظت ضروری سمجھتے ہیں یہود ونصاریٰ پوری دنیا میں اپنے ان کالجوں یونیورسٹیوں اور مشن سکولوں کی حفاظت ضروری سمجھتے ہیں۔

افسوس! اس پر ہے کہ انگریزی تعلیمات کے لئے مسلمانوں کے خزانے کھلے ہوئے ہیں اور دین اسلام کی تعلیمات پر تمام دروازے بند ہیں۔

کمقلد الخنازیر: اس جملہ میں نالائق شخص اور بے ادب طالب علم کو علم سکھانے کی مثال بتائی گئی ہے کہ نالائق اور بے ادب کو علم سکھانا ایسا ہے جس طرح کوئی شخص سونے چاندی کے ہار اور موتی جواہرات کو خنزیر کے گلے میں لٹکا دے جس طرح خنزیر ایک نالائق اور مبغوض ومنحوس حیوان ہے اس کو جواہرات کا ہار پہنا دینا جواہرات کی توہین ہے۔ اسی طرح بے ادب گستاخ کو علم سکھانا علم کی توہین ہے۔ کیونکہ دین ادب واحترام کا نام ہے۔ عارفین کا کلام ہے کہ: **"الدین کله ادب"**۔

اس سلسلہ میں شعراء کے چند اشعار لکھنا بھی مناسب ہے۔[3]

قال الشاعر:

فَيَا عَجَبًا لِّمَنْ رَبَّيْتُ طِفْلًا أُلَقِّمُهُ بِأَطْرَافِ الْبَنَانِ

ہائے تعجب ہے اس شخص پر جس کو میں نے اس طرح بچہ پالا کہ اپنی انگلیوں سے اس کے منہ میں لقمہ دیا کرتا تھا۔

أُعَلِّمُهُ الْمُرُوَّةَ كُلَّ يَوْمٍ فَلَمَّا طَرَّ شَارِبُهُ جَفَانِي

میں ہر روز اس کو انسانی مروت سکھایا کرتا تھا مگر جب اس کی مونچھیں نکل آئیں تو اس نے میرے ہی ساتھ بے مروتی کی۔

أُعَلِّمُهُ الرِّمَايَةَ كُلَّ يَوْمٍ فَلَمَّا اشْتَدَّ سَاعِدُهُ رَمَانِي

میں ہر روز اس کو تیر اندازی سکھایا کرتا تھا مگر جب اس کے بازو مضبوط ہو گئے تو اس نے مجھے ہی تیر مارا۔

[1] المرقات ۱/۴۷۷ [2] المرقات ۱/۴۷۷ [3] المرقات ۱/۴۷۷

أُعَلِّمُهُ الْقَوَافِي كُلَّ يَوْمٍ فَلَمَّا قَالَ قَافِيَةً هَجَانِي

میں ہر روز اس کو شاعری سکھایا کرتا تھا مگر جب اس نے پہلا شعر پڑھا تو میری ہی مذمت کی۔

از خدا خواہیم توفیق ادب بے ادب محروم گشت از فضل رب

میں اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق مانگتا ہوں کیونکہ بے ادب اللہ کی رحمت سے محروم رہتا ہے۔

چوں خدا خواہد کہ پردۂ کس درد میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کا پردہ پاک کرنا چاہتا ہے تو اس کو نیک لوگوں پر طعن کی طرف مائل کر دیتا ہے۔

ہر چہ گیرد علتے علت شود کفر گیرد کاملے ملت شود

جو شخص دوسروں میں عیب ڈھونڈتا ہے وہ خود عیب دار بن جاتا ہے مگر کامل شخص کی بظاہر غلطی بھی ملت بن جاتی ہے۔

کار پاکاں برقیاس خود مگیر در نوشتن گرچہ یکساں شیر وشیر

نیک لوگوں کا کام اپنے کام پر قیاس نہ کرو اگرچہ لکھنے میں شیر جو درندہ ہے اور شیر جو دودھ ہے ایک جیسا ہے۔

کس نیا موخت علم تیر ازمن کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

کسی بھی شخص نے مجھ سے تیراندازی نہیں سیکھی کہ جس نے آخر میں مجھے نشانہ نہ بنایا ہو۔

سعدیا شیرازیا پندے مدہ کم زات را کم زات چوں ملا شود دشنام داد استاد را

ارے سعدی شیرازی! بدذات شخص کو علم نہ سکھاؤ کیونکہ بدذات جب عالم بن جائے گا تو اپنے استاد کو گالی دے گا۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود گرچہ با آدمی بزرگ شود

بھیڑیا کا بچہ آخر میں بھیڑیا بن جاتا ہے اگرچہ وہ انسان کے ساتھ بزرگ بن جائے۔

چوں بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا است سخن شناس نہ ئے دلبرا خطا ای جا است

جب عارفین کے کلام کو سن لو تو اس کو غلط نہ کہو میری جان! غلطی اس میں ہے کہ تم اللہ والوں کی بات سمجھتے نہیں ہو۔

ہزار نکتۂ باریک تر زمو ایں جا است نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

قلندر بننے کے لئے یہاں بال سے زیادہ باریک ہزاروں نکتے ہیں صرف سر منڈانے سے کوئی شخص قلندر نہیں بنتا ہے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن

ہر مقام پر گھوڑا نہیں دوڑایا جا سکتا ہے کہ کیونکہ بہت سارے مقامات ایسے ہیں جہاں ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں۔

اصیل مرغ سمجھتے بھی ہیں اور ہیں خاموش سنو گے پٹنیوں میں چوں چرا کا جوش و خروش

دہ ازار نہ چا بازار ندے مند لے ڈیر عالم مدے پدے ستر گولیدلے

دل آزاری سے کسی نے کامیابی کا بازار نہیں پایا ہے میں نے اپنی آنکھوں سے اس طرح بہت سارے لوگوں کو دیکھا ہے۔

۱۲ صفر ۱۴۱۰ھ

دین کی سمجھ سے منافق محروم رہتا ہے

﴿۲۱﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِي مُنَافِقٍ حُسْنُ سَمْتٍ وَلَا فِقْهٌ فِي الدِّيْنِ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا "دو خصلتیں ایسی ہیں جو منافق میں جمع نہیں ہوتیں ایک تو خلق نیک اور دوسری دینی سمجھ"۔ (ترمذی)

توضیح: حسن سمت: حسن خلق اور خوش خلقی کو حسن سمت کہا گیا ہے۔ اچھے اخلاق کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق خدا کے لئے مجسمہ خیر بن جائے اور بھلائی و آسانی کا ذریعہ بن جائے۔ دوست اور دشمن سب برابر نظر آئے۔ یہ اسلامی اچھے اخلاق ہیں جو منافق میں نہیں ہوتے ہیں۔ ایک تاجرانہ اخلاق ہوتے ہیں جو کوئی تاجر گاہک کے ساتھ برقرار رکھتا ہے۔ حدیث میں یہ اخلاق مراد نہیں ہیں۔ تیسری قسم مشن کے اخلاق ہوتے ہیں۔ جیسے انگریزوں میں مشن کے تحت اخلاق ہوتے ہیں۔ جس میں وہ ہر بے حیائی کو اخلاق کا نام دے کر مسلمانوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔ یہ تو اخلاق نہیں بلکہ بداخلاقی ہے۔[2]

طالب علم اللہ تعالیٰ کی راہ میں رہتا ہے

﴿۲۲﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَنْ خَرَجَ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللهِ حَتَّى يَرْجِعَ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ)[3]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو شخص گھر سے علم حاصل کرنے کے لئے نکلا تو وہ جب تک (گھر واپس نہ آجائے) خدا کی راہ میں ہے۔ (ترمذی، دارمی)

توضیح: فهو فی سبیل اللہ: یعنی جب تک یہ طالب علم سفر علم سے واپس گھر نہیں لوٹتا یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہے۔ فی سبیل اللہ کی تشریح و تفصیل کتاب الجہاد میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گی۔ یہاں اتنی بات سمجھ لیں کہ فی سبیل اللہ سے

---

[1] اخرجه الترمذی ۲۶۸۴ [2] المرقات ۱/۴۷۹ [3] اخرجه الترمذی ۲۶۴۷ والدارمی

خاص جہاد کا راستہ مراد ہے۔ اس راستے میں ایک روپیہ سات سو سے سات لاکھ تک بڑھ جاتا ہے۔
طالب علم چونکہ سفرِ علم میں بہت بڑی مشقتیں اٹھاتا ہے اس لئے اس کو مجاہد فی سبیل اللہ کا ثواب ملتا ہے یہ مطلب نہیں کہ یہ طالب علم مجاہد فی سبیل اللہ بن گیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کی مشقتوں اور محنتوں کی وجہ سے اس کو جہاد فی سبیل اللہ کا ثواب ملتا ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے بعض فقہاء نے مصرف زکوٰۃ "فی سبیل اللہ" میں مجاہدین کے ساتھ طلباء علم دین کو بھی داخل مانا ہے۔[1]

طلبِ علم سے سابقہ گناہ مٹ جاتے ہیں

﴿۲۳﴾ وَعَنْ سَخْبَرَةَ الْاَزْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ كَانَ كَفَّارَةً لِمَا مَضٰى.
(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ ضَعِيْفُ الْاِسْنَادِ وَاَبُوْ دَاوُدَ الرَّاوِيْ يُضَعَّفُ)[2]

ترجمہ: اور حضرت سخبرۃ الازدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "جو شخص علم طلب کرتا ہے تو وہ اس کے گزرے ہوئے (صغیرہ) گناہوں کے لئے کفارہ ہو جاتا ہے۔ (ترمذی) (دارمی) اور امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف الاسناد ہے یعنی اس حدیث کے ایک راوی ابوداود (روایت حدیث میں) ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔

توضیح: کان کفارة: اگر اس نیک عمل کے ساتھ اس شخص نے توبہ بھی کی تو اس کے چھوٹے بڑے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے اور اگر توبہ نہ کی تو چھوٹے گناہ طلب علم کی برکتوں سے معاف ہو جائیں گے اور بڑے گناہ کمزور پڑ جائیں گے۔
امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ابوداود نامی ایک راوی ضعیف ہے۔ یاد رہے کہ یہ راوی ابوداود شریف کے مؤلف نہیں بلکہ کوئی اور آدمی ہے جو ضعیف ہے۔[3]

عالم کبھی علم سے سیر نہیں ہوتا

﴿۲۴﴾ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَنْ يَّشْبَعَ الْمُؤْمِنُ مِنْ خَيْرٍ يَسْمَعُهُ حَتّٰى يَكُوْنَ مُنْتَهَاهُ الْجَنَّةَ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[4]

ترجمہ: حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "مومن بھلائی (یعنی علم) سے سیر نہیں ہوتا وہ اس کو سنتا (یعنی حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی انتہا جنت ہوتی ہے۔ (ترمذی)

علم چھپانا گناہ ہے

﴿۲۵﴾ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ اُلْجِمَ يَوْمَ

[1] المرقات ۱/۴۸۰ [2] اخرجه الدارمی ۵۶۷ والترمذی ۲۶۴۸ [3] المرقات ۱/۴۸۰ [4] اخرجه الترمذی ۲۶۸۶

الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ عَنْ أَنَسٍ)[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جس شخص سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جو اسے معلوم تھی مگر اس نے چھپایا (یعنی نہیں بتایا) تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی۔ (احمد، ابوداؤد) اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

توضیح: الجم: آگ کی لگام کا مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص دوزخ میں جائے گا کیونکہ آگ کی لگام کسی اور جگہ نہیں پڑے گی۔[2]

ثم کتمہ: یہ وعید فرائض اور واجبات کے متعلق ہے مگر یہاں چند شرائط بھی علماء نے ذکر کی ہیں۔[3]

اول بات: تو یہ ہے کہ یہ عالم مسائل کے لئے متعین ہو اور صرف یہی عالم ہو دوسرا عالم موجود نہ ہو۔

دوسری بات: یہ ہے کہ اس عالم کو یہ مسئلہ معلوم بھی ہو اور جانتے ہوئے وہ اس کو چھپا رہا ہو۔

تیسری بات: یہ ہے کہ یہ مسئلہ فرائض یا واجبات سے متعلق ہو اور نہ بتانے سے ضروری حکم شرعی کو نقصان پہنچ رہا ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ وعید مستحبات ونوافل کے مسائل سے متعلق نہیں ہے۔

جھگڑے اور ریاکاری کا علم وبال ہے

﴿۲۶﴾ وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ أَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ أَوْ يَصْرِفَ بِهِ وُجُوهَ النَّاسِ إِلَيْهِ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ عَنِ ابْنِ عُمَرَ)[4]

ترجمہ: حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جس شخص نے علم کو اس غرض سے حاصل کیا کہ اس کے ذریعے علماء پر فخر کرے بیوقوفوں سے جھگڑے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی آگ میں داخل کرے گا''۔ (ترمذی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے)

توضیح: ''من طلب العلم'': علم ایک نور ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ اس کے حصول سے انسان کی ظاہری اور باطنی حالت میں صالح انقلاب آنا چاہیئے۔ اور علم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ یہ شخص رسول اللہ ﷺ کی نیابت اور وراثت علمی میں دین کی اس روشنی کو مخلوق خدا کے دلوں میں اور ان کے دماغوں میں پہنچا کر ان کو روشن کرے۔ اس عالی مقصد کے برعکس اگر ایک عالم ابتداء سے علم فقط اس لئے پڑھتا ہے کہ وہ کل عالم بن کر علماء سے مناظرہ کرے گا اور عوام الناس سے جھگڑا کرے گا۔ اس کا اولین مقصد یہی ہے کہ لوگوں سے مناظرہ مجادلہ اور مقابلہ کرنا ہے، تاکہ

---

[1] اخرجہ احمد ۲/۲۶۳ وابو داؤد ۳۶۵۸ [2] المرقات ۱/۴۸۱ [3] المرقات ۱/۴۸۱ [4] اخرجہ الترمذی ۲۶۵۴ وابن ماجہ ۲۶۳

اس کی آڑ میں وہ اپنی شخصیت بنائے اس کا ارادہ یہ ہو کہ لوگوں میں اس کی سرداری قائم ہو جائے اور اس کے مقابل کو لوگ ذلیل سمجھیں۔ علماء اور عوام سے جھگڑ کر اس کا سکہ لوگوں میں بیٹھ جائے اور یہ تمام حلقوں میں اپنا لوہا منوائے اور پھر دنیوی اغراض و اموال کے حصول میں کامیاب ہو جائے تو ایسا شخص عالم نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ جاہل ہے، اور دوزخ کا ایندھن ہے۔ جنت کی خوشبو اس پر حرام ہے کیونکہ بنیاد غلط ہے:

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا میرود دیوار کج

لیکن اگر اس شخص نے علم تو اچھی نیت سے پڑھا اور عالم بن کر پھر احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے اہل باطل سے مناظرہ مجادلہ مقابلہ کی نوبت آئی تو یہ ممنوع نہیں بلکہ مشروع و محمود ہے۔ بلکہ علماء سوء کے مفاد کے ازالہ کے لئے ضروری بھی ہے۔

لیجاری: مجارات سے ہے تکبر و تعلی اور فخر و مباہات کو کہتے ہیں۔ [1]

لیماری: ممارات سے ہے جھگڑے اور مقابلہ کو کہتے ہیں۔ [2]

او یصرف: یعنی لوگوں کی توجہات اور مدح و تعریف کے جذبات کو اپنی طرف کھینچ کر لانا چاہتا ہے۔ تاکہ اس کی آڑ میں وہ اپنی اغراض فاسدہ کو حاصل کرے۔ دینی فکر اور سوچ کے لئے نہیں بلکہ دنیوی مقاصد کے لئے اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کی غرض سے علم حاصل کیا ہے۔ گویا وہ یہ کہتا ہے: [3]

یا اللہ میری پیری میں زور رہنے دے چشم عالم کو کور رہنے دے

دنیا کے حصول کے لئے علم جنت سے محروم کر دیتا ہے

﴿۲۷﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللهِ لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِي رِيحَهَا.

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ) [4]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس نے اس علم کو جس سے اللہ کی رضا طلب کی جاتی ہے اس غرض سے سیکھا کہ وہ اس کے ذریعہ دنیا کی متاع حاصل کرے تو قیامت کے دن اسے جنت کی خوشبو بھی میسر نہیں ہوگی“۔ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

توضیح: علما: یعنی علم حاصل کرنے سے غرض صرف اور صرف دنیا ہو تو اس کے لئے یہ وعید ہے اگر حصول علم سے غرض حفاظت دین اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا ہو اور پھر اس پر ترتب دنیا ہو جائے اور دنیا بھی اس کو حاصل ہو جائے تو

---

[1] المرقات ۱/۴۸۲ [2] المرقات ۱/۴۸۲ [3] المرقات ۱/۴۸۲

[4] اخرجه احمد ۲/۳۳۸ وابو داؤد ۳۶۶۴ وابن ماجه ۲۵۳

اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دین اور دنیا دونوں ایسے عالم کو دیتا ہے۔ [1]

لم یجد عرف الجنة: یعنی جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔ [2]

سؤال: یہاں یہ شبہ ہے کہ جب یہ شخص کبھی بھی جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص تو کافر ہو گیا حالانکہ شرعی قاعدہ ایسا نہیں۔

پہلا جواب: اس شبہ کے دو جواب ہیں اول جواب یہ ہے کہ دخول اولی کے ساتھ جنت کی خوشبو نہیں سونگھ سکے گا۔ بلکہ سزا و عذاب بھگتنے کے بعد جنت میں جائے گا۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے علم حاصل کیا ہو اور اغراض دنیویہ سے بالا ہو کر دین کی خدمت کی ہو وہ میدانِ حشر میں جنت کے داخلے سے پہلے جنت کی خوشبو سونگھ سکے گا۔ کیونکہ ان کے مسامات کھلے ہوں گے تو میدانِ حشر میں اس خوشبو سے لطف اٹھائے گا۔ لیکن جس شخص نے دین کو اغراض دنیویہ کے لئے حاصل کیا ہو اور اس میں رضائے الٰہی کا شائبہ نہ ہو تو ان اغراض فاسدہ سے اس کے جسم کے مسامات بند ہو چکے ہوں گے لہٰذا وہ میدان محشر میں جنت کی اس خوشبو سے محروم رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ آئندہ جنت میں داخل بھی ہو جائے گا مگر میدان محشر میں جنت کی خوشبو سے لطف اٹھانے سے محروم ہوگا۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ یہ تغلیظاً تشدیداً تہدیداً فرمایا ہے۔ [3]

احادیث پڑھانے والوں کی فضیلت

﴿۲۸﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَأَدَّاهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ ثَلَاثٌ لَا يَغِلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ مُسْلِمٍ إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ وَالنَّصِيْحَةُ لِلْمُسْلِمِيْنَ وَلُزُوْمُ جَمَاعَتِهِمْ فَإِنَّ دَعْوَتَهُمْ تُحِيْطُ مِنْ وَرَائِهِمْ۔ (رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي الْمَدْخَلِ وَرَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه وَالدَّارِمِيُّ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ إِلَّا أَنَّ التِّرْمِذِيَّ وَأَبَا دَاوُدَ لَمْ يَذْكُرَا ثَلَاثٌ لَا يَغِلُّ عَلَيْهِنَّ إِلَى آخِرِهِ) [4]

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ اس بندے کو تازہ رکھے (یعنی اس کی قدر و منزلت بہت ہو) اور اسے دین و دنیا کی خوشی اور مسرت کے ساتھ رکھے) جس نے میری کوئی بات سنی اور اسے یاد رکھا اور ہمیشہ یاد رکھا اور اس کو جیسا سنا ہو بہو لوگوں تک پہنچایا کیونکہ بعض حامل فقہ (یعنی علم دین کے حامل) فقیہ (یعنی سمجھدار) نہیں ہوتے اور بعض حامل فقہ ان لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ ہوتے ہیں اور تین چیزیں ایسی ہیں جن میں مسلمانوں کا دل خیانت نہیں کرتا ایک تو عمل خاص طور پر خدا کے لئے کرنا، دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کرنا اور تیسرے

---

[1] المرقات ۱/۴۸۳　[2] المرقات ۱/۴۸۴　[3] المرقات ۱/۴۸۴　[4] اخرجه احمد ۱/۴۳۶ وابن ماجه ۲۳۲ والترمذی ۲۶۵۷

مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا اس لئے کہ جماعت کی دعا ان کو چاروں طرف سے گھیری ہوئی ہے"۔ (شافعی، بیہقی ودر مدخل)

توضیح: غیر فقیه: یعنی حدیث کے الفاظ یاد رکھنے والے بعض علماء تو ایسے ہوتے ہیں جو فقاہت اور زیادہ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے ہیں وہ الفاظ کے تو ماہر ہوتے ہیں مگر استنباط سے قاصر رہتے ہیں، اور مسائل کے استخراج سے عاجز رہتے ہیں۔ اور الفاظ کے یاد رکھنے والے بعض علماء سمجھدار تو ہوتے ہیں مگر وہ جن کے سامنے حدیث کو بیان کریں گے بسا اوقات وہ سننے والے اس سنانے والے سے زیادہ سمجھدار اور فقیہ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا حدیث یاد رکھنے والوں کو چاہئے کہ وہ حدیث کو اپنے الفاظ کے ساتھ بحفاظت دوسروں تک پہنچایا کریں۔ [1]

اس حدیث میں "اداها" کے الفاظ سے تبلیغ اور آگے پہنچانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ لیکن بعض اوقات اس تبلیغ واشاعت میں کچھ رکاوٹیں پیش آتی ہیں مثلاً ریاکاری یا حسد یا کنارہ کشی اور گوشہ نشینی اس تبلیغ سے مانع بنتے ہیں۔ اسی کے بیان کے لئے آنے والا جملہ ارشاد فرمایا۔

ثلاث لا یغل علیهن: اگر لَا يَغِلُّ یاء کے زبر کے ساتھ ہو اور غین کے زیر کے ساتھ ہو تو یہ "غل" حسد اور کینہ کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں حدیث شریف کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اخلاص عمل اور مسلمانوں کی بھلائی نصیحت، خیر خواہی اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ جڑا رہنا یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن پر کسی مسلمان کے دل میں کسی قسم کا حسد اور کینہ باقی نہیں رہ سکتا ہے۔ کوئی بھی مسلمان ان تین چیزوں کے متعلق تبلیغ واشاعت میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

اور اگر "لا یغل" یاء کے پیش اور غین کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا جائے تو یہ لفظ غلول سے ہو کر خیانت کے معنی میں ہوگا۔ غلول مال غنیمت میں خیانت کو بھی کہتے ہیں۔ اس صورت میں حدیث شریف کا مطلب یہ ہوگا کہ ان تین چیزوں میں مسلمان کا دل خیانت نہیں کر سکتا ہے۔ بلکہ ہر مسلمان ان تین چیزوں کے متعلق تبلیغ واشاعت میں بغیر کسی خیانت کے دلچسپی لے گا۔ اس تشریح سے حدیث شریف کے تمام حصوں میں جوڑ اور ربط پیدا ہو گیا۔ [2]

فان دعوتهم: یہ جملہ اس سے قبل "ولزوم جماعتهم" کے لئے تفصیل اور علت ہے۔ اور فاء کو تفصیل وتوضیح کے لئے لیا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو قلبی طور پر مسلمانوں کی جماعت سے وابستہ رہنا چاہئے کیونکہ مسلمانوں کی جماعت کی دعائیں سب کے لئے عام ہیں۔ وہ جماعت میں شامل ہو کر ان دعاؤں کا مستحق بن سکتا ہے۔ [3]

﴿۲۹﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ نَضَّرَ اللهُ اِمْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى لَهُ مِنْ سَامِعٍ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ) [4]

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس

---

[1] المرقات ۱/۴۸۵ [2] المرقات ۱/۴۸۶ [3] المرقات ۱/۴۸۶ [4] اخرجه الترمذی ۲۶۵۶ ابن ماجه ۲۱۰۵

شخص کو تازہ رکھے (یعنی خوش اور باعزت رکھے) جس نے مجھ سے کوئی بات سنی اور جس طرح سنی تھی اسی طرح اسے دوسروں کو پہنچائی۔ چنانچہ اکثر وہ لوگ جنہیں پہنچادی جاتی ہے سننے والے سے زیادہ یادرکھنے والے ہوتے ہیں''۔ (ترمذی، ابن ماجہ) اور دارمی نے اس حدیث کو ابودرداء سے روایت کیا ہے۔

احادیث میں جھوٹ بولنا موجب نار ہے

﴿۳۰﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِتَّقُوا الْحَدِيثَ عَنِّي إِلَّا مَا عَلِمْتُمْ فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ وَجَابِرٍ وَلَمْ يَذْكُرْ اِتَّقُوا الْحَدِيثَ عَنِّي إِلَّا مَا عَلِمْتُمْ)[1]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''میری جانب سے حدیث بیان کرنے سے بچو مگر اس حدیث کو بیان کرو جسے تم (سچ) جانو چنانچہ جس شخص نے (جان) کر مجھ پر جھوٹ بولا تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں تلاش کرے''۔ (ترمذی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے) (حدیث کے پہلے جزء) کہ میری جانب سے حدیث بیان کرنے سے بچو مگر جسے تم سچ جانو کا ذکر نہیں کیا۔

قرآن کی تفسیر میں رائے شامل نہ کرو

﴿۳۱﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ وَفِي رِوَايَةٍ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جس شخص نے قرآن مجید کے اندر اپنی عقل سے کچھ کہا اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تلاش کرے''۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ''جس شخص نے بغیر علم کے قرآن میں کچھ کہا اسے چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں تلاش کرے''۔ (ترمذی)

﴿۳۲﴾ وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ)[3]

ترجمہ: حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے قرآن پاک میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور وہ حقیقت اور واقع کے مطابق بھی ہو اس نے تب بھی غلطی کی''۔ (ترمذی وابوداؤد)

[1] اخرجه الترمذی ۲۹۵۰ وابن ماجه [2] اخرجه الترمذی ۲۹۵۰ [3] اخرجه الترمذی ۲۹۵۲ وابو داؤد ۳۶۵۲

توضیح: **برأیه:** تفسیر اسے کہتے ہیں کہ قرآن کا مطلب مفسرین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور احادیث اور اہل لغت کی لغت کے مطابق ہو، تاویل اسے کہتے ہیں کہ کسی آیت کے معانی و مطالب کو بطور احتمال بیان کیا جائے۔ کہ میں جو معنی بتا رہا ہوں ممکن ہے کہ مطلب اسی طرح ہو۔ یہ تاویل اس وقت جائز ہے جب اس کا مطلب لغت اور شریعت کے قواعد کے مطابق ہو۔ اور جس شخص نے نہ علماء کی تفسیر کو دیکھا اور نہ احادیث اور شریعت اور لغت کا لحاظ رکھا محض اپنی عقل و دانش کے زور پر آیت کی تفسیر کی یہ غلط اور ناجائز ہے۔ اگرچہ اتفاقی طور پر وہ تفسیر صحیح بھی ہو کیونکہ اس شخص نے ابتدا سے جو مطلب بیان کیا ہے اس کی بنیاد ہی صحیح نہ تھی یہ تفسیر بالرائے ہوئی جو درست نہیں۔[1]

قرآن میں جھگڑا ڈالنا کفر ہے

﴿۳۳﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اَلْمِرَاءُ فِي الْقُرْآنِ كُفْرٌ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ)[2]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "قرآن میں جھگڑنا کفر ہے"۔ (احمد و ابو داؤد)

توضیح: **المراء فی القرآن کفر:** مراء جھگڑنے کے معنی میں ہے یعنی جو شخص اپنی خواہش پوری کرنے کی غرض سے قرآن کریم کی آیتوں اور نصوص کو آپس میں ٹکراتا ہے اور اس میں بے جا تاویل کرتا ہے اور ایک آیت کو چھوڑتا ہے ایک کو قبول کرتا ہے یہ کفر ہے مثلاً وہ شخص آیت "ما اصاب من مصیبة فباذن الله" کو آیت "ما اصاب من مصیبة فبما کسبت ایدیکم" سے متعارض بنا کر جھگڑا کھڑا کرتا ہے۔ ایک فریق ایک آیت کو لے کر دوسری کو ٹھکراتا ہے دوسرا فریق ایک آیت کو لے کر دوسری کو ٹھکراتا ہے تو یہ صورت جانبین کے لئے باعث خطر و باعث کفر ہے۔ کیونکہ یہ ایسا خطرناک عمل ہے کہ رفتہ رفتہ اس کی نوبت کفر تک پہنچ سکتی ہے۔[3]

﴿۳۴﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ سَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْمًا يَتَدَارَؤُنَ فِي الْقُرْآنِ فَقَالَ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِهٰذَا ضَرَبُوا كِتَابَ اللهِ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ وَإِنَّمَا نَزَلَ كِتَابُ اللهِ يُصَدِّقُ بَعْضُهُ بَعْضًا فَلَا تُكَذِّبُوا بَعْضَهُ بِبَعْضٍ فَمَا عَلِمْتُمْ مِنْهُ فَقُولُوا وَمَا جَهِلْتُمْ فَكِلُوهُ إِلَى عَالِمِهِ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَه)[4]

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک جماعت کے بارے میں سنا کہ وہ آپس میں قرآن کریم کے بارے میں بحث کر رہے ہیں اور جھگڑ رہے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "بے شک تم سے پہلے کے لوگ اسی سبب سے ہلاک ہوئے انہوں نے کتاب اللہ کے بعض حصے کو بعض پر مارا (یعنی آیات

[1] المرقات ۱/۴۹۱ [2] اخرجه احمد ۲/۲۸۶ و ابو داؤد ۴۶۰۳ [3] المرقات ۱/۴۹۲، ۴۹۳ [4] اخرجه احمد ۲/۱۸۱ و ابن ماجه

میں تضاد اور اختلاف ثابت کیا کہ فلاں آیت اس آیت کے مخالف ہے) اور یہ آیت فلاں آیت کے مخالف ہے۔ اور بے شک کتاب اللہ کا بعض حصہ بعض کی تصدیق کرتا ہے۔ لہٰذا تم قرآن کے بعض حصے کو بعض سے نہ جھٹلاؤ اور اس کے بارے میں جتنا تم جانتے ہو اس کو بیان کرو اور جو نہیں جانتے اسے جاننے والوں کی طرف سونپ دو"۔ (رواہ احمد وابن ماجہ)

توضیح: یتدارئون: یہ "دَرْءٌ" دفع کرنے کے معنی میں ہے مراد بحث و جھگڑا کرنا اور قرآن کریم کی آیتوں کو آپس میں ٹکرانا ہے۔ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ بعض کم فہم اور کج فہم لوگ اپنی نااہلی اور بیمار ذہنیت کی وجہ سے قرآن میں اختلاف پیدا کر کے حق سے ہٹ کر باطل پر ڈٹ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ جب قرآن کریم کی آیتوں کو نہیں سمجھ سکتے تو اس کے علم کو جاننے والے علماء پر چھوڑ دیں اور علماء سے پوچھیں۔ اس حدیث سے تقلید کا ثبوت واضح طور پر ملتا ہے۔ [۱]

قرآن کا سات لغات پر نازل ہونے کا مطلب

﴿۳۵﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ لِكُلِّ آيَةٍ مِنْهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ وَلِكُلِّ حَدٍّ مُطَّلَعٌ۔ (رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ)[۲]

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "قرآن کریم سات طرح پر نازل کیا گیا ہے ہر ایک آیت کے لئے ظاہر ہے اور باطن ہے اور ہر حد کے واسطے ایک جگہ خبردار ہونے کی ہے"۔

(رواہ شرح السنۃ)

توضیح: انزل القرآن علی سبعة احرف: یہ حدیث مشکل ترین احادیث میں سے ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سمجھنے کے لئے اس میں ۴۰ توجیہات کی گئی ہیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں فصاحت اور بلاغت اور لب ولہجہ کے اعتبار سے مختلف اسلوب اور مختلف لغات ہوتے ہیں اسی طرح عربی زبان کی بھی سات لغات عرب میں مشہور تھیں۔ اس حدیث کی تشریحات میں سب سے آسان تشریح وتوجیہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی ہے۔ میں اسی کا خلاصہ لکھ دیتا ہوں کیونکہ یہ حدیث کے مفہوم سے زیادہ اقرب واوفق ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"احرف" حرف کی جمع ہے جو لغات کے معنی میں ہے۔ "ای سبعة لغات" قرآن کا نزول قریش کی لغت میں ہوا تھا مگر اس کے علاوہ عرب میں چھ لغات مشہور اور متعارف تھیں۔ جو یہ ہیں۔

① لغت قریش ② لغت بنوطے ③ لغت بنوتمیم ④ لغت ھوازن ⑤ لغت اہل یمن ⑥ لغت ثقیف ⑦ لغت ھذیل۔

ان قبائل کی لغات چونکہ مختلف تھیں اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کی لغت کو نہیں سمجھتا تھا قرآن کریم کا پڑھنا اور یاد کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اللہ پاک نے سات لغات تک آسانی فرمادی اور سات لغات تک پڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔ [۳]

---

[۱] المرقات ۱/۴۹۳　[۲] اخرجه البغوی فی شرح السنة　[۳] المرقات ۱/۴۹۶

یہ اجازت اس طرح نہیں تھی کہ ہر لغت میں سات طرح پڑھنا ہوتا تھا بلکہ مجموعی اعتبار سے ان لغات کی تعداد سات تک پہنچ گئی تھی۔ قبائل کا یہ اختلاف ایسا ہی تھا جیسا کہ پشتو زبان میں مختلف قوموں کے ہاں لحاف کے مختلف نام ہیں مثلاً
① بڑستن ② رضائی ③ کنجڑ ④ تلتک ⑤ ترنگڑ ⑥ نالئے وغیرہ۔
یہ ایک ہی زبان بولنے والے قبائل کی زبان میں اختلاف ہے۔
سات لغات کا مصداق قراء سبعہ کی سات قرائتیں نہیں ہیں۔ اس آسانی کی ایک مثال وہ واقعہ ہے کہ ایک عرب دیہاتی کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یہ آیت پڑھا رہے تھے۔ "**طعام الاثیم**" وہ شخص اثیم کے لفظ کو زبان سے ادا نہیں کرسکتا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "**ان طعام الفاجر**" پڑھا کرو وہ اسی طرح سے پڑھنے لگا۔ یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک تک چلتا رہا۔[1]
پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اصرار پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ قرآن کریم کو لکھ کر ایک جگہ جمع کیا جائے اس لحاظ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جامع قرآن مشہور ہو گئے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مختلف قبائل اسلام میں داخل ہو گئے اور قرآن کی ان سات لغات کے اختلاف کی وجہ سے آپس میں تنازعات شروع ہو گئے تو عراق کے گورنر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس امت کو اختلاف وافتراق سے پہلے پہلے بچا لیجئے۔ تب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن کریم ابتدا میں لغت قریش پر اترا تھا۔ لہٰذا اس لغت کے مطابق قرآن کو جمع کیا جائے اور لغت قریش کے علاوہ لغات کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع بھی ہو گیا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جامع قرآن کے نام سے مشہور ہو گئے۔
اس میں قرآن عظیم کے کسی حکم یا کسی آیت میں تبدیلی قطعاً نہیں ہوئی جیسا کہ شیعہ حضرات کی غلط فہمی ہے۔ بلکہ سات طرح پڑھنے کو ایک طرح پڑھنے کا حکم دیا گیا تاکہ اختلاف وافتراق ختم ہو جائے۔
لکل آیۃ منہا ظہر وبطن: اس جملہ کا ایک مطلب یہ ہے کہ ہر آیت کا ایک ظاہری معنی ہے اور ایک تاویلی اور باطنی معنی ہے۔ تو تاویل باطن ہے اور ظاہر ظاہر ہے۔
دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر آیت کا ایک ظاہری معنی ہے جو تمام اہل زبان اور علمائے اسلام سمجھتے ہیں اور ایک باطنی معنی ہے جس کو علماء باطن اور اہل معرفت وطریقت سمجھتے ہیں۔
تیسرا مطلب یہ ہے کہ ہدایت کا ایک ظاہر ہے یعنی ان معانی کا تعلق اعمال ظاہرہ سے ہے اور ایک باطن ہے یعنی احکام باطنیہ سے بھی اس کا تعلق ہے۔[2]
ولکل حد مطلع: یعنی ہر حد وسرحد کے واسطے خبردار ہونے اور اطلاع پانے کی جگہ ہے۔ "حد" نہایت اور طرف کے معنی میں ہیں۔ اور "**مطلع**" پہنچنے کے مقام کو کہتے ہیں۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ ہر آیت کے ظاہر اور باطن کی ایک حد اور طرف

[1] المرقات ۱/۵۰۰ [2] المرقات ۱/۴۹۷، ۴۹۸

ہے۔ اور اس حد وطرف کا ایک ایسا مقام ہے جس پر پہنچنے اور اس کو حاصل کرنے کے بعد آدمی اس حد ونہایت پر مطلع ہو جاتا ہے۔
تو آیت کے ظاہر پر مطلع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عربی زبان کے اصول وقواعد سیکھے جائیں علم صرف ونحو اور علم لغت کو سمجھا جائے اور آیت کا شانِ نزول اور ناسخ ومنسوخ کا علم حاصل کر لیا جائے یہ ظاہر تک پہنچنے کا مطلع اور مقام ہے۔
باطن کا مطلع یہ ہے کہ ریاضت ومجاہدہ کر کے قرآن حکیم کے احکام ومعانی پر عمل کیا جائے۔ عبادت سے اپنے دل ودماغ کو روشن کر کے قرآن کریم کے معارف واسرار کو حاصل کیا جائے۔[1]

۱۳ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ

اصل علم کس چیز کا نام ہے

﴿۳۶﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ اٰيَةٌ مُحْكَمَةٌ اَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ اَوْ فَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ وَمَا كَانَ سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ فَضْلٌ۔ (رَوَاهُ اَبُوْ دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَة)[2]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کہ علم تین ہیں: ① آیت محکم (یعنی مضبوط) ② سنت قائمہ ③ فریضہ عادلہ اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ زائد ہے''۔ (رواہ ابوداود وابن ماجہ)

توضیح: **العلم:** اس سے مراد علم دین ہے تو علم دین تین قسم پر ہیں۔[3]

① **آية محكمة:** یہ وہ احکام ہیں جو محکم بلا تردد اور واضح ہوں اور ان میں نسخ کا امکان نہ ہو اور نہ ان میں اشتباہ ہو۔ لہٰذا متشابہات کا رجوع انہی محکمات کی طرف ہوتا ہے اس جملہ سے کتاب اللہ کی حیثیت کی طرف اشارہ ہے۔[4]

② **او سنة قائمة:** سنت قائمہ سے مراد غیر منسوخ سنت ہے اس جملہ سے سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ ہے:[5]

العلم ما قال الله وقال الرسول به وما سوى ذاك وسواس الشياطين

او فريضة عادلة: یعنی وہ احکامات جو بطریق استنباط قرآن وحدیث دونوں سے مستخرج ہوں۔[6]

عادلة: یعنی معادلة مساویة جو کتاب وسنت کے مساوی ہوں اس سے مراد اجماع اور قیاس ہے۔ یہ مساوات نفس وجوب عمل میں ہے مرتبہ اور وجوب میں نہیں ہے۔[7]

شرعی منصب دار کے علاوہ کسی کا وعظ جائز نہیں

﴿۳۷﴾ وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْاَشْجَعِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُصُّ اِلَّا اَمِيْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ اَوْ مُخْتَالٌ۔
(رَوَاهُ اَبُوْ دَاوُدَ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ وَفِيْ رِوَايَتِهٖ اَوْ مُرَاءٍ بَدَلَ اَوْ مُخْتَالٌ)[8]

[1] المرقات ۱/۵۰۱ [2] اخرجه ابو داؤد ۲۸۸۵ وابن ماجه ۵۴ [3] المرقات ۱/۵۰۱ [4] المرقات ۱/۵۰۱
[5] المرقات ۱/۵۰۱ [6] المرقات ۱/۵۰۱ [7] المرقات ۱/۵۰۱ [8] اخرجه ابو داؤد ۳۶۶۵

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تین آدمی قصہ (وعظ) بیان کریں گے حاکم یا محکوم یا تکبر کرنے والا'' (رواہ ابوداؤد) اور دارمی نے اس حدیث کو عمرو بن شعیب سے روایت کیا ہے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے اور دارمی کی روایت میں لفظ ''مختال'' (یعنی تکبر کرنے والا) کے بجائے ''مراء'' (ریا کار) ہے۔

توضیح: **لا یقص: قص یقص۔ قُصاص** اور **قاص** واعظ کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جمعہ وعیدین اور دیگر خطبوں کا حق غیر ذمہ دار افراد کو نہیں ہے۔[1]

الا امیر: یعنی وہ امیر جو شرعاً مسلمانوں کا خلیفہ یا بادشاہ ہو اور شرعی طور پر بھی ذمہ دار ہو۔[2]

او مامور: یعنی جو شخص شرعی امیر اور حاکم کی طرف سے مامور اور مقرر ہو اور یا براہ راست اللہ پاک کی طرف سے مقرر ہو جیسے علمائے کرام ہیں جبکہ خود حاکم نا اہل جاہل ہو جیسا کہ آج کل کے مسلمان حکمران ہیں۔ جو یا تو جاہل اور منافق ہیں اور یا غیر اعلانیہ کافر ہیں ایسے حالات میں دین اسلام کے احکامات کے سنبھالنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے علمائے حق پر عائد ہوتی ہے۔[3]

او مختال: یہ لفظ اختیال سے تکبر کرنے کے معنی میں ہے۔ ایک لفظ ''مراء'' بھی ہے جس کا معنی ریا کاری ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وعظ ونصیحت تین آدمی کر سکتے ہیں مگر دو کے لئے جائز ہے اور تیسرا متکبر ہے اور دکھاوے والا ہے آج کل جو غیر علماء وعظ وبیان کرتے پھرتے ہیں وہ اس تیسری قسم میں داخل ہیں۔[4]

علم کے بغیر فتویٰ دینا جائز نہیں

﴿۳۸﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ أُفْتِیَ بِغَيْرِ عِلْمٍ كَانَ اِثْمُهُ عَلٰى مَنْ أَفْتَاهُ وَمَنْ اَشَارَ عَلٰى أَخِيْهِ بِأَمْرٍ يَعْلَمُ أَنَّ الرُّشْدَ فِي غَيْرِهٖ فَقَدْ خَانَهُ. (رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ)[5]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جس شخص کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا ہو گا تو اس کا گناہ اس شخص پر ہو گا جس نے اس کو (غلط) فتویٰ دیا ہے۔ اور جس شخص نے اپنے بھائی کو کسی ایسے کام کے بارے میں مشورہ دیا جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ اس کی بھلائی اس میں نہیں ہے تو اس نے خیانت کی''۔ (ابوداؤد)

توضیح: من افتی: فتویٰ پوچھنے والے مستفتی پر لازم ہے کہ وہ عالم اور ماہر مفتی سے مسئلہ پوچھے تاکہ وہ صحیح مسئلہ بتائے اگر پوچھنے والے نے کسی نا اہل سے پوچھا اور اس نے غلط مسئلہ بتا دیا تو اس غلطی میں مفتی اور مستفتی دونوں گنہگار ہوں گے۔ اور اگر پوچھنے والے نے خوب تلاش اور تحقیق واعتماد کے بعد کسی سے مسئلہ پوچھ لیا اور وہ عالم نما صاحب جبہ و دستار تو تھا مگر حقیقت میں نرا جاہل کورا تھا اور اس نے غلط مسئلہ بتا دیا تو گنہگار صرف یہی غیر عالم مفتی ہو گا۔ آج کل اس قسم کے ان پڑھ جاہل بھی فتویٰ دے رہے ہیں اور لوگ مستند علماء کی طرف رجوع نہیں کرتے ہیں۔[6]

[1] المرقات ۱/۵۰۲ [2] المرقات ۱/۵۰۲ [3] المرقات ۱/۵۰۲ [4] المرقات ۱/۵۰۲ [5] اخرجه ابو داؤد ۳۶۵۷ [6] المرقات ۱/۵۰۳

چیستان اور معمہ کا حکم

﴿۳۹﴾ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْأُغْلُوطَاتِ۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوٗدَ)[1]

ترجمہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے مغالطہ دینے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

توضیح: **اغلوطات:** **اغلوطة** کی جمع ہے ہر زبان میں اپنے اپنے انداز سے چیستانیں اور معمے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مغالطات سے منع کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ علمائے کرام کو مغالطہ میں ڈالنے کے لئے ان سے ایسے مسائل نہیں پوچھنے چاہئیں جو پیچیدہ ہونے اور ذو معنی ہونے کی وجہ سے ایذا رسانی اور تکلیف پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً کسی نے کسی سے پوچھا کہ تم فرعون پر ایمان لاتے ہو یا نہیں؟ اب اگر وہ کہتا ہے کہ میں ان پر ایمان لاتا ہوں تو سائل کہتا ہے کہ تم کافر ہوگئے۔ اور اگر وہ کہتا ہے کہ میں فرعون کو نہیں مانتا ہوں تو سائل کہتا ہے کہ فرعون کا قصہ اور تذکرہ قرآن مجید میں جگہ جگہ آیا ہے تم نے قرآن کا انکار کیا۔ یا کوئی آدمی کہتا ہے۔ "**من قال قال الله فقد کفر**" اب سننے والا قال کو قول سے سمجھتا ہے اور بولنے والا اس کو قیلولہ سے لیتا ہے اس میں ایمان کے لئے خطرات ہیں تو اس سے منع فرمایا۔[2]

خلاصہ یہ ہے کہ چیستان اگر غیر کی تذلیل اور توہین کے لئے ہو تو منع ہے ہاں ویسے خوش طبعی اور تشحیذ اذہان کے لئے اگر کوئی کرے تو وہ جائز ہے۔ جیسے "**قال زید تحت الشجرة فنقض وضوئه**" یا "**النار فی الشتاء خیر من الله ورسوله**"۔ یہاں من قسم کے لئے ہے۔ یا اَنَّ زَیْدٌ کَرِیْحٍ وغیرہ وغیرہ۔

علم میراث پڑھنے کی اہمیت

﴿۴۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَالْقُرْآنَ وَعَلِّمُوا النَّاسَ فَإِنِّيْ مَقْبُوْضٌ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[3]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم فرائض (یعنی فرض چیزیں، یا علم فرائض) اور قرآن کریم سیکھ لو اور دوسروں کو بھی سکھاؤ اس لئے کہ میں قبض کیا جاؤں گا"۔ (یعنی اس عالم سے اٹھا لیا جاؤں گا)۔
(رواہ ترمذی)

توضیح: **الفرائض:** اس سے مراد قرآن وحدیث سے ثابت شدہ احکام ہیں۔ یا علم میراث مراد ہے۔ کیونکہ علم الفرائض میراث کا نام ہے۔ اور یہ طے شدہ امر ہے کہ علوم میں سب سے پہلے اٹھایا جانے والا علم علم میراث ہی ہوگا۔[4]

فانی مقبوض: دوسری توجیہ پر یہی قرینہ ہے۔ کہ میں دنیا سے اٹھنے والا ہوں تم علم میراث کا زیادہ اہتمام کرو۔ اور لوگوں کو بھی سکھاؤ۔

---

[1] اخرجه ابو داؤد ۳۶۵۶ [2] المرقات ۱/۵۰۳ [3] اخرجه الترمذی ۲۰۹۱ [4] المرقات ۱/۵۰۴

والقرآن: یعنی قرآن مجید سیکھنے کا اہتمام کیا کرو کیونکہ اس امت کے لئے میرے بعد قرآن مجید ہی ہدایت کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر الفرائض سے احکام فرضیہ مراد لیا جائے تو پھر والقرآن بطور تاکید ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو جائے۔[۱]

﴿۴۱﴾ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَشَخَصَ بِبَصَرِهِ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ قَالَ هٰذَا أَوَانٌ يُخْتَلَسُ فِيهِ الْعِلْمُ مِنَ النَّاسِ حَتّٰى لَا يَقْدِرُوا مِنْهُ عَلٰى شَيْءٍ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[۲]

ترجمہ: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ہم سرکار دو عالم ﷺ کے ہمراہ تھے کہ آپ ﷺ نے اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا "یہ وقت ہے کہ علم آدمیوں میں سے جاتا رہے گا یہاں تک کہ وہ علم کے ذریعے کسی چیز پر قدرت نہ رکھیں گے"۔ (ترمذی)

توضیح: یختلس: اختلاس اچکنے اور اٹھنے کے معنی میں ہے۔ اور علم سے مراد علم وحی ہے۔[۳]

آنحضرت ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ وحی کے انتظار میں آپ ﷺ اکثر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے رہتے تھے۔ اس دفعہ دیکھنے کے دوران آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے سے آپ کی وفات کی خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب وقت آگیا ہے کہ وحی آنا بند ہو جائے اس سے آپ ﷺ نے اپنی وفات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

مدینہ کا عالم بڑا عالم ہوگا

﴿۴۲﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رِوَايَةً يُوشِكُ أَنْ يَضْرِبَ النَّاسُ أَكْبَادَ الْإِبِلِ يَطْلُبُونَ الْعِلْمَ فَلَا يَجِدُونَ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْ عَالِمِ الْمَدِينَةِ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِي جَامِعِهِ قَالَ ابْنُ عُيَيْنَةَ إِنَّهُ مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ وَمِثْلُهُ عَنْ عَبْدِ الرَّزَّاقِ وَقَالَ إِسْحَاقُ ابْنُ مُوسٰى وَسَمِعْتُ ابْنَ عُيَيْنَةَ أَنَّهُ قَالَ هُوَ الْعُمَرِيُّ الزَّاهِدُ وَاسْمُهُ عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ)[۴]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ زمانہ قریب ہے کہ جب لوگ علم حاصل کرنے کے لئے اونٹوں کے جگر پھاڑ ڈالیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم کسی کو نہیں پائیں گے"۔

(ترمذی) اور جامع ترمذی میں ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ مدینہ کے وہ عالم مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اور عبدالرزاق نے بھی یہی لکھا ہے اور اسحق ابن موسیٰ کا بیان ہے کہ میں نے ابن عیینہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ مدینہ کا وہ عالم عمری زاہد ہے۔ (یعنی وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خاندان سے ہے) جن کا نام عبدالعزیز بن عبداللہ ہے۔

توضیح: یضرب الناس: ضرب مارنے کے معنی میں آتا ہے لیکن یہاں مراد سفر ہے الضرب سفر کے معنی میں آتا ہے۔[۵]

اکباد: کبد کی جمع ہے جگر کو کہتے ہیں اونٹوں کے جگر مارنے کے لفظ میں تیز اور سریع چلنے کا استعارہ ہے۔ کیونکہ جب کوئی

---

[۱] المرقات ۱/۵۰۴ [۲] اخرجه الترمذی ۲۶۵۳ [۳] المرقات ۱/۵۰۴ [۴] اخرجه الترمذی ۲/۲۹۹ [۵] المرقات ۱/۵۰۴

جانور تیز دوڑتا ہے تو اس کے جگر میں حرکت آتی ہے گویا جگر کو مارا جاتا ہے بہر حال اس جملہ سے دور دراز کا سفر مراد ہے۔[1]

من عالم المدينة: حدیث شریف کی یہ پیشین گوئی ایک خاص زمانے کے مخصوص عالم کے بارے میں ہے جو مدینہ منورہ میں سکونت پذیر ہوں گے۔ اس پیشین گوئی کے مصداق زیادہ تر علماء کے نزدیک "**امام دار الهجرة امام مالك**" ہیں۔ سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ اور مشہور محدث شیخ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حدیث کا مصداق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا ہے۔ بعض نے کہا کہ اس سے مراد عمری زاہد ہیں جن کا نام عبدالعزیز بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ ہے۔

بعض نے کہا اس سے مراد خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز ہیں مگر راجح پہلا قول ہے کیونکہ دنیا بھر کے دور دراز علاقوں سے ہزاروں شاگرد اونٹوں کو ہنکا کر مدینہ آیا کرتے تھے۔ اور خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ واقعی مدینہ منورہ کے عالم بھی تھے۔ کیونکہ پیشاب اور قضاء حاجت کے سوا آپ کبھی مدینہ منورہ سے باہر نہیں جاتے تھے۔ ایسا اور کون ہوسکتا ہے؟[2]

مجدّد کون ہوتا ہے

﴿۴۳﴾ وَعَنْهُ فِيمَا أَعْلَمُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا. (رَوَاهُ أَبُو دَاوُد)[3]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ اس امت کے نفع کے واسطے ہر سو ۱۰۰ برس پر ایک شخص کو بھیجتا ہے جو اس کے دین کو تازہ کرتا ہے"۔

(ابوداؤد)

توضیح: یبعث: بھیجنے اٹھانے اور پیدا کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[4]

من یجدد: یہ لفظ تجدید سے جدت کے معنی میں ہے۔ یعنی ہر صدی کے موقع پر اللہ تعالیٰ ایک مجدد کو پیدا کر کے کھڑا کرتے ہیں۔ ہر صدی اور سو سال پر ایک قرن ختم ہو جاتا ہے۔ جب پہلے علماء وصلحاء ختم ہو جاتے ہیں یا کمزور پڑ جاتے ہیں تو بدعات، رسومات اور طرح طرح کے مفاسد دین میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ علمائے کرام اور مجددین کو اٹھاتا ہے جو دین اور غیر دین میں امتیاز کر کے رسوم و بدعات کو مٹا کر دین کی اصلاح کرتے ہیں۔ ساری دنیا کے لئے ایک مجدد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ الگ الگ علاقوں اور ملکوں کے لئے ایک زمانہ میں کئی مجدد ہوسکتے ہیں۔ بلکہ ایک صالح جماعت بھی مجدد کہلائی جاسکتی ہے۔ لیکن مجدد کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی حرکات وسکنات اور اعمال وافعال کا سلسلہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑا ہوا ہو اور اس کی وجہ سے علمی وعملی اعتبار سے دین کو غلبہ حاصل ہو۔ جس کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے میں حدیث ہو ہر محرک مجدد نہیں ہوتا کیونکہ شاعر نے کہا ہے:[5]

ہزار نکتۂ باریک تر زمو این جا است نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

[1] المرقات ۱/۵۰۵ [2] المرقات ۱/۵۰۵ [3] اخرجه ابو داؤد ۴۲۹۱ [4] المرقات ۱/۵۰۶ [5] المرقات ۱/۵۰۶

دین کی حفاظت

﴿۴۴﴾ وَعَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْعُذْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ۔

(رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ كِتَابِ الْمَدْخَلِ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ جَابِرٍ فَاِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ فِيْ بَابِ التَّيَمُّمِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى)

ترجمہ: حضرت ابراہیم بن عبد الرحمن عذری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ہر آئندہ آنے والی جماعت میں سے اس کے نیک (یعنی ثقہ اور معتمد) لوگ اس علم (کتاب وسنت) کو حاصل کریں گے۔ اور وہی لوگ اس (علم) کے ذریعہ (آیات واحادیث) میں حد سے گزرنے والوں کی تحریف کو باطلوں کی افتراء پردازی اور جاہلوں کی تاویلات کو دور کریں گے"۔ (اس حدیث کو بیہقی نے اپنی کتاب مدخل میں عذری سے نقل کیا ہے) اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت (جس کی ابتداء یہ ہے) **فانما شفاء العی السوال** ہم باب تیمم میں بیان کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ![1]

توضیح: یحمل: یہ لفظ اٹھانے کے معنی میں بھی ہے اور اس کا ترجمہ **یحصل** سے بھی کیا جا سکتا ہے۔[2] "**هذا العلم**" کا لفظ **یحمل** کے لئے مفعول بہ ہے اور "**عدوله**" اس کا فاعل ہے۔ "**من کل خلف**" **یحمل** سے متعلق ہے۔ **عدل عادل** سے معتدل اور افراط وتفریط سے پاک اور ثقہ ومعتمد لوگ مراد ہیں۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ **من کل خلف** میں اگر من زائد ہو جائے تو یہ **یحمل** کا فاعل اور **عدوله** اس سے بدل بن جائے گا۔[3]

خلف: پیچھے آنے والے اچھے لوگوں کو کہتے ہیں یہاں اچھے لوگوں کی جماعت مراد ہے۔[4]

غالین: غلو سے غالی کی جمع ہے حد سے گزرنے کے معنی میں ہے یہاں دین میں غلو کرنے والے مبتدعین اور اہل بدعت مراد ہیں۔[5]

انتحال: جھوٹی نسبت کو کہتے ہیں یعنی اہل باطل کی جھوٹی نسبتیں جو وہ علماء اور بزرگوں کی طرف کرتے ہیں اور جھوٹے حوالہ جات دیتے رہتے ہیں۔[6]

وتاویل الجاهلین: یعنی آیتوں میں یہ جاہل لوگ بے موقع تاویلیں کرتے ہیں۔ اور آیتوں کو اپنے مقصد میں بے جا چسپاں کرتے ہیں۔

اس حدیث میں دینِ اسلام کی حفاظت کی طرف اشارہ ہے۔ کہ ہر زمانے میں جید علمائے کرام افراط وتفریط سے پاک ہو کر دین حق کی سرحدات کی حفاظت کے لئے موجود ہوں گے۔ جو دین میں تین قسم کے ڈاکوؤں کا مقابلہ کریں گے۔

---

[1] اخرجه البيهقي [2] المرقات ۱/۵۰۸ [3] المرقات ۱/۵۰۸ [4] المرقات ۱/۵۰۸ [5] المرقات ۱/۵۰۸ [6] المرقات ۱/۵۰۸

ڈاکوؤں کا پہلا طبقہ وہ ہے جو اس میں اپنے مقصد کے لئے تحریف کرتا ہے جیسے قادیانی، پرویزی وغیرہ۔
ڈاکوؤں کا دوسرا طبقہ وہ ہے جو اس میں جھوٹے قصے اور بزرگوں کی طرف غلط خیالات منسوب کر کے اپنے مقاصد کو پورا کرتا ہے جیسے روافض اور اہل بدعت وغیرہ ہیں۔
تیسرا طبقہ وہ ہے جو جاہل ہے وہ اپنی جہالت کی وجہ سے آیتوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ آج کل اس کا مصداق وہ ماڈرن طبقہ ہے جو دانشوروں، پروفیسروں اور ججوں پر مشتمل ہے۔ جو قرآن وحدیث کے حکموں کو اپنی عقل و دانش کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور اس میں طرح طرح کی مکروہ تاویلیں کرتے ہیں۔[1]
گویا:

؎ خود بدلتے نہیں قرآن بدل دیتے ہیں

۱۵ صفر ۱۴۱۰ھ

الفصل الثالث

طالب علم کی انتہائی فضیلت

﴿۴۵﴾ عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْاِسْلَامَ فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ. (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے بطریق مرسل روایت ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جس شخص کی موت اس حال میں آئے کہ وہ علم حاصل کر رہا ہو اور (وہ علم) اس غرض سے (حاصل کر رہا ہو) کہ وہ اس کے ذریعہ سے اسلام کو رائج کرے گا تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا''۔ (اور وہ مرتبۂ نبوت ہے)۔ (دارمی)

توضیح: فبینه: جنت میں ۱۰۰ درجے ہیں۔ جو انبیائے کرام کو ملیں گے۔ اور جو انبیائے کرام کے نائبین علماء ہیں ان کو ۹۹ درجے ملیں گے۔ اس وجہ سے ان کے اور انبیائے کرام کے درمیان ایک درجے کا فرق بتایا گیا ہے اور یہ درجہ نبوت کا ہے۔ کہ علم دین کے احیاء واشاعت کے لئے جو عالم وطالب محنت کرتے کرتے مرجاتا ہے تو نبوت کے علاوہ تمام درجے اس کو ملیں گے۔
حسن سے مراد حسن بصری رحمہ اللہ ہیں۔ تابعین کے طبقے میں جب مطلق حسن کا نام آجائے اس سے مراد حسن بصری ہوتے ہیں۔ اور صحابہ کے طبقہ میں جب مطلق عبد اللہ کا نام آجائے تو اس سے مراد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہوتے ہیں۔[3]

---

[1] المرقات ۱/۵۰۹　[2] اخرجه الدارمی ۳۵۸　[3] المرقات ۱/۵۱۰

عابد پر عالم کی انتہائی فضیلت

﴿۴۶﴾ وَعَنْهُ مُرْسَلًا قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلَيْنِ كَانَا فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ أَحَدُهُمَا كَانَ عَالِمًا يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ وَالْآخَرُ يَصُوْمُ النَّهَارَ وَيَقُوْمُ اللَّيْلَ أَيُّهُمَا أَفْضَلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضْلُ هٰذَا الْعَالِمِ الَّذِي يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ عَلَى الْعَابِدِ الَّذِي يَصُوْمُ النَّهَارَ وَيَقُوْمُ اللَّيْلَ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ. (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مرسل روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے بنی اسرائیل کے دو آدمیوں کے بارے میں سوال کیا گیا، ان میں سے ایک تو عالم تھا جو فرض نماز پڑھتا تھا اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو علم سکھاتا تھا۔ اور دوسرا شخص وہ تھا جو دن کو تو روزے رکھتا تھا اور تمام رات عبادت کیا کرتا تھا۔ (چنانچہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا) کہ ان دونوں میں بہتر کون ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس عالم کو جو فرض نماز پڑھتا ہے اور بیٹھ کر لوگوں کو علم سکھاتا ہے اس عابد پر جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات میں عبادت کرتا ہے ایسی فضیلت حاصل ہے جیسی کہ مجھے تمہارے ایک ادنیٰ آدمی پر ہے"۔ (دارمی)

عالم کو بے نیاز رہنا چاہیے

﴿۴۷﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نِعْمَ الرَّجُلُ الْفَقِيْهُ فِي الدِّيْنِ إِنْ أُحْتِيْجَ إِلَيْهِ نَفَعَ وَإِنْ أُسْتُغْنِيَ عَنْهُ أَغْنٰى نَفْسَهُ. (رَوَاهُ رَزِيْنٌ)

ترجمہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "بہتر شخص وہ ہے جو دین کی سمجھ رکھتا ہو۔ اگر اس کے پاس کوئی حاجت لائی گئی تو اس نے نفع پہنچایا۔ اور اگر اس سے بے پرواہی برتی گئی تو اس نے (بھی) اپنے نفس کو بے پرواہ رکھا"۔ (رزین)

توضیح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک عالمِ دین کی یہ شان ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کا محتاج کر کے اپنی حیثیت کو کمزور و کمتر نہ کرے۔ اور اپنے غلط مقاصد اور دنیوی اغراض کی وجہ سے عوام اور ظالم جہال کی طرف نہ جھکے اور نہ لالچ رکھے۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے علوم کو چھپا کر مخلوقِ خدا سے الگ تھلگ ہو کر اپنے علوم سے ان کو محروم رکھے۔ جب عوام الناس کو اس کے علم کی ضرورت ہو اور دوسرا کوئی عالم متعین نہ ہو تو اس صورت میں عوام سے ربط و ارتباط رکھنا ضروری ہے۔

[1] اخرجه الدارمی ۳۴۵

ہاں اگر عوام بالکل کسی چیز میں اس عالم کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں اور اس سے لاپرواہی برتتے ہیں اور اس سے علمی استفادہ کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں تو اس عالم کو بھی جائز ہے کہ وہ ان سے مستغنی اور بے پرواہ ہو جائے۔ اور اپنی عبادات اور علمی مشاغل میں مصروف ہو جائے۔ کیونکہ "لیس للمسلم ان یذل نفسه" بھی ایک حدیث ہے۔[1]

زیادہ وعظ نہ کرو

﴿۴۸﴾ وَعَنْ عِكْرِمَةَ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ حَدِّثِ النَّاسَ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّةً فَإِنْ أَبَيْتَ فَمَرَّتَيْنِ فَإِنْ أَكْثَرْتَ فَثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَلَا تُمِلَّ النَّاسَ هٰذَا الْقُرْآنَ وَلَا أُلْفِيَنَّكَ تَأْتِي الْقَوْمَ وَهُمْ فِي حَدِيثٍ مِنْ حَدِيثِهِمْ فَتَقُصُّ عَلَيْهِمْ فَتَقْطَعُ عَلَيْهِمْ حَدِيثَهُمْ فَتُمِلُّهُمْ وَلٰكِنْ أَنْصِتْ فَإِذَا أَمَرُوكَ فَحَدِّثْهُمْ وَهُمْ يَشْتَهُونَهُ وَانْظُرِ السَّجْعَ مِنَ الدُّعَاءِ فَاجْتَنِبْهُ فَإِنِّي عَهِدْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابَهُ لَا يَفْعَلُونَ ذٰلِكَ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عکرمہ سے فرمایا "تم ہر جمعہ کو ایک بار لوگوں کے سامنے حدیث بیان کرو۔ اگر اسے قبول نہ کرو (یعنی ہفتے میں ایک بار وعظ ونصیحت کو کافی نہ جانو) تو (ہفتہ میں) دو بار اور بہت کرو تو ہفتہ میں تین بار (وعظ ونصیحت کر سکتے ہو) اور تم لوگوں کو اس قرآن سے تنگ نہ کرو (یعنی ہفتہ میں تین بار سے زیادہ وعظ ونصیحت کا بیان کر کے لوگوں کو ملول نہ کرو) اور میں تمہیں اس حالت میں نہ پاؤں کہ تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ اپنی باتوں میں مشغول ہوں اور تم ان کی باتوں کو منقطع کر کے ان کے سامنے وعظ ونصیحت شروع کر دو (اور اس طرح) تم ان کو کبیدہ خاطر کرو۔ ایسے موقع پر تمہیں چاہیئے کہ تم خاموش رہو۔ البتہ وہ اگر تم سے وعظ ونصیحت کی فرمائش کریں تو جب تک اس کے خواہش مند ہوں تم ان کے سامنے حدیث بیان کرو۔ اور تم دعا میں مقفی عبارت سے صرف نظر نہ کرو اور اس سے بچو۔ چنانچہ میں نے معلوم کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور ان کے اصحاب ایسا نہیں کرتے تھے"۔ (یعنی دعا میں مقفی عبارت استعمال نہیں کرتے تھے)۔ (بخاری)

توضیح: کل جمعة مرة: اس حدیث میں اس بات پر زور دیا جارہا ہے کہ وعظ ونصیحت کے معاملہ میں اعتدال اور موقع وماحول کی رعایت ضروری ہے کیونکہ اثر اندازی کے اعتبار سے دعوت وتبلیغ کا یہ بنیادی پتھر ہے۔ جس پر تبلیغ کی کامیابی کا پورا دارومدار ہے۔ اس حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگرد کو پہلی بات یہ بتائی کہ جمعہ میں ایک بار یا زیادہ سے زیادہ تین بار عوام کے سامنے وعظ ونصیحت کر دیا کرو۔

دوسری بات آپ رضی اللہ عنہ نے یہ بتائی کہ قرآن کریم کے ذریعے سے لوگوں کو تنگ نہ کیا کرو۔

تیسری بات یہ بتائی ہے کہ ایسا ہرگز نہ کرو کہ تم کسی قوم کے پاس آجاؤ وہ اپنی گفتگو میں لگی ہوئی ہو اور تم فوراً وعظ شروع کر دو اور ان کی گفتگو کو کاٹ دو بلکہ تم خاموش بیٹھ جاؤ ان کی باتیں سنو اگر وہ تمہیں وعظ ونصیحت کا حکم دیں تو تم ان کی چاہت کے

[1] المرقات ۱/۵۱۱ [2] اخرجه البخاری ۸/۹۱

مطابق مختصر بات چیت کرلو۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جب دعا مانگو تو سجع اور قافیہ سے بچو "انظر" کا مطلب یہ ہے کہ سجع سے بچنے کا خیال رکھو۔ یہاں کاہنوں کی طرح تکلف کر کے سجع بنا کر دعا مانگنے سے منع کیا گیا ہے۔ ورنہ بغیر تکلف اور تصنع کے اگر دعا میں سجع آ گیا تو وہ منع نہیں ہے۔ کیونکہ احادیث میں جو دعائیں وارد ہوئی ہیں ان میں کثرت کے ساتھ سجع موجود ہے۔ جو طبعی کلام میں بغیر تکلف آ گیا ہے سجع مقفیٰ کلام کو کہتے ہیں۔ [1]

ناکام طالب علم بھی کامیاب ہے

﴿۴۹﴾ وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ فَأَدْرَكَهُ كَانَ لَهُ كِفْلَانِ مِنَ الْأَجْرِ فَإِنْ لَمْ يُدْرِكْهُ كَانَ لَهُ كِفْلٌ مِنَ الْأَجْرِ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ) [2]

ترجمہ: حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو شخص علم کا طالب ہو اور اسے علم حاصل بھی ہو گیا تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا اور اگر اسے علم حاصل نہ ہوا تو اس کو ایک حصہ ثواب ملے گا"۔ (دارمی)

توضیح: کفلان: دو ثواب اس طرح ملیں گے کہ ایک ثواب طالب علم کی محنت و مشقت پر ملے گا اور دوسرا ثواب حصول علم پر ملے گا۔ کیونکہ حصول علم سے اشاعت علم کا راستہ کھلے گا اور علم پر عمل کرنے کا بھی موقع ملے گا۔ لہٰذا دوہرا ثواب ملے گا۔ اور اگر محنت و مشقت کے باوجود علم حاصل نہیں ہوا تو ایک ثواب ضرور ملے گا۔ [3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علم دین کا طالب علم ناکام اور فیل نہیں ہوتا ہے بشرطیکہ وہ صحیح نیت سے علم میں لگا ہوا ہو وہ ہر حالت میں کامیاب ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے:

گرچہ نتواں بدوست رہ بردن   شرط یاری است در طلب مُردن

میت کے لئے صدقہ جاریہ

﴿۵۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ عِلْمًا عَلَّمَهُ وَنَشَرَهُ وَوَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهُ أَوْ مُصْحَفًا وَرَّثَهُ أَوْ مَسْجِدًا بَنَاهُ أَوْ بَيْتًا لِابْنِ السَّبِيْلِ بَنَاهُ أَوْ نَهْرًا أَجْرَاهُ أَوْ صَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِي صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ تَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ۔

(رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ) [4]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "مومن کو اس کے جس عمل یا جن نیکیوں کا مرنے کے بعد ثواب پہنچتا ہے اس میں سے ایک تو علم ہے جس کو اس نے سیکھا اور رواج دیا تھا۔ دوسرا وہ نیک اولاد ہے جس

[1] المرقات ۱/۵۱۲ [2] اخرجہ الدارمی ۳۴۰ [3] المرقات ۱/۵۱۳ [4] اخرجہ ابن ماجہ ۲۴۲ والبیھقی

کو اس نے اپنے بعد چھوڑا۔ تیسرا قرآن مجید ہے جو وارثوں کے لئے چھوڑا ہو۔ چوتھا مسجد ہے جس کو اپنی زندگی میں بنا گیا ہو۔ پانچواں مسافر خانہ ہے جس کو اس نے تعمیر کیا ہو۔ چھٹی وہ نہر ہے جس کو اس نے جاری کیا ہو۔ اور ساتویں وہ خیرات ہے جس کو اس نے اپنی تندرستی اور زندگی میں اپنے مال سے نکالا ہو۔ ان تمام چیزوں کا ثواب اس کے مرنے کے بعد اس کو پہنچتا ہے"۔

(ابن ماجہ وبیہقی)

توضیح: ان مما یلحق: انسان جب مرجاتا ہے تو اس کے اپنے اعمال کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔ وہ اگر مرنے کے بعد عالم برزخ میں کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اس پر ان کو ثواب نہیں ملتا ہے ہاں حدیث میں چند اعمال کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان اعمال کا ثواب میت کو پہنچتا رہے گا۔ یہاں حصر کرنا مقصود نہیں بلکہ خیر و بھلائی کا جو بھی سلسلہ ہوگا وہ مراد ہے اور اس کا ثواب میت کو ملتا رہے گا۔ اس سے ایصالِ ثواب کا ثبوت ملتا ہے۔ جس کا معتزلہ انکار کرتے ہیں۔ [1]

طلب علم کے راستے جنت کے راستے ہیں

﴿۵۱﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ أَوْحَى إِلَيَّ أَنَّهُ مَنْ سَلَكَ مَسْلَكًا فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ سَهَّلْتُ لَهُ طَرِيْقَ الْجَنَّةِ وَمَنْ سَلَبْتُ كَرِيْمَتَيْهِ أَثَبْتُهُ عَلَيْهِمَا الْجَنَّةَ وَفَضْلٌ فِيْ عِلْمٍ خَيْرٌ مِنْ فَضْلٍ فِيْ عِبَادَةٍ وَمِلَاكُ الدِّيْنِ الْوَرَعُ۔

(رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ) [2]

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ "اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی (خفی) بھیجی ہے کہ جو طلب علم کے لئے راستہ اختیار کرے تو میں اس پر جنت کے راستے کو آسان کردوں گا اور جس شخص کی میں نے دونوں آنکھیں چھین لی ہوں (یعنی کوئی شخص نابینا ہوگیا ہو تو اس دنیاوی نعمت سے محرومی اور اس پر صبر و شکر کی بناء پر) میں اس کا بدلہ اسے جنت میں دوں گا۔ اور علم کے اندر زیادتی عبادت میں زیادتی سے بہتر ہے اور دین کی جڑ پرہیزگاری ہے"۔

(بیہقی)

توضیح: سلبت کریمتیه: سلب چھیننے کے معنی میں ہے۔ کریمتیه دونوں آنکھوں کو کہتے ہیں مراد آنکھوں کا نور چلا جانا ہے کیونکہ زیادہ کسب کی وجہ سے نور کے پٹھے سوکھ جاتے ہیں۔ [3]

وفضل: اس سے مراد علم میں اضافہ اور زیادتی ہونا ہے۔ یعنی علمی اضافہ عبادت کے اضافہ سے بہتر ہے۔ [4]

وملاك: اصل اور جڑ اور بنیاد کو ملاک کہتے ہیں۔ [5]

الورع: پرہیزگاری کو کہتے ہیں۔ [6]

---

[1] المرقات ۱/۵۱۳ [2] اخرجه البیهقی: ۵/۵۳ [3] المرقات ۱/۵۱۵ [4] المرقات ۱/۵۱۵ [5] المرقات ۱/۵۱۵ [6] المرقات ۱/۵۱۵

تدریس کرنا تہجد سے افضل ہے

﴿۵۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِّنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِنْ إِحْيَائِهَا۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[1]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "رات میں تھوڑی دیر علم کا درس دینا تمام رات کو زندہ رکھنے سے بہتر ہے"۔ (دارمی)

توضیح: تدارس العلم: یعنی ایک گھڑی اور تھوڑی دیر کے لئے علمی درس وتدریس کا مشغلہ رات بھر کی عبادت سے بہتر ہے کیونکہ عبادت کا تعلق اس شخص کی ذات سے وابستہ ہے اور علمی مشغلہ درس و تدریس وتحریر وتصنیف امت اسلامیہ کی عمومی خدمت ہے۔ نیز عابد اوراس کی عبادت ایک وقتی عارضی عمل ہے۔ اور علمی مشغلہ دائمی اور متعدی و پائیدار عمل ہے۔ اس لئے یہ افضل ہے۔[2]

آنحضرت ﷺ معلم بن کر آئے تھے

﴿۵۳﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ مَرَّ بِمَجْلِسَيْنِ فِي مَسْجِدِهِ فَقَالَ كِلَاهُمَا عَلَى خَيْرٍ وَأَحَدُهُمَا أَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهِ أَمَّا هَؤُلَاءِ فَيَدْعُونَ اللهَ وَيَرْغَبُونَ إِلَيْهِ فَإِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ وَإِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ وَأَمَّا هَؤُلَاءِ فَيَتَعَلَّمُونَ الْفِقْهَ أَوِ الْعِلْمَ وَيُعَلِّمُونَ الْجَاهِلَ فَهُمْ أَفْضَلُ وَإِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ثُمَّ جَلَسَ فِيهِمْ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[3]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرکار دوعالم ﷺ کا گزر دو مجلسوں پر ہوا، جو مسجد نبوی میں منعقد تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "دونوں بھلائی پر ہیں لیکن ان میں سے ایک (نیکی میں) دوسرے سے بہتر ہے۔ ایک جماعت عبادت میں مصروف ہے، خدا سے دعا کر رہی ہے اوراس سے اپنی رغبت کا اظہار کر رہی ہے (یعنی حصول مقصد کے لئے خدا کی طرف امیدوار ہے اور حصول مقصد رضائے الٰہی پر موقوف ہے) لہٰذا اگر خدا چاہے تو انہیں دے اور چاہے نہ دے۔ اور دوسری جماعت فقہ یا علم حاصل کر رہی ہے اور جاہلوں کو علم سکھا رہی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بہتر ہیں اور میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں" اور پھر آپ ﷺ خود بھی ان میں بیٹھ گئے۔ (دارمی)

توضیح: فهم افضل: اس سے ان حضرات کی ترغیب مقصود ہے ورنہ خیر و بھلائی پر تو دونوں ہی ہیں۔ مگر مجلس علم کا فائدہ نفع بخش اور متعدی ہے۔ اس وجہ سے یہ افضل ہے۔ مجلس عبادت وعابدین کی فضیلت کی نفی مقصود نہیں۔[4]

انما بعثت معلما: بعض ناواقف حضرات کہتے ہیں کہ اسلام میں تعلیم و تعلم کا ذکر آیا ہے۔ درس وتدریس کا نہیں آیا

[1] اخرجه الدارمی ۲۶۸، ۶۱۷ [2] المرقات ۱/۵۱۵ [3] اخرجه الدارمی ۳۵۳ [4] المرقات ۱/۵۱۶

ہے۔ لہٰذا ہم تعلیم کرتے ہیں ہم ہی ان فضائل کے مستحق ہیں۔ یہ لغو اور لایعنی قسم کی بات ہے جو لاعلمی کی وجہ سے منہ سے نکلتی ہے۔ قرآن کریم میں درس کا لفظ آیا ہے۔[1]

اور اس حدیث سے پہلے حدیث میں تدارس العلم کا لفظ آیا ہے۔ لہٰذا درس و تدریس اور مدرسین کی توہین نہیں کرنی چاہیئے۔

ثم جلس فیھم: اس جماعت کے اہتمام شان اور اکرام و اعزاز ظاہر کرنے کی غرض سے ان میں تشریف فرما ہوئے کیونکہ:[2]

کلاہ گوشئہ دہقان بہ آفتاب رسید　　　کہ سایہ بر سرش انداخت چوں تو سلطانے

نیز آنحضرت ﷺ مجلس علم میں اس لئے بیٹھ گئے کہ شاید ان کو تعلیم دینے کی ضرورت پیش آجائے۔

چالیس احادیث یاد کرانے کی فضیلت

﴿۵۴﴾ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَا حَدُّ الْعِلْمِ الَّذِي إِذَا بَلَغَهُ الرَّجُلُ كَانَ فَقِيهًا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَفِظَ عَلَى أُمَّتِي أَرْبَعِينَ حَدِيثًا فِي أَمْرِ دِينِهَا بَعَثَهُ اللّٰهُ فَقِيهًا وَكُنْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَافِعًا وَشَهِيدًا۔[3]

ترجمہ: حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ علم کی مقدار کیا ہے کہ جب انسان اتنا علم حاصل کرے تو فقیہ (عالم) ہو جائے (اور آخرت میں اس کا شمار زمرۂ علماء میں ہو)۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص میری امت کو فائدہ پہنچانے کے لئے امر دین کی چالیس حدیثیں یاد کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت میں فقیہ اٹھائے گا۔ اور میں قیامت کے دن میں اس کا شفاعت کرنے والا اور (اس کی اطاعت پر) گواہ بنوں گا۔

توضیح: من حفظ علی امتی: یعنی میری امت کی بھلائی اور خیر خواہی کے لئے چالیس حدیثیں پڑھا دیں اور اُن تک پہنچا دیں خواہ یاد کریں یا تصنیف سے پہنچا دیں اور یا کسی اور ذریعہ سے امت تک پہنچا دیں۔ سب اس میں داخل ہیں۔ اس حدیث کی بشارت کے پیش نظر اس امت کے محدثین اور علماء نے اربعین یا اربعینات کے نام سے بہت سی کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔[4]

امر دینھا: یعنی جو احادیث دین کے احکامات سے متعلق ہوں صرف واقعات سے اس کا تعلق نہ ہو۔[5]

علم دین کا عالم سب سے زیادہ سخی ہوتا ہے

﴿۵۵﴾ وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَدْرُونَ مَنْ أَجْوَدُ

[1] المرقات ۱/۵۱۶ [2] المرقات ۱/۵۱۶ [3] اخرجه البیهقی [4] المرقات ۱/۵۱۷ [5] المرقات ۱/۵۱۷

جُوْدًا قَالُوْا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ قَالَ اللّٰهُ اَجْوَدُ جُوْدًا ثُمَّ أَنَا أَجْوَدُ بَنِي آدَمَ وَأَجْوَدُهُمْ مِنْ بَعْدِي رَجُلٌ عَلِمَ عِلْمًا فَنَشَرَهُ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَمِيْرًا وَحْدَهُ أَوْ قَالَ أُمَّةً وَاحِدَةً۔ [1]

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا ''کیا تم جانتے ہو کہ سخاوت کے معاملے میں سب سے بڑا سخی کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سخاوت کرنے میں اللہ تعالیٰ سب سے بڑا سخی ہے اور بنی آدم میں سب سے بڑا سخی میں ہوں، پھر لوگوں میں میرے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہوگا جس نے علم سیکھا اور اسے پھیلایا وہ شخص قیامت کے دن ایک ''امیر'' یا فرمایا کہ ''ایک گروہ کی طرح آئے گا''۔

توضیح: **اجود جودًا:** یعنی تمام سخیوں میں یعنی تمام سخیوں میں سخاوت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ سب سے بڑا سخی ہے۔ کیونکہ ابتدائے آفرینش عالم سے لے کر آج تک جانداروں کو اور تمام کفار و اشرار کو اور تمام ابرار کو کھلا رہا ہے۔ پلا رہا ہے اور خوانِ نعمت کو بچھائے رکھا ہے۔ [2]

امیرًا واحدًا: یعنی اکیلا ہوگا مگر امیر ہو کر آئے گا گویا اس کے ماتحت جم غفیر ہوگا۔ کیونکہ اس نے جن کو پڑھایا یا اس کی تعلیمات جن تک پہنچیں اور انہوں نے آگے اوروں کو پہنچایا تو لاکھوں کا عمل اس کو ملے گا اس لئے وہ اکیلے ہوتے ہوئے بھی امیر ہوگا۔ [3]

علم کا حریص کبھی سیر نہیں ہوتا

﴿۵۶﴾ وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ مَنْهُوْمٌ فِي الْعِلْمِ لَا يَشْبَعُ مِنْهُ وَمَنْهُوْمٌ فِي الدُّنْيَا لَا يَشْبَعُ مِنْهَا۔ (رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْأَحَادِيْثَ الثَّلَاثَةَ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ وَقَالَ قَالَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ فِي حَدِيْثِ أَبِي الدَّرْدَاءِ هٰذَا مَتْنٌ مَشْهُوْرٌ فِيْمَا بَيْنَ النَّاسِ وَلَيْسَ لَهُ إِسْنَادٌ صَحِيْحٌ) [4]

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''حرص کرنے والے دو شخص ہیں جن کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ایک علم میں حرص کرنے والا کہ اس کا پیٹ علم سے کبھی بھی نہیں بھرتا، اور دوسرا دنیا کی حرص کرنے والے کہ اس کا پیٹ دنیا سے کبھی نہیں بھرتا''۔

مذکورہ بالا تینوں حدیثیں بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہیں۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کا متن لوگوں میں مشہور ہے مگر اس کی اسناد صحیح نہیں ہے۔

توضیح: **منہوم:** حریص کے معنی میں ہے۔ **شبع:** پیٹ بھرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی دو قسم کے حریص ہیں۔

[1] اخرجہ البیہقی [2] المرقات ۱/۵۱۸ [3] المرقات ۱/۵۱۸ [4] اخرجہ البیہقی

ایک دنیا کا حریص ہے جو مذموم ہے دوسرا علم کا حریص ہے جو محمود ہے کیونکہ دنیا کا طالب انجام کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی رضا سے دور ہو کر ہلاک ہوجاتا ہے اور علم کا طالب جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی طرف جاتا ہے اور اس کا انجام کامیاب ہوجاتا ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث کے متعلق امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''کہ لوگوں میں اس حدیث کا متن مشہور ہے مگر اس کی سند صحیح نہیں ہے''۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''کہ یہ حدیث بے شک ضعیف ہے لیکن اس کے طرق متعدد ہیں۔ لہٰذا اس میں قوت ہے''۔

ادھر علمائے کرام نے تصریح کی ہے کہ فضائل اعمال میں قدرے ضعیف حدیث بھی قبول کی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی حدیث یا شرعی قاعدہ سے متصادم نہ ہو۔[1]

﴿۵۷﴾ وَعَنْ عَوْنٍ قَالَ قَالَ عَبْدُ اللهِ ابْنُ مَسْعُوْدٍ مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ صَاحِبُ الْعِلْمِ وَصَاحِبُ الدُّنْيَا وَلَا يَسْتَوِيَانِ أَمَّا صَاحِبُ الْعِلْمِ فَيَزْدَادُ رِضًى لِلرَّحْمٰنِ وَأَمَّا صَاحِبُ الدُّنْيَا فَيَتَمَادٰى فِي الطُّغْيَانِ ثُمَّ قَرَأَ عَبْدُ اللهِ كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغٰى أَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى قَالَ وَقَالَ الْاٰخَرُ إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت عون روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''دو حریص ہیں جن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ ایک عالم اور دوسرا دنیادار لیکن یہ (درجہ میں) برابر نہیں ہیں۔ کیونکہ عالم تو خدا کی خوشنودی اور رضامندی کو زیادہ کرتا ہے اور دنیادار سرکشی میں زیادتی کرتا ہے''۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دنیادار کے حق میں (دلیل کے طور پر) یہ آیت پڑھی۔ ترجمہ: خبردار! انسان البتہ سرکشی کرتا ہے جبکہ وہ اپنے آپ کو (کثرت مال کی بناء پر لوگوں سے) غنی دیکھتا ہے۔ حضرت عون رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دوسرے (یعنی) عالم کے حق میں یہ آیت پڑھی۔ ترجمہ: ''خدا کے بندوں میں عالم خدا سے ڈرتے ہیں''۔ (دارمی)

توضیح: یہ حدیث مرفوع ہے لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حدیث کے مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے اس سے پہلے جو حدیث گزر چکی ہے اس کی تشریح اور زیر بحث حدیث کی تشریح ایک جیسی ہے۔ اس کو ملاحظہ کیا جائے۔

دنیاداروں سے علماء کو دور رہنا چاہئے

﴿۵۸﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أُنَاسًا مِنْ أُمَّتِيْ سَيَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ وَيَقْرَأُوْنَ الْقُرْاٰنَ يَقُوْلُوْنَ نَأْتِي الْأُمَرَاءَ فَنُصِيْبُ مِنْ دُنْيَاهُمْ وَنَعْتَزِلُهُمْ

[1] المرقات ۱/۴۱۵ [2] اخرجه الدارمی: ۳۳۷

بِدِيْنِنَا وَلَا يَكُوْنُ ذٰلِكَ كَمَا لَا يُجْتَنٰى مِنَ الْقَتَادِ اِلَّا الشَّوْكُ كَذٰلِكَ لَا يُجْتَنٰى مِنْ قُرْبِهِمْ اِلَّا قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَّاحِ كَأَنَّهُ يَعْنِي الْخَطَايَا۔ (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ)[1]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "میری امت میں بہت سے لوگ دین میں سمجھ (یعنی دین کا علم) حاصل کریں گے اور قرآن مجید پڑھیں گے اور کہیں گے کہ ہم امراء کے پاس جا کر ان کی دنیا اور (دولت) میں سے اپنا حصہ حاصل کریں گے اور اپنے دین کو ان سے یکسو رکھیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا (کہ دین و دنیا ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں کیونکہ امراء کی صحبت میں بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے) جیسا کہ جس طرح خار دار درخت سے صرف کانٹا ہی حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح امراء کی صحبت سے نہیں حاصل ہوتا مگر! حضرت محمد ابن صباح کہتے ہیں کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد لفظ "الا" کے بعد خطایا تھی۔ (ابن ماجہ)

توضیح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس امت میں بعض ایسے مطلب پرست علماء پیدا ہوں گے جن کا مطمح نظر صرف حصول دنیا ہوگا اس غرض کے حصول کے لئے وہ مالداروں اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے پیچھے گھومتے پھریں گے اور اگر ان کو طعنہ دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ بھائی ہم مالی فوائد تو حاصل کرتے ہیں لیکن اپنا دین اپنے دل میں محفوظ رکھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا یہ اس طرح محال ہے جس طرح کسی کانٹے دار بے پھل درخت سے پھل حاصل کرنا اس سے تو کانٹے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور پھل ملنا محال ہے۔

الا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "الا" کے بعد کوئی لفظ ارشاد نہیں فرمایا اور "الا" پر کلام کو ختم فرمایا۔
امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاد محمد بن صباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا الخطایا کے کلمہ کا ارادہ کیا تھا مگر زبان سے ادا نہیں فرمایا، اس میں یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جرم کو مبہم چھوڑ کر اشارہ فرمایا کہ یہ اتنا بڑا جرم ہے جو زبان پر بھی نہیں لایا جا سکتا ہے۔[2]

عالم کو اپنے علم کی حفاظت خود کرنی چاہیئے

﴿۵۹﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَوْ أَنَّ أَهْلَ الْعِلْمِ صَانُوا الْعِلْمَ وَوَضَعُوْهُ عِنْدَ أَهْلِهِ لَسَادُوْا بِهِ أَهْلَ زَمَانِهِمْ وَلٰكِنَّهُمْ بَذَلُوْهُ لِأَهْلِ الدُّنْيَا لِيَنَالُوْا بِهِ مِنْ دُنْيَاهُمْ فَهَانُوْا عَلَيْهِمْ سَمِعْتُ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهِ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ وَمَنْ تَشَعَّبَتْ بِهِ الْهُمُوْمُ أَحْوَالُ الدُّنْيَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ فِي أَيِّ أَوْدِيَتِهَا هَلَكَ۔[3]
(رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَرَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ مِنْ قَوْلِهِ مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ إِلَى آخِرِهِ)

---

[1] اخرجہ ابن ماجہ ۲۵۵ [2] المرقات ۱/۵۲۰،۵۲۱ [3] اخرجہ ابن ماجہ ۲۵۷، ۲۱۰۶ والبیہقی

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا ''اگر اہل علم (یعنی علماء) علم کی حفاظت کریں اور علم کو اس کے اہل ہی (یعنی قدر دانوں) کے حوالے کریں تو وہ بے شک اپنے علم کے سبب دنیا والوں کے سردار بن جائیں لیکن (علماء نے ایسا نہیں کیا بلکہ) انہوں نے علم کو دنیاداروں پر خرچ کیا تا کہ اس کے ذریعے وہ اپنی دنیا (یعنی جاہ وجلال) کو حاصل کریں (اور علم کا حقیقی مقصد یعنی دنیا والوں کی ہدایت ونصیحت کو موقوف کردیں) تو وہ دنیا والوں کی نظر میں ذلیل ہو گئے۔ میں نے سرکارِ دوعالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے اپنے مقاصد میں صرف ایک ہی مقصد یعنی آخرت کے مقصد کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیاوی مقصد کو پورا فرما دیتا ہے۔ اور جس شخص کے مقاصد پراگندہ ہوں جیسے کہ دنیا کے حالات ہیں تو اللہ تعالیٰ کو پھر پرواہ نہیں ہوتی خواہ وہ کسی بھی جنگل (یعنی دنیا کی کسی بھی حالت) میں ہلاک ہو۔ (ابن ماجہ)

بیہقی نے اس حدیث کو شعب الایمان میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے قول "من جعل الھموم" سے آخر تک روایت کیا ہے۔

توضیح: لو ان اھل العلم: اس روایت کا پہلا حصہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور "سمعت نبیکم" سے آخر تک آپ نے مرفوع حدیث بیان فرمائی ہے۔ روایت کا مطلب واضح ہے کہ جب عالم اپنے علم کی دولت کی خود قدر کرے گا اور اس کی عزت وعظمت کو برقرار رکھے گا تو وہ دنیا والوں کے سامنے معزز ومکرم رہے گا۔ اور اگر وہ خود اس کی ناقدری کرے گا تو لوگوں کے سامنے خود ذلیل ہو جائے گا۔ اور ناقدری یہ ہے کہ علم کی اس عظیم دولت کو **نیابة عن رسول اللہ** خدمت دین کے بجائے اپنے دنیوی مقصد کے لئے استعمال کرے اور مخلوقِ خدا کی رہنمائی کو نظر انداز کر کے اغراض کے پیچھے پڑ جائے۔[1]

ومن تشعبت: اس کا ترجمہ پراگندہ ہونا، مختلف ہونا، شاخ در شاخ ہونا ہے۔[2]

الھموم: یہ ھم کی جمع ہے غم کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں مقاصد اور حالات مراد ہیں۔ اور "**احوال الدنیا**" اس سے بدل ہے جو حالات ومقاصد کے معنی میں ہے۔ ترجمہ اس طرح ہوگا کہ جن کو مختلف غموں اور حالات نے مختلف راستوں پر لگا دیا۔[3]

ضیاعِ علم کے اسباب

﴿۶۰﴾ وَعَنِ الْاَعْمَشِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آفَةُ الْعِلْمِ النِّسْيَانُ وَاِضَاعَتُهُ أَنْ تُحَدِّثَ بِهٖ غَيْرَ أَهْلِهٖ. (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ مُرْسَلًا)[4]

ترجمہ: حضرت اعمش رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''علم کی آفت بھولنا ہے اور علم کا ضائع کرنا یہ ہے کہ اس کو نااہل کے سامنے بیان کیا جائے''۔ (دارمی نے بطریق ارسال اسے نقل کیا ہے)

توضیح: آفة العلم: حصول علم ایک عظیم دولت ہے اور ہر دولت کے حصول میں رکاوٹیں بھی ہوتی ہیں تو علم کے حصول کے سامنے بھی بڑی رکاوٹیں ہیں۔ جیسے کہا گیا ہے: "**لکل شیء آفة وللعلم آفات**"۔

---

[1] المرقات ۱/۵۲۱ [2] المرقات ۱/۵۲۲ [3] المرقات ۱/۵۲۲ [4] اخرجه الدارمی ۶۲۲

یہ تو حصول علم سے پہلے کی آفات ہیں مگر علم کے حصول کے بعد بڑی آفت آتی ہے وہ علم کا بھولنا اور نسیان ہے۔ علم کے بھولنے کے کئی اسباب ہیں ان میں سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس علم کی ناقدری کی جائے اور اس کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے۔ یا تو نالائق کو علم سکھایا جائے یا اس پر عمل نہ کیا جائے جیسے کہا گیا ہے: "ھتف العلم بالعمل ان اجاب والا فارتحل"۔[1]

امام شافعی رحمہ اللہ نے بھولنے کی بیماری کا تذکرہ اپنے استاد وکیع رحمہ اللہ کے سامنے کیا تو آپ نے نیک اعمال کی وصیت فرمائی:

شکوت الی وکیع سوء حفظی　　فاوصانی الی ترک المعاصی

فان العلم فضل من اله　　وفضل الله لا یعطیٰ لعاصی

حقیقی عالم کون ہوتا ہے

﴿۶۱﴾ وَعَنْ سُفْيَانَ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ لِكَعْبٍ مَنْ أَرْبَابُ الْعِلْمِ قَالَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ بِمَا يَعْلَمُوْنَ قَالَ فَمَا أَخْرَجَ الْعِلْمَ مِنْ قُلُوْبِ الْعُلَمَاءِ قَالَ الطَّمَعُ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت سفیان رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا "(تمہارے نزدیک) صاحب علم کون ہے؟ حضرت کعب نے جواب دیا "وہ لوگ جو اپنے علم کے موافق عمل کریں"۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کون سی چیز عالموں کے دل سے علم کو نکال دیتی ہے؟ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "وہ "لالچ" ہے"۔ (دارمی)

توضیح: **الطمع:** طمع ایک ایسی آفت اور بلا ہے جس کی وجہ سے آدمی علم کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتا۔ جب دل میں ہر وقت دنیا دار سے حصول دنیا کی لالچ موجود ہو تو ایسا شخص حق کو کیسے بیان کرسکتا ہے؟ اور جب حق کو چھپائے گا تو علم کا نور اور اس کی عظمت و برکت اس کے دل سے محو ہو کر نکل جائے گی۔ ایک حدیث میں ہے: "کن فی الایاس مما فی ایدی الناس تکن اغنی الناس"۔[3]

علماء سوء سے بچو

﴿۶۲﴾ وَعَنِ الْأَحْوَصِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ سَأَلَ رَجُلٌ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الشَّرِّ فَقَالَ لَا تَسْأَلُوْنِيْ عَنِ الشَّرِّ وَسَلُوْنِيْ عَنِ الْخَيْرِ يَقُوْلُهَا ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ أَلَا إِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ وَإِنَّ خَيْرَ الْخَيْرِ خِيَارُ الْعُلَمَاءِ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[4]

---

[1] المرقات ۱/۵۲۳　[2] اخرجه الدارمی ۱۸۷　[3] المرقات ۱/۵۲۴　[4] اخرجه الدارمی ۳۷۳

ترجمہ: حضرت احوص بن حکیم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم ﷺ سے برائی کے بارے میں سوال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "مجھ سے برائی کے بارے میں مت پوچھو۔ بلکہ بھلائی کے بارے میں سوال کرو۔ اور ان جملوں کو آپ نے تین بار دہرایا۔ خبردار! بدلوگوں میں بدترین برے علماء ہیں۔ اور بھلے لوگوں میں سب بہتر بھلے علماء ہیں۔

(دارمی)

توضیح: لا تسئلونی عن الشر: یعنی صرف شر اور برائی کے بارے میں سوال نہ کرو یا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص بدترین آدمی کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہے کہ سب سے بدترین آدمی کون ہے تو آنحضرت ﷺ نے یہ جواب دیا۔ حدیث کے سیاق وسباق سے یہی مطلب زیادہ واضح معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے سوال سے منع فرمایا ہے۔ کہ آپ سراپا رحمت تھے۔ تو آپ سے صرف برائی کے بارے میں نہیں بلکہ برائی اور بھلائی دونوں کے متعلق سوال کرنا چاہئے تھا۔[1]

شر الشر: یعنی بدترین آدمیوں میں سے بدتر لوگ۔[2]

شر العلماء: یعنی برے علماء ہیں جو اپنے آپ کو علماء بھی کہتے ہیں اور سب سے بدتر بھی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء کا شر اور ان کی بدی متعدی ہے جیسا کہ ان کی بھلائی متعدی ہے۔ کیونکہ معاشرہ میں علماء کی ذات معیاری نمونہ اور کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اگر علماء اعلیٰ معیار کے ہوں گے تو عوام بھی ان کی تقلید میں اعلیٰ مثال قائم کرنے کی کوشش کرے گی۔ ورنہ عام تباہی آجائے گی۔ اس حدیث میں علماء سوء مراد ہیں۔ کسی نے کہا ہے:[3]

فساد کبیر عالم متھتك واکبر منه جاھل متنسك

عالم اگر برائی کو دیکھ کر خاموش رہتا ہے تو عوام الناس مزید برائی پر جری ہو جائیں گے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً ایک شخص کو کسی نے گریبان سے پکڑلیا ہے اس کے ایک بیٹے نے دیکھ لیا مگر جا کر مسجد میں بیٹھ کر تسبیح پھیرنے لگا۔ دوسرا بیٹا آیا۔ اس نے بھی دیکھا مگر کچھ برا مان کر چلا گیا۔ اور مسجد میں نماز پڑھنے لگا۔ تیسرا آیا اور اس نے معمولی سا فیصلہ کیا اور باپ کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا۔ چوتھا آیا اور اس نے تمام نوافل کو چھوڑ کر اس آدمی کو پکڑ کر ہٹا دیا اور اس کی پٹائی لگا کر باپ کو چھڑا لیا۔ اب تم خود بتاؤ کہ وہ باپ کس بیٹے سے خوش ہوگا؟ یہی معاملہ فساق وفجار کا ہے۔ کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے گریبان میں گویا ہاتھ ڈالا ہے اب جو عالم ہاتھ سے پکڑ کر ان کو ہٹائے گا تو حضور ﷺ اس سے ہی خوش ہوں گے۔

اس حدیث کے بعد آنے والی حدیث کو بھی اسی تشریح سے سمجھ لینا چاہیئے۔ ان حدیثوں کے مصداق اگر جدید دنیا کے وہ علماء ہوں جو دنیاوی عدالتوں کے جج ہیں اور مشرق ومغرب کے دنیادار انہیں کو علماء مانتے ہیں تو پھر مسئلہ بہت واضح ہوگا۔

[1] المرقات ۱/۵۲۴ [2] المرقات ۱/۵۲۴ [3] المرقات ۱/۵۲۴، ۵۲۵

بے عمل عالم کی مذمت

﴿۶۳﴾ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَالِمٌ لَا يَنْتَفِعُ بِعِلْمِهٖ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[۱]

ترجمہ: حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "قیامت کے دن خدا کے نزدیک مرتبہ میں سب سے بدتر وہ عالم ہے جس نے اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھایا"۔ (دارمی)

دین کو گرانے والی چیزیں

﴿۶۴﴾ وَعَنْ زِيَادِ بْنِ حُدَيْرٍ قَالَ قَالَ لِي عُمَرُ هَلْ تَعْرِفُ مَا يَهْدِمُ الْإِسْلَامَ قُلْتُ لَا قَالَ يَهْدِمُهُ زَلَّةُ الْعَالِمِ وَجِدَالُ الْمُنَافِقِ بِالْكِتَابِ وَحُكْمُ الْأَئِمَّةِ الْمُضِلِّينَ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[۲]

ترجمہ: حضرت زیاد بن حدیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا "کیا تم جانتے ہو کہ اسلام کی عمارت ڈھانے والی چیز کیا ہے؟"۔ میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں ہے"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "عالم کا پھسلنا (یعنی کسی مسئلے میں عالم کا غلطی کرنا اور اس کا گناہ کرنا) منافق کا کتاب اللہ میں جھگڑنا اور گمراہ سرداروں کا حکم جاری کرنا۔ اسلام (کی عمارت) کو تباہ و برباد کر دیتا ہے"۔ (دارمی)

توضیح: زلة العالم: یعنی ایسی لغزش جس سے سارے لوگ گمراہ ہوں گے اور اسلام کے بنیادی پانچ ارکان بھی گر جائیں گے۔[۳]

وجدال المنافق: یعنی زبان سے تو اسلام کا دم بھرتا ہے اور اندرونی طور پر اسلام کی بیخ کنی کرتا ہے۔ اور اسلام کی اصل شکل کو بگاڑتا ہے۔ اور نصوص میں غلط تاویلات کرتا ہے۔ جیسے روافض اور خوارج اور دیگر اہل بدعت طبقات ہیں۔ جو علماء کی شکل میں جہال سے بدتر ہیں۔ جیسے کہا گیا ہے: **ویل للجاهل مرة وللعالم سبع مرات**"۔[۴]

علم نافع اور غیر نافع کی پہچان

﴿۶۵﴾ وَعَنِ الْحَسَنِ قَالَ الْعِلْمُ عِلْمَانِ فَعِلْمٌ فِي الْقَلْبِ فَذَاكَ الْعِلْمُ النَّافِعُ وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ فَذٰلِكَ حُجَّةُ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى ابْنِ آدَمَ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[۵]

ترجمہ: حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ علم جو دل کے اندر ہوتا ہے۔ یہ علم تو نفع دیتا ہے اور دوسرا وہ علم ہے جو زبان کے اوپر ہوتا ہے یہ علم آدمی پر خدائے عز وجل کی حجت اور دلیل ہے۔ (دارمی)

[۱] اخرجه الدارمی ۲۶۶ [۲] اخرجه الدارمی ۲۱۹ [۳] المرقات ۱/۵۲۵ [۴] المرقات ۱/۵۲۵ [۵] اخرجه الدارمی ۳۶۸

توضیح: فعلم فی القلب: حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے علم کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ان میں سے ایک علم ظاہر ہے۔ اور دوسرا علم باطن ہے۔ یہ دونوں علوم انجام کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ ان دونوں میں گہرا ربط ہے۔ جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ [۱]

حضرت شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم نافع وہ ہوتا ہے کہ جس سے دل منور ہو جاتا ہے۔ پھر یہ علم نافع انسانی معاملات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ تو معاملات درست ہو جاتے ہیں۔ [۲]

اور دوسرا علم مکاشفہ ہے جو ظاہری اعمال کے اثرات میں سے ہے۔ جس کا تعلق قلب اور باطن سے ہے۔ دوسرا علم زبانی ہے جو نہ دل پر اثر ڈالتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو متاثر کر سکتا ہے:

علم چوں بر دل زند یارے شود   علم چوں برتن زند مارے شود

عالم کہ تن آسانی وتن پروری کند   او خویشتن گم است کرا رهبری کند

حجة الله: یعنی بے عمل اور صرف زبانی علم بندوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت اور دلیل وسند ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو الزام دے کر فرمائے گا کہ میں نے تمہیں علم دیا تھا تم نے اس پر عمل کیوں نہ کیا؟ [۳]

ہر جگہ ہر مسئلہ ظاہر نہیں کیا جا سکتا

﴿۶۶﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وِعَائَیْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ فِیْكُمْ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ یَعْنِیْ مَجْرَی الطَّعَامِ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ) [۴]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے علم کے دو برتن (یعنی دو طرح کے علم) یاد رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو میں نے تمہارے درمیان پھیلا دیا ہے۔ اور دوسرا علم وہ ہے کہ اگر میں اسے بیان کروں تو میرا یہ گلا کاٹ ڈالا جائے۔ (بخاری)

توضیح: وعائین: یعنی نبی کریم ﷺ سے میں نے علم کے دو برتن یاد کر کے بھر لئے ایک علم کو تو میں نے عوام میں پھیلا دیا ہے جس کا تعلق ظاہر اور علم الاحکام سے تھا۔ [۵]

واما الاخر: اس دوسرے علم کے دو مفہوم ہیں ایک یہ کہ علم ظاہر کے مقابلے میں علم باطن سے میں نے برتن بھر لیا۔ یہ عارفین اور اہل اللہ سے متعلق علوم ہیں۔ اگر میں اس کو بیان کرنا شروع کر دوں تو لوگ نہ سمجھنے کی وجہ سے میرا گلا کاٹ دیں گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس میں دوسرے علم کا تعلق آئندہ آنے والے فتنہ پرور اور فتنہ ساز وفتنہ باز حکمرانوں سے ہے۔ اگر میں ان فتنوں کی نشاندہی کر کے اس علم کو ظاہر کر دوں گا تو یہ لوگ میری گردن اڑا دیں گے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے دعا

---

[۱] المرقات ۱/۵۲۶ [۲] اشعۃ اللمعات ۱:۱۹۰ [۳] المرقات ۱/۵۲۶ [۴] اخرجه البخاری ۱/۴۱ [۵] المرقات ۱/۵۲۶

مانگی تھی کہ مجھے اللہ تعالیٰ لونڈوں کی حکمرانی سے پہلے ہی اٹھالیں چنانچہ یزید کی حکومت آنے سے کچھ پہلے ہی آپ کا انتقال ہوگیا تھا۔[1]

بثثته: یہ بث یبث سے پھیلانے اور کھولنے کے معنی میں ہے۔[2]

البلعوم: یہ حلقوم کے وزن پر ہے۔ مراد حلقوم اور گلا ہے۔[3]

واللہ اعلم کہنا بھی علم ہے

﴿۶۷﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ مَنْ عَلِمَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ بِهِ وَمَنْ لَمْ يَعْلَمْ فَلْيَقُلْ أَللهُ أَعْلَمُ فَإِنَّ مِنَ الْعِلْمِ أَنْ تَقُولَ لِمَا لَا تَعْلَمُ أَللهُ أَعْلَمُ قَالَ اللهُ تَعَالَى لِنَبِيِّهِ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[4]

ترجمہ: اور روایت ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے (لوگوں کو مخاطب کرکے) فرمایا "اے لوگو! جو شخص کسی بات کو جانتا ہو تو چاہیئے کہ اسے بیان کردے اور جو نہ جانتا ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ کہے کہ اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کا اسے علم نہیں ہے اس کے بارے میں "اللہ اعلم" کہنا بھی علم کی ایک قسم ہے۔ (یعنی معلوم کا غیر معلوم سے تمیز کرنا بھی علم کی ایک قسم ہے) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے واسطے فرمایا کہ **قل ما اسئلکم علیه من اجر وما انا من المتکلفین۔**

ترجمہ: اے محمد! کہہ دیجئے کہ میں اس قرآن پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا اور میں تکلف کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ (بخاری)

ہر قسم کے استاد سے علم نہیں لینا چاہئے

﴿۶۸﴾ وَعَنِ ابْنِ سِيرِينَ قَالَ إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِينٌ فَانْظُرُوا عَمَّنْ تَأْخُذُونَ دِينَكُمْ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[5]

ترجمہ: حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "یہ علم (یعنی کتاب وسنت کا علم) دین ہے۔ لہٰذا جب (تم اسے حاصل کرو تو) یہ دیکھ لو کہ اپنا دین کس سے حاصل کررہے ہو"۔ (مسلم)

توضیح: فانظروا: یعنی علم دین کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ جس سے علم حاصل کیا جاتا ہے اس پر یہ اطمینان اور اعتماد ہو کہ وہ متدین، متقی پرہیزگار اور صحیح عقائد کا حامل ہے۔ ہر کس وناکس کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا عقلمندی نہیں ہے۔ کیونکہ استاد کا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ دینی مدارس میں اساتذہ دیندار ہوتے ہیں۔ تو باوجود فلسفہ اور منطق پڑھانے کے آج تک کوئی طالب علم گمراہ نہیں ہوا اور اسکول وکالج میں چونکہ عموماً اساتذہ بے دین اور ملحد ہوتے ہیں تو وہاں اسلامیات پڑھانے

[1] المرقات ۱/۵۲۷ [2] المرقات ۱/۵۲۷ [3] المرقات ۱/۵۲۷ [4] اخرجه البخاری ۶/۳۷ ومسلم ۸/۱۳۰ [5] اخرجه مسلم ۸

والے اساتذہ کے شاگرد ملحد اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اسلامیات پڑھانے والا خود اسلامیات کا مخالف ہوتا ہے۔[1]

غلط قاریوں کی مذمت

﴿۶۹﴾ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ يَا مَعْشَرَ الْقُرَّاءِ اِسْتَقِيْمُوْا فَقَدْ سَبَقْتُمْ سَبْقًا بَعِيْدًا وَاِنْ اَخَذْتُمْ يَمِيْنًا وَشِمَالًا لَقَدْ ضَلَلْتُمْ ضَلَالًا بَعِيْدًا۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے (قاریوں کو مخاطب کر کے فرمایا) اے قاریوں کی جماعت! سیدھے رہو، اس لئے کہ تم سبقت لے گئے ہو دوڑ کی سبقت (اگر تم سیدھے راستے سے ہٹ کر) ادھر ادھر ہو گئے تو البتہ بڑی گمراہی میں پڑ جاؤ گے۔ (بخاری)

﴿۷۰﴾ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ تَعَوَّذُوْا بِاللهِ مِنْ جُبِّ الْحُزْنِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ وَمَا جُبُّ الْحُزْنِ قَالَ وَادٍ فِيْ جَهَنَّمَ يَتَعَوَّذُ مِنْهُ جَهَنَّمُ كُلَّ يَوْمٍ اَرْبَعَمِائَةَ مَرَّةٍ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللهِ وَمَنْ يَدْخُلُهَا قَالَ اَلْقُرَّاءُ الْمُرَاؤُوْنَ بِاَعْمَالِهِمْ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَكَذَا ابْنُ مَاجَه وَزَادَ فِيْهِ وَاِنَّ مِنْ اَبْغَضِ الْقُرَّاءِ اِلَى اللهِ تَعَالٰى اَلَّذِيْنَ يَزُوْرُوْنَ الْاُمَرَاءَ قَالَ الْمُحَارِبِيُّ يَعْنِي الْجَوَرَةَ)[3]

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے (صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا) ''تم اللہ سے پناہ مانگو جب الحزن یعنی غم کے کنوئیں) سے۔ صحابہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! غم کا کنواں کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا دوزخ میں ایک نالہ ہے جس سے دوزخ دن میں چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس میں کون داخل ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ قرآن پڑھنے والے جو اپنے اعمال دکھانے کے لئے کرتے ہیں'' (ترمذی، ابن ماجہ) اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ ''خدا کے نزدیک مبغوض ترین قاری ہیں جو سرداروں سے ملاقات کرتے ہیں'' اس حدیث کے راوی محاربی نے کہا کہ سرداروں سے مراد ظالم سردار ہیں۔

علماء سوء کی مذمت

﴿۷۱﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ اَنْ يَّأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهُ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُهُ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰى عُلَمَاؤُهُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ۔[4] (رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ)

---

[1] المرقات ۱/۵۲۸ [2] اخرجه البخاري ۹/۱۱۵ [3] اخرجه الترمذي ۲۲۸۳ وابن ماجه ۲۵۶ [4] اخرجه البيهقي ۲/۳۱۱

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عنقریب لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اسلام میں صرف اس کا نام باقی رہ جائے گا۔ اور قرآن میں سے صرف اس کے نقوش باقی رہ جائیں گے۔ ان کی مسجدیں (بظاہر تو) آباد ہوں گی مگر حقیقت میں یہ ہدایت سے خالی ہوں گی۔ ان کے علماء آسمان کے نیچے کی مخلوق میں سے سب سے بدتر ہوں گے۔ انہی سے (ظالموں کی حمایت و مدد کی وجہ سے) دین میں فتنہ پیدا ہوگا۔ اور انہی میں لوٹ آئے گا'' (یعنی انہی پر ظالم مسلط کردیئے جائیں گے)۔ (بیہقی)

توضیح: **الا رسمه:** یعنی مفاہیم ہوں گے مصادیق نہ ہوں گے مثلاً لفظ تقویٰ ہوگا تقویٰ کا وجود نہیں ہوگا۔ لفظ علم ہوگا لیکن علم کی حقیقت اور اس کا وجود معدوم ہوگا۔ لفظ امانت ہوگا امانت نہیں ہوگی۔ لفظ خیر ہوگا خیر نہیں رہے گی۔ ہدایت کا لفظ ہوگا ہدایت نہیں ہوگی۔ نام ہوگا کام نہیں ہوگا۔

مساجد آباد ہوں گی لیکن اس میں شریعت کے مطابق عبادت نہیں ہوگی۔ لہٰذا مساجد اپنے اصلی مقصد سے خالی ہوں گی۔ علماء گو اپنے آپ کو امت کا رہنما اور پیشوا کہیں گے لیکن وہ تمام انسانوں سے زیادہ بدتر ہوں گے کیونکہ وہ تفرقے پیدا کریں گے۔ اور ظالموں کی مدد و حمایت کریں گے۔ اپنے باطل مقاصد کے لئے طرح طرح کے فتنے برپا کریں گے۔ اس سے آخر زمانے کے علماء سوء مراد ہیں۔ اگر جدید دور کے علماء مراد لئے جائیں تو مطلب بہت واضح ہو جائے گا۔ کیونکہ جدید دور میں جج حضرات کو لوگ عالم مانتے ہیں۔ [1]

چونکہ حدیث میں **علماء هم** یعنی ان کے علماء کا جملہ آیا ہے۔ اور آج کل مدارس کے فضلاء کو ماڈرن طبقہ عالم نہیں سمجھتا ہے۔ جبکہ ان کے نزدیک جج حضرات علماء ہیں۔ پروفیسر علماء ہیں اصل علماء کے علم کو وہ علم تصور ہی نہیں کرتے ہیں۔ نیز ان کے علماء کے متعلق جو یہ فرمایا بالکل برمحل ہے اور دین کے مخالف غلط فیصلوں کی وجہ سے آئے روز انہی سے فتنے نکلتے ہیں اور پھر وہ فتنے انہی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

زوالِ علم کا بڑا سبب عمل نہ کرنا ہے

﴿۷۲﴾ وَعَنْ زِيَادِ بْنِ لَبِيْدٍ قَالَ ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئاً فَقَالَ ذٰلِكَ عِنْدَ أَوَانِ ذَهَابِ الْعِلْمِ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللهِ وَكَيْفَ يَذْهَبُ الْعِلْمُ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَنُقْرِئُهُ أَبْنَاءَنَا وَيُقْرِئُهُ أَبْنَاؤُنَا أَبْنَاءَهُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَقَالَ ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ زِيَادُ اِنْ كُنْتُ لَأَرَاكَ مِنْ أَفْقَهِ رَجُلٍ بِالْمَدِيْنَةِ أَوَلَيْسَ هٰذِهِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى يَقْرَأُوْنَ التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ لَا يَعْمَلُوْنَ بِشَيْءٍ مِمَّا فِيْهِمَا۔

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَه وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ عَنْهُ نَحْوَهُ وَكَذَا الدَّارِمِيُّ عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ) [2]

ترجمہ: حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے کسی چیز (یعنی فتنہ اور ابتلاء) کا ذکر کیا۔ پھر

---

[1] المرقات ۱/۵۳۱ والکاشف ۱/۲۶۳ [2] اخرجه احمد ۴/۱۶۰ والدارمی ۲۴۸

فرمایا۔ "یہ اس وقت ہوگا جب کہ علم جاتا رہے گا"۔ (یہ سن کر) میں نے عرض کیا "یارسول اللہ! علم کس طرح جاتا رہے گا؟ حالانکہ ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں گے ہمارے بچے اپنے بچوں کو پڑھائیں گے اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "زیاد! تمہیں تمہاری ماں گم کرے، میں تو تمہیں مدینہ کے لوگوں میں بڑا سمجھدار سمجھتا تھا، کیا یہود و نصاریٰ تورات اور انجیل کو نہیں پڑھتے ہیں؟ لیکن ان کی کتابوں کے اندر جو کچھ ہے (یعنی احکام) اس میں سے وہ کس چیز پر عمل کرتے ہیں"؟ (احمد ابن ماجہ) اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کی روایت "زیاد" سے اور اسی طرح دارمی نے ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

توضیح: **لا یعملون:** یعنی تورات وانجیل کی تعلیم جاری ہے مگر اس کے مندرجات اور تعلیمات پر عمل ختم ہوگیا ہے۔ اس لئے ان کے ہاں علم کی عمارت زمین بوس ہوگئی ہے۔ کتابیں موجود ہیں تعلیم کا انتظام بھی ہے مگر علم چلا گیا ہے۔ اس لئے کہ عمل نہیں ہے اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ عمل کے انحطاط سے علم کا انحطاط آتا ہے۔ فکرمند علماء نصاب کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ مشوروں پر مشورے جاری ہیں مگر اصل بیماری کی طرف کسی کی انگلی نہیں اٹھتی ہے کہ جس ادارہ میں صرف عملہ اور طلبہ نہیں بلکہ انتظامیہ اور مربی اساتذہ تک نمازوں میں سستی کرتے ہوں اور عملی میدان میں پیچھے ہوں تو وہاں علمی انحطاط نہیں آئے گا تو کیا آئے گا؟ آنحضرت ﷺ کی پیشگوئی بالکل سچی ثابت ہو رہی ہے ہمیں عمل کی اصلاح کرنی چاہیئے۔[1]

علم میراث سب سے پہلے ضائع ہوگا

﴿۷۳﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوْهَا النَّاسَ تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ فَإِنِّيْ امْرُؤٌ مَقْبُوْضٌ وَالْعِلْمُ سَيُقْبَضُ وَتَظْهَرُ الْفِتَنُ حَتّٰى يَخْتَلِفَ اِثْنَانِ فِيْ فَرِيْضَةٍ لَا يَجِدَانِ أَحَدًا يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا۔

(رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ وَالدَّارَقُطْنِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا "علم کو سیکھو اور لوگوں کو سکھلاؤ"۔ علم فرائض (یا فرض احکام) کو سیکھو اور لوگوں کو سکھلاؤ (اسی طرح) قرآن کو سیکھو اور لوگوں کو بھی سکھلاؤ۔ اس لئے کہ بے شک میں ایک شخص ہوں جو اٹھایا جاؤں گا اور علم بھی اٹھایا جائے گا، اور فتنے ظاہر ہوں گے یہاں تک کہ دو شخص ایک فریضہ میں اختلاف کریں گے اور کسی کو ایسا نہ پائیں گے جو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرے۔ (یعنی علم کے کم ہو جانے اور فتنوں کے بڑھ جانے سے یہ حال ہو جائے گا)"۔ (دارمی و دارقطنی)

[1] المرقات ۱/۵۳۳ [2] اخرجه الدارمي ۲۱۱۶ والترمذي ۲۰۹۱

علم بلا عمل کی مثال

﴿۷۴﴾ وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَثَلُ عِلْمٍ لَا يُنْتَفَعُ بِهٖ كَمَثَلِ كَنْزٍ لَا يُنْفَقُ مِنْهُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالدَّارِمِيُّ)[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اس علم کی مثال جس سے نفع نہ اٹھایا جائے (یعنی نہ دوسروں کو پڑھایا جائے اور نہ ہی اس پر عمل کیا جائے) اس خزانہ کی مانند ہے جس میں سے خدا کی راہ میں کچھ بھی خرچ نہ کیا جائے''۔ (احمد، دارمی)

توضیح: مثل علم: یعنی اس علم کی مثال جس سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے اس بے فائدہ رکھے ہوئے خزانے کی طرح ہے جس میں سے کوئی پیسہ کسی بھلائی پر خرچ نہ کیا جائے۔ نہ اپنے بال بچوں پر خرچ کرے اور نہ اپنے جسموں پر خرچ کرے۔ اور نہ قومی اجتماعی امور میں خرچ کرے اور نہ جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس تشبیہ سے صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ علم سے فائدہ اور استفادہ نہ کرنا ایسا ہے جیسا کہ خزانے سے خرچ نہ کرنا۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں کہ اگر اس تشبیہ سے عام تشبیہ مراد لی جائے تو پھر علم کی تشبیہ خزانہ سے دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے اور خزانہ گھٹتا ہے۔ علم باقی رہتا ہے اور خزانہ فانی ہے۔ علم کی چوری نہیں ہوتی اور خزانے کی چوری ہو جاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:[2]

رضینا قسمة الجبار فینا لنا علم وللجهال مال
فان المال یفنی عن قریب وان العلم باق لا یزال

کتاب العلم کے اختتام پر اکبر الہ آبادی وغیرہ کے چند ابیات کا درج کرنا مفید ہوگا فرمایا:

یہ بات تو کھری ہے ہرگز نہیں ہے کھوٹی — عربی میں نظم ملت بی اے میں صرف روٹی
کیا کہیں احباب کیا کارنمایاں کر گئے — بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے
بچوں میں کیا آئے خُو ماں باپ کے اطوار کی — دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی
مسٹر نقلی کو عُقبیٰ میں سزا کیسے ملی — شرح اس کی نامناسب ہے ملی جیسے ملی
اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس — چارہ ہی کیا تھا خدا تعلیم ہی ایسی ملی

الحمد للہ آج ۱۶ شعبان ۱۴۰۲ھ کو مشکوٰۃ شریف کی ابتداء سے کتاب العلم کی انتہا تک شرح اردو توضیحات کا کام مکمل ہو گیا۔ آئندہ کتاب الطہارۃ سے شرح کی ابتدا ہوگی۔ انشاء اللہ۔

[1] اخرجه احمد ۲/۴۹۹ والدارمی ۵۶۲ [2] المرقات ۱/۵۳۸ الکاشف ۱/۳۶۵

۱۶ صفر ۱۴۱۰ھ

کتاب الطھارۃ

پاکیزگی کا بیان

طہارت لغت میں نظافت اور پاکیزگی کو کہتے ہیں اور اصطلاح شرع میں اس کی تعریف اس طرح ہے:

"غسل اعضاء مخصوصة بصفة مخصوصة"۔ (کذا فی التعریفات)

صاحب مشکوٰۃ نے سب سے پہلے کتاب الایمان کو رکھا ہے کیونکہ ایمان کے بغیر کسی چیز کا اعتبار نہیں پھر علم کا درجہ بہت اہم تھا کیونکہ علم ہر چیز کی بنیاد ہے۔ چنانچہ کتاب الایمان کے بعد کتاب العلم کو رکھا علم اور ایمان کے بعد سب سے اہم درجہ نماز کا تھا کیونکہ شریعت نے ایمان کے بعد نماز کو رکھا ہے نیز نماز کائنات کی تمام عبادات کو شامل ہے اس میں قیام کی حالت میں اشجار سے مشابہت ہے، رکوع میں حیوانات کی عبادت اور سجدہ میں تمام سربسجود چیزوں اور فرشتوں سے مشابہت ہے اور قعود میں جبال اور پہاڑوں کی عبادت سے مشابہت ہے۔ یا یوں سمجھیں کہ نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرنے سے حج کی مشابہت آ گئی کیونکہ حج کا تعلق بیت اللہ سے ہے اور تزکیۂ نفس حاصل ہونے کی وجہ سے نماز زکوٰۃ کی عبادت کو جامع ہے اور نماز میں اکل وشرب بند کرنے سے روزہ سے مشابہت آ گئی اور انتہائی عظمت وتعظیم ہونے کی وجہ سے یہ توحید کو بھی شامل ہے۔

لہٰذا نماز جامع العبادات ہے تو ایمان کے بعد اسی کا رتبہ ومقام ہے لیکن چونکہ طہارت نماز کے لئے شرط ہے اور شرط کا درجہ مشروط پر مقدم ہوتا ہے لہٰذا کتاب الصلوٰۃ سے پہلے کتاب الطھارۃ کو رکھنا پڑا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ طہارت مقام تخلیہ ہے اور نماز مقام تحلیہ ہے اور تخلیہ تحلیہ پر مقدم ہوتا ہے۔ اس لئے طہارت کو مقدم رکھا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے طہارت کو چار قسموں کی طرف تقسیم کیا ہے ترتیب اور تقسیم اس طرح ہے:

1. طھارۃ البدن من الاخباث والأنجاس۔
2. طھارۃ الجوارح من الأثام۔
3. طھارۃ القلب من الرذائل والذمائم۔
4. طھارۃ السر عن ما سوی اللہ۔

یعنی دل کے احساسات اور خیالات وتصورات کو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے پاک کرنا کہ مرکز محبت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو جائے اور ماسوائے اللہ پر کوئی نظر نہ ہو۔ یہ طھارۃ السر عن ما سوی اللہ کا درجہ ہے۔

الفصل الاوّل

پاکیزگی نصف ایمان ہے

﴿۱﴾ عَنْ اَبِيْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ وَسُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ اَوْ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَالصَّلَاةُ نُوْرٌ وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَيْكَ كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ تَمْلَآنِ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ۔ لَمْ اَجِدْ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَلَا فِيْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَلَا فِي الْجَامِعِ وَلٰكِنْ ذَكَرَهَا الدَّارِمِيُّ بَدَلَ سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ۔[1]

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: "پاک رہنا آدھا ایمان ہے اور الحمد للہ کہنا (اعمال کے) ترازو کو بھر دیتا ہے اور سبحان اللہ والحمد للہ بھر دیتے ہیں یا فرمایا ہر ایک کلمہ بھر دیتا ہے اس چیز کو جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہے، نماز نور ہے، صدقہ دلیل ہے، صبر کرنا روشنی ہے اور قرآن تمہارے لئے یا تمہارے اوپر دلیل ہے۔ ہر شخص (جب) صبح کرتا ہے (یعنی سو کر اٹھتا ہے) تو اپنی جان کو اپنے کاموں میں بیچتا (یعنی لگاتا) ہے۔ لہٰذا وہ اپنی جان کو آزاد کرتا ہے یا ہلاک کرتا ہے۔ (مسلم)

اور ایک روایت میں ہے کہ "لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر" بھر دیتے ہیں اس چیز کو جو آسمان و زمین کے درمیان ہے"۔ (صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ) "میں نے اس روایت کو نہ بخاری میں پایا ہے نہ مسلم میں نہ ہی کتاب حمیدی اور جامع الاصول میں مجھے یہ روایت ملی ہے۔ البتہ دارمی نے اس روایت کو بجائے سبحان اللہ والحمد للہ کے ذکر کیا ہے۔" (لہٰذا صاحب مصابیح کا اس روایت کو فصل اول میں ذکر کرنا درست نہیں)۔

توضیح: الطہور شطر الایمان: طہارت کے دو پہلو ہیں یعنی طہارت ظاہر اور طہارت باطن اور ہر پہلو کی دو قسمیں ہیں مثلاً طہارۃ البدن اور طہارۃ الجوارح دونوں کا تعلق ظاہر طہارت سے ہے اور طہارت باطنی میں **طہارۃ القلب عن الرذائل** ایک قسم ہے اور **طہارۃ السر عن ماسوی اللہ** دوسری قسم ہے جو درحقیقت ایمان خالص ہے۔ اب طہارۃ ظاہر آدھا ایمان ہے اور طہارت باطن بھی آدھا ایمان ہے چنانچہ اس ظاہر اور باطن کو ملانے سے مکمل ایمان بن جائے گا۔[2]

کیونکہ ظاہری طہارت کے متعلق فرمایا کہ **الطہور شطر الایمان** اور طہارت باطن کے متعلق بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ

---

[1] اخرجہ مسلم ۱/۱۴۰ [2] المرقات ۲/۶،۷

الطهور شطر الایمان توصرف ایک قسم کی طہارت سے ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔
امام غزالی عتنﷲعلیہ نے طہارت کے مندرجہ بالا چاروں درجوں کونصف ایمان بتایا ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ طہارت کی چاروں اقسام مقام تخلیہ میں ہیں یعنی صفائی اور پاکی کا درجہ ہے اس کے بعد مقام تحلیہ ہے تو تخلیہ اور تحلیہ مل کر مکمل ایمان بنے گا۔ بعض علماء نے شطر نصف کے معنی میں نہیں لیا ہے بلکہ صرف حصہ کے معنی میں لیا ہے تو مطلب ہوا کہ طہارت ایمان کا ایک حصہ ہے تو یہ اعتراض ختم ہوا کہ طہارت نصف ایمان کیسے ہوئی۔ [1]
الحمد لله تملأ الميزان: یعنی ثواب تولنے کا جو ترازو ہے وہ الحمدللہ کے ثواب سے بھر جائے گا۔
اب یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ ثواب تو اعراض میں سے ہے اس سے ترازو بھرنے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے اس کا جواب گزشتہ زمانہ کے علماء کے لئے کچھ مشکل تھا مگر آجکل تو اعراض کے تولے جانے کا مسئلہ کچھ مشکل نہیں کیونکہ اعراض تولنا مشاہدہ میں آگیا ہے مثلاً تھرمامیٹر سے بخار کے درجات تولے جاتے ہیں بعض آلات سے نظر تولی جاتی ہے۔ درجۂ حرارت و برودت معلوم کیا جاتا ہے۔ اس کا الگ ترازو ہے اور جہاز میں ارتفاع و انخفاض طوالت مسافت اور قرب و بعد تولا جاتا ہے۔ اگر ایک کمزور انسان اتنا کچھ کرسکتا ہے تو قادر مطلق بادشاہ کے لئے اعراض کا تولنا کیا مشکل ہے؟
قدیم زمانہ کے علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ اعراض دنیا میں اعراض ہیں عالم آخرت میں مجسم ہوں گے پھر ان کو تولا جائے گا، بعض نے اعمال کے دفاتر اور نامۂ اعمال کے رجسٹر مراد لیا ہے کہ گناہ اور ثواب کے بنڈل تولے جائیں گے۔ [2]
والصلوة نور: جیسا اوپر بیان کیا گیا کہ صلوٰۃ تمام عبادات کے لئے جامع ہے تو یہ عالم دنیا عالم برزخ اور عالم آخرت میں ہر تاریکی اور ظلمت کے لئے نور ہی نور ہوگی۔ [3]
والصدقة برهان: یعنی ایمان پر دلیل ہے کیونکہ ایمان کے پرکھنے کے لئے سب سے معیاری کسوٹی مالی قربانی ہے کھرے ایمان والا قربانی دینے کے لئے تیار رہتا ہے اور کھوٹا تو کھوٹا ہے۔ صدقہ کی یہ قربانی فرض نفل واجب سب قربانیوں کو شامل ہے مالی قربانی کتنی مشکل ہے ملاحظہ ہو۔ [4]

گر جان طلبی بتو بخشم گر سر طلبی بتو بخشم ‌ ‌ ‌ ‌ دگر زر طلبی سخن دریں است

الصبر: صبر کا لفظ پوری شریعت کو شامل ہے کیونکہ صبر کی تین قسمیں ہیں: **صبر على المصيبة، صبر على الطاعة** اور **صبر عن المعصية** ان تین قسموں میں پوری شریعت آگئی۔ [5]
القرآن حجة: یعنی اگر قرآن کو پڑھ کر اس کے احکامات پر عمل کیا تو یہ پڑھنے والے اور عمل کرنے والے کے لئے دلیل اور حجت ہے کہ وہ مومن مسلمان اور مستحق جنت ہے ورنہ یہی قرآن اس بدعمل پر دلیل بنے گا اور اس کے خلاف شکایت کرے گا تو وہ ناکام ہوجائے گا۔ [6]

---
[1] المرقات ۲/۶ [2] المرقات ۲/۷ [3] المرقات ۲/۸
[4] المرقات ۲/۸ [5] المرقات ۲/۸ [6] المرقات ۲/۹

"یغدو" صبح کو نکلنا "بائع نفسہ" یعنی اپنی جان کو بیچتا ہے عمل کے بدلے میں نیک عمل کے بدلے میں یا برے عمل کے بدلے میں اسی پر آنے والا جملہ متفرع ہے۔[1]

فمعتقها: یعنی نیکی کر کے دوزخ سے اپنی جان چھڑاتا ہے۔ **او موبقھا** یعنی برائی کے بدلے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔[2]

تین چیزوں سے گناہ مٹ جاتے ہیں

﴿۲﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلَى مَا يَمْحُو اللهُ بِهِ الْخَطَايَا وَيَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ إِسْبَاغُ الْوُضُوءِ عَلَى الْمَكَارِهِ وَكَثْرَةُ الْخُطَى إِلَى الْمَسَاجِدِ وَانْتِظَارُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ وَفِي حَدِيثِ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ رَدَّدَ مَرَّتَيْنِ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِي رِوَايَةِ التِّرْمِذِيِّ ثَلَاثًا)[3]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے (صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا اور کہا میں تمہیں وہ چیز نہ بتلادوں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو دور کردے اور جس کے سبب (جنت میں) تمہارے درجات کو بلند کرے؟ صحابہ نے عرض کیا "ہاں یا رسول اللہ!" آپ ﷺ نے فرمایا مشقت کے وقت (یعنی بیماری یا سخت جاڑے میں) وضو کا پورا کرنا، مسجد کی طرف (گھر سے دور ہونے کی وجہ سے) کثرت سے قدموں کا رکھنا اور (ایک) نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا پس یہ رباط ہے اور مالک بن انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں پس یہ رباط ہے پس یہ رباط ہے دو مرتبہ ہے (مسلم) اور ترمذی کی روایت میں تین مرتبہ ہے۔

توضیح: الا ادلکم: یہاں ہمزہ استفہام کے لئے ہے اور "لا" کا کلمہ نفی کے لئے ہے تنبیہ کے لئے نہیں کیونکہ اس کے جواب میں بلیٰ کا کلمہ آیا ہے جو نفی پر دلیل ہے۔[4]

یمحو: محو کرنے سے مراد معاف کرنا ہے یا نامۂ اعمال سے مٹانا مراد ہے۔[5]

اسباغ الوضوء: یعنی مکمل وضو بنانا کہ تین بار پانی بہایا جائے عضو کو مکمل طور پر دھویا جائے اور محل کے دھونے میں تطویل غرۃ سے کام لیا جائے۔[6]

علی المکارہ: مکرہ کی جمع ہے مشقت کے معنی میں ہے کہ سخت سردی میں یا سخت گرمی میں یا بیماری کی حالت میں وضو بنا رہا ہے اور محنت اٹھا رہا ہے یا پانی کا ملنا مشکل ہو رہا ہے یا مہنگے داموں مل رہا ہے یہ سب مکارہ کی صورتیں ہیں۔[7]

وکثرۃ الخطا: خطوۃ قدم اٹھانے کے معنی میں ہے مراد کثرت سے مسجد میں آنا جانا ہے کہ نماز کے لئے یا ویسے عبادت

---

[1] المرقات ۲/۹ [2] المرقات ۲/۹ [3] اخرجه مالک ۱۱۸ ومسلم ۱/۱۵۱

[4] المرقات ۲/۱۰ [5] المرقات ۲/۱۰ [6] المرقات ۲/۱۰ [7] المرقات ۱/۱۱

کے لئے یا مسجد سے محبت کے لئے بار بار مسجد میں آتا جاتا ہے ایک مطلب یہ بھی ہے کہ دور دراز علاقہ سے مسجد میں آتا ہے تو قدم زیادہ پڑتے ہیں جس سے ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔[۱]

انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نماز پڑھ لی اور دوسری نماز کے لئے مسجد میں بیٹھ کر انتظار کر رہا ہے دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایک نماز پڑھ لی اور گھر وغیرہ چلا گیا لیکن دل دوسری نماز کے ساتھ لگا ہوا ہے جیسا حدیث میں ہے:

"وَرجل قلبه معلق بالمساجد"۔[۲]

فذالکم: یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ ذا اسم اشارہ ہے اور کم کی ضمیر مخاطب کے اعتبار سے آتی ہے اگر مخاطب مفرد ہے تو ذالک آتا ہے تثنیہ ہے تو ذالکما آتا ہے اور جمع کے لئے ذالکم آتا ہے اس کا ترجمہ اس طرح ہوتا ہے یہ جو کام ہے، تم ایک یا تم دو یا تم سب کو کہہ رہا ہوں فذالکن زلیخا نے کہا یہ جو کام ہے تم سب عورتوں کو کہہ رہی ہوں آنحضرت نے فرمایا: "کیف تیکن" یعنی یہ عائشہ کیسی ہے تمہیں کہہ رہا ہوں۔

الرباط: سرحدات اسلامیہ پر کفر کے مقابلے میں پہرہ دینے کو رباط کہتے ہیں کیونکہ اس شخص نے اپنے آپ کو اور اپنے گھوڑوں کو وہاں پابند کر کے گویا باندھ رکھا ہے اس لئے یہ رباط کا اصل مفہوم اور مصداق ہے پھر اس کا چونکہ بڑا ثواب ملتا ہے لہٰذا وہ ثواب یہاں اس انتظار میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے دیتا ہے تو یہ ثواب کے اعتبار سے رباط ہے اصل رباط تو سرحد پر ہوتا ہے۔[۳]

۷ صفر ۱۴۱۰ھ

وضو سے گناہ دھل جاتے ہیں

﴿۳﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ جَسَدِهٖ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِهٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۴]

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح کرے (یعنی اس کے سنن و مستحبات کی رعایت کے ساتھ) تو اس کے (صغیرہ) گناہ اس کے بدن سے نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: فاحسن الوضوء: یعنی اچھی طرح وضو کرے اچھے وضو سے مراد یہ ہے کہ اس کے فرائض و سنن اور مستحبات وآداب کا پورا پورا خیال رکھے اور اس میں کسی کراہت کا ارتکاب نہ کرے۔[۵]

خرجت خطایاہ: اس مقام پر بھی وہی اعتراض آتا ہے کہ گناہ اعراض کے قبیل سے ہیں اور لفظ خروج تو اجرام واجسام

---

۱ المرقات ۱/۱۱ ۲ المرقات ۱/۱۱ ۳ المرقات ۱/۱۱ ۴ اخرجه البخاری ومسلم ۱/۱۳۹ ۵ المرقات ۱/۱۲

کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس سوال کے بھی وہی جوابات ہیں جو اس سے پہلے حدیث نمبر (۱) میں گزر چکے ہیں کہ آج کل اعراض تولے جاتے ہیں لہٰذا اب یہ مسئلہ مشکل نہیں رہا۔ یہاں دوسرا جواب یہ ہے کہ خطایا سے مراد اس کے اثرات ہیں کہ ان گناہوں کے داغ زائل ہوجاتے ہیں یا یہ کہ عالم مثال میں معاصی کی ایک مجسم شکل ہوتی ہے اس کے اعتبار سے خروج کا لفظ استعمال کیا گیا ہے "من جسدہ" یعنی تمام بدن سے یا اعضاء وضو سے گناہ خارج ہوجاتے ہیں۔ [۱]

من تحت اظفارہ: یہ مبالغہ کے طور پر فرمایا گیا ہے کہ گناہ بالکل ختم ہوجاتے ہیں یہاں تک کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل کر ختم ہوجاتے ہیں یہ محاورہ ایسا ہی ہے جیسا کہتے ہیں "تمہاری شیخی ناک کے راستے سے نکال دیں گے"۔

اب یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ خطایا سے کونسے گناہ مراد ہیں آیا کبیرہ گناہ بھی معاف ہوجاتے ہیں۔

تو علماء نے جواب دیا ہے کہ اس سے صغائر گناہ مراد ہیں کبائر بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے کیونکہ حدیث میں "**ما لم یؤت کبیرۃ**" کی قید صراحت کے ساتھ موجود ہے ہاں اگر وضو کرتے کرتے توبہ بھی کی تو کبائر بھی معاف ہوں گے اگر توبہ نہ کی تو صغائر سارے معاف ہوجائیں گے اور کبائر کمزور پڑ جائیں گے۔

یہاں دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ جب وضو سے صغائر ہی معاف ہوتے ہیں تو شریعت نے نصوص کو مطلق کیوں چھوڑا ہے صغائر کی قید لگا کر اس کا ذکر کیوں نہ کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں مسلمان کی شان ایسی ہے کہ اس کے ذمہ کبھی کوئی کبیرہ گناہ ہی نہ ہو یا کبیرہ کا ارتکاب نہیں کیا اور یا ارتکاب کے ساتھ بے چین ہو کر توبہ کی لہٰذا وضو کے وقت صغائر ہی ہوتے ہیں کبائر نہیں ہوتے۔

اب یہاں ایک اور سوال اٹھتا ہے کہ جب وضو سے سارے صغائر ڈھل گئے تو پھر مسجد میں جانے اور نوافل وغیرہ نمازوں سے کون سے خطایا معاف ہوں گے جبکہ وہاں بھی صغائر کی معافی کا ذکر آتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ صغائر کا ارتکاب بھی ہر وقت ہوتا ہے تو دوسرے اعمال سے وہ معاف ہوں گے یا وضو کے بعد دیگر اعمال سے درجات بلند ہوں گے اور وضو سے صغائر معاف ہوں گے یا خاص قسم کے گناہ وضو سے معاف ہوں گے اور کچھ اور قسم کے صغائر نماز سے معاف ہوں گے۔ [۲]

﴿۴﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُسْلِمُ أَوِ الْمُؤْمِنُ فَغَسَلَ وَجْهَهُ خَرَجَ مِنْ وَجْهِهِ كُلُّ خَطِيئَةٍ نَظَرَ إِلَيْهَا بِعَيْنَيْهِ مَعَ الْمَاءِ أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ فَإِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَ مِنْ يَدَيْهِ كُلُّ خَطِيئَةٍ كَانَ بَطَشَتْهَا يَدَاهُ مَعَ الْمَاءِ أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ فَإِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَ كُلُّ خَطِيئَةٍ مَشَتْهَا رِجْلَاهُ مَعَ الْمَاءِ أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ حَتَّى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِنَ الذُّنُوبِ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ) [۳]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا جب کوئی بندہ مسلمان یا فرمایا مومن

---

[۱] المرقات ۲/۷ [۲] المرقات ۱/۱۲ [۳] اخرجہ مسلم ۱/۱۴۸

وضو کا ارادہ کرتا ہے اور اپنے منہ کو دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ اس کے وہ تمام گناہ جن کی طرف اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کے چہرے سے نکل جاتے ہیں (یعنی جو گناہ آنکھوں سے ہوئے ہیں جھڑ جاتے ہیں) پھر جب دونوں ہاتھوں کو دھوتا ہے تو ہاتھوں کے تمام گناہ جن کو اس کے ہاتھوں نے پکڑا تھا پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ اس کے ہاتھوں سے خارج ہو جاتے ہیں (یعنی جو گناہ ہاتھ سے ہوئے ہیں جھڑ جاتے ہیں) پھر جب وہ دونوں پاؤں کو دھوتا ہے تو اس کے وہ تمام گناہ جن کی طرف وہ پاؤں سے چلا تھا پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ (مسلم)

توضیح: خرج من وجهه: علامہ طیبی ؒ فرماتے ہیں کہ اذنین اور فم دونوں بھی وجہ یعنی چہرے میں داخل تھے مگر ان کا ذکر یہاں نہیں کیا حالانکہ ان سے بھی گناہ سرزد ہو جاتے ہیں صرف آنکھوں کے گناہ کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ آنکھیں بدن میں دل کے لئے سب سے بڑی جاسوس ہیں اور ارتکاب معاصی میں ان کو امتیازی شان حاصل ہے جب آنکھوں کے گناہ وضو سے دھل گئے تو باقی اعضاء مثلاً ناک کان اور زبان کے گناہ بطریق اولیٰ خارج ہوں گے۔ دوسری وجہ یہ کہ ناک اور منہ کے گناہ تو مضمضہ اور استنشاق سے نکل جاتے ہیں اور کان کے گناہ مسح کے ذریعہ خارج ہو جاتے ہیں اس لئے یہاں صرف آنکھوں کے گناہوں کے خروج کا ذکر فرمایا۔

او مع آخر قطر الماء: یعنی پانی کے آخری قطرہ سے گناہ زائل ہو جاتے ہیں یہاں او شک راوی کے لئے بھی ہوسکتا ہے اور بعض نے کہا کہ او تنویع کے لئے بھی لیا جاسکتا ہے۔[1]

حتی یخرج: یہاں سوال یہ ہے کہ جب تمام گناہوں سے پاک ہو گیا تو پھر **مشی الی المسجد** اور صلوۃ کس چیز کے لئے کفارہ بنیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے بعض قسم کے صغائر وضو سے دھل گئے ہوں اور بعض نماز سے دھل جائیں گے دوسرا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے نماز کبائر کے لئے کفارہ بن جائے جب توبہ ساتھ ہو جائے یا نماز کبائر کمزور کرنے کا کام کرے یا رفع درجات کا کام کرے۔[2]

نقیا: پاک وصاف کے معنی میں آتا ہے یہ حال واقع ہے اگر وضو کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھ لی اچھی نیت کی تو پورا بدن پاک ہو جائے گا ورنہ وضو کے اعضاء پاک ہو جائیں گے جیسا کہ دوسری حدیث میں آیا ہے۔[3]

اچھا وضو اور اچھی نماز گناہوں کا کفارہ ہے

﴿۵﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنِ امْرِئٍ مُسْلِمٍ تَحْضُرُهُ صَلَاةٌ مَكْتُوْبَةٌ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَ هَا وَخُشُوْعَهَا وَرُكُوْعَهَا اِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوْبِ مَا لَمْ يُؤْتِ كَبِيْرَةً وَذٰلِكَ الدَّهْرَ كُلَّهُ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[4]

---

[1] الکاشف ۲/۱۰ [2] المرقات ۲/۱۳ [3] المرقات ۱/۱۳ [4] اخرجه مسلم ۱/۱۴۲

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جو مسلمان فرض نماز کا وقت آنے پر اچھی طرح وضو کرے اور نماز میں خشوع ورکوع اچھی طرح ادا کرے تو (اس کی یہ نماز) ان گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے جو اس نے نماز سے پہلے کئے تھے بشرطیکہ وہ گناہ کبیرہ نہ ہوں اور ایسا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ (یہ فضیلت ہر زمانہ میں قائم رہتی ہے)۔
(مسلم)

توضیح: فیحسن وضوءھا: ضمیر نماز کی طرف راجع ہے اچھا وضو وہ ہوتا ہے جس میں فرائض اور سنن و مستحبات کا پورا خیال رکھا جائے۔[1]

وخشوعھا: یعنی ظاہری اور باطنی عاجزی کے ساتھ نماز ادا کرے اعضاء پُرسکون ہوں اور قلب متوجہ ہو اور نگاہیں جائے سجدہ پر جھکی ہوئی ہوں۔[2]

ورکوعھا: رکوع کا ذکر کیا سجدہ کا نہیں کیا کیونکہ رکوع کے بعد سجدہ آتا ہے تو الگ ذکر کی ضرورت نہ تھی نیز رکوع سجدہ سے زیادہ مشکل تھا اس لئے خصوص کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ قاضی عیاض علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ رکوع کا خصوص کے ساتھ ذکر اس لئے کیا کہ یہ مسلمانوں کا خصوصی شعار ہے۔ **من الذنوب:** اس سے صغائر مراد ہیں۔[3]

مالم یؤت کبیرۃ: یہ استثناء کی جگہ میں ہے یعنی **الا الکبیرۃ** کبیرہ کے علاوہ گناہ معاف ہوں گے کیونکہ کبائر کی مغفرت کے لئے توبہ کرنا ضروری ہے بعض علماء نے لکھا ہے کہ کبائر اور صغائر کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑنا چاہیئے اور احادیث کے ظاہری الفاظ کو اپنانا چاہیئے۔ چنانچہ متقدمین علماء فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے مگر متاخرین نے صغائر اور کبائر کا فرق کیا ہے کیونکہ احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے لہذا صغائر معاف کبیرہ نہیں، بعض نے تطبیق دی ہے کہ لغت کے اعتبار سے ذنوب وسیئات کا فرق کرنا چاہیئے یعنی جس طرح لغت میں ذنب اس گناہ کو کہتے ہیں جو باعث عیب ہو "**الذنوب العیوب**" اور **الخطایا** اس گناہ کو کہتے ہیں جو صحیح کے برعکس غلطی ہو" "**معصیت**" نافرمانی کو کہتے ہیں اور "**سیئات**" برائی کے معنی میں ہے تو سب سے اعلیٰ درجے کے گناہ "**المعاصی**" ہیں اس کے بعد دوسرے نمبر پر "**الاثم**" ہے اس کے بعد تیسرے نمبر پر "**السیئات**" ہیں پھر چوتھے نمبر پر "**الخطایا**" ہیں اور پانچویں نمبر پر "**الذنوب**" ہیں تو جو لفظ جہاں احادیث میں آجائے اس کے مفہوم کے اعتبار سے معنی مراد لینا چاہیئے اگر صغیرہ کا لفظ ہو تو صغیرہ لیا جائے اور اگر کبیرہ کا لفظ ہو تو کبیرہ مراد لیا جائے۔

وذلک الدھر کلہ: یعنی نماز کا کفارہ ہونا کسی زمانہ کے ساتھ خاص نہیں اور نہ کسی خاص فرض نماز کے ساتھ خاص ہے بلکہ یہ ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہر فرض نماز کے لئے۔[4]

---

[1] المرقات ۲/۱۳ [2] المرقات ۲/۱۳ [3] المرقات ۱/۱۵ [4] المرقات ۲/۱۵،۱۶

وضو کرنے کا طریقہ

﴿٦﴾ وَعَنْهُ أَنَّهُ تَوَضَّأَ فَأَفْرَغَ عَلَى يَدَيْهِ ثَلَاثًا ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُسْرَى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلَاثًا ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنَى ثَلَاثًا ثُمَّ الْيُسْرَى ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِي هٰذَا ثُمَّ قَالَ مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِي هٰذَا ثُمَّ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ نَفْسَهُ فِيْهِمَا بِشَيْءٍ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ۔ [1] (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَلَفْظُهُ لِلْبُخَارِيِّ)

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ وضو کیا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے اپنے ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی ڈالا پھر تین مرتبہ کلی کی اور ناک جھاڑی (یعنی ناک میں پانی دینے کے بعد ناک سنکی) پھر تین مرتبہ منہ دھویا، پھر تین مرتبہ اپنا داہنا ہاتھ کہنی تک دھویا (یعنی کہنی سمیت دھویا) پھر تین مرتبہ اپنا بایاں ہاتھ کہنی تک دھویا پھر اپنے سر پر مسح کیا پھر اپنا دایاں پیر تین مرتبہ دھویا، پھر بایاں پیر تین مرتبہ دھویا اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا جس طرح اب میں نے وضو کیا'' پھر فرمایا جو شخص میرے اس وضو کی مانند وضو کرے (یعنی فرائض وسنن اور مستحبات وآداب کی رعایت کے ساتھ وضو بنائے پھر دو رکعت نماز پڑھے اور نماز کے اندر اپنے دل سے کچھ باتیں نہ کرے (یعنی پورے دھیان سے نماز پڑھے) تو اس کے تمام پچھلے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ (بخاری ومسلم) اس روایت کے الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔

توضیح: ثم مسح برأسه: اس حدیث میں وضو کے اعضاء کے ساتھ تین بار دھونے کا لفظ آیا ہے لیکن مسح کے ذکر کے ساتھ تین بار کا لفظ نہیں آیا اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تین بار مسح کرنا اور مسح میں تثلیث کرنا کوئی مسنون حکم نہیں ہے اور یہی احناف کا مسلک ہے جس کی تفصیل بعد میں آئے گی ہاتھ اور چہرہ کے دھونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے ہاں **مضمضہ** اور **استنشاق** میں اختلاف ہے جو بعد میں آرہا ہے۔

لا یحدث نفسه: یعنی دو رکعتیں ایسی پڑھ لے جس میں امور دنیوی کے خیالات دل میں نہ لائے اس سے وہ خیالات مراد ہیں جو اختیاری ہوں غیر اختیاری خیالات مراد نہیں کیونکہ ایسے وساوس اور خیالات جو حدیث النفس کے درجہ میں ہوں وہ شرعاً معاف ہیں بہر حال اس عظیم فضیلت کے حصول کے لئے حضور قلب ضروری شرط ہے بعض اللہ والوں نے ان دو رکعتوں کی فضیلت کے حصول کے لئے دو دو سورکعات مسلسل پڑھیں ہیں۔ [2]

وضو کے بعد دو نفل کا ثواب

﴿٧﴾ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ

[1] اخرجه البخاری ۱/۵۱ ومسلم ۱/۱۴۱ [2] المرقات ۱/۱۷

فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهُ ثُمَّ يَقُوْمُ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ وَوَجْهِهٖ اِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ.
(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جو مسلمان وضو کرے اور اچھا وضو کرے پھر کھڑا ہو اور دو رکعت نماز پڑھے دل اور چہرہ سے متوجہ ہو کر (یعنی ظاہر و باطن سے متوجہ ہو کر) تو اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے۔

توضیح: رکعتین: مضمون کے اعتبار سے یہ حدیث اور اس سے پہلے والی حدیث ایک جیسی ہیں۔ دو رکعتوں سے مراد یا تو تحیۃ الوضو ہے اور یا تحیۃ المسجد ہے۔[2] وجبت له الجنة یعنی ان دو رکعتوں کی خاصیت تو یہی ہے کہ جنت واجب ہو جائے گی لیکن آخرت میں فیصلہ معجون مرکب پر ہوتا ہے۔ تو صرف ان رکعتوں کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ دیگر حسنات وسیئات کو ملا کر حد اوسط نکالی جائے گی اور پھر فیصلہ ہوگا بہر حال کسی دنیوی خیال سے پاک ہو کر دو رکعت پڑھنا بھی آسان کام نہیں "الا من رزقه الله"۔[3]

وضو کے بعد کی دعا

﴿۸﴾ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُبْلِغُ أَوْ فَيُسْبِغُ الْوُضُوْءَ ثُمَّ يَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ أَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا فُتِحَتْ لَهٗ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةُ يَدْخُلُ مِنْ أَيِّهَا شَاءَ. هٰكَذَا رَوَاهُ مُسْلِمٌ فِيْ صَحِيْحِهٖ وَالْحُمَيْدِيُّ فِيْ أَفْرَادِ مُسْلِمٍ وَكَذَا ابْنُ الْأَثِيْرِ فِيْ جَامِعِ الْأُصُوْلِ وَذَكَرَ الشَّيْخُ مُحْيِ الدِّيْنِ النَّوَوِيُّ فِيْ آخِرِ حَدِيْثِ مُسْلِمٍ عَلٰى مَا رَوَيْنَاهُ وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ، وَالْحَدِيْثُ الَّذِيْ رَوَاهُ مُحْيِ السُّنَّةِ فِي الصِّحَاحِ «مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ» اِلٰى آخِرِهٖ.
(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ فِيْ جَامِعِهٖ بِعَيْنِهٖ اِلَّا كَلِمَةَ أَشْهَدُ قَبْلَ أَنَّ مُحَمَّدًا)[4]

ترجمہ: اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم میں سے جو شخص وضو کرے اور اس (کی خوبیوں) کو انتہا پر پہنچا دے یا آپ نے یہ الفاظ فرمائے کہ پورا وضو کرے پھر کہے اشهد ان لا اله الا الله وان محمدا عبده ورسوله (یعنی میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ خدائے واحد کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ خدا کے بندے اور رسول ہیں) اور ایک روایت میں ہے، کہ (اس طرح کہے) اشهد ان لا اله الا الله وحده لا

[1] اخرجه مسلم ۱/۱۲۲ [2] المرقات [3] المرقات ۱/۱۸ [4] اخرجه مسلم ۱/۱۲۲

شریك له واشهد ان محمدًا عبده ورسوله تو اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں جس دروازے میں سے اس کا جی چاہے جنت میں داخل ہو۔ (مسلم، حمیدی، جامع الاصول) اور امام نووی نے مسلم کی حدیث کے آخر میں جس کو ہم نے روایت کیا ہے یہ ذکر کیا ہے کہ ترمذی نے (شہادتین پر اس دعا کے) یہ الفاظ زیادہ لکھے ہیں اے اللہ مجھ کو توبہ کرنے والوں میں سے بنا اور پاکیزگی کرنے والوں میں شامل کر (یعنی مسلم کی روایت جس طرح ہم نے ذکر کی ہے وہی روایت امام نووی نے مسلم کی شرح میں نقل کی ہے اور اس کے آخر میں وزاد الترمذی الخ کی عبارت بڑھادی ہے) اور وہ حدیث جس کو امام محی السنۃ نے صحاح میں نقل کیا ہے یعنی **من توضا فاحسن الوضوء** الخ جس نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا'' آخر تک اس کو امام ترمذی نے اپنی جامع میں بعینہ اسی طرح نقل کیا ہے صرف ان محمداً سے پہلے اشهد کا ذکر نہیں کیا ہے۔

توضیح: اللّٰهم اجعلني : اس حدیث میں وضو کے دوران روایات میں مختلف دعائیں اور مختلف الفاظ آئے ہیں۔ جس سے بظاہر تضاد و اضطراب کا خیال گزرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صاحب مشکوۃ نے مختلف روایات کے مختلف الفاظ کو یکجا کر کے اشارہ کیا کہ جو شخص ان دعاؤں میں سے جو پڑھنا چاہتا ہے وہ پڑھ سکتا ہے۔ بعض روایات میں تقدیم وتاخیر سے بھی ان دعاؤں کا ذکر آیا ہے۔ بعض میں شہادتین کا ذکر ہے بعض میں نہیں ہے مطلب یہ کہ جو شخص جو دعا پڑھے گا سنت ادا ہو جائے گی۔ آخر میں صاحب مشکوۃ نے صاحب مصابیح پر اعتراض کیا کہ اس نے جس روایت کو صحاح میں ذکر کیا ہے یہ وہاں نہیں ہے بلکہ ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ترمذی نے ذکر کی ہے۔[1]

ثمانية ابواب: داخل تو ایک دروازہ سے ہوگا مگر ایسے جنتیوں کے اکرام و تعظیم کے لئے آٹھوں دروازے کھل جائیں گے جہاں سے جانا چاہیں گے جائیں گے۔[2]

قیامت میں وضو کے اعضاء چمکتے ہونگے

﴿۹﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ أُمَّتِي يُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يُطِيْلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[3]

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' قیامت کے روز میری امت اس حال میں پکاری جائے گی کہ وضو کے سبب سے ان کی پیشانیاں روشن ہوں گی اور اعضاء چمکتے ہوں گے۔ لہٰذا تم میں سے جو شخص چاہے کہ وہ اپنی پیشانی کی روشنی بڑھائے تو اسے چاہیئے کہ ایسا ہی کرے''۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: غرًا: یہ اغر کی جمع ہے اور غرۃ اصل میں اس سفید داغ کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیشانی پر ہوتا ہے مراد چہرہ ہے پھر ہر روشن اور مشہور چیز پر بولا گیا ہے۔ **محجلین:** یہ **تحجیل** اور **تحجل** سے مشتق ہے جس کا اطلاق جانوروں کے پاؤں کی سفیدی پر ہوتا ہے جو نہایت خوبصورت ہوتی ہے اور یہ بمنزلہ قید ہوتی ہے کیونکہ یہ سفیدی پاؤں پر قید کی طرح محیط

[1] المرقات ۲/۱۹،۲۰ [2] المرقات ۲/۱۹ [3] اخرجه البخاري ۱/۳۶ ومسلم ۱/۱۴۹

ہوتی ہے اس جملہ میں "یدعون" کا لفظ "یسمون" کے معنی میں ہے یعنی یہ قیامت کے روز جب پکارے جائیں گے تو اس طرح چمک دمک کے ساتھ ہوں گے جیسے جانور کے پیروں اور پیشانی کی سفیدی چمکتی ہے۔ ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان کو اس طرح پکارا جائے گا "ایها الغر المحجلون"۔

بعض نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ وضو صرف اس امت کی خصوصیات میں سے ہے کیونکہ یہی قیامت کے روز ان کی پہچان ہوگی لیکن علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ وضو سابقہ امم میں بھی تھا۔ ہاں یہ روشن غرہ اور یہ بیاض الاقدام اور تحجل اس بڑے پیمانے پر اس امت کا خاصہ ہے۔[1]

فمن استطاع: یہ جملہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدرج ہے اور وہ خود اس پر عمل کیا کرتے تھے اطالت غرہ سے مراد یہ ہے کہ جو عضو ہے اس کو معین حد سے زیادہ تک دھویا جائے مثلاً ہاتھ کو کندھوں تک دھویا جائے اور پاؤں گھٹنوں تک دھویا جائے یہاں اطالت غرہ سے مراد تین بار سے زیادہ پانی استعمال کرنا نہیں کیونکہ وہ اسراف ہے جو جائز نہیں ہے۔[2]

﴿۱۰﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ تَبْلُغُ الْحِلْيَةُ مِنَ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ يَبْلُغُ الْوُضُوْءُ۔
(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[3]

ترجمہ: "اور حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا (جنت میں) مومن کو زیور (وہاں تک) پہنچے گا جہاں تک وضو کا پانی پہنچے گا"۔ (مسلم)

توضیح: الحلية: بمعنی زیور ہے یہاں روشنی اور "غرة" مراد ہے جس کا ذکر اس سے پہلے حدیث میں گزرا ہے مطلب یہ ہوا کہ مسلمان جتنا زیادہ وضو کے اعضاء کو مقدار سے آگے تک بڑھا کر دھوئے گا اتنا ہی وہ حصہ مزین ہو کر روشن ہوگا۔[4]

الفصل الثانی

استقامت کی فضیلت

﴿۱۱﴾ عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا وَاعْلَمُوْا أَنَّ خَيْرَ أَعْمَالِكُمُ الصَّلَاةُ وَلَا يُحَافِظُ عَلَى الْوُضُوْءِ إِلَّا مُؤْمِنٌ۔ (رَوَاهُ مَالِكٌ وَأَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ)[5]

ترجمہ: حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "سیدھے رہو اور تم سیدھے رہنے کی ہرگز طاقت نہ رکھ سکو گے۔ اور جان لو کہ تمہارے اعمال میں بہترین چیز نماز ہے اور وضو کی حفاظت مومن ہی کرتا ہے"۔

(مالک، احمد، ابن ماجہ، دارمی)

توضیح: استقیموا: یعنی افراط و تفریط سے پاک اعتدال کے راستے پر سیدھے اور مستقیم رہو اور اعمال صالحہ پر

[1] المرقات ۲/۲۰ [2] المرقات ۲/۲۱ [3] اخرجہ مسلم ۱/۱۵۱ [4] المرقات ۲/۲۲ [5] اخرجہ مالک و احمد ۳/۳۳۰

قائم ودائم رہو۔ استقامت سے متعلق حضرت پاک ﷺ نے فرمایا شیبتنی ھود واخواتھا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا استقامت اس کو کہتے ہیں کہ "لا یروغون روغان الثعالب" یعنی لومڑیوں کی طرح قلابازیاں نہ کھائیں بلکہ حق پر ڈٹ جائیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے فرائض اعمال پر قائم رہنے کو استقامت فرمایا اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو پل صراط کا نام دیا ہے یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کہتے ہیں: "الاستقامة فوق الف کرامة" چونکہ یہ کام بہت مشکل تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ولن تحصوا یعنی یہ کام تمہارے لئے بہت مشکل ہے اگر تم یہ نہیں کرسکو تو اتنا تو کرو کہ دوام علی الوضو کرو کیونکہ یہ مومن کی شان ہے اور محافظت علی الصلوۃ کے لئے معاون ہے۔ دوسرا مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ دین پر بغیر افراط وتفریط کے چلتے رہو مکمل حقوق ادا کیا کرو۔ اخلاق کی استقامت ہو عقائد وعبادات کی استقامت ہو مگر یہ مشکل ہے محنت کرنی پڑے گی۔[1]

وضو پر وضو کی فضیلت

﴿۱۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَوَضَّأَ عَلٰى طُهْرٍ كُتِبَ لَهٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ۔[2]
(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص وضو کے اوپر وضو کرے تو اس کے واسطے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ (ترمذی)

توضیح: علی طھر: یہ وضو علی الوضو کا مسئلہ ہے اس میں دس گنا ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے مگر اس میں چند شرائط ہیں ایک یہ کہ پہلے وضو کے ساتھ کچھ عبادت کرے یا کوئی دنیوی کام کر کے فاصلہ پیدا کرے جس سے حد فاصل بن جائے اور مجلس کی بھی تبدیلی آجائے اگر ایسا نہ ہو تو ایک مجلس میں وضو بنانے کے بعد نیک کام کئے بغیر وضو بنانا تحصیل حاصل اور اسراف کے زمرہ میں آتا ہے جس کو صاحب فتح القدیر نے مکروہ لکھا ہے۔[3]

الفصل الثالث

وضو نماز کی کنجی ہے

﴿۱۳﴾ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلَاةُ وَمِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُوْرُ۔
(رَوَاهُ أَحْمَدُ)[4]

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جنت کی کنجی نماز اور نماز کی کنجی وضو ہے"۔ (احمد)

[1] المرقات ۲/۲۲ [2] اخرجه الترمذی ۵۹ [3] المرقات ۱/۲۳ [4] اخرجه احمد ۳/۳۴۰

توضیح: **مفتاح الجنة:** یہ تشبیہ ہے کہ صلوۃ ونماز ایک خزانہ کی مانند ہے اور وضواس کے لئے کنجی کی مانند ہے اور ایسے ہی جنت ایک خزانہ ہے اور نماز اس کی کنجی ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ مقفل خزانہ کنجی کے بغیر نہیں کھولا جاسکتا ہے۔ لہٰذا نماز وضو کے بغیر ممکن نہیں ہے اور جنت کا داخلہ نماز کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ [1]

مقتدی کا خراب وضوامام کو خراب کرتا ہے

﴿۱۴﴾ وَعَنْ شَبِيْبِ بْنِ اَبِيْ رَوْحٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى صَلَاةَ الصُّبْحِ فَقَرَأَ الرُّوْمَ فَالْتَبَسَ عَلَيْهِ فَلَمَّا صَلَّى قَالَ مَا بَالُ أَقْوَامٍ يُصَلُّوْنَ مَعَنَا لَا يُحْسِنُوْنَ الطُّهُوْرَ وَاِنَّمَا يَلْبِسُ عَلَيْنَا الْقُرْآنَ أُولٰئِكَ.

(رَوَاهُ النَّسَائِيُّ) [2]

ترجمہ: اور حضرت شبیب ابن ابی روح آنحضرت ﷺ کے اصحاب میں سے کسی صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے (ایک مرتبہ) صبح کی نماز پڑھی اوراس کے اندر سورۃ روم کو پڑھا (اثناء نماز میں) آپ کو تشابہ ہوا چنانچہ جب آپ نماز پڑھ چکے تو فرمایا لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور اچھی طرح وضو نہیں کرتے اور اس وجہ سے یہ لوگ ہم پر قرآن میں اشتباہ ڈالتے ہیں۔ (نسائی)

پاکیزگی نصف ایمان ہے

﴿۱۵﴾ وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِيْ سُلَيْمٍ قَالَ عَدَّهُنَّ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ يَدِيْ أَوْ فِيْ يَدِهِ قَالَ اَلتَّسْبِيْحُ نِصْفُ الْمِيْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ يَمْلَأُهُ وَالتَّكْبِيْرُ يَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَالصَّوْمُ نِصْفُ الصَّبْرِ وَالطُّهُوْرُ نِصْفُ الْإِيْمَانِ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ) [3]

ترجمہ: اور قبیلہ بنوسلیم کے ایک شخص روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے چند باتوں کو (جو آگے مذکور ہیں) میرے ہاتھ پر یا اپنے ہاتھ پر شمار کیا (چنانچہ) آپ نے فرمایا سبحان اللہ کہنا (یعنی اس کا ثواب) آدھا ترازو بھر دیتا ہے۔ الحمد للہ (سبحان اللہ کے ساتھ) کہنا (یا فقط الحمد للہ کہنا ہی پورے) ترازو کو بھر دیتا ہے اور اللہ اکبر کہنا بھر دیتا ہے اس چیز کو جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ اور روزہ آدھا صبر ہے اور پاک رہنا آدھا ایمان ہے (ترمذی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے)۔

توضیح: **التسبیح نصف المیزان:** کیونکہ تسبیح صفات سلبیہ سے تنزیہ اور پاکی کا نام ہے اور صفات سلبیہ صفات ثبوتیہ کے مقابلہ میں نصف ہیں اور الحمد للہ صفات ثبوتیہ میں سے ہے لہٰذا دونوں کے جمع ہونے سے ترازو بھر جاتا ہے۔ [4]

---

[1] المرقات ۲/۲۳ [2] اخرجہ نسائی ۲/۱۵۶ [3] اخرجہ الترمذی: ۳۵۱۹ [4] المرقات ۱/۲۵

والصوم نصف الصبر: صوم سے شہوت فرج اور شہوتِ بطن کے تمام مرغوبات چھوٹ جاتے ہیں لیکن صبر تین اجزاء کے مجموعہ کا نام ہے۔یعنی صبر علی الطاعة صبر علی المصیبة اور صبر عن المعصیة۔ لہٰذا صوم میں صبر کے یہ سارے اجزا نہیں پائے جاتے بلکہ دو بڑے بڑے اجزاء یعنی صبر عن شہوۃ البطن اور صبر عن شہوۃ الفرج پائے جاتے ہیں، چنانچہ صوم کو نصف صبر کہا گیا۔[1]

﴿۱۶﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ الصُّنَابِحِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ فَمَضْمَضَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ فِيْهِ وَإِذَا اسْتَنْثَرَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ أَنْفِهِ فَإِذَا غَسَلَ وَجْهَهُ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ وَجْهِهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَشْفَارِ عَيْنَيْهِ فَإِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ يَدَيْهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِ يَدَيْهِ فَإِذَا مَسَحَ بِرَأْسِهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رَأْسِهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ أُذُنَيْهِ فَإِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رِجْلَيْهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِ رِجْلَيْهِ ثُمَّ كَانَ مَشْيُهُ إِلَى الْمَسْجِدِ وَصَلَاتُهُ نَافِلَةً لَهُ۔ (رَوَاهُ مَالِكٌ وَالنَّسَائِيُّ)[2]

ترجمہ: ’’اور حضرت عبداللہ صنابحی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جب بندہ مومن وضو کا ارادہ کرتا ہے اور کلی کرتا ہے تو گناہ اس کے منہ سے خارج ہو جاتے ہیں اور جب ناک جھاڑتا ہے تو گناہ اس کی ناک سے خارج ہو جاتے ہیں جب اپنا منہ پانی سے دھوتا ہے تو گناہ اس کے منہ سے خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کی آنکھوں کی پلکوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں اور جب اپنے دونوں ہاتھ دھوتا ہے تو گناہ اس کے ہاتھوں سے خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے دونوں ہاتھوں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں اور جب اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو گناہ اس کے سر سے خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے دونوں کانوں سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں اور جب اپنے دونوں پاؤں دھوتا ہے تو گناہ اس کے دونوں پاؤں سے خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں پھر مسجد کی طرف اس کا چلنا اور اس کی نماز اس کے واسطے (اعمال میں) زیادتی ہے۔ (مالک ونسائی)

توضیح: حتی تخرج من اذنه: سر کے مسح کرنے سے جو گناہ خارج ہو گئے اس کا راستہ کان بتایا گیا ہے معلوم ہوا کہ دونوں کان مسح میں سر کے تابع ہیں لہٰذا اس کے لئے جدید پانی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ یہ مسئلہ آ رہا ہے۔[3]

وضو والے لوگ قیامت کے دن چمکتے ہونگے

﴿۱۷﴾ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَتَى الْمَقْبَرَةَ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ وَدِدْتُّ أَنَّا قَدْ رَأَيْنَا إِخْوَانَنَا قَالُوْا أَوَلَسْنَا إِخْوَانَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

---

[1] المرقات ۲/۲۵ [2] اخرجه مالك ۲۵ والنسائی ۲/۳۳۸ [3] المرقات ۱/۲۷

قَالَ أَنْتُمْ أَصْحَابِيْ وَإِخْوَانُنَا الَّذِيْنَ لَمْ يَأْتُوْا بَعْدُ فَقَالُوْا كَيْفَ تَعْرِفُ مَنْ لَمْ يَأْتِ بَعْدُ مِنْ أُمَّتِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ أَرَأَيْتَ لَوْ أَنَّ رَجُلًا لَهُ خَيْلٌ غُرٌّ مُحَجَّلَةٌ بَيْنَ ظَهْرَيْ خَيْلٍ دُهْمٍ بُهْمٍ أَلَا يَعْرِفُ خَيْلَهُ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَإِنَّهُمْ يَأْتُوْنَ غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنَ الْوُضُوْءِ وَأَنَا فَرَطُهُمْ عَلَى الْحَوْضِ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ مقبرہ (یعنی جنت البقیع) میں (دعائے مغفرت کے لئے) تشریف لائے۔ چنانچہ (وہاں پہنچ کر) آپ نے فرمایا "اے مومنین کی جماعت! تم پر سلامتی ہو (یعنی آپ نے اہل قبور کو سلام کیا اور فرمایا) ہم بھی انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں اور میں اس بات کی تمنا رکھتا ہوں کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھیں" صحابہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں" آپ نے فرمایا تم میرے دوست ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو ابھی (دنیا میں) نہیں آئے۔ صحابہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ آپ کی امت میں سے جو لوگ ابھی نہیں آئے انہیں آپ (قیامت میں) کس طرح پہچانیں گے"۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے یہ بتاؤ کہ اگر کسی شخص کے پاس سفید پیشانی اور سفید ہاتھ پیر والے گھوڑے ہوں اور وہ نہایت سیاہ گھوڑوں میں ملے ہوئے ہوں تو کیا وہ اپنے گھوڑوں کو پہچان لے گا؟ صحابہ نے عرض کیا ہاں (یا رسول اللہ! ان امتیازی اوصاف کی بناء پر تو وہ یقینا پہچان لے گا) آپ نے فرمایا: "وہ (قیامت میں) وضو کے اثر سے سفید پیشانی اور سفید ہاتھ پاؤں کے ساتھ آئیں گے۔ (لہٰذا اس علامت سے میں انہیں پہچان لوں گا) اور میں حوض کوثر پر ان کا میر سامان ہوں گا۔ (مسلم)

توضیح: السلام علیکم: قبرستان میں مُردوں کو سلام کرنا ثابت ہے اور مسنون طریقہ ہے مُردے سلام کو سنتے ہیں اس پر مزید اشیاء کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے سماع موتی کا مطلق انکار کرنا تفریط ہے اور بالکل ہر بات ہر وقت سننے کا عقیدہ رکھنا افراط ہے اعتدال یہ ہے کہ جن نصوص سے سماع ثابت ہے وہاں سماع ہے اور جہاں نہیں وہاں نہیں سماع کی نصوص بھی خلاف عقل ہیں۔ جو اپنے مورد میں بند ہیں اس پر دیگر اشیاء کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔[2]

انتم اصحابی: یعنی تم تو ہمارے بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ ساتھی بھی ہو اور بعد میں آنے والے صرف بھائی ہیں ساتھی ہونے کا وصف ان میں نہیں ہے اس لئے "اخواننا" کہہ دیا۔ "**دهم بهم**" یعنی کالے کلوٹے۔[3]

﴿۱۷﴾ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنَا أَوَّلُ مَنْ يُؤْذَنُ لَهُ بِالسُّجُوْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَنَا أَوَّلُ مَنْ يُؤْذَنُ لَهُ أَنْ يَرْفَعَ رَأْسَهُ فَأَنْظُرُ إِلٰى مَا بَيْنَ يَدَيَّ فَأَعْرِفُ أُمَّتِيْ مِنْ بَيْنِ الْأُمَمِ وَمِنْ خَلْفِيْ مِثْلَ ذٰلِكَ وَعَنْ يَمِيْنِيْ مِثْلَ ذٰلِكَ وَعَنْ شِمَالِيْ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ

[1] اخرجه مسلم ۱/۱۵۰ [2] المرقات ۱/۲۷ [3] المرقات ۲/۲۸

تَعْرِفُ أُمَّتَكَ مِنْ بَيْنِ الْأُمَمِ فِيمَا بَيْنَ نُوحٍ إِلَى أُمَّتِكَ قَالَ هُمْ غُرٌّ مُحَجَّلُونَ مِنْ أَثَرِ الْوُضُوءِ لَيْسَ أَحَدٌ كَذٰلِكَ غَيْرُهُمْ وَأَعْرِفُهُمْ أَنَّهُمْ يُؤْتَوْنَ كُتُبَهُمْ بِأَيْمَانِهِمْ وَأَعْرِفُهُمْ تَسْعٰى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ ذُرِّيَّتُهُمْ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[1]

ترجمہ: ''اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ''قیامت کے دن ان لوگوں میں سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جن کو سجدہ کی اجازت دی جائے گی۔ اور (پھر) ان لوگوں میں سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جن کو سجدہ سے سر اٹھانے کی اجازت دی جائے گی۔ چنانچہ میں اس چیز کی طرف دیکھوں گا جو میرے آگے ہوگی (یعنی مخلوق کا مجمع) اور میں امتوں کے درمیان اپنی امت کو پہچان لوں گا پھر میں اپنے پیچھے کی طرف اسی طرح اور اپنے دائیں طرف و بائیں طرف (بھی) اسی طرح دیکھوں گا (یعنی چاروں طرف اژدھام خلق دیکھوں گا اور ان میں اپنی امت کو پہچان لوں گا) ایک صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ! نوح علیہ السلام کی امت سے لے کر اپنی امت تک تمام امتوں میں آپ اپنی امت کو کیونکر پہچان لیں گے۔ آپ نے فرمایا ''میری امت کے لوگ وضو کے اثر سے سفید پیشانی اور سفید ہاتھ پاؤں کے ساتھ ہوں گے۔ اس امت کے علاوہ کوئی دوسری امت اس طرح (امتیازی وصف کے ساتھ) نہیں ہوگی۔ اور میں اپنی امت کو اس طرح بھی پہچان لوں گا کہ (میری امت کے لوگوں کو) ان کے اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے، نیز اس وجہ سے بھی شناخت کروں گا کہ ان کی (خورد سال) اولاد ان کے آگے دوڑتی ہوگی''۔ (احمد)

توضیح: بأیمانھم: سوال یہ ہے کہ آخرت میں جتنے کامیاب مسلمان اور مومن ہوں گے سب کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا پھر اس امت کے مومنین کی کیا خصوصیت رہ گئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ دیگر امتوں کے افراد کو بھی دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا مگر اس امت کو ایک خاص شان اور خاص اعزاز کے ساتھ دیا جائے گا اسی کو بتایا گیا۔[2]

تسعی بین ایدیھم: یعنی ان کی اولاد ان سے پہلے آگے آگے جنت کی طرف دوڑتے ہوئے جائے گی یا مطلب یہ کہ وہ ان کے سامنے کھیلتے دوڑتے ہوں گے یہ فراخی اور خوشی اور بے خوفی کی طرف اشارہ ہے شاید دیگر امتوں کے لوگ خوشحالی کی اس کیفیت میں نہ ہوں گے۔[3]

[1] اخرجه احمد ۵/۱۹۹ [2] المرقات ۲/۳۰ [3] المرقات ۲/۳۰

باب ما یوجب الوضوء

نواقضِ وضو کا بیان

الفصل الاوّل

وضو کے بغیر نماز صحیح نہیں

﴿۱﴾ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ مَنْ أَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا بے وضو کی نماز قبول نہیں کی جاتی جب تک کہ وضو نہ کرے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: باب ما یوجب الوضوء ای باب أسباب وجوب الوضو والا فالموجب حقیقة هو الله تعالیٰ۔

لا تقبل صلوٰۃ: لا تقبل کا ایک مطلب اور معنی لا تصح ہے دوسرا مطلب اور معنی لا یترتب علیه الثواب ہے یہاں پہلا معنی مراد ہے یعنی وضو کے بغیر نماز صحیح نہیں ہے۔[2]

اس بات پر اجماع ہے کہ حالت حدث میں نماز پڑھنا حرام ہے اگر کوئی شخص طہارت کے بغیر قصداً نماز پڑھتا ہے اور اس کو جائز سمجھتا ہے تو فقہاء کے نزدیک اس شخص پر کافر ہونے کا خطرہ ہے۔"ای یخشی علیه الکفر"۔

موجبات وضو میں سے بعض ایسے ہیں جن پر سب صحابہ کرام کا اتفاق ہے نیز تابعین اور فقہاء کا بھی ان پر اتفاق ہے جیسے بول و براز، خروج ریح اور خروج مذی وغیرہ ہیں ان سے سب کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے۔[3]

اور بعض موجبات وضو ایسے ہیں جن میں روایات کے اختلاف کی وجہ سے صحابہ و تابعین کے ہاں اختلاف رہا ہے۔ پھر فقہائے کرام کا بھی اختلاف رہا ہے جیسے خروج دم اور مس المرأة اور مس ذکر اور ما خرج من غیر السبیلین وغیرہ ان اسباب کی الگ الگ تفصیل آنے والی ہے۔ بعض موجبات وضو ایسے ہیں جو صدر اسلام میں موجبات وضو تھے پھر آخر میں نواقض وضو نہ رہے یا وہ کسی وقت بھی موجبات وضو نہیں تھے لیکن روایات میں شبہ کی وجہ سے ان کو موجبات وضو سمجھ لیا گیا جیسے ما

[1] اخرجه البخاری ۱/۳۶ ومسلم ۱/۱۴۰　[2] المرقات ۲/۳۰　[3] المرقات ۲/۳۱

مست النار سے وضو کا مسئلہ ہے اب یہ چیزیں جمہور امت کے نزدیک موجبات وضو نہیں ہیں۔ مصنف مشکوۃ نے ان تینوں اقسام کا ذکر اس باب میں کیا ہے۔ مندرجہ بالا حدیث میں "**لا تقبل صلاۃ**" کا لفظ آیا ہے اور جیسا لکھا گیا ہے کہ قبول سے **لا تصح** اور عدم جواز مراد ہے اب یہاں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے اور ترجمہ ہے کہ کوئی نماز بغیر وضو جائز نہیں ہوتی۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ آیا صلوٰۃ کا یہ لفظ نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت کو بھی شامل ہے یا نہیں تو جمہور امت کے نزدیک نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت کے لئے وضو شرط ہے ان دونوں پر صلوۃ کا لفظ بولا جاتا ہے اگر چہ یہ اطلاق خفی ہے۔

شیخ شعبی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لفظ صلوٰۃ، جنازہ اور سجدہ تلاوت دونوں کو شامل نہیں ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک ان دونوں کے لئے وضو ضروری نہیں ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صلوٰۃ کا اطلاق سجدۂ تلاوت پر نہیں ہوتا اسی لئے اس میں نہ رکوع ہے اور نہ ہی یہ نماز ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں سجدہ تلاوت بغیر وضو کے جائز ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے بھی عدم وضو پر استدلال کیا ہے کہ "**کان یسجد علی غیر وضوء**" جمہور امت **لا تقبل صلاۃ** کے جملہ سے استدلال کرتے ہیں خواہ اطلاق خفی ہو یا جلی ہو۔ لہٰذا جنازہ اور سجدۂ تلاوت کے لئے وضو ضروری ہے جنازہ پر تو واضح طور پر "**صلوا علی اخیکم**" میں صلوۃ یعنی نماز کا اطلاق ہوا ہے۔ اور سجدہ تلاوت میں اس لئے وضو ضروری ہے کیونکہ سجدہ نماز کا رکن اعظم ہے۔ جب نماز کے لئے طہارت شرط ہے تو اس کے رکن اعظم کے لئے بھی شرط ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں تعارض ہے بعض نسخوں میں "**کان یسجد علی طھور**" کے الفاظ آئے ہیں۔ لہٰذا **اذا تعارضا تساقطا** کے قاعدہ سے یہ روایت قابل استدلال نہیں ہے اور سجدۂ تلاوت بغیر وضو جائز نہیں ہے۔

مسئلۃ فاقد الطھورین

اس باب کی حدیث ① اور حدیث ② دونوں سے مسئلہ فاقد الطہورین نکلتا ہے مثلاً ایک شخص شیشہ کے محل میں یا ایسی جگہ میں محبوس ہے جہاں نہ پانی ہے کہ وضو کرے اور نہ مٹی ہے کہ تیمم کرے اور سر پر نماز کا وقت آ گیا ہے اب نماز پڑھنے کے لئے یہ شخص کیا کرے۔ ایسے ہی شخص کو **فاقد الطھورین** کہتے ہیں ان کے نماز پڑھنے نہ پڑھنے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

فقہاء کا اختلاف

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے چار اقوال منقول ہیں۔ اول یہ کہ فی الحال واجب ہے اور بعد میں پانی ملنے پر قضاء بھی واجب ہے یہ صحیح قول ہے۔ دسرا قول یہ ہے کہ فی الحال نہ پڑھے بعد میں قضاء واجب ہے۔ تیسرا قول یہ کہ فی الحال پڑھنا مستحب ہے اور بعد میں قضاء کرنا واجب ہے۔ چوتھا قول یہ کہ فی الحال پڑھنا واجب ہے اور بعد میں کچھ بھی نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نہ فی الحال پڑھنا واجب ہے اور نہ بعد میں قضاء کرنا ہے بلکہ یہ شخص معاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فی الحال نماز نہ پڑھے اور بعد میں وجوباً قضا کرے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول اسی طرح ہے احناف میں سے صاحبین فرماتے ہیں کہ فی الحال **تشبہ بالمصلین** کرے اور پھر بعد میں قضا کرے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اصح قول بھی یہی ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی قول کی طرف رجوع کیا ہے۔ یہی جمہور کا مسلک ہوا اور اسی پر فتویٰ ہے۔ [1]

دلائل:

جمہور یعنی شوافع اور صاحبین فرماتے ہیں کہ طہارت بشرط الاستطاعت فرض ہے مگر کبھی کبھی فرض بھی ساقط ہو جاتا ہے جس طرح قرأت فرائض صلوۃ میں سے ہے مگر اخرس اور گونگے کے حق میں یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے قیام فی الصلوۃ فرض ہے مگر کبھی کبھی عجز کے وقت یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے اسی طرح طہارت بھی فرض ہے لیکن مجبوری کے وقت ساقط ہو جاتی ہے لہٰذا پڑھنا بھی واجب ہے اور قضاء کرنا بھی واجب ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **فاقد الطھورین** میں نماز پڑھنے کی اہلیت نہیں ہے جس طرح حائضہ عورت حالت حیض میں نماز روزہ نہیں کر سکتی اس کا یہ عمل کرنا نہ کرنا برابر ہے اسی طرح **فاقد الطھورین** کا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے۔ [2]

جواب: جمہور نے قیاس میں جو تمثیلات پیش کی ہیں ان کا جواب یہ ہے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ وہاں دونوں مسئلوں میں نائب موجود ہے اخرس کے حق میں نائب تسبیحات ہیں یا قلبی تصورات ہیں اور قیام پر جو قادر نہیں ہے تو قعود اس کا نائب ہے ورنہ اضطجاع ہے یہاں **فاقد الطھورین** میں نائب نہیں لہٰذا اس پر قیاس کرنا جائز نہیں ہے۔ بہر حال امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں جمہور کی طرف رجوع کیا ہے لہٰذا مسئلہ متفق علیہ ہو گیا۔

ولا صدقة من غلول: غلول مال غنیمت میں خیانت کرنے کو کہتے ہیں یہاں غلول سے مال حرام مراد ہے بہر حال حلال مال سے صدقہ رحمت الٰہی کا مظہر ہے اور حرام مال سے صدقہ کرنا قہر الٰہی کا مظہر ہے اس لئے قبول نہیں اگر کسی کے ہاتھ میں حرام مال آ گیا تو ثواب کی نیت سے اس کا صدقہ نہ کرے کیونکہ اس میں کافر ہونے کا خطرہ ہے ہاں ذمہ سے فارغ ہونے کی نیت سے خرچ کرے یعنی کسی کو ثواب کی نیت کے بغیر دیدے۔

غلول کے لفظ سے اشارہ کیا گیا کہ مال غنیمت میں اگرچہ مجاہدین کا حق ہوتا ہے پھر بھی اس میں خیانت کرنا اور اس کا صدقہ کرنا اتنا سنگین جرم ہے تو اس کے علاوہ خالص حرام کا کیا حال ہوگا؟ یاد رہے یہ تشریح آنے والی حدیث کی بھی ہوگی اور یہ آخری الفاظ اسی حدیث نمبر دو کے ہیں جو آ رہی ہے۔ [3]

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ.
(رَوَاهُ مُسْلِمٌ) [4]

---

[1] المرقات ۲/۳۱ [2] المرقات ۲/۳۱ [3] المرقات ۲/۳۲ [4] اخرجہ مسلم ۱/۱۴۰

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا بغیر طہارت کے نماز قبول نہیں کی جاتی اور مال حرام کی خیرات قبول نہیں کی جاتی۔ (مسلم)

مذی کا حکم

﴿۳﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كُنْتُ رَجُلاً مَذَّاءً فَكُنْتُ أَسْتَحْيِي أَنْ أَسْأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَكَانِ ابْنَتِهِ فَأَمَرْتُ الْمِقْدَادَ فَسَأَلَهُ فَقَالَ يَغْسِلُ ذَكَرَهُ وَيَتَوَضَّأُ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ مجھے مذی بہت زیادہ آتی تھی چونکہ آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) میرے نکاح میں تھیں اس لئے میں آپ سے اس کا حکم دریافت کرتے ہوئے شرماتا تھا (کہ آیا اس سے غسل واجب ہوتا ہے یا وضو) اس لئے میں نے (اس مسئلہ کو آنحضرت ﷺ سے دریافت کرنے کے لئے) حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو مامور کیا۔ چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ سے پوچھا (اس طرح سے کہ ایک شخص ایسا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا (کہ مذی نکلنے پر) صرف پیشاب گاہ کو دھوڈالے اور وضو کرے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: کنت رجلا مذاء: مذی سفید پانی کی طرح ایک سیال مادہ ہے جو ملاعبت زوجہ ومحبوب کی وجہ سے یا تذکر جماع کے وقت شوق شہوت کی وجہ سے خارج ہوتا ہے۔ مذی کے خروج سے صرف وضو ٹوٹ جاتا ہے اس لئے وضو واجب اور غسل واجب نہیں ہوتا ہے اس مسئلہ میں تو سب کا اتفاق ہے ہاں اس میں اختلاف ہے کہ وضو کے وقت کتنی مقدار ذکر کا دھونا ضروری ہے۔ جمہور کے ہاں **موضع النجاسة** کی مقدار دھونا ضروری ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پورے ذکر کا دھونا ضروری ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ذکر مع الانثیین کا دھونا ضروری قرار دیتے ہیں۔
امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابوداؤد شریف کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں مذاکیر اور انثیین کا ذکر آیا ہے جو جلد اول ص ۲۸ پر مذکور ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں "**واغسل ذکرك**" کے الفاظ آئے ہیں اور ذکر کا اطلاق پورے پر ہوتا ہے۔[2]
جمہور فرماتے ہیں کہ اصل قاعدہ وقانون نجاست کے ازالہ کا ہے تو جہاں نجاست ہے وہاں تک دھونا واجب ہے اس سے زائد کا ذکر اگر آیا ہے یا **انثیین** کا ذکر آیا ہے تو وہ علاجاً اور تبریداً ہے کہ زیادہ پانی ڈالنے سے ٹھنڈک آتی ہے جس سے مذی کا مادہ نکلنا بند ہوجاتا ہے یہ حکم بطور مسئلہ نہیں بلکہ بطور علاج ہے یا یہ حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں ہے۔

لمکان ابنته: یعنی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میرے نکاح میں تھی اب آنحضرت ﷺ کے سامنے مذی منی اور ودی جیسی پوشیدہ اشیاء کے ذکر کرنے سے حیاء مانع تھی اس حدیث کے اس جملہ سے ایک لطیف اخلاقی تعلیم ملتی ہے کہ داماد کو سسر کے سامنے شہوت سے متعلق باتوں کا چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔[3]

---

[1] اخرجه البخاری ۱/۷۶ ومسلم [2] المرقات ۲/۳۲،۳۳ [3] المرقات ۲/۳۲

فامرت المقداد: یعنی میں نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ یہ مسئلہ آپ معلوم کریں۔

سوال: یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس حدیث اور دوسری احادیث میں تعارض ہے کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے سوال کرنے اور مسئلہ معلوم کرنے کے لئے کہا مگر ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے ذریعہ مسئلہ پوچھوایا تیسری روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود مسئلہ پوچھا جس طرح کہ فصل ثانی کی حدیث نمبر (۱) میں آرہا ہے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجلس میں ذکر کیا تو حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے بھی پوچھا اور مجلس میں بیٹھے ہوئے حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے بھی پوچھا تو روایتیں دو ہو گئیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابتدا میں بوجہ حیاء بالواسطہ پوچھا پھر اطمینان حاصل کرنے کے لئے بغیر واسطہ خود پوچھا یا یوں کہیں کہ بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ دینی مسائل میں اگر یہ حیاء مانع بن گئی تو بہت سارے مسائل کا نقصان ہو جائے گا اس لئے بعد میں خود پوچھا کیونکہ "ان الله لا یستحی من الحق" حکم ہے۔

مسئلة الوضوء مما مست النار

﴿۴﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ تَوَضَّئُوا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ قَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ الْأَجَلُّ مُحْيِي السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى هٰذَا مَنْسُوخٌ بِحَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكَلَ كَتِفَ شَاةٍ ثُمَّ صَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس چیز کو آگ نے پکایا ہو اس کے کھانے کے بعد وضو کرو۔ (مسلم) امام محی السنۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے منسوخ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بکری کا شانہ کھایا پھر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: توضؤا مما مست النار: آگ سے پکی ہوئی چیز کے کھانے اور استعمال کرنے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں اس بارے میں ابتدا میں دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں معمولی سا اختلاف تھا۔

اختلاف

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے قائل تھے کہ وضو ٹوٹتا ہے لہٰذا نیا وضو بنانا چاہئے لیکن بعد میں صحابہ بھی عدم وضو پر متفق ہو گئے۔ تو جمہور صحابہ جمہور تابعین اور جمہور ائمہ کے نزدیک **اکل مما مست النار** ناقض وضو نہیں ہے۔

---

[1] اخرجه مسلم ۱/۱۸۷ والبخاری

دلائل:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ نے اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے استدلال کیا ہے جس میں **توضؤا** امر کا صیغہ آیا ہے۔

جمہور نے جن احادیث سے عدم وضو پر استدلال کیا ہے وہ بہت زیادہ حدیثیں ہیں۔

ایک حدیث تو حضرت سوید بن نعمان رضی اللہ عنہ کی ہے جو مشکوۃ ص ۴۰ پر ہے دوسری حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ص ۴۱ پر ہے اسی کے ساتھ والی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت بھی ص ۴۱ پر ہے پھر فصل ثالث میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ص ۴۱ پر ہے پھر اسی کے ساتھ والی روایت بھی حضرت رافع ہی سے ہے جس میں قصہ بھی ہے اور نہایت وضاحت بھی ہے اس کے ساتھ والی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ص ۴۱ پر ہے۔[1]

ان تمام احادیث میں نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ **مما مست النار** سے وضو کا حکم نہیں ہے۔

جوابات:

اب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے علماء نے کئی جوابات دیئے ہیں۔

پہلا جواب: تو اسی روایت میں صاحب مصابیح نے دیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی آنے والی روایت سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت منسوخ ہوگئی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ نسخ بجا ہے مگر اس میں اتنی تصریح نہیں ہے جتنی تصریح حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے جو ابوداؤد شریف میں ہے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "**ان اٰخر الامرین من النبی صلی اللہ علیہ وسلم ترك الوضوء مما مست النار**" اس آخر امرین سے زندگی بھر کے دو اعمال میں سے آخری عمل مراد ہے لہٰذا یہ واضح طور پر سابقہ حکم کے لئے ناسخ ہے اس میں کوئی شک نہیں۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ وضو کا حکم اب بھی ہے مگر یہ حکم استحبابی ہے کیونکہ آگ مظہر غضب الٰہی ہے تو خواص وضو کر لیں ویسے بھی پکانے میں کتنی مصیبتیں آتی ہیں آگ کی تپش ہے، پسینہ ہے، ناک سے رینٹ نکلتی رہتی ہے میل کچیل الگ ہے، بدبو الگ ہے، دھواں الگ ہے تو پکانے والے اور پکا کر کھانے والے کے لئے وضو مستحب ہے۔

تیسرا جواب: یہ کہ وضو سے مراد لغوی وضو ہے جو ہاتھ دھونا اور مضمضہ کرنا ہے اور ترمذی جلد ثانی کتاب الاطعمہ میں حضرت عکراش رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**یا عکراش ھذا وضوء مما مست النار**" وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ہاتھ دھو کر کلی کی تھی یہ تصریح ہے کہ وضو سے مراد لغوی وضو ہے اصطلاحی شرعی وضو نہیں ہے۔

مسئلة الوضوء من لحوم الابل

﴿۵﴾ وَعَنْ جَابِرِ ابْنِ سَمُرَةَ اَنَّ رَجُلاً سَاَلَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُوْمِ الْغَنَمِ قَالَ اِنْ شِئْتَ فَتَوَضَّأْ وَاِنْ شِئْتَ فَلاَ تَتَوَضَّأْ قَالَ اَنَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُوْمِ الْاِبِلِ قَالَ نَعَمْ

[1] الکاشف ۲/۲۶، ۲۷ والمرقات: ۲/۳۳

فَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُوْمِ الْإِبِلِ قَالَ أُصَلِّي فِي مَرَابِضِ الْغَنَمِ قَالَ نَعَمْ قَالَ أُصَلِّي فِي مَبَارِكِ الْإِبِلِ قَالَ لَا۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: اور حضرت جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم ﷺ سے پوچھا کہ "کیا ہم بکری کا گوشت کھانے کے بعد وضو کریں" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تمہارا جی چاہے تو وضو کرو اور نہ چاہے تو نہ کرو۔ پھر اس شخص نے پوچھا کیا اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرو پھر اس شخص نے سوال کیا کہ کیا بکریوں کے رہنے کی جگہ میں نماز پڑھ لوں؟ آپ نے فرمایا "ہاں" پھر اس شخص نے دریافت کیا کہ اونٹوں کے بندھنے کی جگہ نماز پڑھ لوں آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ (مسلم)

توضیح: انتوضأ من لحوم الابل: اونٹوں کے گوشت کھانے کے بعد آیا وضو واجب ہو جاتا ہے یا نہیں اس مسئلہ میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

فقہاء کا اختلاف

جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو واجب نہیں ہوتا البتہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ظاہر حدیث کو دیکھ کر جمہور کے خلاف یہ فیصلہ کیا ہے کہ لحوم ابل کے استعمال کے بعد وضو واجب ہو جاتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ **ما مست النار** کا حکم عام تھا لحوم ابل کا حکم خاص ہے اس کا **مما مست النار** سے کوئی تعلق نہیں دونوں میں فرق ہے۔ لہٰذا لحوم الابل میں وضو واجب ہے **ما مست النار** والی حدیث کے منسوخ ہونے سے لحوم ابل والی حدیث منسوخ نہیں ہوگی اسحق بن راھویہ کا بھی یہی مسلک ہے۔[2]

جواب: جمہور نے جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ کی روایت کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں وضو استحبابی مراد ہے وجوبی نہیں ہے۔ استحبابی وضو اس لئے کہ اونٹ کے گوشت میں سخت دسومت، رائحہ کریہہ اور چکنائی ہوتی ہے۔ اس لئے وضو کرنے کو مستحب قرار دیا گیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حکم ابتداء میں تھا پھر **مما مست النار** کی احادیث کے منسوخ ہونے سے یہ بھی منسوخ ہو گیا کیونکہ اس عموم کے تحت یہ بھی داخل ہے کوئی فرق نہیں ہے۔

فی مرابض الغنم: یعنی بکریوں کے باڑہ میں اگر کوئی صاف جگہ ہے تو اس میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جائز ہے اور اونٹوں کے باڑہ میں جائز نہیں ہے۔ ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ بکری ایک مسکین جانور ہے اس کے قریب نماز پڑھنے سے تشویش کی کوئی بات نہیں ہوتی نیز وہ جھک کر پیشاب کرتی ہے تو چھینٹیں پڑنے کا خوف نہیں ہوتا پھر وہ پتھریلی زمین میں رہتی ہے وہاں پیشاب زمین میں جذب ہو کر پھیلتا نہیں ہے اس کے برعکس اونٹ ایک متوحش جانور ہے اس کے قریب میں نماز پڑھنے میں تشویش ہوگی نیز وہ آسمان جیسی بلندی سے پیشاب چھوڑتا ہے جس سے چھینٹیں

---

[1] اخرجه مسلم: ۱/۱۸۸ [2] المرقات ۲/۳۲

پڑنے کا خطرہ ہے اسی طرح وہ نرم زمین میں رہتا ہے تو پیشاب جذب ہو کر پھیلتا ہے۔ پیشاب زیادہ بھی ہوتا ہے لہٰذا اونٹوں کے باڑہ میں نماز پڑھنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ ویسے بھی عرب کے ہاں اونٹ کا باڑہ ناپاک جگہ میں ہوتا تھا لوگ خود بھی وہاں پیشاب کیا کرتے تھے۔[1]

شک کی بنیاد پر فیصلہ نہ کرو

﴿۶﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا وَجَدَ أَحَدُكُمْ فِي بَطْنِهِ شَيْئًا فَأَشْكَلَ عَلَيْهِ أَخَرَجَ مِنْهُ شَيْءٌ أَمْ لَا فَلَا يَخْرُجَنَّ مِنَ الْمَسْجِدِ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص اپنے پیٹ کے اندر کچھ پائے (یعنی قرقر) اور اس پر یہ بات مشتبہ ہو کہ کوئی چیز خارج ہوئی یا نہیں تو اس وقت تک وضو کے لئے مسجد سے باہر نہ نکلے جب تک آواز کو نہ سنے یا بو نہ پائے۔" (مسلم)

توضیح: حتی یسمع صوتا او ریحاً: ان دو چیزوں کو بطور نمونہ اور تمثیل ذکر کیا گیا ہے ان دو میں کوئی حصر کرنا نہیں اسی طرح اس میں بھی حصر نہیں کہ آواز کا سننا شرط ہے یا بدبو آنی شرط ہے بلکہ اصل مقصود یقین حاصل ہو جانا ہے کیونکہ جب تک یقین نہیں آتا کہ واقعی ہوا خارج ہوئی ہے تب تک شک کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے تو اصل چیز یقین آنا ہے ورنہ اگر کوئی بہرا ہو تو وہ آواز نہیں سنے گا یا کسی کی قوت شامہ خراب ہے وہ سونگھ نہیں پاتا تو کیا وضو نہیں ٹوٹے گا؟ خلاصہ یہ کہ یقین آنے سے وضو ٹوٹنے کا حکم لگے گا بعض غیر مقلدین اس میں نقصان کرتے ہیں کہ وہ ہوا خارج ہونے کے بعد بھی بدبو یا صوت اور آواز کا انتظار کرتے ہیں۔[3]

چکناہٹ والی چیز کھانے کے بعد کلی کرنا ضروری ہے

﴿۷﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَرِبَ لَبَنًا فَمَضْمَضَ وَقَالَ إِنَّ لَهُ دَسَمًا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[4]

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پیا (اس کے بعد) کلی کی اور فرمایا دودھ میں چکناہٹ ہوتی ہے۔ (مسلم)

توضیح: ان لہ دسماً: یعنی دودھ میں چکناہٹ ہوتی ہے اس کے ازالہ کے لئے کلی فرمائی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر وہ چیز جو منہ میں اٹک کر رہ جاتی ہے یا چپک کر رہتی ہے اس کا ازالہ نماز سے پہلے ضروری ہے ورنہ نماز کی حالت میں

[1] المرقات ۲/۳۴،۳۵ [2] اخرجہ مسلم ۱/۱۹۰ [3] المرقات ۲/۳۵ [4] اخرجہ البخاری ۱/۱۳۱، ومسلم ۱/۱۸۹

نمازی اس کا ذائقہ محسوس کرے گا کچھ حصہ پیٹ میں چلا جائے گا تو نماز میں وہ کھانے والا شمار ہوگا جو ناجائز ہے۔ علماء نے اس احتمال دسومت کے لئے کلی کو مستحب قرار دیا ہے۔ یقینی اجزاء کے ازالہ کے لئے تو کلی کرنا ضروری ہے اس روایت کے یہاں لانے پر یہ اعتراض ہے کہ اس حدیث کی اس باب سے مناسبت کیا ہے؟

اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ کلی کرنا وضو کے اعمال میں سے ایک عمل ہے کیونکہ کلی کرنا وضو کے مکملات و متممات میں سے ہے اس اعتبار سے اس حدیث کو نواقض وضو میں ذکر کیا گیا۔[1]

ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھ سکتے ہیں

﴿۸﴾ وَعَنْ بُرَيْدَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الصَّلَوَاتِ يَوْمَ الْفَتْحِ بِوُضُوءٍ وَاحِدٍ وَمَسَحَ عَلَى خُفَّيْهِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ لَقَدْ صَنَعْتَ الْيَوْمَ شَيْئًا لَمْ تَكُنْ تَصْنَعُهُ فَقَالَ عَمْدًا صَنَعْتُهُ يَا عُمَرُ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[2]

ترجمہ: اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن سرکار دو عالم ﷺ نے ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھیں (یعنی ایک ہی وضو سے پانچوں نمازیں پڑھیں) اور موزوں پر مسح کیا (یہ دیکھ کر) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ﷺ نے آج وہ چیز کی ہے جس کو آپ نے کبھی نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا "عمر" میں نے ایسا قصداً کیا ہے۔ (مسلم)

توضیح: **یوم الفتح:** اس سے مراد فتح مکہ ہے اور بطور شکر صلوۃ فتح آٹھ رکعات پڑھی جاتی ہے جو آپ نے کبھی پڑھی ہے۔ یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو نئی باتوں کی وجہ سے سوال کیا یہ کہ آنحضرت ﷺ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرتے تھے اس بار کئی نمازیں ایک وضو سے پڑھیں، دوسری وجہ سوال کا یہ بنا کہ آنحضرت ﷺ نے موزوں پر مسح فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے قصداً ایسا کیا ہے کہ امت کے لئے ضابطہ بن جائے اور دین کے امور میں وسعت آجائے۔

ہر نماز کے لئے وضو کرنا جمہور کے نزدیک مستحب ہے اگر پہلا وضو ہے اور کوئی شخص نیا وضو کرنا چاہتا ہے تو اس کو مستحب کا ثواب ملے گا داؤد ظاہری کا کہنا ہے کہ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرنا ضروری اور واجب ہے ان پر مذکورہ حدیث حجت ہے۔[3]

ما مست النار کے استعمال سے وضو نہیں ٹوٹتا

﴿۹﴾ وَعَنْ سُوَيْدِ بْنِ النُّعْمَانِ أَنَّهُ خَرَجَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ عَامَ خَيْبَرَ حَتّٰى إِذَا كَانُوْا بِالصَّهْبَاءِ وَهِيَ مِنْ أَدْنٰى خَيْبَرَ صَلَّى الْعَصْرَ ثُمَّ دَعَا بِالْأَزْوَادِ فَلَمْ يُؤْتَ إِلَّا بِالسَّوِيْقِ فَأَمَرَ بِهٖ فَثُرِّيَ فَأَكَلَ

[1] المرقات ۲/۳۶ [2] اخرجہ مسلم ۱/۱۶۰ [3] المرقات ۲/۳۶

رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَأَكَلْنَا ثُمَّ قَامَ إِلَى الْمَغْرِبِ فَمَضْمَضَ وَمَضْمَضْنَا ثُمَّ صَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ.

(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت سوید بن نعمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ سرکار دو عالم ﷺ کے ہمراہ خیبر (کے فتح) کے سال سفر پر گئے جب صہباء کے مقام پر پہنچے جو خیبر کے نزدیک ہے وہاں آپ نے عصر کی نماز پڑھی اور پھر آپ ﷺ نے توشہ (زادراہ) منگوایا چنانچہ ستو کے علاوہ کچھ نہ تھا جو حاضر کیا گیا اور آپ کے حکم سے اسے تر کیا گیا پھر آنحضرت ﷺ نے اور ہم نے اسے کھایا اور پھر مغرب کی نماز کے لئے کھڑے ہوئے آپ نے کلی کی اور ہم نے بھی کلی کی اور وضو نہیں کیا۔ (معلوم ہوا مامست النار سے وضو ضروری نہیں ہوتا)۔ (بخاری)

توضیح: **صہباء:** خیبر کے قریب ایک مقام کا نام ہے "سویق" ستو کو کہتے ہیں کسی چیز مثلاً گندم یا جو اور یا مکئی کے دانے پہلے بھون لیتے ہیں پھر اس کو پیس لیا جاتا ہے یہ ستو ہے۔ "فثری" یہ تثریۃ سے ہے ثری ترمٹی کو کہتے ہیں یہاں ستو کا پانی میں بھگونا مراد ہے تاکہ کھانا آسان ہو جائے۔[2]

الفصل الثانی

ہوا خارج ہونے سے وضو ٹوٹتا ہے

﴿۱۰﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا وُضُوْءَ إِلَّا مِنْ صَوْتٍ أَوْ رِيْحٍ.

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ)[3]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا وضو کرنا آواز یا بُو سے واجب ہوتا ہے۔ (احمد ترمذی)

توضیح: یہ حصر اضافی ہے یعنی مسجد کے اندر تو یہی حدث ہو سکتا ہے کہ ریح بالصوت یا بغیر صوت خارج ہو جائے یا یہ حصر کسی سائل کے سوال کے جواب میں آیا ہے یعنی **ما الحدث فی المسجد یا ابا ھریرۃ قال لا وضوء الا من صوت او ریح۔**

﴿۱۱﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمَذْيِ فَقَالَ مِنَ الْمَذْيِ الْوُضُوْءُ وَمِنَ الْمَنِيِّ الْغُسْلُ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[4]

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے (حضرت مقداد کے واسطہ سے) سرکار دو عالم ﷺ سے مذی کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مذی نکلنے سے وضو لازم آتا ہے اور منی نکلنے سے غسل واجب ہوتا ہے۔ (ترمذی)

---

[1] اخرجه البخاری ۱/۶۳ [2] المرقات ۲/۳۰ [3] اخرجه احمد ۲/۴۱۰ والترمذی ۷۴ [4] اخرجه الترمذی ۱۱۴

۱۹ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ

مسئلة تكبير التحريمة

﴿۱۲﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُوْرُ وَتَحْرِيْمُهَا التَّكْبِيْرُ وَتَحْلِيْلُهَا التَّسْلِيْمُ. (رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْهُ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ)[1]

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نماز کی کنجی وضو ہے اور نماز کی تحریم تکبیر (یعنی اللہ اکبر کہنا) ہے۔ اور نماز کی تحلیل سلام پھیرنا ہے (ابو داؤد، ترمذی، دارمی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت علی اور حضرت ابوسعید سے روایت کیا ہے)

توضیح: وتحریمها التکبیر: خبر پر الف لام داخل کر کے مسند کو مسند الیہ میں محصور کر دیا گیا ہے یعنی نماز کے تمام محرمات صرف تکبیر سے وابستہ ہیں جب تکبیر کہہ دی تو نماز سے باہر کی تمام جائز چیزیں حرام ہو گئیں اس حدیث کے تین اجزاء ہیں۔ پہلے جز "مفتاح الصلوۃ الطهور" میں کوئی اختلاف نہیں دیگر دونوں اجزا میں فقہائے کرام کا اختلاف ملاحظہ کریں۔[2]

فقہائے کرام کا اختلاف:

اس میں اختلاف ہے کہ دخول صلوٰۃ کے لئے جو تکبیر تحریمہ ہے آیا یہ صرف لفظ اللہ اکبر کے ساتھ خاص ہے یا دیگر الفاظ سے بھی دخول فی الصلوٰۃ جائز ہے ہاں تکبیر تحریمہ سب کے ہاں فرض ہے خالی نیت سے دخول صحیح نہیں اگرچہ ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ صرف نیت سے بھی دخول فی الصلوٰۃ کو جائز مانتے ہیں مگر جمہور کا اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف صرف تخصیص الفاظ میں ہے چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دخول فی الصلوٰۃ کے لئے صرف "الله اکبر" کا لفظ خاص ہے اس کے علاوہ کوئی لفظ جائز نہیں ہے، مذکورہ حدیث میں حصر ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف دو لفظ الله اکبر اور الله الاکبر سے جائز ہے اس کے علاوہ جائز نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ الله الاکبر کے معرف باللام ہونے سے مزید حصر آتا ہے تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ کبریائی میں اضافہ ہے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک الله اکبر، الله الاکبر، الله کبیر، اور الله الکبیر یہ چار الفاظ جائز ہیں اس کے علاوہ جائز نہیں وہ فرماتے ہیں اللہ اکبر صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے کہ اللہ بہت بڑا ہے یہ اسم تفضیل نہیں تو یہ صیغہ کبریائی کے لئے آیا ہے جو کبیر کے معنی میں ہے جب الله کبیر جائز ہوا تو پھر اس مادہ کے دیگر الفاظ بھی جائز ہوئے، جو مزید کبریائی پر دال ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر وصف جو بڑائی کو مستلزم ہو وہ جائز ہے اس سے تکبیر تحریمہ کا فرض پورا

[1] اخرجه ابو داؤد ٦١ والترمذی والدارمی ٦٩٣ [2] المرقات ٢/٣٩

ہو جاتا ہے ہاں خاص طور پر لفظ **اللہ اکبر** کا پڑھنا واجب ہے لہٰذا جو لفظ مشعر تعظیم ہو وہ جائز ہے جیسے **اللہ اعظم یا اللہ عظیم** وغیرہ کے الفاظ ہیں۔

دلائل:

امام مالک رحمہ اللہ و احمد رحمہ اللہ کی ایک دلیل تو مذکورہ حدیث ہے جس میں حصر ہے کہ تحریمہ کے لئے صرف **اللہ اکبر** خاص ہے دوسری دلیل **وربک فکبر** ہے۔ تیسری دلیل یہ کہ آنحضرت ﷺ نے زندگی بھر صرف اللہ اکبر پر مداومت فرمائی ہے کسی اور لفظ کو ادا نہیں فرمایا شوافع حضرات کے دلائل بھی وہی ہیں جو مالکیہ اور حنابلہ کے ہیں ہاں اللہ الاکبر میں کبریائی کا اضافہ ہے تو وہ بھی جائز ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے بھی مالکیہ وحنابلہ کی دلیل سے دیگر صیغوں کی نفی کی ہے مگر اکبر کبیر کے معنی میں ہے لہٰذا چار صیغے جائز ہو گئے کیونکہ جب کبیر جائز ہوا تو الکبیر اور الاکبر بھی جائز ہوا اس لئے کہ یہ سب ہم معنی الفاظ ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی پہلی دلیل "**وذکر اسم ربہ فصلی**" ہے کہ یہ تکبیر تحریمہ کے لئے ہے اور "**اسم ربہ**" کے لفظ میں عموم ہے تو جس لفظ سے اسم رب کی تعظیم ہو وہ جائز ہوگا اور اس سے فرض ادا ہو جائے گا۔ یہاں اس آیت سے ایک اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ احناف کے ہاں تکبیر تحریمہ رکن صلوۃ نہیں بلکہ شرط صلوۃ ہے دیگر ائمہ کے نزدیک تو تحریمہ رکن صلوۃ ہے۔ شرط اپنے مشروط پر مقدم ہوتا ہے اور رکن داخل صلوۃ ہوتا ہے۔

یہاں آیت "**فصلی**" میں فا تعقیب مع الوصل کے لئے آئی ہے تو **ذکر اسم ربہ** اور چیز ہے اور **فصلی** اس کے بعد اور چیز ہے تو تحریمہ رکن نہیں ہوا بلکہ خارج صلوۃ شرط کے درجہ میں ہوا۔

جواب: احناف نے دیگر ائمہ کے دلائل کے جواب میں مالکیہ اور حنابلہ کو یہ جواب دیا ہے کہ **وتحریمها التکبیر** میں حصر کا قاعدہ جو بیان کیا گیا ہے یہ قاعدہ اکثریہ ہے قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ اور علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ چنانچہ **زید العالم** میں یہ حصر نہیں کہ دنیا میں صرف زید ہی عالم ہے بلکہ یہ کبھی کبھی اہتمام شان کے لئے اور کامل فرد بیان کرنے کے لئے بھی آتا ہے۔ باقی **وربک فکبر** تو احناف کی دلیل ہے کیونکہ اس میں تعظیم کا حکم دیا گیا ہے کہ بڑائی بیان کرو اس میں خصوصیت اللہ اکبر نہیں۔ مالکیہ کی تیسری دلیل کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ اکبر پر مداومت فرمائی اس کا جواب یہ ہے کہ مداومت سے وجوب ثابت ہوتا ہے اور اللہ اکبر کی تخصیص کے وجوب کے تو ہم بھی قائل ہیں آپ تو اس کو فرض کہتے ہیں حالانکہ فرض کے ثبوت کے لئے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ نص کی ضرورت ہے کیونکہ احکام کے اعتبار سے دلائل اثبات بھی چار قسم پر ہیں۔

① **قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ** اس سے فرض ثابت ہوتا ہے۔

② قطعي الثبوت ظني الدلالة

③ ظني الثبوت قطعي الدلالة ان دونوں دلائل سے واجب ثابت ہوتا ہے۔

④ ظني الثبوت ظني الدلالة اس سے سنن مؤکدہ اور مستحبات ثابت ہوتے ہیں۔

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ شارع نے اگر مداومت کی ہے مگر کبھی کبھی ترک بھی کیا تو یہ سنت مؤکدہ ہے اور کبھی کیا کبھی ترک کیا تو وہ مستحب ہے اور ایک ہی بار جواز کے لئے کیا تو وہ مباح ہے بیان جواز کے لئے کبھی کبھی مکروہ تنزیہی کا ارتکاب بھی کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ حدیث خبر واحد ہے اس سے فرض ثابت نہیں ہوتا یہ تفصیل ان دلائل اور نصوص کی جانب اثبات میں ہوئی اور جانب نفی و عدم میں قسم اول سے حرام ثابت ہوتا ہے اور قسم دوم سوم سے مکروہ تحریمی ثابت ہوتا ہے اور قسم چہارم سے مکروہ تنزیہی وغیرہ ثابت ہوتا ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو جواب یہ ہے کہ جس طرح آپ نے اللہ اکبر کے لفظ میں تعمیم لفظی کر کے چار الفاظ کو جائز قرار دیا ہے اسی طرح آپ تعمیم معنوی کر کے ہر اس لفظ کو جائز قرار دیں جو مشعر تعظیم ہو تعمیم لفظی جب کی تو تعمیم معنوی بھی کیجئے۔

وتحليلها التسليم: نماز سے نکلنے کے لئے جو لفظ اختیار کیا جاتا ہے اس میں بھی فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ تینوں ائمہ اور جمہور کے نزدیک صرف لفظ سلام سے نمازی اپنی نماز سے خارج ہو سکتا ہے ورنہ نماز نہیں ہوگی۔ ان کی دلیل یہی حدیث اور یہی الفاظ ہیں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں خاص لفظ سلام کے ساتھ نماز سے نکلنا واجب ہے اور صنع مصلی کے ساتھ عمداً نماز سے نکلنا فرض ہے خواہ کوئی بھی لفظ یا کوئی بھی عمل ہو اور یہ نکلنا درحقیقت دوسری نماز کی تیاری اور پڑھنے کی وجہ سے فرض ہو جاتا ہے مثلاً کسی نے مغرب کی نماز اتنی طویل کی کہ عشاء کا وقت آ گیا تو اب نکلنا فرض ہے تا کہ عشاء پڑھ لے۔[1]

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: **فان شئت ان تقوم فقم** (رواہ ابوداؤد) نیز اعرابی کو تعلیم کے وقت آنحضرت ﷺ نے فرض سلام کا ذکر نہیں کیا تکبیر تحریمہ کی بحث میں جن جوابات کو ذکر کیا گیا ہے وہ جوابات یہاں بھی چلتے ہیں۔ بہر حال مداومت سلام کی وجہ سے ہم بھی لفظ سلام کو واجب کہتے ہیں فرض کا قاعدہ الگ ہے۔

اپنی بیوی سے اغلام بازی کرنا حرام ہے

﴿۱۳﴾ وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ طَلْقٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا فَسَا أَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ وَلَا تَأْتُوا النِّسَاءَ فِي أَعْجَازِهِنَّ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْ دَاوُدَ)[2]

---

[1] المرقات ۲/۳۹ [2] اخرجه ابو داؤد ۲۰۵، ۱۰۰۵ والترمذی ۱۱۶۴

ترجمہ: اور حضرت علی بن طلق رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کوئی حدث کرے (یعنی بغیر آواز کے ہوا خارج ہو) تو اسے وضو کرنا چاہیئے۔ اور تم عورتوں سے (خلاف فطرت) ان کی مقعد (یعنی پاخانہ کی جگہ) میں جماع نہ کرو۔ (ترمذی، ابوداؤد)

توضیح: اذا فسا احدکم: فسوۃ ہوا خارج ہونے کو کہتے ہیں یعنی جب یقینی طور پر ہوا خارج ہوجائے تو وضو کرو کیونکہ اس ہوا سے ممکن ہے اندر کے ذرات خارج ہوں یا یہ خود گندگی ہے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ہاں قبل اور ذکر سے اگر ہوا خارج ہوجائے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا الا یہ کہ عورت **مفضاۃ** ہو پھر پتہ نہیں چلے گا کہ آیا یہ ہوا قبل سے آئی ہے یا دبر سے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

ولا تاتو النساء فی اعجازھن: اعجاز عجز کی جمع ہے پچھلے حصہ کو کہا جاتا ہے مراد مقعد اور دُبر ہے اب سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ کے ذکر کرنے کی یہاں کیا ضرورت تھی اور اس کی یہاں کیا مناسبت ہے تو علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ جب ہوا خارج ہونے سے دبر کا تذکرہ آگیا تو آنحضرت ﷺ نے اس مناسبت سے اس اہم مسئلہ پر بھی تنبیہ فرمائی۔[1]

۲۰ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ

مسئلة النوم ناقض للوضوء ام لا؟

﴿۱۴﴾ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّمَا الْعَيْنَانِ وِكَاءُ السَّهِ فَإِذَا نَامَتِ الْعَيْنُ اسْتَطْلَقَ الْوِكَاءُ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[2]

ترجمہ: اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا "آنکھیں سرین کا سربند ہیں چنانچہ آنکھ سوجاتی ہے تو سربند کھل جاتا ہے"۔ (دارمی)

توضیح: وکاء السه: وکاء او کیہ اس تسمہ کو کہا جاتا ہے جس سے تھیلی کو باندھ لیا جاتا ہے اور "**السه**" سین کے فتح اور ھا کے سکون کے ساتھ دبر اور مقعد کو کہا جاتا ہے کہتے ہیں یہ اصل میں "**ستہ**" تھا تا کو حذف کیا گیا تو "**سہ**" رہ گیا اس کی دلیل **استاہ** ہے کہ وہاں تا موجود ہے بہرحال وکاء سربند اور تھیلی کی ڈوری کو کہا جاتا ہے۔ یہاں انسان کی تشبیہ ایک مشکیزہ سے دی گئی ہے جس کی ڈوری انسان کی آنکھیں ہیں جب آنکھیں کھلی رہتی ہیں تو مشکیزہ بند رہتا ہے اور جب آنکھیں بند ہوجاتی ہیں تو گویا گرہ کھل جاتی ہے اور مشکیزہ غیر محفوظ ہوجاتا ہے اور سرین کے دھاگے کھلنے سے ہوا خارج ہونے کا قوی احتمال پیدا ہوجاتا ہے اگرچہ نیند خود ناقض وضو نہیں ہے لیکن نیند کی وجہ سے بدن میں استرخاء مفاصل آجاتا ہے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور استرخاء مفاصل موجب خروج ہوا ہے اور ہوا کا پتہ تو نہیں چل سکتا لہٰذا شریعت نے نیند کو خروج ہوا کا قائم مقام بنا دیا ہے اب ہوا خارج ہو یا نہ ہو محض نیند نقض وضو کی نشانی اور علامت بن گئی۔[3]

---

[1] المرقات ۲/۴۰ [2] اخرجه الدارمی ۷۶۸ [3] المرقات ۲/۴۰

فقہائے کرام کا اختلاف:

نوم کے اس مسئلہ میں چار قسم کی احادیث آئی ہیں اور چاروں کا رنگ الگ الگ ہے۔ لہٰذا فقہائے کرام میں بھی ان روایات کی وجہ سے اختلاف آ گیا ہے یہاں کئی مذاہب ہیں لیکن مشہور و معروف مذاہب پانچ ہیں۔

❶ **پہلا مسلک:** ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، امام اوزاعی اور شعبہ کا ہے کہ نیند قلیل ہو یا کثیر ہو جس حالت میں بھی ہو وہ مطلقاً ناقض للوضو نہیں ہے۔

❷ **دوسرا مسلک:** اسحاق بن راھویہ اہل ظواہر اور ابو عبد الرحمان مزنی کا ہے کہ نوم مطلقاً ناقض للوضو ہے۔

❸ **تیسرا مسلک:** امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ نوم قلیل ناقض نہیں ہے اور کثیر ناقض ہے۔

❹ **چوتھا مسلک:** امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ وہ نیند جو **جالسًا قاعدًا معتمدًا مقعدہ علی الارض** ہو وہ ناقض نہیں اس کے علاوہ ہر حالت میں ناقض للوضو ہے۔

❺ **پانچواں مسلک:** احناف کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ آدمی اگر کسی ہیئت من ہیئات صلوۃ میں ہو تو ناقض نہیں جیسے **قائما راکعا قاعدًا جالسًا غیر معتمد علی شی لو ازیل لسقط** ان ہیئات کے علاوہ میں نیند ناقض وضو ہے۔

دلائل:

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، امام اوزاعی اور شعبہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ظاہری روایت "**حتی تخفق رؤسھم**" اور ترمذی کی روایت "**ینامون**" سے استدلال کیا ہے کہ اس قدر سوتے تھے، پھر بھی وضو کئے بغیر نماز پڑھتے تھے ترمذی کی روایت اس طرح ہے **کان اصحاب النبی ﷺ ینامون ثم یصلون ولا یتوضؤن** ابوداؤد کی روایت اس طرح ہے "**کان اصحاب النبی ینتظرون العشاء حتی تخفق روسھم ثم یصلون ولا یتوضؤن**"۔

اسحاق بن راھویہ، اہل ظواہر اور ابو عبید مزنی نے زیر نظر حدیث "**انما العینان وکاء السه**" سے استدلال کیا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث میں تطبیق اور جمع بین الاحادیث کا راستہ اختیار کیا ہے کہ جہاں نقض وضو کا حکم ہے وہاں کثیر نوم مراد ہے اور جہاں عدم نقض وضو کا حکم ہے وہاں نوم قلیل مراد ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے "**انما الوضوء علی من نام مضطجعا**" سے استدلال کیا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے مفہوم مخالف کے طور پر کہا کہ اضطجاع کے علاوہ کسی بھی صورت میں نیند ناقض وضو نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اسی حدیث سے استدلال کیا ہے لیکن اس حدیث میں جو علت بیان ہوئی ہے احناف نے اس علت کو بنیاد بنایا ہے وہ علت یہ ہے **فانه اذا اضطجع استرخت مفاصله** تو نقض وضو کے لئے جسم کا ڈھیلا ہونا ضروری ہے یعنی جوڑوں کا سست ہونا علت ہے اور انسان جب ہیئات صلوۃ میں سے کسی ہیئت پر سوتا ہے تو قوت ماسکہ ختم نہیں ہوتی جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ استرخاء مفاصل نہیں ہوا ہے لہٰذا وضو نہیں ٹوٹتا۔

جوابات:

جن حضرات نے مطلقاً نوم کو ناقض نہیں کہا جیسے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ امام اوزاعی اور شعبہ وغیرہ تو ان کا مستدل نوم قلیل پر محمول ہے جس میں استرخاء مفاصل نہیں ہوتا ہے۔

اور دوسرے مسلک والوں کا جواب یہ ہے کہ ان کا یہ مسلک کہ نوم بالکل ناقض وضو نہیں ہے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ مسلک صریحاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی روایات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فعلی روایات سے متعارض ہے جس میں آپ نے وضو کا حکم دیا ہے یا خود وضو فرمایا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، احمد رحمۃ اللہ علیہ کو جواب یہ ہے کہ آپ نے جو جمع بین الاحادیث کیا ہے یہ ٹھیک ہے لیکن قلیل اور کثیر کی تحدید ضروری ہے تاکہ اس پر عمل کیا جاسکے صرف قلیل اور کثیر کہنے سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔

باقی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جو قاعداً والی نیند میں ہمارے ساتھ ہیں اور اس کے علاوہ حالات میں مخالف ہیں ان کو جواب یہ ہے کہ **انما الوضوء علی من نام مضطجعا** کا جملہ سائل کے جواب میں واقع ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا تھا کہ آپ سو گئے ہیں وضو کرنا چاہیئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تو بیٹھ کر سو گیا تھا اور وضو لیٹ کر سونے والے پر ضروری ہوتا ہے تو یہاں سائل کے جواب میں یہ جملہ واقع ہوا ہے اس میں کوئی حصر نہیں کہ اس کے علاوہ کسی ہیئت کی نیند قابل معافی نہیں ہے بلکہ حدیث میں واضح علت موجود ہے کہ اصل علت استرخاء مفاصل ہے۔

اور وہ ہیئات صلوٰۃ کی کسی ہیئت پر سونے سے نہیں ہوتا ہے تو احناف نے پوری حدیث کو دیکھ کر عمل کیا ہے اور شوافع نے وسیع حکم کو ایک لفظ تک محدود کر دیا ہے جو مناسب نہیں ہے یہ تشریح و تفصیل اس کے بعد آنے والی دو روایتوں کے لئے بھی کافی شافی ہے۔

﴿۱۵﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِكَاءُ السَّهِ الْعَيْنَانِ فَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مُحْيِ السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللهُ هٰذَا فِي غَيْرِ الْقَاعِدِ لِمَا صَحَّ عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْتَظِرُوْنَ الْعِشَاءَ حَتّٰى تَخْفِقَ رُؤُوسُهُمْ ثُمَّ يُصَلُّوْنَ وَلَا يَتَوَضَّأُوْنَ۔

(رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ اِلَّا اَنَّهُ ذَكَرَ فِيْهِ يَنَامُوْنَ بَدَلَ يَنْتَظِرُوْنَ الْعِشَاءَ حَتّٰى تَخْفِقَ رُؤُوسُهُمْ)[1]

ترجمہ: اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سرین کا سربند آنکھیں ہیں لہٰذا جو شخص سو جائے اسے چاہیئے کہ وضو کرے۔ (ابوداؤد) اور حضرت امام محی السنۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس شخص کے واسطے ہے جو بیٹھا نہ ہو (بلکہ لیٹ کر سویا ہو) اس لئے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] اخرجہ الترمذی ۷۸ وابو داؤد ۲۰۲

اصحاب رضی اللہ عنہم عشاء کی نماز کا (بیٹھ کر) انتظار کیا کرتے تھے یہاں تک کہ نیند کے سبب ان کے سر جھک جاتے تھے اسی حالت میں وہ اٹھ کر نماز پڑھ لیتے تھے وضو نہ کرتے تھے۔ (ابوداود۔ ترمذی) مگر ترمذی نے اپنی روایت میں "ینتظرون العشاء حتیٰ تخفق رؤوسهم" کے بجائے لفظ "ینامون" ذکر کیا ہے۔

﴿۱۶﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الْوُضُوْءَ عَلَى مَنْ نَامَ مُضْطَجِعًا فَإِنَّهُ إِذَا اضْطَجَعَ اسْتَرْخَتْ مَفَاصِلُهُ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ)[۱]

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ''وضو اس شخص پر لازم ہوتا ہے جو لیٹ کر سو جائے، اس لئے کہ جس وقت آدمی لیٹتا ہے تو اس کے بدن کے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں (اور پھر ہوا خارج ہونے کا خدشہ رہتا ہے)۔ (ترمذی، ابوداود)

مسئلة الوضوء من مس الذکر

﴿۱۷﴾ وَعَنْ بُسْرَةَ بِنْتِ صَفْوَانَ بْنِ نَوْفَلٍ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِذَا مَسَّ أَحَدُكُمْ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ. (رَوَاهُ مَالِكٌ وَأَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ)[۲]

ترجمہ: اور حضرت بسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تم میں سے جو شخص اپنے ذکر (عضو خاص) کو ہاتھ لگائے تو اس کو چاہئے کہ وضو کرے''۔ (مالک، احمد، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)

توضیح: اذا مس احدکم ذکرہ: مس ذکر کے مسئلہ میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے کہ آیا اس سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں۔

فقہاء کا اختلاف

تینوں ائمہ کے ہاں مس ذکر ناقض وضو ہے البتہ ان کے درمیان آپس میں اس کی کیفیات میں اختلاف ہے۔ شوافع کے ہاں یہ مس الذکر بلا حائل ہو اور بباطن کف ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں "بشھوۃ" کی قید ملحوظ ہے البتہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں کوئی قید نہیں ہے۔

مس الذکر کا مطلب یہی ہوا کہ ہاتھ سے عضو تناسل کو چھو لینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جمہور کے ہاں مس فرج کا مسئلہ عورت کے لئے مس الذکر کی طرح ہے کہ عورت کا وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ ائمہ احناف فرماتے ہیں کہ خروج نجاست کے بغیر وضو واجب نہیں ہوتا ہے۔[۳]

[۱] اخرجه الترمذی ۷۷ وابو داؤد ۱۸۱　[۲] اخرجه مالك ۱۵ واحمد ۶/۴۰۶ والترمذی　[۳] المرقات ۲/۴۲

دلائل:

ائمہ ثلاثہ اپنے استدلال میں حضرت بسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت پیش کرتے ہیں جس میں مس الذکر کے بعد وضو کا حکم دیا گیا ہے۔
"اذا مس احد کم ذکرہ فلیتوضا" ائمہ احناف اپنی دلیل میں حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں:
"قال وھل ھو الا بضعة منه" ائمہ جمہور اور ائمہ احناف دونوں ایک دوسرے کے دلائل پر اعتراضات کرتے ہیں۔[1]
چنانچہ ائمہ احناف نے بسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عروہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث براہ راست بسرہ سے نہیں سنی ہے بلکہ عروہ رضی اللہ عنہ اور بسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے درمیان یا مروان ابن الحکم راوی ہے اور یا مروان کا کوئی شرطی یعنی پولیس بیچ میں واسطہ ہے جو مجہول ہے۔
اگر مروان بیچ میں ہے تو وہ حکومت میں آنے کے بعد اس قابل نہیں رہے کہ ان سے روایت لی جائے اور اگر شرطی بیچ میں ہے تو وہ مجہول الحال ہونے کے علاوہ مروان سے بھی بدحال ہے لہٰذا یہ روایت ناقابل استدلال ہے۔
جمہور نے طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ منسوخ ہے کیونکہ بسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی نقل کیا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے اور طلق بن علی نے اسلام قبول کر کے ۱ھ میں ملاقات کی اور اس کے بعد مدینہ نہیں آئے تو متأخر الاسلام روای کی روایت متقدم الاسلام راوی کی روایت کے لئے ناسخ بن جائے گی لہٰذا طلق رضی اللہ عنہ کی روایت منسوخ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ناسخ ہے۔

اصل جواب:

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں حسن سے کم درجہ کی نہیں ہیں۔ بسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت چودہ وجوہ سے منقول ہے تو کس کس کو ضعیف کہو گے؟ اور طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو کسی واضح دلیل کے بغیر منسوخ کہنا صحیح نہیں ہے نسخ کا قول بلا دلیل ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی ملاقات دوبارہ ہوئی ہو محض تقدمِ اسلامِ راوی تقدمِ روایت کی دلیل نہیں بن سکتی ہے نسخ کے اس ضابطہ کو اگر پکڑو گے تو بسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت خود منسوخ بن جائے گی کیونکہ بسرہ رضی اللہ عنہ مکہ میں اسلام لائی تھی اور طلق بن علی رضی اللہ عنہ کئی سال بعد یکم ہجری میں مدینہ میں مسلمان ہوئے تھے لہٰذا تقدم و تاخر کی بات نہیں چلے گی بلکہ یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یکم ہجری کے بعد طلق بن علی کی ملاقات نہیں ہوئی تھی حالانکہ طلق رضی اللہ عنہ نے ۹ھ **سنة الوفود** میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی تھی جس کو طبقات ابن سعد نے صریحاً ذکر کیا ہے اس تقریر سے محی السنۃ کی بات بھی ختم ہوگئی کہ طلق رضی اللہ عنہ کی روایت منسوخ ہے۔ مندرجہ بالا تقریر سے معلوم ہوا کہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں تو اب فیصلہ ترجیحات کی بنیاد پر ہوگا تو طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت کی ایک ترجیح یہ ہے کہ قیاس اس کے موافق ہے کیونکہ جب احادیث میں تعارض آتا ہے تو قیاس کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور قیاس کہتا ہے کہ جب تک سبیلین سے نجاست کا خروج نہیں ہوتا وضو واجب نہیں ہوتا اور یہاں سبیلین سے کچھ

---

[1] المرقات ۴۴،۴۳/۲

بھی خارج نہیں ہوا ہے دوسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ بسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت محتمل ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ مس ذکر پیشاب کرنے سے کنایہ ہو اور عربی میں ایسا اطلاق ہوتا ہے۔ تیسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں علت کا ذکر ہے یعنی "ھل ھو الا بضعۃ منہ" چوتھی وجہ ترجیح بلکہ تطبیق اس طرح ہے کہ بسرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں جس وضو کا ذکر آیا ہے وہ وضو استحبابی ہے جس سے احناف کو انکار نہیں اور طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں عدم وضو کا جو ذکر آیا ہے وہ قاعدہ اور ضابطہ ہے۔

آخر میں الزامی جواب یہ ہے کہ بسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت پر تو آپ نے بھی براہ راست عمل نہیں کیا کیونکہ آپ میں سے بعض باطن کف کی قید لگاتے ہیں اور بعض بشھوۃ کی قید لگاتے ہیں تو آپ نے کب اس حدیث پر عمل کیا؟

ایک اور الزامی جواب اس طرح ہے کہ ذکر کو ہاتھ سے چھونا اگر باعث نقض وضو ہے تو پھر یہی ذکر نماز کے دوران عورت غلیظہ یعنی ران کے ساتھ ٹکراتا ہے اس سے وضو کیوں نہیں ٹوٹتا؟

ترجیح کی وجوہات میں سے آخری وجہ یہ بھی ہے کہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت اور اس کی علت کی تائید میں صحابہ کرام کے کئی آثار وارد ہیں چنانچہ

١. حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں **ما ابالی مسستہ او طرف انفی۔**

٢. حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا **ان کنت تستنجسہ فاقطعہ۔**

٣. حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کے جواب میں فرمایا **الا قطعتہ؟** یعنی جب یہ نجس ہے اور ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹتا ہے تو تو نے اسے کاٹا کیوں نہیں؟

٤. حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی منقول ہے **ما ابالی انفی مسست او اذنی او ذکری۔**

٥. حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح فرمایا **وما ابالی ذکری مسست فی الصلوۃ او اذنی او انفی** بہرحال اس تحقیق سے گزشتہ حدیث اور آنے والی حدیث کی تشریح ہوگئی۔

﴿١٨﴾ وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ مَسِّ الرَّجُلِ ذَكَرَهُ بَعْدَ مَا يَتَوَضَّأُ قَالَ وَهَلْ هُوَ إِلَّا بَضْعَةٌ مِنْهُ رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَى ابْنُ مَاجَهْ نَحْوَهُ وَقَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مُحْيِ السُّنَّةِ هٰذَا مَنْسُوْخٌ لِأَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ أَسْلَمَ بَعْدَ قُدُوْمِ طَلْقٍ وَقَدْ رَوَى أَبُوْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا أَفْضَى أَحَدُكُمْ بِيَدِهِ إِلَى ذَكَرِهِ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا شَيْءٌ فَلْيَتَوَضَّأْ۔

(رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَرَوَاهُ النَّسَائِيُّ عَنْ بُسْرَةَ إِلَّا أَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا شَيْءٌ) [1]

ترجمہ: "حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم سے پوچھا گیا کہ وضو کرنے کے بعد اگر کوئی شخص اپنا ذکر چھوئے (تو کیا حکم ہے) آپ نے ارشاد فرمایا "وہ بھی تو آدمی کے گوشت کا ایک ٹکڑا ہے"۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

---

[1] اخرجہ ابو داؤد ۱۸۲ والترمذی ۸۶ والنسائی ۱/۱۰۱

اور ابن ماجہ نے بھی اس طرح روایت کیا ہے امام محی السنۃ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منسوخ ہے اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ کے آنے کے بعد اسلام لائے ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث منقول ہے کہ جب تم میں سے کسی کا ہاتھ اپنے ذکر پر پہنچ جائے اور ہاتھ اور ذکر کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وضو کرے۔ (شافعی، دارقطنی) اور نسائی نے بسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت نقل کی ہے جس میں **لیس بینه وبینها شیٔ** کے الفاظ مذکور نہیں ہیں۔

۲۱ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ

مسئلة تقبیل المرأة

﴿۱۹﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُ بَعْضَ أَزْوَاجِهِ ثُمَّ يُصَلِّي وَلَا يَتَوَضَّأُ۔ (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ لَا يَصِحُّ عِنْدَ أَصْحَابِنَا بِحَالٍ إِسْنَادُ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ وَأَيْضًا إِسْنَادُ إِبْرَاهِيمَ التَّيْمِيِّ عَنْهَا قَالَ أَبُو دَاوُدَ هٰذَا مُرْسَلٌ وَإِبْرَاهِيمُ التَّيْمِيُّ لَمْ يَسْمَعْ عَنْ عَائِشَةَ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ اپنی بعض بیویوں کا بوسہ لیتے تھے اور بغیر وضو کئے (پہلے ہی وضو سے) نماز پڑھ لیتے تھے (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) ترمذی نے کہا ہے کہ ہمارے علماء کے نزدیک کسی حال میں عروہ کی سند حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نیز ابراہیم تیمی کی سند بھی حضرت عائشہ سے صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ ابراہیم تیمی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نہیں سنا ہے۔

توضیح: یقبل بعض ازواجه: یہ مسئلہ مس ذکر کی طرح مس مرأة کا ہے جس کو تقبیل المرأة بھی کہتے ہیں مس ذکر کی طرح اس میں بھی بڑا اختلاف ہے کہ آیا عورت کو چھو لینے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں ٹوٹتا۔ روایات میں اختلاف کی وجہ سے صحابہ میں اور پھر تابعین وفقہاء میں اختلاف ہو گیا ہے۔

فقہائے کرام کا اختلاف:

جمہور فقہاء کے ہاں مس المرأة ناقض وضو ہے۔ البتہ شوافع نے بلا حائل کی قید کا اضافہ کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے تین قیود کا اضافہ کیا ہے یعنی عورت اجنبیہ ہو بالغہ ہو اور مس بشھوۃ ہو۔ ائمہ احناف کے نزدیک مس مرأة اور تقبیل المرأة مطلقا ناقض للوضو نہیں ہیں ہاں اگر مباشرت وملاعبت فاحشہ ہو یا صرف تقبیل سے خروج نجاست ہو تو پھر ناقض وضو ہے۔[2]

دلائل:

جمہور کے پاس کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے البتہ انہوں نے قرآن عظیم کی آیت سے مسئلہ کو نکالنے کی کوشش کی ہے اور احناف کی دلیل میں جو حدیث ہے اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ حضرات آیت "**اولا مستم النساء**"

---

[1] اخرجه ابوداؤد ۱۷۹ والترمذی ۸۶ [2] المرقات ۲/۴۵

سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ اس لمس سے لمس بالید مراد ہے جماع مراد نہیں لہٰذا عورت کے چھونے سے وضو لازم ہو جاتا ہے۔

جمہور نے مشکوٰۃ ص ۴۱ کے آخر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اثر سے بھی استدلال کیا ہے اور پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اثر اور پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اثر اور موقوف روایات سے استدلال کیا ہے۔ ائمہ احناف نے زیر نظر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مرفوع روایت سے استدلال کیا ہے۔ احناف کی دوسری دلیل بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے فرماتی ہیں:

کنت انام بین یدی رسول الله ﷺ ورجلای فی قبلته فاذا سجد غمزنی فقبضت رجلی فاذا قام بسطتها والبیوت یومئذ لیس فیها مصابیح۔ (بخاری ج۱، ص ۵۲)

اس حدیث کو بخاری نے کئی جگہ مختلف الفاظ سے نقل کیا ہے تاہم یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ احناف کی تیسری دلیل مسلم شریف کی روایت ہے جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس طرح نقل فرماتی ہیں:

"فقدت رسول الله صلی الله علیه وسلم لیلة من الفراش فالتمسته فوقعت یدی علی بطن قدمه وهو فی المسجد"۔

احناف کی چوتھی دلیل حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کو ابن عدی نے کامل میں ذکر کیا ہے ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"قلت یارسول الله الرجل یتوضا ثم یقبل اهله ویلاعبها اینقض ذلك الوضوء قال لا"۔

جمہور نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زیر بحث حدیث پر اعتراض کیا ہے جس کو صاحب مشکوٰۃ نے نقل کیا ہے کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک عروہ کی اسناد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی حال میں صحیح نہیں ہے۔

صاحب مرقاۃ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے صاحب مشکوٰۃ کے اس قول کو غیر صحیح کہا ہے کیونکہ امام ترمذی نے اگرچہ اس سند کو ضعیف کہا ہے لیکن انہوں نے عروہ کے سماع کا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے انکار نہیں کیا ہے اور یہ انکار وہ کر بھی نہیں سکتے ہیں کیونکہ بخاری و ترمذی میں جگہ جگہ عروہ کے سماع عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تصریح موجود ہے البتہ یہ اعتراض صحیح ہے کہ حبیب بن ثابت کا سماع عروہ سے ثابت نہیں ہے۔

اس حدیث کی سند پر اعتراض کی صحیح توجیہ ہونی چاہیئے تاکہ صاحب مشکوٰۃ کی طرف اتنی بڑی غلطی کی نسبت نہ ہو جائے وہ توجیہ یہ ہے کہ عروہ نام کے دو شخص ہیں ایک عروہ بن زبیر ہیں جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے ہیں اور دوسرے عروہ مزنی ہیں یہاں اگر عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مراد لیا جائے تو ان کا سماع عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تو ثابت ہے لیکن حبیب بن ثابت کا سماع عروہ بن زبیر سے ثابت نہیں تو حدیث منقطع ہوگی اور اگر یہاں عروہ سے مراد عروہ مزنی مراد لیا جائے تو حبیب

کا سماع اس عروہ سے تو ہے مگر عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس کا سماع نہیں پھر بھی حدیث میں انقطاع آ گیا بہر حال حدیث کی یہ سند منقطع ہے۔ احناف اس اعتراض کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس سند میں عروہ سے مراد عروہ بن زبیر ہی ہیں مزنی نہیں ہے اور دار قطنی اور مسند احمد کی روایت میں اس کی تصریح بھی موجود ہے کہ عروہ سے مراد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے ابن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں ادھر ابوداؤد کی روایت میں ایک مضبوط قرینہ ہے کہ مراد عروہ بن زبیر ہیں کیونکہ وہاں یہ الفاظ ہیں "من هي الا انت فضحكت"۔[1]

بے تکلفی کے یہ الفاظ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہی کہہ سکتے ہیں۔

کیونکہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے ہیں اور عروہ مزنی تو ایک اجنبی آدمی ہیں وہ کیسے یہ الفاظ کہہ سکتے ہیں؟ اب یہ بات رہ گئی کہ حبیب کا سماع ولقاء عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام ابوداؤد رضی اللہ عنہ نے واضح کیا ہے کہ حبیب کا سماع عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے اور عام محدثین نے بھی اس سماع کو تسلیم کیا ہے اب جمہور کا پہلا اعتراض ختم ہو گیا۔

لیکن جمہور نے دوسرا اعتراض کیا ہے کہ یہ حدیث ابراہیم تیمی کی وجہ سے مرسل کی ایک قسم منقطع ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مرسل روایت جمہور کے نزدیک قابل استدلال ہے صرف شوافع اس میں اختلاف رکھتے ہیں تو ہمارے نزدیک مرسل بھی مقبول ہے نیز طبرانی میں عن ابراهيم التيمي عن ابيه عن عائشه کی سند ہے اب تو یہ حدیث مرسل بھی نہ رہی ارسال بھی ختم ہو گیا جمہور نے آیت الوضو کے لفظ "لامستم" سے استدلال کیا ہے آیت اس طرح ہے:

يا ايها الذين امنو اذا قمتم الى الصلوة فاغسلوا وجوهكم وايديكم الى المرافق وامسحوا برؤوسكم وارجلكم الى الكعبين وان كنتم جنبًا فاطهروا وان كنتم مرضىٰ او على سفر او جاء احد منكم من الغائط او لامستم النساء فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيدا طيبًا۔[2]

جواب: قرآن کریم کی اس آیت سے جمہور نے استدلال کیا اور کہا کہ احناف آیت کے مقابلہ میں حدیث کو کیوں لیتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ رئیس المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے **اولامستم النساء** کی تفسیر جماع سے کی ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ باب مفاعلہ اغلباً جانبین سے فعل کے صدور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور جانبین کا تحقق جماع کی صورت میں ہو سکتا ہے۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ آیت میں تیمم کا ذکر ہے پانی نہ ملنے کی صورت میں طہارت کے لئے تیمم کافی ہے اب تیمم کو حدث اصغر اور حدث اکبر دونوں کے لئے عام کرنا چاہئے اور یہ تب ہو سکتا ہے کہ "**او جاء احد منكم من الغائط**" سے حدث اصغر اور "**او لامستم النساء**" سے حدث اکبر مراد لیا جائے تا کہ تیمم دونوں حدثوں کے لئے طہارت بن

---

[1] المرقات ۲/۳۵ [2] مائدۃ الآیہ ۶

جائے اور تاکید کے بجائے آیت میں تاسیس آجائے جو تاکید سے افضل ہے لہٰذا **اولامستم** سے جماع مراد لینا ہوگا۔
نیز لمس محاورہ عرب میں جماع کے لئے استعمال کیا جاتا ہے خاص کر جب اس کا مفعول بہ نساء کا لفظ ہو جیسے اردو میں بھی کہتے ہیں حرم پر ہاتھ ڈالا پشتو میں کہتے ہیں: "پہ خحئے لاس اولگؤو"۔
باقی جمہور نے جن آثار سے استدلال کیا ہے وہ مرفوع احادیث کے مقابلہ میں پیش نہیں کئے جاسکتے ویسے بھی شوافع کے نزدیک مجتہدین پر لازم نہیں کہ وہ صحابہ کرام کے اجتہادی اقوال کے پابند ہوں وہ کہتے ہیں: **"نحن رجال وهم رجال"**۔

آگ پر پکی ہوئی اشیاء کے استعمال سے وضو نہیں ٹوٹتا

﴿۲۰﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ أَكَلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتِفًا ثُمَّ مَسَحَ يَدَهُ بِمِسْحٍ كَانَ تَحْتَهُ ثُمَّ قَامَ فَصَلَّى۔ (رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه)[۱]

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے بکری کا شانہ (یعنی بکری بریاں کے شانہ کا گوشت) کھایا پھر اپنا ہاتھ ٹاٹ سے پونچھ لیا جو آپ ﷺ کے نیچے بچھا ہوا تھا اور پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھ لی۔
(ابوداؤد، ابن ماجہ)

﴿۲۱﴾ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ أَنَّهَا قَالَتْ قَرَّبْتُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَنْبًا مَشْوِيًّا فَأَكَلَ مِنْهُ ثُمَّ قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[۲]

ترجمہ: اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس ایک بھنا ہوا پہلو لے گئی چنانچہ آپ ﷺ نے اس میں سے کھایا پھر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے اور وضو نہیں کیا۔ (اور نہ ہاتھ منہ دھویا)۔ (احمد رحمہ اللہ)

الفصل الثالث

﴿۲۲﴾ عَنْ أَبِي رَافِعٍ قَالَ أَشْهَدُ لَقَدْ كُنْتُ أَشْوِي لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَطْنَ الشَّاةِ ثُمَّ صَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[۳]

ترجمہ: حضرت ابورافع فرماتے ہیں کہ اس بات کی قسم کھاتا ہوں کہ میں سرکار دو عالم ﷺ کے لئے بکری کا پیٹ (یعنی پیٹ کے اندر کی چیزیں مثلاً دل، کلیجی وغیرہ) بھونتا تھا آپ (اس سے کھاتے) پھر نماز کے لئے کھڑے ہوتے اور وضو نہ کرتے۔
(مسلم)

[۱] اخرجہ ابوداؤد ۱۸۹ وابن ماجہ ۴۸۸ [۲] اخرجہ احمد ۶/۳۰۷ [۳] اخرجہ مسلم ۱/۸۸

﴿۲۳﴾ وَعَنْهُ قَالَ اُهْدِيَتْ لَهُ شَاةٌ فَجَعَلَهَا فِي الْقِدْرِ فَدَخَلَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا هٰذَا يَا أَبَا رَافِعٍ فَقَالَ شَاةٌ اُهْدِيَتْ لَنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ فَطَبَخْتُهَا فِي الْقِدْرِ فَقَالَ نَاوِلْنِي الذِّرَاعَ يَا أَبَا رَافِعٍ فَنَاوَلْتُهُ الذِّرَاعَ ثُمَّ قَالَ نَاوِلْنِي الذِّرَاعَ الْآخَرَ فَنَاوَلْتُهُ الذِّرَاعَ الْآخَرَ ثُمَّ قَالَ نَاوِلْنِي الذِّرَاعَ الْآخَرَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ إِنَّمَا لِلشَّاةِ ذِرَاعَانِ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَا إِنَّكَ لَوْ سَكَتَّ لَنَاوَلْتَنِي ذِرَاعًا فَذِرَاعًا مَا سَكَتَّ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَتَمَضْمَضَ فَاهُ وَغَسَلَ أَطْرَافَ أَصَابِعِهِ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى ثُمَّ عَادَ إِلَيْهِمْ فَوَجَدَ عِنْدَهُمْ لَحْمًا بَارِدًا فَأَكَلَ ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَصَلّٰى وَلَمْ يَمَسَّ مَاءً.

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ أَبِي عُبَيْدٍ إِلَّا أَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ إِلَى آخِرِهِ) [1]

ترجمہ: حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ (ایک دن) میرے پاس تحفہ کے طور پر بکری بھیجی گئی چنانچہ میں نے (اس کے گوشت) کو (پکانے کے لئے) ہانڈی میں ڈال دیا (اسی اثناء میں) آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور فرمایا ''ابورافع یہ کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! بکری کا گوشت ہے، جو میرے پاس ہدیہ کے طور پر آیا تھا اسی کو میں نے ہانڈی میں پکایا ہے''۔ آپ نے فرمایا ایک دست مجھے بھی دو چنانچہ میں نے ایک دست آپ کی خدمت میں پیش کیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دست اور دو میں نے دوسرا دست بھی خدمت اقدس میں پیش کر دیا آپ ﷺ نے فرمایا ''ایک دست اور دو'' میں نے عرض کیا یارسول اللہ! بکری کے تو دو ہی دست ہوتے ہیں (اور دونوں ہی آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں اب کہاں سے لاؤں) سرکار دو عالم ﷺ نے ان سے فرمایا ابورافع اگر تم خاموش رہتے تو مجھ کو دست پر دست دیئے چلے جاتے جب تک کہ تم چپ رہتے۔ پھر آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور منہ دھویا (یعنی کلی کی) پھر انگلیوں کے پورے دھوئے اور کھڑے ہوئے اور پھر نماز پڑھ کر ابورافع کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے ہاں ٹھنڈا گوشت دیکھا چنانچہ آپ ﷺ نے اسے کھایا اس کے بعد مسجد تشریف لے گئے اور (شکرانہ کی) پھر نماز پڑھی اور پانی کو چھوا بھی نہیں یعنی نہ تو وضو کیا اور نہ ہی کلی کی (احمد) اور اس حدیث کو دارمی نے بھی روایت کیا ہے مگر **ثم دعا بماء** سے آخر تک ذکر نہیں کیا ہے۔

توضیح: الذراع: بکری کے سامنے والے دونوں پاؤں کے اوپر شانہ تک کے حصہ کو ذراع کہتے ہیں جس کو اردو میں دست یا دستی کہتے ہیں، آنحضرت ﷺ کو دست کا گوشت زیادہ پسند تھا کیونکہ گوشت کا یہ حصہ لذیذ بھی ہوتا ہے اور قوت بخش بھی ہوتا ہے۔ [2]

ذراعاً فذراعاً: یعنی میرے مانگنے پر اگر تم خاموش رہتے تو معجزاتی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئی ذراع کا انتظام ہو جاتا مگر جب تم نے ظاہر اسباب کی تصریح وتشریح شروع کر دی تو پردۂ غیب کا کرشمہ موقوف ہو گیا۔ [3]

[1] اخرجه احمد ۶/۳۹۲ والدارمی [2] المرقات ۲/۴۷ [3] المرقات ۲/۴۸

ولم یمس ماء: یعنی آپ ﷺ نے اس صورت میں پانی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا کیونکہ یہاں آپ نے ٹھنڈا گوشت تناول فرمایا جس سے
ہاتھوں کو کچھ بھی نہیں لگا تھا۔ تو نہ ہاتھ دھوئے اور نہ وضو کیا یہ ساری حدیثیں جمہور کے دلائل ہیں کہ آگ سے چھوئی ہوئی چیز کے کھانے پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔[1]

﴿۲۴﴾ وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كُنْتُ أَنَا وَأُبَيٌّ وَأَبُو طَلْحَةَ جُلُوسًا فَأَكَلْنَا لَحْمًا وَخُبْزًا ثُمَّ دَعَوْتُ بِوَضُوءٍ فَقَالَا لِمَ تَتَوَضَّأُ فَقُلْتُ لِهٰذَا الطَّعَامِ الَّذِي أَكَلْنَا فَقَالَا أَتَتَوَضَّأُ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَمْ يَتَوَضَّأْ مِنْهُ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنْكَ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[2]

ترجمہ: اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے ہم نے گوشت اور روٹی کھائی (کھانے سے فارغ ہوکر) میں نے وضو کے لئے پانی منگوایا، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا تم وضو کیوں کرتے ہو، میں نے کہا اس کھانے کی وجہ سے جو میں نے ابھی کھایا ہے ان دونوں نے کہا کیا پاکیزہ چیزوں کے کھانے سے وضو کرتے ہو؟ ان چیزوں کو کھا کر اس شخص نے وضو نہیں کیا جو تم سے بہتر ہیں یعنی آنحضرت ﷺ۔ (احمد)

﴿۲۵﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانَ يَقُولُ قُبْلَةُ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ وَجَسُّهَا بِيَدِهِ مِنَ الْمُلَامَسَةِ وَمَنْ قَبَّلَ امْرَأَتَهُ أَوْ جَسَّهَا بِيَدِهِ فَعَلَيْهِ الْوُضُوءُ۔ (رَوَاهُ مَالِكٌ)[3]

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ مرد کا اپنی عورت کا بوسہ لینا یا اس کو اپنے ہاتھ سے چھونا یہ ملامست ہے اور جس شخص نے اپنی عورت کا بوسہ لیا یا اس کو ہاتھ سے چھوا تو اس پر وضو واجب ہے۔
(مالک۔شافعی)

﴿۲۶﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ كَانَ يَقُولُ مِنْ قُبْلَةِ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ الْوُضُوءُ۔ (رَوَاهُ مَالِكٌ)[4]

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعود کے بارے میں منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ مرد پر اپنی عورت کا بوسہ لینے سے وضو لازم آتا ہے۔ (مالک)

﴿۲۷﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ إِنَّ الْقُبْلَةَ مِنَ اللَّمْسِ فَتَوَضَّؤُوا مِنْهَا۔[5]

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بوسہ لینا لمس میں داخل ہے (جو قرآن میں مذکور ہے) لہٰذا بوسہ لینے کے بعد وضو کیا کرو۔

توضیح: فتوضؤا: یہ روایت اور اس سے پہلے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت اور اس سے پہلے ابن عمر رضی اللہ عنہ

[1] المرقات ۲/۴۸ [2] اخرجه احمد [3] اخرجه مالک ۱ [4] اخرجه مالک ۲ [5] اخرجه دار قطنی ۱/۱۵۷

کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو چھو لینے سے وضو لازم ہے شوافع نے اس کو بطور دلیل لیا ہے احناف فرماتے ہیں کہ اول تو یہ روایتیں موقوف ہیں اور اقوال صحابہ ہیں جو مرفوع احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اگر اس کو قوی اور قابل استدلال مانا جائے تو ممکن ہے مرفوع احادیث اس کے لئے ناسخ ہوں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیس فی القبلۃ وضوء (کذافی مسند ابی حنیفہ رحمہ اللہ) تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلۃ الوضوء من کل دم سائل

﴿۲۸﴾ وَعَنْ عُمَرَ ابْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ عَنْ تَمِيْمِ الدَّارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْوُضُوْءُ مِنْ كُلِّ دَمٍ سَائِلٍ.

(رَوَاهُمَا الدَّارَقُطْنِيُّ وَقَالَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ تَمِيْمِ الدَّارِيِّ وَلَا رَآهُ وَيَزِيْدُ بْنُ خَالِدٍ وَيَزِيْدُ بْنُ مُحَمَّدٍ مَجْهُوْلَانِ) [۱]

ترجمہ: اور حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر بہنے والے خون سے وضو لازم آتا ہے۔ ان دونوں روایتوں کو دارقطنی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمہ اللہ نے نہ تو تمیم داری رضی اللہ عنہ سے سنا ہے اور نہ ہی انہیں دیکھا ہے۔ نیز اس روایت کے دو راوی یزید بن خالد اور یزید بن محمد مجہول ہیں۔

توضیح:

فقہاء کا اختلاف:

اس حدیث سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خروج نجاست من غیر سبیلین سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے پھر اس عام قاعدہ کے تحت اس حدیث سے خون کے خروج کے بارے میں ایک اختلافی مسئلہ پیدا ہوتا ہے مالکیہ اور شوافع کے نزدیک خروج دم سائل ناقض وضو نہیں ہے پھر شوافع کے ہاں اگر یہ خون غیر سبیلین سے ہو تو ناقض نہیں اور اگر سبیلین یعنی قبل ودبر سے ہو تو وہ ناقض وضو ہے خواہ معتاد خون ہو یا غیر معتاد ہو، حیض اور نفاس کا خون معتاد ہوتا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک غیر سبیلین سے خارج خون مطلقاً ناقض وضو نہیں ہے اور سبیلین سے اگر غیر معتاد طور پر آیا ہو مثلاً استحاضہ وغیرہ تو وہ بھی ناقض وضو نہیں ہے اور اگر **ما خرج من سبیلین** معتاد ہو جیسے حیض ونفاس کا خون تو وہ ناقض وضو ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وصاحبین امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ تمام فقہاء کے نزدیک خروج دم سائل مطلقاً ناقض وضو ہے خواہ وہ سبیلین سے ہو یا بدن کے دیگر حصوں سے ہو بشرطیکہ وہ خون زخم کے منہ سے ارد گرد پھیل کر بہہ جائے۔

فقہاء کے دلائل:

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل دو صحابہ کا وہ واقعہ ہے جو ابو داؤد نے جلد اول ص ۲۶ باب

---

[۱] اخرجہ دار قطنی ۱/۱۵۷

الوضوء من الدم میں بیان کیا ہے کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ مہاجری اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہ انصاری غزوۂ ذات الرقاع میں نبی کریم ﷺ کے فرمان پر رات کو افواج اسلام کے پہرے پر مقرر ہوئے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ رات کے پہلے حصہ میں آرام کرنے لگے اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہ چوکیداری کرنے لگے۔ آپ نماز پڑھنے لگے کہ ایک مشرک نے آپ کو تیر مارا آپ نے نماز جاری رکھی تو ظاہر ہے خون بہہ گیا ہوگا اگر وضو ٹوٹتا تو آپ نماز چھوڑ دیتے معلوم ہوا خون کے خروج سے وضو نہیں ٹوٹتا اور مذکورہ حدیث کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ اس میں انقطاع بھی ہے اور اس کے دوراوی یزید بن خالد اور یزید بن محمد دونوں مجہول ہیں۔

ائمہ احناف اور جمہور نے فاطمہ بنت ابی حبیش کی بخاری والی روایت سے استدلال کیا ہے جس میں فاطمہ بنت ابی حبیش کے پوچھنے پر آنحضرت ﷺ نے جواب دیا حدیث یوں ہے:

"عن عائشة قالت جاءت فاطمة بنت ابی حبیش الی النبی ﷺ فقالت انی امرأة استحاض فلا اطهر أفأدع الصلوة قال لا انما ذلك دم عرق ثم توضى لكل صلوة"۔[1]

اور بخاری کے بعض روایات کے الفاظ اس طرح ہیں:

"توضئی ما بین ذلك حتی یجیء ذلك الوقت"۔

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ خون ناقض للوضو ہے کیونکہ استحاضہ کے خون کے خروج سے ہر نماز کے لئے وضو کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ دلیل شوافع پر حجت نہیں بلکہ مالکیہ پر حجت ہے جو سبیلین اور غیر سبیلین کے خون کا فرق نہیں کرتے ہیں ہاں "دم عرق" کے لفظ میں جب عموم ہے تو پھر شوافع پر بھی حجت ہوگی احناف اور حنابلہ نے اس روایت کو اسی عموم کے پیش نظر پیش کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دم عرق فرمایا تو جسم کے جس حصہ سے بھی خون بہہ جائے سب کو شامل ہے۔

احناف اور حنابلہ کی دوسری دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مرفوع حدیث ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

من اصابه قیء او رعاف او قلس او مذی فلینصرف فلیتوضأ ثم لیبن علی صلاته وهو فی ذلك لا یتكلم۔ (رواه ابن ماجه فی باب ماجاء فی البناء علی الصلاة ص ۸۵)

اس حدیث میں نکسیر کے خون اور قے کو ناقض للوضو بتایا گیا ہے اور یہ دونوں چیزیں خارج من غیر السبیلین ہیں۔

احناف کی تیسری دلیل وہ استنباطی دلیل ہے جو اس حدیث سے مستنبط ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے

[1] المرقات ۲/۵۱

کہ جس شخص کا نماز میں وضو ٹوٹ جائے تو وہ ناک پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل جائے۔ طرز استدلال اس طرح ہے کہ وہ شخص شرم کے مارے نماز سے نکل نہیں سکتا ہے کیونکہ لوگ کہیں گے اس کی ہوا خارج ہوگئی اس شرم سے بچنے کے لئے وہ ناک پر ہاتھ رکھے اور لوگوں کو یہ دکھائے کہ میرا وضو ہوا کے خارج ہونے سے نہیں ٹوٹا ہے بلکہ ناک سے خون بہنے کی وجہ سے ٹوٹا ہے اب اگر خون خارج ہونے سے وضو نہیں ٹوٹتا تو اس شخص کو آنحضرت ﷺ نے یہ تدبیر کیوں سمجھائی ہے؟

احناف کی چوتھی دلیل یہی زیر نظر حدیث ہے اس پر صاحب کتاب نے دو اعتراض اٹھائے ہیں پہلا اعتراض یہ کہ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے اور پھر کہا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی تمیم داری رضی اللہ عنہ سے نہ روایت ثابت ہے نہ رؤیت ثابت ہے لہٰذا حدیث منقطع و مرسل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ زیلعی نے تصریح کی ہے کہ ابن عدی نے اس روایت کو سند متصل کے ساتھ نقل کیا ہے نیز مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی یہ حدیث سند متصل کے ساتھ مذکور ہے تو انقطاع اور ارسال ختم ہوگیا ہے نیز کثرت طرق اور تعدد سند کی وجہ سے حدیث میں قوت آگئی ہے اسی وجہ سے ترمذی نے اس حدیث کو حسن کا درجہ دیا ہے ویسے بھی اگر یہ حدیث منقطع ہو یا ضعیف بھی ہو تو احناف کی دلیل کا مدار اس حدیث پر نہیں ہے ان کی دلیل کا مدار تو فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رعاف والی حدیث پر ہے نیز یہ بھی شرعی ضابطہ ہے کہ خروج نجاست موجب وضو ہے اور خون اتفاقی طور پر نجس ہے۔ صاحب کتاب نے زیر نظر حدیث پر دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ اس حدیث کے دو راوی یزید بن خالد اور یزید بن محمد مجہول ہیں لہٰذا حدیث قابل استدلال نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زیلعی نے صحیح سند کے ساتھ زید بن خالد سے اس کی روایت کی ہے جیسا کتاب ''کامل بن عدی'' میں ہے اور یزید بن محمد اور یزید بن خالد مجہول الحال تو ہیں مگر مجہول الذات نہیں اور ان سے بہت سارے ثقہ راوی روایت لیتے ہیں لہٰذا وہ مجہول بھی نہ رہے۔

جواب: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ و شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے صحابی کے جس واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ خون بہہ گیا اور وہ نماز پڑھتے رہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک صحابی کے جذبات واستغراق اور غلبۂ حال کا واقعہ ہے اور کسی کے غلبۂ حال اور استغراقی کیفیت سے استدلال نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس جزئیہ سے قواعد کلیہ نہیں بنائے جا سکتے نیز اس پر آنحضرت ﷺ کی تقریر وتصویب ثابت نہیں نیز اتنا خون بہنے سے کپڑے کیسے پاک رہے حالانکہ شوافع کے ہاں نجاست میں کوئی قدر معاف نہیں اسی لئے علامہ خطابی شافعی نے فرمایا

کہ اس حدیث سے شوافع اس وقت استدلال کر سکتے ہیں جبکہ خون فوارہ کی شکل میں باہر جا کر گرا ہو اور کپڑے محفوظ رہ گئے ہوں ہم نے کہا واہ واہ۔

حضرت علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ توجیہ غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس صحابی کے پاس دوسرے کپڑے تھے جو پاک تھے وہ اس نے پہن لئے اور نماز پڑھی ہم نے کہا شاباش!

حالانکہ جب اس صحابی کے ساتھی نے ان کو خون میں لت پت دیکھا تو کہا مجھے کیوں نہیں جگایا آپ نے فرمایا میں نے سورۂ کہف شروع کی تھی میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ نماز چھوڑوں، معلوم ہوا خون سے وہ کپڑے آلودہ ہو گئے تھے جس میں نماز پڑھی۔ اس حدیث میں جو قصہ ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ غزوہ ذات الرقاع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عباد بن بشر رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو پہرہ پر مقرر فرمایا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ تو سو گئے اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہ اپنی باری میں پہرہ دینے لگے اور نماز میں مشغول ہو گئے ادھر ایک کافر تھا جس کی بیوی میدان جنگ میں ماری گئی تھی اس نے قسم کھائی تھی کہ محمد کے ساتھیوں میں سے کسی کو قتل کر کے بیوی کا بدلہ لوں گا وہ رات کے وقت آیا اور اس صحابی پر تیر مارا صحابی نماز پر قائم رہے پھر حضرت عمار رضی اللہ عنہ جاگ اٹھے تو کافر نے اندازہ کر لیا کہ اب یہ لوگ تعاقب کریں گے تو وہ بھاگ نکلا۔

باب آداب الخلاء

بیت الخلاء جانے کا بیان

آداب ادب کی جمع ہے شرعی طور پر اس کا اطلاق مستحب پر بھی ہوتا ہے۔ اور "اعطاء کل شیء حقه" یعنی ہر چیز کو اس کا جائز اور مناسب مقام دینے پر بھی ہوتا ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ادب کی تعریف اس طرح کی ہے:

"الآداب استعمال ما یُحمَدُ قولاً او فعلاً"۔ [1]

یعنی ادب ان چیزوں کے استعمال کو کہتے ہیں جن کے استعمال کو اچھا سمجھا جاتا ہے خواہ اس کا تعلق افعال سے ہو یا اقوال سے ہو۔ چنانچہ اس باب میں ان اشیاء کا تذکرہ کیا گیا ہے جو استنجاء کے حوالے سے ممنوع اور مکروہ ہیں اور ان چیزوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو استنجا میں مستحب ومحمود ومطلوب ہیں۔

الخلاء: خا کے فتح اور مد کے ساتھ ہے خلاء ہر اس مکان کو کہا جاتا ہے جس میں انسان قضاء حاجت کے لئے جاتا ہو یہ "خالٍ" کے معنی میں ہے کیونکہ انسان بھی وہاں سب سے خالی اور تنہا ہو کر جاتا ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب انسان وہاں نہیں جاتا ہے تو عام اوقات میں وہ مکان خالی رہتا ہے یا انسان وہاں اپنے پیٹ کو خالی کرتا ہے۔

چند آداب:

اس مقام پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے چند چیزوں کو آداب خلاء میں بیان فرمایا ہے۔

1. اول قضاء حاجت کے وقت بیت اللہ اور قبلہ کی عظمت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔
2. نظافت اور صفائی کا خیال رکھا جائے لہٰذا تین پتھروں سے کم نہ ہوں تاکہ خوب صفائی آجائے۔
3. لوگوں کے نقصان سے پرہیز کیا جائے لہٰذا راستہ یا سایہ دار اور پھل دار درخت کے نیچے قضاء حاجت نہ کرے۔
4. اپنے نقصان سے پرہیز کرے کہ سوراخ میں پیشاب نہ کرے۔
5. حقوق جوار اور اخوان کا خیال رکھے اس لئے جنات کی خوراک ہڈی گوبر وغیرہ سے استنجا نہ کرے۔
6. حقوق نفس کا خیال رکھے لہٰذا دائیں ہاتھ سے استنجا نہ کرے۔
7. وسوسہ سے بچنے کی خاطر غسل خانہ میں پیشاب نہ کرے۔
8. لوگوں کی آنکھوں سے ستر اور حجاب اختیار کرے۔
9. دخول اور خروج کے وقت مسنون دعائیں پڑھے۔

اس باب میں مندرجہ بالا تمام آداب سے متعلق احادیث آئیں گی۔

---

[1] المرقات ۲/۵۲

الفصل الاوّل

مسئلة استقبال القبلة واستدبارها

﴿۱﴾ عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا وَلٰكِنْ شَرِّقُوْا أَوْ غَرِّبُوْا. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ).

قَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مُحْيِ السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللّٰهُ هٰذَا الْحَدِيْثُ فِي الصَّحْرَاءِ وَأَمَّا فِي الْبُنْيَانِ فَلَا بَأْسَ لِمَا رُوِيَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ ارْتَقَيْتُ فَوْقَ بَيْتِ حَفْصَةَ لِبَعْضِ حَاجَتِي فَرَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْضِي حَاجَتَهُ مُسْتَدْبِرَ الْقِبْلَةِ مُسْتَقْبِلَ الشَّامِ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۱]

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب تم بیت الخلاء جاؤ تو قبلہ کی طرف منہ نہ کرو بلکہ مشرق اور مغرب کی طرف منہ اور پشت رکھو" (بخاری ومسلم) حضرت امام محی السنۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ جنگل کا حکم ہے آبادی میں ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی کسی ضرورت سے حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان پر چڑھا تو میں نے آنحضرت ﷺ کو (بیت الخلاء میں) قضاء حاجت کرتے دیکھا آپ قبلہ کی طرف پشت اور شام کی طرف منہ کئے ہوئے تھے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: **لا تستقبلوا القبلة:** پیشاب پاخانہ کے وقت استقبال قبلہ اور استدبار قبلہ کرنے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ مشہور اور غیر مشہور تمام مسالک آٹھ ہیں لیکن مسالک مشہورہ متبوعہ صرف چار ہیں اسی کو بیان کیا جاتا ہے چونکہ روایات مختلف ہیں اس لئے فقہائے کرام میں بھی اختلاف آ گیا ہے اگرچہ یہ طے ہے کہ سب کے نزدیک اصح مافی الباب یہی حدیث ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ ہے جو نفی پر دال ہے اور دوسری حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے جو جواز پر دال ہے۔[۲]

فقہاء کا اختلاف:

❶ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک استقبال قبلہ اور استدبار قبلہ آبادی میں مطلقاً جائز ہے اور صحرا میں مطلقاً ناجائز ہے گویا انہوں نے جمع بین الاحادیث کی کوشش کی ہے کہ جواز کی حدیثیں آبادی وبُنْیان پر محمول ہیں اور عدم جواز اور نہی کی احادیث صحرا پر محمول ہیں۔

❷ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے استدبار قبلہ صحراء اور بُنْیان دونوں میں جائز قرار دیا ہے اور استقبال کو دونوں میں ناجائز کہا ہے تو جو احادیث نہی کی ہیں وہ استقبال پر محمول ہیں اور جن احادیث سے جواز معلوم ہوتا ہے وہ استدبار کی ہیں۔

---

[۱] اخرجه البخاری ۱/۹۰۱ ومسلم ۱/۱۵۲ [۲] المرقات ۲/۵۲

❸ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، جمہور صحابہ اور جمہور فقہاء کے نزدیک استقبال واستدبار آبادی وصحرا دونوں جگہوں میں ناجائز ہے اور کسی کی کہیں بھی گنجائش نہیں ہے۔

❹ داؤد ظاہری، ربیعہ الرائی اور اہل ظواہر کے نزدیک استقبال واستدبار مطلقاً جائز ہے خواہ بُنیان میں ہو یا صحرا میں ہو۔ انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے استقبال کا جواز اخذ کیا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدبار کا جواز اخذ کیا۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ یہ روایات متاخر ہیں لہٰذا یہ ناسخ ہیں تو استقبال واستدبار دونوں کا اصل جواز باقی رہ گیا۔ ان چاروں مذاہب میں دلائل کے اعتبار سے شوافع، احناف اور اہل ظواہر کا اختلاف نمایاں ہے اس لئے اسی کو بیان کیا جاتا ہے۔[1]

دلائل:

شوافع اور مالکیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی زیر نظر حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل "**مستدبر القبلة مستقبل الشام**" بتایا گیا ہے۔

ان حضرات کی دوسری دلیل حضرت عراک رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے جس میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بتایا گیا کہ کچھ لوگ قضاء حاجت کے وقت استقبال قبلہ کو مکروہ سمجھتے ہیں تو آپ نے فرمایا میرا خیال ہے کہ لوگوں نے ایسا شروع کیا ہے تم لوگ میری قضاء حاجت کی جگہ قبلہ کی طرف موڑ دو الفاظ حدیث ملاحظہ ہوں:

عراك عن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت ذكر عند رسول الله صلى الله عليه وسلم قوم يكرهون ان يستقبلوا بفروجهم القبلة فقال أُراهم قد فعلوها استقبلوا بمقعدتي القبلة۔ (سنن ابن ماجہ ص ۲۷)

ان حضرات کی تیسری دلیل مروان اصفر کی ابن عمر رضی اللہ عنہ سے وہ روایت ہے جو مشکوٰۃ کے صفحہ ۴۴ پر مذکورہ ہے جس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ کھلے میدان میں استقبال قبلہ منع ہے مگر جب کوئی حائل بیچ میں ہو تو پھر کوئی پرواہ نہیں ہے۔

اہل ظواہر اپنے استدلال میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں جس کو ابوداؤد نے ص ۳ پر نقل کیا ہے الفاظ یہ ہیں:

عن جابر قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان نستقبل القبلة ببول فرأيته قبل ان يقبض بعام يستقبلها۔ (ترمذی، ابوداؤد)

ان حضرات کی دوسری دلیل وہی عراک بن مالک کی روایت ہے جس سے شوافع نے بھی استدلال کیا ہے اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی یہ لوگ استدبار کے جواز کے لئے استدلال کرتے ہیں۔ لہذا ان کے نزدیک استدبار واستقبال مطلقاً جائز ہے۔

ائمہ احناف، جمہور فقہاء اور تابعین کی ایک دلیل تو یہی زیر نظر ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو اصح مافی الباب ہے جس میں مطلقاً استقبال واستدبار کی نہی کردی گئی ہے۔

---

[1] المرقات ۲/۵۴

جمہور کی دوسری دلیل سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو مشکوۃ کے ص ۴۲ پر موجود ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

"قال نهانا رسول الله ﷺ ان نستقبل القبلة لغائط او بول". (مسلم)

جمہور کی تیسری دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو مشکوۃ کے اسی صفحہ ۴۲ پر موجود ہے۔ جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

"اذا اتيتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستدبروها" (دارمی ابن ماجہ)

جمہور کی چوتھی دلیل عبداللہ بن الحارث بن جزء کی مرفوع حدیث ہے جس کو ابن ماجہ اور ابن حبان نے نقل کیا ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں:

"لا يبولن احدكم مستقبل القبلة". (ابن حبان ابن ماجہ)

جمہور کی پانچویں دلیل حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی دوسری مرفوع حدیث ہے جس میں نہایت واضح بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تم قضاء حاجت کے لئے جاؤ تو پیشاب پاخانہ کے وقت قبلہ کی طرف رخ نہ کرو بلکہ مشرق اور مغرب کی جانب رخ کرو (ابوایوب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) کہ جب ہم شام چلے آئے تو وہاں ہم نے بیت الخلاؤں کو قبلہ رخ پایا پس ہم استعمال کے وقت قبلہ سے منحرف ہو کر قضاء حاجت کرتے اور (کچھ کوتاہی پر) اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے تھے۔ (ابوداؤد ص ۳)

مسلک احناف کی ترجیحات:

استقبال قبلہ کے مسئلہ میں احناف کا مسلک بہت سی وجوہات کی وجہ سے راجح ہے چند وجوہات ملاحظہ ہوں۔

❶ مسلک احناف کے دلائل قولی احادیث ہیں دوسرے مسلک کی روایتیں فعلی ہیں اور قول وفعل کا جب تعارض ہو جائے تو ترجیح قولی حدیث کو دی جاتی ہے کیونکہ فعل میں خصوصیت کا احتمال ہوتا ہے اور یہاں خصوصیت کا احتمال قوی ہے کیونکہ محققین علماء کے نزدیک روضۂ اطہر میں آنحضرت ﷺ کا جسد مبارک زمین کے جس حصہ سے لگا ہوا ہے وہ حصہ عرش سے افضل ہے تو کعبہ سے جسد انور کی کیا نسبت تو خصوصیت پیغمبری ہوگئی۔ نیز تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیائے کرام کے فضلات پاک ہیں اور نہی ناپاک ہونے کی وجہ سے ہے تو یہ بھی خصوصیت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں جب آنحضرت ﷺ کے بعد بیت الخلاء میں داخل ہوتی تو مجھے وہاں کوئی فضلہ نظر نہیں آتا تھا اور خوشبو اٹھتی رہتی تھی۔ میں نے

اس کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انبیائے کرام کے جسم جنت کی ارواح طیبہ سے بنے ہیں جو کچھ ان جسموں سے خارج ہوتا ہے زمین اس کو نگل لیتی ہے۔ (شفاء قاضی عیاض) اسی طرح آنحضرت ﷺ کی لونڈی کا واقعہ ہے کہ اس نے آنحضرت ﷺ کے پیشاب کو ایک بار غلطی سے پانی سمجھ کر پی لیا آپ نے کوئی نکیر نہیں فرمائی تو یہ فضلات کی طہارت کی علامت ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شرح لمعات میں بھی انبیائے کرام کے فضلات کو پاک لکھا ہے۔[۱]

❷ احناف نے جو دلائل پیش کئے ہیں یہ سب مُحَرِّم ہیں یعنی حرمت کو ثابت کرتی ہیں اور جب مبیح اور محرم میں تعارض آجائے تو ترجیح محرم کو دی جاتی ہے تاکہ حرمت سے بچا جاسکے۔

❸ احناف نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے وہ عام تشریع اور قانون کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں شریعت کا قاعدہ اور ضابطہ کلیہ بیان کیا گیا ہے۔ اور باقی حضرات نے جن روایتوں سے استدلال کیا ہے ان کی حیثیت جزئی واقعات کی ہے اور جزئی واقعہ کے مقابلہ میں قاعدہ کلیہ کو اپنایا جاتا ہے آنحضرت ﷺ نے زندگی میں دو چار مرتبہ نہیں صرف ایک مرتبہ استدبار کیا ہے اور اس میں بھی احتمالات ہیں۔

❹ حضرت ابن عمر کی روایت اپنے مقصود و مطلوب پر دلالت کرنے میں قطعی اور یقینی نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے دیکھنے میں غلطی کا احتمال ہے ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا چہرۂ انور ایک طرف ہو اور پیشاب دوسری طرف ہو ایسی حالت میں کوئی شخص گھور کر نہیں جھانک سکتا ہے نیز ہوسکتا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی آہٹ سن کر آنحضرت ﷺ نے منہ موڑ لیا ہو یا کوئی اور عذر ہو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت پر یہ شبہ بھی ہے کہ اس میں آبادی کا ذکر نہیں ہے تو صرف چھت پر قضاء حاجت اور صحرا میں یکساں ہے تو اس حدیث سے بُنیان کے جواز پر استدلال نہیں ہوسکتا اور چھت کی چار دیواری ثابت کرنا مشکل ہے تو دلیل دعویٰ کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ چھت کی کھلی فضا بُنیان نہیں ہے۔[۲]

الزامی جواب:

احناف نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کی روایات کا یہ الزامی جواب دیا ہے کہ بتاؤ احادیث میں **نہی عن استقبال القبلة** کی علت کیا ہے تو واضح بات ہے کہ ادب کعبہ علت ہے اگر علت یہی ہے تو پھر بُنیان اور صحرا میں فرق کیوں کرتے ہو؟ یا دونوں جگہ جائز کہہ دو یا دونوں میں حرام کہہ دو، اگر تم یہ فرق کرتے ہو کہ بُنیان میں

---

[۱] اشعة اللمعات　[۲] المرقات ۲/۵۳

آڑ اور حائل ہے صحرا میں نہیں تو ادب کے ساتھ عرض ہے کہ چار بالشت کی دیوار اگر حائل بن سکتی ہے تو کیا صحرا اور بیت اللہ کے درمیان یہ بڑے بڑے پہاڑ اور جنگلات حائل نہیں ہو سکتے۔ نیز اگر ادب کعبہ کی وجہ سے ہزاروں میل دور صحراؤں، پہاڑوں اور آبادیوں میں تھوکنا منع ہے تو کیا پیشاب پاخانہ منع نہیں ہوگا؟ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مسئلہ میں شوافع اور مالکیہ بہت کمزور ہیں یہی وجہ ہے کہ حافظ مغرب ابن حزم اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے حنفیہ کا قول اپنایا ہے۔

قاضی ابوبکر مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی قول کو لیا ہے ابن قیم حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی مسلک کو اپنایا ہے۔ باقی جن حضرات نے جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے اور اس کی وجہ سے نہی کی تمام احادیث کو منسوخ قرار دیا ہے تو یہ بہت افسوسناک بات ہے کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت اکثر محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اس میں ایک راوی محمد بن اسحاق ہے دوسرا ثوبان بن صالح ہے اور یہ دونوں ضعیف ہیں تو یہ روایت شیخین کی ابوایوب رضی اللہ عنہ والی صحیح تر روایت کے لئے کیسے ناسخ بن سکتی ہے؟ اگرچہ اس کو حسن بھی قرار دیا جائے، نیز اس میں بھی وہی احتمالات ہیں جو ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہیں۔

جن حضرات نے عراک بن مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے استدلال کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو اگرچہ بعض حضرات نے حسن کہا ہے لیکن اکثر محدثین نے اس پر بہت کلام کیا ہے چنانچہ علامہ ذہبی، ابن حزم، ابوحاتم، احمد بن حنبل اور امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس میں کلام کیا ہے کیونکہ خالد بن ابی الصلت منکر الحدیث مجہول اور ضعیف ہے دوجگہ اس میں انقطاع بھی ہے اور بعض نے **موقوف علی عائشہ** رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہا ہے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا عجیب جواب دیا ہے وہ یہ کہ استقبال واستدبار کی ممانعت سن کر لوگوں نے ہر جگہ بیت اللہ کی طرف پیٹھ کرنے میں غلو کیا اور ہر نشست میں پیٹھ کرنے کو حرام سمجھنے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری نشست کو قبلہ رخ کر دو تا کہ پیٹھ قبلہ کی طرف ہو اور لوگوں میں اعتدال آجائے یہاں بیت الخلاء کا مقعد مراد نہیں ہے بلکہ عام مجالس کی بات ہے۔

الغائط: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غائط اصل میں زمین کے نشیبی حصہ کو کہتے ہیں اسی اعتبار سے قضاء حاجت کی جگہ اور بیت الخلاء کو غائط کہا گیا ہے کیونکہ عادت کے مطابق لوگ نشیبی علاقہ کو قضاء حاجت کے لئے تلاش کرتے ہیں کیونکہ اس میں پردہ زیادہ ہوتا ہے پھر اس میں توسیع کر دی گئی اور پاخانہ کو ہی غائط کہہ دیا گیا: "**تسمیة الحال باسم محله**"۔

ولکن شرقوا او غربوا: یہ حکم اہل مدینہ اور بیت اللہ کے جنوب یا شمال میں رہنے والوں کے ساتھ خاص ہے کیونکہ وہاں سے بیت اللہ جنوب کی جانب واقع ہے اور مشرق ومغرب کی طرف بیت اللہ نہیں ہوتا بخلاف ہمارے ممالک کے جو مشرق میں واقع ہیں یہ حکم یہاں کے لئے نہیں ہے کیونکہ یہاں مغرب میں بیت اللہ واقع ہے۔ ہاں جو ممالک بیت اللہ کے

جنوب یا شمال میں واقع ہیں یہ حدیث ان کو بھی شامل ہے۔ شریعت میں بعض احکامات بعض لوگوں کے ساتھ خاص ہو کر آئے ہیں یہ حکم اسی قسم میں سے ہے۔ استقبال واستدبار کا یہ حکم راجح قول کے مطابق بیت اللہ کے ساتھ خاص ہے بیت المقدس کا حکم ایسا نہیں ہے۔

۲۲ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ

مسئلة الاستنجاء بالاحجار

﴿۲﴾ وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ نَهَانَا يَعْنِي رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِالْيَمِيْنِ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِأَقَلَّ مِنْ ثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيْعٍ أَوْ بِعَظْمٍ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ہمیں منع کیا ہے اس سے کہ ہم پاخانہ یا پیشاب کے وقت قبلہ کی طرف منہ کریں اور اس سے کہ ہم داہنے ہاتھ سے استنجا کریں اور اس سے کہ ہم تین ڈھیلوں سے کم سے استنجا کریں اور اس سے کہ ہم گوبر یا ہڈی سے استنجا کریں۔ (مسلم)

توضیح: ان نستقبل القبلة: اس حدیث میں تین اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور تینوں میں الگ الگ حقوق کا ذکر ہے اس پہلے جملے میں استقبال قبلہ کا مسئلہ ہے اس کی تفصیل اس سے پہلے گزر چکی ہے اس جملہ میں حق اللہ کا بیان آ گیا۔

ان نستنجی بالیمین: یعنی ہمیں حضور اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ ہم دائیں ہاتھ سے استنجا کریں اس جملہ میں حق العبد کا بیان آ گیا اور اس میں دوسرے اہم مسئلے کی طرف اشارہ ہے کہ دائیں ہاتھ کو استنجاء میں استعمال نہ کرو۔ اہل ظواہر اور بعض شوافع کے ہاں دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنے سے طہارت ہی حاصل نہیں ہوگی لیکن جمہور امت کا مسلک یہ ہے کہ یہ ممانعت دائیں ہاتھ کی شرافت کی وجہ سے ہے ورنہ اصل مقصود تو صفائی حاصل کرنی ہے اور وہ دائیں یا بائیں ہر ایک ہاتھ سے حاصل ہو جاتی ہے شریعت نے دائیں ہاتھ کو اچھے کاموں اور بائیں کو ناپسندیدہ اور مکروہ کاموں کے لئے مقرر فرمایا ہے تو استنجاء بھی مکروہ کام ہے جو بائیں ہاتھ سے کرنا چاہیئے تاکہ کھانا کھاتے وقت انسان کو گھن نہ آئے کہ ابھی ابھی اس دائیں ہاتھ کو پاخانہ میں آلودہ کیا تھا اور اب اس کو لقمہ کے ساتھ منہ میں داخل کر رہا ہے بہر حال اصل صفائی تو کسی بھی ہاتھ سے ہو جاتی ہے دائیں کو استنجاء سے بچانا اس کی شرافت کی وجہ سے ہے۔

ان نستنجی باقل من ثلاثة احجار: اس جملہ میں حق النفس کا بیان آ گیا اور اس میں تیسرے اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا عنوان استنجاء بالاحجار ہے اس میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

[1] اخرجه مسلم ۱۵۵/۱

فقہاء کرام کا اختلاف:

یہاں تین چیزیں قابل لحاظ ہیں: ① **انقاء محل** یعنی محل کو صاف کرنا ② **تثلیث** یعنی تین کے عدد کا لحاظ رکھنا۔ ③ **ایتار** یعنی طاق عدد کی رعایت کرنا اس پر سب کا اتفاق ہے کہ تینوں کی رعایت کرنی چاہیئے مگر اختلاف اس میں ہے کہ اس کی حیثیت کیا ہے۔

تو امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک تثلیث بھی واجب ہے ایتار بھی واجب ہے اور انقاء یعنی صفائی حاصل کرنا بھی واجب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک **تنقیہ** یعنی صفائی واجب ہے اور تثلیث وایتار مستحب ہے۔[1]

ثمرۂ اختلاف:

اختلاف کا ثمرہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے کہ مثلاً ایک آدمی نے دو ڈھیلوں سے انقاء کرلیا اب تیسرا ڈھیلا استعمال کرنا واجب ہے یا نہیں تو شوافع اور حنابلہ کے ہاں واجب ہے تاکہ تثلیث حاصل ہو جائے اور مالکیہ اور حنفیہ کے ہاں واجب نہیں ہے۔ اور اگر چار ڈھیلوں سے **تنقیہ** آگیا تو شوافع اور حنابلہ کے ہاں ایتار کے حصول کے لئے پانچواں استعمال کرنا واجب ہے۔ جبکہ مالکیہ اور حنفیہ کے ہاں واجب نہیں ہے۔

دلائل:

شوافع اور حنابلہ کی پہلی دلیل زیر بحث سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں تین پتھروں سے کم پر اکتفاء کرنے کو منع کیا گیا ہے، ان کی دوسری دلیل مشکوۃ کے اسی صفحہ ۴۲ پر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے "**من استجمر فلیوتر**" اس میں ایتار کا ذکر ہے پھر اسی صفحہ پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ان حضرات کی تیسری دلیل ہے جس میں "**وامر بثلاثۃ احجار**" کے الفاظ آئے ہیں، ان حضرات کی چوتھی دلیل مشکوۃ صفحہ ۴۴ پر سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں "**ولا نکتفی بدون ثلاثۃ احجار**" کے الفاظ آئے ہیں۔

ائمہ احناف اور مالکیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جو مشکوۃ کے صفحہ ۴۳ میں مذکور ہے جس میں "**من فعل فقد احسن ومن لا فلا حرج**" کے الفاظ آئے ہیں جس سے اباحت اور استحباب معلوم ہوتا ہے۔

ان حضرات کی دوسری دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے جو مشکوۃ شریف صفحہ ۴۲ پر ہے جس میں "**فانھا تجزئ عنہ**" کے الفاظ آئے ہیں جس سے احناف اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجزیٔ فرمایا ہے یعنی یہ تین پتھر کفایت کرتے ہیں یعنی **تنقیہ** کے لئے کافی ہیں یہاں اصل مقصود انقاء کو بیان کیا ہے عدد اور ایتار

---

[1] المرقات ۲/۵۵

وتثلیث کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا اس طرز پر یہ حدیث ہماری دلیل بنے گی ورنہ بظاہر یہ شوافع کی دلیل ہے۔

جواب: شوافع حضرات نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے وہ تین پتھروں کے ثبوت پر دال اور تین سے کم کی نہی اور ممانعت پر دال ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تین اور طاق ہمارے نزدیک بھی مستحب ہے تو ان احادیث کو استحباب پر حمل کریں گے تاکہ تمام احادیث میں تطبیق آجائے اور تعارض ختم ہوجائے اور تین سے کم پتھروں کے استعمال کو مکروہ تنزیہی سمجھیں گے تو تعارض ختم ہوجائے گا۔

الزامی جواب:

اصل مقصود تنقیہ اور صفائی ہے طاق ہونا یا تین ہونا کوئی مقصود نہیں ہے اگر تثلیث وایتار وجوبی طور پر مقصود ہوتا تو پھر شوافع کے ہاں ایک ایسے پتھر کو جس کے تین کونے ہوں اور ہر کونہ الگ الگ استعمال کیا اور تنقیہ حاصل ہوگیا تو ان کے نزدیک یہ جائز کیوں ہے حالانکہ نہ اس میں تثلیث ہے نہ ایتار ہے معلوم ہوا یہ چیزیں ضروری نہیں صرف مستحب ہیں۔

رجیع: گوبر کو کہتے ہیں "رجیع" **فعیل** کے وزن پر اسم مفعول "**مرجوع**" کے معنی میں ہے اردو میں اس کے معنی لوٹنے اور لوٹائے جانے کے ہیں اور گوبر اور غلاظت بھی طہارت سے نجاست کی طرف لوٹ کر آئے ہیں گوبر سے استنجاء اس لئے ناجائز ہے کہ یہ موجب تلویث ہے۔ اور جنات کی خوراک بھی ہے۔[1]

بعظم: ہڈی کو عظم کہتے ہیں ہڈی سے استنجاء جائز نہیں یا تو اس لئے کہ چکناہٹ اور گوشت کی بوٹی لگی ہوئی ہڈی سے صفائی حاصل نہیں ہوسکتی ہے اور اگر خشک پرانی ہڈی ہے تو ملاست کی وجہ سے یعنی کھردرا نہ ہونے کی وجہ سے صفائی حاصل نہیں ہو سکتی ہے اور یا نوکیلی ہڈی کی وجہ سے زخم لگنے کا خطرہ ہے لیکن حدیث شریف میں ممانعت کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یہ جنات کی خوراک ہے اور یہی واضح تر ہے استنجاء میں استعمال ہونے والی چیزوں اور استعمال نہ ہونے والی چیزوں کے لئے قاعدہ اور ضابطہ اس عربی عبارت میں فرمایا: "**کل شیء طاهر قالع للنجاسة غیر محترم**" آگے اس کی تفصیل (ص ۵۳۹، ۵۴۳) آنے والی ہے۔[2]

بیت الخلاء جانے کی دعا

﴿۳﴾ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[3]

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب پاخانہ میں داخل ہوتے (یعنی داخل ہونے کا ارادہ کرتے) تو یہ دعا پڑھتے "اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں ناپاک جنوں اور جنیوں (یعنی نر اور مادہ دونوں) سے"۔ (بخاری ومسلم)

[1] المرقات ۲/۵۵ [2] المرقات ۲/۵۵ [3] اخرجه البخاری ۱/۴۸ ومسلم ۱/۱۹۵

توضیح: اذا دخل: یعنی بیت الخلاء میں آدمی جب داخل ہونے کا ارادہ کرے تو یہ دعا پڑھے اور بایاں پاؤں پہلے اندر رکھے اور اگر صحرا میں ہو تو کشف ثیاب سے پہلے یہ دعا پڑھے تاہم ذکر قلبی ہر جگہ جائز ہے۔[1]

الخبث: خا اور با کے ضمہ کے ساتھ یا با کے سکون کے ساتھ یہ خبیث کی جمع ہے اس سے جنات اور سرکش شیاطین مراد ہیں جن کا تعلق ان کے مردوں اور ذکور سے ہے۔[2]

الخبائث: یہ خبیثة کی جمع ہے جس سے مراد جنات کے مؤنثات ہیں تو دونوں لفظوں کا ترجمہ "ای ذکورهم واناثهم" ہے جنات طبعاً گندی جگہ کو پسند کرتے ہیں اور ایسی ہی جگہوں میں جمع رہتے ہیں اس لئے ایسی جگہوں میں ان سے بچاؤ کے لئے اس طرح دعا کی تعلیم کی گئی ہے۔[3]

قبروں پر پھول چڑھانے کا حکم

﴿۴﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَيْنِ فَقَالَ إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ لَا يَسْتَنْزِهُ مِنَ الْبَوْلِ وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ ثُمَّ أَخَذَ جَرِيدَةً رَطْبَةً فَشَقَّهَا بِنِصْفَيْنِ ثُمَّ غَرَزَ فِي كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا فَقَالَ لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا۔

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[4]

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو آپ نے (انہیں دیکھ کر) فرمایا کہ ان دونوں قبر والوں پر عذاب نازل ہو رہا ہے اور عذاب بھی کسی بڑی چیز پر نازل نہیں ہو رہا ہے (کہ جس سے بچنا مشکل ہو) ان میں سے ایک تو پیشاب سے نہیں بچتا تھا، مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغل خور تھا" پھر آپ ﷺ نے (کھجور کی) ایک تر شاخ لی اور اس کو بیچ سے آدھوں آدھ چیرا انہیں ایک ایک کر کے دونوں قبروں پر گاڑ دیا صحابہ نے (یہ دیکھ کر) پوچھا یا رسول اللہ! آپ نے ایسا کیوں کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا شاید (اس عمل سے) ان کے عذاب میں (اس مدت تک کے لئے) کچھ تخفیف ہو جائے جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں۔

(بخاری و مسلم)

توضیح: مر بقبرین: اس میں بحث ہے کہ یہ دونوں قبریں مسلمانوں کی تھیں یا یہ لوگ کافر تھے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ دونوں کافر تھے کیونکہ بعض روایات میں "قبرین" کے ساتھ "قد یمین" کا لفظ بھی ملتا ہے یعنی قدیم جاہلیت کی قبریں تھیں لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کے مسلمان ہونے کو ترجیح دی ہے اور ابن ماجہ کی حدیث میں ہے مر

[1] المرقات ۲/۵۵ [2] المرقات ۲/۵۶ [3] المرقات ۲/۵۶ [4] اخرجه البخاری ۱/۶۵ ومسلم ۱/۱۶۶

النبی ﷺ بقبرین جدیدین اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ مسلمان تھے بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے پوچھا آج تم نے یہاں کس کو دفن کیا ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ مسلمان تھے بعض روایات میں حصر ہے کہ **وما یعذبان الا فی الغیبة والبول** معلوم ہوا کہ کفر کی وجہ سے عذاب نہیں تھا بلکہ یہ مسلمان تھے کفر کے علاوہ دو گناہوں کی وجہ سے عذاب ہو رہا تھا۔

وما یعذبان فی کبیر: یعنی ان دونوں کو کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا ہے۔

سوال: اب یہاں یہ اعتراض آتا ہے کہ پیشاب سے نہ بچنا اور چغلی کھانا تو کبیرہ ہیں یہاں نفی کیسے کی گئی؟ نیز بعض روایات میں "**بلی انه لکبیر**" کے الفاظ آئے ہیں تو یہاں کیسے کبیرہ کی نفی کی گئی ہے؟

جواب: اس کا ایک جواب یہ ہے کہ کبیر شاق کے معنی میں ہے جیسے قرآن میں ہے: "**وانها لکبیرة الا علی الخاشعین**" وہاں کبیرہ سے شاق اور گراں مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ گناہ اگرچہ دوسرے بڑے گناہوں کی نسبت ان جیسے بڑے نہیں ہیں مگر فی نفسہ بڑے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے نزدیک تو یہ کام اور یہ گناہ اتنا بڑا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا ہے خاص کر جب اس پر مداومت ہو جائے۔

اب یہ شبہ ہے کہ ان گناہوں کا قبر کے عذاب سے کیا تعلق ہے کہ قبر ہی کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بول سے نہ بچنا نماز کو خراب کرتا ہے کیونکہ ظاہری طہارت جب نہ ہو تو نماز نہیں ہوگی اور نماز کا حساب کتاب قیامت میں سب سے پہلے ہوگا اور قبر آخرت کا پیش خیمہ اور پہلی منزل ہے تو قبر ہی سے عذاب شروع ہو گیا اسی طرح چغلی سے بچنا باطنی طہارت ہے جب طہارت ضائع ہو گئی تو قبر سے عذاب شروع ہو گیا۔ یا یوں سمجھو کہ چغلی سے فتنہ و فساد اٹھتا ہے جس سے قتل و قتال واقع ہو جاتا ہے اور قیامت میں سب سے پہلے حقوق العباد میں ناحق خون کا حساب ہوگا اور قبر آخرت کی پہلی منزل ہے تو یہیں سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا حساب شروع ہو گیا۔[1]

ثم اخذ جریدة رطبة: قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کھجور کی شاخ کو دو ٹکڑے کر کے آنحضرت ﷺ نے جو ایک ایک قبر پر گاڑ دیا تھا یہ شفاعت پیغمبری کے قبیل سے ایک عمل تھا کہ جب تک شاخ ہری رہے گی میری شفاعت رہے گی تو عذاب نہیں ہوگا تو یہ خصوصیت پیغمبری ہو گئی اور مسلم شریف کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ یہ شفاعت تھی تو کسی اور کو اختیار نہیں کہ یہ عمل کرے۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شاخوں کا یہ گاڑنا ایک سبب پر محمول ہے اور اس کی ایک علت تھی لہٰذا یہ خصوصیت پیغمبری نہیں تھی بعض علماء نے لکھا ہے کہ تر شاخ خشک ہونے تک تسبیح پڑھتی ہے جس کا اثر صاحب قبر کے عذاب پر ہوتا ہے اور تخفیف آتی ہے۔

نیز بریدہ بن الخصیب رضی اللہ عنہ نے تر شاخ اپنی قبر پر گاڑنے کی وصیت کی تھی لہٰذا یہ ایک سبب پر محمول ہے۔ یہ تو ایک علمی بحث

---

[1] المرقات ۲/۵۶،۵۷

تھی لیکن آج کل لوگ قبروں پر جو گل پاشی کرتے ہیں اور پھولوں کی چادریں چڑھاتے ہیں یہ تو کہیں سے بھی ثابت نہیں ہے یہ آجکل ایسی رسم ہوگئی ہے کہ غیر مسلم لوگ بعض مشہور قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں یا مسلمان سربراہان غیر مسلموں کی قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں یہ سب فضول اور لغو عمل ہے اس کا اس حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ [1]

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ما يفعله الناس على القبور لا اصل له"۔ (نووی) [2]

اب تو لوگوں میں اتنا غلو ہوگیا کہ جو لوگ یہ کام نہیں کرتے ہیں ان کو وہابی کہہ کر مطعون کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر اتباع حضور مقصود ہے تو پھر شاخ گاڑنا چاہئیے پھول چڑھانا کہاں سے آیا ہے۔ نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو معذبین کی قبروں پر یہ عمل فرمایا تھا اور آج کل مقربین کے ساتھ یہ عمل ہو رہا ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل متبعین صحابہ کرام تھے ان سے پھول چڑھانا اور نچھاور کرنا ثابت نہیں ہے نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو ان دو قبروں کے علاوہ کہیں نہیں کیا۔ اس لئے سداً للذرائع بدعات سے بچنے کیلئے علماء نے منع کیا ہے تاکہ نوبت پھولوں، شالوں، دوشالوں، ہاروں اور قبوں اور دیواروں تک نہ پہنچ جائے۔

لوگوں کے راستے میں پاخانہ کرنا موجب لعنت ہے

﴿۵﴾ وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِتَّقُوا اللَّاعِنَيْنِ قَالُوْا وَمَا اللَّاعِنَانِ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ اَلَّذِيْ يَتَخَلَّى فِيْ طَرِيْقِ النَّاسِ اَوْ فِيْ ظِلِّهِمْ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ) [3]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "تم ان دو چیزوں سے بچو جو لعنت کا سبب ہیں" صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ چیزیں کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک تو یہ ہے کہ کوئی شخص دوسروں کے راستہ میں پاخانہ کرے، دوسرے یہ کہ کوئی شخص لوگوں کے سایہ کے نیچے پاخانہ کرے"۔ (مسلم)

توضیح: **اللاعنين:** یعنی وہ دو کام جو لعنت کے لئے سبب اور ذریعہ بنتے ہوں گویا یہ دو کام خود لعنت کرنے والے بن جاتے ہیں اس اعتبار سے حامل اور باعث کو فاعل کا درجہ دیا گیا ورنہ اصل میں لعنت کرنے والے تو وہ لوگ ہیں جو تکلیف اٹھا کر گالی اور لعنت کرنے لگ جاتے ہیں تو یہ "اسناد الى غير ما هو له" بن گیا۔ صاحب ازہار نے لکھا ہے کہ لاعن بروزن فاعل ملعون بروزن مفعول کے معنی میں ہے۔ [4]

الذى يتخلى: یہاں مضاف محذوف ہے اصل عبارت اس طرح ہے۔ اى تخلى الذى يتخلى اور تخلی خالی ہونے کو کہتے ہیں مراد پاخانہ کرنا ہے۔ [5]

فی طریق الناس: اس سے مراد عام راستہ ہے جس پر لوگ آتے جاتے گزرتے ہیں اگر جنگل میں کوئی راستہ ہو وہ مراد

---

[1] المرقات ۲/۵۷،۵۸ [2] المرقات ۲/۵۸ [3] اخرجه مسلم ۱/۱۵۶ [4] المرقات ۲/۵۸ [5] المرقات ۲/۵۹

نہیں ہے نیز اس سے وہ راستہ مراد ہے جو عام ہو کسی کے مملوک راستہ میں بغیر اجازت قضاء حاجت حرام ہے۔ [۱]

او فی ظلھم: یہاں او تنویع کے لئے ہے اور ظل مستظل کے معنی میں ہے یعنی سایہ دار درخت کے نیچے جہاں لوگ سایہ حاصل کرتے ہیں قضاء حاجت کرنا باعث لعنت ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص اس حرکت کرنے والے کو گالی دیتا ہے یا اس پر لعنت بھیجتا ہے تو یہ شخص اس کا مستحق ہے۔ سایہ دار درخت کے علاوہ پھل دار درخت کا بھی یہی حکم ہے۔ نیز اس سے وہ مقامات بھی مراد ہیں جہاں لوگ دھوپ لینے کے لئے سردیوں میں بیٹھتے ہیں یا عام مجلس جمانے کے لئے بیٹھتے ہوں نیز پانی کے گھاٹ اور پارک وغیرہ پبلک مقامات سب مراد ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس میں وہ بیت الخلاء بھی آتا ہے جس میں فلش سسٹم نہ ہو اور پاخانہ اس میں پڑا رہتا ہو جس سے دوسروں کو ایذا پہنچتی ہو۔ ہاں جب مجبوری ہو تو پھر اس میں تخفیف بوجہ مجبوری ہوگی۔ [۲]

دائیں ہاتھ سے ذکر کو چھونا منع ہے

﴿۶﴾ وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا شَرِبَ اَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَفَّسْ فِی الْاِنَاءِ وَاِذَا اَتَى الْخَلَاءَ فَلَا يَمَسَّ ذَكَرَهٗ بِيَمِيْنِهٖ وَلَا يَتَمَسَّحْ بِيَمِيْنِهٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) [۳]

ترجمہ: اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص پانی پیئے تو (پانی پینے کے) برتن میں سانس نہ لے اور جب پاخانہ میں جائے تو داہنے ہاتھ سے عضو مخصوص کو نہ چھوئے اور نہ داہنے ہاتھ سے استنجاء کرے"۔ (بخاری ومسلم)

﴿۷﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَوَضَّاَ فَلْيَسْتَنْثِرْ وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوْتِرْ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) [۴]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جو شخص وضو کرے تو اسے چاہیئے کہ وہ ناک کو بھی جھاڑ دے اور جو شخص (پاخانہ کے بعد ڈھیلے سے) استنجا کرے اسے چاہیئے کہ طاق ڈھیلے لے" (یعنی تین، پانچ، یا سات)۔ (بخاری ومسلم)

﴿۸﴾ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُ الْخَلَاءَ فَاَحْمِلُ اَنَا وَغُلَامٌ اِدَاوَةً مِنْ مَاءٍ وَعَنَزَةً يَسْتَنْجِیْ بِالْمَاءِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) [۵]

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب پاخانہ کے لئے تشریف لے جاتے تو میں اور

---

[۱] المرقات ۲/۵۸ [۲] المرقات ۲/۵۹ [۳] اخرجه البخاری ۱/۳۹ ومسلم ۱/۱۵۶

[۴] اخرجه البخاری ۱/۵۲ ومسلم ۱/۱۳۶ [۵] اخرجه البخاری ۱/۳۹ ومسلم ۱/۱۵۶

ایک لڑکا (یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ یا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ) پانی کی چھاگل اور ایک برچھی لیتے آپ ﷺ (ڈھیلوں سے صفائی کے بعد) پانی سے استنجاء کرتے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: غلام: اس سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔[1]

اداوة: چمڑے کے لوٹے کو کہتے ہیں جس کو چھاگل کہتے ہیں یعنی چمڑے کا بنا ہوا برتن۔[2]

علنزة: یہ اس برچھی کو کہتے ہیں جو لاٹھی سے کچھ بڑی اور نیزے سے چھوٹی ہوتی ہے۔ اس کو کسی ضرورت کے لئے یا بوقت نماز سترہ کے لئے اٹھا کر لے جاتے تھے۔[3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی پانی استعمال کیا ہے اور کبھی صرف ڈھیلا استعمال فرمایا ہے اور کبھی دونوں کو استعمال کیا ہے یہاں پانی کی وضاحت ہے باقی جائز سب ہے۔ البتہ **جمع بین الماء والحجر** افضل ہے پھر پانی کا استعمال افضل ہے اور آخر میں صرف ڈھیلا ہے۔ جو لوگ صرف پانی سے استنجاء کو ناجائز کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

الفصل الثانی

قابل احترام چیز کو بیت الخلاء نہ لے جاؤ

﴿۹﴾ عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ نَزَعَ خَاتَمَهُ. (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ وَقَالَ أَبُو دَاوُدَ هٰذَا حَدِيثٌ مُنْكَرٌ وَفِي رِوَايَتِهِ وَضَعَ بَدَلَ نَزَعَ)[4]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب بیت الخلاء تشریف لے جاتے تو اپنی انگوٹھی اتار لیا کرتے تھے۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے نیز ان کی روایت لفظ نزع کے بجائے لفظ وضع ہے۔

توضیح: نزع خاتمه: بعض روایت میں "**وضع خاتمه**" کے الفاظ آئے ہیں اس میں کوئی فرق نہیں ہے آنحضرت ﷺ کی انگوٹھی میں "**محمد رسول الله**" کی عبارت اس طرز پر کھدی ہوئی تھی کہ اوپر والی سطر میں لفظ اللہ تھا پھر لفظ رسول تھا اور سب سے نیچے لفظ محمد تھا، اس لئے آپ اسے قضاء حاجت کے وقت اتارتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز جس پر آیت لکھی ہوئی ہو یا کسی رسول یا فرشتے کا نام ہو یا قرآن یا اللہ کے ناموں میں کوئی نام ہو اسے بیت الخلاء میں لے جانا مکروہ ہے ہاں اگر تعویذ کی شکل میں کوئی چیز چھپی ہوئی ہو تو اس کا حکم الگ ہے۔ ابوداؤد نے اس حدیث کو منکر کہا ہے مگر علماء کہتے ہیں کہ یہ حدیث دلیل کے لئے صحیح ہے۔[5]

﴿۱۰﴾ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَرَادَ الْبَرَازَ انْطَلَقَ حَتّٰى لَا يَرَاهُ أَحَدٌ. (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ)[6]

---

[1] المرقات ۲/۶۱ [2] المرقات ۲/۶۱ [3] المرقات ۲/۶۱

[4] اخرجه ابوداؤد ۱۹ والترمذی ۱۷۳۶ [5] المرقات ۲/۶۲ [6] اخرجه ابوداؤد ۲

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب پاخانہ کے لئے (جنگل میں) جانے کا ارادہ کرتے تو (اتنی دور) تشریف لے جاتے کہ آپ ﷺ کو کوئی نہ دیکھتا۔ (ابوداؤد)

توضیح: **البراز:** یہ لفظ با کے فتح کے ساتھ ہے کھلی فضا میں نکلنے کے معنی میں ہے۔ یہ قضاء حاجت سے کنایہ ہے پاخانہ کا لفظ چونکہ غیر پسندیدہ ہے لہٰذا ہر زبان میں اس کو لوگ بطور کنایہ استعمال کرتے ہیں بلکہ قضاء حاجت کی وجہ سے اس جگہ کا نام بھی بوجہ کراہت بدلتا رہتا ہے مثلاً پہلے اس کا نام ٹٹی خانہ تھا وہ مکروہ ہوا تو بیت الخلاء ہو گیا پھر طہارت خانہ پھر سنڈاس ہو گیا پھر باتھ روم ہو گیا اب لٹرین چل رہا ہے۔ براز کو با کے کسرہ کے ساتھ پڑھنا بعض نے غلط قرار دیا ہے کہ وہ لڑائی کے معنی میں ہے مگر وہ بھی صحیح ہے ہاں فتح زیادہ بہتر ہے۔ قضاء حاجت کے لئے دور جانا آنحضرت ﷺ کی حیا اور کریمانہ اخلاق کا حصہ تھا جبکہ بیت الخلاء گھر میں نہ تھا۔[1]

نرم جگہ میں پیشاب کرنا چاہئے

﴿۱۱﴾ وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَأَرَادَ أَنْ يَبُولَ فَأَتَى دَمِثًا فِي أَصْلِ جِدَارٍ فَبَالَ ثُمَّ قَالَ إِذَا أَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يَبُولَ فَلْيَرْتَدْ لِبَوْلِهِ. (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن میں سرکار دو عالم ﷺ کے ہمراہ تھا آپ ﷺ نے پیشاب کرنے کا ارادہ فرمایا چنانچہ آپ ﷺ ایک دیوار کی جڑ میں (یعنی اس کے قریب) نرم زمین پر پہنچے اور پیشاب کیا پھر (پیشاب سے فراغت کے بعد) آپ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص پیشاب کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ پیشاب کے لئے نرم زمین تلاش کرے"۔ (تاکہ چھینٹیں نہ پڑیں)۔ (ابوداؤد)

توضیح: **دمثا:** دال کے فتح اور میم کے کسرہ کے ساتھ سمع یسمع سے نرم مکان اور نرم زمین کو کہتے ہیں یہ لفظ صفت ہے اور اس کا موصوف "مکانا" ہے۔[3] **فلیرتد:** یہ ارتاد یرتاد سے طلب کرنے کے معنی میں ہے نرم جگہ تلاش کرنا اس لئے تھا کہ چھینٹیں جسم پر نہ پڑ جائیں یا اونچائی سے پیشاب پاؤں کی طرف نہ آئے اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ لاٹھی سے سخت زمین کو کرید کر نرم فرماتے اور پھر پیشاب کرتے تھے یہاں یہ شبہ ہے کہ دوسرے کی دیوار کے پاس پیشاب کرنا جائز نہیں اس سے دیوار کی جڑ اور بنیاد خراب ہو جاتی ہے آپ نے کیسے کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عام جگہ تھی سب لوگ یہاں پیشاب کرتے تھے یا شاید دیوار سے یہ جگہ فاصلہ پر تھی یا یہ جواب ہے کہ آپ ﷺ نے فاصلہ پر پیشاب کیا۔[4]

﴿۱۲﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ الْحَاجَةَ لَمْ يَرْفَعْ ثَوْبَهُ حَتَّى يَدْنُوَ مِنَ الْأَرْضِ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ)[5]

---

[1] المرقات ۲/۶۲ [2] اخرجه ابو داؤد ۳ [3] المرقات ۲/۶۳ [4] المرقات ۲/۲۲ [5] اخرجه الترمذی ۱۴ والدارمی وابو داؤد ۳۶

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب استنجاء کا ارادہ فرماتے تو جب تک (بیٹھنے کے لئے) زمین سے قریب نہ ہو جاتے کپڑا نہ اٹھاتے تھے۔ (ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

﴿۱۳﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهٖ أُعَلِّمُكُمْ إِذَا أَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا وَأَمَرَ بِثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ وَنَهٰى عَنِ الرَّوْثِ وَالرِّمَّةِ وَنَهٰى أَنْ يَسْتَطِيْبَ الرَّجُلُ بِيَمِيْنِهٖ. (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهَ وَالدَّارِمِيُّ)[۱]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا (تعلیم ونصیحت کے سلسلہ میں) "میں تمہارے لئے ایسا ہوں جیسے باپ بیٹے کے لئے ہوتا ہے چنانچہ میں سکھلاتا ہوں کہ جب تم پاخانہ میں جاؤ تو قبلہ کی طرف نہ منہ کرو اور نہ پشت کرو"۔ اور آپ ﷺ نے (پاخانہ کے بعد) تین ڈھیلوں سے استنجاء کرنے کا حکم دیا اور لید (یعنی تمام نجاستوں) اور ہڈی سے استنجاء کرنے کو منع فرمایا نیز آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص دائیں ہاتھ سے استنجاء کرے۔

(ابن ماجہ، دارمی)

دایاں ہاتھ پاخانہ کے لئے نہیں کھانے کے لئے ہے

﴿۱۴﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَتْ يَدُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْيُمْنٰى لِطُهُوْرِهٖ وَطَعَامِهٖ وَكَانَتْ يَدُهُ الْيُسْرٰى لِخَلَائِهٖ وَمَا كَانَ مِنْ أَذًى. (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ)[۲]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کا داہنا دست مبارک وضو کرنے اور کھانے کے لئے تھا اور بایاں ہاتھ استنجاء اور ہر مکروہ کام کے استعمال کے لئے تھا۔ (ابوداؤد)

توضیح: الیمنی لطھورہ: اسلام ایک جامع مذہب ہے اور یہ کامل مکمل بلکہ اکمل ضابطہ حیات ہے اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے ہر قسم کے مسائل کا حل موجود ہے اسی سلسلہ میں متعدد احادیث میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کے دائیں اور بائیں ہاتھ کے الگ الگ فرائض ہیں چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا دایاں ہاتھ کھانے پینے اور ہر اچھے اور مبارک کام کے لئے تھا اور بایاں ہاتھ استنجاء اور ہر اس کام کے لئے تھا جو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔[۳]

شریعت مطہرہ نے انسانی طبیعت کے ساتھ مماشات کی ہے کیونکہ طبعاً انسان کھانے اور پاخانے میں فرق کرنا چاہتا ہے اور کوئی انسانی طبیعت یہ نہیں چاہتی کہ ابھی ابھی جس ہاتھ کو پاخانہ میں آلودہ کیا تھا اسے اب منہ میں ڈال کر اپنے کھانے کی لذت کو تباہ کر دے اسی وجہ سے بائیں ہاتھ کو ناپسندیدگی کی وجہ سے شیطان کا ہاتھ کہا گیا ہے یعنی شیطان کے پسندیدہ کاموں میں یہ ہاتھ استعمال ہوتا ہے اب پیشاب، پاخانہ، ناک کی صفائی اور کسی گندی چیز کو اٹھانے میں

[۱] اخرجه ابن ماجه ۳۱۲ والدارمی ۶۸۰ [۲] اخرجه ابو داؤد ۳۳ [۳] المرقات ۲/۶۵

بائیں ہاتھ کو استعمال کیا جائے گا اور دایاں ہاتھ دیگر اچھے کاموں کے لئے ہے تا کہ ہر عضو کے لئے الگ الگ تقسیم کار ہو۔ اب جن لوگوں کی طبیعت شیطانی ہوگئی ہے وہ بائیں ہاتھ کو پسند کرتے ہیں اور کھانے پینے اور پاخانے میں اس کو برابر استعمال کرتے ہیں وہ گندے اور اچھے کاموں میں دائیں بائیں کا فرق نہیں کرتے ہیں شریعت نے انسانی شرافت کا بہت بڑا خیال رکھا ہے رحمان کا سارا نظام طہارت کا ہے اور رحمان اسی کا حکم دیتا ہے اور شیطان کا سارا نظام نجاست کا ہے اور وہ خبیث اسی کا حکم دیتا ہے۔

﴿۱۵﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا ذَهَبَ أَحَدُكُمْ إِلَى الْغَائِطِ فَلْيَذْهَبْ مَعَهُ بِثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ يَسْتَطِيْبُ بِهِنَّ فَإِنَّهَا تُجْزِئُ عَنْهُ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ)[۱]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی شخص پاخانہ کے لئے جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے ساتھ تین پتھر (یا ڈھیلے) لے جائے جو کافی ہوں گے" (یعنی پانی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی)۔ (احمد، ابوداؤد، نسائی دارمی)

کن چیزوں سے استنجا جائز اور کن سے ناجائز ہے

﴿۱۶﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْتَنْجُوْا بِالرَّوْثِ وَلَا بِالْعِظَامِ فَإِنَّهُ زَادُ إِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ إِلَّا أَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ زَادُ إِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ)[۲]

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم لوگ لید اور ہڈی سے استنجاء نہ کرو کیونکہ (ہڈی) تمہارے بھائیوں، جنات کی غذا ہے" (ترمذی، نسائی) مگر نسائی نے "زاد اخوانکم من الجن" کے الفاظ ذکر نہیں کئے ہیں۔

توضیح: روث اور رجیع گوبر کے معنی میں ہے مگر روث لید یعنی گھوڑوں کے فضلات کو کہتے ہیں اور بعرۃ بھیڑ بکریوں اونٹوں کے فضلات کو کہتے ہیں اور سرقین بھینس گائے وغیرہ کے فضلات کو کہتے ہیں۔ رجیع کی تشریح گزر چکی ہے یہ عام ہے۔[۳]

لید سے استنجاء کی ممانعت کی ایک وجہ تو حدیث میں آئی ہے کہ تمہارے بھائیوں جنات کی خوراک ہے اس میں یہ وضاحت بھی آئی ہے کہ گوبر کے اندر جو دانے ملتے ہیں اسی کو جنات کھاتے ہیں یا بعض احادیث میں آیا ہے کہ گوبر جنات کے جانوروں کا چارہ اور گھاس ہے تو یہاں جنات کی طرف نسبت ادنیٰ ملابست کی وجہ سے ہے یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ جب جنات اور انسانوں کی شریعت ایک ہے تو پھر جنات کے لئے گوبر کیسے جائز ہوا جو حرام چیز ہے اس کے دو جواب تو اوپر گزر گئے۔

[۱] اخرجه احمد ۲/۱۰۸ وابو داؤد ۴۰ والنسائی ۱/۴۱　[۲] اخرجه الترمذی ۱۸ والنسائی ۳۰۹　[۳] المرقات ۲/۶۶،۶۷

تیسرا جواب یہ کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ گوبر اٹھاتے ہی ان کے لئے کھجور میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جواب دیا ہے کہ ایک ہی شریعت میں مختلف اصناف کے لوگوں کے حق میں حکم بدل جاتا ہے جس طرح مردوں کے لئے ریشم کا لباس حرام ہے اور عورتوں کے لئے جائز ہے تو اسی طرح جنات کے لئے گوبر جائز ہے۔ انسانوں کے لئے حرام ہے۔

فائدہ: اس ضمیر کے مرجع میں کلام ہے کہ ضمیر مفرد کیوں ہے حالانکہ سابق دو چیزیں ہیں اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ضمیر عظام کی طرف راجع ہے اور عظام اگرچہ جمع ہے لیکن طعام کے معنی میں ہے تو ضمیر لوٹانا صحیح ہے۔ یہ ہے کہ ہر ایک کے اعتبار سے ضمیر لوٹائی گئی ہے یعنی ہر ایک مذکور کا یہ حکم ہے۔ یہ ہے کہ مرقات میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے جس نسخہ کو نقل کیا ہے اس میں "انہا" کی ضمیر مؤنث ہے۔[1]

ولا بالعظام: ہڈی سے استنجاء کی ممانعت کی وجوہات اور شرح اس باب کی حدیث نمبر ۲ میں گزر چکی ہے یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جنات کے لئے ان ہڈیوں پر نیا گوشت پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کھاتے ہیں اور بعض روایات میں صرف سونگھنے کا ذکر آیا ہے۔ سوات کے میرے محترم استاد مولانا فضل محمد رحمۃ اللہ علیہ نے درس مشکوۃ کے وقت فرمایا کہ میں نے ایک جنّی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ہم صرف سونگھ کر سیر ہو جاتے ہیں نیا گوشت نہیں آتا ہے۔[2]

بعض روایات میں کوئلہ کی بھی ممانعت آئی ہے جیسا کہ اس باب کی آخری حدیث نمبر ۳۹ میں ہے۔ اس میں کوئلہ کو جنات کا رزق بتایا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں جیسے کھانے پکانے میں آگ جلانے اور روشنی کرنے میں استعمال کرتے ہیں تو ''رزقاً'' بمعنی انتفاعاً ہے۔ جنات بھی عجیب مخلوق ہیں۔

قاعدہ:

ایک جامع قاعدہ کو سمجھ لیا جائے کہ استنجاء کن کن اشیاء سے جائز ہے تو فرمایا:

یجوز الاستنجاء بکل جامد طاهر منق قالع للنجاسة غیر موذ لیس بذی حرمة ولا شرف ولا یتعلق به حق الغیر۔ (شرح نقایہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ج ۱ ص ۳۹)

اس عبارت میں **لیس بذی حرمة** کی قید سے وہ کپڑا خارج ہو گیا جو کسی کے کام میں آسکتا ہو اسی طرح روئی بھی نکل گئی اسی طرح مکئی کے بھٹے کا دانوں سے خالی حصہ بھی نکل گیا جس سے عموماً عورتیں بچوں کے پاخانہ کو صاف کرتی ہیں نیز اس سے وہ سارے کاغذات بھی نکل گئے جو کسی طور پر قابل احترام ہوں ہاں جو کاغذ اسی صفائی کے لئے بنایا گیا ہو جیسے ٹوائلٹ پیپر وغیرہ تو وہ اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔

---

[1] المرقات ۲/۶۶ والکاشف ۲/۳۹ [2] المرقات ۲/۶۶،۶۷

داڑھی میں گرہ باندھنا منع ہے

﴿۱۷﴾ وَعَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَا رُوَيْفِعُ لَعَلَّ الْحَيَاةَ سَتَطُوْلُ بِكَ بَعْدِيْ فَأَخْبِرِ النَّاسَ أَنَّ مَنْ عَقَدَ لِحْيَتَهُ أَوْ تَقَلَّدَ وَتَرًا أَوِ اسْتَنْجٰى بِرَجِيْعِ دَابَّةٍ أَوْ عَظْمٍ فَإِنَّ مُحَمَّدًا مِنْهُ بَرِيْءٌ. (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[1]

ترجمہ: اور حضرت رویفع بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اے رویفع! شاید میرے بعد تیری زندگی دراز ہو لہٰذا تم لوگوں کو خبر دار کرنا کہ جس شخص نے اپنی ڈاڑھی میں گرہ لگائی یا (گلے) میں تانت کا ہار ڈالا یا جانور کی نجاست (لید اور گوبر وغیرہ) اور ہڈی سے استنجاء کیا تو محمد ﷺ اس سے بیزار ہیں"۔ (ابوداؤد)

توضیح: **من عقد لحیته:** جاہلیت میں کفار کی عادت تھی کہ جو شخص شادی کرتا تو وہ ڈاڑھی میں ایک گرہ لگاتا تھا۔ دوسری شادی پر دوسری گرہ باندھتا تھا اس سے منع کیا گیا ہے کہ یہ جاہلیت کی ایک بیہودہ رسم ہے اور ان سے مشابہت ہے یا جاہلیت میں لوگ داڑھی سمیت کر ٹھوڑی کے نیچے مروڑ کر دباتے تھے اس سے روکا گیا کیونکہ داڑھی میں سنت طریقہ اس کا کھلا چھوڑنا ہے چنانچہ آجکل مسلمانوں اور سکھوں کی داڑھی میں یہی فرق ہے اور اس تناظر میں اس حکم کی ایک عالمی حیثیت بن جاتی ہے اور مسلمان کا تعارف مسنون داڑھی سے ہو جاتا ہے۔[2]

عقد وترا: اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ جاہلیت میں لوگ دفع نظر اور دفع آفات کے لئے گلے میں ڈورے ڈالتے تھے اور تعویذ اور گنڈے بنا کر گھوڑوں اور بچوں کے گلے میں ڈال دیا کرتے تھے اس سے منع کیا گیا اس لئے کہ اس میں ضعف عقیدہ اور شرک کا قوی امکان تھا اور اہل شرک سے مشابہت بھی تھی۔ بعض علماء نے وتر سے کمان کے وہ چلے مراد لئے ہیں جو تسموں کے بنے ہوئے ہوتے تھے اس کو گھوڑوں کے گلوں میں دفع آفات کے لئے ڈالتے تھے اس میں خالص شرک تھا تو منع کیا گیا۔[3]

بریٔ: یعنی اس شخص سے نبی اکرم ﷺ اور شریعت کا کوئی واسطہ نہیں بلکہ ان سے بیزار ہیں اگر وہ اس کو جائز حلال سمجھتا ہے تو کافر ہو گیا ورنہ صرف اس ایک عمل میں آنحضرت ﷺ ان سے بیزار ہیں پورے اسلام کی بیزاری مراد نہیں۔[4]

استنجاء میں تین پتھر استعمال کرنا مستحب ہے

﴿۱۸﴾ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اكْتَحَلَ فَلْيُوْتِرْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ أَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَا حَرَجَ وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوْتِرْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ أَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَا حَرَجَ وَمَنْ أَكَلَ فَمَا تَخَلَّلَ فَلْيَلْفِظْ وَمَا لَاكَ بِلِسَانِهٖ فَلْيَبْتَلِعْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ أَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَا حَرَجَ وَمَنْ أَتَى

[1] اخرجه ابو داؤد ۱/۶ [2] المرقات ۲/۶۷ [3] المرقات ۲/۶۸ [4] المرقات ۲/۶۸

الْغَائِطَ فَلْيَسْتَتِرْ فَإِنْ لَمْ يَجِدْ إِلَّا أَنْ يَجْمَعَ كَثِيبًا مِنْ رَمْلٍ فَلْيَسْتَدْبِرْهُ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَلْعَبُ بِمَقَاعِدِ بَنِي آدَمَ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ أَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَا حَرَجَ. (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ وَالدَّارِمِيُّ)[۱]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص سرمہ لگائے اسے چاہئے کہ طاق سلائیاں لگائے جس نے ایسا کیا (یعنی طاق سلائیاں لگائیں) اس نے اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا تو کچھ گناہ نہیں اور جو شخص استنجاء کرے اسے چاہیئے کہ طاق ڈھیلے استعمال کرے (یعنی تین پانچ یا سات) جس نے ایسا کیا اس نے اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا کچھ گناہ نہیں اور جو شخص کچھ کھائے تو جو چیز خلال کے ذریعہ سے نکلے تو اسے چاہئے کہ پھینک دے اور جو چیز زبان سے نکلے تو اسے چاہئے کہ نگل لے جس نے ایسا کیا اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا کچھ گناہ نہیں۔ اور جو شخص پاخانہ کے لئے جائے تو اسے چاہیئے کہ پردہ کرے اگر کوئی چیز پردہ کی نہ ملے تو (کم سے کم) ریت کو جمع کر کے اس کا تودہ اپنے پیچھے کر لے اس لئے کہ شیطان بنی آدم (انسان) کے پاخانہ کے مقام سے کھیلتا ہے جس نے ایسا کیا اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا کوئی گناہ نہیں''۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

توضیح: من استجمر: استجمار استنجاء بالحجر کے معنے میں ہے اور استجمار رمی جمرات کے لئے بھی آتا ہے اور انگیٹھی میں عود ڈال کر خوشبو کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے یہاں استنجاء میں پتھر استعمال کرنا مراد ہے۔[۲]

تخلل: یعنی خلال کی لکڑی استعمال کرنے سے جو بوٹی نکل آئی ہے اس کو نہ کھائے۔[۳]

یلفظ: پھینکنے کے معنی میں ہے اور ''لاک'' یعنی زبان سے ہلا کر نکال لیا تو اسے کھائے کیونکہ پہلی صورت میں یہ بوٹی دانتوں کی آلودگی سے آلودہ ہو کر زبردستی سے باہر آتی ہے اور دوسری صورت میں ایسا نہیں ہے تو آلودہ بوٹی کو نہ کھائے غیر آلودہ کو کھائے۔[۴]

کثیبا: ریت کا تودہ اور ٹیلہ مراد ہے تاکہ پردہ ہو سکے۔[۵]

یلعب: یعنی شیطان پاخانہ کرنے والے کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ دیکھو پیچھے سے وہ آدمی آ گیا یہ آ گیا اور غیر کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ دیکھو یہ کیسا ننگا بیٹھا ہے۔[۶]

غسل خانہ میں پیشاب کرنے کا حکم

﴿۱۹﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبُولَنَّ أَحَدُكُمْ فِي مُسْتَحَمِّهِ ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ أَوْ يَتَوَضَّأُ فِيهِ فَإِنَّ عَامَّةَ الْوَسْوَاسِ مِنْهُ.

(رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ إِلَّا أَنَّهُمَا لَمْ يَذْكُرَا ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ أَوْ يَتَوَضَّأُ فِيهِ)[۷]

[۱] اخرجہ ابوداؤد ۳۵ وابن ماجہ ۳۳۷　[۲] المرقات ۲/۶۹　[۳] المرقات ۲/۶۹
[۴] المرقات ۲/۶۹　[۵] المرقات ۲/۶۹　[۶] المرقات ۲/۷۰　[۷] اخرجہ ابوداؤد ۲۷ والترمذی ۲۱

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی شخص اپنے غسل خانہ میں پیشاب نہ کرے جس میں پھر وہ نہائے یا وضو کرے (یعنی یہ عقل سے بعید ہے کہ آدمی نہانے کی جگہ پیشاب کرے اور پھر وہیں نہائے یا وضو کرے) اس لئے کہ اس سے اکثر وسواس پیدا ہوتے ہیں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) ترمذی اور نسائی نے "ثم يغتسل فيه او يتوضأ فيه" کے الفاظ ذکر نہیں کئے ہیں۔

توضیح: في مستحمه: **مستحم**، **حميم** سے مشتق ہے جس کے معنی گرم پانی کے ہیں اور چونکہ غسل خانہ میں عموماً گرم پانی ہوتا ہے اس لئے اس کو **مستحم** کہا گیا پھر یہ اطلاق عام ہوا اور ہر قسم غسل خانہ پر بولا جانے لگا خواہ پانی گرم ہو یا ٹھنڈا ہو۔[1]

فان عامة: عامۃ کسی چیز کے بڑے حصے یا پوری شئ پر بولا جاتا ہے نحاۃ اس لفظ کو حال کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اضافت کے ساتھ اس کے استعمال کو نہیں مانتے ہیں لیکن صاحب شریعت افصح العرب ﷺ نے اس کو استعمال کیا ہے تو پھر نحاۃ کو بات کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مقاصد کے خطبہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اس کو اضافت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔[2]

الوسواس: قلبی وسوسہ اور حدیث النفس کو کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے الوسواس سے ایک قسم جنون مراد لیا ہے جس کو مالیخولیا کہتے ہیں بعض نے اس سے نسیان مراد لیا ہے۔ حضرت شاہ انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ جنّوں کی چھیڑ چھاڑ سے کیا ہے۔ غسل خانہ میں پیشاب سے متعلق فقہاء کے تین اقوال ہیں۔

❶ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غسل خانہ میں مطلقاً پیشاب کرنا جائز ہے۔

❷ اور بعض علماء کے نزدیک مطلقاً مکروہ ہے۔

❸ جمہور کے نزدیک اس میں تفصیل ہے کہ اگر غسل خانہ میں منفذ ہو کہ فوراً پانی نکلتا ہو اور زمین بھی پکی ہو تو اس میں پیشاب کرنا جائز ہے اور اگر زمین نرم اور کچی ہے اور پیشاب نکلنے کے لئے راستہ اور منفذ بھی نہیں تو اس میں پیشاب کرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ جسم پر چھینٹے لگنے کا خطرہ ہے۔ محاکمہ اور فیصلہ والی بات یہ ہے کہ جس صورت میں چھینٹے پڑنے کا اندیشہ ہے وہاں پیشاب کرنا مکروہ تحریمی ہے اور جہاں اندیشہ نہیں وہاں مکروہ تنزیہی ہے کیونکہ حدیث میں کسی تفصیل کے بغیر ممانعت آئی ہے تو کسی نہ کسی کراہت سے خارج نہیں کیونکہ یہ موجب نسیان ہے اور یہ تاثیر بالخاصہ کہلاتا ہے کہ اس عمل کا اثر یہی ہے، اب اگر سبب ظاہر ہو جیسے آگ کا اثر جلانا ہے تو اس سبب کی طرف نسبت کرنا جائز ہے اور اگر سبب خفی ہو تو اس کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں بلکہ شرک کا خطرہ ہے۔[3]

ربنا الله لا شريك له: یہ جملہ مشکوۃ میں نہیں بلکہ ترمذی میں ہے اور یہ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے سننے کے بعد ارشاد فرمایا مطلب یہ ہے کہ غسل خانہ میں پیشاب کرنے کو وسوسہ پیدا کرنے کا حقیقی سبب قرار دینا شرک ہے اور

---

[1] المرقات ۲/۷۰　[2] المرقات ۲/۷۱　[3] المرقات ۲/۷۱

ہمارے رب کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اب اس کلام میں صورۃً حدیث سے معارضہ ہے مگر حقیقتاً معارضہ نہیں ہے کیونکہ وہ تو جائز ہی نہیں بلکہ صحابہ وتابعین نے تو صورۃً معارضہ کو بھی برداشت نہیں کیا اور ایسے شخص سے بائیکاٹ کیا ہے امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کو شاید حدیث نہیں پہنچی تھی اس لئے ایسا فرمایا، یا ان کے قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر **بول فی المغتسل** کو مؤثر حقیقی سمجھ لیا تو یہ شرک ہے اور اللہ تعالیٰ شرک سے پاک ہے۔

ثم یغتسل فیه: اس حدیث میں یہ ثم استبعاد یہ ہے کہ عجیب بات ہے پہلے اس میں پیشاب کرتا ہے اور پھر اس میں وضو بھی بناتا ہے اور غسل بھی کرتا ہے جس طرح آیت: "**ثم الذین کفروا بربهم یعدلون**" میں ثم استبعاد اور تعجب کے مقام میں استعمال ہوا ہے۔ **او یتوضا:** یہاں او تنویع کے لئے ہے۔[1]

﴿۲۰﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ سَرْجِسَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبُوْلَنَّ أَحَدُكُمْ فِيْ جُحْرٍ۔ (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ)[2]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "تم میں سے کوئی شخص کسی سوراخ میں پیشاب نہ کرے"۔ (ابوداؤد، نسائی)

توضیح: فی جحر: جحر پہلے جیم اور بعد میں حا ہے سوراخ کو کہتے ہیں۔ سوراخ میں پیشاب کرنے کی ممانعت اس لئے ہے کہ وہاں کئی خطرات ہیں مثلاً سانپ بچھو وغیرہ سوراخ سے نکل کر ڈنگ بھی مار سکتے ہیں نیز ان سوراخوں میں اکثر جنات کے گھر ہوتے ہیں وہ پھر ایذاء رسانی پر اتر آتے ہیں۔ جیسا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو اسی طرح واقعہ میں جنات نے تیر مار کر شہید کر دیا اور پھر غائبانہ طور پر کہا:[3]

نحن قتلنا سید الخزرج سعد بن عبادہ رمیناہ بسهم فلم نخطئ فؤادہ[4]

"ہم نے قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو قتل کر دیا ہم نے انہیں ایسا تیر مارا جو سیدھا دل میں جا کر پیوست ہو گیا"۔

﴿۲۱﴾ وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِتَّقُوا الْمَلَاعِنَ الثَّلَاثَةَ اَلْبَرَازَ فِي الْمَوَارِدِ وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ وَالظِّلِّ۔ (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ)[5]

ترجمہ: اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم تین چیزوں سے بچو جو لعنت کا سبب ہیں: ① گھاٹوں پر پیشاب پاخانہ کرنے سے ② راستہ کے درمیان اور ③ سایہ میں پیشاب و پاخانہ کرنے سے"۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

[1] المرقات ۲/۷۰ [2] اخرجه ابوداؤد ۲۹ والنسائی ۱/۳۳
[3] المرقات ۲/۷۲ [4] المرقات ۲/۷۲ [5] اخرجه ابوداؤد ۲۶ وابن ماجه ۳۲۸

قضائے حاجت کے وقت باتیں کرنا منع ہے

﴿۲۲﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا يَخْرُجُ الرَّجُلَانِ يَضْرِبَانِ الْغَائِطَ كَاشِفَيْنِ عَنْ عَوْرَتِهِمَا يَتَحَدَّثَانِ فَإِنَّ اللهَ يَمْقُتُ عَلَى ذٰلِكَ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ)[1]

ترجمہ: اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''(ایک ساتھ) دو شخص پاخانہ کے لئے (اس طرح) نہ جائیں کہ دونوں اپنی شرمگاہ کھولے ہوئے ہوں اور باتیں کرتے ہوں کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ غضب ناک ہو جاتا ہے''۔ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

توضیح: **یضربان الغائط:** یعنی پاخانہ کے لئے جارہے تھے تو یضربان ضرب سے چلنے کو کہتے ہیں "ضرب فی الارض ای ذھب" جب اس کے ساتھ الغائط آگیا تو یہ یفعلان کے معنی میں ہوگیا یعنی **یفعلان الغائط**۔ بعض علماء نے یضربان چلنے ہی کے معنی میں لے لیا ہے۔ لیکن الغائط کو للغائط منصوب بنزع الخافض مانا ہے تو معنی یہ ہوا کہ دونوں ایک ساتھ پاخانہ کے لئے گئے اور شرمگاہیں کھول کر بیٹھ گئے۔[2]

یتحدثان: اور باتیں کرنے لگے یہ موجب غضب الٰہی عمل ہے اس میں مرد بھی کسی زمانہ میں مبتلا تھے لیکن عورتیں تو آج کل دیہاتوں میں ایک ساتھ بیٹھ کر خوب باتیں کرتی ہیں اور اس سے نہیں شرماتی ہیں یہ بڑی بے حیائی ہے اور غضب الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔[3]

بیت الخلاء میں جانے کی دعا

﴿۲۳﴾ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ هٰذِهِ الْحُشُوْشَ مُحْتَضَرَةٌ فَإِذَا أَتَى أَحَدُكُمُ الْخَلَاءَ فَلْيَقُلْ أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔ (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ)[4]

ترجمہ: اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''پاخانے کی جگہیں شیاطین اور جنات کے حاضر ہونے کی جگہیں ہیں اس لئے جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء جائے تو اسے چاہیئے کہ یہ دعا پڑھے۔ "اعوذ باللہ من الخبث والخبائث" یعنی میں ناپاک جنوں اور جنیوں سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں''۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

﴿۲۴﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ سِتْرُ مَا بَيْنَ أَعْيُنِ الْجِنِّ وَعَوْرَاتِ بَنِي آدَمَ إِذَا دَخَلَ أَحَدُهُمُ الْخَلَاءَ أَنْ يَقُوْلَ بِسْمِ اللهِ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَإِسْنَادُهُ لَيْسَ بِقَوِيٍّ)[5]

---

[1] اخرجہ احمد ۳/۳۶ وابوداؤد ۱۵ وابن ماجہ ۳۴۲ [2] المرقات ۲/۷۳

[3] المرقات ۲/۷۳ [4] اخرجہ ابوداؤد وابن ماجہ ۲۹۶ [5] اخرجہ الترمذی ۶۰۶

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی شخص پاخانہ کی جگہ میں داخل ہو تو جن (شیطان) کی آنکھوں اور انسان کی شرمگاہ کے درمیان کا پردہ یہ ہے کہ **بسم اللہ** کہے اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند قوی نہیں ہے۔

بیت الخلاء سے نکلنے کی دعا

﴿۲۵﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ قَالَ غُفْرَانَكَ۔
(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب پاخانہ سے باہر تشریف لاتے تو فرماتے غفرانک یعنی اے اللہ میں تیری بخشش کا خواستگار ہوں۔ (ترمذی، ابن ماجہ، داری)

توضیح: **غفرانك:** یہ لفظ اغفر امر کے لئے مفعول مطلق ہے ای اغفر غفرانك اور صاحب کافیہ نے کہا کہ ایسے مقامات میں فعل کا حذف کرنا واجب ہوجاتا ہے اب یہاں سوال یہ ہے کہ اس عمل کے بعد استغفار کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا اس نے بیت الخلاء میں جا کر کوئی گناہ کیا اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک آدمی بیت الخلاء میں رہتا ہے تو وہ شیطان کے پڑوس میں ہوتا ہے اور اندر ذکر کرنے سے محروم رہتا ہے اس کوتاہی پر استغفار کرتا ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ غذا کھا کر ہضم ہونے اور کھل کر پاخانہ آنے سے آدمی کو بہت راحت ملتی ہے اس کا بہت بڑا شکر ادا کرنا چاہیے اس بڑے شکر میں کوتاہی کی وجہ سے استغفار کر رہا ہے تاکہ کوتاہی کا اثر بھی زائل ہوجائے۔ یا بیت الخلاء میں قلبی ذکر جاری تھا اس میں غیر اختیاری بے ادبی پر استغفار کرتا ہے۔[2]

﴿۲۶﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَتَى الْخَلَاءَ أَتَيْتُهُ بِمَاءٍ فِي تَوْرٍ أَوْ رَكْوَةٍ فَاسْتَنْجَى ثُمَّ مَسَحَ يَدَهُ عَلَى الْأَرْضِ ثُمَّ أَتَيْتُهُ بِإِنَاءٍ آخَرَ فَتَوَضَّأَ۔ (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَرَوَى الدَّارِمِيُّ وَالنَّسَائِيُّ مَعْنَاهُ)[3]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب قضاء حاجت کے لئے جاتے تو میں آپ کے لئے پیالہ یا چمڑے کی چھاگل میں پانی لاتا آپ اس سے استنجاء کرتے پھر ہاتھ کو زمین پر رگڑتے پھر اس کے بعد میں پانی کا دوسرا برتن لاتا اور آپ وضو فرماتے۔ (ابوداود، دارمی، نسائی)

توضیح: **فی تور:** یہ پیتل کے برتن اور لوٹے کو کہتے ہیں "او" یہ لفظ راوی کے شک کی بنیاد پر ہے کہ پانی کا وہ برتن پیتل کا تھا یا پتھر کا یا وہ چمڑے سے بنا ہوا برتن تھا جس کو چھاگل کہتے ہیں یہاں او تنویع کے لئے بھی لیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ برتن کس نوع کا تھا۔[4]

---

[1] اخرجه الترمذی ۷، وابن ماجه ۳۰۰ والدارمی ۶۸۶ [2] المرقات ۲/۷۵

[3] اخرجه ابو داؤد ۴۵ والدارمی ۶۷۸ والنسائی ۱/۴۵ [4] المرقات ۲/۷۶

ثم مسح: یعنی بدبو دور کرنے کے لئے استنجاء کے بعد آپ ﷺ زمین سے ہاتھ رگڑ لیا کرتے تھے یہ امت کی تعلیم کے لئے تھا۔ ورنہ آپ ﷺ کی قضاء حاجت میں بدبو نہ تھی۔[1]

باناء آخر: علماء نے لکھا ہے کہ استنجاء اور وضو کے لئے اگر الگ الگ دو برتن ہوں تو یہ بہتر اور مستحب ہے یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے یا یہ کہ پہلے برتن میں پانی اتنا ہی ہوتا تھا جس سے صرف استنجاء ہوسکتا تھا اس لئے بعد میں وضو کیلئے نیا برتن لایا جاتا تھا۔[2]

شرمگاہ پر چھینٹیں دینے کا مطلب

﴿۲۷﴾ وَعَنِ الْحَكَمِ بْنِ سُفْيَانَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا بَالَ تَوَضَّأَ وَنَضَحَ فَرْجَهُ۔ (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ)[3]

ترجمہ: اور حکم بن سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب پیشاب کر چکتے تو وضو فرماتے اور اپنی شرمگاہ پر چھینٹا دیتے۔ (ابوداؤد، نسائی)

توضیح: ونضح فرجه: انتضاح چھینٹیں دینے کے معنی میں ہے اس کا پہلا اور واضح مطلب یہ ہے کہ جب وضو کرلو تو سامنے کی طرف جواز ار یا شلوار ہے اس میں چھینٹیں مارو تاکہ بول کے قطرات کا وسوسہ نہ آئے اور رفتہ رفتہ آدمی شکی اور وسواسی نہ بن جائے تو جب ان کو شک آئے گا کہ یہ تری پیشاب کے قطروں سے ہے تو وہ کہے گا کہ یہ تو چھینٹے ہیں جو میں نے ابھی دیئے ہیں یہ انتضاح وضو سے فراغت کے بعد ہے آئندہ حدیثوں میں بھی یہ حکم مذکور ہے۔ صوفیاء کے ہاں اس کا نام "بل السراویل" ہے اس عمل سے وسوسہ ختم ہوجاتا ہے۔ بعض نے نضح سے شرمگاہ پر چھینٹے مارنے کا مطلب اخذ کیا ہے تاکہ اس سے بول کے قطرات دفع ہوجائے بہر حال جن لوگوں کو یقینی طور پر یہ قطرات آنے کی بیماری ہے وہ ایسا نہ کریں بلکہ قطرات کے بند ہونے کے یقین تک انتظار کرے۔[4]

بیماری یا مجبوری کی وجہ سے برتن میں پیشاب کرنا

﴿۲۸﴾ وَعَنْ أُمَيْمَةَ بِنْتِ رُقَيْقَةَ قَالَتْ كَانَ لِلنَّبِيِّ ﷺ قَدَحٌ مِنْ عَيْدَانٍ تَحْتَ سَرِيْرِهِ يَبُوْلُ فِيْهِ بِاللَّيْلِ۔ (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ)[5]

ترجمہ: اور حضرت امیمة بنت رقیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے پاس لکڑی کا ایک پیالہ تھا جو آپ کی چارپائی کے نیچے رکھا رہتا تھا آپ ﷺ رات کو اس میں پیشاب کرلیا کرتے تھے۔ (ابوداؤد، نسائی)

[1] المرقات ۲/۷۶ [2] المرقات ۲/۷۶ [3] اخرجه ابو داؤد ۱۶۶ والنسائی ۱/۸۶

[4] المرقات ۲/۷۷ [5] اخرجه ابو داؤد ۲۴ والنسائی ۱/۳۱

توضیح: **من عیدان:** اس لفظ کو صاحب ازھار نے عُود سے لیا ہے یعنی یہ پیالہ لکڑیوں میں سے کسی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ علامہ میرک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے کہ عیدان عود کی جمع ہے اور عود سے مراد لکڑی ہے علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لکڑی کے مختلف اجزاء کی وجہ سے جمع کا کلمہ لایا گیا ہے ان تمام صورتوں میں عیدان عین کے کسرہ کے ساتھ ہوگا۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محققین نے جو بات لکھی ہے وہی صحیح ہے اور وہ یہ کہ عیدان عین کے فتح کے ساتھ ہے کسرہ نہیں ہے۔ چنانچہ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ عیدان فتح کے ساتھ کھجور کے لمبے درخت کو کہتے ہیں اس کا مفرد "عیدانہ" ہے اور اسی کی لکڑی سے یہ پیالہ بنایا گیا تھا۔[1]

تحت سریرہ: اس جیسی احادیث پر بعض لوگ شک کرتے ہیں یا اس کو عجیب وغریب سمجھتے ہیں حالانکہ ان کو یہ سوچنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دنیا دشمن تھی آپ کے لئے رات کے وقت نکلنے میں جان کا کتنا خطرہ تھا اس وجہ سے اگر آپ نے پیشاب کا انتظام گھر کے اندر کرلیا تو اس میں کیا تعجب ہے کیا آج کل لوگ نہایت عالیشان کمرہ میں باتھ روم نہیں بناتے ہیں؟ جہاں پیشاب نہیں بلکہ پاخانہ کرتے ہیں۔ نیز رات کو نکلنے میں سردی کی کتنی تکلیف تھی نیز سانپ اور بچھو کے کاٹنے کا خوف کتنا یقینی تھا اور ہوسکتا ہے کہ یہ معاملہ بیماری کے زمانے کا ہو پھر تو کوئی بات ہی نہیں۔ بہرحال ان وجوہات کی بنیاد پر آپ کے لئے چارپائی کے نیچے برتن رکھا جاتا تھا اور صبح اس پیشاب کو پھینکا جاتا تھا۔ صاحب مظاہر حق نے لکھا ہے کہ کسی نے غلطی سے ایک دفعہ یہ پیشاب پی لیا تھا تو ان کے بدن سے خوشبو مہک اٹھی۔ سریر کے لفظ سے ثابت ہوگیا کہ چارپائی پر سونا جائز ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چارپائی استعمال فرمائی ہے اگرچہ یہ کبھی کبھی ہوا ہے۔[2]

کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کا حکم

﴿۲۹﴾ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ رَآنِي النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم وَأَنَا أَبُولُ قَائِمًا فَقَالَ يَا عُمَرُ لَا تَبُلْ قَائِمًا فَمَا بُلْتُ قَائِمًا بَعْدُ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ) قَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مُحْيِي السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللهُ قَدْ صَحَّ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ أَتَى النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ قِيلَ كَانَ ذٰلِكَ لِعُذْرٍ)[3]

ترجمہ: اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک روز) مجھے کھڑے ہوکر پیشاب کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا عمر کھڑے ہوکر پیشاب نہ کیا کرو چنانچہ اس کے بعد میں نے کبھی کھڑے ہوکر پیشاب نہیں کیا (ابن ماجہ، ترمذی) امام محی السنۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم کے کوڑے کرکٹ کی جگہ پر گئے اور وہاں کھڑے ہوکر پیشاب کیا (بخاری ومسلم) کہا جاتا ہے کہ آپ کا یہ فعل کھڑے ہوکر پیشاب کرنا کسی عذر کی بناء پر تھا۔

توضیح: **یا عمر لا تبل قائما:** عرب بیٹھ کر پیشاب کرنے سے بچتے تھے اور اس کو عورتوں کا طرز عمل سمجھتے تھے

[1] المرقات ۲/۷۷ [2] المرقات ۲/۷۷ [3] اخرجہ الترمذی ۱۲ وابن ماجہ ۳۰۸۲

اور مردوں کی بلندی اور شہامت اس میں سمجھتے تھے کہ وہ کھڑے ہو کر پیشاب کریں اسی اصول کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر پیشاب کر رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے انہیں دیکھ کر منع فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر عمر بھر کبھی میں نے ایسا نہیں کیا اب فقہی مسئلہ یہ ہے کہ متفقہ طور پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنا مکروہ ہے ہاں اس میں اختلاف ہے کہ مکروہ تحریمی ہے یا مکروہ تنزیہی ہے بعض علماء کے نزدیک یہ مکروہ تحریمی ہے اور بعض کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے ضابطہ اور قاعدہ یہی ہے ہاں اگر کہیں آنحضرت ﷺ سے کھڑے ہو کر پیشاب کا ذکر آیا ہے تو اس کو عذر پر حمل کیا جائے گا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے جواز کا ایک قول منقول ہے اوپر جو مسئلہ بیان ہوا ہے یہ جمہور کا مسلک ہے حضرت شاہ انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اب شعائر کفار میں سے ہو گیا ہے لہٰذا حرام ہے مزید تفصیل ساتھ والی روایت میں ملاحظہ کریں۔ [۱]

الفصل الثالث

بیٹھ کر پیشاب کرنا مسنون ہے

﴿۳۰﴾ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَنْ حَدَّثَكُمْ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَبُوْلُ قَائِمًا فَلَا تُصَدِّقُوْهُ، مَاكَانَ يَبُوْلُ إِلَّا قَاعِدًا۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ) [۲]

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ جو شخص یہ حدیث بیان کرے کہ سرکار دو عالم ﷺ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے تو اسے سچ نہ مانو آپ ﷺ نے ہمیشہ بیٹھ کر پیشاب کیا ہے۔ (احمد، ترمذی، نسائی)

توضیح: فلا تصدقوہ: اس روایت میں اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی "سباطة قوم" والی روایت میں بظاہر تعارض ہے اس میں آنحضرت ﷺ سے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا عمل منقول ہے اور یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بالکل نفی کرتی ہیں۔

اس کا جواب اور دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی معلومات اور گھر کے اعمال وعادات کے متعلق فرمایا ہے تو وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت باہر کے ماحول سے متعلق ہے وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے یا یوں کہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عام عادت کے متعلق فرمایا ہے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت ایک نادر واقعہ سے متعلق ہے۔ اور نادر معدوم کے حکم میں ہوتا ہے یا حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت استثنائی صورت پر محمول ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے قاعدہ کلیہ بیان فرمایا ہے تو کوئی تعارض نہیں ہے۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں آنحضرت ﷺ کو کیا عذر تھا تو بعض علماء نے لکھا ہے کہ بیان جواز کے لئے کیا اگرچہ کراہت تنزیہی ہو کیونکہ امت کی سہولت کے لئے کبھی کبھی آپ ﷺ نے کراہت تنزیہی والا کام کیا ہے تاکہ لوگ حرام نہ

---

[۱] المرقات ۲/۷۸ [۲] اخرجه احمد ۶/۳۸۶ والترمذی ۱۳ والنسائی ۱/۱۹

سمجھیں تو آپ ﷺ کے لئے کراہت بھی نہیں تھی۔
بعض نے کہا کہ آپ کے گھٹنے میں تکلیف تھی بیٹھنا مشکل تھا، بعض نے کہا کہ بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی مجبوری تھی، بعض نے کہا کہ آپ کی کمر میں تکلیف تھی اور اس درد کا علاج کھڑے ہو کر پیشاب میں تھا۔[۱]

﴿۳۱﴾ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ جِبْرِيْلَ أَتَاهُ فِي أَوَّلِ مَا أُوحِيَ إِلَيْهِ فَعَلَّمَهُ الْوُضُوْءَ وَالصَّلَاةَ فَلَمَّا فَرَغَ مِنَ الْوُضُوْءِ أَخَذَ غُرْفَةً مِنَ الْمَاءِ فَنَضَحَ بِهَا فَرْجَهُ.
(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالدَّارَقُطْنِيُّ)[۲]

ترجمہ: اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سرکار دو عالم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام (جب) سب سے پہلے وحی کے موقع پر آپ کے پاس تشریف لائے تو آپ کو وضو کرنا سکھایا، پھر نماز پڑھنی سکھلائی چنانچہ جب وضو سے فارغ ہوئے تو ایک چلو پانی لیا اور اس کو اپنی شرمگاہ پر چھڑک لیا۔ (احمد، دارقطنی)

﴿۳۲﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ جَاءَنِي جِبْرِيْلُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ إِذَا تَوَضَّأْتَ فَانْتَضِحْ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَسَمِعْتُ مُحَمَّدًا يَعْنِي الْبُخَارِيَّ يَقُوْلُ: الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ الْهَاشِمِيُّ الرَّاوِيْ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ)[۳]

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا اے محمد ﷺ جب آپ وضو کریں تو تھوڑا سا پانی (شرمگاہ پر دفع وسواس کے لئے چھڑک لیا کیجئے، ترمذی) اور امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث منکر ہے اور میں نے محمد (یعنی امام بخاری) کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اس حدیث کے راوی حسن بن علی ہاشمی منکر الحدیث ہیں۔

﴿۳۳﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ بَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَقَامَ عُمَرُ خَلْفَهُ بِكُوْزٍ مِنْ مَاءٍ فَقَالَ مَا هٰذَا يَا عُمَرُ قَالَ مَاءٌ تَتَوَضَّأُ بِهِ قَالَ مَا أُمِرْتُ كُلَّمَا بُلْتُ أَنْ أَتَوَضَّأَ وَلَوْ فَعَلْتُ لَكَانَتْ سُنَّةً.
(رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه)[۴]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ نے پیشاب کیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پانی کا لوٹا لے کر آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا عمر یہ کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا آپ کے وضو کے لئے آپ نے فرمایا مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جب بھی میں پیشاب کروں تو وضو بھی کروں اگر میں ایسا کرتا تو یہ (میرا فعل) سنت ہو جاتا۔ (ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

[۱] المرقات ۲/۷۹ الکاشف ۵۸ [۲] اخرجہ احمد ۴/۱۶۱ والدار قطنی
[۳] اخرجہ الترمذی ۵۰ [۴] اخرجہ ابو داؤد ۴۲ والترمذی

استنجاء کے آداب

﴿۳۴﴾ وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ وَجَابِرٍ وَأَنَسٍ أَنَّ هٰذِهِ الْآيَةَ لَمَّا نَزَلَتْ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَّتَطَهَّرُوا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَثْنٰى عَلَيْكُمْ فِي الطُّهُوْرِ فَمَا طُهُوْرُكُمْ قَالُوْا نَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ وَنَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ وَنَسْتَنْجِيْ بِالْمَاءِ قَالَ فَهُوَ ذَاكَ فَعَلَيْكُمُوْهُ۔
(رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ)[1]

ترجمہ: حضرت ابوایوب، حضرت جابر، حضرت انس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی فیہ رجال یحبون ان یتطھروا واللہ یحب المطھرین یعنی مسجد قبا میں ایسے مرد ہیں جو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ خوب پاکی حاصل کریں اور اللہ خوب پاکی حاصل کرنے والوں کو پسند رکھتا ہے تو سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا اے انصار کی جماعت اللہ تعالیٰ نے پاکی کے معاملے میں تمہاری تعریف کی ہے۔ بتاؤ تمہاری پاکی کیا ہے انہوں نے عرض کیا کہ ہم نماز کے لئے وضو کرتے ہیں جنابت (ناپاکی) سے غسل کرتے ہیں (جیسا کہ دوسرے مسلمان کرتے ہیں) اور ڈھیلے کے بعد پانی سے استنجاء کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں! وہ یہی ہے لہٰذا اسے لازم پکڑو۔ (ابن ماجہ)

توضیح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ **استنجاء بالماء** افضل ہے استنجاء کی کل تین صورتیں ہیں۔

1. صرف ڈھیلے اور پتھر استعمال کر کے استنجاء کیا جائے۔
2. صرف پانی استعمال کر کے استنجاء کیا جائے۔
3. پتھر اور پانی دونوں استعمال کر کے استنجاء کیا جائے۔ فقہاء کے نزدیک یہ تینوں صورتیں جائز ہیں۔

اگرچہ بعض مالکیہ اور سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ نے پانی سے صفائی کو ناجائز کہا ہے مگر جمہور فقہاء کے نزدیک جائز اور افضل ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث میں اس کی تصریح موجود ہے اور حضور ﷺ سے اس پر مداومت ثابت ہے۔ اب فقہاء کرام اور جمہور امت کے نزدیک پانی اور ڈھیلے دونوں کو جمع کر کے استنجاء کی صورت سب سے افضل ہے اور کئی احادیث سے یہ جمع ثابت ہے تعدد طرق سے حدیث میں قوت آجاتی ہے۔ نیز فقہاء کے تعامل سے بھی حدیث قوی ہو جاتی ہے اس کے بعد پانی سے استنجاء افضل ہے اور پھر صرف پتھر کا درجہ ہے۔

مسلمان اپنے معاملات میں کسی کے محتاج نہیں

﴿۳۵﴾ وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ بَعْضُ الْمُشْرِكِيْنَ وَهُوَ يَسْتَهْزِئُ إِنِّيْ لَأَرٰى صَاحِبَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ حَتّٰى الْخِرَاءَةَ قُلْتُ أَجَلْ أَمَرَنَا أَنْ لَّا نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ وَلَا نَسْتَنْجِيْ بِأَيْمَانِنَا وَلَا نَكْتَفِيْ بِدُوْنِ ثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ لَيْسَ فِيْهَا رَجِيْعٌ وَلَا عَظْمٌ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَأَحْمَدُ وَاللَّفْظُ لَهُ)[2]

[1] اخرجہ ابن ماجہ ۳۵۵ [2] اخرجہ مسلم ۱/۱۵۴ واحمد ۵/۴۳۷

ترجمہ: اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مشرکوں میں سے ایک شخص نے بطور استہزاء یہ کہا کہ میں تمہارے سردار (یعنی آنحضرت ﷺ) کو دیکھتا ہوں کہ وہ تمہیں ہر چیز سکھاتے ہیں یہاں تک کہ پاخانہ میں بیٹھنے کی صورت بھی (سکھاتے ہیں) میں نے کہا ہاں آپ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ (استنجاء کے وقت) ہم قبلہ کی طرف رخ کر کے نہ بیٹھیں اپنے دائیں ہاتھوں سے استنجاء نہ کریں تین پتھروں سے کم سے استنجاء نہ کریں اور ان پتھروں میں نجاست (یعنی پاخانہ، لید و گوبر) نہ ہو اور نہ ہڈی ہو۔ (مسلم، احمد) الفاظ احمد کے ہیں۔

توضیح: **الخراءة:** خا کے کسرہ اور را پر مد کے ساتھ پاخانہ کے لئے بیٹھنے کی کیفیت کو کہتے ہیں اور نفس پاخانہ پر اس کا اطلاق "تا" کے حذف کے وقت ہوتا ہے یعنی **الخراء والخراء**۔

لیکن اکثر راویوں نے خا کو مفتوح اور را کو بغیر مد کے پڑھا یعنی خرا۔ اصل میں یہ لفظ پرندوں کی بیٹ کیلئے استعمال ہوتا ہے مگر یہاں قضاء حاجت کے لئے استعمال ہوا ہے اس لفظ سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی **ادب الخراءة** مطلب یہ ہوا کہ تم کو یہ نبی پاخانہ کرنے کا ادب سکھاتا ہے چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تعلیم دیتا ہے اور بدیہی چیزوں کی بلا ضرورت تعلیم دیتا ہے اس مشرک کی طرف سے یہ کلام استہزاء اور مذاق تھا کہ پاخانہ کا طریقہ سکھاتے ہیں تمہیں بچہ بنا رکھا ہے؟[1]

قلت اجل: یعنی ہاں ہمیں وہ نبی یہ چیزیں سکھاتے ہیں۔[2]

اب سوال یہ ہے کہ اس مشرک نے دین کا مذاق اڑا کر اعتراض کیا اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے "اجل" کہہ کر اس کو تسلیم کر لیا کیا یہ جائز تھا؟ جواب یہ ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اسلوب حکیم کے طور پر جواب دیا ہے جس کو علم المعانی والے **مماشات مع الخصم** اور **ارخاء العنان** کہتے ہیں تا کہ وہ جواب سننے کے لئے خوب متوجہ اور تیار ہو جائے گویا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے جانور! سن لو یہ تعلیمات آسمانی ہیں جو مدرک بالعقل نہیں ہیں یہ بدیہیات نہیں ہیں تم بیوقوف ہو کہ اس کو عقل کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرتے ہو دیکھو ہمیں نبی ﷺ نے حکم دیا ہے کہ ہم قبلہ کی طرف قضاء حاجت کے وقت منہ نہ کریں یہ حق [illegible] یہ حکم ہے دائیں ہاتھ سے استنجاء نہ کریں یہ حق النفس ہے اور پھر حکم دیا کہ ہڈی و گوبر سے استنجاء نہ کریں یہ حق الاخوان ہے تو اس تعلیم میں حق النفس اور حق العباد تینوں آگئے جو مکمل شریعت ہے اس کا مذاق اڑانا حماقت ہے۔

﴿۳۶﴾ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ حَسَنَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَفِي يَدِهِ الدَّرَقَةُ فَوَضَعَهَا ثُمَّ جَلَسَ فَبَالَ اِلَيْهَا فَقَالَ بَعْضُهُمْ اُنْظُرُوْا اِلَيْهِ يَبُوْلُ كَمَا تَبُوْلُ الْمَرْأَةُ فَسَمِعَهُ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ وَيْحَكَ اَمَا عَلِمْتَ مَا اَصَابَ صَاحِبَ بَنِي اِسْرَائِيْلَ كَانُوْا اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَوْلُ قَرَضُوْهُ بِالْمَقَارِيْضِ فَنَهَاهُمْ فَعُذِّبَ فِي قَبْرِهِ. (رَوَاهُ اَبُوْ دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ النَّسَائِيُّ عَنْهُ عَنْ اَبِي مُوْسٰى)[3]

---

[1] المرقات ۲/۸۳　[2] المرقات ۲/۸۳　[3] اخرجه ابو داؤد ۲۲ وابن ماجه ۳۴۶

ترجمہ: اور حضرت عبدالرحمن بن حسنہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) سرکار دو عالم ﷺ (گھر سے) نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے (اس وقت) آپ ﷺ کے ہاتھ میں ڈھال تھی۔ اسے آپ ﷺ نے (اپنے سامنے) زمین پر رکھ دیا پھر اس کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کیا (یہ دیکھ کر) ایک مشرک نے کہا ان کی طرف دیکھو اس طرح پیشاب کرتے ہیں جیسے عورت پیشاب کرتی ہے یہ بات آنحضرت ﷺ نے سن لی اور فرمایا تجھ پر افسوس ہے، کیا تو اس چیز کو نہیں جانتا جو بنی اسرائیل کے ساتھی کو پہنچی (یعنی عذاب) بنی اسرائیل (جب پیشاب کرتے اور ان) کے جسم کپڑے کو پیشاب لگ جاتا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے چنانچہ (بنی اسرائیل میں سے) ایک شخص نے (اس حکم کو ماننے سے) لوگوں کو روکا لہٰذا اسے قبر کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی نے اس حدیث کو عبدالرحمن سے اور انہوں نے ابوموسیٰ سے روایت کیا ہے)

توضیح: الدرقة: یہ اس ڈھال کو کہتے ہیں جو خالص کھال اور چمڑے سے بنی ہوئی ہو جس میں لوہا لکڑی وغیرہ نہ ہو۔[1]

بعضهم: اس سے یا کوئی مشرک مراد ہے یا کوئی منافق تھا ثانی واضح ہے۔[2]

كما تبول المرأة: عورت بیٹھ کر پیشاب کرتی ہے کیونکہ وہ کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کر سکتی ہے عرب میں مرد کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے اور اس کو مردوں کی نشانی سمجھتے تھے۔[3]

ويحك: یہ کلمہ واضع نے بددعا کے لئے وضع کیا ہے لیکن اس کا اکثر استعمال بددعا کے علاوہ میں ہوتا ہے۔[4]

قرضوه بالمقاريض: بنی اسرائیل کے مشکل اور شاق احکامات میں سے ایک حکم یہ تھا کہ اگر بدن کے ساتھ نجاست لگ جاتی تو بدن کا وہ حصہ چھیلنا اور کاٹنا پڑتا اور اگر کپڑا پلید ہو جاتا تو اس کو بھی کاٹنا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں ایک شخص نے اس حکم سے انکار کیا اور لوگوں کو بھی منع کیا تو اس شخص کو اس بے احتیاطی کی وجہ سے قبر میں عذاب ہو گیا کیونکہ وہ پیشاب سے نہ بچ سکا۔

یہاں نبی اکرم ﷺ کے پیشاب کرتے وقت بیٹھنے پر اعتراض کرنے والے اور بنی اسرائیل کے آدمی میں کیا مناسبت ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص کی مثال دی۔ تو اصل بات یہ ہوئی کہ دیکھو بنی اسرائیل کے آدمی نے ان کی شریعت کے ایک معروف اور اچھے کام سے روکنے کی کوشش کی تو اس کا انجام کتنا برا ہوا کہ عذاب میں مبتلا ہو گیا اسی طرح تم بھی ایک نیک کام سے روکنے کی کوشش کرتے ہو تو تم کو بھی اسی طرح قبر کا عذاب ہوگا کیونکہ بے احتیاطی کرو گے اور پیشاب لگے گا تو عذاب ہوگا۔[5]

﴿۳۷﴾ وَعَنْ مَرْوَانَ الْأَصْفَرِ قَالَ رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ أَنَاخَ رَاحِلَتَهُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ ثُمَّ جَلَسَ يَبُوْلُ إِلَيْهَا فَقُلْتُ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ أَلَيْسَ قَدْ نُهِيَ عَنْ هٰذَا قَالَ بَلْ إِنَّمَا نُهِيَ عَنْ ذٰلِكَ فِي الْفَضَاءِ فَإِذَا كَانَ بَيْنَكَ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ شَيْءٌ يَسْتُرُكَ فَلَا بَأْسَ. (رواه أبو داؤد)[6]

---

[1] المرقات ۲/۸۴ [2] المرقات ۲/۸۴ [3] المرقات ۲/۸۴ [4] المرقات ۲/۸۴ [5] المرقات ۲/۸۵ [6] اخرجه ابو داؤد: ۱۱

ترجمہ: اور حضرت مروان اصفر سے روایت ہے کہ میں نے (ایک مرتبہ) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنا اونٹ قبلہ کی طرف بٹھایا! پھر خود بیٹھے اور اونٹ کی طرف پیشاب کیا میں نے (یہ دیکھ کر) عرض کیا ابوعبدالرحمن (یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) کیا اس طرح قبلہ کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنے سے منع نہیں فرمایا گیا انہوں نے فرمایا جنگل میں اس سے منع فرمایا گیا ہے لیکن جب تمہارے اور قبلہ کے درمیان کوئی چیز حائل ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ (ابوداؤد)

توضیح: یہ ایک صحابی کی اپنی رائے اور ان کا عمل ہے مرفوع احادیث کی یہ روایت مقابلہ نہیں کر سکتی ہے تفصیل گزر چکی ہے۔

﴿۳۸﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذٰى وَعَافَانِي۔ (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه)[۱]

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب بیت الخلاء سے نکلتے تو یہ دعا پڑھتے: الحمد لله الذی اذهب عنی الاذیٰ وعافانی یعنی تمام تعریفیں خدا ہی کو زیبا ہیں جس نے مجھ سے گندی اور تکلیف دہ چیز (یعنی پاخانہ) کو دور کیا اور مجھے عافیت بخشی۔ (ابن ماجہ)

ہڈی اور گوبر سے استنجاء کی ممانعت

﴿۳۹﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ وَفْدُ الْجِنِّ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْهَ أُمَّتَكَ أَنْ يَسْتَنْجُوْا بِعَظْمٍ أَوْ رَوْثَةٍ أَوْ حُمَمَةٍ فَإِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ لَنَا فِيْهَا رِزْقًا فَنَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[۲]

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جنات کی جماعت سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس نے آپ سے عرض کیا "یا رسول اللہ آپ اپنی امت کو منع فرما دیجئے کہ وہ گوبر، ہڈی اور کوئلہ سے استنجاء نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے ہمارا رزق پیدا کیا ہے"، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں ان (چیزوں کے استعمال) سے منع فرمایا۔ (ابوداؤد)

[۱] اخرجه ابن ماجه ۳۰۱ [۲] اخرجه ابو داؤد: ۳۹

۲۳ صفر الخیر ۱۴۱۰ھ

باب السواك

مسواک کا بیان

سواك : مسواک استعمال کرنے پر بھی بولا جاتا ہے اور مسواک کی لکڑی پر بھی بولا جاتا ہے۔ ابن ملک فرماتے ہیں کہ سواک مسواک کرنے کو بھی کہتے ہیں اور مسواک کی لکڑی کو بھی کہتے ہیں۔ مسواک اس لکڑی کا نام ہے جس سے دانت مل کر صاف کئے جاتے ہیں۔ "مایدلك به الاسنان" عرب کہتے ہیں **ساك فاه يسو كه** جب اس کا مفعول بہ مذکور ہو تو **ساك فاه** کہتے ہیں اور جب مفعول بہ مذکور نہ ہو تو **استاك** کہتے ہیں سواک کتاب کی طرح ہے جس کی جمع بھی **سُوُكٌ** **كُتُبٌ** کی طرح آتی ہے۔ اور مسواک کی جمع **مساويك** بھی آتی ہے چنانچہ امرأ القیس اپنی محبوبہ کی انگلیوں کی تعریف میں کہتا ہے:[1]

وَتَعۡطُوۡ بِرَخۡصٍ غَيۡرِ شَثۡنٍ كَاَنَّهَا   اَسَارِيۡعُ ظَبۡيٍ اَوۡ مَسَاوِيۡكُ اَسۡحَلٖ

سب سے افضل مسواک زیتون کی ہے پھر پیلو کی ہے یعنی جس لکڑی میں کڑواہٹ زیادہ ہو وہ عمدہ ہے۔ ملیٹھی کی مسواک بھی ملتی ہے جو بہت ہی عمدہ ہوتی ہے برش اور ٹوتھ پیسٹ سے مسواک کی سنت ادا نہیں ہوتی ہے اگر چہ دانت صاف ہو جاتے ہیں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے مسواک کی سنیت پر اجماع نقل کیا ہے اور مسواک پر تواتر عملی ہے۔ علماء نے مسواک کے ستر (۷۰) سے زیادہ فوائد لکھے ہیں ایک بڑا فائدہ یہ کہ موت کے وقت کلمہ شہادت نصیب ہوتا ہے، مسواک کرنے کا مستحب طریقہ عرضاً یعنی چوڑائی میں استعمال کرنے کا ہے اگر چہ طولاً بھی جائز ہے مگر اس سے زخم آنے کا خطرہ ہے جس شخص کے دانت نہ ہوں اس کے لئے انگلی مسواک کے قائمقام ہے، عورتیں بھی مسواک کرسکتی ہیں مگر ان کے لئے دنداسہ بھی مسواک ہے جو زیادہ مناسب ہے۔ جس شخص کے پاس مسواک نہ ہو تو روایت سے ثابت ہے کہ انگلی مسواک کی جگہ لے سکتی ہے۔[2]

مسواک کی مقدار:

مسواک کی مقدار ایک بالشت ہونی چاہیئے، موٹائی میں انگوٹھے کے برابر ہو، پتلے پن میں چھنگلی کے برابر ہو، اگر بالشت سے زیادہ لمبی ہو تو اگر خریدی ہے تو اس کو کاٹنا صحیح نہیں ہے کہ اسراف ہے اگر کسی نے عطیہ دی ہے تو زائد کو کاٹ کر ضائع کیا جا سکتا ہے، استعمال کے بعد جب چار انگلی کے برابر رہ جائے تو کسی جگہ میں دفن کر دی جائے، استعمال کے بعد مسواک کے رکھنے کا ادب یہ ہے کہ اس کو الٹا رکھا جائے تا کہ منہ میں استعمال شدہ حصہ زمین پر آجائے اس طرح اس میں پانی اندر کے بجائے باہر کو نچڑ جائے گا تو بدبو نہیں آئے گی نیز زمین میں نوشادر کے اجزاء ہیں اس سے مسواک میں لگے جراثیم بھی

---

[1] المرقات ۲/۸۷ [2] المرقات ۲/۸۷

مرجائیں گے۔ جمہور نے مسواک کو سنت قرار دیا ہے صرف داؤد ظاہری نے اس کو واجب کہا ہے فتح القدیر نے پانچ حالتوں میں مسواک کرنے کو مسنون اور ضروری بتایا ہے۔[1]

① جب دانت پیلے پڑ جائیں۔ ② جب منہ سے بدبو آئے۔
③ جب آدمی نیند سے جاگ جائے۔ ④ جب نماز شروع کرے۔
⑤ جب وضو شروع کرے۔[2]

الفصل الاول

مسئلة السواك

﴿۱﴾ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَوْ لَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِتَأْخِيرِ الْعِشَاءِ وَبِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[3]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اگر میں اپنی امت پر اس بات کو مشکل نہ جانتا تو مسلمانوں کو یہ حکم دیتا کہ وہ عشاء کی نماز دیر سے پڑھیں اور ہر نماز کیلئے مسواک کریں۔" (بخاری و مسلم)

توضیح: لولا ان اشق: لولا انتفاء ثانی کے لئے آتا ہے بسبب وجود اول حالانکہ وجود اول یعنی مشقت متحقق نہیں ہوئی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ لولا کے ساتھ "**خشية**" کی عبارت محذوف ماننا پڑے گا۔ پھر یہاں دوسرا اشکال یہ ہے کہ انتفاء ثانی متحقق نہیں ہوا ہے کیونکہ مسواک کا حکم ختم نہیں ہوا بلکہ مسنون طریقہ پر موجود ہے اور تاخیر عشاء کا حکم بھی برقرار ہے اس کا جواب یہ ہے کہ "**امرتهم**" میں فرضیت اور وجوبی طور پر حکم کی نفی کی گئی ہے اور وہ نفی موجود ہے کہ مسواک کرنا نہ فرض ہے اور نہ واجب ہے ترجمہ یہ ہوا کہ اگر مجھے امت کے مشقت میں پڑنے کا خوف نہ ہوتا تو میں فرض اور وجوبی طور پر مسواک کا حکم دیتا لیکن چونکہ امت کے مشقت میں پڑ جانے کا خوف موجود ہے اس لئے میں نے واجبی طور پر مسواک کا حکم نہیں دیا بلکہ مسنون طریقہ کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح کلام تاخیر عشاء میں بھی ہے۔[4]

عند کل صلوة: دوسری روایت میں "**عند کل وضوء**" کے الفاظ آئے ہیں اور تیسری روایت میں "**مع کل وضوء**" کے الفاظ بھی آئے ہیں ان الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے فقہاء کرام کا اس بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ آیا مسواک سنن وضو میں سے ہے یا یہ سنن صلوۃ میں سے ہے۔[5]

فقہاء کرام کا اختلاف:

ائمہ احناف کے ہاں مسواک سنن وضو میں سے ہے اور شوافع کے ہاں یہ سنن صلوۃ میں سے ہے ثمرۂ اختلاف اس وقت ظاہر

---

[1] المرقات ۲/۸۷ [2] المرقات ۲/۸۸،۸۹ [3] اخرجه البخاری ۲/۵ ومسلم ۱/۱۵۱ [4] المرقات ۲/۸۸ [5] المرقات ۲/۸۸

ہوگا کہ مثلاً ایک شخص نے وضو کے ساتھ مسواک کی اور پھر اسی وضوء سے کئی نمازیں پڑھ لیں تو احناف کے نزدیک یہ ساری نمازیں مسواک والی ہوں گی لیکن شوافع کے ہاں مسواک والی نہیں ہوں گی۔

دلائل:

شوافع نے اپنے استدلال میں وہ روایات پیش کیں ہیں جن میں "**عند کل صلوۃ**" کے الفاظ آئے ہیں زیر بحث حدیث بھی ان کی دلیل ہے ائمہ احناف "**کثر الله سوادھم**" نے ان روایات سے استدلال کیا ہے جن میں "**عند کل وضوء**" کے الفاظ آئے ہیں یا "**مع کل وضوء**" کے الفاظ ہیں موطا مالک میں "**مع کل وضوء**" کے الفاظ موجود ہیں، نیز مسند احمد اور سنن کبری میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں اور یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے لہٰذا جب "**مع کل وضوء**" میں صراحت کے ساتھ مقارنت کا ذکر ہے تو اسی پر "**عند کل صلوۃ**" کو بھی حمل کرنا چاہئے اور "**عند کل وضوء**" کے الفاظ کو بھی "**مع کل وضوء**" پر حمل کرنا چاہیے تا کہ تمام احادیث میں تطبیق آجائے اور "**عند کل صلوۃ**" کے احتمالی کلمات "**مع کل وضوء**" کے یقینی کلمات پر محمول ہو جائیں تا کہ اختلاف ختم ہو کر اتفاق ہو جائے۔ ائمہ احناف کی دوسری دلیل فصل ثانی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے: "**السواك مطهرة للفم ومرضاة للرب**" طرز استدلال اس طرح ہے کہ مسواک کا تعلق طہارت سے جوڑا گیا ہے اور طہارت وضو کے ساتھ وابستہ ہے یہ نقلی دلیل بھی ہے اور عقلی بھی ہے، عقلی دلیل میں دیکھا گیا ہے کہ آیا مسواک مقصودی عبادت یعنی صلوۃ کے زیادہ قریب ہے یا اس کے وسیلے وضو کے زیادہ قریب ہے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ مسواک کا تعلق وسیلہ سے زیادہ ہے یعنی وضو سے زیادہ اور اس حدیث نے اسکی تصریح بھی کر دی کہ "**مطهرة للفم**" نیز آنحضرت ﷺ کی مداومت مسواک **عند الوضوء** پر ہے نیز ہم **قبل الصلوۃ** بھی مسواک کو مانتے ہیں اور فتح القدیر نے پانچ مواضع میں **قبل الصلوۃ** مسواک کا ذکر بھی کیا ہے لیکن چونکہ احناف کے نزدیک خروج خون **ناقض للوضوء** ہے تو **احناف عند الصلوۃ** مسواک سے اس خوف کی وجہ سے بچتے ہیں ورنہ مستحب اس مقام میں بھی ہے جب احناف نے پانچ مواضع میں مسنون مان لیا تو پھر مسئلہ میں اختلاف ہی نہیں رہا یہی وجہ ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسواک کے اختلاف کو اپنی کتاب شرح معانی الآثار میں ذکر نہیں کیا ہے جس سے وہ یہ اشارہ کرتے ہیں کہ اس میں اختلاف نہیں ہے کیونکہ وہ **اعرف بالخلافیات** ہیں۔[1]

مسواک استعمال کرنے کے مواضع

﴿۲﴾ وَعَنْ شُرَيْحِ بْنِ هَانِئٍ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ بِأَيِّ شَيْءٍ كَانَ يَبْدَأُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ بَيْتَهُ قَالَتْ بِالسِّوَاكِ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[2]

---

[1] المرقات ۲/۸۸،۸۹ [2] اخرجه مسلم ۱/۲۵۲

ترجمہ: اور حضرت شریح بن ھانی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ سرکار دو عالم ﷺ جب اپنے گھر میں تشریف لاتے تو پہلے کیا کرتے؟ انہوں نے فرمایا سب سے پہلے آپ ﷺ مسواک کرتے تھے۔ (مسلم)

توضیح: اذا دخل: یعنی گھر میں آنے کے وقت سب سے پہلا کام مسواک ہوتا تھا یہ امت کو تعلیم دے دی کہ گھر میں داخل ہونے کے بعد اپنی بیوی سے بوس وکنار کا موقع آسکتا ہے اگر منہ سے بدبو اٹھ رہی ہو تو یہ باعث نفرت ہوسکتا ہے اور نفرت میاں بیوی کے درمیان جدائی کا ذریعہ بن سکتی ہے اس لئے گھر میں آنے کے وقت خوب مسواک کرنا چاہیئے تا کہ منہ سے بدبو اٹھنے کا امکان باقی نہ رہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا قَامَ لِلتَّهَجُّدِ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوْصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ.
(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب رات میں تہجد کی نماز کے لئے اٹھتے تو اپنا منہ مسواک سے ملتے اور دھوتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

ڈاڑھی بڑھانا اور دس فطری چیزیں

﴿۴﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ وَإِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَالسِّوَاكُ وَاسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَقَصُّ الْأَظْفَارِ وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَنَتْفُ الْإِبِطِ وَحَلْقُ الْعَانَةِ وَانْتِقَاصُ الْمَاءِ يَعْنِي الْإِسْتِنْجَاءَ قَالَ الرَّاوِيُّ وَنَسِيْتُ الْعَاشِرَةَ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ الْمَضْمَضَةُ.
(رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِي رِوَايَةٍ الْخِتَانُ بَدَلَ إِعْفَاءِ اللِّحْيَةِ. لَمْ أَجِدْ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَلَا فِي كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَلٰكِنْ ذَكَرَهَا صَاحِبُ الْجَامِعِ وَكَذَا الْخَطَّابِيُّ فِي مَعَالِمِ السُّنَنِ عَنْ أَبِي دَاوُدَ بِرِوَايَةِ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ)[2]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا دس چیزیں فطرت میں سے ہیں (یعنی دین کی باتیں ہیں) ① لبوں کے بال کٹوانا ② داڑھی کا بڑھانا ③ مسواک کرنا ④ ناک میں پانی دینا ⑤ ناخن کٹوانا ⑥ جوڑوں کی جگہ دھونا ⑦ بغل کے بال صاف کرنا ⑧ زیر ناف بالوں کو مونڈنا ⑨ پانی کا کم کرنا یعنی پانی کے ساتھ استنجا کرنا۔ راوی یعنی مصعب یا زکریا کا بیان ہے کہ دسویں چیز کو میں بھول گیا ممکن ہے وہ کلی کرنا ہو (مسلم) اور ایک روایت میں (دوسری چیز) داڑھی بڑھانے کے بجائے ختنہ کرانا ہے اور (صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ) مجھے یہ روایت نہ صحیحین یعنی بخاری ومسلم میں ملی ہے اور نہ کتاب حمیدی میں (جو صحیحین کی جامع ہے) البتہ اس روایت کو صاحب جامع الاصول نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے اسی طرح خطابی نے معالم السنن میں ابوداؤد کے حوالہ سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

[1] المرقات ۲/۸۹ [2] اخرجہ مسلم ۱۵۳،۱۵۴/۱

توضیح: الفطرة: اس لفظ کا ایک مطلب **سنن الانبیاء** ہے یعنی ان کی خلقت میں داخل تھی تو ہماری خلقت میں بھی داخل ہے اس کا دوسرا مطلب **سنن الدین** ہے۔ اس لفظ کا تیسرا مطلب انسانی فطرت اور خلقت وطبیعت ہے۔ یعنی یہ دس خصلتیں انسانی طبیعت اور فطرت ہیں ''یہ چیزیں انسانی ہیئت کو باقی رکھتی ہیں ورنہ انسان کی ہیئت غیر فطری ہو جائے گی۔'' [۱]

قص الشارب: تمام الفاظ حدیث سے لبوں کے کاٹنے کترنے کا اشارہ ملتا ہے مونڈنے کا اشارہ نہیں ملتا ہے اگرچہ فتاوی عالمگیری نے اسے جائز کہا ہے مونچھوں کا بالکل صاف کرنا اصل سنت ہے لبوں کے برابر بال لینا بھی جائز طریقہ ہے۔ نتھنوں کے پاس کچھ بال چھوڑ کر باقی صاف کرنا مسٹر چرچل کا طریقہ ہے اور بیچ سے کچھ حصہ کاٹ کر دونوں طرف کناروں میں کافی بال چھوڑنا مانکی کے شیخان کا نامناسب طریقہ ہے۔ [۲]

إعفاء اللحية: یہ باب افعال سے **اعفاء** معاف کرنے کے معنی میں ہے یعنی معاف کر کے خوب چھوڑے اور کترنے مونڈنے سے نہ چھیڑے داڑھی بڑھانے کی کوئی حد نہیں، ہاں اگر منہ چھوٹا ہے اور صلحاء کے ہاں چہرہ برا لگتا ہے تو داڑھی اتنی کم کرنا جائز ہے کہ بری نہ لگے لیکن ایک مشت سے کم کرنا جائز نہیں ایک مشت تک کم کرنا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے ورنہ احادیث میں بڑھانے کا حکم ہے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقات میں لکھتے ہیں کہ داڑھی چھوٹی کرنا عجمیوں کا عمل ہے اور آج کل یہ بہت سارے مشرکین اور فرنگیوں اور یہود وہنود اور ملحد لوگوں کا شعار بن چکا ہے اور طائفہ قلندریہ کا یہ شعار بن گیا ہے جن کا دین سے کوئی واسطہ نہیں ہاں عورت کی داڑھی اگر آ گئی تو اسے منڈانا مستحب ہے داڑھی رکھنا واجب ہے اس کو سنت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سنت طریقہ سے ثابت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر نبی اور ہر صحابی نے داڑھی رکھنے پر مداومت فرمائی ہے جو وجوب کی دلیل ہے۔ [۳]

وقص الاظفار: یعنی ناخن تراشا ایک فطری عمل ہے جو لوگ ناخن بڑھاتے ہیں یہ غیر فطری اور غیر انسانی فعل کے مرتکب ہیں ناخن تراشا ہر طریقہ سے جائز ہے لیکن بہتر طریقہ اس طرح ہے کہ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے شروع کر کے چھوٹی انگلی تک تراش لیا جائے اور پھر انگوٹھے کو تراش کر بائیں ہاتھ کی چھنگلی سے شروع کر کے انگوٹھے تک کاٹ دیئے جائیں، بعض نے کہا ہے کہ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو چھوڑ کر بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے شروع کر کے انگوٹھے تک تراش لیا جائے اور آخر میں دائیں ہاتھ کے انگوٹھا پر ختم کرے اور پاؤں میں دائیں پیر کی چھوٹی انگلی سے لے کر بائیں کے آخر تک تراش لیا جانا عام اور رائج طریقہ ہے۔ [۴]

وغسل البراجم: یہ ''برجمة'' کی جمع ہے انگلیوں کے جوڑوں میں جو لکیریں ہیں اس کو کہتے ہیں لیکن یہ حکم ہر اس جگہ کو عام ہے جہاں میل جمع ہوتا ہے مثلاً کان کے اردگرد اور اس کے اندر کا حصہ ہے ناک اور اس کے اندر جو میل جمع ہوتا ہے یا جسم کے باقی حصوں میں جہاں میل جمع ہوتا ہے سب اس میں داخل ہیں۔ [۵]

---

[۱] المرقات ۲/۹۰ [۲] المرقات ۲/۹۱ [۳] المرقات ۲/۹۱ [۴] المرقات ۲/۹۱ [۵] المرقات ۲/۹۱

ونتف الابط: یعنی بغل کے بال صاف کرنا "نتف" نوچنے کے معنی میں ہے لہٰذا یہ لفظ بتاتا ہے کہ بغل کے بال استرے سے صاف نہ کئے جائیں کیونکہ اس سے بال گھنے ہو کر جنگل بن جاتا ہے اور پھر بدبو پیدا ہوتی ہے انگلیوں سے جب ابتداء سے اس کو اکھیڑنے کی عادت بنائی جائے پھر یہ بال آسانی سے نوچے جاسکتے ہیں۔[1]

وحلق العانة: یعنی زیر ناف بال مونڈنا ابن مَلِک (جوایک فقیہ ہیں) فرماتے ہیں کہ زیر ناف بالوں میں منڈانا ہی سنت ہے کسی اور طریقہ سے صاف کرنے سے سنت پوری نہیں ہوگی بعض نے بال صفا اور نورہ سے صاف کرنے کو بھی جائز کہا ہے مگر قینچی سے کاٹنا جائز نہیں ہے مردوں کے لئے لوہے سے منڈانا باعث قوت باہ ہے اور عورتوں کیلئے زیر ناف بال نوچنا زیادہ بہتر ہے اس سے ان کی شہوت کنٹرول ہوجاتی ہے تاہم وہ بال صفا یا نورہ بھی استعمال کرسکتی ہیں مگر ان کے لئے منڈانا خلاف سنت ہے۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کے لئے لبوں کو صاف کرنے ناخن تراشنے بغل کے بال صاف کرنے اور زیر ناف بال صاف کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ چالیس دن کا وقت دیا تھا تو پوری امت کے لئے یہی تعلیم ہے علماء نے یہ ترتیب بتائی ہے کہ ہفتہ وار صفائی حاصل کریں ورنہ پندرہ دن میں حاصل کریں ورنہ چالیس دن میں حاصل کریں اس سے زیادہ دیر کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ دس چیزیں وہ تھیں جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا تھا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے **"و اذا بتلی ابراھیم ربه بکلمات فاتمھن"** تو یہ آپ کی سنت تھی پھر تمام انبیاء کرام کی سنت رہی اور امتوں کی فطرت کا حصہ بن گیا۔[2]

الفصل الثانی

مسواک کرنے کے فوائد

﴿۵﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلسِّوَاكُ مِطْهَرَةٌ لِلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ.

(رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ وَالدَّارِمِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَى الْبُخَارِيُّ فِي صَحِيْحِهِ بِلَا إِسْنَادٍ)[3]

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا مسواک (کرنا) منہ کی پاکی کا سبب ہے اور پروردگار کی خوشنودی کا باعث ہے (شافعی احمد، دارمی، نسائی) اور امام بخاری نے اس حدیث کو اپنی (صحیح بخاری) میں بغیر سند کے نقل کیا ہے۔

﴿۶﴾ وَعَنْ أَبِي أَيُّوْبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أَرْبَعٌ مِّنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ اَلْحَيَاءُ وَيُرْوَى الْخِتَانُ وَالتَّعَطُّرُ وَالسِّوَاكُ وَالنِّكَاحُ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[4]

---

[1] المرقات ۲/۹۱ [2] المرقات ۲/۹۲ [3] اخرجه احمد ۶/۴۷ والنسائی ۱/۶۱ والبخاری [4] اخرجه الترمذی ۱۰۸۰

ترجمہ: اور حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا چار چیزیں رسولوں کے طریقہ میں سے ہیں:

① حیا کرنا ایک روایت میں ختنہ کرنا مروی ہے (یعنی اس روایت میں تو الحیاء کا لفظ ہے اور بعض روایات میں اس کے بجائے الختان کا لفظ آیا ہے)۔ ② خوشبو لگانا ③ مسواک کرنا ④ نکاح کرنا۔ (ترمذی)

﴿۷﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَرْقُدُ مِنْ لَيْلٍ وَلَا نَهَارٍ فَيَسْتَيْقِظُ إِلَّا يَتَسَوَّكُ قَبْلَ أَنْ يَتَوَضَّأَ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ)[۱]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب رات اور دن میں سو کر اٹھتے تو وضو کرنے سے پہلے مسواک کرتے۔ (احمد، ابوداؤد)

﴿۸﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَسْتَاكُ فَيُعْطِيْنِي السِّوَاكَ لِأَغْسِلَهُ فَأَبْدَأُ بِهِ فَأَسْتَاكُ ثُمَّ أَغْسِلُهُ وَأَدْفَعُهُ إِلَيْهِ۔ (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ)[۲]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ مسواک کرتے اور پھر مجھے دے دیتے تا کہ میں اسے دھو ڈالوں چنانچہ میں (آپ سے مسواک لے کر) پہلے اس سے خود مسواک کرتی پھر دھوتی اور آنحضرت ﷺ کو دے دیتی۔ (ابوداؤد)

الفصل الثالث

مسواک کی اہمیت

﴿۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ أَرَانِي فِي الْمَنَامِ أَتَسَوَّكُ بِسِوَاكٍ فَجَاءَنِي رَجُلَانِ أَحَدُهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الْآخَرِ فَنَاوَلْتُ السِّوَاكَ الْأَصْغَرَ مِنْهُمَا فَقِيْلَ لِي كَبِّرْ فَدَفَعْتُهُ إِلَى الْأَكْبَرِ مِنْهُمَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۳]

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (ایک دن) سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا میں نے اپنے آپ کو خواب میں دیکھا کہ میں مسواک کر رہا ہوں (اسی اثناء میں) دو آدمی میرے پاس آئے ان میں سے ایک آدمی دوسرے سے بڑا تھا میں نے ان میں سے چھوٹے کو مسواک دینے کا ارادہ کیا مگر مجھ سے کہا گیا کہ بڑے کو مسواک دو چنانچہ میں نے ان میں سے بڑے کو مسواک دی۔ (بخاری و مسلم)

---

[۱] اخرجه احمد ۶/۱۲۱ وابو داؤد ۵۷　[۲] اخرجه ابو داؤد ۵۲/۱۳　[۳] اخرجه البخاری ۵۷/۱، ومسلم

توضیح: ارانی: یعنی میں نے خواب میں اپنے آپ کو دیکھا۔ انبیاء کرام کا خواب وحی کا درجہ رکھتا ہے تو جو عمل انہوں نے خواب میں کیا وہ امت کے لئے شریعت بنتی ہے گویا مسواک سبب اعزاز واکرام ہے تو آپ نے بڑے کو اس اکرام سے نوازا اس حدیث کے بعد آنے والی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث نمبر ۱۲ میں اس طرح کے قصہ کا بیداری میں بھی پیش آنا مذکور ہے جہاں آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے حکم ہوا کہ مسواک بڑے آدمی کو دے دی جائے۔

اس حدیث کے بعد کئی احادیث میں مسواک کی نہایت ترغیب دی گئی ہے چنانچہ حدیث نمبر ۱۰ میں "**لقد خشیت ان احفی مقدم فی**" کے الفاظ آئے ہیں **احفاء** چھیلنے کے معنی میں ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جبریل امین نے مسواک پر اتنا زور دیا کہ مسواک کرتے کرتے مجھے خوف لاحق ہو گیا کہ میں منہ کے اگلے حصہ کو چھیل نہ ڈالوں "**فی**" **فم** میں ایک لغت ہے شد کے ساتھ منہ کو کہتے ہیں۔[1]

﴿۱۰﴾ وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ مَا جَاءَنِي جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَطُّ إِلَّا أَمَرَنِي بِالسِّوَاكِ لَقَدْ خَشِيْتُ أَنْ أُحْفِيَ مُقَدَّمَ فِيَّ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابی امامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جبریل علیہ السلام جب بھی میرے پاس آتے تو مجھے مسواک کرنے کا حکم دیتے (یہاں تک کہ) مجھے خوف ہوا کہ (کہیں مسواک کی زیادتی سے) میں اپنے منہ کے اگلے حصہ کو چھیل نہ ڈالوں۔" (احمد)

﴿۱۱﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَقَدْ أَكْثَرْتُ عَلَيْكُمْ فِي السِّوَاكِ. (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[3]

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے تم سے مسواک کے متعلق بہت کچھ بیان کیا ہے۔ (بخاری)

﴿۱۲﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَسْتَنُّ وَعِنْدَهُ رَجُلَانِ أَحَدُهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الْآخَرِ فَأُوْحِيَ إِلَيْهِ فِي فَضْلِ السِّوَاكِ أَنْ كَبِّرْ أَعْطِ السِّوَاكَ أَكْبَرَهُمَا. (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[4]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ مسواک کر رہے تھے اور آپ کے پاس دو آدمی تھے جن میں ایک دوسرے سے بڑا تھا چنانچہ مسواک کی فضیلت میں آپ کی طرف یہ وحی نازل فرمائی گئی کہ بڑے کو مقدم رکھو یعنی ان دونوں میں سے بڑے کو مسواک دو۔ (ابوداؤد)

[1] المرقات ۲/۹۷ [2] اخرجہ احمد ۵/۲۶۳ [3] اخرجہ البخاری ۲/۵ [4] اخرجہ ابو داؤد ۵۰

مسواک کی عظیم فضیلت

﴿۱۳﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَفْضُلُ الصَّلَاةُ الَّتِيْ يُسْتَاكُ لَهَا عَلَى الصَّلَاةِ الَّتِيْ لَا يُسْتَاكُ لَهَا سَبْعِيْنَ ضِعْفًا۔ (رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ نماز جس کے لئے مسواک کی گئی (یعنی وضو کے وقت) اس نماز پر جس کے لئے مسواک نہیں کی گئی ستر (۷۰) درجہ کی فضیلت رکھتی ہے۔ (بیہقی)

﴿۱۴﴾ وَعَنْ أَبِيْ سَلَمَةَ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِيْ لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَلَأَخَّرْتُ صَلَاةَ الْعِشَاءِ إِلَى ثُلُثِ اللَّيْلِ قَالَ فَكَانَ زَيْدُ بْنُ خَالِدٍ يَشْهَدُ الصَّلَوَاتِ فِي الْمَسْجِدِ وَسِوَاكُهُ عَلَى أُذُنِهِ مَوْضِعَ الْقَلَمِ مِنْ أُذُنِ الْكَاتِبِ لَا يَقُوْمُ إِلَى الصَّلَاةِ إِلَّا اسْتَنَّ ثُمَّ رَدَّهُ إِلَى مَوْضِعِهِ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْ دَاوُدَ إِلَّا أَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ وَلَأَخَّرْتُ صَلَاةَ الْعِشَاءِ إِلَى ثُلُثِ اللَّيْلِ. وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ)[2]

ترجمہ: حضرت ابو سلمہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر اپنی امت کے لئے میں اس میں مشکل نہ جانتا تو میں ان کو ہر نماز کے لئے مسواک کرنے کا حکم دیتا (یعنی یہ اعلان کر دیتا کہ ہر نماز کے وقت مسواک کرنا واجب ہے) اور عشاء کی نماز میں تہائی رات تک تاخیر کا حکم کرتا راوی کا بیان ہے کہ (اس کے بعد) زید بن خالد رضی اللہ عنہ نماز کے لئے مسجد میں آتے تو مسواک ان کے کان پر رکھی ہوتی جس طرح کاتب کے کان پر قلم رکھا رہتا ہے وہ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو فوراً مسواک کر لیتے اور پھر کان پر رکھ لیتے۔ (ابو داؤد، ترمذی) ابو داؤد نے لاخرت صلوۃ العشاء الی ثلث اللیل کے الفاظ ذکر نہیں کئے ہیں اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ملاحظہ:

یاد رہے کہ ۲۳ صفر ۱۴۱۰ کا درس یہاں ختم ہو گیا اور آئندہ سنن الوضو مستقل ایک دن کا درس ہے گویا ۲۳ صفر کے عنوان سے جو درس ہے یہ دو دن کا سبق ہے۔

[1] اخرجه البيهقي [2] اخرجه الترمذی ۲۲۳ وابو داؤد ۴۷

باب سنن الوضوء
وضو کی سنتوں کا بیان

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں سنن الوضوء کے عنوان سے صرف وضو کی سنتیں مراد نہیں بلکہ یہاں آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال اور تقریرات سب مراد ہیں خواہ وہ سنت ہوں یا فرض ہوں جس طرح فرض اور واجب کے بارے میں بھی کبھی کبھی آتا ہے کہ سنت میں اس طرح آیا ہے حالانکہ وہاں صرف سنت مراد نہیں، بلکہ سنت طریقہ سے ثابت شریعت کا حکم مراد ہوتا ہے لہٰذا اس باب میں سنت وفرائض اور آداب ومستحبات سب بیان ہوں گے۔[1]

الفصل الاول
مسئلة غمس اليد في الاناء

﴿۱﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهِ فَلَا يَغْمِسْ يَدَهُ فِي الْإِنَاءِ حَتّٰى يَغْسِلَهَا ثَلَاثًا فَإِنَّهُ لَا يَدْرِي أَيْنَ بَاتَتْ يَدُهُ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص سو کر اٹھے (تو اسے چاہیے کہ) اپنے ہاتھ کو پانی کے برتن میں نہ ڈالے جب تک اسے (پہنچوں تک) تین بار دھو نہ لے اس لئے کہ اسے نہیں معلوم کہ رات بھر اس کا ہاتھ کہاں کہاں رہا۔'' (متفق علیہ)

توضیح: فلا یغمس یدہ فی الاناء: یہاں وضو کے آداب میں سے ایک ادب یہ بتایا گیا ہے کہ جب سو کر اٹھو تو پانی کے برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے تین دفعہ ہاتھوں کو دھولیا کرو بغیر دھوئے ہاتھ نہ ڈالا کرو اب یہ ہاتھ دھونا واجب ہے یا سنت ہے اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر ہاتھ پر گندگی لگنے کا یقین یا ظن غالب ہو تو پھر ہاتھ دھونا واجب ہے اور اگر صرف شک اور احتمال ہو تو پھر ہاتھ دھونا مسنون یا مستحب ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل حجاز اکثری طور پر استنجاء بالاحجار کرتے تھے اور وہاں گرمی کی شدت ہوتی تھی نیز وہ لوگ شلوار کے بجائے ازار باندھتے تھے اس لئے قوی احتمال تھا کہ حالت نوم میں ہاتھ نجاست کے مقام پر پڑ جائے اور پسینہ کی وجہ سے ہاتھ نجاست سے آلودہ ہو جائے یا رائحہ کریہہ لگ جائے، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں نہ ڈالا جائے کیونکہ احتمال نجاست ہے اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر پانی سے کوئی استنجاء کرے یا ازار کے بجائے شلوار پہنے اور علاقہ بھی ٹھنڈا ہو تو ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں ڈالا جا سکتا ہے۔

---

[1] الکاشف ۲/۷۱ والمرقات ۲/۱۰۱

[2] اخرجه البخاری ۱/۵۲ ومسلم ۱/۱۶۱

بہر حال جہاں تو ہم نجاست ہو وہاں بھی ہاتھ ڈالنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا کیونکہ "الیقین لا یزول بالشك" ایک مسلمہ قاعدہ ہے ہاں نظافت کے خلاف ہے بہر حال اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا اختلاف بھی ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے۔[1]

فقہاء کا اختلاف:

اہل ظواہر اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر نیند سے اٹھنے والے شخص نے پانی میں ہاتھ ڈالا تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ البتہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے چند قیود کا اضافہ کیا ہے کہ نیند سے اٹھے لہٰذا بیہوش آدمی کے ہاتھ ڈالنے سے کوئی فرق نہیں آئے گا۔ دوسری قید یہ کہ رات کی طویل نیند ہو لہٰذا دن کی قلیل نیند کا یہ حکم نہیں۔ تیسری قید یہ کہ برتن میں ہاتھ ڈال دے لہٰذا غیر برتن کا حکم اس طرح نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہ قیودات احترازی ہیں۔

جمہور فقہاء کے نزدیک یہ فعل اگرچہ مکروہ ہے لیکن احتمال نجاست کی وجہ سے پانی کو ناپاک نہیں کہیں گے، کیونکہ پانی یقینی طور پر پاک تھا "الیقین لا یزول بالشك" ایک قاعدہ ہے ہاں اگر ظاہری نجاست لگ گئی پھر ناپاک ہوگا جمہور یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیث میں جو قیودات ہیں وہ احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہیں لہٰذا اگر بے ہوش آدمی نے غفلت کی وجہ سے پانی میں ہاتھ ڈال دیا تو یہ عمل بھی مکروہ ہوگا کیونکہ یہ بھی غفلت کا نتیجہ ہے اور "فانه لا یدری این باتت یده" سے اسی علت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر برتن بڑا ہے تو پہلے ایک ہاتھ کی انگلیوں سے پانی لے کر دوسرے ہاتھ کو دھولے اور پھر اس ہاتھ سے دوسرا ہاتھ دھولے اور پھر دونوں ہاتھوں سے چلو بھر کر وضو کرے اور اگر برتن چھوٹا ہے تو انڈیل کر ڈالے اور اگر الگ لوٹا ہے تو بڑے برتن میں ڈال کر پانی حاصل کرے۔[2]

مسئلة المضمضة والاستنشاق

﴿۲﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِهِ فَتَوَضَّأَ فَلْيَسْتَنْثِرْ ثَلَاثاً فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَبِيْتُ عَلَى خَيْشُوْمِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَقِيْلَ لِعَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ كَيْفَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ فَدَعَا بِوَضُوْءٍ فَأَفْرَغَ عَلَى يَدَيْهِ فَغَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثاً ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثاً ثُمَّ غَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهُ بِيَدَيْهِ فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ ثُمَّ ذَهَبَ بِهِمَا إِلَى قَفَاهُ ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتّٰى رَجَعَ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِيْ بَدَأَ مِنْهُ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. رَوَاهُ مَالِكٌ وَالنَّسَائِيُّ وَلِأَبِيْ دَاوٗدَ نَحْوَهُ ذَكَرَهُ صَاحِبُ الْجَامِعِ وَفِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ قِيْلَ لِعَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ تَوَضَّأْ لَنَا وُضُوْءَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَدَعَا

---

[1] المرقات ۲/۱۰۲ [2] المرقات ۲/۱۰۲

بِإِنَاءٍ فَأَكْفَأَ مِنْهُ عَلَى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا ثَلَاثًا ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَاسْتَخْرَجَهَا فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفٍّ وَاحِدَةٍ فَفَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثًا ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَاسْتَخْرَجَهَا فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَاسْتَخْرَجَهَا فَغَسَلَ يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَاسْتَخْرَجَهَا فَمَسَحَ بِرَأْسِهِ فَأَقْبَلَ بِيَدَيْهِ وَأَدْبَرَ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا كَانَ وُضُوءُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ۔ وَفِي رِوَايَةٍ فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ ثُمَّ ذَهَبَ بِهِمَا إِلَى قَفَاهُ ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتّٰى رَجَعَ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِي بَدَأَ مِنْهُ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا بِثَلَاثِ غَرَفَاتٍ مِنْ مَاءٍ وَفِي أُخْرَى فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفَّةٍ وَاحِدَةٍ فَفَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثًا وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ فَمَسَحَ رَأْسَهُ فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ مَرَّةً وَاحِدَةً ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَفِي أُخْرَى لَهُ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ غَرْفَةٍ وَاحِدَةٍ۔ [1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کوئی سو کر اٹھے اور وضو کا ارادہ کرے تو تین مرتبہ (ناک میں پانی دے کر) ناک کو جھاڑے اس لئے کہ اس کی ناک کے بانسے پر شیطان رات گزارتا ہے۔" (بخاری، مسلم)

توضیح: فلیستنثر ثلاثا: یعنی تین بار ناک میں پانی ڈالکر جھاڑ دے جسے استنشاق بھی کہتے ہیں۔ مضمضہ اور استنشاق میں فقہاء کا اختلاف بھی ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

مضمضہ اور استنشاق کی وضو اور غسل میں کیا حیثیت ہے اس میں فقہاء کا اختلاف ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مضمضہ اور استنشاق دونوں وضو اور غسل میں سنت ہیں۔ اہل ظواہر اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مضمضہ تو دونوں میں سنت ہے لیکن استنشاق وضو اور غسل دونوں میں فرض ہے یعنی شوافع و مالکیہ کے ہاں دونوں جگہ میں دونوں سنت ہے اور حنابلہ کے ہاں مضمضہ دونوں جگہ سنت اور استنشاق فرض ہے ائمہ احناف کے نزدیک وضو میں یہ دونوں سنت ہے اور غسل میں دونوں فرض ہے۔

دلائل:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی دلیل تو آیت الوضوء ہے جس میں تمام فرائض کا ذکر کیا گیا ہے وہاں مضمضہ اور استنشاق مذکور نہیں ہے اگر ہم حدیث سے فرض ثابت کریں گے تو یہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادت لازم آئے گی جو

[1] اخرجه البخاری ۱/۱۵۳ ومسلم ۱/۱۳۶

ناجائز ہے لہذا فرض نہیں بلکہ سنت ہے۔

ان حضرات کی دوسری دلیل حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت **عشر من الفطرة** اور **عشر من سنن المرسلین** ہے جہاں مضمضہ اور استنشاق کو سنت کہا گیا ہے تو وضو اور غسل دونوں میں یہ دونوں سنت ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور اہل ظواہر نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی زیر نظر روایت سے استدلال کیا ہے جس میں **لیستنثر** امر کا صیغہ آیا ہے اور اس سے فرض ثابت ہو گیا جب حدث اصغر میں فرض ہوا تو حدث اکبر غسل میں بطریق اولیٰ فرض ہو گا ائمہ احناف کو دو الگ الگ دلائل کی ضرورت ہے چنانچہ وضو میں ان دونوں کے سنت ہونے پر احناف کی دلیل وہی آیت ہے جس سے شوافع اور مالکیہ نے استدلال کیا ہے کہ آیت الوضو میں اگر مضمضہ اور استنشاق کو فرض کہیں گے تو اس سے کتاب اللہ پر زیادت آئے گی جو جائز نہیں ہے لیکن غسل میں دونوں کے فرض ہونے کے لئے احناف نے قرآن کی آیت "**فاطھروا**" سے استدلال کیا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ غسل میں بہت ہی مبالغہ سے کام لیا جائے اس مبالغہ کا تقاضا یہ ہے کہ جسم میں جو حصہ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہو وہ بھی غسل کے حکم میں آ کر فرض ہو جائے جب ہم نے دیکھا تو جسم میں ایسی جگہ ناک اور منہ ہیں کیونکہ منہ جب کھل جائے تو یہ حساً ظاہر بدن کا حصہ ہے نیز اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں منہ میں پانی ڈالتا ہے اور حلق سے پانی باہر رہتا ہے تو روزہ نہیں ٹوٹتا معلوم ہوا یہ حکماً ظاہر بدن ہے اور اگر منہ سے تھوک کو روزہ دار نگل لیتا ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حکماً منہ بدن کے باطن کا حصہ ہے۔ اسی طرح ناک کو اوپر کیا جائے تو اندر نظر آتا ہے یہ ظاہر بدن ہونے کی دلیل ہے اور جب نیچے رہے تو اندر کچھ نظر نہیں آتا یہ باطن کی علامت ہے اب آیت نے جس مبالغہ کو ذکر کیا ہے اس کا مقصد تو تب پورا ہو گا کہ جسم کے ظاہر سے آگے بڑھ کر اس کے اس حصہ کو بھی دھویا جائے جو ایک حیثیت سے باطن سمجھا جاتا ہے لہذا مضمضہ اور استنشاق کو الفاظ قرآن کے مطابق غسل میں فرض ہونا چاہیے یہ کتاب اللہ پر زیادت نہیں بلکہ آیت کا تقاضا ہے تاہم اس فرض کا منکر کافر نہیں بنے گا کیونکہ اس میں اجتہاد کو دخل ہے۔

احناف نے اس کے علاوہ اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ "**تحت کل شعرة جنابة**" کیونکہ ناک میں ایک بال نہیں سینکڑوں بال ہوتے ہیں اور جنسی تعلقات میں **لمسوت قبلوت** میں منہ کو بڑا دخل ہے تو مضمضہ واستنشاق ضروری ہے۔

نیز جماع میں حیوانیت کی صفت ہے شریعت کی نظر میں اس میں بہت قلت ہونی چاہیے اس لئے شریعت نے غسل میں شدت کی ہے تاکہ حیوانیت کم سے کم ہو، اس کا بھی تقاضا ہے کہ غسل میں مضمضہ اور استنشاق فرض ہو۔

جواب: اہل ظواہر اور حنابلہ کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ امر جب خالی من قرینہ ہو تو وہاں وجوب کے لئے آتا ہے یہاں تو عدم وجوب پر قرینہ صارفہ مانعہ موجود ہے کہ اس سے آیت پر زیادتی لازم آتی ہے۔

الزامی جواب یہ ہے کہ اگر "فلیستنثر" امر آیا ہے تو حدیث میں "مضمض" بھی امر کا صیغہ ہے تو مضمضہ کو کیوں فرض نہیں کہا؟ شوافع اور مالکیہ کو جواب یہ ہے کہ حدیث میں وضو والا مضمضہ اور استنشاق مراد ہے غسل والا نہیں، یا سنن المرسلین سے ان کا طریقہ مراد ہے اور طریقہ فرض واجب اور سنت سب کو شامل ہے۔

۲۴ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ

مسئلة مسح الراس

اور حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ سرکار دو عالم ﷺ کس طرح وضو فرمایا کرتے تھے (یہ سن کر) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے وضو کا پانی منگوایا (جب پانی آ گیا تو) انہوں نے دونوں ہاتھوں پر (پانی) ڈالا اور انہیں (پہنچوں تک) دو دو مرتبہ دھویا پھر کلی کی اور پانی ڈال کر ناک کو جھاڑا تین تین مرتبہ اور پھر اپنا منہ تین مرتبہ دھویا پھر اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک دو دو مرتبہ دھوئے پھر دونوں ہاتھوں سے سر کا مسح کیا (اس طرح کہ) دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے تک لے گئے اور پیچھے سے آگے تک لائے یعنی انہوں نے اپنے سر کے اگلے جانب سے شروع کیا اور دونوں ہاتھوں کو گدی تک لے گئے پھر ان کو (پھیر کر) اسی جگہ واپس لائے جہاں سے شروع کیا تھا پھر دونوں پاؤں کو دھویا۔ (مالک، نسائی، ابوداؤد) [1]

اور بخاری و مسلم میں یہ روایت اس طرح ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم سے کہا گیا کہ جس طرح آنحضرت ﷺ وضو کرتے تھے اسی طرح آپ ہمارے سامنے وضو کیجئے چنانچہ عبداللہ بن زید نے (پانی کا) برتن منگوایا (جب پانی کا برتن آیا تو) انہوں نے اسے جھکایا اور اس سے اپنے ہاتھوں پر پانی ڈال کر انہیں تین تین مرتبہ دھویا پھر ہاتھ برتن میں داخل کیا اور اس سے پانی نکالا پھر (اسی) ایک چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی دیا اس طرح انہوں نے تین مرتبہ کیا پھر انہوں نے اپنا ہاتھ برتن میں ڈال کر پانی نکالا اور تین مرتبہ منہ دھویا پھر انہوں نے اپنا ہاتھ برتن میں ڈال کر نکالا اور سر کا مسح (اس طرح) کیا کہ اپنے دونوں ہاتھ آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی طرف لائے اور پھر اپنے دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا پھر فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کا یہی وضو تھا اور بخاری و مسلم کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ (مسح کے لئے) اپنے ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی طرف لائے یعنی اپنے سر کے اگلے حصہ سے (مسح) شروع کیا اور (ہاتھوں کو) گدی کی طرف لے گئے پھر گدی کی طرف سے وہیں لے آئے جہاں سے (مسح) شروع کیا تھا اور پھر اپنے پاؤں کو دھویا۔ صحیحین کی ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ "کلی کی، ناک میں پانی دیا اور ناک تین مرتبہ جھاڑی، تین چلوؤں سے" ایک اور روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ "پس کلی کی اور ایک ہی کلی سے ناک میں پانی ڈالا اس طرح تین مرتبہ کیا" بخاری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "پس سر کا مسح کیا (اس طرح کہ) اپنے دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پیچھے سے آگے کی طرف لے آئے اور یہ ایک مرتبہ کیا پھر دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا"۔

[1] المرقات ۱۰۵،۱۰۶/۲

بخاری ہی کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں ''پس کلی کی اور ناک جھاڑی تین مرتبہ صرف ایک چلو سے۔'' [1]

توضیح: ثم مسح راسه بيديه: سر کے مسح کا حکم قرآن کریم سے ثابت ہے اس کی فرضیت میں کسی کو اختلاف نہیں ہاں مقدار میں اختلاف ہے کہ کتنا حصہ فرض ہے اس میں چاروں ائمہ کا اختلاف اس طرح ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پورے سر کا مسح ایک بار ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اکثر حصہ سر کا مسح فرض ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کوئی خاص مقدار نہیں بلکہ "**ادنیٰ ما يطلق عليه المسح**" فرض ہے خواہ وہ بعض اشعر کیوں نہ ہوں ہاں ان کے ہاں مسح میں تثلیث سنت ہے یعنی تین بار تکرار سنت ہے۔

احناف کے ہاں **مقدار ناصیہ** فرض ہے جو **ربع رأس** چار انگلیوں کے اندازہ پر ہے استیعاب سنت ہے اور مسح میں تکرار نہیں ہے مسح کی تعریف اس طرح ہے "**إمرار اليد المبتلة العضو**" یعنی پانی سے تر ہاتھ کو کسی عضو پر پھیرنے کا نام مسح ہے۔

دلائل:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل قرآن کریم کی آیت "**وامسحوا برؤسكم**" ہے کہ یہاں با زائد ہے تو "**وامسحوا روسكم**" سے پورے سر کا مسح فرض ہو گیا یہاں پر "با" اسی طرح زائد ہے جس طرح تیمم کی آیت "**وامسحوا بوجوهكم**" میں زائد ہے وہاں پورا چہرہ مراد ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے کئی روایات منقول ہیں مگر ان سے مشہور یہی ہے کہ وہ اکثر سر کے مسح کو فرض کہتے ہیں ان کی دلیل بھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرح یہی آیت ہے لیکن وہ "**للا كثر حكم الكل**" کے قاعدے کے مطابق اکثر سر کے مسح کو فرض کہتے ہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت میں مطلق مسح کا ذکر ہے اور ایک فرد پر عمل کرنے سے مطلق پر عمل ہو جاتا ہے لہٰذا چند بالوں پر مسح کرنے سے مطلق کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل بھی یہی آیت ہے جس میں "**وامسحوا برؤسكم**" ہے طرز استدلال کا ایک طریقہ اس طرح ہے کہ جب کسی فعل کے بعد اس کا مفعول بہ آتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ فعل پورے مفعول بہ پر واقع ہو جائے بلکہ فعل اگر مفعول بہ کے بعض حصہ پر واقع ہو جائے تو مقصود پورا ہو جاتا ہے مثلاً "**اضرب زيدًا**" میں یہ مراد نہیں کہ زید کے ہر جز کو مارا جائے بلکہ زید کے کسی حصہ پر اگر ضرب واقع ہو گئی تو مقصود پورا ہو جائے گا اور امر کا امتثال ہو جائے گا اسی طرح "**وامسحوا**" میں امر کا صیغہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ سر کے کسی حصہ پر مسح ہو جائے خواہ وہ قلیل کیوں نہ ہو تو مسح کے اعتبار

---

[1] المرقات ۱۰۶،۱۰۷/۲

سے یہ آیت مجمل ہوگئی کہ کتنا حصہ مراد ہے اور مجمل کے لئے شارع کی طرف سے تفسیر چاہیئے چنانچہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس کی تفسیر ہوگئی جس میں مقدار ناصیہ کو متعین کیا گیا ہے الفاظ یہ ہیں "فمسح بناصیته" ناصیہ کی مقدار اور اندازہ ایک چوتھائی سر ہے یا چار انگلیوں کے برابر حصہ اور اتنا ہی فرض ہے۔

اصول کی کتابوں میں طرز استدلال اس طرح بھی لکھا ہے کہ "وامسحوا برؤسکم" میں با آلہ کے لئے ہے جو ذی آلہ اور محل پر داخل ہے جس سے استیعاب محل مقصود نہیں ہوتا ہے مثلاً محاورہ عرب ہے "مسحت الجدار بالید" سے کل جدار کا مسح مراد ہوتا ہے اور بعض حصہ ہاتھ کا مراد ہوتا ہے اور "مسحت بالجدار" میں بعض جدار کا مسح مراد ہوتا ہے کیونکہ یہاں "با" آلہ پر داخل نہیں بلکہ محل پر داخل ہے گویا "آلہ یا ذی الآلہ" جس پر بھی داخل ہوگا اس سے بعض مدخول مراد لیا جائے گا اور آیت میں "با" ذی الآلہ اور محل پر داخل ہے لہٰذا بعض محل مراد ہے اور وہ مجمل حصہ ہے جس کی تفسیر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوگئی ہے جو ناصیہ ہے جس کا اندازہ ایک چوتھائی سر ہے اور یہی فرض ہے۔

پہلا جواب: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو جواب یہ کہ "با" کو زائد مراد لینا خلاف اصل ہے جب "با" موجود ہے تو اس کو کیوں زائد کہتے ہیں باقی تیمم کی آیت پر مسح کی آیت کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ تیمم وضو کا قائم مقام ہے اور وضو میں پورا چہرہ فرض ہے۔ لہٰذا قائم مقام اور نائب میں بھی پورا چہرہ مراد لینا ضروری ہے تاکہ اصل اور نائب میں اختلاف نہ ہو۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ اگر استیعاب کو فرض کہو گے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے تعارض آجائے گا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیشہ استیعاب ثابت نہیں ہے۔ یہ جواب امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ہے اور ان کو دوسرا جواب یہ ہے کہ "للا کثر حکم الکل" تب ہوتا جب "با" موجود نہ ہوتا جب با آیا ہے تو بعض حصہ مراد لینا ضروری ہے جو مجمل ہے اور اس کی تفسیر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔

شوافع کو جواب یہ ہے کہ آیت مطلق نہیں ہے کیونکہ مطلق اور مقید کا مسئلہ مفاہیم اور افراد میں ہوتا ہے مقادیر میں نہیں ہوتا اور یہاں مقدار کی بحث ہے۔

لہٰذا آیت مطلق نہیں بلکہ مجمل ہے جس کی تفسیر کی ضرورت ہے اور وہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے نیز اگر شوافع کا مسلک لیا جائے تو پھر آیت میں سر کے مسح کو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی بلکہ وضو کرنے کے دوران ممکن نہیں کہ سینکڑوں بالوں پر مسح نہ آئے تو اس قسم کا مسح تو خود بخود حاصل ہو جاتا ہے پھر حکم قرآنی کی کیا ضرورت تھی بہر حال تمام بحث کے بعد احتیاط امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک میں ہے کہ پورے سر کا مسح کیا جائے تاکہ اختلاف ختم ہو جائے۔

مسح میں تکرار کا حکم:

اب یہ مسئلہ رہ گیا کہ سر کا مسح ایک بار کرنا ہے یا تین بار کرنا ہے اس میں تثلیث وتکرار مسنون ہے یا توحید وعدم تکرار مسنون ہے تو جمہور فقہاء کے نزدیک یہ ایک بار ہے اور عدم تکرار مسنون ہے اور شوافع کے نزدیک تثلیث اور تکرار مسنون ہے۔
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بعض روایات سے استدلال کیا ہے جن میں تین بار مسح کا ذکر آیا ہے اور ابوداؤد شریف کے ص ۱۴ پر یہ حدیث مذکور ہے۔ [1]
شوافع کی دوسری دلیل مسح کو **اعضاء مغسولہ** پر قیاس کرنا ہے کہ جب **اعضاء مغسولہ** میں تین بار غسل ہے اور تکرار ہے تو مسح میں بھی تکرار ہونا چاہیے۔
جمہور کے دلائل تو بے شمار احادیث ہیں جن میں دیگر اعضاء کے تین بار دھونے کا ذکر ہے اور مسح کرنے میں ایک بار کا ذکر آیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی احادیث میں جہاں بھی ذکر آیا ہے وہاں تکرار نہیں اس لئے ابوداؤد نے یہ فیصلہ سنایا ہے:

"**احادیث عثمان الصحاح کلها تدل علی مسح الراس انها واحدة**"۔

اس سے شوافع کی دلیل کا جواب ہو گیا کہ جہاں تثلیث کا ذکر آیا ہے وہ روایت قابل استدلال نہیں ہے۔ دوسرا جواب یہ کہ جو تکرار کسی نے دیکھا ہے وہ مسح کے بعد سر کے بال بنانے کے لئے ہاتھ پھیرنا تھا مسح کا تکرار نہیں تھا دیکھنے والے نے اس کو تکرار سمجھا۔ تیسرا جواب یہ کہ اگر مسح میں تکرار کرو گے تو یہ غسل بن جائے گا حالانکہ شریعت نے سر کے لئے مسح مقرر کیا ہے تا کہ اس میں تخفیف ہو کیونکہ سر جسم کا بادشاہ ہے اور یہ **بلد العلماء** ہے۔ یعنی جتنے اسباب علم ہیں وہ سب سر میں ہیں جیسے **قوت سامعه، قوت باصرہ، قوت شامه، قوت ذائقه** اور **قوت لامسه** یہ سب سر میں ہیں لہٰذا سر کا اعزاز یہی ہے کہ اس پر خفیف سا مسح کیا جائے اب اگر تثلیث آجائے تو وہ غسل بن جائے گا جو اس تخفیف اور اعزاز کے منافی ہے۔
باقی اگر آپ سر کو دیگر اعضاء کے دھونے پر قیاس کرتے ہیں تو یہ **قیاس مع الفارق** ہے اور اس سے اوپر والی حکمت بھی فوت ہو جاتی ہے اور اگر سر کے مسح کو دیگر **ممسوحہ** مقامات پر قیاس کرے ہو مثلاً **جبیرہ** اور زخم کی پٹی وغیرہ پر تو یہ قیاس بھی تکرار کے لئے صحیح نہیں ہے کیونکہ وہاں ایک بار مسح ہوتا ہے تکرار نہیں ہوتی ہے۔ فقہاء نے یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ ایک عضو میں مسح اور غسل دونوں جمع نہیں ہو سکتے ہیں۔
فاقبل بهما وادبر: اس جملہ کا لفظی ترجمہ اس طرح ہے کہ سر کے پیچھے کی طرف سے آگے کی طرف مسح کرنے میں ہاتھ لے آئے اور پھر آگے کی طرف سے پیچھے کی طرف لے گئے۔ اس ترجمہ کے مطابق بعض سلف نے عمل بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ سر کے پیچھے کی طرف سے مسح شروع کیا جائے لیکن احناف اور جمہور فقہاء اس کے خلاف ہیں وہ فرماتے ہیں کہ سر کے

[1] المرقات ۲/۱۰۷

اگلے حصہ سے مسح شروع کیا جائے گا اور پچھلے حصہ پر جا کر ختم ہوگا اس مفہوم کو واضح کرنے کیلئے اس جملہ کی تفسیر "بدأ بمقدم راسه" سے کی گئی ہے تا کہ خلاف واقع مفہوم میں کوئی نہ پڑ جائے ویسے جن حضرات نے ظاہر الفاظ کا ترجمہ لیا ہے وہ ترجمہ عربیت اور محاورۂ عرب کے خلاف ہے کیونکہ محاورہ میں عرب ہمیشہ اقبال اور لفظ اقبل کو مقدم ذکر کرتے ہیں۔ جیسے امرأ القیس نے اپنے گھوڑے کی تعریف میں اقبال کے لفظ کو پہلے ذکر کیا ہے:

مکر مفر مقبل مدبر معا　　کجلمود صخر حطه السیل من عل

تو فعل میں ادبار یعنی پیچھے کی طرف لے جانا مقدم ہوتا ہے اور قول میں اقبال یعنی آگے کی طرف لانا مقدم ہوتا ہے اس تشریح سے اس عبارت پر وہ اعتراض بھی ختم ہوگیا کہ یہ تفسیر اپنے **مفسر** کے خلاف ہے اعتراض اس لئے ختم ہوا کہ محاورہ کو اگر دیکھا جائے تو یہ تفسیر بالکل اپنے **مفسر** کے موافق ہے۔

گردن کا مسح:

چونکہ سر کے مسح کی بحث چل رہی ہے تو یہ اشارہ بھی مناسب ہوگا کہ **مسح رقبہ** یعنی گردن کے مسح کی شریعت میں کیا حیثیت ہے فقہاء کرام کا اس میں اختلاف ہے احناف میں سے بعض حضرات نے اس کو سنت اور بعض نے مستحب لکھا ہے قاضی خان نے لکھا ہے کہ گردن کا مسح نہ سنت ہے اور نہ مستحب ہے ہاں بعض نے اس کو سنت کہا ہے اور جب فقہاء کے اقوال میں اختلاف ہوگیا تو اب نہ کرنے سے مسح کرنا بہتر ہوگا۔ (قاضی خان ج ۱ ص ۱۷)

علامہ نووی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو بدعت کہا ہے علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اس بارے میں کوئی حدیث صحیح ثابت نہیں ہے لیکن احناف کے بعض علماء اور شوافع کے بھی بہت سارے علماء گردن کے مسح کو سنت یا مستحب کہتے ہیں۔

نواب صدیق حسن خان صاحب غیر مقلد نے "بدور الاھلہ ص ۲۸" پر لکھا ہے کہ **مسح رقبہ** کی حدیث کو غیر صحیح کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ **مسح رقبہ** کی روایات تعدد طرق کی وجہ سے استدلال کے قابل ہیں احناف کی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ **حلقوم** کا مسح بدعت ہے اور گردن کا مسح جائز ہے (بہر حال میں نے بڑے علماء کو وضو کے دوران مسح کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ (راقم)

مضمضہ کی کیفیت:

من کف واحدۃ: حدیث مبارک کے اس لفظ سے مضمضہ اور استنشاق کی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی کیفیت اور طرز عمل میں احناف اور شوافع نے اپنے اپنے انداز سے الگ الگ طریقہ کو افضل اور اولیٰ قرار دیا ہے اس میں کل پانچ طریقے ہیں احناف نے پانچویں طریقہ کو افضل اور راجح کہا ہے اور شوافع نے چوتھے طریقے کو پسندیدہ قرار دیا

ہے جائز سب طریقے ہیں۔

❶ اول طریقہ یہ کہ ایک چلو پانی ہاتھ میں لے کر ایک ساتھ منہ اور ناک میں تین بار پانی ڈالا جائے یعنی ایک ہی چلو کا کچھ پانی منہ میں اور کچھ ناک میں تین بار ڈالا جائے۔

❷ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک ہی چلو پانی ہے مگر پہلے منہ میں اس کا کچھ حصہ تین بار ڈالا جائے اور پھر باقی حصہ ناک میں تین بار ڈالا جائے۔

❸ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک چلو سے تین بار مضمضہ کیا جائے پھر دوسرے چلو سے تین بار استنشاق کیا جائے۔

❹ چوتھا طریقہ جو شوافع کے ہاں پسندیدہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک چلو سے اولاً مضمضہ اور استنشاق کیا جائے پھر دوسرا چلو لے کر مضمضہ اور استنشاق کرے اور پھر تیسرا چلو لے کر مضمضہ اور استنشاق کرے۔

❺ پانچواں طریقہ یہ ہے کہ الگ الگ تین چلو سے مضمضہ کیا جائے پھر الگ الگ تین چلو لے کر استنشاق کیا جائے گویا چھ چلوؤں سے دونوں کا کام ہو جائے گا یہ طریقہ احناف کے ہاں پسندیدہ ہے۔

اس تفصیل کو آپ مختصر طور پر اس طرح سمجھ لیں کہ مضمضہ کی کیفیت میں چار قول ہیں: ① غرفۃ ② غرفتین ③ ثلاث غرفات ④ ست غرفات۔ یہ چوتھا قول احناف کے ہاں افضل ہے اور تیسرا قول شوافع کے ہاں افضل ہے۔

شوافع حضرات نے زیر بحث حدیث "من کف واحدۃ" کے الفاظ سے استدلال کیا ہے کہ اس میں غرفات میں وصل کا بیان ہے تو چوتھا طریقہ اس کا بہترین مصداق ہے۔

ائمہ احناف نے کئی روایات سے استدلال کیا ہے لیکن ترمذی کی روایت سب سے زیادہ واضح ہے اور وہ ص ۱۴ پر عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:[1]

"قال رأیت النبی ﷺ مضمض واستنشق من کف واحد فعل ذلك ثلاثا"۔ (رواہ الترمذی)

ادھر ابوداؤد میں بھی یہ الفاظ ہیں صحابی فرماتے ہیں: "فرأیته یفصل بین المضمضة والاستنشاق" (ص ۱۹)

ائمہ احناف "من کفۃ واحدۃ" کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد یہ کہ مضمضہ اور استنشاق میں ایک ہاتھ کو استعمال میں لاؤ ایک ہاتھ کے چلو سے کام چلاؤ چہرہ کی طرح دونوں ہاتھوں کو استعمال نہ کرو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک چلو سے مضمضہ اور استنشاق بیان جواز کے لئے ہے تو جائز ہم بھی مانتے ہیں اور شوافع کے ہاں فصل بھی جائز ہے تو کوئی اختلاف نہیں اولیٰ غیر اولیٰ کا مسئلہ ہے نیز قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ وضو کے تمام اعضاء کے لئے الگ الگ پانی لے کر تین بار استعمال کیا جاتا ہے تو ناک اور منہ کا بھی اسی طرح حکم ہونا چاہئے نیز زیر نظر روایت میں بھی ثلاث غرفات کے الفاظ موجود ہیں جو احناف کی واضح دلیل ہے۔

---

[1] المرقات ۲/۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷

ادنیٰ درجہ کا وضو

﴿۳﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ تَوَضَّأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَرَّةً مَرَّةً لَمْ يَزِدْ عَلٰى هٰذَا۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ''سرکار دو عالم ﷺ نے ایک ایک مرتبہ وضو کیا (یعنی تمام اعضاء وضو کو صرف ایک ایک مرتبہ دھویا) اور اس پر زیادہ نہیں کیا'' (بخاری)

توضیح: سب سے افضل اور اعلیٰ وضو تو وہی ہے جس میں تین بار پانی ہر عضو میں استعمال کیا جائے اگر پانی کم ہے یا بدن کی حالت یا مکان و مقام یا بیان جواز کی حالت کا تقاضا اس سے کم کا ہو تو پھر دو دو بار پانی استعمال کرنا جائز ہے اور اگر حالات اس قسم کے ہیں کہ ایک بار سے زیادہ گنجائش نہیں تو جواز کے طور پر ایک بار بھی کافی ہے وضو ہو جائے گا آنے والی حدیثوں میں یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

متوسط درجہ کا وضو

﴿۴﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[2]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے دو دو مرتبہ وضو کیا (یعنی اعضاء وضو کو دو دو بار دھویا)۔ (بخاری)

اعلیٰ درجہ کا وضو

﴿۵﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ أَنَّهُ تَوَضَّأَ بِالْمَقَاعِدِ فَقَالَ أَلَا أُرِيْكُمْ وُضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَتَوَضَّأَ ثَلَاثًا ثَلَاثًا۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[3]

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے مقام مقاعد میں وضو کیا اور کہا کہ کیا تمہیں آنحضرت ﷺ کا وضو نہ دکھلاؤں چنانچہ انہوں نے تین تین مرتبہ وضو کیا (یعنی انہوں نے اعضاء وضو کو تین تین بار دھو کر بتایا کہ آنحضرت ﷺ اس طرح وضو فرماتے تھے)۔ (مسلم)

مقاعد: مسجد نبوی سے باہر باتوں کے لئے اور بیٹھنے کے لئے ایک جگہ تھی مقاعد اس کا نام تھا یہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بنائی تھی تاکہ لوگ مسجد میں باتیں نہ کریں۔[4]

---

[1] اخرجہ البخاری ۱/۵۱ [2] اخرجہ البخاری ۱/۵۱ [3] اخرجہ مسلم ۱/۱۲۲ [4] المرقات ۲/۱۰۸

۲۵ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ

مسئلة غسل الرجلين

﴿٦﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَجَعْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ مِنْ مَكَّةَ إِلَى الْمَدِيْنَةِ حَتّٰى إِذَا كُنَّا بِمَاءٍ بِالطَّرِيْقِ تَعَجَّلَ قَوْمٌ عِنْدَ الْعَصْرِ فَتَوَضَّؤُا وَهُمْ عُجَّالٌ فَانْتَهَيْنَا إِلَيْهِمْ وَأَعْقَابُهُمْ تَلُوْحُ لَمْ يَمَسَّهَا الْمَاءُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ أَسْبِغُوا الْوُضُوْءَ. (رواه مسلم)[1]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرمایا کہ ہم سرکار دو عالم ﷺ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کو واپس لوٹے یہاں تک کہ جس وقت ہم پانی پر پہنچے جو راستہ میں تھا تو کچھ لوگوں نے نماز عصر کے لئے وضو کرنے میں جلدی کی اور وہ لوگ بہت جلدی کرنے والے تھے چنانچہ جب ہم ان لوگوں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ان کی ایڑیاں چمک رہی تھیں (یعنی خشک رہ گئی تھیں کیونکہ) ان تک پانی نہیں پہنچا تھا (ان کی خشک ایڑیوں کو دیکھ کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا ویل (خرابی) ہے ایڑیوں کے لئے آگ ہے، وضو کو پورا کرو۔ (مسلم)

توضیح: ویل للأعقاب من النار: تمام اہل سنت تمام صحابہ وتابعین اور تمام فقہاء وصلحا اور علماء سلفاً وخلفاً اس پر متفق ہیں کہ وظیفۂ رجلین وضو میں غسل ہے اور عدم تخفف کی حالت میں پاؤں پر مسح کرنا بالکل جائز نہیں ہے شیعہ امامیہ اور روافض نے اس مسئلہ میں پوری امت کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ **وظیفۂ رجلین** صرف مسح ہے غسل نہیں بعض نے یہ مسلک ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی طرف بھی منسوب کیا ہے لیکن ابن جریر طبری دو ہیں ایک سنی ہے ایک شیعہ ہے یہاں سنی مراد نہیں ہے اور اگر ابن جریر سنی بھی ہو تو ان کا کلام اس مسئلہ میں صریح نہیں صرف کلام میں وھم ہے۔[2]

دلائل شیعہ:

شیعہ روافض نے آیت الوضو میں "**وأرجلكم الى الكعبين**" کی جر والی قرأت سے استدلال کیا ہے کہ جر کی صورت میں یہ "**رؤسكم**" پر عطف ہے یعنی سر پر مسح کرو اور پاؤں پر بھی مسح کرو شیعہ نے کہا کہ "**أرجلكم**" میں نصب والی قرأت بنزع الخافض ہے یعنی "**أرجلكم**" نصب کی صورت میں درحقیقت "**بأرجلكم**" تھا با کو ہٹانے کی وجہ سے نصب آ گیا۔[3]

شیعہ کی دوسری دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے جس کے الفاظ کم وبیش اس طرح ہیں "**لا يدل كلام الله الا بالمسح**

[1] اخرجه مسلم ۱/۱۴۷ [2] المرقات ۲/۱۱۰ [3] المرقات ۲/۱۱۰

وأبي الناس الا الغسل" بعض نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں "أمر الله بالمسح وابی الناس الا الغسل" اسی طرح شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ اقوال بھی پیش کرتے ہیں۔

اہل السنۃ کے دلائل:

اہل سنت والجماعۃ کی دلیل بھی آیت الوضو ہے لیکن وہ "وارجلکم" میں نصب کی قرأت کو لیتے ہیں جو "فاغسلوا وجوهکم" پر عطف ہے جو دھونے پر واضح دلیل ہے جمہور کی دوسری دلیل زیر بحث حدیث ہے جس میں پاؤں کی ایڑی خشک رہنے پر شدید وعید آئی ہے جو معلوم ہوا پاؤں کا وظیفہ مکمل طور پر دھونا ہے۔[1]

جمہور کی تیسری دلیل حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جو درحقیقت آیت الوضو کی تفسیر ہے حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو کے متعلق پوچھا آپ نے جواب کے ضمن میں فرمایا:

"ثم يغسل قدميه الى الكعبين كما امر الله تعالىٰ"۔ (رواه ابن خزيمه وابو عوانه)

اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اللہ کا حکم "وارجلکم الى الكعبين" سے غسل اور دھونا مراد ہے جمہور نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری زندگی میں کبھی ننگے پاؤں پر مسح ثابت نہیں ہے نہ صحابہ کرام نے ایسا کیا ہے بلکہ سب کا عمل غسل پر تھا گویا ایسا اجماع ہے جس میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔

جوابات:

جمہور نے شیعہ شنیعہ کے دلائل کے کئی جوابات دیئے ہیں۔

پہلا جواب: یہ ہے کہ آیت میں جو جر کی قرات آئی ہے یہ جر جوار ہے یعنی ایک کلمہ کے پڑوس کی وجہ سے کبھی کبھی اس کا اعراب دوسرے کلمہ کو دیا جاتا ہے تو آیت میں برؤوسکم میں جر تھا تو وأرجلکم کو بھی اس پڑوس کی وجہ سے مجرور پڑھا گیا یہ لفظوں کے مسح کے ساتھ ہے لیکن معنی کے اعتبار سے یہ مغسول کے ساتھ ہے کلام عرب میں جر جوار کا اعتبار ہے چنانچہ عبدالرسول لکھتے ہیں:

گاہ اسمے میشود مجرور از بہر جوار ہم ازیں جانزد عامہ جر ارجل شد روا

یعنی کبھی کبھی کوئی اسم جر جوار کی وجہ سے مجرور ہوجاتا ہے اسی وجہ سے عام علماء کے نزدیک وارجلکم میں جر آگیا ہے۔

جر جوار قرآن عظیم سے بھی ثابت ہے جیسے "عَذَابُ يَوْمٍ أَلِيمٍ" الیم عذاب کی صفت ہے جو مرفوع ہونا چاہئے تھا مگر یوم کے پڑوس کی وجہ سے مجرور ہوگیا ہے۔[2]

اور جیسے "عَذَابُ يَوْمٍ مُّحِيطٍ" ہے کہ محیط جر جوار کی وجہ سے مجرور ہے نیز "جُحْرُ ضَبٍّ خَرِبٍ"۔ "مَاءُ شَنٍّ بَارِدٍ" اسی طرح حدیث میں "مَنْ مَلَكَ ذَا رَحِمٍ مَحْرَمٍ" یہاں محرم جر جوار کی وجہ سے مجرور ہے۔ عرب اور عربیت

[1] المرقات ۲/۱۱۰ [2] المرقات ۲/۱۱۰

کا مشہور شاعر امرا القیس کہتا ہے:

کأن ثبیر فی عرانین و بله کبیر اناس فی بجاد مزمل

یہاں "**مزمل**" **کبیر اناس** کی صفت ہے اسے مرفوع ہونا چاہئیے مگر "**بجاد**" کے پڑوس کی وجہ سے مجرور ہو گیا ہے۔

عبدالرسول جو مشہور نحوی ہیں انہوں نے یہاں اعتراض کیا ہے کہ جر جوار سلسلۂ معطوفات میں ممنوع ہے اور یہاں آیت میں **وارجلکم** معطوف ہے۔

اس کا جواب روح المعانی نے دیا ہے کہ عبدالرسول کا یہ کہنا غلط ہے کیونکہ محاورۂ عرب میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں خود قرآن کریم میں "**وحور عین**" سلسلہ معطوفات میں جر جوار کے ساتھ آیا ہے پورا کلام اس طرح ہے **ولحم طیر مما یشتھون و حور عین** (سورہ واقعہ آیت ۲۲) [۱] یہاں پر کسائی اور حمزہ اور عاصم کی قرأت میں **حور عین** میں "**حور**" مجرور ہے جر جوار کے ساتھ مجرور ہے اور اس کا پڑوسی لحم کا کلمہ ہے جو پہلے سے مجرور چلا آ رہا ہے باقی قرأتوں میں یہ مرفوع ہے۔

جمہور امت کی طرف سے شیعہ کو دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عبدالرسول کے اس اشکال کی وجہ سے ابن حاجب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور راستہ اختیار کیا ہے آپ نے لکھا ہے کہ "**وارجلکم**" اصل میں فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے اصل عبارت اس طرح ہے: "**وامسحوا برؤسکم واغسلوا ارجلکم**"۔

وہ فرماتے ہیں کہ یہ از قبیل **علفتھا تبنا وماء باردا** ہے کہ موجودہ عامل کے علاوہ اصل عامل محذوف ہے کیونکہ موجودہ عامل کے ساتھ معنی صحیح نہیں رہتا یعنی میں نے اونٹنی کو چارہ اور ٹھنڈا پانی کھلایا حالانکہ پانی پلایا جاتا ہے کھلایا نہیں جاتا لہٰذا معنی کو درست کرنے کے لئے مناسب فعل کو محذوف ماننا پڑے گا اور وہ **سقیتھا** ہے یعنی **سقیتھا ماء باردا** ایک اور مثال ہے:

"وزججن الحواجب والعیونا":

اذا ما الغانیات برزن یوما وزججن الحواجب والعیونا

"**ای واکتحلن العیونا**" یعنی جب گیت گانے والی عورتیں ایک دن نکل آئیں تو انہوں نے ابرو کے بالوں کو استرہ سے بنایا اور آنکھوں میں سرمہ ڈالا تو یہاں معنی درست کرنے کے لئے **واکتحلن** فعل محذوف ہے کیونکہ آنکھوں میں استرہ نہیں چلتا بلکہ سرمہ ڈالا جاتا ہے اسی طرح شاعر کا یہ شعر ہے:

یا لیت بعلك فی الوغی متقلدا سیفا ورمحا [۲]

اے کاش اگر تیرا شوہر لڑائی کے دن تلوار و نیزہ کو گلے میں باندھ کر آتا۔

---

[۱] واقعہ ۲۲ [۲] المرقات ۲/۱۱۰

یہاں "رمحًا" سے پہلے "حاملًا" محذوف ہے تاکہ مطلب درست ہو جائے یعنی تلوار گلے میں اور نیزہ کندھے پر اٹھا کر آئے تو جس طرح ان مقامات میں معمول کے لئے مناسب فعل محذوف ماننا پڑا ہے اسی طرح وأرجلکم کے لئے واغسلوا کا فعل محذوف ماننا پڑے گا اور پہلا اغسلوا اس پر دلالت بھی کرتا ہے واغسلوا کا فعل اس لئے محذوف ماننا پڑے گا کہ "الی الکعبین" کا جو لفظ قرآن کی آیت میں موجود ہے یہ قطعاً مسح کو قبول نہیں کرتا ہے کیونکہ مسح میں کسی کے ہاں ٹخنوں تک مسح کرنا لازم نہیں ہے تو یہ الفاظ بہانگ دہل کہہ رہے ہیں کہ یہاں پاؤں کا دھونا مراد ہے مسح مراد نہیں ہے واغسلوا محذوف ماننا پڑے گا نیز فعل رسول اور فعل صحابہ اور تمام احادیث بھی کہہ رہی ہیں کہ یہاں پاؤں کا مسح مراد نہیں ہے ان وجوہات کی بناء پر لامحالہ قرأت جر میں تاویل کرنا ضروری ہے۔

جمہور امت نے تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ نصب کی صورت میں "واغسلوا" فعل مقدر ہے اور جر کی صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ قرآن نے حالت تخفف کی صورت بیان کی ہے یعنی اگر موزہ پہنا ہوا ہو تو پھر مسح کافی ہے لیکن الی الکعبین نے جو تحدید کی ہے اس کے پیش نظر یہ جواب کمزور ہے کیونکہ مسح میں کعبین تک کی کوئی قید نہیں جبکہ قرآن مقید ہے معلوم ہوا مسح کی صورت نہیں۔

جواب ۴: اب رہ گیا یہ کہ شیعہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جو روایت نقل کی ہے تو اہل جرح وتعدیل اور محدثین کا کہنا ہے کہ یہ روایت من گھڑت ہے جس کو شیعہ نے گھڑ رکھا ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں یا صحیح احادیث کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی نہیں ہے باقی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایات بھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی ہیں یا وہ حالت تخفف یعنی موزہ پہننے کی حالت پر محمول ہیں یا وضو علی الوضو کی صورت میں ہے۔

شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے لمعات میں بحوالہ طحاوی پاؤں کے مسح اور غسل کے متعلق لکھا ہے کہ آیت میں نصب اور جر دونوں قرأتیں ہیں اور مستند بھی ہیں اور دونوں میں تعارض ہے جب اس طرح تعارض ہوتا ہے تو دونوں کے حکم کو ساقط کر کے حدیث کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور احادیث مشہورہ کثیرہ نے بھی غسل رجلین کا حکم دیا ہے لہٰذا غسل متعین ہے مسح ناجائز ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مسح کا حکم اگر محدود زمانہ کے لئے تھا بھی تو وہ پھر منسوخ ہو گیا ہے علماء نے لکھا ہے کہ غسل رجلین کو اللہ تعالیٰ نے مسح کے ساتھ رکھا کہ پاؤں دھوتے وقت پانی میں اسراف سے بچنے کا احساس دلایا جائے کیونکہ لوگ پاؤں پر زیادہ پانی ڈالتے ہیں۔[1]

بہر حال احادیث صحیحہ صریحہ کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا دائمی اجماعی عمل موجود ہے اور پھر تابعین فقہاء کرام اور امت محمدیہ کا یہ متفقہ موقف موجود ہے اس کے باوجود شیعہ روافض پاؤں پر مسح کرنے پر تلے ہوئے

[1] اشعۃ اللمعات ۱/۲۳۶

ہیں یہ ان کی بڑی گمراہی ہے۔ اور اس ہٹ دھرمی سے ان کی وہ نمازیں بھی بیکار ہوگئیں جو وہ لوگ کبھی کبھار پڑھتے ہیں۔

ویل: یہ کلمہ ہلاکت کی بددعاء کے لئے آتا ہے بعض نے کہا کہ دوزخ میں ایک خاص وادی کا نام ہے۔[1]

الاعقاب: یہ عقب کی جمع ہے ایڑی کو کہتے ہیں یہاں ایڑی کو امر واقعہ کی وجہ سے خاص کیا کہ ایڑیاں خشک رہ گئی تھیں یا اس لئے کہ عام طور پر ایڑی ہی خشک رہ جاتی ہے اس کا الف لام استغراق عرفی کے لئے ہے یعنی دنیا بھر کی ایڑیوں کے لئے بددعا نہیں بلکہ جو ایڑیاں خشک رہ گئی تھیں ان کے لئے بددعا ہے۔[2]

یہاں مضاف محذوف ہے یعنی خشک ایڑیوں کے مالک کیلئے **ویل** اور سختی و مشقت اور ہلاکت ہے۔

۲۶ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

مسئلة مسح العمامة

﴿۷﴾ وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعَلَى الْعِمَامَةِ وَعَلَى الْخُفَّيْنِ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[3]

ترجمہ: اور حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے وضو کیا چنانچہ آپ نے اپنی پیشانی کے بالوں کے اوپر اور پگڑی پر اور موزوں پر مسح کیا۔ (مسلم)

توضیح: **وعلى العمامة:** اس روایت میں **مسح على الناصية** کے ساتھ **مسح على العمامة** کا ذکر بھی آگیا ہے اس وجہ سے فقہاء کرام کے درمیان **مسح على العمامة** کے مسئلہ میں اختلاف آگیا۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ امام اوزاعی رحمہ اللہ داؤد ظاہری اور اسحاق بن راہویہ کے نزدیک عمامہ پر مسح جائز ہے اس سے سر کے مسح کا فرض پورا ہو جاتا ہے البتہ امام احمد رحمہ اللہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ پگڑی طہارت پر پہنی ہو۔ دوسری شرط یہ کہ عمامہ **مُحَنَّكَة** ہو یعنی ٹھوڑی کے نیچے لپیٹا گیا ہو اور پورے سر پر حاوی اور محیط ہو جس طرح موزہ کے لئے پاؤں پر محیط ہونا ضروری ہے امام مالک رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ یعنی جمہور کے نزدیک **مسح على العمامة** جائز نہیں ہے اس سے فرض پورا نہیں ہوگا۔[4]

دلائل:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور اہل ظواہر نے زیر بحث مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جس میں عمامہ پر مسح کا ذکر موجود ہے اس کے علاوہ سنن میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی روایت اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال

---

[1] المرقات ۲/۱۰۹ [2] المرقات ۲/۱۰۹ [3] اخرجہ مسلم ۱/۱۵۹ [4] المرقات ۲/۱۱۱

کیا ہے جس میں عمامہ کا ذکر ہے۔
ان حضرات نے **علی الخفین** پر قیاس بھی کیا ہے کہ جب پاؤں کے بجائے موزہ پر مسح جائز ہے تو سر کے بجائے عمامہ پر بھی مسح جائز ہے دونوں کا حکم ایک جیسا ہونا چاہیئے۔[1]
جمہور کی پہلی دلیل تو قرآن کریم کی وہ آیت ہے جس میں "**وامسحوا برؤسکم**" کا حکم ہے کہ سر پر مسح کرو اور سر غیر ہے اور پگڑی غیر ہے پگڑی پر مسح کرنے سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سر پر مسح کیا اللہ تعالیٰ کا حکم سر پر مسح کرنے کا ہے پگڑی پر نہیں جمہور کی دوسری دلیل وہ صحیح اور صریح احادیث ہیں جو تقریباً ۸۰ صحابہ کرام سے ثابت ہیں جن میں سر کے مسح کا ذکر موجود ہے اور عمامہ کا کوئی ذکر نہیں ہے جمہور نے **مسح علی العمامة** کی حدیث کا کئی طریقوں سے جواب دیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

جواب: کتاب اللہ کی آیت نص قطعی ہے اور مسح علی العمامہ کی روایات اخبار آحاد ہیں لہٰذا ہم نہ آیت الوضو میں ان احادیث محتملہ کی وجہ سے تخصیص کر سکتے ہیں نہ آیت میں تقید کر سکتے ہیں اور نہ اس میں تاویل کر سکتے ہیں۔
نیز مسح راس کے مسئلے میں اسی (۸۰) صحابہ کرام کی جو روایات ہیں نہ ہم ان کو چھوڑ سکتے ہیں تو آیت کی موجودگی میں اور صحیح صریح کثیر احادیث کی موجودگی میں ہم مسح عمامہ کی اخبار آحاد و غرائب اور محتمل و مضطرب روایات کو کیسے لے سکتے ہیں۔
مسح عمامہ کی روایات میں ایک احتمال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مقدار ناصیہ پر مسح کرنے کے بعد پگڑی پر مسح کیا ہو اور بعض روایات میں اس کا ذکر ملتا ہے تو صرف عمامہ پر مسح نہیں تھا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ مسح اس قناع اور نرم کپڑے پر تھا جو آنحضرت ﷺ پگڑی کے نیچے استعمال فرماتے تھے اس قناع کو عمامہ سے یاد کیا گیا اور قناع باریک ہوتا ہے تو سر پر مسح ہو جاتا ہے۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اصل مسح تو سر پر کیا تھا پھر سر پر عمامہ رکھنے کے بعد اس پر ہاتھ پھیرا تا کہ عمامہ کو درست فرمالیں اسی کو دیکھنے والے نے عمامہ پر مسح سمجھ کر بیان کیا۔ چوتھا احتمال یہ ہوسکتا ہے کہ یہ **وضو علی الوضو** کی صورت میں ہو اور وہاں تو مسح سر کی ضرورت بھی نہیں لہٰذا اگر عمامہ پر مسح کیا تو کیا ہوا؟۔ پانچواں احتمال یہ بھی ہے کہ مسح راس قصدی طور پر تھا اور مسح عمامہ تبعی طور پر تھا۔
امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسح عمامہ کا حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ شیخ ابو عمرو نے تمہید میں لکھا ہے کہ مسح عمامہ کی ساری روایات معلول ہیں۔ عام علماء فرماتے ہیں کہ مسح عمامہ کی روایات اتنی قوی نہیں جو دیگر صحیح احادیث کا مقابلہ کر سکیں جس پر مسح کا حکم موجود ہے۔

﴿۸﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ فِي شَأْنِهِ كُلِّهِ فِي طُهُوْرِهِ وَتَرَجُّلِهِ وَتَنَعُّلِهِ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

---

[1] المرقات ۲/۱۱۱ [2] اخرجه احمد ۲۵۴ ومسلم ۱/۱۵۵

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ حتی الامکان اپنے تمام کاموں کو سیدھے ہاتھ سے شروع کرنا محبوب رکھتے تھے (مثلاً) اپنی طہارت میں، اپنی کنگھی کرنے میں، اپنا جوتا پہننے میں۔ (بخاری ومسلم)

الفصل الثانی

﴿۹﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا لَبِسْتُمْ وَإِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَأُوْا بِأَيَامِنِكُمْ.

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ) ۱

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم (لباس وغیرہ) پہنو یا وضو کرو تو اپنے دائیں طرف سے شروع کرو۔ (احمد، ابوداؤد)

مسئلة التسمية عند الوضوء

﴿۱۰﴾ وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللهِ عَلَيْهِ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ وَالدَّارِمِيُّ عَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ عَنْ أَبِيْهِ وَزَادُوْا فِي أَوَّلِهِ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَا وُضُوْءَ لَهُ) ۲

ترجمہ: اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے (وضو کے وقت) اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا اس کا وضو نہیں ہوا (ترمذی، ابن ماجہ) اور احمد و ابوداؤد نے اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور دارمی نے ابن ابوسعید خدری سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے نیز ان لوگوں نے اپنی روایت کے شروع میں یہ الفاظ زائد ذکر کئے ہیں کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جس نے وضو نہیں کیا۔

توضیح: **لا وضوء:** اس پر پوری امت متفق ہے کہ وضو کے شروع میں **بسم اللہ** پڑھنا مستحب اور پسندیدہ فعل ہے ہاں **بسم اللہ** کی قانونی حیثیت میں اختلاف ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اسحاق بن راھویہ داؤد ظاہری اور اہل ظواہر کا مسلک یہ ہے کہ وضو سے پہلے **بسم اللہ** پڑھنا فرض اور واجب ہے البتہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے بھول کر چھوڑ دی تو وضو ہو جائے گا لیکن اہل ظواہر وغیرہ کے ہاں نسیاناً چھوڑنے سے بھی وضو نہیں ہوگا۔

۱ اخرجه احمد ۲/۳۵۴ ۲ اخرجه الترمذی ۲۶ وابو داؤد

جمہور فقہاء اور ائمہ فرماتے ہیں کہ تسمیہ وضو میں مسنون ہے اگر تسمیہ رہ گیا تو وضو ہو جائے گا۔[1]

دلائل:

جو حضرات وضو میں تسمیہ کے وجوب اور فرضیت کے قائل ہیں ان کی دلیل یہی زیر بحث حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں لا وضوء کا لفظ موجود ہے جس سے نفی کلی مراد ہے کہ بغیر تسمیہ وضو صحیح ہی نہیں۔

جمہور نے سب سے پہلے قرآن کی آیت الوضو سے استدلال کیا ہے کہ اگر تسمیہ فرض یا واجب ہوتا تو قرآن میں اس کا ذکر آتا جیسا کہ باقی فرائض کا ذکر آیا ہے جب قرآن نے وضو کے فرائض میں تسمیہ کو شمار نہیں کیا ہے تو خبر واحد سے اس کو فرض یا واجب کہنا اصولاً صحیح نہیں ہے اور یہ کتاب اللہ پر زیادت کے مترادف ہے اور یہ نسخ کے قبیل سے ہے جو جائز نہیں ہے۔

جمہور کی دوسری دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی صریح حدیث ہے جو مشکوۃ ص ۴۷ پر موجود ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جس نے وضو کے ساتھ بسم اللہ پڑھ لی تو یہ وضو پورے جسم کے لئے گناہوں سے پاکی کا ذریعہ بنے گا اور جس نے وضو میں بسم اللہ نہیں پڑھی تو وضو صرف اعضاء مغسولہ کی طہارت کا ذریعہ بنے گا۔

جواب: جمہور نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی زیر بحث حدیث کا جواب دیا ہے۔

کہ یہاں "لا وضوء" میں لا کا کلمہ اصل شئی کی نفی کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ نفی کمال کے لئے آیا ہے نفی کمال کی مثال جیسے

① لا ایمان لمن لا امانة له۔ ② لا دین لمن لا عهد له۔ ③ لا صلوة لجار المسجد إلا فی المسجد۔

④ لیس المسکین الذی تردہ التمرة والتمرتان۔ ⑤ لیس المسلم الذی یبیت وجارہ جائع الی جنبه۔

جمہور فرماتے ہیں کہ ان دلائل کی روشنی میں بسم اللہ کو وضو میں سنت پر حمل کرنا چاہیئے نہ کہ اس کو فرض یا واجب کہا جائے۔

نیز وضو خود عبادت مقصودہ نہیں بلکہ اس کے لئے ذریعہ اور وسیلہ ہے لہٰذا جب اس طرح کی عبادت غیر مقصودہ میں خبر واحد سے کوئی حکم ثابت ہوتا ہے تو اس کو سنت پر حمل کیا جاتا ہے فرض اور واجب پر اس کو حمل نہیں کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ وضو میں واجب نہیں۔

(ملاحظہ: یہاں سے مسئلہ نبیذ التمر تک تمام مباحث حرمین شریفین میں زیارت عمرہ کے موقع پر مکہ مکرمہ میں ۱۷ رمضان ۱۴۲۲ھ میں لکھنا شروع کئے الحمد للہ علی ذلک)[2]

انگلیوں کا خلال

﴿۱۱﴾ وَعَنْ لَقِيطِ بْنِ صَبِرَةَ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ أَخْبِرْنِي عَنِ الْوُضُوءِ قَالَ أَسْبِغِ الْوُضُوءَ

---

[1] المرقات ۲/۱۱۳،۱۱۴ [2] المرقات ۲/۱۱۴

وَخَلِّلْ بَيْنَ الْأَصَابِعِ وَبَالِغْ فِي الْاِسْتِنْشَاقِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَائِمًا.

(رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَى ابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ إِلَى قَوْلِهِ بَيْنَ الْأَصَابِعِ)[1]

ترجمہ: اور حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "یارسول اللہ مجھے وضو کے بارے میں آگاہ فرمائیے آپ نے فرمایا تم وضو کو پورا کرو، انگلیوں میں خلال کرو اور اگر تمہارا روزہ نہ ہو تو ناک میں اچھی طرح پانی پہنچاؤ"

(ابوداؤد، درامی) نسائی، ابن ماجہ اور درامی نے اس حدیث کو بین الاصابع تک روایت کیا ہے۔

توضیح: اخبرنی عن الوضوء: اس صحابی نے وضو کے مکملات اور آداب کے متعلق سوال کیا کیونکہ نفس وضو تو ان کے ہاں ایک معروف عمل تھا یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مکملات اور محسنات وضو جواب میں ارشاد فرمائے۔[2]

الاصابع: انگلیوں سے یہاں پاؤں اور ہاتھوں کی انگلیاں مراد ہیں حدیث میں دونوں کا ذکر ہے ان دونوں کا خلال جمہور کے ہاں سنت ہے البتہ امام مالک رحمہ اللہ اور بعض دیگر فقہاء کا قول ہے کہ خلال پاؤں کی انگلیوں کے ساتھ خاص ہے کیونکہ ہاتھ کی انگلیوں میں کشادگی کی وجہ سے خلال کی ضرورت نہیں ہے نیز اگر پاؤں کا خلال بھی چھوڑ دیا تو پرواہ نہیں۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خلال سنت ہے تو پھر بعض احادیث میں اس کے چھوڑنے پر شدید وعید کیوں آئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلال واجب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انگلیاں کشادہ ہیں تو خلال سنت ہے اور اگر پاؤں کی انگلیاں آپس میں مضبوط جڑی ہوئی ہیں تو پھر خلال واجب ہے اور اسی کے چھوڑنے پر وعید آئی ہے۔ تاکہ درمیان میں خشک نہ رہ جائے تو وعید خشکی پر ہے۔[3]

﴿۱۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأْتَ فَخَلِّلْ أَصَابِعَ يَدَيْكَ وَرِجْلَيْكَ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَى ابْنُ مَاجَهْ نَحْوَهُ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ)[4]

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تم وضو کرو تو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں اور اپنے پیروں کی انگلیوں کے درمیان خلال کرو۔"

(ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے)۔

توضیح: فخلل: پاؤں کی انگلیوں میں خلال کی کیفیت یہ ہے کہ بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کو دائیں پیر کی چھوٹی انگلی کے درمیان داخل کر کے ترتیب سے بائیں پیر کی چھوٹی انگلی تک ملتے چلے جائیں اور ہاتھوں کا خلال یہ کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں دبا کر ایک ساتھ خلال کریں۔[5]

[1] اخرجه الترمذی وابو داؤد: ۱۰۱ وابن ماجه ۳۹۹ [2] المرقات ۲/۱۱۵ [3] المرقات ۲/۱۱۵

[4] اخرجه الترمذی: ۳۹ وابن ماجه ۴۴۷ [5] المرقات ۲/۱۱۶

﴿۱۳﴾ وَعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ يَدْلُكُ أَصَابِعَ رِجْلَيْهِ بِخِنْصَرِهٖ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه)[1]

ترجمہ: اور حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو دیکھا جب آپ وضو فرماتے تو اپنے پاؤں کی انگلیوں کو (بائیں ہاتھ) کی چھنگلی سے ملتے (یعنی پاؤں کی انگلیوں کے درمیان بائیں ہاتھ کی چھنگلی سے خلال فرماتے)۔" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ڈاڑھی کا خلال

﴿۱۴﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ أَخَذَ كَفًّا مِنْ مَاءٍ فَأَدْخَلَهُ تَحْتَ حَنَكِهٖ فَخَلَّلَ بِهٖ لِحْيَتَهٗ وَقَالَ هٰكَذَا أَمَرَنِيْ رَبِّيْ. (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[2]

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب وضو فرماتے تو ایک چلو پانی لیتے پھر اسے ٹھوڑی کے نیچے پہنچاتے اور اس سے اپنی ڈاڑھی میں خلال کرتے اور پھر فرماتے کہ میرے پروردگار نے (وحی خفی کے ذریعہ) اسی طرح سے حکم فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

توضیح: فخلل به لحیته: امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور اکثر علماء کے نزدیک ڈاڑھی میں خلال کرنا سنت ہے امام مالک رحمہ اللہ نے مستحب کا قول اختیار فرمایا ہے ائمہ احناف کے نزدیک ڈاڑھی کا خلال راجح قول کے مطابق سنت ہے امام مزنی اور ایک قول میں احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ خلال واجب ہے۔ تمام احادیث کو دیکھ کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاڑھی کا خلال ایک اچھا کام ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس پر عمل کیا ہے۔

وضو میں ڈاڑھی کا حکم:

اب یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ وضو میں ڈاڑھی کا حکم کیا ہے آیا دھونا ہے یا اس کا مسح کرنا ہے؟

جمہور نے کسی تفصیل کے بغیر فرمایا ہے کہ ڈاڑھی کا دھونا وضو میں واجب ہے احناف نے اس میں تفصیل سے کام لیا ہے کہ ڈاڑھی دو قسم کی ہوتی ہے ہلکی اور گھنی، ہلکی وہ ہوتی ہے جس میں کھال نظر آتی ہے اور گھنی وہ ہوتی ہے کہ جس میں چہرہ کی کھال نظر نہ آتی ہو ہلکی ڈاڑھی کا حکم یہ ہے کہ اس کی جڑوں تک پانی پہنچانا واجب اور ضروری ہے۔

گھنی گنجان ڈاڑھی کا حکم اس طرح ہے کہ اس کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری نہیں اوپر سے دھونا فرض ہے اور ڈاڑھی کے جو بال نیچے لٹک رہے ہوں ان کا دھونا ضروری نہیں ہے اور نہ مسح کرنا ضروری ہے البتہ خلال کرنا اور خلال کے لئے نیا پانی لینا

[1] اخرجه الترمذی ۴۰ وابو داؤد ۱۴۸ [2] اخرجه ابو داؤد ۱۴۵

ضروری نہیں ہے وضو کا سابقہ پانی کافی ہے۔ خلال کے مسئلہ سے ضمنی طور پر یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ شریعت میں ایک قبضہ سے کم ڈاڑھی کا وجود نہیں کیونکہ خشخشی ڈاڑھی میں کیسے خلال ہوسکتا ہے کیونکہ ڈاڑھی کے خلال کی کیفیت اس طرح ہے کہ دھونے کے بعد ہاتھ کی انگلیاں ڈاڑھی کے نیچے سے داخل کر کے اوپر کی طرف بڑھائی جائیں۔

﴿۱۵﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ أَنَّ النَّبِيَّ كَانَ يُخَلِّلُ لِحْيَتَهُ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ (وضو کرتے وقت) اپنی ڈاڑھی میں خلال کیا کرتے تھے۔ (ترمذی، دارمی)

﴿۱۶﴾ وَعَنْ أَبِي حَيَّةَ قَالَ رَأَيْتُ عَلِيًّا تَوَضَّأَ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ حَتّٰى أَنْقَاهُمَا ثُمَّ مَضْمَضَ ثَلَاثًا وَاسْتَنْشَقَ ثَلَاثًا وَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا وَذِرَاعَيْهِ ثَلَاثًا وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ مَرَّةً ثُمَّ غَسَلَ قَدَمَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَامَ فَأَخَذَ فَضْلَ طَهُوْرِهِ فَشَرِبَهُ وَهُوَ قَائِمٌ ثُمَّ قَالَ أَحْبَبْتُ أَنْ أُرِيَكُمْ كَيْفَ كَانَ طُهُوْرُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابوحیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا چنانچہ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو دھویا یہاں تک کہ انہیں پاک کیا۔ پھر تین مرتبہ کلی کی تین مرتبہ ناک میں پانی دیا تین مرتبہ اپنا منہ دھویا تین مرتبہ دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے ایک مرتبہ اپنے سر کا مسح کیا اور اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے پھر کھڑے ہوئے اور وضو کے بچے ہوئے پانی کو کھڑے کھڑے پی لیا اور پھر فرمایا کہ میں نے یہ پسند کیا کہ تمہیں دکھاؤں کہ آنحضرت ﷺ کا وضو کس طرح تھا۔ (ترمذی، نسائی)

﴿۱۷﴾ وَعَنْ عَبْدِ خَيْرٍ قَالَ نَحْنُ جُلُوْسٌ نَنْظُرُ إِلَى عَلِيٍّ حِيْنَ تَوَضَّأَ فَأَدْخَلَ يَدَهُ الْيُمْنٰى فَمَلَأَ فَمَهُ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَنَثَرَ بِيَدِهِ الْيُسْرٰى فَعَلَ هٰذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى طُهُوْرِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَهٰذَا طُهُوْرُهُ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[3]

ترجمہ: اور حضرت عبد خیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم بیٹھے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو وضو کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے چنانچہ انہوں نے برتن میں سے داہنے ہاتھ سے پانی لیا اور منہ میں بھر کر کلی کی اور ناک میں پانی دیا اور بائیں ہاتھ سے ناک سنکی اسی طرح تین مرتبہ کیا پھر فرمایا کہ جس کے لئے یہ بات خوش کن ہو کہ وہ سرکار دو عالم ﷺ کے وضو کو دیکھے تو (وہ دیکھے کہ) آنحضرت ﷺ کا وضو یہ ہے (یعنی اس طرح آپ وضو فرماتے تھے) (دارمی)

[1] اخرجه الترمذی ۳۱ والدارمی [2] اخرجه الترمذی ۴۴ والنسائی ۱/۷۰ [3] اخرجه الدارمی ۱/۷۰۸

﴿۱۸﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفٍّ وَاحِدٍ فَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثًا۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے ایک ہی چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی دیا اور تین مرتبہ اس طرح کیا۔ (ابوداود، ترمذی)

﴿۱۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ بِرَأْسِهٖ وَأُذُنَيْهِ بَاطِنَهُمَا بِالسَّبَّابَتَيْنِ وَظَاهِرَهُمَا بِإِبْهَامَيْهِ۔ (رَوَاهُ النَّسَائِيُّ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے سر اور دونوں کانوں کا مسح کیا اور کانوں کے اندر کا مسح اپنی شہادت کی انگلیوں سے اور اوپر کا انگوٹھوں سے کیا۔ (نسائی)

﴿۲۰﴾ وَعَنِ الرُّبَيِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذٍ أَنَّهَا رَأَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ قَالَتْ فَمَسَحَ رَأْسَهٗ مَا أَقْبَلَ مِنْهُ وَمَا أَدْبَرَ وَصُدْغَيْهِ وَأُذُنَيْهِ مَرَّةً وَاحِدَةً وَفِيْ رِوَايَةٍ أَنَّهٗ تَوَضَّأَ فَأَدْخَلَ إِصْبَعَيْهِ فِيْ جُحْرَيْ أُذُنَيْهِ۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ الرِّوَايَةَ الْأُوْلٰى وَأَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ الثَّانِيَةَ)[3]

ترجمہ: اور حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکار دو عالم ﷺ کو وضو کرتے دیکھا چنانچہ فرماتی ہیں کہ آپ نے اپنے سر کے اگلے حصہ پر، پچھلے حصہ پر، کنپٹیوں پر اور کانوں پر ایک مرتبہ مسح کیا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے وضو کیا چنانچہ (مسح کے لئے) اپنی دونوں انگلیوں کو اپنے دونوں کانوں کے سوراخوں میں داخل کیا (ابوداود) ترمذی نے پہلی حدیث کو اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری حدیث کو روایت کیا ہے۔

مسح سر کے لئے نیا پانی لینا

﴿۲۱﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ أَنَّهٗ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ وَأَنَّهٗ مَسَحَ رَأْسَهٗ بِمَاءٍ غَيْرِ فَضْلِ يَدَيْهِ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ مَعَ زَوَائِدَ)[4]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے سر کا مسح اس پانی سے کیا جو ہاتھوں کا بچا ہوا نہ تھا (یعنی نیا پانی لے کر مسح کیا) ترمذی، مسلم اور مسلم نے اس

[1] اخرجه ابو داؤد ۱۳۹ والترمذی ۲۸ — [2] اخرجه النسائی ۷۰

[3] اخرجه ابو داؤد ۱۲۹ والترمذی ۳۳ — [4] اخرجه الترمذی ۳۲ ومسلم ۱/۱۴۵

روایت کو زیادتی کے ساتھ نقل کیا ہے (جس میں دیگر اعضاء وضو کے دھونے کا بھی ذکر ہے)۔

توضیح: بماء غیر فضل یدیه: یعنی آنحضرت ﷺ نے سر کے مسح کے لئے نیا پانی لیا اور ہاتھ کی تری پر اکتفاء نہیں کیا۔ ائمہ احناف کی کتابوں میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ کسی عضو کے دھونے کے بعد ہاتھ پر جو تری رہ جاتی ہے وہ کسی عضو کے مسح کے لئے کافی ہے نیا پانی لینے کی ضرورت نہیں ہاں اگر ہاتھوں سے کسی عضو پر مسح کیا تو اس کے بعد ہاتھ کی تری کسی اور عضو کے لئے کافی نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ مسح کے بعد ہاتھ کی تری کا پانی مستعمل ہو جاتا ہے جس کو پھر دوبارہ استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے اور دھونے سے جو تری رہ جاتی ہے وہ مستعمل پانی کے حکم میں نہیں کیونکہ مستعمل وہ ہوتا ہے جو کسی عضو پر استعمال میں بہہ جائے یہ حدیث احناف کے علاوہ دیگر ائمہ کی دلیل ہے جو سر کے مسح کے لئے نیا پانی لینے کو ضروری سمجھتے ہیں، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو اسی طرح "بماء غیر فضل یدیه" نقل فرمایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ابن لھیعہ کی روایت میں "غیر فضل یدیه" کے الفاظ ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہاتھوں کا بچا ہوا پانی آپ ﷺ نے سر کے مسح میں استعمال کیا ہے اگر یہ روایت صحیح ہو جائے تو یہ احناف کی دلیل بن جائے گی لیکن امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اس روایت سے پہلے والی روایت زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہی مشہور ہے (لمعات) بہر حال اگر نیا پانی لیا جائے تو وہ زیادہ بہتر ہوگا تاکہ اختلافی صورت سے آدمی بچ جائے۔[1]

مسئلة مسح الأذنين

﴿۲۲﴾ وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ ذَكَرَ وُضُوءَ رَسُولِ اللهِ ﷺ قَالَ وَكَانَ يَمْسَحُ الْمَاقَيْنِ وَقَالَ الْأُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَذَكَرَا قَالَ حَمَّادٌ لَا أَدْرِي الْأُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ مِنْ قَوْلِ أَبِي أُمَامَةَ أَمْ مِنْ قَوْلِ رَسُولِ اللهِ ﷺ.[2]

ترجمہ: اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکار دو عالم ﷺ کے وضو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "آپ آنکھ کے کونوں کو بھی ملا کرتے تھے اور کہا کہ دونوں کان بھی سر میں داخل ہیں۔" (ابن ماجہ، ابو داؤد، ترمذی) اور ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حماد نے کہا کہ میں یہ نہیں جانتا کہ الاذنان من الراس (یعنی دونوں کان سر میں داخل ہیں) ابو امامہ رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے یا آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

توضیح: الاذنان من الرأس: وضو میں کانوں کا کیا حکم ہے آیا مسح کرنا ہے یا دھونا ہے تو اس کے بارے میں علماء کی مختلف رائے ہیں۔

فقہاء کا اختلاف:

① امام زھری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چہرہ کے سامنے کانوں کو مکمل طور پر دھویا جائے۔

[1] اشعة اللمعات ۱/۲۴۲ [2] اخرجه ابن ماجه ۴۴۴ وابو داؤد ۱۳۴

② عامر شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کانوں کا سامنے والا حصہ چہرہ کے ساتھ دھویا جائے اور پشت کے حصے پر سر کے مسح کے ساتھ مسح کیا جائے۔

③ جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ کانوں پر سر کے مسح کے ساتھ مسح کرنا چاہئے البتہ ان کے آپس میں یہ اختلاف ہے کہ آیا کانوں کے مسح کے لئے نیا پانی لینا چاہئے یا ہاتھوں کا ما بقی پانی کافی ہے نقل مذہب میں بھی اختلاف ہے کہ کون کس طرف ہے مگر احناف اور شوافع بہر حال ایک دوسرے کے مقابل ہیں چنانچہ شوافع کے ہاں جدید پانی لینا افضل ہے احناف کے نزدیک جدید پانی لینا افضل نہیں ہے۔[1]

فقہاء کے دلائل:

باب ہٰذا میں مذکورہ حدیث ائمہ احناف کی دلیل ہے کہ مسح میں کان سر سے وابستہ ہیں لہٰذا جدید پانی لینے کی ضرورت نہیں سر کے مسح میں شہادت کی انگلیاں اور انگوٹھے استعمال نہیں ہوئے انہی کو کانوں میں استعمال کیا جائے گا۔

احناف کی دوسری دلیل وہ حدیث بھی ہے جس میں مسح سر کی وجہ سے گناہوں کے خروج کا راستہ کان بتایا گیا ہے کہ "خرجت خطایاہ من اذنیہ" معلوم ہوا کہ کان مسح میں سر کے تابع ہیں تو جدید پانی ضروری نہیں ہے۔

احناف کی تیسری دلیل ابن خزیمہ کی روایت ہے جس کو بحر الرائق نے نقل کیا ہے جس میں ہے کہ "أخذ غرفة فمسح بها رأسه واذنیه" اسی طرح اس باب میں اس سے پہلے حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانوں کا مسح سر کے ساتھ ہے اور اس کا تابع ہے شوافع حضرات کے ہاں اس مسئلہ میں کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے وہ صرف عقلی دلیل پیش کرتے ہیں کہ کان الگ عضو ہے اور الگ عضو کے لئے الگ پانی کی ضرورت ہے۔

لہٰذا کانوں کے لئے الگ پانی لینا چاہیے وہ حضرات احناف کی دلیل کو کمزور کرنے کے لئے ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت پر اعتراضات کرتے ہیں۔

ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ اب تک یہ معلوم نہیں کہ "الاذنان من الرأس" کا جملہ آیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے یا یہ ابو امامہ رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے حماد کہتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کس کا قول ہے۔

جواب: ائمہ احناف نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ ابن ماجہ میں اس کی تصریح ہے کہ "قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم الاذنان من الرأس" اور اگر بفرض محال یہ ابو امامہ رضی اللہ عنہ ہی کا قول ہے تو چونکہ یہ حکم غیر مدرک بالقیاس ہے صحابی اپنی طرف سے ایسی بات نہیں کہہ سکتا ہے تو پھر بھی یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے نیز یہ حدیث صرف ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی نہیں بلکہ حافظ جمال الدین زیلعی رحمہ اللہ نے "نصب الرایۃ" میں اس کی آٹھ صحابہ کرام سے تخریج کی ہے۔

---

[1] المرقات ۲/۱۲۳

شوافع حضرات کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ مرفوع حدیث ہو بھی جائے تو اس کا مقصد نیا پانی لینا نہ لینا نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کا مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ کان سر میں ہیں یہ سر کا حصہ ہیں گویا یہ کوئی تشریعی بیان نہیں بلکہ تخلیقی فرمان ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ شارع ہیں خلقت بیان کرنا آپ کا منصب وموضوع نہیں ہے بلکہ حکم شریعت بیان کرنا آپ کا مقصود ومطلوب ہے نیز اگر یہ بیان خلقت اور تخلیق کا ہے تو اس کی ضرورت کیا تھی یہ تو ایک بدیہی معاملہ ہے جس کو ہر ایک جانتا ہے کہ کان سر میں ہیں اور دو ہیں آنکھیں دو ہیں اور سر میں ہیں ناک اور منہ سر کا حصہ ہے اس کو بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی آپ کی بعثت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔[1]

﴿۲۳﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُهُ عَنِ الْوُضُوءِ فَأَرَاهُ ثَلَاثًا ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا الْوُضُوءُ فَمَنْ زَادَ عَلَى هٰذَا فَقَدْ أَسَاءَ وَتَعَدّٰى وَظَلَمَ.

(رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَرَوَى أَبُو دَاوُدَ مَعْنَاهُ)[2]

ترجمہ: اور حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ ایک دیہاتی آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ سے وضو کی کیفیت پوچھی چنانچہ آپ نے اسے اعضاء وضو کو تین مرتبہ دھو کر دکھلایا اور فرمایا کہ "(کامل) وضو اسی طرح ہے لہٰذا جس نے اس پر زیادہ کیا (یعنی تین مرتبہ سے زیادہ دھویا) اس نے برا کیا اور تعدی کی اور ظلم کیا" (نسائی، ابن ماجہ) اور ابوداؤد نے بھی اسی مطلب کی حدیث روایت کی ہے۔

توضیح: **فمن زاد:** یہاں یہ سوال ہے کہ **اطالت غرہ** تو مطلوب ومقصود ہے حالانکہ یہاں **زیادت فی الوضو** کو گناہ اور ظلم بتایا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اس کی تبلیغ میں زیادتی یا کمی کی اس نے ظلم کیا یا جس نے اس کے خلاف عقیدہ رکھا تو اس نے ظلم کیا یا جس نے وضو کے مرات میں زیادتی کی یعنی تین بار سے زیادہ دھویا تو اس نے ظلم کیا "اساء" یعنی ترک سنت کی وجہ سے اس نے گناہ کیا برا کام کیا۔[3]

دعاؤں میں تجاوز نہ کرو

﴿۲۴﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْمُغَفَّلِ أَنَّهُ سَمِعَ ابْنَهُ يَقُولُ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْقَصْرَ الْأَبْيَضَ عَنْ يَمِينِ الْجَنَّةِ قَالَ أَيْ بُنَيَّ سَلِ اللّٰهَ الْجَنَّةَ وَتَعَوَّذْ بِهِ مِنَ النَّارِ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ يَقُولُ إِنَّهُ سَيَكُونُ فِي هٰذِهِ الْأُمَّةِ قَوْمٌ يَعْتَدُونَ فِي الطُّهُورِ وَالدُّعَاءِ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه)[4]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا "اے اللہ

[1] المرقات ۲/۱۲۳ [2] اخرجه النسائی ۱/۸۸ وابن ماجه ۱۲۲ [3] المرقات ۲/۱۲۴

[4] اخرجه احمد ۴/۸۶ وابو داؤد ۹۶ وابن ماجه ۳۸۶۴

میں تجھ سے جنت کے دائیں طرف سفید محل مانگتا ہوں'' تو انہوں نے کہا ''اے میرے بیٹے! تم خدا سے جنت مانگو اور (دوزخ کی) آگ سے پناہ مانگو'' میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''عنقریب اس امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو طہارت اور دعا میں غلو کریں گے۔'' (احمد، ابن ماجہ، ابوداؤد)

توضیح: **القصر الابیض:** سفید محل کا ترجمہ انگریزی میں وائٹ ہاؤس ہے۔ یہ لفظ آیندہ مشکوٰۃ شریف کے دوسرے حصہ میں بھی آیا ہے وہاں فارس کے بادشاہ کسریٰ کے محل اور اس کے خزانوں کی فتوحات کا ذکر ہے چنانچہ مدائن کی فتوحات میں ایوان کسریٰ میں "القصر الابیض" بھی فتح ہوا تھا۔ (مشکوٰۃ ص ۴۶۶)

یعتدون: اعتداء تجاوز اور زیادتی کے معنی میں ہے۔ طہارت میں تجاوز یہ ہے کہ تین بار دھونے سے زیادہ دھویا جائے یا بے تحاشا پانی اسراف کی حد تک بہایا جائے یا دھونے میں اس قدر مبالغہ کرے کہ شک اور وسوسہ تک نوبت پہنچ جائے یہ سب طہور میں تجاوز ہے اور دعاء میں تجاوز یہ ہے کہ یا تو بہت لمبی مانگی جائے یا تکلف کے ساتھ اس میں وزن اور سجع اور تصنع کے الفاظ لائے جائیں یا قیودات لگا کر تعین کیا جائے جس طرح اس حدیث میں سفید محل اور جنت کے دائیں طرف کی قیودات ہیں یا اس طرح دعاء مانگی جائے جس کا قبول ہونا محال ہو مثلاً ایک غریب گنوار دیہاتی بادشاہ بننے کی دعا مانگے یہ سب تجاوز کی صورت ہیں۔[1]

شیطان وضو میں وسوسہ ڈالتا ہے

﴿۲۵﴾ وَعَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنَّ لِلْوُضُوْءِ شَيْطَانًا يُقَالُ لَهُ الْوَلْهَانُ فَاتَّقُوا وَسْوَاسَ الْمَاءِ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَلَيْسَ إِسْنَادُهُ بِالْقَوِيِّ عِنْدَ أَهْلِ الْحَدِيْثِ لِأَنَّا لَا نَعْلَمُ أَحَدًا أَسْنَدَهُ غَيْرَ خَارِجَةَ وَهُوَ لَيْسَ بِالْقَوِيِّ عِنْدَ أَصْحَابِنَا).[2]

ترجمہ: اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ وضو کا ایک شیطان ہے جسے ولہان کہا جاتا ہے لہٰذا پانی کے وسوسے سے بچو (ترمذی، ابن ماجہ) اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور محدثین کے نزدیک اس کی سند قوی نہیں ہے اس لئے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ خارجہ (ایک عالم) کے علاوہ کسی نے اس کی سند بیان کی ہو اور وہ (خارجہ) ہمارے محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہے۔

توضیح: **الولہان:** "وَلَهٌ صَدَفٌ" کے وزن پر متحرک ہے یہ لفظ غم کے معنی میں ہے یا غم کی وجہ سے حیران اور پاگل ہونے کے معنی میں ہے ولہان اس شیطان کا نام ہے جو وضو کے پانی میں اسراف کے لئے حاضر ہوتا ہے یہ لفظ یا تو خود اس شیطان کی صفت ہے کہ یہ لوگوں کو وسواسی اور شکی بنانے میں سرگرداں پھرتا رہتا ہے یا حقیقت میں وسوسہ میں تو انسان پڑتا ہے لہٰذا "ولہان" اس شکی انسان کی صفت ہے لیکن مجازاً اس کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے کیونکہ شیطان کے ورغلانے سے وہ آدمی وسوسہ میں پڑ گیا ہے۔[3]

[1] المرقات ۲/۱۲۶ [2] اخرجہ الترمذی ۵۷ وابن ماجہ ۴۲۱ [3] المرقات ۲/۱۲۶

وضو کے بعد تولیہ وغیرہ کا استعمال

﴿۲۶﴾ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ مَسَحَ وَجْهَهُ بِطَرَفِ ثَوْبِهِ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ وضو فرماتے تو اپنے کپڑے کے کونے سے منہ پونچھتے۔ (ترمذی)

توضیح: رقة ینشف بها: وضو کرنے کے بعد اعضاء کو خشک کرنے کے لئے تولیہ یا رومال استعمال کرنا چاہیئے یا نہیں اس سلسلہ میں بعض روایات سے پانی پونچھنا اور خشک کرنا ثابت ہوتا ہے بعض روایات میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کپڑا استعمال کرنے سے انکار فرمایا اس وجہ سے فقہاء کے اقوال میں بھی اختلاف آگیا ہے۔[2]

امام شافعی رحمہ اللہ سے تین اقوال زیادہ مشہور ہیں ایک قول یہ کہ کپڑا استعمال کرنا اور پانی خشک کرنا مستحب ہے اور دوسرا قول یہ کہ مکروہ ہے۔ تیسرا قول یہ کہ سردیوں میں استعمال کرنا چاہیئے اور گرمیوں میں استعمال نہ کرنا چاہیے۔ ائمہ احناف میں سے بعض نے اس کو آداب وضو میں شمار کیا ہے بعض نے مستحب لکھا ہے اور بعض نے صرف مباح کا قول اختیار کیا ہے۔

احناف اور جمہور کا معتمد قول یہ ہے کہ وضو کے بعد کپڑا استعمال کرنا فقط مباح ہے مستحب ہونے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اور مکروہ پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

جن حضرات نے پانی خشک نہ کرنے کا کہا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ پانی قیامت میں وزن اعمال میں تولا جاتا ہے لہٰذا اس کو خشک نہ کرو مگر یہ کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اگر کپڑے سے خشک کرنا نقصان دہ ہے تو جسم پر بھی یہ پانی خشک ہو جاتا ہے بہر حال یہ ایک طبعی معاملہ ہے کوئی تشریعی حکم نہیں ہے گرمی میں ضرورت نہیں پڑتی ہے اور سردی میں ضرورت پڑتی ہے۔ جس کو جس میں سہولت ہو وہ صورت اپنالے۔

﴿۲۷﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ خِرْقَةٌ يُنَشِّفُ بِهَا أَعْضَاءَهُ بَعْدَ الْوُضُوْءِ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَيْسَ بِالْقَائِمِ وَأَبُوْ مُعَاذٍ الرَّاوِيْ ضَعِيْفٌ عِنْدَ أَهْلِ الْحَدِيْثِ)[3]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کے پاس ایک کپڑا تھا جس سے وضو کے بعد اپنے بھیگے ہوئے اعضاء کو پونچھا کرتے تھے (ترمذی) اور امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے اور اس کے ایک راوی ابو معاذ محدثین کے ہاں ضعیف ہیں۔

[1] اخرجه الترمذی ۵۴ [2] المرقات، ۲/۲/۱۲۷ [3] اخرجه الترمذی ۵۳

الفصل الثالث

﴿۲۸﴾ وَعَنْ ثَابِتِ بْنِ أَبِي صَفِيَّةَ قَالَ قُلْتُ لِأَبِي جَعْفَرٍ هُوَ مُحَمَّدُ الْبَاقِرُ حَدَّثَكَ جَابِرٌ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ مَرَّةً مَرَّةً وَمَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ وَثَلَاثًا ثَلَاثًا قَالَ نَعَمْ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه)[1]

ترجمہ: اور حضرت ثابت ابن ابی صفیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے والد سے جن کا نام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ ہے کہا کہ آپ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ ''سرکار دو عالم ﷺ نے (کبھی) ایک ایک مرتبہ (کبھی) دو دو مرتبہ اور (کبھی) تین تین مرتبہ وضو کیا ہے انہوں نے فرمایا ''ہاں''۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

﴿۲۹﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ وَقَالَ هُوَ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ۔[2]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ''سرکار دو عالم ﷺ نے دو دو مرتبہ وضو فرمایا (یعنی اعضاء وضو کو دو دو بار دھویا) اور پھر فرمایا کہ ''یہ نور کے اوپر نور ہے۔''

﴿۳۰﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأَ ثَلَاثًا ثَلَاثًا وَقَالَ هٰذَا وُضُوْئِيْ وَوُضُوْءُ الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِيْ وَوُضُوْءُ إِبْرَاهِيْمَ۔ (رَوَاهُمَا رَزِيْنٌ وَالنَّوَوِيُّ ضَعَّفَ الثَّانِيَ فِيْ شَرْحِ مُسْلِمٍ)[3]

ترجمہ: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے تین تین مرتبہ وضو کیا اور پھر فرمایا کہ ''یہ میرا اور مجھ سے پہلے انبیاء کا وضو ہے اور حضرت ابراہیم کا وضو ہے'' (یہ دونوں حدیثیں رزین نے روایت کی ہیں اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں دوسری حدیث کو ضعیف کہا ہے)۔

﴿۳۱﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ لِكُلِّ صَلَاةٍ وَكَانَ أَحَدُنَا يَكْفِيْهِ الْوُضُوْءُ مَا لَمْ يُحْدِثْ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)[4]

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ ہر (فرض) نماز کیلئے وضو فرمایا کرتے تھے اور ہم کو ایک وضو اس وقت تک کافی ہوتا تھا جب تک کہ وضو نہ ٹوٹتا تھا۔ (داری)

وضوء علی الوضوء کے بدلے مسواک کا حکم

﴿۳۲﴾ وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حَبَّانَ قَالَ قُلْتُ لِعُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَرَأَيْتَ وُضُوْءَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ لِكُلِّ صَلَاةٍ طَاهِرًا كَانَ أَوْ غَيْرَ طَاهِرٍ عَمَّنْ أَخَذَهُ فَقَالَ حَدَّثَتْهُ أَسْمَاءُ بِنْتُ زَيْدِ بْنِ

[1] اخرجه الترمذی ۴۵ وابن ماجه ۴۱۰ [2] اخرجه رزین [3] اخرجه رزین [4] اخرجه الدارمی ۷۲۳

الْخَطَّابِ أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ حَنْظَلَةَ بْنِ أَبِي عَامِرِ الْغَسِيْلِ حَدَّثَهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَانَ أُمِرَ بِالْوُضُوْءِ لِكُلِّ صَلَاةٍ طَاهِرًا كَانَ أَوْ غَيْرَ طَاهِرٍ فَلَمَّا شَقَّ ذٰلِكَ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ أُمِرَ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَوُضِعَ عَنْهُ الْوُضُوْءُ إِلَّا مِنْ حَدَثٍ قَالَ فَكَانَ عَبْدُ اللهِ يَرٰى أَنَّ بِهٖ قُوَّةً عَلٰى ذٰلِكَ فَفَعَلَهُ حَتّٰى مَاتَ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[1]

ترجمہ: اور حضرت محمد بن یحییٰ بن حبان رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے یہ بتائیے کہ کیا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہر نماز کے لئے وضو کرتے تھے خواہ وہ باوضو ہوں یا بے وضو ہوں اور انہوں نے یہ عمل کس سے حاصل کیا تھا؟ حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حضرت اسماء بن زید بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ حدیث بیان کی کہ حضرت عبداللہ بن حنظلہ ابی عامر الغسیل رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ حدیث بیان کی کہ سرکار دو عالم ﷺ کو ہر نماز کیلئے وضو کرنے کا حکم دیا گیا تھا خواہ آپ باوضو ہوں یا بے وضو جب آپ ﷺ کے لئے یہ مشکل ہوا تو ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیا گیا اور وضو کو موقوف کیا گیا (ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرنا واجب نہ رہا) جب تک وضو ٹوٹ نہ جائے، حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ خیال تھا کہ مجھ میں ہر نماز کیلئے تازہ وضو کرنے کی قوت ہے چنانچہ انہوں نے اسی پر موت کے وقت تک عمل کیا۔ (احمد)

وضو میں بھی پانی کا اسراف منع ہے

﴿۳۳﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَرَّ بِسَعْدٍ وَهُوَ يَتَوَضَّأُ فَقَالَ مَا هٰذَا السَّرَفُ يَا سَعْدُ! قَالَ أَفِي الْوُضُوْءِ سَرَفٌ قَالَ نَعَمْ وَإِنْ كُنْتَ عَلٰى نَهْرٍ جَارٍ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَه)[2]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ کا گزر حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر ہوا جبکہ وہ وضو کر رہے تھے (اور وہ وضو میں اسراف بھی کر رہے تھے) آپ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا "اے سعد یہ کیا اسراف (زیادتی) ہے؟" حضرت سعد نے عرض کیا کہ کیا وضو میں بھی اسراف ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں اگرچہ تم نہر جاری ہی پر کیوں نہ وضو کر رہے ہو۔" (احمد، ابن ماجہ)

بسم اللہ پڑھ کر وضو کرنے سے پورا بدن پاک ہو جاتا ہے

﴿۳۴﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ وَابْنِ مَسْعُوْدٍ وَابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ تَوَضَّأَ وَذَكَرَ اسْمَ اللهِ فَإِنَّهُ يُطَهِّرُ جَسَدَهُ كُلَّهُ وَمَنْ تَوَضَّأَ وَلَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللهِ لَمْ يَطْهُرْ إِلَّا مَوْضِعُ الْوُضُوْءِ۔[3]

[1] اخرجہ احمد ۵/۲۲۵ [2] اخرجہ احمد ۲/۲۲۱ وابن ماجہ ۴۲۵ [3] اخرجہ دار قطنی

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرۃ، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سرکار دو عالم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''جس شخص نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام لیا (یعنی بسم اللہ) پڑھ کر وضو شروع کیا تو اس نے اپنا تمام بدن (گناہوں سے) پاک کیا اور جس نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا تو اس نے صرف اعضاء وضو کو پاک کیا۔

انگوٹھی ہلا کر وضو بنایا جائے

﴿٣٥﴾ وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ وُضُوْءَ الصَّلَاةِ حَرَّكَ خَاتَمَهُ فِي إِصْبَعِهِ۔

(رَوَاهُمَا الدَّارَ قُطْنِيُّ وَرَوَى ابْنُ مَاجَه الْأَخِيْرَ)[1]

ترجمہ: اور حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب نماز کے لئے وضو فرماتے تو اپنی انگلی کی انگوٹھی کو بھی گھما کر پھرا لیتے (ان دونوں حدیثوں کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ نے صرف دوسری حدیث نقل کی ہے)۔

توضیح: **وضوء الصلاۃ:** یعنی نماز کے لئے جب آپ وضو فرماتے تو خوب مبالغہ کرتے اور اس کے علاوہ دخول مسجد یا تلاوت یا سجدۂ تلاوت وغیرہ کے لئے وضو فرماتے تو اس قدر مبالغہ نہ فرماتے اس صورت میں الصلاۃ کا لفظ قید احترازی بن جائے گا۔[2]

حرك خاتمه: یہ تحریک سنت اور مستحب امر ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے زاد الفقیر میں لکھا ہے کہ اگر انگوٹھی کھلی ہو تو اس کو حرکت دینا سنت ہے اور اگر تنگ ہو تو اس کو گھما کر حرکت دینا واجب ہے تا کہ نیچے جگہ خشک نہ رہ جائے۔[3]

اس حدیث کے حکم کے تحت جسم میں وضو کے اعضاء سے جو بھی چیز چپکی ہوئی ہوگی اس کو حرکت دینا ضروری ہے خواہ وہ گھڑی ہو یا کوئی اور کڑا وغیرہ ہو نیز وضو کے اعضاء میں جہاں سوراخ ہو جیسے عورتوں کی ناک میں ہوتا ہے تو اس میں زیور کو حرکت دے کر پانی اندر پہنچانا ضروری ہوگا اسی طرح کان کے سوراخوں میں غسل کے دوران عورتوں پر لازم ہے کہ اندر تک پانی پہنچائیں اور کان کی بالیوں کو خوب حرکت دے دیں۔

[1] اخرجه الدارقطني وابن ماجه ٤٤٩　[2] المرقات ٢/١٣٣　[3] المرقات ٢/١٣٣

۲۷ صفر ۱۴۱۰ھ

باب الغسل

غسل جنابت کا بیان

الفصل الاول

﴿۱﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا جَلَسَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ شُعَبِهَا الْأَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ وَإِنْ لَمْ يُنْزِلْ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۱]

ترجمہ: حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جب کہ تم میں سے کوئی شخص عورت کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھے پھر کوشش کرے (یعنی جماع کرے) تو اس پر غسل واجب ہو گیا اگر چہ منی نہ نکلے۔'' (بخاری ومسلم)

مسئلة انما الماء من الماء

﴿۲﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ قَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مُحْيِ السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللهُ هٰذَا مَنْسُوْخٌ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ إِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ فِي الْإِحْتِلَامِ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَلَمْ أَجِدْهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ)[۲]

ترجمہ: حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''پانی پانی سے ہے'' (یعنی منی نکلنے سے غسل واجب ہو جاتا ہے) (مسلم)

اور امام محی السنۃ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے اور ابن عباس نے فرمایا کہ ''پانی پانی سے ہے'' کا حکم احتلام کے لئے ہے اور مجھے یہ روایت بخاری ومسلم میں نہیں ملی ہے۔ (ترمذی)

توضیح: **انما الماء من الماء: ای انما وجوب استعمال الماء بالمنی** تو اول ماء سے غسل کا پانی مراد ہے اور دوسرے ماء سے نطفہ اور منی کا پانی مراد ہے اس حدیث کے الفاظ میں حصر ہے کہ غسل صرف اس صورت میں فرض ہے جبکہ منی کا خروج ہو جائے خروج منی کے بغیر غسل واجب نہیں خواہ حشفہ غائب ہو یا غائب نہ ہو اور خواہ **التقاء ختانین** ہو یا نہ ہو انزال منی اگر ہے تو غسل ہے ورنہ غسل نہیں ہے۔[۳]

اس مسئلہ کا عنوان اکسال بھی ہے اکسال کسل سے سست ہونے کے معنی میں ہے مطلب یہ کہ جب انزال ہو جاتا ہے تو ذکر

[۱] اخرجہ البخاری ۱/۸۰ ومسلم ۱/۱۸۶ [۲] اخرجہ الترمذی اخرجہ مسلم ۱/۱۸۶ [۳] ۲/۱۳۵

سست پڑ جاتا ہے ورنہ نہیں اور زیر بحث مسئلہ میں اکسال کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص انزال کے بغیر ذکر کو خارج کر کے سست بنانے کی کوشش کرتا ہے اب بظاہر ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اس سے پہلے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بالکل متعارض ہے اس میں **غیبوبت حشفه** پر غسل واجب قرار دیا گیا ہے خواہ انزال ہو یا نہ ہو اور یہاں انزال کو غسل کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے بھی متعارض ہے جس میں "**اذا جاوز الختان الختان وجب الغسل**" کے الفاظ آئے ہیں جو بعد میں آ رہی ہے۔ اسی طرح فصل ثالث میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی متعارض ہے جو مشکوٰۃ ص ۴۹ پر آ رہی ہے۔ [1]

احادیث کے اس تعارض کی وجہ سے ابتداء اسلام میں دور صحابہ میں اس مسئلہ پر بڑا اختلاف پیدا ہو گیا تھا مہاجرین صحابہ تو حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کو لے کر **غیبوبت حشفه** پر غسل کرتے تھے لیکن انصار صحابہ "**انما الماء من الماء**" حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت پر عمل کرتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اس مسئلہ میں صحابہ کرام کو متحد کرنے کی کوشش فرمائی تا کہ سب مسلمان ایک حکم پر متحد ہو جائیں چنانچہ آپ نے صحابہ سے مشورہ لیا تو طے یہ ہوا کہ اس مسئلہ کا تعلق ازدواجی زندگی سے ہے لہٰذا ازواج مطہرات سے پوچھنا چاہیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس بھیجا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے التقائے ختانین والی روایت بیان فرمائی تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرکاری فرمان جاری کیا اور انصار کو اکسال سے سختی کے ساتھ منع فرمایا تو اس مسئلہ پر اجماع منعقد ہو گیا اور داؤد ظاہری کے سوا پوری امت میں کسی کا اختلاف نہ رہا اب انزال ہو یا نہ ہو حشفہ کے غائب ہونے سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں صحابہ کرام کے اجماع اور دیگر کئی احادیث کے پیش نظر تاویل کرنا ضروری ہو گیا ہے چنانچہ امام محی السنۃ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تاویل یہ کی ہے کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا ہے چنانچہ آئندہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت اس پر صریح دلالت کرتی ہے کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ دوسری تاویل آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے یہ کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "**انماء الماء من الماء**" کا حکم احتلام کے بارے میں ہے۔ [2]

لیکن اس تاویل اور توجیہ پر حدیث کے شان ورود کی وجہ سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عتبان بن مالک صحابی مسجد قباء کے قریب رہتے تھے میں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیر کے دن وہاں گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کے گھر کے سامنے سے آواز دے کر بلایا وہ جماع میں مشغول تھے اسے چھوڑ کر باہر آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نے آدمی کو جلدی میں ڈال دیا وہ باہر آئے اور آتے ہی مسئلہ پوچھا کہ انزال کے بغیر اگر اکسال ہو جائے تو کیا حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **انما الماء من الماء**۔ یعنی انزال کے بغیر غسل واجب نہیں تو یہ واقعہ بیداری کا ہے اس میں

[1] المرقات ۲/۱۳۵ [2] المرقات ۲/۱۳۵

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تاویل کیسے چل سکتی ہے کہ یہ احتلام پر محمول ہے؟[1]

علماء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تاویل کو درست بنانے کے لئے ایک توجیہ کی ہے وہ یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی یہ حدیث منسوخ ہے جیسا کہ پوری امت کے نزدیک منسوخ ہے مگر ان کے ہاں اس حدیث کی ایک صورت ایسی بھی ہے جو اب بھی منسوخ نہیں ہے اور وہ احتلام کی صورت ہے کہ احتلام میں اب بھی "انما الماء من الماء" ضروری ہے یعنی بیداری کی حالت میں یہ حدیث حقیقۃً اور حکماً دونوں صورتوں کو شامل ہے لیکن خواب میں صرف حقیقی صورت کو شامل ہے یعنی منی کا نکلنا غسل کے لئے ضروری ہے۔

بعض علماء نے اس حدیث کا تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایات امر حکمی کو شامل ہیں یعنی جب غیبوبت حشفہ ہو جائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ غسل واجب ہے کیونکہ غیبوبت کے وقت منی کا خروج تو نظر آتا نہیں لہٰذا شریعت نے اس غیبوبت کو حکماً انزال کا قائم مقام قرار دیا ہے۔

اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت امر حقیقی اور حکمی دونوں پر محمول ہے کہ کبھی انزال ہوگا تو "انما الماء من الماء" پر عمل ہوگا اور کبھی انزال نہیں ہوگا تو پھر **غیبوبت حشفہ** پر عمل ہوگا "**اذا جاوز الختان الختان**" سے مراد جماع ہے یعنی ختنہ شدہ جگہوں کا ملنا ہے۔[2]

الختانان: یہ ختان کا تثنیہ ہے اور ختان ختن سے بچے کے ختنہ کرنے کو کہتے ہیں مراد ختنہ شدہ جگہ ہے لڑکوں میں تو ختنہ معروف اور مسنون اسلامی طریقہ ہے مگر لڑکیوں کے ختنہ کو بھی یہ حدیث شامل ہے اور آئندہ لڑکیوں کے ختنہ کے بارے میں ایک صریح حدیث بھی آنے والی ہے حقیقت یہ ہے کہ خط استواء پر قائم گرم ممالک میں اس کا رواج پہلے بھی تھا اور اب بھی بعض ممالک میں ہے اور شوافع حضرات مصر وغیرہ میں اس کو ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ ایسے ممالک میں لڑکیوں کے اندام نہانی میں گوشت اور چربی کا ایک ٹکڑا ابھر کر آتا ہے اسے کاٹنے سے طرفین کے لئے جماع کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے گوشت یا چربی کے اسی ٹکڑے کو کاٹنے کا نام عورتوں کا ختنہ ہے لیکن یاد رکھو یہ مسئلہ برصغیر کے ممالک کے لئے نہیں ہے اس سے علماء حق کے خلاف اہل بدعت بڑا طوفان اٹھاتے ہیں لہٰذا اس مسئلہ کا تذکرہ ہی نہیں کرنا چاہیئے۔[3]

مسئلة احتلام المرأة

﴿۴﴾ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ يَا رَسُوْلَ اللهِ إِنَّ اللهَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْ غُسْلٍ إِذَا احْتَلَمَتْ قَالَ نَعَمْ إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ فَغَطَّتْ أُمُّ سَلَمَةَ وَجْهَهَا وَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَوَ تَحْتَلِمُ الْمَرْأَةُ قَالَ نَعَمْ تَرِبَتْ يَمِيْنُكِ فَبِمَ يُشْبِهُهَا وَلَدُهَا. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ مُسْلِمٌ بِرِوَايَةِ أُمِّ سُلَيْمٍ أَنَّ مَاءَ الرَّجُلِ غَلِيْظٌ أَبْيَضُ وَمَاءَ الْمَرْأَةِ رَقِيْقٌ أَصْفَرُ فَمِنْ أَيِّهِمَا عَلَا أَوْ سَبَقَ يَكُوْنُ مِنْهُ الشَّبَهُ.)[4]

---

[1] المرقات ۲/۱۳۵ [2] المرقات ۲/۱۳۶ [3] اخرجه البخاری ۱/۴۴ ومسلم ۱/۱۳۲ [4] اخرجه البخاری ۱/۴۴ ومسلم ۱/۱۳۲

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! خدائے تعالیٰ حق کے معاملہ میں حیا نہیں کرتا (لہٰذا یہ بتایئے) کیا عورت پر غسل واجب ہے جبکہ اس کو احتلام ہو (یعنی خواب میں مجامعت دیکھے) آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" جبکہ وہ پانی (منی) کو دیکھے" یہ سن کر ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا منہ (شرم کی وجہ سے) ڈھانک لیا اور کہا کہ یا رسول اللہ کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ (یعنی کیا مرد کی طرح عورت کے بھی منی ہوتی ہے اور نکلتی ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" خاک آلود ہو تیرا داہنا ہاتھ (اگر ایسا نہ ہوتا تو) پھر اس کا بچہ اس کے مشابہ کیونکر ہوسکتا تھا (متفق علیہ) اور امام مسلم رحمہ اللہ نے ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ (آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا) مرد کی منی گاڑھی سفید ہوتی ہے اور عورت کی منی پتلی زرد ہوتی ہے لہٰذا ان میں سے جو منی غالب ہو یا سبقت کرے تو (بچے کی) مشابہت اسی کے ساتھ ہوتی ہے۔

توضیح: او تحتلم المراۃ: اس حدیث پر بظاہر یہ اعتراض ہے کہ "**او تحتلم المراۃ**" کے جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو احتلام نہیں ہوتا ہے تب ہی تو ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے استفہام کے انداز میں پوچھا کہ ایسا بھی ہوتا ہے؟ پھر اسی حدیث کے ابتدائی حصہ میں حضرت ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا اقرار فرما رہی ہیں کہ "**فھل علی المرأۃ من غسل اذا احتلمت**" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو عورتوں کے احتلام کا علم تھا تب ہی تو ام سلیم نے سوال کیا اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے کئی جوابات اور توجیہات ہیں اول سرسری جواب یہ کہ امھات المومنین کو صفاء باطن کی وجہ سے احتلام نہیں ہوتا تھا تو ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے انکار کیا نیز احتلام میں شیطان متشکل ہو کر آتا ہے اور آنحضرت ﷺ کی شکل میں شیطان کا آنا محال تھا اور کسی دوسرے آدمی کے خواب میں آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے ازواج مطہرات کو احتلام کا علم نہیں تھا تو ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے انکار کیا اور ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو معلوم تھا تو انہوں نے اقرار کیا اس جواب پر یہ اعتراض ہے کہ یہ تب صحیح ہوگا کہ ازواج مطہرات پر کبھی جاہلیت کا زمانہ نہ آیا ہو یا پہلے کسی شوہر سے نکاح نہ ہوا ہو حالانکہ دونوں میں معاملہ برعکس ہے تو کیا گارنٹی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں احتلام نہ ہوتا ہو۔

نیز احتلام تو صرف تشکل شیطان کی صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی تکان کی وجہ سے ہوتا ہے کبھی امتلاء بطن کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی امتلاء منی کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے دوسرا صحیح جواب یہ ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عورتوں کے احتلام کے اس عیب کو چھپانا چاہتی تھیں کہ ام سلیم ویسے فرضی باتوں کا پوچھتی ہیں عورتوں کو کہاں احتلام ہوتا ہے۔[1]

اس حقیقت پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے آپ نے فرمایا **فضحت النساء** یعنی اے ام سلیم تم نے عورتوں کے اس پوشیدہ راز کو فاش کر کے عورتوں کو رسوا کیا معلوم ہوا ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس حقیقت کو چھپانا چاہتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سخت لہجہ میں فرمایا "**تربت یداک**" یعنی تیرے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں

---

[1] المرقات ۲/۱۳۶،۱۳۷

اگر عورت کا نطفہ نہیں ہے تو پھر کبھی بچہ ماں کے مشابہ کیوں ہوتا ہے اس جملہ سے بعض ان اطباء پر رد ہوگیا جن کا خیال ہے کہ عورت کی ذات میں مادہ منویہ نہیں ہے منی صرف مردوں میں ہوتی ہے۔ ۱

غسل کا مسنون طریقہ

﴿۴﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ بَدَأَ فَغَسَلَ يَدَيْهِ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ كَمَا يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ يُدْخِلُ أَصَابِعَهُ فِي الْمَاءِ فَيُخَلِّلُ بِهَا أُصُوْلَ شَعْرِهِ ثُمَّ يَصُبُّ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثَ غَرَفَاتٍ بِيَدَيْهِ ثُمَّ يُفِيْضُ الْمَاءَ عَلَى جِلْدِهِ كُلِّهِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَيْهِ قَبْلَ أَنْ يُدْخِلَهُمَا الْإِنَاءَ ثُمَّ يُفْرِغُ بِيَمِيْنِهِ عَلَى شِمَالِهِ فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ)۔ ۲

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جب غسل جنابت (یعنی ناپاکی کو دور کرنے کے لئے غسل) کا ارادہ فرماتے تو (غسل) اس طرح شروع فرماتے کہ پہلے دونوں ہاتھ (پہنچوں تک) دھوتے پھر وضو کرتے جس طرح نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے پھر انگلیاں (تر ہونے کے لئے) پانی میں ڈالتے پھر انہیں نکال کر ان (انگلیوں کی تری) سے اپنے بالوں کی جڑوں میں خلال فرماتے پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے تین چلو (پانی لے کر) سر پر ڈالتے اور پھر اپنے تمام بدن پر پانی بہاتے (بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (جب آپ غسل) شروع کرتے تو اپنے داہنے ہاتھ سے اپنے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے اور پھر اپنی شرمگاہ کو دھوتے اور اس کے بعد وضو کرتے۔

توضیح: کما یتوضأ للصلاۃ: اس تشبیہ کی وجہ یہ ہے کہ وہم ہوسکتا تھا کہ جب غسل میں سر پر پانی ڈالا جاتا ہے تو شاید اس وضو میں سر کا مسح نہ کیا ہوگا یا غسل میں سارا پانی پاؤں پر آتا ہے تو شاید اس وضو میں پاؤں نہ دھوئے ہوں اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ یہ وضو بالکل نماز کے وضو کی طرح تھا۔ ۳

یہاں پر یہ شبہ بھی ہے کہ اس روایت میں وضو کے ساتھ پاؤں دھونے کا ذکر ہے اور بعد والی حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں غسل کے بعد پاؤں دھونے کا ذکر نہیں ہے دونوں میں تعارض ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں صورتیں جائز ہیں کوئی تعارض نہیں ویسے احناف کا ایک قول ہے کہ مطلقاً پاؤں بعد میں دھونا چاہئے، شوافع فرماتے ہیں کہ غسل سے پہلے وضو کے ساتھ دھوئے جائیں، صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ **اگر جگہ میں تلویث قدمین** کا خطرہ ہے تو بعد میں پاؤں دھوئے جائیں اور اگر جگہ صاف ہے اور مناسب چوکی وغیرہ ہے تو وضو کے ساتھ دھونا زیادہ بہتر ہے۔ غسل میں پہلے سر پر پانی ڈالا جائے پھر دائیں کندھے پر ڈالا جائے پھر بائیں کندھے پر ڈالا جائے اور پھر سارے بدن پر ڈالا جائے اطباء کے ہاں یہ اچھا طریقہ ہے۔

---

۱ المرقات ۲/۱۳۷ ۲ اخرجه البخاری ۱/۷۲ ومسلم ۱/۱۴۶ ۳ المرقات ۲/۱۳۸

﴿۵﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَتْ مَيْمُونَةُ وَضَعْتُ لِلنَّبِيِّ ﷺ غُسْلًا فَسَتَرْتُهُ بِثَوْبٍ وَصَبَّ عَلَى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا ثُمَّ صَبَّ بِيَمِينِهِ عَلَى شِمَالِهِ فَغَسَلَ فَرْجَهُ فَضَرَبَ بِيَدِهِ الْأَرْضَ فَمَسَحَهَا ثُمَّ غَسَلَهَا فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَغَسَلَ وَجْهَهُ وَذِرَاعَيْهِ ثُمَّ صَبَّ عَلَى رَأْسِهِ وَأَفَاضَ عَلَى جَسَدِهِ ثُمَّ تَنَحّٰى فَغَسَلَ قَدَمَيْهِ فَنَاوَلْتُهُ ثَوْبًا فَلَمْ يَأْخُذْهُ فَانْطَلَقَ وَهُوَ يَنْفُضُ يَدَيْهِ.

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَلَفْظُهُ لِلْبُخَارِيِّ)[1]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کے لئے غسل کے واسطے پانی رکھا اور کپڑا ڈال کر پردہ کیا چنانچہ آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈال کر انہیں دھویا۔ پھر آپ نے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا اور شرم گاہ کو دھویا پھر اپنا بایاں ہاتھ (جس سے شرمگاہ کو دھویا تھا) زمین پر رگڑا اور اسے دھویا پھر کلی کی، ناک میں پانی ڈالا اور چہرہ اور ہاتھ کو (کہنیوں تک) دھویا پھر اپنے سر پر پانی ڈالا اور تمام بدن پر بہایا پھر (جہاں آپ نے غسل فرمایا تھا) اس جگہ سے ہٹ کر اپنے پاؤں دھوئے۔ اس کے بعد میں نے (بدن پونچھنے کے لئے) کپڑا دیا لیکن آپ نے کپڑا نہیں لیا پھر آپ ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ (بخاری ومسلم) الفاظ بخاری کے ہیں۔

حائضہ کے غسل کا طریقہ

﴿۶﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ إِنَّ امْرَأَةً مِنَ الْأَنْصَارِ سَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ غُسْلِهَا مِنَ الْمَحِيْضِ فَأَمَرَهَا كَيْفَ تَغْتَسِلُ ثُمَّ قَالَ خُذِيْ فِرْصَةً مِنْ مِسْكٍ فَتَطَهَّرِيْ بِهَا قَالَتْ كَيْفَ أَتَطَهَّرُ بِهَا فَقَالَ تَطَهَّرِيْ بِهَا قَالَتْ كَيْفَ أَتَطَهَّرُ بِهَا قَالَ سُبْحَانَ اللهِ تَطَهَّرِيْ بِهَا فَاجْتَذَبْتُهَا إِلَيَّ فَقُلْتُ تَتَبَّعِيْ بِهَا أَثَرَ الدَّمِ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ (ایک دن) ایک انصاری عورت نے سرکار دو عالم ﷺ سے اپنے غسل حیض کے بارے میں پوچھا چنانچہ آپ نے اسے غسل کا حکم دیا کہ کس طرح غسل کیا جائے (یعنی پہلی حدیثوں میں غسل کی جو کیفیت گزری ہے، آپ نے وہ بیان فرمائی) اور پھر فرمایا کہ مشک میں (بھگوئے ہوئے کپڑے) کا ایک ٹکڑا لے کر اس سے پاکی حاصل کرو۔ اس نے پوچھا کہ اس سے کس طرح پاکی حاصل کروں؟ آپ نے فرمایا کہ تم اس سے پاکی حاصل کرو اس نے پھر پوچھا کہ اس سے کس طرح پاکی حاصل کروں؟ آپ نے فرمایا سبحان اللہ (یعنی اللہ پاک ہے) تم اس سے پاکی حاصل کرو، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں (کہ آنحضرت ﷺ کے انہیں الفاظ کو بار بار سن کر) میں نے اس عورت کو اپنی جانب کھینچ لیا اور اس سے کہا کہ (تم اس کپڑے کو) خون کی جگہ (یعنی شرمگاہ پر) رکھ لو۔ (بخاری ومسلم)

[1] اخرجه البخاری ۱/۷۲ ومسلم ۱/۱۴۷ [2] اخرجه البخاری ۲/۸۵ ومسلم ۱/۱۴۹

توضیح: المحیض: حیض کے معنی میں ہے **فامرھا** یعنی آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو غسل کی کیفیت اور طریقہ سمجھا دیا۔[۱]

فرصۃ: یہ لفظ فا کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ اون یا روئی کے ٹکڑے کو کہا جاتا ہے یا کپڑے کے چھوٹے سے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ بعض روایات میں یہ لفظ قرصۃ قاف کے ساتھ آیا ہے اس سے بھی چھوٹا ٹکڑا مراد ہے جو دو انگلیوں کے درمیان میں دب جاتا ہو۔[۲]

من مسك: یہ لفظ میم کے کسرہ کے ساتھ زیادہ مشہور ہے ظاہر لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مشک کے چھوٹے سے ٹکڑے کو اندام نہانی پر مل لیا جائے تا کہ وہاں بدبو کا اثر باقی نہ رہے یا مشک سے مراد یہ کہ اس کو کسی کپڑے پر مل لو اور پھر وہ کپڑا اندام نہانی پر مل کر صفائی حاصل کرلو۔[۳] **"تطھری"** کا مطلب یہی ہے کہ صفائی حاصل کرلو مگر بعض روایات میں **"توضئی"** کا لفظ بھی آیا ہے اس سے بھی صفائی ستھرائی مراد ہے۔[۴]

قال سبحان الله: یعنی آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو جتنا سمجھایا وہ نہ سمجھ سکی اور سوال کرتی رہی ادھر آنحضرت ﷺ کو حجاب تھا کہ کھلے اور برہنہ الفاظ استعمال فرمائیں اس پر آپ نے تعجب کے انداز میں لفظ سبحان اللہ استعمال فرمایا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے پردے والے مسائل میں جتنا ممکن ہو کنائی الفاظ استعمال کئے جائیں اور شرم وحیا کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔[۵]

فاجتذبتھا: یہ کھینچنے کے معنی میں ہے اس لفظ کو جتنا الٹ پلٹ دیا جائے اس کا معنی ایک ہی رہتا ہے بعض روایات میں **فاجتبذتھا** ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے اللہ تعالیٰ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے درجات کو بلند فرمائے انہوں نے جب دیکھا کہ یہ عورت سمجھتی نہیں ہے اور آنحضرت ﷺ کو پریشان کر رکھا ہے تو آپ نے اس کو کھینچا اور برہنہ الفاظ میں سمجھا دیا کہ ایسا کرو کیونکہ عورتوں کے آپس میں اس طرح باتوں کی گنجائش ہوتی ہے۔[۶]

غسل میں سر کے بالوں کا مسئلہ

﴿۷﴾ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ إِنِّي امْرَأَةٌ أَشُدُّ ضُفْرَ رَأْسِي أَفَأَنْقُضُهُ لِغُسْلِ الْجَنَابَةِ فَقَالَ لَا إِنَّمَا يَكْفِيكِ أَنْ تَحْثِي عَلَى رَأْسِكِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ ثُمَّ تُفِيضِينَ عَلَيْكِ الْمَاءَ فَتَطْهُرِينَ۔

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[۷]

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ "میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں ایک ایسی عورت ہوں کہ اپنے سر کے بالوں کو بہت مضبوط گوندھتی ہوں، کیا صحبت کے بعد نہانے کے واسطے انہیں کھولا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں (بالوں

[۱] المرقات ۲/۱۴۰،۱۴۱ [۲] المرقات ۲/۱۴۱ [۳] المرقات ۲/۱۴۱
[۴] المرقات ۲/۱۴۱ [۵] المرقات ۲/۱۴۱ [۶] المرقات ۲/۱۴۲ [۷] اخرجه مسلم

کو کھولنے کی ضرورت نہیں ہے) بلکہ تمہیں یہی کافی ہے کہ تین لپیں پانی لے کر سر پر ڈال لیا کرو اور پھر سارے بدن پر پانی بہا لیا کرو پاک ہو جاؤ گی۔ (مسلم)

توضیح: اشد: شَدَّ یَشُدُّ مضبوط کرنے اور باندھنے کے معنی میں ہے۔[1]

ضفر راسی: ضفر ضاد کے فتح اور فا کے سکون کے ساتھ زیادہ مشہور ہے ضفر مفرد ہے اس کی جمع ضفائر ہے یہ مینڈنیوں کے معنی میں ہے اب بھی دیہاتوں میں شرفاء عورتیں سر کے بالوں کو بٹ لیتی ہیں اور مینڈنیاں بناتی ہیں اور اس کام پر کافی وقت لگتا ہے تو ہر غسل کے لئے اس کا کھولنا آسان کام نہیں اس لئے ام سلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مسئلہ پوچھا تو آنحضرت ﷺ نے عورتوں کے لئے نہ کھولنے کی اجازت فرمائی اب یہ رخصت عورتوں کے ساتھ خاص ہے مردوں میں کسی فقیر ملنگ کو اس کی اجازت نہیں کیونکہ اس کے لئے مینڈنیاں بنانا جائز نہیں۔ عورتوں کے غسل میں فقہاء کا اختلاف ہے۔[2]

فقہاء کا اختلاف:

اس مسئلے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ عورتوں کے لئے غسل کے وقت مینڈنیاں کھولنا ضروری ہے یا نہیں تو امام مالک رحمہ اللہ اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے ہاں حیض کے غسل میں نقض ضفائر ضروری ہے باقی غسلوں میں نہیں جمہور فقہاء کے نزدیک کسی بھی غسل میں عورت کے لئے نقض ضفائر ضروری نہیں ہے بشرطیکہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچتا ہو۔

دلائل:

امام مالک واحمد رحمہ اللہ نے بخاری کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جو حجۃ الوداع کے قصہ میں ہے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے ماہواری آئی تو غسل کے لئے آنحضرت ﷺ نے مجھے فرمایا کہ سر کے بالوں کو کھول دوں اور کنگھی کر کے غسل کرلوں مشکوٰۃ میں یہ الفاظ ہیں **فامرنی النبی ﷺ ان انقض راسی وامتشط** اور چونکہ یہ حیض کے بعد کا غسل تھا اس لئے صرف حیض کے غسل میں نقض ضفائر ہے جمہور کی دلیل زیر نظر ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صریح اور صحیح حدیث ہے۔[3]

جواب: مالکیہ اور حنابلہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہ نقض ضفائر کا حکم حج کے موقع پر دوسرے میل کچیل دور کرنے کی وجہ سے فرمایا تھا حیض کے ساتھ تخصیص نہیں بلکہ محل حج کے ساتھ خاص ہے۔

وضو اور غسل میں پانی کی مقدار

﴿۸﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ وَيَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلَى خَمْسَةِ أَمْدَادٍ.

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[4]

---

[1] المرقات ۲/۱۳۲ [2] المرقات ۲/۱۳۲ [3] المرقات ۲/۱۳۲ [4] اخرجه البخاري ومسلم ۱/۱۷۷

ترجمہ: اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ ایک مد (پانی) سے وضو فرماتے اور ایک صاع سے پانچ مد تک (پانی) سے غسل فرما لیتے تھے۔ (بخاری، مسلم)

توضیح: بالمد: یہ لفظ میم کے ضمہ اور دال کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یہ دو رطل یعنی دو پونڈ کے پیمانے کا نام ہے اور صاع اس پیمانہ کا نام ہے جس میں چار مد یعنی آٹھ رطل آتے ہوں یہ احناف کے ہاں ہے آئندہ کسی جگہ انشاء اللہ تفصیل آجائے گی۔ اس حدیث اور دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک مد پانی سے وضو اور ایک صاع پانی سے غسل فرما لیا کرتے تھے۔

فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ وضو اور غسل میں پانی استعمال کرنے کی کوئی حد بندی نہیں ہے البتہ اسراف اور تقتیر یعنی کمی سے بچنا ضروری ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ امور عادی ہیں عادت کی وجہ سے بدلتے ہیں کبھی زمانہ کبھی مکان و مقام کی وجہ سے اس میں فرق آتا ہے کبھی پانی کی قلت و کثرت اور کبھی مزاج کے تغیر سے اس میں تغیر آتا ہے نبی اکرم ﷺ عموماً اسی مقدار کو استعمال فرماتے تھے جس کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے۔[1]

مرد اور عورت کا ایک ساتھ غسل کرنا

﴿۹﴾ وَعَنْ مُعَاذَةَ قَالَتْ قَالَتْ عَائِشَةُ كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَرَسُوْلُ اللهِ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ فَيُبَادِرُنِيْ حَتّٰى أَقُوْلَ دَعْ لِيْ دَعْ لِيْ قَالَتْ وَهُمَا جُنُبَانِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: اور حضرت معاذہ رحمہا اللہ تعالیٰ کہتی ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی تھیں کہ "میں اور سرکار دو عالم ﷺ ایک برتن سے جو دونوں کے درمیان رکھا رہتا تھا نہاتے تھے اور آپ (پانی لینے میں) مجھ سے جلدی کرتے تھے تو میں کہا کرتی تھی میرے لئے تو پانی چھوڑیئے! میرے لئے بھی تو پانی رہنے دیجئے۔" حضرت معاذہ فرماتی ہیں کہ وہ دونوں (آنحضرت ﷺ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) جنبی (یعنی حالت ناپاکی میں) ہوتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

توضیح: کنت اغتسل انا: مرد اور عورت جو میاں بیوی ہو اگر معاً ساتھ ساتھ غسل کریں تو اتفاقاً یہ جائز ہے اس میں کوئی کراہت نہیں اور اگر مرد نے پہلے غسل کیا اور عورت نے بعد میں کیا تو اس میں بھی کوئی کراہت نہیں اگر عورت نے تخلیہ میں پہلے غسل کیا اور مرد بعد میں اس کے بقیہ پانی سے غسل کرنا چاہتا ہے تو اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور اہل ظواہر کے نزدیک یہ صورت مکروہ ہے جمہور علماء کے نزدیک صرف عورت کے پہلے غسل کرنے سے پانی مکروہ نہیں ہوتا لہٰذا مرد کے لئے اس سے غسل کرنا مکروہ نہیں ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہی مذکورہ حدیث ہے حنابلہ اور اہل ظواہر نے ان روایات سے استدلال کیا ہے جن میں عورتوں کے بعد مردوں کے اغتسال کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] المرقات ۲/۱۴۳ [2] اخرجه البخاری ۱/۷۲ ومسلم ۱/۱۷۵

جمہور ان روایات کا یہ جواب دیتے ہیں کہ وہ اجنبیات کے استعمال شدہ پانی پر محمول ہیں یعنی اجنبیت کی وجہ سے غیر محرم کے لئے التذاذ کے باعث منع کیا گیا ہے یا وہ روایات ایسی عورتوں کے بارے میں ہیں جو غسل کرنے کا صحیح سلیقہ نہیں جانتی ہوں اور پانی میں چھینٹیں پڑ جاتی ہوں تو وہ ممنوع و مکروہ ہے ورنہ نہیں۔

باقی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جس منظر کو بیان فرمایا ہے اس کا پس منظر اس طرح ہے کہ اس وقت پانی کی بھی تنگی تھی الگ الگ پانی میسر نہیں تھا نیز الگ الگ برتن بھی میسر نہیں تھے تنگ مکان کی وجہ سے الگ الگ جگہ بھی میسر نہیں تھی۔ پھر رات کی تاریکی میں ایک دوسرے کا بدن بھی نظر نہیں آتا تھا اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس پر منکرین حدیث کو اعتراض کا موقع ملے۔

ہاں خبث باطن کا تو کوئی علاج نہیں کسی نے خوب کہا ہے:

وعين الرضا عن كل عيب كليلة ولكن عين السخط تبدی المساویا

۲۸ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ

الفصل الثانی

مسئلة الاحتلام

﴿۱۰﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنِ الرَّجُلِ يَجِدُ الْبَلَلَ وَلَا يَذْكُرُ احْتِلَامًا قَالَ يَغْتَسِلُ وَعَنِ الرَّجُلِ يَرٰى أَنَّهُ قَدِ احْتَلَمَ وَلَا يَجِدُ بَلَلًا قَالَ لَا غُسْلَ عَلَيْهِ قَالَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ هَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ تَرٰى ذٰلِكَ غُسْلٌ قَالَ نَعَمْ إِنَّ النِّسَاءَ شَقَائِقُ الرِّجَالِ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَرَوَى الدَّارِمِيُّ وَابْنُ مَاجَه إِلٰى قَوْلِهٖ لَا غُسْلَ عَلَيْهِ) [1]

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو (سوکر اٹھنے کے بعد کپڑے پر منی کی) تری محسوس کرے اور خواب (احتلام) اسے یاد نہ ہو؟ آپ نے فرمایا کہ "نہانا چاہئے" اور ایسے شخص کے بارے میں بھی پوچھا گیا جسے (سوکر اٹھنے کے بعد) احتلام تو یاد رہے مگر تری معلوم نہیں ہوتی۔ آپ نے فرمایا "اس پر غسل واجب نہیں" ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا اگر عورت بھی یہ (تری) دیکھے تو اس پر غسل واجب ہے؟ آپ نے فرمایا "ہاں" عورتیں بھی مردوں ہی کی مثل ہیں"۔ ترمذی، ابوداؤد اور دارمی و ابن ماجہ نے اس حدیث کو "لا غسل علیہ" اس پر غسل واجب نہیں۔

توضیح: **یجد البلل:** اس حدیث میں ایک سوال تو اس شخص کے بارے میں کیا گیا ہے جو سوکر اٹھنے کے بعد کپڑے یا جسم وغیرہ پر تری دیکھتا ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس شخص پر غسل واجب ہے۔ دوسرا سوال ایسے شخص

[1] اخرجه الترمذی ۱۱۳ وابو داؤد ۲۳۶ والدارمی ۷۷۱ وابن ماجه ۲۱

کے بارے میں کیا گیا جس نے نیند میں خواب تو دیکھا احتلام بھی یاد ہے مگر جاگنے کے بعد کوئی تری کہیں نظر نہ آئی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس پر غسل واجب نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا کوئی بڑا اختلاف تو نہیں ہے البتہ احناف کے نزدیک اس کی صورتوں میں کافی لمبی تفصیل ہے میں اس کو مختصر طور پر پیش کرتا ہوں۔ [1]

احتلام کی صورتیں:

اگر احتلام کے بعد نیند سے اٹھنے کے بعد اس شخص نے نہ تو منی دیکھی نہ کوئی اور تری نظر آئی تو اس صورت میں غسل نہیں ہے اور اگر کچھ خارج ہوا ہے اور تری نظر آئی ہے تو پھر چند صورتیں ہوں گی۔

① اس شخص کو یقین آ گیا کہ یہ منی ہے ② یا یقین آ گیا کہ مذی ہے ③ یا یقین آ گیا کہ ودی ہے۔

پھر یقین کی ان تینوں صورتوں میں اس شخص کو احتلام یاد ہوگا یا احتلام یاد نہیں ہوگا تو یقین کی یہ چھ صورتیں بن گئیں ان میں تین صورتوں میں غسل ہے اور تین میں نہیں ہے وہ اس طرح کہ اس شخص کو یقین ہے کہ منی ہے تو احتلام یاد ہو یا بھول گیا ہو غسل واجب ہے۔ یہ دو صورتیں ہو گئیں یا یقین ہے کہ یہ ودی ہے تو احتلام یاد ہو یا بھول گیا ہو اس میں غسل واجب نہیں ہے یا یقین ہے کہ یہ مذی ہے تو اس میں اگر احتلام یاد ہے تو غسل واجب ہے اگر یاد نہیں ہے تو کچھ نہیں تو منی کی دو صورتوں اور مذی کی ایک صورت ان تینوں صورتوں میں غسل ہے اور ودی کی دو صورتوں اور مذی کی ایک صورت، ان تینوں میں غسل نہیں ہے۔

اب اگر شک کی صورت ہو تو اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ:

① اس میں شک ہے کہ یہ منی ہے یا مذی ہے ② اس میں شک ہے کہ یہ منی ہے یا ودی ہے ③ اس میں شک ہے کہ یہ مذی ہے یا ودی ہے۔ ④ منی مذی ودی تینوں میں ایک ساتھ شک ہے تو شک کی کل چار صورتیں بن گئیں۔

اب ان چاروں صورتوں میں احتلام یاد ہوگا یا نہیں تو یہ کل آٹھ صورتیں ہو گئیں ان میں احتلام یاد ہونے کی صورت میں امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک غسل چار صورتوں میں واجب ہے اور احتلام یاد نہ ہونے کی چار صورتوں میں غسل نہیں ہے۔

شک اور یقین کی یہ سب چودہ صورتیں بن گئیں سات میں غسل واجب ہے اور سات میں نہیں ہے۔ یہ تفصیل احناف کے ہاں ہے باقی ائمہ کے ہاں اگر منی ہے تو غسل ہے ورنہ نہیں ہے۔

ان النساء شقائق الرجال: یعنی تخلیق اور طبائع میں مرد اور عورتیں یکساں ہیں جو کچھ مردوں میں ظاہر ہوتا ہے وہ عورتوں میں بھی ظاہر ہوتا ہے جو کچھ ایک صنف میں پایا جاتا ہے وہ دوسری صنف میں بھی پایا جاتا ہے لہٰذا جس طرح احتلام مردوں میں ہوتا ہے عورتوں میں بھی ہوتا ہے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں میں احتلام کے قلیل اور نادر ہونے کی

[1] المرقات ۲/۱۳۴

وجہ سے ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سوال کیا کہ کیا عورتوں کے احتلام میں بھی کوئی تری ظاہر ہوتی ہے آپ ﷺ نے اثبات میں جواب دیا بعض علماء نے شقائق اور شقیقۃ کو اشتراک فی الاحکام کے معنی میں لیا ہے کہ دونوں احکام شریعت میں یکساں ہیں یہ مفہوم زیادہ آسان ہے۔[1]

حشفہ غائب ہونے سے غسل واجب ہوجاتا ہے

﴿۱۱﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا جَاوَزَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ وَجَبَ الْغُسْلُ فَعَلْتُهُ أَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاغْتَسَلْنَا۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه)[2]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب مرد کے ختنہ کی جگہ عورت کے ختنہ کی جگہ سے تجاوز کر جائے (یعنی حشفہ غائب ہوجائے تو دونوں پر) غسل واجب ہوجائے گا۔" (حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) فرماتی ہیں کہ میں نے اور آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا اور ہم دونوں نہائے۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

توضیح: اس حدیث کی تشریح باب کی ابتدائی حدیثوں میں گزر چکی ہے۔ (مؤلف)

ہر بال کے نیچے جنابت ہے

﴿۱۲﴾ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَحْتَ كُلِّ شَعْرَةٍ جَنَابَةٌ فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ وَأَنْقُوا الْبَشَرَةَ۔

(رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَالْحَارِثُ بْنُ وَجِيْهٍ الرَّاوِيُّ وَهُوَ شَيْخٌ لَيْسَ بِذَاكَ)[3]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا "ہر بال کے نیچے (جڑ میں) جنابت ہوتی ہے لہٰذا بالوں کو (خوب) دھویا کرو اور بدن کو پاک کیا کرو۔" (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ) اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے کیونکہ اس حدیث کا ایک راوی حارث بن وجیہ ایک بوڑھا شخص ہے وہ معتبر نہیں ہے۔
(یعنی کبرسنی اور غلبہ نسیان کی وجہ سے اس کی روایت قابل اعتماد یعنی قوی نہیں ہے بلکہ ضعیف ہے)

ایک بال کی جگہ خشک رہ گئی تو غسل نہیں ہوگا

﴿۱۳﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَرَكَ مَوْضِعَ شَعْرَةٍ مِنْ جَنَابَةٍ لَمْ يَغْسِلْهَا فُعِلَ بِهَا كَذَا وَكَذَا مِنَ النَّارِ قَالَ عَلِيٌّ فَمِنْ ثَمَّ عَادَيْتُ رَأْسِيْ فَمِنْ ثَمَّ عَادَيْتُ رَأْسِيْ ثَلَاثًا۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَأَحْمَدُ وَالدَّارِمِيُّ إِلَّا أَنَّهُمَا لَمْ يُكَرِّرَا فَمِنْ ثَمَّ عَادَيْتُ رَأْسِيْ)[4]

[1] المرقات ۲/۱۳۵ [2] اخرجه الترمذی ۱۰۸ وابن ماجه ۶۰۸
[3] اخرجه ابو داؤد ۲۴۸ والترمذی ۱۰۶ وابن ماجه ۵۹۷ [4] اخرجه ابو داؤد ۲۵۰ واحمد ۱/۹۴ والدارمی ۷۵۷

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جس شخص نے غسل جنابت میں ایک بال کے برابر بھی جگہ (خشک) چھوڑ دی کہ اسے نہ دھویا تو اسے اس طرح آگ کا عذاب دیا جائے''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دشمنی کی اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دشمنی کی، اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دشمنی کی کہ منڈا ڈالا، تین مرتبہ یہ کہا'' (ابوداؤد، احمد، دارمی) مگر احمد اور دارمی نے یہ الفاظ ''اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دشمنی کی'' مکرر ذکر نہیں کئے ہیں۔

﴿۱۴﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَتَوَضَّأُ بَعْدَ الْغُسْلِ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ)[۱]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ''سرکار دو عالم ﷺ غسل کرنے کے بعد وضو نہیں فرماتے تھے''۔

(ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

توضیح: لا یتوضأ: یعنی غسل کرنے کے بعد وضو نہیں فرماتے تھے کیونکہ غسل سے پہلے آپ مکمل وضو بناتے تھے جیسا کہ اس باب کی حدیث نمبر ۴ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تصریح فرمائی ہے ویسے بھی جب آدمی غسل کرتا ہے تو حدث اکبر سے پاک ہوجاتا ہے تو حدث اصغر کی پاکی تو اس کے ضمن میں ہے اس کے اعادہ کی کیا ضرورت ہے۔[۲]

﴿۱۵﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَغْسِلُ رَأْسَهُ بِالْخِطْمِيِّ وَهُوَ جُنُبٌ يَجْتَزِئُ بِذٰلِكَ وَلَا يَصُبُّ عَلَيْهِ الْمَاءَ. (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ)[۳]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں ''سرکار دو عالم ﷺ ناپاکی/ جنابت کی حالت میں (غسل کے وقت) خطمی سے سر کو دھو لیتے تھے اور اسی پر کفایت کرتے اور دوبارہ سر پر (خالص) پانی نہ ڈالتے تھے۔'' (ابوداؤد)

توضیح: الخطمی: خا کے کسرہ کے ساتھ ایک پودے کا نام ہے جس کو پانی میں ملا کر اس سے صابن کا کام لیا جاتا تھا جس سے سر خاص طور پر دھویا جاتا تھا۔[۴]

یجتزئ بذلك: یعنی جس پانی میں خطمی ملا ہوتا تھا اس کو استعمال کر کے غسل کے لئے کافی سمجھتے تھے اور خطمی کو دھونے کے لئے مزید خالص پانی استعمال نہیں کرتے تھے یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ پانی میں گل خطمی بہت کم مقدار میں ملایا گیا ہو تو یہ خالص پانی کی طرح ہوتا تھا اور مزید خالص پانی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔[۵]

اس حدیث سے ائمہ احناف کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ پانی میں اگر کوئی پاک چیز مل جائے اور اس کا اثر پانی میں ظاہر ہوجائے اور پانی کی طبیعت رقت سیلان متاثر نہ ہو تو اس سے وضو جائز ہے شوافع اس کو نہیں مانتے ہیں۔

---

[۱] اخرجه الترمذی ۱۰۷ وابو داؤد ۲۵۰ والنسائی ۱/۱۳۷ [۲] المرقات ۲/۱۴۸

[۳] اخرجه ابو داؤد ۲۵۶ [۴] المرقات ۲/۱۴۸ [۵] المرقات ۲/۱۴۸

﴿۱۶﴾ وَعَنْ يَعْلٰى قَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَأٰى رَجُلًا يَغْتَسِلُ بِالْبَرَازِ فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ سِتِّيْرٌ يُحِبُّ الْحَيَاءَ وَالتَّسَتُّرَ فَإِذَا اغْتَسَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَتِرْ.

(رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَفِيْ رِوَايَتِهٖ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ سِتِّيْرٌ فَإِذَا أَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يَغْتَسِلَ فَلْيَتَوَارَ بِشَيْءٍ) [1]

ترجمہ: اور حضرت یعلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک شخص کو میدان میں ننگا نہاتے ہوئے دیکھا چنانچہ آپ (وعظ کے لئے) ممبر پر چڑھے اور پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی پھر فرمایا اللہ تعالیٰ بہت حیاء دار ہے (یعنی اپنے بندوں سے حیاداروں کا معاملہ کرتا ہے بایں طور کہ انہیں معاف کرتا ہے) اور بہت پردہ پوش ہے (یعنی اپنے بندوں کے گناہ اور عیوب کو پوشیدہ رکھتا ہے) وہ حیاء اور پردہ پوشی کو پسند کرتا ہے لہٰذا جب تم میں سے کوئی (میدان میں) نہائے تو اسے چاہئیے کہ وہ پردہ کرلیا کرے۔" (ابوداؤد، نسائی) اور نسائی کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ پردہ پوش ہے لہٰذا جب تم میں سے جو کوئی نہانے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئیے کہ وہ کسی چیز کا پردہ کرلیا کرے۔"

الفصل الثالث

﴿۱۷﴾ وَعَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ إِنَّمَا كَانَ الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ رُخْصَةً فِيْ أَوَّلِ الْإِسْلَامِ ثُمَّ نُهِيَ عَنْهَا.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ) [2]

ترجمہ: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم کہ غسل انزال کے بعد ہی واجب ہوتا ہے ابتدائے اسلام میں آسانی کی وجہ سے تھا پھر اس سے منع فرمادیا گیا (یعنی یہ حکم منسوخ قرار دے دیا گیا)۔ (ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

غسل جنابت میں بدن کا کوئی حصہ خشک نہ رہے

﴿۱۸﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ إِنِّيْ اغْتَسَلْتُ مِنَ الْجَنَابَةِ وَصَلَّيْتُ الْفَجْرَ فَرَأَيْتُ قَدْرَ مَوْضِعِ الظُّفْرِ لَمْ يُصِبْهُ الْمَاءُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كُنْتَ مَسَحْتَ عَلَيْهِ بِيَدِكَ أَجْزَأَكَ. (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ) [3]

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے غسل جنابت کیا اور صبح کی نماز پڑھ لی، پھر میں نے دیکھا کہ (بدن پر) ناخن کے برابر جگہ خشک رہ گئی کہ وہاں پانی نہیں پہنچا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم (اس جگہ اپنے بھیگے) ہاتھ سے مسح بھی کرلیتے تو کافی ہوجاتا۔ (ابن ماجہ)

توضیح: مسحت علیه: اس سے مراد غسل اور دھونا ہے مسح ملنے کے معنی میں ہے اور دھونے میں ملنا ہوتا ہی ہے

[1] اخرجه ابوداؤد ۴۰۱۳ والنسائی ۱/۲۰۰ [2] اخرجه الترمذی ۱۱۰ وابوداؤد ۲۱۵ والدارمی ۶۵، [3] اخرجه ابن ماجه ۶۶۴

یعنی اگر غسل کے بعد اس خشک حصہ پر تم ذرا پانی مل لیتے تو تمہارے لئے یہ جائز ہوتا اور نماز ہو جاتی مگر تم نے ایسا نہیں کیا لہٰذا فرض نماز نہیں ہوئی اب دوبارہ پڑھنی ہوگی۔ یہ مسئلہ غسل کیلئے بھی ہے اور اعضاء وضو میں وضو کے لئے بھی ہے کہ اگر کوئی جگہ خشک رہ گئی یا نیل پالش یا لپ اسٹک کی وجہ سے یا دیگر روغن یا تارکول یا گوند وغیرہ کی وجہ سے پانی جسم کے مطلوبہ حصہ تک نہیں پہنچا تو نہ غسل صحیح ہوگا اور نہ وضو ہوگا رنگ روغن کرنے والوں اور پالش استعمال کرنے والی عورتوں پر اس مسئلہ میں احتیاط لازم ہے۔[1]

چند احکام میں تخفیف

﴿۱۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَتِ الصَّلَاةُ خَمْسِيْنَ وَالْغُسْلُ مِنَ الْجَنَابَةِ سَبْعَ مَرَّاتٍ وَغَسْلُ الْبَوْلِ مِنَ الثَّوْبِ سَبْعَ مَرَّاتٍ فَلَمْ يَزَلْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَسْأَلُ حَتّٰى جُعِلَتِ الصَّلَاةُ خَمْسًا وَغَسْلُ الْجَنَابَةِ مَرَّةً وَغَسْلُ الثَّوْبِ مِنَ الْبَوْلِ مَرَّةً۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ (پہلے) پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں، نیز جنابت (ناپاکی) سے نہانا اور کپڑے پر سے پیشاب دھونا سات سات مرتبہ (فرض ہوا تھا) پھر آنحضرت ﷺ متواتر اللہ تعالیٰ سے ان میں تخفیف کی دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ نمازیں تو پانچ رہ گئیں اور جنابت سے نہانا اور کپڑے پر سے پیشاب کا دھونا ایک ایک مرتبہ رہ گیا۔ (ابوداؤد)

توضیح: خمسین: یعنی لیلۃ المعراج میں آنحضرت ﷺ کی امت پر دن رات میں پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں لیکن اس پر عمل کرنے سے پہلے ہی وہ منسوخ و موقوف ہو گئیں اور صرف پانچ رہ گئیں معلوم ہوا کہ کسی حکم پر عمل کرنے سے پہلے وہ منسوخ ہو سکتا ہے نسخ کی تعریف اور اس کا حکم اس کتاب کی ابتداء میں گزر چکا ہے۔[3]

وغسل الثوب مرۃ: یعنی نجاست لگنے کے بعد اس کے ازالہ کے لئے سات بار دھونے کا حکم تھا پھر ایک بار دھونے کا حکم رہ گیا یہ مسلک شوافع کا ہے کہ ایک بار دھونے سے کپڑا وغیرہ پاک ہو جاتا ہے ہاں تین بار دھونا مستحب ہے لیکن احناف کے ہاں تین بار دھونا واجب ہے جبکہ نجاست غیر مرئیہ ہو۔[4]

[1] المرقات ۲/۱۵۱ [2] اخرجہ ابو داؤد ۲۴۷ [3] المرقات ۲/۱۵۱ [4] المرقات ۲/۱۵۱

باب مخالطة الجنب وما يباح له

جنبی سے اختلاط کا بیان

الفصل الاول

﴿۱﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ لَقِيَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَنَا جُنُبٌ فَأَخَذَ بِيَدِي فَمَشَيْتُ مَعَهُ حَتَّى قَعَدَ فَانْسَلَلْتُ فَأَتَيْتُ الرَّحْلَ فَاغْتَسَلْتُ ثُمَّ جِئْتُ وَهُوَ قَاعِدٌ فَقَالَ أَيْنَ كُنْتَ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ فَقُلْتُ لَهُ فَقَالَ سُبْحَانَ اللهِ إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجَسُ. هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ وَلِمُسْلِمٍ مَعْنَاهُ وَزَادَ بَعْدَ قَوْلِهِ فَقُلْتُ لَهُ لَقِيتَنِي وَأَنَا جُنُبٌ فَكَرِهْتُ أَنْ أُجَالِسَكَ حَتَّى أَغْتَسِلَ وَكَذَا الْبُخَارِيُّ فِي رِوَايَةٍ أُخْرَى.[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ سے میری ملاقات ہوئی اور میں جنبی تھا۔ آنحضرت ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑلیا اور میں آپ کے ہمراہ ہولیا جب آپ بیٹھ گئے تو میں چپکے سے نکل کر اپنے مکان پر آیا اور نہا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے (مجھے دیکھ کر) آپ ﷺ نے فرمایا ''تم کہاں تھے؟'' میں نے آپ سے (اصل واقعہ) ذکر کیا (کہ میں ناپاک تھا اس لئے چلا گیا تھا) آپ ﷺ نے فرمایا ''سبحان اللہ! مومن ناپاک نہیں ہوتا'' روایت کے الفاظ بخاری کے ہیں مسلم نے اس کی ہم معنی روایت نقل کی ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ مزید نقل کیے ہیں (انہوں نے کہا) ''میں چونکہ ناپاکی کی حالت میں تھا اس لئے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ آپ کے پاس بیٹھوں جب تک کہ نہا نہ لوں'' اسی طرح بخاری کی دوسری روایت میں بھی یہ الفاظ منقول ہیں۔

جنابت کی حالت میں سونے کا حکم

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ ذَكَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ أَنَّهُ تُصِيبُهُ الْجَنَابَةُ مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ تَوَضَّأْ وَاغْسِلْ ذَكَرَكَ ثُمَّ نَمْ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے رات کو جنابت ہوجاتی ہے (یعنی احتلام یا جماع سے غسل واجب ہوجاتا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ (اسی وقت) وضو کر کے عضو تناسل کو دھو کر سوجایا کرو۔ (بخاری ومسلم)

---

[1] اخرجه البخاری ۱/۷۹ ومسلم ۱/۱۳۹ [2] اخرجه البخاری ۱/۸۰ ومسلم ۱/۱۷۱

توضیح: **توضأ:** یعنی وضو بنالو ذکر دھولو اور سو جاؤ۔
رات کو جنابت کی حالت میں بغیر غسل کے سو جانا اہل ظواہر کے نزدیک ناجائز ہے۔ جمہور فرماتے ہیں کہ غسل کرنا مستحب اور افضل ہے ورنہ پھر وضو کا درجہ ہے اور پھر صرف استنجاء کا درجہ ہے شاہ انور شاہ کاشمیری عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ نے فیض الباری میں لکھا ہے کہ جو شخص ہمیشہ جنابت کی حالت میں سوتا ہے تو اس کے جنازہ میں فرشتے شریک نہیں ہوتے بہرحال عام احادیث میں بغیر غسل کے سو جانے کی اجازت موجود ہے اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ غسل کرنے کی بہتری میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔[1]

جنبی آدمی کھانے پینے اور سونے کے لئے وضو کرے

﴿۳﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا كَانَ جُنُبًا فَأَرَادَ أَنْ يَأْكُلَ أَوْ يَنَامَ تَوَضَّأَ وُضُوْءَهُ لِلصَّلَاةِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ حالت ناپاکی میں ہوتے اور کھانا کھانے اور سونے کا ارادہ فرماتے تو نماز کے وضو کی طرح وضو کر لیتے۔ (بخاری ومسلم)

دوبارہ صحبت کے لئے وضو کرنا مستحب ہے

﴿۴﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا أَتَى أَحَدُكُمْ أَهْلَهُ ثُمَّ أَرَادَ أَنْ يَعُوْدَ فَلْيَتَوَضَّأْ بَيْنَهُمَا وُضُوْءًا۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[3]

ترجمہ: اور حضرت ابو سعید خدری رَضِیَ اللہُ عَنْہُ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس آئے (یعنی صحبت کرے) اور پھر اس کے پاس دوبارہ آنے کا (یعنی صحبت کرنے کا) ارادہ کرے تو اسے چاہیئے کہ دونوں کے درمیان وضو کرے۔" (مسلم)

توضیح: **وضوء ا:** اس میں تنوین تعظیم کے لئے ہے مراد کامل اور مکمل وضو ہے یہ حکم وجوبی نہیں ہے بلکہ استحبابی ہے اس سے نشاط پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس پر عمل نہیں کرتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔[4]

﴿۵﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَطُوْفُ عَلَى نِسَائِهِ بِغُسْلٍ وَاحِدٍ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[5]

ترجمہ: اور حضرت انس رَضِیَ اللہُ عَنْہُ فرماتے ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ ایک غسل کے ساتھ اپنی ازواج مطہرات سے صحبت کیا کرتے تھے۔" (مسلم)

توضیح: **یطوف علی نسائه:** اس حدیث پر بظاہر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ قسم یعنی باری مقرر کرنے کے احکام میں

[1] المرقات ۲/۱۵۳ [2] اخرجه البخاری ومسلم ۱/۱۷۰ [3] اخرجه مسلم ۱/۱۷۱ [4] المرقات ۲/۱۵۴ [5] اخرجه مسلم ۱/۱۷۱

یہ ہے کہ ایک دن رات کم از کم قسم کے لئے ضروری ہے تو یہاں آپ نے قسم کو کیسے ترک کیا کہ ایک رات میں سب ازواج کے پاس تشریف لے گئے باری کہاں گئی؟ اس شبہ کے کئی جوابات ہیں: ① آنحضرت ﷺ پر قسم لازم نہیں تھا ② ازواج مطہرات کی مرضی سے ایسا ہوا ③ اس طرح واقعے صرف دو آئے ہیں اور دونوں حجۃ الوداع کے موقع پر حج کے دوران پیش آئے ہیں ایک واقعہ احرام سے پہلے کا ہے اور دوسرا زمانہ منیٰ کے قیام میں پیش آیا ہے اس وقت آپ سفر میں تھے اور سفر میں باری ختم ہو جاتی ہے۔[1]

﴿۶﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَذْكُرُ اللهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ.

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَحَدِيثُ ابْنِ عَبَّاسٍ سَنَذْكُرُهُ فِي كِتَابِ الْأَطْعِمَةِ إِنْ شَاءَ اللهُ تَعَالَى)[2]

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ”سرکار دو عالم ﷺ ہر وقت یاد الٰہی میں مصروف رہا کرتے تھے۔“ (مسلم) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جو صاحب مصابیح نے اس موقع پر نقل کی ہے، ہم انشاء اللہ کتاب الاطعمہ میں ذکر کریں گے۔“

توضیح: **علی کل احیانہ:** اس حدیث پر بظاہر یہ اشکال ہے کہ اس میں ہر وقت ذکر اللہ کرنے کا بیان ہے حالانکہ بعض اوقات میں ذکر اللہ کرنا جائز نہیں ہوتا جیسے قضاء حاجت وغیرہ میں منع ہے اس اشکال کے کئی جوابات ہیں۔

پہلا جواب: یہ کہ احیانہ سے **صالحۃ للذکر** اوقات مراد ہیں تو نامناسب اوقات یا مقامات اس سے خارج ہیں۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ ”احیانہ“ کی ضمیر آنحضرت ﷺ کی طرف لوٹانے سے یہ اعتراض آتا ہے یعنی آپ اپنے تمام اوقات میں ذکر فرماتے تھے مگر علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”احیانہ“ کی ضمیر ذکر اللہ کی طرف راجع ہے جو اس سے قبل مذکور بھی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ ذکر کے اوقات میں ہر وقت ذکر فرماتے تھے اور ذکر کے اوقات وہی جائز اوقات ہیں۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ ذکر سے مراد ذکر لسانی نہیں ہے بلکہ ذکر قلبی ہے اور وہ ہر وقت جاری رہ سکتا ہے لیکن شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے لمعات میں اس توجیہ کو رد فرما کر کہا ہے کہ یہ لغت اور شریعت دونوں کے منافی توجیہ ہے کیونکہ لغت اور شریعت ذکر لسانی کو ذکر کہتی ہے نہ کہ ذکر قلبی کو۔[3]

الفصل الثانی

﴿۷﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اغْتَسَلَ بَعْضُ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ فِي جَفْنَةٍ فَأَرَادَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يَتَوَضَّأَ مِنْهُ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللهِ إِنِّي كُنْتُ جُنُبًا فَقَالَ إِنَّ الْمَاءَ لَا يُجْنِبُ.

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه وَرَوَى الدَّارِمِيُّ نَحْوَهُ وَفِي شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْهُ عَنْ مَيْمُونَةَ بِلَفْظِ الْمَصَابِيحِ)[4]

[1] المرقات ۲/۱۵۵ [2] اخرجہ مسلم ۱/۱۹۴ [3] المرقات ۲/۱۵۶ [4] اخرجہ ابوداؤد ۶۸ والدارمی ۲۱

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ (ایک دن) سرکار دو عالم ﷺ کی کسی زوجہ مطہرہ نے لگن سے (یعنی لگن میں بھرے ہوئے پانی سے چلو لے کر) غسل کیا جب آنحضرت ﷺ نے اسی (لگن میں بچے ہوئے) پانی سے وضو کرنے کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں جنبی تھی (اور میں نے اسی سے غسل کیا ہے) آپ نے فرمایا پانی تو جنبی نہیں ہوتا (یعنی جنبی کے نہانے یا اس کے کسی عضو کے پانی میں پڑنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا) (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ) اور دارمی نے بھی ایسی روایت نقل کی ہے نیز شرح السنۃ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مصابیح کے ہم الفاظ روایت نقل کی ہے۔

نوٹ: اس حدیث سے متعلق تشریح باب الغسل کی حدیث ۹ میں گزر چکی ہے۔

﴿۸﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ ثُمَّ يَسْتَدْفِئُ بِي قَبْلَ أَنْ أَغْتَسِلَ۔ (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ نَحْوَهُ وَفِي شَرْحِ السُّنَّةِ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ)[۱]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ (میرے ساتھ) صحبت سے فراغت کے بعد غسل فرماتے، پھر میرے نہانے سے پہلے مجھ سے (لپٹ کر) گرمی حاصل کرتے تھے" (ابن ماجہ) اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایسی ہی روایت نقل کی ہے نیز شرح السنہ میں مصابیح کے ہم لفظ روایت منقول ہے۔

بے وضو آدمی یاد سے قرآن پڑھ سکتا ہے

﴿۹﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَخْرُجُ مِنَ الْخَلَاءِ فَيُقْرِئُنَا الْقُرْآنَ وَيَأْكُلُ مَعَنَا اللَّحْمَ وَلَمْ يَكُنْ يَحْجُبُهُ أَوْ يَحْجُزُهُ عَنِ الْقُرْآنِ شَيْءٌ لَيْسَ الْجَنَابَةَ۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَى ابْنُ مَاجَهْ نَحْوَهُ)[۲]

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ پاخانہ سے نکل کر (وضو سے پہلے) ہمیں قرآن کریم پڑھا دیا کرتے تھے اور (اسی وقت) ہمارے ساتھ گوشت کھا لیا کرتے تھے۔ آپ کو قرآن کریم پڑھنے سے سوائے جنابت کے کوئی چیز نہیں روکتی تھی۔ (ابوداؤد، نسائی) اور ابن ماجہ نے بھی ایسی ہی روایت نقل کی ہے۔

جنبی اور حائضہ کا قرآن پڑھنا

﴿۱۰﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا تَقْرَءُ الْحَائِضُ وَلَا الْجُنُبُ شَيْئًا مِّنَ الْقُرْآنِ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[۳]

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "حائضہ (ایام والی عورت) اور جنبی قرآن کریم کا کچھ حصہ بھی نہ پڑھیں"۔ (ترمذی)

---

[۱] اخرجہ ابن ماجہ ۵۸۰ والترمذی ۱۲۳ [۲] اخرجہ ابوداؤد ۲۲۹ والنسائی ۱/۱۴۴ [۳] اخرجہ الترمذی ۱۳۱

توضیح:

لا تقرأ الحائض: لا تقرأ کے ہمزہ پر ضمہ ہے یہ نفی کا صیغہ ہے جو نہی کے معنی میں مستعمل ہے بعض نے جزم کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں یہ نہی کا صیغہ ہے یعنی حائضہ اور جنبی قرآن سے کچھ نہ پڑھے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت اس طرح منقول ہے کہ حرز جان اور حفاظت نفس کے لئے حائضہ اور جنبی آدمی قرآن پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ چھوٹی آیتیں ہوں۔

ان سے دوسری روایت اس طرح منقول ہے کہ جنبی آدمی قرآن نہیں پڑھ سکتا اور حائضہ اور نفساء عورت کے لئے پڑھنا جائز ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جنابت تو ہر وقت آسکتی ہے اور اس کا وقت کم ہوتا ہے تو غسل کرلے اور پھر تلاوت کرے اور حیض و نفاس کی مدت لمبی ہوتی ہے اس لئے ان کے لئے گنجائش ہے۔

جمہور علماء اور تمام احناف کے نزدیک جنبی اور حائضہ و نفساء کے لئے قرآن کا پڑھنا جائز نہیں ہے پوری آیت کے نہ پڑھنے پر تو سب کا اتفاق ہے البتہ **ما دون الآية** یعنی آدھی آیت کے پڑھنے نہ پڑھنے میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ کرخی رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے علامہ کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک **ما دون الآية** کا پڑھنا بھی جائز نہیں ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزیک **ما دون الآية** کا پڑھنا جائز ہے کیونکہ اس قلیل مقدار پر قرآن کا حکم نہیں لگتا ہے بعض علماء نے علامہ کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو ترجیح دی ہے کہ اس میں احتیاط ہے اور بعض نے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو راجح قرار دیا ہے کہ اس میں سہولت اور آسانی ہے اس مسئلہ میں علماء کرام یعنی جمہور اور دیگر علماء کے اقوال میں کافی تفاوت ہے خاص ضابطہ نہیں ہے جس پر اتفاق ہو جائے آج کل معلمات خواتین کے لئے یہ مسئلہ دردسر بنا ہوا ہے تو علماء ان کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے متعلق بتاتے ہیں کہ پوری آیت نہ پڑھے بلکہ کاٹ کاٹ کر پڑھے یا صرف ہجے کر کے چھوڑ دے بہر حال ظاہر حدیث میں ممانعت ہے اس لئے حیلہ بہانوں میں نہیں پڑھنا چاہیے جمہور علماء کے نزدیک عدم جواز پر فتویٰ ہے۔[1]

مسئلة عبور المسجد للحائض والجنب

﴿۱۱﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَجِّهُوْا هٰذِهِ الْبُيُوْتَ عَنِ الْمَسْجِدِ فَإِنِّيْ لَا أُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَلَا جُنُبٍ. (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[2]

ترجمہ: اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "مکانوں کے یہ دروازے مسجد کی طرف سے پھیر دو کیونکہ حائضہ اور جنبی کو مسجد میں داخل ہونا (خواہ وہاں ٹھہرنے کے لئے ہو یا وہاں گزرنے کے لئے) میں جائز نہیں کرتا۔" (رواہ ابوداؤد)

[1] المرقات ۲/۱۶۰ [2] اخرجہ ابوداؤد ۲۳۲

توضیح: فانی لا احل المسجد: حائضہ، نفساء اور جنبی کے لئے مسجد میں ٹھہرنا یا گزرنا جائز ہے یا نہیں اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف عبور اور گزرنا جائز ہے "مکث" یعنی ٹھہرنا جائز نہیں ہے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں وضو کرنے کے بعد مکث اور مرور جائز ہے کیونکہ وضو سے تقلیل نجاست آجاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مرور وعبور اور مکث وقعود مطلقاً ناجائز ہے۔[1]

دلائل:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ النساء کی اس آیت سے استدلال کیا ہے:

"یا ایھا الذین اٰمنوا لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکاریٰ حتی تعلموا ما تقولون ولا جنباً الا عابری سبیل حتی تغتسلوا"۔[2]

طرز استدلال اس طرح ہے کہ **لا تقربوا الصلوۃ** میں صلوۃ سے مواضع صلوۃ یعنی مسجدیں مراد ہیں مطلب یہ ہوا کہ نشہ کی حالت میں مسجدوں کے قریب نہ جاؤ جب تک نشہ اتر نہ جائے اسی طرح جب تم جنابت میں ہو تو مسجدوں کے قریب نہ جاؤ جب تک غسل نہ کرو۔

"**الا عابری سبیل**" ہاں اگر صرف راستے کو عبور کرنا مقصود ہو تو پھر ممانعت نہیں جنابت کی حالت میں مسجد کو عبور کر سکتے ہیں تو یہ استثناء **لا تقربوا الصلوۃ** سے ہے اور صلوۃ سے مراد **مواضع الصلوۃ** ہیں تو صرف عبور جائز ہوا۔

احناف و مالکیہ کی دلیل زیر بحث صحیح اور صریح حدیث ہے جس میں کسی قید کے بغیر مطلقاً عبور و مرور کو ناجائز کہا گیا ہے۔

جواب: شوافع اور حنابلہ کو جواب یہ ہے کہ صلوۃ سے **مواضع صلوۃ** مراد لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے صلوۃ سے مراد نماز ہے جو اس کا حقیقی معنی ہے اس کو چھوڑ کر مجازی معنی لینا جائز نہیں ہے۔

نیز اس آیت میں دو حکم بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک نشہ اتر نہ جائے دوسرا حکم یہ ہے کہ جنابت کی حالت میں نماز نہ پڑھو جب تک غسل نہ کرو "**الا عابری سبیل**" یعنی ہاں اگر تم راستے پر چلنے والے مسافر ہو اور پانی نہیں ملتا ہے تو پھر تم غسل کے لئے تیمم کر سکتے ہو خلاصہ یہ کہ اس **عابری سبیل** کا تعلق مسافر سے ہے اس سے مسافر مراد ہے مسجد میں گزرنے والے سے اس کا تعلق نہیں ہے نیز یہ مسئلہ مبیح اور محرم کا ہے مبیح و محرم میں جب تعارض ہوتا ہے۔ تو ترجیح محرم کو ہوتی ہے لہٰذا مرور وعبور اور مکث وقعود مسجد میں جنبی اور حائضہ کے لئے جائز نہیں ہے صریح حدیث پر عمل بہتر ہے نیز احتیاط احناف و مالکیہ کے مسلک میں ہے۔[3]

---

[1] المرقات ۲/۱۶۱ [2] سورۃ النساء الایۃ ۴۳ [3] المرقات ۲/۱۶۱

تصاویر کی ممانعت

﴿۱۲﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ صُوْرَةٌ وَلَا كَلْبٌ وَلَا جُنُبٌ۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: ''جس گھر میں تصویر یا کتا یا جنبی ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔'' (نسائی)

توضیح: لا تدخل الملائكة: فرشتوں سے مراد رحمت کے فرشتے ہیں کیونکہ زحمت کے فرشتے تو ہر جگہ آتے ہیں۔

صورة: تصویر سے جاندار اور ذی روح کی تصویر مراد ہے تصاویر کی حرمت کے معاملے میں کچھ شرائط اور تفصیل ہے۔

❶ قد آدم کی پوری تصویر مراد ہے یا کم از کم ان حصوں کی تصویر مراد ہے جن سے آدمی کی زندگی اور موت کا تعلق ہے لہٰذا جس تصویر میں سر نہ ہو یا پورا سینہ اور ناف سے نیچے کے اعضاء رئیسہ نہ ہوں تو وہ تصویر اس وعید سے خارج ہے۔[2]

❷ تصویر اتنی چھوٹی اور پتلی نہ ہو کہ اسے اگر زمین پر رکھا جائے اور کھڑا آدمی اس کو دیکھے تو اس کی جنس اور اس کے اعضاء کی تمیز نہ ہوتی ہو اگر اتنی چھوٹی ہے اور اس طرح پتلی ہے تو وہ بھی وعید سے خارج ہے۔

❸ شوقیہ تصویر ہو جو بطور اعزاز نمایاں جگہ پر رکھی ہوئی ہو اور اگر ممتہان ہے یعنی فرش یا قالین تکیہ تلائی وغیرہ ایسی جگہوں میں رکھی ہوئی ہے جسے روندا جاتا ہے تو وہ بھی اس وعید سے خارج ہے۔

ولا كلب: اس سے شوقیہ پالتو کتا مراد ہے چوکیداری کا کتا اور شکاری کتا اس سے مستثنیٰ ہیں۔[3]

ولا جنب: جنب سے وہ جنبی آدمی مراد ہے جس نے جنابت میں رہنے کو اپنی عادت بنا ڈالی ہے اور غسل کو اتنا موخر کرتا ہے کہ فجر وغیرہ کی نماز قضاء ہو جاتی ہے۔ صرف غسل کرنے میں تاخیر کرنے پر وعید نہیں ہے۔[4]

﴿۱۳﴾ وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ لَا تَقْرَبُهُمُ الْمَلَائِكَةُ جِيْفَةُ الْكَافِرِ وَالْمُتَضَمِّخُ بِالْخَلُوْقِ وَالْجُنُبُ إِلَّا أَنْ يَتَوَضَّأَ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[5]

ترجمہ: اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ''تین شخص ایسے ہیں کہ رحمت کے فرشتے ان کے قریب بھی نہیں آتے: ① کافر کا بدن ② خلوق کا ملنے والا ③ جنبی جب تک وضو نہ کرے۔'' (ابوداود)

[1] اخرجه ابو داؤد ۲۲۷ والنسائی ۱/۱۳۱ [2] المرقات ۲/۱۶۱،۲۶۲

[3] المرقات ۲/۲۶۲ [4] المرقات ۲/۱۶۲ [5] اخرجه ابو داؤد ۴۱۸

بلا وضو مس مصحف کا حکم

﴿۱۴﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ أَنَّ فِي الْكِتَابِ الَّذِي كَتَبَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ أَنْ لَا يَمَسَّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ. (رَوَاهُ مَالِكٌ وَالدَّارَقُطْنِيُّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم راوی ہیں کہ "سرکار دو عالم ﷺ نے جو ہدایت نامہ عمرو بن حزم کے لئے لکھا تھا اس میں یہ (حکم بھی) مرقوم تھا کہ قرآن کریم کو پاک لوگ ہی ہاتھ لگایا کریں۔" (مالک، دارقطنی)

توضیح: جمہور علماء ومحدثین اور فقہاء کے نزدیک بغیر طہارت کے قرآن عظیم کا چھونا اور اس کو ہاتھ میں لینا جائز نہیں ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک جس طرح بغیر طہارت کے قرآن پڑھنا جائز ہے اسی طرح چھونا بھی جائز ہے۔

جمہور نے زیر بحث حدیث سے استدلال کیا ہے پھر جو چیز **ملصق بالقرآن** ہے وہ بھی چھونے میں قرآن کے حکم میں ہے مثلاً قمیص وغیرہ ہاں جو چیز الگ ہے اور قرآن اس میں لپیٹا گیا ہے جیسے غلاف و چادر اور رومال وغیرہ تو اس کے ساتھ چھونا جائز ہے آستین انسان کے جسم سے وابستہ ہے لہٰذا اس کے علاوہ کسی کپڑے کو چھونے میں استعمال کرنا چاہئے چھوٹے بچے اس حکم سے بوجہ ضرورت مستثنیٰ ہیں۔

جمہور نے قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے "**لا یمسه الا المطھرون**" یہاں ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اور **مطھرون** سے مراد باوضو لوگ ہیں اس تفسیر کے مطابق یہ آیت جمہور کی دلیل ہے۔

بعض مفسرین نے **لا یمسه** کی ضمیر کو "**کتاب مکنون**" یعنی لوح محفوظ کی طرف لوٹائی ہے اور **المطھرون** سے فرشتے مراد لئے ہیں اس صورت میں یہ آیت جمہور کی دلیل نہیں رہے گی امام مالک رحمہ اللہ نے اسی تفسیر کو لیا ہے بہر حال صریح وصحیح حدیث اور احتیاط وادب کا تقاضا یہ ہے کہ جمہور کے مسلک پر عمل کیا جائے اور بلا وضو قرآن کو ہاتھ نہ لگایا جائے البتہ یاد سے پڑھ سکتا ہے۔[2]

سلام کے جواب کے لئے وضو

﴿۱۵﴾ وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ انْطَلَقْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فِي حَاجَةٍ فَقَضَى ابْنُ عُمَرَ حَاجَتَهُ وَكَانَ مِنْ حَدِيثِهِ يَوْمَئِذٍ أَنْ قَالَ مَرَّ رَجُلٌ فِي سِكَّةٍ مِنَ السِّكَكِ فَلَقِيَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَقَدْ خَرَجَ مِنْ غَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ حَتّٰى إِذَا كَادَ الرَّجُلُ أَنْ يَتَوَارَى فِي السِّكَّةِ ضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدَيْهِ عَلَى الْحَائِطِ وَمَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ ثُمَّ ضَرَبَ ضَرْبَةً أُخْرَى فَمَسَحَ ذِرَاعَيْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَى الرَّجُلِ السَّلَامَ وَقَالَ إِنَّهُ لَمْ يَمْنَعْنِي أَنْ أَرُدَّ عَلَيْكَ السَّلَامَ إِلَّا أَنِّي لَمْ أَكُنْ عَلٰى طُهْرٍ. (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[3]

[1] اخرجه مالک ۵۳۰ والدار قطنی [2] المرقات ۲/۱۶۴ [3] اخرجه ابو داؤد ۳۳۰

ترجمہ: اور حضرت نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما استنجاء کے لئے جا رہے تھے میں بھی ان کے ہمراہ ہولیا (پہلے تو) انہوں نے استنجاء کیا اور اس کے بعد انہوں نے اس روز یہ حدیث بیان کی کہ ایک شخص کسی کوچہ میں جا رہا تھا اور سرکار دو عالم ﷺ پیشاب یا پاخانہ سے فارغ ہو کر تشریف لا رہے تھے اس شخص نے آپ سے ملاقات کی اور سلام عرض کیا، آنحضرت ﷺ نے سلام کا جواب نہیں دیا جب یہ شخص (دوسرے) کوچہ میں مڑنے کو ہوا تب سرکار دو عالم ﷺ نے (تیمم کے لئے) اپنے دونوں ہاتھ کو دیوار پر مار کر منہ پر پھیرے پھر (دوسری مرتبہ) مار کر اپنے ہاتھوں پر کہنیوں تک پھیرے اس کے بعد اس شخص کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا ''مجھے تمہارے سلام کا جواب دینے سے کسی چیز نے نہیں روکا تھا فقط یہ بات تھی کہ میں بے وضو تھا''۔ (ابوداؤد)

توضیح: **ثم ضرب ضربة اخری:** اس حدیث سے ایک یہ بات واضح طور پر معلوم ہوئی کہ تیمم کے لئے دو ضربیں ہیں یہ مسئلہ تیمم میں آئے گا کہ احناف کے ہاں دو ضربیں ضروری ہیں۔ اس کے بعد اس حدیث پاک سے دو قاعدے مستنبط ہو جاتے ہیں۔

● پہلا قاعدہ یہ مستنبط ہو گیا کہ اگر کسی عمل کے لئے وضو ضروری ہو لیکن وہ عمل ایسا ہو کہ اسکے فوت ہونے کے بعد وہ ہاتھ نہیں آ سکتا ہو اور نہ اس کا بدل ہو اور نہ قضاء ہو مثلاً جنازہ ہے یا عیدین کی نماز ہے کہ اس کے فوت ہونے سے نہ اس کا بدل مل سکتا ہے نہ قضاء کر سکتے ہیں اگر اس وقت وضو بنانے میں آدمی لگ جائے اور اس عمل کے فوت ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے تو اس آدمی کو چاہیے کہ وضو کے بجائے تیمم کرے اگر چہ پانی موجود ہے جس طرح یہاں آنحضرت ﷺ نے سلام کے جواب کیلئے تیمم کیا کیونکہ اس آدمی کے چلے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

● دوسرا قاعدہ یہ مستنبط ہوا کہ جس کام کے لئے طہارت شرط نہ ہو یا وہ عبادت غیر مقصودہ ہو یعنی غیر کے لئے وسیلہ ہو، اس کے لئے تیمم کرنا جائز ہے، اگر چہ پانی قریب میں موجود ہو۔

مثلاً مسجد میں داخل ہونے کے لئے تیمم کیا، زبانی تلاوت کے لئے کیا، فقہ کی اسلامی کتابوں کو ہاتھ لگانے کے لئے تیمم کیا یا رات کو سونے کے لئے تیمم کیا یہ سب جائز اور باعث ثواب و برکت ہے آنحضرت ﷺ نے صرف سلام کے جواب کے لئے تیمم کیا حالانکہ اس کے لئے طہارت شرط نہیں در مختار نے اس ضابطہ کو قبول کیا ہے اگر چہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس پر رد کیا ہے۔ حضرت شاہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ضابطہ و قاعدہ صحیح ہے۔[1]

﴿۱۶﴾ وَعَنِ الْمُهَاجِرِ ابْنِ قُنْفُذٍ أَنَّهُ أَتَى النَّبِيَّ ﷺ وَهُوَ يَبُولُ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ حَتَّى تَوَضَّأَ ثُمَّ اعْتَذَرَ إِلَيْهِ وَقَالَ إِنِّي كَرِهْتُ أَنْ أَذْكُرَ اللهَ إِلَّا عَلَى طُهْرٍ.

(رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَرَوَى النَّسَائِيُّ إِلَى قَوْلِهِ حَتَّى تَوَضَّأَ وَقَالَ فَلَمَّا تَوَضَّأَ رَدَّ عَلَيْهِ)[2]

---

[1] المرقات ۲/۱۶۵ [2] اخرجه ابوداؤد، والنسائی

ترجمہ: حضرت مھاجر بن قنفذ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ یہ (ایک مرتبہ) سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جبکہ آپ پیشاب کررہے تھے انہوں نے سلام عرض کیا آنحضرت ﷺ نے جواب نہ دیا، یہاں تک کہ آپ نے وضوفرمایا اور پھر یہ عذر بیان فرمایا کہ "میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں کہ بے وضو اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرو" (ابوداؤد) اور نسائی نے یہ روایت لفظ حتی توضاء (یہاں تک کہ آپ نے وضوفرمایا) تک نقل کی ہے اور کہا کہ جب آپ نے وضوفرمالیا تو سلام کا جواب دیا۔"

الفصل الثالث

جنابت کی حالت میں آدمی سوسکتا ہے

﴿۱۷﴾ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُجْنِبُ ثُمَّ يَنَامُ ثُمَّ يَنْتَبِهُ ثُمَّ يَنَامُ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ)[۱]

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ حالت ناپاکی میں سوجایا کرتے تھے اور پھر جاگتے اور سوجاتے۔ (رواہ احمد)

وضو میں سات مرتبہ پانی بہانے کا مطلب

﴿۱۸﴾ وَعَنْ شُعْبَةَ قَالَ إِنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ كَانَ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ يُفْرِغُ بِيَدِهِ الْيُمْنٰى عَلٰى يَدِهِ الْيُسْرٰى سَبْعَ مَرَّاتٍ ثُمَّ يَغْسِلُ فَرْجَهُ فَنَسِيَ مَرَّةً كَمْ أَفْرَغَ فَسَأَلَنِيْ فَقُلْتُ لَا أَدْرِيْ فَقَالَ لَا أُمَّ لَكَ وَمَا يَمْنَعُكَ أَنْ تَدْرِيَ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ وُضُوْءَهُ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ يُفِيْضُ عَلٰى جِلْدِهِ الْمَاءَ ثُمَّ يَقُوْلُ هٰكَذَا كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَتَطَهَّرُ. (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[۲]

ترجمہ: اور حضرت شعبہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب ناپاکی کا غسل فرماتے تو (پہلے) اپنے داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر سات مرتبہ پانی ڈالتے پھر اپنی شرمگاہ دھوتے ایک مرتبہ یہ بھول گئے کہ پانی کتنی بار ڈالا ہے چنانچہ انہوں نے مجھ سے پوچھا میں نے عرض کیا مجھے یاد نہیں انہوں نے فرمایا تمہاری ماں مرے تمہیں یاد رکھنے سے کس نے روک دیا تھا؟ پھر نماز کے وضو کی طرح وضو کر کے اپنے سارے بدن پر پانی بہالیا اور کہنے لگے کہ سرکار دو عالم ﷺ بھی اسی طرح پاک ہوا کرتے تھے۔ (رواہ ابوداؤد)

توضیح: **سبع مرار:** سات مرتبہ پانی بہا کر ہاتھ دھونے کے لئے کوئی حدیث نہیں ہے آنحضرت ﷺ کا عمل مطلق دھونے کا بھی ہے اور دو یا تین بار دھونے کا بھی ہے سات بار کا ذکر نہیں ہے تو شاید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کسی مخصوص ضرورت کے تحت ایسا کیا ہے اس سے ضابطہ شرعیہ نہیں بنایا جاسکتا ہے یہ کوئی مخصوص جزئی معاملہ ہے۔[۳]

[۱] اخرجہ احمد ۶/۲۹۸ [۲] اخرجہ ابوداؤد ۲۴۶ [۳] المرقات ۲/۱۶۷

لا ام لك: یہ کلمہ مذمت میں استعمال ہوتا ہے اور "لا اب لك" زیادہ تر مدح میں استعمال ہوتا ہے پہلے کلمہ کا مطلب یہ کہ تم لقیط ہو تمہاری ماں کا پتہ نہیں اور دوسرے کلمہ کا مطلب یہ کہ تم خود مستقل آدمی ہو تمہیں باپ کی کیا ضرورت ہے باپ نہ بھی ہو تو تم خود باپ ہو یہ مدح کا پہلو ہے۔[1]

﴿۱۹﴾ وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ قَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ طَافَ ذَاتَ يَوْمٍ عَلٰى نِسَائِهٖ يَغْتَسِلُ عِنْدَ هٰذِهٖ وَعِنْدَ هٰذِهٖ قَالَ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللهِ أَلَا تَجْعَلُهٗ غُسْلًا وَاحِدًا آخِرًا قَالَ هٰذَا أَزْكٰى وَأَطْيَبُ وَأَطْهَرُ.
(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ)[2]

ترجمہ: حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ ایک روز اپنی تمام بیویوں کے پاس آئے (یعنی سب سے جماع کیا) اور ہر ایک بیوی سے (جماع سے فارغ ہو کر علیحدہ علیحدہ) غسل فرمایا ابو رافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! آپ نے آخر میں ایک ہی مرتبہ کیوں نہ غسل کیا آپ نے فرمایا یہ (یعنی ہر جماع کے بعد غسل کرنا) خوب پاک کرتا ہے (نفس کو) بہت خوش آئند ہے اور (جسم) کو خوب صاف کرتا ہے۔ (احمد و ابو داؤد)

عورت کے غسل اور وضو سے بچے ہوئے پانی کا حکم

﴿۲۰﴾ وَعَنِ الْحَكَمِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أَنْ يَّتَوَضَّأَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ طَهُوْرِ الْمَرْأَةِ.
(رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ وَالتِّرْمِذِيُّ وَزَادَ أَوْ قَالَ بِسُؤْرِهَا وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ)[3]

ترجمہ: اور حضرت حکم ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے عورت کے (غسل یا وضو) کے بچے ہوئے پانی سے مرد کو وضو کرنے سے منع فرمایا ہے (ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی) اور ترمذی نے یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ "آپ نے منع فرمایا عورت کے (وضو کے) بقیہ پانی سے نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مرد و عورت ایک دوسرے کے بچے ہوئے پانی سے غسل نہ کریں

﴿۲۱﴾ وَعَنْ حُمَيْدِ الْحِمْيَرِيِّ قَالَ لَقِيْتُ رَجُلًا صَحِبَ النَّبِيَّ ﷺ أَرْبَعَ سِنِيْنَ كَمَا صَحِبَهٗ أَبُوْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أَنْ تَغْتَسِلَ الْمَرْأَةُ بِفَضْلِ الرَّجُلِ أَوْ يَغْتَسِلَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ الْمَرْأَةِ زَادَ

---

[1] المرقات ۲/۱۶۷،۱۶۸ [2] اخرجہ احمد ۶/۸ و ابو داؤد ۲۱۹
[3] اخرجہ ابو داؤد ۸۲ والترمذی ۶۴ [4] اخرجہ ابو داؤد ۸۱،۲۸ والنسائی ۱/۱۳۰

مُسَدَّدٌ وَلْيَغْتَرِفَا جَمِيْعًا۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَزَادَ أَحْمَدُ فِي أَوَّلِهِ نَهٰى أَنْ يَمْتَشِطَ أَحَدُنَا كُلَّ يَوْمٍ أَوْ يَبُوْلَ فِي مُغْتَسَلِهِ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَرْجِسَ.)[1]

ترجمہ: حضرت حمید حمیری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں ایک شخص سے ملا جو حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی طرح چار برس سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں رہ چکے تھے انہوں نے کہا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ عورت مرد (کے غسل) کے بچے ہوئے پانی سے نہائے یا مرد عورت (کے غسل) کے بچے ہوئے پانی سے نہائے۔ مسدد رحمہ اللہ نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ دونوں اکٹھے ہو کر (علیحدہ علیحدہ) چلو لے کر نہائیں (تو جائز ہے)۔

(ابو داؤد، نسائی) اور امام احمد نے اس روایت کے شروع میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ آپ نے اس سے (بھی) منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص ہر روز کنگھی کرے اور نہانے کی جگہ پیشاب کرے اور ابن ماجہ رحمہ اللہ نے یہ روایت عبد اللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

[1] اخرجه ابو داؤد ۶۸،۸۱ والنسائی ۱/۱۳۰

۲۹-صفر ۱۴۱۰ھ

باب احکام المیاہ

پانی کے مسائل

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں زندگی کے ہر شعبے کے مسائل کا حل موجود ہے پانی زندگی کیلئے اہم ضرورت ہے اس کے پاک اور ناپاک ہونے کے لمبے چوڑے مسائل ہیں اسلام نے مسلمانوں کی رہنمائی کیلئے پانی کے سارے مسائل وفضائل اور آداب ومستحبات کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔

یہاں میاہ جمع کا صیغہ لایا گیا ہے جس سے اشارہ ہوتا ہے کہ پانی خواہ بارش کا ہو کنوئیں کا ہو نہر کا ہو یا سمندر اور دریا کا یا چشموں کا ہو قلیل ہو یا کثیر ہو مستعمل ہو یا غیر مستعمل ہو سب کے احکام بیان ہوں گے۔

اسلام کے احکام میں عجیب حکمت ہوتی ہے مثلاً وضو کی ابتداء میں ہاتھ دھونے کا حکم ہے تاکہ ہاتھوں سے اندازہ ہو جائے کہ پانی ابلا ہوا سخت گرم یا سخت ٹھنڈا تو نہیں جب معلوم ہوا کہ قابل استعمال ہے تو پھر منہ میں ڈالنے کا حکم دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ پانی ہے شوربا یا شربت وغیرہ نہیں ہے پھر ناک میں ڈالنے کا حکم دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ بدبودار سڑا ہوا تو نہیں ہے جب خوب اطمینان ہوا تو حکم ملا کہ اب چہرہ پر ڈالتے جاؤ۔

الفصل الاول

پانی میں پیشاب نہیں کرنا چاہیے

﴿۱﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَا يَبُولَنَّ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ الَّذِي لَا يَجْرِي ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ لَا يَغْتَسِلُ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ وَهُوَ جُنُبٌ قَالُوا كَيْفَ يَفْعَلُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ يَتَنَاوَلُهُ تَنَاوُلًا) [۱]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس ٹھہرے ہوئے پانی میں جو بہنے والا نہ ہو پیشاب نہ کرے کہ پھر اس میں غسل کرنے لگے (یعنی کسی دانشمند سے یہ بعید ہے کہ وہ پانی میں پیشاب کرے پھر اسی پانی سے غسل کرے) (بخاری ومسلم) مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "آپ نے فرمایا تم میں کوئی شخص ناپاکی کی حالت میں ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل نہ کرے (تاکہ پانی ناپاک نہ ہو جائے) لوگوں نے کہا اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پھر کس طرح نہانا چاہیے انہوں نے فرمایا اس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی (چلو سے) لے کر (پانی سے باہر نہانا چاہیے)۔

[۱] اخرجه البخاری ۱/۶۸ ومسلم ۱/۱۶۲

توضیح: فی الماء الدائم: اس روایت میں **الدائم** کا لفظ ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی آنے والی روایت میں **راکد** کا لفظ آیا ہے عام علماء کے نزدیک دائم اور راکد کا مطلب "**الذی لا یجری**" ہے یہ دائم کے لئے صفت کاشفہ ہے کہ دائم سے مراد غیر جاری پانی ہے۔[1]

لیکن شاہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ماء دائم اور راکد سے مراد وہ پانی ہے جو غیر منقطع ہو یعنی دائمی ہو نہ ختم ہونے والا پانی ہو خواہ وہ جاری ہو یا جاری نہ ہو تو یہاں جو **الذی لا یجری** کے الفاظ ہیں یہ کوئی قید احترازی نہیں نہ یہ بیان تعریف کے لئے ہے بلکہ **ماء دائم** کی ایک قسم کے لئے یہ قید لگائی گئی ہے کہ **دائم** کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو **الذی لا یجری** ہے۔[2]

قائم و دائم و راکد پانی میں پیشاب کرنے سے اس لئے روکا گیا ہے کہ اگر یہ قلیل پانی ہوگا تو پیشاب کرنے سے نجس ہو جائے گا اور اگر کثیر ہوگا تو ایک کے پیشاب کو دیکھ کر دوسرا آ کر کرے گا۔ اس طرح بالآخر پانی خراب ہو جائے گا ویسے بھی پانی میں پیشاب کرنا انسانی شرافت کے منافی ہے چنانچہ منع ہے۔

ثم یغتسل فیه: "**یغتسل**" کا صیغہ مشہور روایت کے مطابق مرفوع ہے یعنی "**لا یبل ثم هو یغتسل فیه**" تو یہ **لا یبولن** کے پورے جملے پر عطف ہے بعض علماء نے اس صیغہ کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کو لانہی کے ماتحت **یبولن** پر عطف کیا ہے اور دونوں جملوں کو نہی کے ماتحت داخل کیا ہے۔

بہر حال پہلی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ کوئی شخص کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے اور یہ کتنی غیر معقول بات ہے کہ پہلے پیشاب کیا اور پھر اس سے غسل کر رہا ہے اس صورت میں ثم استبعاد اور تعجب کے لئے ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت میں حدیث کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ کوئی شخص نہ کھڑے پانی میں پیشاب کرے اور نہ کھڑے پانی میں غسل کرے، اس صورت میں دونوں باتوں سے منع کیا ہے بعض علماء نے ثم کے بعد "ان" مقدر مان کر منصوب پڑھا ہے۔[3]

﴿۲﴾ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُبَالَ فِي الْمَاءِ الرَّاكِدِ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[4]

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

﴿۳﴾ وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ ذَهَبَتْ بِيْ خَالَتِيْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّ ابْنَ أُخْتِيْ وَجِعٌ فَمَسَحَ رَأْسِيْ وَدَعَا لِيْ بِالْبَرَكَةِ ثُمَّ تَوَضَّأَ فَشَرِبْتُ مِنْ وَضُوْئِهِ ثُمَّ قُمْتُ خَلْفَ ظَهْرِهِ فَنَظَرْتُ إِلَى خَاتَمِ النُّبُوَّةِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ مِثْلَ زِرِّ الْحَجَلَةِ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[5]

---

[1] المرقات ۲/۱۷۰،۱۷۱ [2] المرقات ۲/۱۷۱ [3] المرقات ۲/۱۷۱

[4] اخرجه مسلم ۱/۱۶۲ [5] اخرجه البخاری ۱/۵۹ ومسلم ۷/۷۶

ترجمہ: اور حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میری خالہ مجھے سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں لے گئیں انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! (یہ) میرا بھانجا بیمار ہے چنانچہ آپ نے میرے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور میرے لئے برکت کی دعا کی، پھر آپ نے وضو کیا اور میں نے آپ کے وضو کا پانی پی لیا اس کے بعد میں آپ اکی پشت مبارک کے پیچھے کھڑا ہو کر مہر نبوت کو دیکھنے لگا جو آپ کے مونڈھوں کے درمیان تھی اور دلہن کے پلنگ کی گھنڈی کی طرح (چمک رہی) تھی۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: فشربت من وضوئه: وضو میں اگر واؤ کا ضمہ پڑھیں گے تو اس سے وضو کا عمل اور نام مراد ہوتا ہے اور اگر واؤ پر فتحہ پڑھیں گے تو اس سے مراد وہ پانی ہوتا ہے جو وضو کرنے کے بعد برتن میں بچتا ہے اور اگر واؤ کا کسرہ پڑھیں گے تو اس سے وضو کے پانی کا برتن مراد ہوتا ہے یہاں اگر واؤ کا فتحہ ہے تو مراد یہ کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے وضو سے بچا ہوا پانی بطور تبرک پی لیا اس میں کسی قسم کی قیل وقال کی گنجائش نہیں ہے اور حدیث کے اس مطلب کی طرف بہت سارے علماء گئے ہیں۔[1]

شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لمعات میں لکھا ہے کہ اس حدیث کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وضو کے اعضاء سے جو پانی نیچے گرتا تھا میں نے اس کو حاصل کر کے پی لیا شیخ فرماتے ہیں کہ بہت سارے علماء نے اس مفہوم کو لیا ہے یہاں سے مستعمل پانی کے استعمال میں فقہاء کے اختلاف کا مسئلہ سامنے آتا ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ بعد میں آئے گی۔

یہاں تو ماء مستعمل کہنا بھی مشکل ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کے مبارک اعضاء سے الگ شدہ پانی تو باعث برکت تھا جس پر صحابہ کرام لڑتے تھے یہ آپ کی خصوصیت تھی شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے اسی حدیث کی تشریح میں لکھا ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک آنحضرت ﷺ کے فضلات پاک تھے تو مستعمل پانی کا کیا کہنا۔[2]

خاتم النبوۃ: یہ حضور اکرم ﷺ کی نبوت کی نشانی تھی اس کو مہر نبوت اور ختم نبوت کہتے ہیں یہ آپ کے کندھوں کے درمیان بائیں کندھے کی غضروف کی ہڈی کے نیچے تھی یہ آنحضرت ﷺ کے بدن مبارک ہی کا ابھرا ہوا نہایت خوشنما حصہ تھا سابقہ کتابوں میں اس کا ذکر موجود تھا اس لئے اہل کتاب بطور خاص اس کو دیکھ لیا کرتے تھے۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ ختم نبوت پیدائش کے وقت سے آپ کے جسد اطہر پر موجود تھی ایک ضعیف قول ہے کہ مہر نبوت پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی "**سر فانت منصور**" بعض علماء کا خیال ہے کہ شق صدر کے وقت سے یہ مہر ظاہر ہوئی تھی اور وفات کے وقت جسم میں غائب ہوگئی۔[3]

زر الحجلة: حجلة اس مسہری کو کہتے ہیں جو دلہن کی مجلس میں اس کے لئے سجائی جاتی ہے اس پر خوبصورت پردے لگائے جاتے ہیں اور اس میں جو گھنڈیاں ہوتی ہیں اسی کو "زر" کہتے ہیں جس کی جمع ازرار ہے۔ شاعر نے کہا:[4]

---

[1] المرقات ۲/۱۶۷ [2] اشعة اللمعات ۱/۲۶۱ [3] المرقات ۲/۱۶۷ [4] المرقات ۲/۱۶۷

لا تعجبوا من بلى غلالته قد زر ازراره على القمر

بعض نے اس لفظ کو را کی تقدیم کے ساتھ "رز الحجلة" پڑھا ہے "رز" انڈے کو کہتے ہیں اور "حجلہ" چکور کو کہتے ہیں یعنی چکور کے انڈے کے برابر ختم نبوت تھی مہر نبوت کی مقدار اور حجم کے بارے میں مختلف الفاظ آئے ہیں سب میں تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن یہ کوئی تعارض نہیں ہر ایک نے اپنے اپنے اندازے کے مطابق اظہار خیال فرما کر تشبیہ دے دی ہے زیادہ واضح کبوتر یا چکور کے انڈے سے تشبیہ ہے۔

الفصل الثانی

مسئلة بئر بضاعة وحديث القلتين

﴿۴﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنِ الْمَاءِ يَكُوْنُ فِي الْفَلَاةِ مِنَ الْأَرْضِ وَمَا يَنُوْبُهُ مِنَ الدَّوَابِ وَالسِّبَاعِ فَقَالَ إِذَا كَانَ الْمَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ۔

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَفِي أُخْرىٰ لِأَبِي دَاوُدَ فَإِنَّهُ لَا يَنْجُسُ)[1]

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ سے اس پانی کا حکم پوچھا گیا جو جنگل میں زمین پر جمع ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر چوپائے درندے اس پر آتے جاتے رہتے ہیں (یعنی جانور وغیرہ اس پانی پر آ کر اسے پیتے ہیں اور پیشاب وغیرہ بھی کرتے ہیں) آپ نے فرمایا کہ اگر پانی دو قلوں کے برابر ہو تو وہ ناپاکی کو قبول نہیں کرتا (یعنی نجاست وغیرہ پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتا) احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابوداؤد کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ ناپاک نہیں ہوتا۔

﴿۵﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَنَتَوَضَّأُ مِنْ بِئْرِ بُضَاعَةَ وَهِيَ بِئْرٌ يُلْقٰى فِيْهَا الْحِيَضُ وَلُحُوْمُ الْكِلَابِ وَالنَّتْنُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِنَّ الْمَاءَ طَهُوْرٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ۔

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ سے کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہم بضاعہ کے کنویں (کے پانی) سے وضو کر سکتے ہیں جبکہ اس کنوئیں میں حیض کے (خون میں بھرے ہوئے) کپڑے، کتوں کا گوشت اور گندگی ڈالی جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا (اس کنوئیں کا) پانی پاک ہے (جب تک اس کے رنگ، مزہ اور بو میں فرق نہ آئے) اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کر سکتی۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

توضیح: اذا کان الماء قلتین الخ: حدیث بئر بضاعہ اور حدیث قلتین چونکہ دونوں پانی میں نجاست گرنے اور پھر پانی کے پاک رہنے یا ناپاک ہو جانے سے متعلق ہیں اس لئے عمومی طور پر دونوں کی تشریح ایک ساتھ ہوتی ہے اور

[1] اخرجہ احمد ۲/۱۲ وابوداؤد ۶۳ [2] اخرجہ احمد ۳/۳۱ والترمذی ۶۶ وابوداؤد ۶۶

ترتیب کے اعتبار سے حدیث بئر بضاعہ کی تفصیل پہلے ہوتی ہے اور حدیث قلتین کی بعد میں ہوتی ہے حالانکہ مشکوٰۃ میں ذکر کرنے کے اعتبار سے حدیث قلتین پہلے آئی ہے اور حدیث بئر بضاعہ بعد میں ہے لیکن اسی معروف ترتیب کے لحاظ سے یہاں بھی پہلے بئر بضاعہ پر بحث و تحقیق لکھی جاتی ہے اس مسئلہ کا عنوان اس طرح ہے۔

مسئلة وقوع النجاسة فی الماء

پانی بالطبع طاہر و مطہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "وانزلنا من السماء مآء طهورا" اس لئے اگر پانی میں کوئی پاک چیز شامل ہو جائے اور پانی کی رقت وسیلان باقی ہو اور اسم مآء زائل نہ ہوا ہو اور شئ طاہر کے اختلاط اور غلبہ سے پانی کی طبیعت میں تغیر نہ آیا ہو تو پانی پاک ہے پانی کی طبیعت رقت اور سیلان ہے اور یہی پانی کی ماہیت اور ذات ہے اور اگر پانی میں کوئی نجاست شامل ہو جائے تو پھر دیکھیں گے اگر پانی جاری ہے یا جاری کے حکم میں ہے تو جب تک **احد الاوصاف** میں تغیر نہ آئے پانی نجس نہیں ہوگا بلکہ پاک رہے گا۔

احد الاوصاف کا مطلب یہ ہے کہ پانی کے تین اوصاف ہیں رنگ، بو، ذائقہ، ان میں سے کسی ایک میں تغیر نہ آیا ہو تو پانی اتفاقاً پاک رہے گا اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

اور اگر پانی قلیل ہے یعنی نہ جاری ہے اور نہ جاری کے حکم میں ہے اور اس میں نجاست واقع ہو جائے تو اس میں فقہاء کرام کا طویل اختلاف ہے اہم اور مشہور مذاہب کے بیان پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اہل ظواہر کے نزدیک پانی کے قلیل اور کثیر ہونے کا اعتبار نہیں **احد الاوصاف** کے تغیر کا اعتبار ہے تو جب تک کسی وصف یعنی رنگ و بو اور ذائقہ میں تغیر نہ آیا ہو پانی پاک رہے گا ائمہ جمہور فرماتے ہیں کہ قلیل پانی صرف وقوع نجاست سے پلید اور ناپاک ہو جاتا ہے **احد الاوصاف** کے تغیر کا کوئی اعتبار نہیں ہے لیکن ان حضرات کے آپس میں قلت و کثرت کی تحدید و تعین میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں جب پانی مقدار قلتین کو پہنچ گیا تو وہ کثیر ہے ورنہ وہ قلیل ہے اس میں انہوں نے اتنا غلو اور تجاوز کیا ہے کہ مثلاً ایک قلہ اور مٹکہ میں نجس پانی ہے اور دوسرے میں بھی نجس پانی ہے مگر جب دونوں کو ملا دیا گیا اور دو قلے ہو گئے تو اب پانی پاک ہو گیا اور جب الگ الگ کیا تو پھر نجس ہو گیا علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ شارح مسلم نے ایسا ہی لکھا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قلت و کثرت کا فیصلہ کرنے میں اس آدمی کی رائے کا اعتبار ہے جو اس مسئلہ میں مبتلا ہو گیا ہو یعنی رائے مبتلی بہ کا اعتبار ہے اگر اس کو یقین ہے کہ یہ پانی کثیر ہے اور ایک جانب کی حرکت و نجاست دوسری جانب تک نہیں جاتی ہے تو کثیر ہے ورنہ قلیل ہے فقہ حنفی کی کتابوں میں جو یہ مشہور ہے کہ "**عشر فی عشر**"

یعنی دہ دردہ کی مقدار کثیر ہے ورنہ قلیل ہے تو مدار مذہب دراصل اس پر نہیں ہے البتہ اس کی شہرت کی وجہ یوں ہوئی کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاں پانی کی قلت وکثرت کا مسئلہ بیان فرمایا اور کثیر پانی کے لئے کہہ دیا" **کحوض مسجدی هذا**" یعنی میری اس مسجد کے حوض کا جو پانی ہے یہ کثیر ہے سلیمان جوزجانی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے چلے جانے کے بعد اس حوض کو ناپ دیا تو وہ دہ دردہ نکل آیا تو عوام میں یہ مسئلہ مشہور ہو گیا اور اس میں عوام کیلئے سہولت بھی ہے۔

مالکیہ کے دلائل:

امام مالک اور اہل ظواہر نے اپنے مسلک کے استدلال میں حدیث بئر بضاعہ کو پیش کیا ہے جس کے یہ الفاظ ہیں "**ان الماء طهور لا ينجسه شي**" اس میں الف لام جنس کیلئے ہے اور شئی نکرہ تحت النفی واقع ہے جس میں عموم ہے مطلب یہ ہوا کہ جنس پانی پاک ہے۔ کوئی چیز اس کو ناپاک نہیں کرسکتی ہے جب تک کہ ذات پانی باقی ہے اور تغیر نہیں آیا ہے۔

ان حضرات نے تغیر **احد الاوصاف** کے قاعدہ کے لئے ابن ماجہ کی ایک روایت سے استدلال کیا ہے جس میں یہ استثناء ہے "**الا ما غير لونه او ريحه او طعمه**" نیز انہوں نے اجماع امت سے بھی تغیر **احد الاوصاف** کو لیا ہے کہ رنگ وبو اور ذائقہ بدلنے سے اجماعاً پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔

ان حضرات کی دوسری دلیل مشکوۃ ص ۵۱ فصل سوم پر یحییٰ بن عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے اور اسی فصل ثالث میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ان روایتوں میں واضح طور پر مذکور ہے کہ پانی کو درندوں گدھوں اور کتوں نے استعمال کیا لیکن پھر بھی صحابہ کرام بلکہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے نجس قرار نہیں دیا۔

جمہور کے دلائل:

❶ ائمہ جمہور نے مشکوۃ شریف صفحہ ۵۰ کی حدیث "**لا يبولن احدكم في الماء الدائم**" سے استدلال کیا ہے وہاں تغیر اوصاف کا ذکر نہیں بلکہ صرف وقوع نجاست کا ذکر ہے معلوم ہوا اصل مدار وقوع نجاست پر ہے تغیر اوصاف کا قلیل پانی میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔

❷ جمہور نے مشکوۃ ص ۴۵ پر مذکور حدیث "**اذا استيقظ احدكم من نومه فلا يغمسن يده في الاناء**" سے بھی استدلال کیا ہے یہاں بھی پانی میں ہاتھ ڈالنے سے روکا گیا ہے کہ احتمال نجاست ہے حالانکہ اس سے تغیر اوصاف نہیں ہوتا ہے۔

❸ جمہور کی تیسری دلیل مشکوۃ ص ۵۲ پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

"**اذا شرب الكلب في اناء احدكم فليغسله سبع مرات**"۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اصل اعتبار وقوع نجاست کا ہے تغیر اوصاف کا نہیں یہاں ولوغ کلب سے پانی نجس ہوگیا اور سات دفعہ برتن دھونے کا حکم دیا گیا حالانکہ کسی وصف میں اس سے تغیر نہ آیا ہے اور نہ آسکتا ہے۔

❹ جمہور کی چوتھی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مشکوۃ ص ۳۶۱ پر ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"اذا وقعت الفارة فی السمن فان کان جامدا فالقوھا وما حولھا وان کان مائعا فلا تقربوہ"۔

(سنن ابی داؤد)

اس حدیث میں واضح طور پر مذکور ہے کہ گھی اگر مائع ہے سیال ہے تو چوہا گرنے سے نجس ہوجائے گا حالانکہ اس سے تغیر اوصاف نہیں ہوتا ہے اسی باب ما یحل اکلہ وما یحرم میں صاحب مشکوۃ نے حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت بھی نقل کی ہے جس کا مضمون مذکورہ حدیث کی طرح ہے جو ص ۳۶۰ پر ہے۔

جوابات: بیر بضاعہ کی روایت کے جمہور نے کئی جوابات دیئے ہیں نمبروار ملاحظہ ہوں۔

❶ بیر بضاعہ والی حدیث صحت کے اعتبار سے ان احادیث کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہے جو جمہور نے پیش کی ہیں یہی وجہ ہے کہ بخاری ومسلم نے بیر بضاعہ کی حدیث کو اپنی کتابوں میں ذکر نہیں کیا ہے۔

❷ بیر بضاعہ کی روایت کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اگرچہ صحیح کہا ہے مگر یحیی بن سعید القطان رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سند کے اضطراب کی وجہ سے ضعیف کہا ہے اور جب تصحیح اور تضعیف میں تقابل ہوجائے تو تضعیف کو راجح قرار دیا جاتا ہے۔

❸ تیسرا جواب صاحب فتح القدیر نے یہ دیا ہے کہ یہ حکم عام پانی کا نہیں ہے بلکہ سوال بیر بضاعہ سے متعلق تھا جواب بھی اسی کے متعلق دیا گیا ہے کہ موجود پانی پاک ہے اس سے آئندہ کے لئے عام ضابطہ نہیں بنایا جاسکتا ہے کیونکہ یہاں الف لام عہدی ہے خاص اور معہود پانی مراد ہے۔

اس بات کی وضاحت علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق سے بھی ہوجاتی ہے آپ نے اور میر سید سند شریف رحمۃ اللہ علیہ دونوں نے لکھا ہے کہ الف لام میں اصل عہد خارجی ہے اگر اس پر عمل ممکن ہے تو دوسری قسموں کی طرف جانا مناسب نہیں ہے اس قاعدہ کا مطلب بھی یہ ہوا کہ یہاں خاص پانی کے متعلق سوال تھا چنانچہ خاص پانی کے متعلق ہی جواب دیا ہے لہٰذا یہ عام ضابطہ نہیں ہے۔

❹ صحابہ کرام کا سوال زمانہ ماضی سے متعلق تھا کہ پہلے اس میں گندگی ڈالی جاتی تھی اب نہیں تو کیا اب ہم وضو کرسکتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانی طبعاً پاک ہے اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرسکتی۔

❺ بلاذری اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بیر بضاعہ "غدیر" تھا اور غدیر بڑے کنوئیں کو کہتے ہیں یعنی یہ قلیل پانی نہیں تھا بلکہ کثیر پانی تھا اس میں ہمیں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کثیر پانی ناپاک نہیں ہوتا۔

⑥ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام التاریخ علامہ واقدی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بیر بضاعہ چشمہ دار کنواں تھا اس سے قریب کے باغات سیراب ہوتے اس قول سے یہ ثابت ہو گیا کہ بیر بضاعہ کا پانی قلیل نہیں بلکہ کثیر اور جاری کے حکم میں تھا علامہ واقدی رحمۃ اللہ علیہ پر اگرچہ روایت حدیث میں اعتراض ہے لیکن تاریخ میں وہ امام عندالانام ہیں۔

⑤ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر بیر بضاعہ کا پانی قلیل تھا تو اتنی نجاستوں کے باوجود آنحضرت ﷺ نے اس کے استعمال کا کیسے حکم دیا اور آپ نے اس کو خود کیسے استعمال فرمایا حالانکہ یہ بدیہی بات ہے کہ اتنی گندگیاں گرنے کے بعد ایسے پانی کو کوئی استعمال نہیں کر سکتا ہے اور نہ ٹوکرے بھر بھر گندگی ڈالے جانے سے پانی کے اوصاف تغیر سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

نیز کافر اور مسلمان دونوں پانی کی صفائی ستھرائی اور اس کے صحت بخش ہونے پر متفق ہیں پھر ایک عقلمند کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ لوگوں نے عمداً اس میں گندگیاں ڈالیں اور واقعی گندگی پڑی تھی اور وہ اس پانی کو استعمال کرتے تھے لامحالہ یہاں اس روایت میں کئی احتمالات ہیں ان تمام احتمالات پر غور کرنا چاہیئے اور بیر بضاعہ کے اس جزئی واقعہ کو ضابطہ نہیں بنانا چاہیئے۔

⑥ صحابہ کا یہ سوال توہم اور احتمال و وہم پر مبنی تھا کیونکہ یہ کنواں نالے میں تھا اور سیلاب کے پانی کے ساتھ گندگی آنے کا احتمال اور خطرہ تھا تو آنحضرت ﷺ نے اسلوب حکیم کے طور پر جواب دیا کہ پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کر سکتی تم اوہام اور احتمالات کو چھوڑ دو کیونکہ "الیقین لا یزول بالشک" ایک قاعدہ مسلمہ ہے۔

⑦ شاہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیر بضاعہ کے چشمہ دار کنوئیں اور کثیر پانی ہونے پر بخاری شریف کی ایک حدیث سے اس طرح استدلال کیا ہے کہ وہاں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی اور بیر بضاعہ کے قریب اس کے چقندر کا باغ تھا وہ اس باغ کو اس کنوئیں سے سیراب کرتی تھی اور جمعہ کی نماز کے بعد چقندر پکا کر صحابہ کو کھلاتی تھی صحابہ جمعہ کے انتظار میں رہتے تھے کہ بوڑھی اماں چقندر کھلائیں گی۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیر بضاعہ چشمہ دار کنواں تھا جس کا پانی جاری تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس کا پانی پاک ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کر سکتی ہے۔

باقی ابوداؤد میں جو مولف نے بیر بضاعہ کا واقعہ لکھا ہے اس میں کئی راوی مجہول ہیں وہ قابل استدلال نہیں۔ اور مشکوۃ شریف میں حوضوں سے متعلق جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کے واقعات ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بڑے حوض تھے جو جاری پانی کے حکم میں تھے کیونکہ مدینہ منورہ کی زمین کے پیش نظر وہاں چھوٹے حوض باقی نہیں رہ سکتے تھے۔

لغات:.... بیر بضاعہ مشہور روایت کے مطابق با کے ضمہ کے ساتھ ہے بعض نے کسرہ کو بھی جائز کہا ہے ضاد مشہور ہے کسی نے صاد بھی پڑھا ہے یہ مدینہ منورہ میں ایک کنوئیں کا نام ہے جو مسجد نبوی سے احد کی طرف حضرت حمزہ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر سے پہلے راستے میں دائیں طرف کہیں واقع ہے ایک روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس سے خود پانی کا ایک ڈول بھرا اور اس سے وضو فرمایا اور پھر وضو کا بچا ہوا پانی لعاب دہن سے ملا کر کنوئیں میں ڈالا۔

صحابہ کرام حضور ﷺ کے زمانہ میں اس پانی سے حصول شفاء کے لئے بیماروں کو غسل دیتے تھے اللہ تعالیٰ شفاء عطا فرماتا تھا۔ بیر بضاعہ کے مالک ابن سید رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے اس کنوئیں میں لعاب دہن ڈالا اس کے بعد ہم اس کے پانی کو بطور تبرک استعمال کرتے تھے۔ (کذا فی اللمعات ج ۱ ص ۱۳۸)

الحیض: حا کے کسرہ اور یا کے فتح کے ساتھ یہ حیضة کی جمع ہے اس سے مراد حیض میں استعمال شدہ کپڑے اور چیتھڑے ہیں۔

النتن: بدبو کو کہا جاتا ہے یہاں مراد بدبودار اشیاء ہیں۔ **لحوم الکلاب** یعنی مردہ کتوں کو اور اس کے کٹے ہوئے اعضاء کو پھینکتے تھے۔

۳۰-جز ۱۰-۱۴

حدیث قلتین کی بحث

اذا بلغ الماء قلتین: جمہور اور مالکیہ کے درمیان ماء قلیل وکثیر میں نجاست پڑنے سے متعلق اختلاف تھا اب ائمہ احناف اور شوافع وحنابلہ کے درمیان پانی کے قلیل وکثیر کی تحدید اور تعین میں بڑا اختلاف ہے شوافع نے قلیل وکثیر کے لئے قلتین کو معیار بنایا ہے اور احناف نے مبتلی بہ آدمی کی رائے کو معیار بنایا ہے اس کی تشریح پہلے درس میں گزر چکی ہے یہاں ان حضرات کے دلائل کو پیش کیا جاتا ہے۔

دلائل:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استدلال میں حدیث قلتین کو پیش کیا ہے کہ کثیر پانی کی حد قلتین ہے اور حدیث میں ہے: "**اذا بلغ الماء قلتین لم یحمل الخبث**" **ای لم یقبل الخبث** یعنی نجاست گرنے سے وہ پانی ناپاک نہیں ہوگا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ ایک زنگی چاہ زمزم میں گر کر مر گیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ نے کنوئیں کے پورے پانی کے اخراج کا حکم دیا روایت میں ہے کہ زمزم کا کنواں چشمہ دار تھا پانی ختم نہیں ہو رہا تھا اور لوگ نکالتے رہے اور ناپاک سمجھ کر کنواں خالی کرتے رہے اس کنوئیں میں ہزاروں قلے پانی موجود تھا پھر بھی اس کو ناپاک سمجھا گیا اور تمام صحابہ کی موجودگی میں اس پر عمل ہوا کسی نے اعتراض نہیں کیا تو یہ ایک قسم کا اجماع ہو گیا اسی کو لیا جائے گا اور حدیث قلتین گویا اجماع کے خلاف ہے اس کو تحدید ماء کیلئے معیار قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

جواب: حدیث قلتین کا جواب ائمہ احناف اس طرح دیتے ہیں کہ یہ حدیث ① سنداً ② متناً ③ اور معنیً مضطرب ہے جس کی وجہ سے حدیث ضعیف ہو جاتی ہے سنداً اضطراب یہ ہے کہ اس حدیث کی روایت کا مدار تین آدمیوں پر ہے۔ اول محمد بن اسحاق، دوم ولید بن کثیر اور سوم حماد بن سلمہ۔

محمد بن اسحاق کے بارے میں تقریباً تمام محدثین متفق ہیں کہ وہ ضعیف ہیں بلکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو **دجال من الدجاجلہ** کے نام سے یاد کیا ہے لہٰذا حدیث کی سند کا یہ طریق قابل اعتماد نہیں رہا۔

ولید بن کثیر کے طریق میں دو اضطراب ہیں کہیں محمد بن جعفر کا ذکر ہے اور کہیں محمد بن عباد بن جعفر کا ذکر ہے کہیں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے اور کہیں عبید اللہ بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے اسی وجہ سے شیخین نے اس روایت کو نہیں لیا اور امام ابوداؤد نے اپنی کتاب میں اس اضطراب کا ذکر کیا ہے جو ان کی عادت کے مطابق حدیث کے ضعیف ہونے کی علامت ہے۔

نیز ابوداؤد کے پرانے نسخوں میں یہ بات ملتی ہے کہ ابوداؤد نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ معارف السنن میں ابوداؤد کے نسخوں پر محدث العصر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے بات کی ہے اور فرمایا ہے کہ پہلے نسخوں میں یہ بات ملتی ہے کہ امام ابو داؤد نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، صاحب ہدایہ نے انہیں دو وجوہات کی وجہ سے ابوداؤد کا حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے حدیث قلتین کو ضعیف کہا ہے، حماد بن سلمہ کے طریق میں اس حدیث کے موقوف اور مرفوع ہونے میں اختلاف ہے یہ الگ اضطراب ہے لہٰذا حدیث قلتین سنداً مضطرب ہے اور مضطرب ضعیف ہے قابل استدلال نہیں ہے۔

متناً اضطراب: یہ کہ بعض روایات میں قلتین کا ذکر ہے بعض میں ثلاث قلال کا ذکر ہے کسی میں اربع قلال ہے تو کسی میں اربعین قلۃ ہے بعض روایات میں اربعین غرباً ہے اور بعض میں اربعین دلواً ہے بعض میں قلتین و مازاد کے الفاظ ہیں لہٰذا یہ روایت متن کے اعتبار سے بھی مضطرب ہے جو ضعیف ہونے کی دلیل ہے۔

معنیً اضطراب یہ کہ "قلۃ" لغت میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے: ① **قامة الرجل** ② **رأس الجبل** ③ **الجرة الكبيرة** یعنی بڑا مٹکہ شوافع کہتے ہیں کہ ہم مٹکہ مراد لیتے ہیں احناف کہتے ہیں کہ مٹکے بھی بڑے چھوٹے ہو کر مختلف ہو جاتے ہیں۔ شوافع فرماتے ہیں کہ پانچ مشکیزوں والے دو مٹکے مراد ہیں یعنی ایک مٹکہ میں ڈھائی مشک پانی بھرتا ہے دو میں پانچ مشک جو تقریباً ساڑھے چھ من پانی بن جاتا ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ مشک کا بھی علم نہیں کہ بھینس کی ہے اونٹ کی یا بکری کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس مشک میں تیس یا پچاس استار پانی آجائے وہ مراد ہے احناف کہتے ہیں کہ استار میں بھی تفاوت ہوتا ہے اور اگر قلۃ سے **رأس الجبل** مراد لو گے تو یہ تمہارے بھی خلاف ہے تو جہالت در جہالت آگئی تو **فأين التحديد؟** ایک اضطراب باعث تضعیف ہوتا ہے یہاں تو تین اضطراب کی لائن لگی ہوئی ہے۔

دوسرا جواب یہ کہ اس حدیث کی صحت وعدم صحت میں علماء کا بھی اختلاف ہے بہت سے محققین نے اس کو صحیح کہا ہے لیکن مذاہب اربعہ کے بہت سارے جبال العلم نے اس کی تضعیف بھی کی ہے علی المدینی نے کہا ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن القیم رحمہ اللہ جیسے اونچے پائے کے اہل علم نے اس کو ضعیف کہا ہے۔
بدرالدین عینی رحمہ اللہ اور صاحب ہدایہ جیسے محققین نے اس کو ضعیف کہا ہے نیز اس حدیث میں ایک علت قادحہ بھی ہے جس سے حدیث معلل بن جاتی ہے اور وہ علت یہ ہے کہ پانی جیسے عام استعمال کی چیز میں جب روایت آتی ہے تو جماعت صحابہ میں صرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کوئی اور صحابی نہیں کرتا اور پھر آپ کے شاگردوں میں صرف عبداللہ یا عبیداللہ آپ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں یہ خفی علت ہے جس سے حدیث معلول بن جاتی ہے۔ امام طحاوی نے یہ کہا ہے کہ حدیث صحیح ہے لیکن ہم اس کے معنے کو نہیں سمجھتے ہیں۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے دو قلے پانی کے لئے ایک گڑھا کھدوایا اور پھر اس میں دو قلے پانی بھروایا وہ فرماتے ہیں کہ یہ دو قلے دہ دردہ کی مقدار کا پانی تھا لہٰذا اس میں احناف وشوافع کا اختلاف ہی نہیں رہا دونوں کے نزدیک یہ کثیر پانی کے حکم میں ہو گیا۔

حدیث قلتین کا مصداق:

بہر حال اگر حدیث ثابت ہو جائے اور صحیح ہو تو پھر اس کا اصل مصداق کیا ہونا چاہیئے؟ تو امام ابو یوسف اسی خلجان کو دل میں رکھ کر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا اصل مصداق کیا ہے اور اس کا محمل کیا ہونا چاہیئے؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کا مصداق جنگل کا وہ تھوڑا سا پانی ہے جو ٹپک ٹپک کر ایک گڑھے میں گرتا ہے اور وہاں جمع ہو جاتا ہے اس گڑھے سے یہ پانی کچھ آگے جا کر سوکھ جاتا ہے اور عادۃً اس گڑھے میں دو قلے جمع رہتا ہے تو یہ نہ نہر ہے نہ بڑا حوض ہے نہ جاری چشمہ ہے لیکن پلید اس لئے نہیں ہوتا ہے کہ اس میں نجاست نہیں ٹھہرتی ہے کیونکہ تھوڑا تھوڑا بہتا رہتا ہے تو جاری کے حکم میں ہے یہ سن کر امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کھڑے ہو کر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی پیشانی کا خوشی سے بوسہ لیا اور کہا آپ کو اللہ نے بڑا منصب عطا کیا ہے۔
بندہ عاجز عرض کرتا ہے کہ میں نے بار بار ایسے پانی کو اور جمع شدہ گڑھوں کو شکار کے دوران دیکھا ہے یہ واقعی دو قلے کے برابر ہوتا ہے اور جنگل میں ہوتا ہے جمع بھی ہے اور جاری بھی ہے اور یہ حدیث تو چیخ چیخ کر پکارتی ہے کہ قلتین سے اسی قسم کا کنواں مراد ہے جو جنگل میں ہوتا ہے اور شہری پانی مراد نہیں کیونکہ حدیث میں درندوں اور جانوروں کی آمد ورفت اور پینے کا ذکر موجود ہے تو کیا کوئی درندہ امپریس مارکیٹ کراچی میں آ کر مٹکے میں منہ ڈالے گا جس کی وجہ سے یہ مسئلہ کھڑا ہوگا؟
اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر کروڑہا رحمتیں نازل فرمائے وہ علوم نبوت کے امین تھے۔

[illegible] ۱۴۰۰ھ

مسئلة ماء البحر وميتته

﴿۶﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: سَأَلَ رَجُلٌ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّا نَرْكَبُ الْبَحْرَ وَنَحْمِلُ مَعَنَا الْقَلِيلَ مِنَ الْمَاءِ فَإِنْ تَوَضَّأْنَا بِهِ عَطِشْنَا أَفَنَتَوَضَّأُ بِمَاءِ الْبَحْرِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ هُوَ الطَّهُورُ مَاؤُهُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ. (رَوَاهُ مَالِكٌ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَالدَّارِمِيُّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ! ہم (کھارے) دریا میں کشتی کے ذریعہ سے سفر کرتے ہیں اور (میٹھا) پانی اپنے ہمراہ تھوڑا لے جاتے ہیں اس لئے اگر ہم اس پانی سے وضو کرلیں تو پیاسے رہ جائیں گے تو کیا ہم دریا کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں (یا تیمم کرلیا کریں) آنحضرت ﷺ نے فرمایا سمندر ہی کا پانی پاک کرنے والا ہے اور اس کا مردہ حلال ہے۔ (مالک، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)

توضیح: سأل رجل: بعض کہتے ہیں کہ اس شخص کا نام عبد تھا جو مدلجی تھا جس نے سمندر کے پانی سے متعلق سوال کیا تھا بعض نے ان کا نام عبد العزی بتایا ہے بعض نے کہا کہ ان کا نام "عرکی" تھا کہتے ہیں سوال کرنے والا یہ شخص سمندر میں کشتی بانی کا کام کرتا تھا یعنی مچھیرا تھا۔

سوال: افنتوضا بماء البحر: یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ سمندر کے پانی سے متعلق یہاں سوال کیسے ہوا ہے اس کا منشاء کیا تھا جبکہ صحابہ اور عرب ذہانت میں بہت آگے تھے وہ چھوٹے چھوٹے کنوؤں کے متعلق علم رکھتے تھے تو سمندر کے پاک یا ناپاک ہونے کے بارے میں ان کو اشکال کیوں پیدا ہوا؟

پہلا جواب: سوال کے محرکات و اسباب تین تھے اول یہ کہ ابو داؤد شریف کی روایت میں ہے کہ "**و ان تحت البحر نارًا**" (ج ۱ ص ۳۴۷) اسی طرح قرآن کریم کی آیت "**و اذا البحار سجرت**" اور آیت "**والبحر المسجور**" یہ سب اس پر دال ہیں کہ سمندر کے نیچے آگ ہے اور قیامت کے وقت یہ آگ بھڑک اٹھے گی اور یہی سمندر کا نچلا حصہ دوزخ بنے گا جب اس پانی کے نیچے آگ ہے اور آگ مظہر غضب الٰہی ہے تو اس کے ساتھ والے سمندری پانی میں پاکی اور ناپاکی کا شبہ ہوسکتا تھا اس لئے صحابی نے یہ سوال کیا بہرحال یہ جواب بہت کمزور ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ سمندر میں بڑے بڑے جانور رہتے ہیں جو بڑے پہاڑ کے برابر ہوسکتے ہیں کیونکہ مچھلی ان حیوانات میں سے ہے جن کے جسم کے بڑے ہونے کی کوئی حد نہیں ہوتی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ حیوانات سمندر میں مرتے بھی ہیں تو سمندر کے پانی کے نجس ہونے کا شبہ پیدا ہوگیا تو سوال کیا: یہ وجہ کچھ غنیمت ہے۔

[1] اخرجه مالك ۴۰۰ والترمذی ۶۹ وابو داؤد ۸۳

تیسرا جواب: جو قوی بھی ہے اور حقیقت پر مبنی بھی ہے وہ یہ ہے کہ سمندر کا پانی اپنے تینوں اوصاف لون رائحہ اور ذائقہ میں عام پانیوں سے مختلف ہوتا ہے نہایت ترش اور بدبودار ہوتا ہے اس لئے صحابی کو شبہ ہو گیا تو سوال کیا جس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے ان کے انکار کی صورت کو نہایت حصر اور تاکید کے ساتھ رد فرما کر "**هو الطهور مائه**" فرمادیا کہ پاک پانی اگر ہے تو وہ سمندر ہی کا ہے۔

سوال: آنحضرت ﷺ نے صحابی کے اس سوال کے جواب میں نعم کے مختصر لفظ کی جگہ اتنا طویل جملہ کیوں ارشاد فرمایا؟

جواب: نعم کہنے سے سائل کا جواب تو ہو جاتا کہ وضو جائز ہے مگر پانی کی حیثیت اور اس سے عموم طہارت کے حصول کا حکم ظاہر نہیں ہو سکتا تھا اور جب یہ طویل جملہ ارشاد فرمایا تو شریعت کا ایک ضابطہ اور قاعدہ سامنے آ گیا کہ اس پانی سے وضو غسل اور کپڑے دھونا وغیرہ سب جائز ہے۔

والحل میتته: میتته میں سارے **میتات البحر** مراد نہیں ہے بلکہ اس سے صرف **انواع سمك** مراد ہیں یعنی یہاں اضافت استغراق کے لئے نہیں بلکہ اضافت عہدی ہے اور صرف معہود حیوان یعنی مچھلیاں مراد ہیں۔[1]

سوال: یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے اس سائل نے صرف پانی کے متعلق سوال کیا تھا تو آپ نے پانی کے متعلق جواب کے ساتھ سمندری جانوروں کے متعلق جواب کی ضرورت کیوں محسوس کی اور اس جملے کا ماقبل سوال کے ساتھ ربط کیا بنے گا؟

جواب: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس آدمی نے سمندر کے پانی سے وضو کا مسئلہ پوچھا تھا وہ سمندر میں کشتی بانی کا کاروبار کرتا تھا اور اکثر و بیشتر اس کا سفر سمندر میں ہوتا تھا تو جس طرح پانی استعمال کرنے کا مسئلہ اس کے لئے ضروری تھا اسی طرح کھانے کا مسئلہ بھی اس کے لئے اہم تھا تو آنحضرت ﷺ نے اس کی حالت اور اس کی ضرورت کے پیش نظر سمندری جانوروں کے متعلق حلت اور حرمت کا مسئلہ بیان فرمادیا کہ اسی سمندر میں تیرا پانی ہے اسی میں تیرا کھانا ہے نیز اس تفصیلی جواب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سمندری پانی صرف ضرورت کے وقت نہیں بلکہ ہر وقت قابل استعمال ہے۔

سمندری جانوروں کا شرعی حکم:

میتة البحر: یعنی سمندری جانوروں کی حلت وحرمت میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے مچھلی کی تمام اقسام حلال ہیں اس میں تو کسی کا اختلاف نہیں مچھلی کے علاوہ دیگر جانوروں میں اختلاف ہے۔

فقہاء کا اختلاف:

ائمہ ثلاثہ یعنی مالک شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کے اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں۔

---

[1] المرقات ۲/۱۸۱

پہلا قول:

یہ ہے کہ جو اشیاء خشکی میں حلال ہیں اس کی نظیر بحر میں حلال ہے اور جو بر میں حرام ہیں ان کے مانند جانور بحر میں حرام ہیں۔

دوسرا قول:

یہ ہے کہ بحری اشیاء تمام حلال ہیں حتیٰ کہ انسان بحری کلب بحری اور خنزیر بحری بھی حلال ہیں کسی نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ سمندری انسان اگر باتیں کر رہا ہو اس کا کھانا بھی حلال ہے؟ تو آپ نے جواب دیا "**نعم ولو یتکلم بالعربیة الفصحی**" یعنی اگرچہ فصیح عربی بولتا ہو اس کا کھانا بھی حلال ہے ہاں اس قول میں ان حضرات کے ہاں سمندری جانوروں میں سے تین چیزیں دیگر نصوص کی وجہ سے مستثنیٰ ہیں۔ اول **ضفدع** مینڈک، دوم **سلحفاة** کچھوا اور سوم **تمساح** یعنی مگرمچھ گھڑیال نہنگ۔ ان حضرات کے ہاں یہ دوسرا قول سب سے زیادہ مختار ہے۔

جمہور کا تیسرا قول:

یہ کہ جو اشیاء زہریلی ہیں وہ حرام ہیں باقی چیزیں حلال ہیں بہرحال جمہور کے ان تینوں اقوال میں کوئی ضبط اور انضباط نہیں ہے جس کو ہر خاص و عام آسانی سے سمجھ جائے اور اس پر عمل کرے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انواع سمک کے علاوہ تمام سمندری اشیاء حرام ہیں۔

دلائل:

① جمہور کی پہلی دلیل زیر بحث حدیث ہے جس میں "**والحل میتته**" کے الفاظ آئے ہیں وہ حضرات اس میں اضافت استغراق کے لئے مانتے ہیں یعنی سمندر کے تمام میتات حلال ہیں۔

② جمہور کی دوسری دلیل "**احل لکم صید البحر وطعامه متاعا لکم وللسیارة**"۔[1]

③ جمہور کی تیسری دلیل قصۂ عنبر ہے کہ صحابہ کرام کو آنحضرت ﷺ نے ایک سریہ میں بھیجا تھا جب ان کے پاس کھانا ختم ہو گیا تو پتے کھانے لگے پھر اللہ تعالیٰ نے ایک سمندری "**دابة**" بھیجا جسے عنبر کہا جاتا ہے صحابہ نے اسے کھا لیا جمہور فرماتے ہیں کہ یہاں دابہ کا لفظ آیا ہے جس سے مراد جانور ہے اور صحابہ نے کھایا ہے اور بخاری میں یہ حدیث موجود ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل قرآن کریم کی آیت "**ویحرم علیکم الخبائث**"[2] ہے وہ فرماتے ہیں کہ انواع سمک کے علاوہ تمام بحری اشیاء خبائث میں داخل ہیں جو موذیات اور خبائث ہیں بلکہ بعض تو اتنے زہریلے ہیں کہ ان کے کھانے سے آدمی فوراً مر جاتا ہے۔

جھینگے کا حکم:

یہاں ضمنی طور پر مختصر انداز سے جھینگے کے متعلق بھی کچھ ملاحظہ فرمائیں۔ پھر جمہور کے دلائل کا جواب ہوگا۔

[1] مائدہ ۹۶ [2] اعراف ۱۵۷

جھینگے میں شوافع مالکیہ حنابلہ کے علاوہ ائمہ احناف کا آپس میں بھی اختلاف ہے۔ بعض احناف جو بالخصوص ساحلی علاقوں کے باشندے ہیں وہ جھینگے کو حلال سمجھتے ہیں اور اکثر علماء احناف اس کو حلال نہیں کہتے ہیں اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ آیا جھینگا مچھلی کی اقسام میں داخل ہے یا اس سے خارج ہے، اگر یہ مچھلی کی اقسام میں داخل ہے تو پھر اس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن اگر یہ مچھلی کی اقسام سے خارج ہے تو پھر اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ احناف انواع سمک کے علاوہ دیگر سمندری حیوانات کو حلال نہیں سمجھتے ہیں تو پھر جھینگا کو بھی حلال نہیں کہنا چاہیئے۔ اب یہ مسئلہ علماء حیوانات کے کورٹ میں چلا گیا کہ ماہرین حیوانات یہ فیصلہ کریں کہ جھینگا مچھلی ہے یا کچھ اور چیز ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس کو خشکی کا کیڑا قرار دیا ہے فتاوی رشیدیہ میں اسی طرح لکھا ہے۔

حضرت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے علماء حیوانات کا حوالہ دیا ہے کہ وہ اس کو کس میں شامل کرتے ہیں اگر مچھلی ہے تو حلال ہے ورنہ حرام ہے۔ علماء حیوانات کا کہنا ہے کہ مچھلی میں ہڈی کا ہونا ضروری ہوتا ہے جھینگے میں ہڈی نہیں نیز مچھلی کے گلپھڑے ہوتے ہیں جھینگے میں یہ بھی نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جھینگا مچھلی کی قسم نہیں ہے کوئی اور چیز ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس مسئلہ کی تحقیق غیر جانب دار علماء کو کرنا چاہیئے جو علماء صبح و شام جھینگے مہنگے داموں خرید کر استلذاذ کامل کے ساتھ کھاتے ہیں ظاہر ہے وہ اس کے جواز اور حلال طیب بنانے کے لئے ہر غث و سمین قسم کے دلائل کا سہارا لیں گے چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ شوافع حضرات نے جن دلائل سے بحری اشیاء کی حلت پر استدلال کیا ہے جھینگا کھانے والے حضرات انہیں دلائل کو جواز کے لئے بطور استدلال پیش کرتے ہیں حالانکہ زیر بحث حدیث کی تشریح کرنے میں علماء احناف شد و مد کے ساتھ شوافع حضرات کے ان دلائل کا مدلل انداز سے جواب دیتے چلے آئے ہیں۔ جس میں اس حدیث کا جواب بھی ہے، جھینگے کے خواہشمند شوقین حضرات اکثر و بیشتر لغت کی کتابوں کے حوالے نکال کر پیش کرتے ہیں کہ جھینگا حلال ہے اور کہتے ہیں دیکھو لغت کی فلاں فلاں کتاب نے اس کو مچھلی کہدیا ہے تو یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ لغات کی یہ اکثر کتابیں شافعی مسلک حضرات کی ہیں ان سے احناف کیسے استدلال کریں گے نیز یہ کھانے نہ کھانے کے حرام اور حلال کا مقابلہ ہے اور اس طرح کی صورت میں ترجیح حرام کو دی جاتی ہے تاکہ حرام کے کھانے میں پڑنے سے آدمی بچ جائے۔

یہاں میں علماء لغت کے دو تین حوالے بھی دوں گا تاکہ جھینگا نہ کھانے والے حضرات کو تسلی ہو جائے اور کھانے والوں کے لئے کچھ سوچنے کا سامان ہو جائے۔

جھینگا کو عربی میں ''روبیان'' کہتے ہیں لہٰذا لغت والے اس کو باب الراء میں لکھتے ہیں لغت میں اس کو ''اربیان'' بھی کہتے ہیں اس لئے باب الالف میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے چنانچہ مولف المنجد الابجدی حرف الراء ص ۵۰۳ پر لکھتے ہیں:

الروبیان جنس سرطان بحری من القشریات العشاریة الاقدام ویعرف بالقریدس۔

یعنی جھینگا سمندری کیکڑا اور سرطان ہے اس پر چھلکے ہوتے ہیں اور اس کے دس کے قریب پنجے ہوتے ہیں اور قریدس یعنی کیکڑے کے نام سے مشہور ہے۔

لغت کی ایک کتاب المنجد فی اللغة کے ص ۸ پر اس کا مصنف لکھتا ہے:

اربیان وروبیان جنس سرطان بحری من القشریات العشاریة الاقدام ویعرف بالقریدس اصناف عدیدۃ لذیذ الطعم۔

اس عبارت میں یہ آخری الفاظ مزید آئے ہیں کہ جھینگا کی بہت ساری اقسام ہیں اور یہ ایک لذیذ چیز ہے۔
لغت کی مشہور کتاب **المنجد فی اللغة والادب والعلوم** میں اس کا عیسائی مصنف لویس معلوف نے جھینگا کے متعلق لکھا ہے "**اربیان نوع من سرطان بحری**" یعنی یہ کیکڑوں کی ایک قسم ہے۔ (المنجد فی اللغۃ والعلوم ص ۷)
لغت کی ایک اور کتاب **الأروس** کے ص ۵۶ پر لکھتے ہیں "**روبیان برغوث البحر**" یعنی جھینگے سمندر کے پسو ہیں۔
خلاصہ یہ نکلا کہ جھینگے کو کیکڑا کہا گیا کیڑا کہا گیا پسو کہا گیا اب اس کے کھانے والوں کو خود سوچنا چاہیے کہ وہ کیا چیز کھا رہے ہیں قیمت اور لذت میں نہیں پڑنا چاہیے حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے میں جھینگے کو حرام نہیں کہتا ہوں لیکن دسترخوان پر میرے سامنے نہ لایا جائے۔ بہرحال پسند اپنی اپنی نصیب اپنا اپنا اجتہادی مجاہدہ ہے ہر طرف گنجائش نکالنے کا جہد مسلسل جاری ہے کوئی کھا رہے ہیں کوئی ٹھکرا رہے ہیں۔

احناف کی طرف سے جمہور کو جواب:

بہرحال جھینگے کے جملہ معترضہ کے بعد اب زیر بحث حدیث **والحل میتته** کا جواب احناف یہ دیتے ہیں کہ یہاں میتة سے مراد عام سمندری جانور نہیں ہیں بلکہ اس سے صرف **مچھلی** مراد ہے اور مچھلی پر **میتة** کا اطلاق اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے لئے ذبح کی ضرورت نہیں پڑتی ہے حدیث شریف میں آیا ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"احلت لنا المیتتان السمك والجراد والدمان الكبد والطحال"۔

ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور ابن ماجہ اور نسائی نے بھی الفاظ کے تغیر کے ساتھ نقل کیا ہے۔
جمہور کی دوسری دلیل **احل لکم صید البحر** کا جواب یہ ہے کہ یہاں صید مصید کے معنی میں نہیں جس کے معنی شکار شدہ چیز کے ہیں بلکہ یہ لفظ اپنے مصدری معنی "**اصطیاد**" شکار کھیلنے کے معنی میں ہے تو آیت سے مُحرِم (حالت احرام) کے

لئے سمندری شکار کھیلنے کی اجازت مل گئی ہے کھانے کی بات یہاں نہیں ہے اور شکار تو حرام جانوروں کا بھی ہوتا ہے اور اگر شکار کرنے اور کھانے کی بات بھی ہو تو صید البحر کا مصداق مچھلی کا شکار ہے جو معروف ہے جائز بھی ہے اور حلال بھی ہے۔

جمہور کی تیسری دلیل عنبر والی حدیث تھی جس میں دابۃ کا لفظ آیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ بخاری کی بعض روایات میں عنبر پر سمک کا اطلاق بھی موجود ہے دابۃ اس لئے کہا گیا کہ وہ وھیل اژدھا مچھلی تھی کہ تین سو صحابہ نے ایک ماہ تک اس کو کھایا اس کی آنکھ کے خانہ میں نو آدمی بیٹھ جاتے تھے اور ایک صحابی اس کی ہڈی کے دونوں جانب زمین میں گاڑ کر اونٹ پر سوار ہو کر ہڈی کے نیچے سے آرام سے گزر گئے اتنی بڑی مچھلی تھی اس لئے اس پر دابۃ کا اطلاق ہوا ہے ورنہ اس کا نام عنبر تھا اور عنبر مچھلی ہی کی ایک قسم ہے۔ (فضل محمد یوسف زئی۔ نزیل مکہ مکرمہ، شارع ستین، دار عمر عبد الحفیظ ۲۰ رمضان ۱۴۲۲ھ)

مسئلة نبيذ التمر

﴿۷﴾ وَعَنْ أَبِي زَيْدٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُ لَيْلَةَ الْجِنِّ مَا فِي إِدَاوَتِكَ قَالَ قُلْتُ نَبِيذٌ قَالَ تَمْرَةٌ طَيِّبَةٌ وَمَاءٌ طَهُورٌ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَزَادَ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ فَتَوَضَّأَ مِنْهُ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ أَبُو زَيْدٍ مَجْهُولٌ وَصَحَّ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ لَمْ أَكُنْ لَيْلَةَ الْجِنِّ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[1]

ترجمہ: اور حضرت ابوزید حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے لیلۃ الجن (یعنی جن کی رات) میں ان سے پوچھا کہ تمہاری چھاگل میں کیا ہے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا نبیذ (یعنی کھجوروں کا شربت) ہے آپ نے فرمایا کھجوریں پاک ہیں اور پانی پاک کرنے والا ہے۔ (ابوداؤد) اور امام احمد اور امام ترمذی نے یہ الفاظ زیادہ نقل کئے ہیں پس آپ نے اس سے وضو کیا نیز امام ترمذی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ابوزید کا پتہ نہیں کہ یہ کون ہیں حضرت علقمہ البتہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح طور پر یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا "میں لیلۃ الجن میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نہیں تھا۔" (مسلم)

توضیح: فتوضأ منه: اس حدیث سے نبیذ التمر کا مسئلہ نکلتا ہے نبیذ فعیل بمعنی مفعول یعنی منبوذ ہے اس کا مطلب پھینکنا اور پھینکی ہوئی چیز ہے اگر تمر ہے تو نبیذ تمر کہلاتا ہے اگر زبیب ہے تو نبیذ زبیب کہا جاتا ہے۔

دراصل عرب میں پانی کے کھارا پن ختم کرنے اور پانی کو ذائقہ دار بنانے کے لئے اس میں کھجوریں ڈالی جاتی تھیں اور چند دنوں کے بعد پانی کو استعمال کیا جاتا تھا یہی نبیذ کی حقیقت ہے لیکن اس کی بڑی قسمیں تین ہیں دو قسمیں اتفاقی ہیں اور ایک میں اختلاف ہے۔[2]

[1] اخرجه مسلم وابو داؤد ۸۴ واحمد ۱/۴۰۲ [2] المرقات ۲/۱۸۲

① کھجوریں پانی میں ڈال کر حلاوت آنے سے پہلے پہلے وضو بنایا جائے یہ سب کے نزدیک جائز ہے۔
② کھجوریں پانی میں ڈال کر ابال دی جائیں یا طویل مدت کی وجہ سے اس میں جھاگ آگیا اور حد سکر تک پہنچ گیا تو بالاتفاق اس سے وضو بنانا جائز نہیں ہے۔
③ پانی میں کھجوریں ڈالی گئیں اور اس میں حلاوت آگئی لیکن ابھی پانی مزبد نہیں ہوا اور رقت بھی باقی ہے مطبوخ بھی نہیں تو اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔[1]

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **نبیذ التمر** کی یہ قسم اگر موجود ہے تو آدمی اس سے وضو بھی کرے اور پھر تیمم بھی کرے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جمہور فقہاء کے ساتھ ہیں اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اس قسم کے پانی کی موجودگی میں اس سے وضو کرنا جائز نہیں ہے بلکہ تیمم کرنا فرض ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے پانی سے وضو کرنا جائز ہے اس کی موجودگی میں تیمم جائز نہیں ہے نوح بن ابی مریم نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جمہور کے قول کی طرف رجوع نقل کیا ہے اور احناف کے ہاں فتویٰ بھی عدم جواز کا ہے لہٰذا اب امام ابو حنیفہ اور جمہور کے درمیان کوئی اختلاف نہ رہا لیکن مخالفین اعتراض کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فتویٰ صحیح نہیں دیا ہے اس لئے دلائل اور بحث و تحقیق کی حد تک اس مسئلہ کو بیان کیا جاتا ہے تاکہ دلائل کی دنیا کو دنیا دیکھ لے۔[2]

دلائل:

جمہور نے قرآن کریم کی آیت "**فان لم تجدوا ماءً فتیمموا صعیدًا طیبًا**" سے استدلال کیا ہے طرز استدلال اس طرح ہے کہ جب مطلق پانی نہیں ہے تو تیمم کی طرف جانے کا قرآن حکم دیتا ہے طہارت کے لئے پانی ہے یا مٹی ہے یہ **نبیذ التمر** کا واسطہ بیچ میں کہاں سے آگیا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی زیر بحث حدیث ہے جس کے ظاہری الفاظ اور ظاہری مطلب سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ **نبیذ التمر** سے وضو کرنا جائز ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ "**تمرة طیبة وماء طهور فتوضأ منه**" میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔[3]

اعتراض:

جمہور نے اس حدیث پر دو اعتراضات کئے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس حدیث کا ایک راوی ابو زید ہے اور وہ مجہول ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خود حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس واقعہ کا انکار کرتے ہیں کہ "**ما شهدها منا احد**" یعنی ہم میں سے کوئی بھی لیلۃ الجن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں تھا۔ جب خود صاحب واقعہ اس کا انکار کرتا ہے تو آپ اس

[1] المرقات ۲/۱۸۲ [2] المرقات ۱۸۴، ۲/۱۸۳ [3] المرقات ۲/۱۸۴

سے کیسے استدلال کرتے ہو؟

جواب: پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ اگر ابوزید میں جہالت عینیۂ ذاتیہ ہے کہ اس کی ذات مجہول ہے تو ہم بتاتے ہیں ترمذی کے مشہور شارح ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ابوزید عمرو بن حریث کا غلام تھا اور راشد بن کیسان رحمۃ اللہ علیہ اور ابوورق رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے روایت کی ہے اور فن اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ جب کسی شخص سے دو ثقہ راوی روایت کرتے ہیں تو وہ مجہول الذات نہیں رہتا ہے بلکہ معلوم الذات بن جاتا ہے اور اگر اعتراض کا مطلب یہ ہے کہ ابوزید معلوم الوصف نہیں ہے یعنی ''مجہول الصفۃ'' ہے معلوم نہیں کہ ثقہ ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں ابوزید اکیلا نہیں بلکہ چودہ آدمی اس کے متابع ہیں اور چودہ آدمی جس شخص کے متابع ہوں تو وہ خود کیونکر ثقہ نہیں ہوگا اور اس کی روایت کا اعتبار کیوں نہیں ہوگا۔

رہ گیا دوسرے سوال کا جواب کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ ہم میں سے **لیلۃ الجن** میں کوئی بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ترمذی نے ابواب الامثال جلد ثانی میں تصریح کی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ **لیلۃ الجن** میں تھے اور اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ دوسرا جواب اس سوال کا یہ ہے کہ **آکام المرجان فی احکام الجان** میں علامہ بدرالدین شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ **لیلۃ الجن** کا واقعہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ چھ مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں پیش آیا تھا۔ تفصیل اس طرح ہے:

① مکہ مکرمہ میں پیش آیا جس میں "**اغتیل واستطیر**" کے الفاظ آئے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اکیلے تھے۔

② مقام حجون میں پیش آیا تھا۔

③ اعلیٰ مکہ میں پیش آیا تھا۔

④ مدینہ منورہ میں **بقیع الغرقد** میں پیش آیا۔

⑤ خارج المدینہ میں پیش آیا تھا جس میں حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔

⑥ حالت سفر میں پیش آیا جس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔

تو تین مقامات میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے اور تین میں ساتھ نہیں تھے تو **لم اکن لیلۃ الجن** کی نفی صرف تین واقعات کے ساتھ متعلق ہے مطلق نفی مراد نہیں ہے۔[1]

یا یہ جواب ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ **لیلۃ الجن** کے واقعہ میں تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص مقام میں نہیں تھے۔ بلکہ لکیر کے حصار میں آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر بٹھلا دیا تھا اور جنات کے پاس اندر خود چلے گئے تھے۔

باقی جمہور نے جس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مطلق پانی جب نہ ہو تو تیمم کیا کرو تو اس کا جواب یہ ہے کہ ماء مطلق سے کیا مراد ہے؟ اور مقید کا کیا مطلب ہے؟ اگر پانی کی اضافت کسی چیز کی طرف ہونے سے آپ اس کو مقید کہیں گے مثلاً

---

[1] المرقات ۲/۱۸۳

"ماء النبیذ" تو پھر ماء السماء، ماء البحر، ماء النھر، ماء البیر وغیرہ سب کو اضافت کی وجہ سے مقید ماننا ہوگا پھر تو کوئی پانی مطلق نہ ہوا حالانکہ یہ تمہارے نزدیک بھی مطلق پانی ہے اور مقید نہیں ہے۔

اور اگر مطلق پانی سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے پانی مانگے اور وہ شخص پانی پیش کرے اور لوگ اس شخص کو غلطی پر نہ سمجھیں بلکہ یہ تسلیم کریں کہ ہاں یہ مطلق پانی ہے تو نبیذ میں بھی ایسی ہی صورت ہے کہ اس کے پیش کرنے سے معاشرہ کے لوگ اس کو غلطی پر نہیں سمجھتے ہیں لہٰذا نبیذ التمر بھی مطلق پانی کے حکم میں ہے بہر حال حضرت امام صاحب کا رجوع ثابت ہے زیادہ شور کرنے کی ضرورت نہیں ہے احتیاط جمہور کے مذہب میں ہے نیز یہ اختلاف بھی صرف نبیذ تمر میں ہے زبیب وشعیر وغیرہ کی نبیذ سے وضو اتفاقاً جائز نہیں ہے۔[1]

مسئلة سؤر الهرة

﴿۸﴾ وَعَنْ كَبْشَةَ بِنْتِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ وَكَانَتْ تَحْتَ اِبْنِ أَبِي قَتَادَةَ أَنَّ أَبَا قَتَادَةَ دَخَلَ عَلَيْهَا فَسَكَبَتْ لَهُ وَضُوْءً فَجَاءَتْ هِرَّةٌ تَشْرَبُ مِنْهُ فَأَصْغَى لَهَا الْإِنَاءَ حَتّٰى شَرِبَتْ قَالَتْ كَبْشَةُ فَرَآنِي أَنْظُرُ إِلَيْهِ فَقَالَ أَتَعْجَبِيْنَ يَا ابْنَةَ أَخِيْ قَالَتْ فَقُلْتُ نَعَمْ فَقَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ إِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجِسٍ إِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِيْنَ عَلَيْكُمْ أَوِ الطَّوَّافَاتِ.

(رَوَاهُ مَالِكٌ وَأَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَالدَّارِمِيُّ)[2]

ترجمہ: اور حضرت کبشہ بنت کعب بن مالک جو حضرت ابوقتادہ کے بیٹے کی بیوی تھیں، سے روایت ہے کہ (ایک روز) ان کے سسر حضرت ابوقتادہ ان کے پاس آئے (کبشہ کہتی ہے کہ) میں نے ان کے وضو کے لئے (ایک برتن میں) پانی رکھ دیا تو ایک بلی آکر اس میں سے پانی پینے لگی حضرت ابوقتادہ نے برتن کو اس کی طرف جھکا دیا (تاکہ وہ آسانی سے پانی پی لے) چنانچہ بلی نے پانی پی لیا کبشہ کہتی ہیں کہ جب حضرت ابوقتادہ نے مجھے دیکھا کہ میں (تعجب سے) ان کی طرف دیکھ رہی ہوں تو انہوں نے کہا میری بھتیجی کیا تمہیں اس پر تعجب ہو رہا ہے میں نے کہا جی ہاں حضرت ابوقتادہ نے کہا سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا بلیاں ناپاک نہیں ہیں کیونکہ یہ تمہارے پاس آنے جانے والوں میں سے ہیں یا یہ فرمایا کہ آنے جانے والیوں میں سے ہیں۔ (مالک، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)

توضیح: یا ابنة اخی: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے عرب کی عادت کے مطابق حضرت کبشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھائی کی بیٹی کہا اس سے اسلامی بھائی چارہ مراد ہے رشتہ داری کی بات نہیں ہے۔[3]

انها لیست بنجس: یہاں سوال یہ ہے کہ نجس کا لفظ مذکر ہے تو ہرة کے لئے کیسے استعمال ہوا ہے؟ اس کا ایک

[1] المرقات ۲/۱۸۳ [2] اخرجه مالک ۲۰ والترمذی ۹۲ وابو داؤد ۷۵ [3] المرقات ۲/۱۸۴

عام جواب بطور لطیفہ اور چٹکلہ اس طرح ہے کہ "زید ھا ھو" یعنی اس سے لفظ مراد لو گے تو مذکر کی ضمیر لاؤ گے کیونکہ زید مذکر ہے لیکن زید سے "کلمۃ" کا ارادہ کرو گے تو مونث کی ضمیر بھی جائز ہے یہ لطیفہ ہر جگہ چلتا ہے سوال کا حقیقی جواب شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لمعات میں دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مشکوۃ اور مصابیح کے تمام نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح مذکر ہے لیکن شروحات میں "انھا نجسۃ" تانیث کے ساتھ آیا ہے شیخ فرماتے ہیں کہ ترمذی کے بعض پرانے نسخوں میں یہ لفظ تذکیر کے ساتھ آیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کا اصل لفظ نجس مذکر ہے کسی نے اس میں تغیر کر کے نجسۃ کر دیا ہے اور شروحات نے اس کو ذکر کر دیا آنے والی حدیث کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مونث کے لئے مذکر کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ "ھرۃ" سے "سنور" مراد لیا گیا ہے آنے والی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قصہ میں لفظ "ھریسہ" آیا ہے گوشت کے ٹکڑے اور مصالحہ اور دیگر چند چیزوں کو ملا کر ایک شیرہ قسم کی چیز کا نام "ھریسہ" ہے عرب میں اب بھی یہ ایک مرغوب خوراک ہے۔[1]

سؤر الھرۃ میں فقہاء کا اختلاف:

بلی کے جھوٹے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے اور اختلاف کا منشاء کراہت کی علت ہے کہ اس کی علت کیا ہے بعض نے بلی کے گوشت کو دیکھ کر حکم لگایا ہے بعض نے یہ علت بیان کی کہ بلی ناپاک چیزوں میں منہ ڈالنے میں احتیاط نہیں کرتی ہے تو ناپاکی کا احتمال ہے۔

تینوں ائمہ اور امام ابو یوسف و امام محمد یعنی جمہور کے نزدیک اگر بلی نے فی الوقت کوئی نجس چیز نہ کھائی ہو اور کسی نجس چیز میں منہ نہ ڈالا ہو تو اس کا جھوٹا پاک ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام کرخی رحمہ اللہ اور امام طحاوی رحمہ اللہ کے نزدیک بلی کا جھوٹا مکروہ ہے پھر علت کو دیکھ کر امام طحاوی رحمہ اللہ نے مکروہ تحریمی کا قول اختیار کیا ہے امام کرخی نے مکروہ تنزیہی کا قول اختیار کیا ہے اور یہی قول راجح اور قابل فتویٰ ہے اس سے تمام ائمہ کا اختلاف ختم ہو جائے گا کیونکہ مکروہ تنزیہی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔[2]

دلائل:

جمہور کی دلیل زیر نظر حضرت کبشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ طوافین اور طوافات سے علت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو موجب تخفیف ہے اور وہ عدم کراہت ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بلی سے متعلق مختلف احادیث ہیں جو آپس میں متعارض ہیں ایک حدیث میں ہے "الھرۃ سبع" جس کا تقاضا ہے کہ بلی کا جوٹھا حرام ہے۔ ترمذی جلد اول ص ۲۷ پر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے آخر

---

[1] اشعۃ اللمعات ۱/۲۹۶ [2] المرقات ۲/۱۸۶

میں یہ الفاظ آئے ہیں "اذا ولغت فیه الهرة غسل مرة" یہ بھی دلیل تخمس ہے کہ اس کا جھوٹا ناپاک ہے اس لئے ایک بار دھونے کا حکم دیا گیا ہے، امام طحاوی عشیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے فرمایا: "طهور الاناء اذا ولغ فیه الهر ان یغسل مرة او مرتین" اس حدیث کا تقاضا بھی ہے کہ بلی کا جھوٹا ناپاک ہے۔

اسی طرح قیاس کا بھی تقاضا ہے کیونکہ بلی کا گوشت اتفاقاً حرام ہے اور لعاب گوشت سے پیدا ہوتا ہے تو قیاس کہتا ہے کہ اس کا جھوٹا ناپاک ہے۔لیکن چونکہ جواز وعدم جواز اور پاک وناپاک ہونے میں روایات میں تعارض ہے پھر ائمہ مجتہدین میں بھی جواز وعدم جواز میں اختلاف ہوگیا لہٰذا "اختلاف امتی رحمة" کے قاعدہ کی برکت سے بات حرمت سے کراہت کی طرف آگئی۔

اب امام طحاوی عشیہ نے قیاس کو ترجیح دی اور فرمایا کہ بلی کا جھوٹا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ گوشت سے متولد ہے اور گوشت حرام ہے لہٰذا جھوٹا حرام ہے۔امام کرخی عشیہ نے علت کو دیکھا جو طوافات ہے تو اس سے تخفیف کا پتہ چلا تو آپ نے کراہت تنزیہی کا فتویٰ دیا اور یہی راجح ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔طوافین اور طوافات کی علت سے شریعت کا یہ ضابطہ حاصل ہوگیا کہ "الحرج مدفوع فی الشرع" اور "المشقة تجلب التیسیر" یعنی حرج اور مشقت آسانی کو کھینچ کرلاتی ہے۔[1]

﴿۹﴾ وَعَنْ دَاوُدَ بْنِ صَالِحِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ أُمِّهٖ أَنَّ مَوْلَاتَهَا أَرْسَلَتْهَا بِهَرِيْسَةٍ إِلٰى عَائِشَةَ قَالَتْ فَوَجَدْتُهَا تُصَلِّيْ فَأَشَارَتْ إِلَيَّ أَنْ ضَعِيْهَا فَجَاءَتْ هِرَّةٌ فَأَكَلَتْ مِنْهَا فَلَمَّا انْصَرَفَتْ عَائِشَةُ مِنْ صَلَاتِهَا أَكَلَتْ مِنْ حَيْثُ أَكَلَتِ الْهِرَّةُ فَقَالَتْ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ إِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجِسٍ إِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِيْنَ عَلَيْكُمْ وَإِنِّيْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِفَضْلِهَا. (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[2]

ترجمہ: حضرت داؤد بن صالح بن دینار عشیہ اپنی والدہ مکرمہ سے روایت کرتے ہیں کہ (ایک روز) انہیں آزاد کرنے والی مالکہ نے ہریسہ یعنی (حریرہ) دے کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت اقدس میں بھیجا ان کی والدہ فرماتی ہیں کہ میں نے (وہاں پہنچ کر) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نماز پڑھتے ہوئے پایا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اشارہ سے اسے رکھ دینے کے لئے مجھ سے کہا (چنانچہ میں نے ہریسہ کا برتن رکھ دیا اتنے میں) ایک بلی آکر اس میں سے کھانے لگی۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب نماز سے فارغ ہوئیں تو حریرہ کو بلی نے جس طرف سے کھایا تھا اسی طرف سے انہوں نے بھی کھالیا۔پھر فرمایا کہ سرکار دوعالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ بلی ناپاک نہیں ہے اور وہ تمہارے پاس آنے جانے والیوں میں سے ہے اور میں نے خود سرکار دوعالم ﷺ کو بلی کے جوٹھے (پانی) سے وضو کرتے ہوئے دیکھا۔ (ابوداؤد)

---

[1] المرقات ۱۸۶،۱۸۷/۲ [2] اخرجه ابوداؤد ۷۶

وحشی جانوروں کے جُوٹھے کا بیان

﴿۱۰﴾ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أَنَتَوَضَّأُ بِمَا أَفْضَلَتِ الْحُمُرُ قَالَ نَعَمْ وَبِمَا أَفْضَلَتِ السِّبَاعُ كُلُّهَا. (رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ)[1]

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کیا ہم اس پانی سے وضو کر سکتے ہیں جس کو گدھوں نے جوٹھا کر دیا ہو آپ نے فرمایا کہ ہاں (اس پانی سے وضو کرنا جائز ہے) اور اس پانی سے بھی (وضو کرنا جائز ہے) جس کو درندوں نے جوٹھا کر دیا ہو۔ (شرح السنہ)

توضیح: **السباع:** درندوں کو عربی میں سباع کہتے ہیں جیسے شیر، ریچھ، بھیڑیا، لومڑی وغیرہ ہیں ان جانوروں کے جوٹھے میں اختلاف ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

جنگلی درندوں کا جوٹھا مالکیہ اور شوافع کے نزدیک پاک ہے اور احناف اور ایک قول کے مطابق حنابلہ کے نزدیک ناپاک ہے۔[2]

دلائل:

شوافع نے مذکورہ روایت سے استدلال کیا ہے جو اپنے مدعا پر واضح دلیل ہے۔ نیز حدیث نمبر ۱۲ اور حدیث نمبر ۱۳ سے بھی ان حضرات نے استدلال کیا ہے۔

احناف نے شریعت کے اس ضابطہ سے استدلال کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ جس چیز کا گوشت حرام ہے اس کا جوٹھا بھی حرام ہے کیونکہ لعاب گوشت سے متولد ہے۔ نیز احناف نے مشکوٰۃ فصل ثالث کی حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جس میں یہ الفاظ ہیں "**هل ترد حوضك السباع**" یہ سوال اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ درندوں کے جوٹھے کو ناپاک سمجھتے تھے ورنہ سوال کی کیا ضرورت تھی۔ یہ حدیث شوافع کی دلیل ہے، اگر مذکورہ الفاظ سے احناف نے استدلال کیا ہے۔

جواب: شوافع کی دلائل کا جواب یہ ہے کہ یہاں یقین کی بات نہیں بلکہ صرف ایک احتمالی بات تھی کہ شاید درندوں نے پانی میں منہ ڈالا ہو آپ نے اس کو رد فرمایا کیونکہ "**اليقين لا يزول بالشك**"۔ شیخ عبد الحق رحمہ اللہ نے لمعات میں یہ جواب بھی دیا ہے کہ طہارت پر دلالت کرنے والی روایات میں کلام ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ روایات بڑے حوضوں سے متعلق ہیں جس میں کثیر پانی ہوتا ہے اور کسی طرح ناپاک نہیں ہوتا ہے۔[3]

---

[1] اخرجه البغوی فی شرح السنة [2] المرقات ۲/۱۸۸ [3] المرقات ۲/۱۸۸ واشعة اللمعات ۱/۲۶۷

بما أفضلت الحمر: احناف کے ہاں گدھے کا جوٹھا مشکوک ہے یعنی دلائل کے تناظر میں جو شک وشبہ آتا ہے اس کی وجہ سے مشکوک ہے ورنہ شریعت کو حکم سنانے میں کوئی شک نہیں ہے سمجھنے میں شک اس طرح آ گیا کہ گدھے کا گوشت حرام ہے جس کا تقاضا ہے کہ لعاب اور پسینہ دونوں نجس ہوں لیکن آنحضرت ﷺ نے گدھے پر سواری کی تو لامحالہ پسینہ لگا ہوگا آپ نے اس کی نجاست کی کوئی بات نہیں بتائی تو پسینہ پاک ہوگیا اور چونکہ پسینہ کی طرح لعاب بھی گوشت سے متولد ہے تو لعاب بھی اسی طرح پاک ہونا چاہئے اس کی وجہ سے شک پڑ گیا تو مسئلہ مشکوک ہو گیا لہٰذا مشکوک پانی سے پہلے وضو کیا جائے گا پھر تیمم ہوگا مذکورہ حدیث کا تعلق شاید حمار وحشی سے ہے اور وہ حلال ہے۔[1]

﴿۱۱﴾ وَعَنْ أُمِّ هَانِىءٍ قَالَتْ اِغْتَسَلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ هُوَ وَمَيْمُوْنَةُ فِيْ قَصْعَةٍ فِيْهَا أَثَرُ الْعَجِيْنِ.
(رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَه)[2]

ترجمہ: اور حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ اور حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک طشت میں کہ جس میں گندھے ہوئے آٹے کا کچھ حصہ لگا ہوا تھا غسل فرمایا۔ (نسائی ابن ماجہ)

الفصل الثالث

﴿۱۲﴾ وَعَنْ يَحْيَى بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ إِنَّ عُمَرَ خَرَجَ فِيْ رَكْبٍ فِيْهِمْ عَمْرُو بْنُ الْعَاصِ حَتّٰى وَرَدُوْا حَوْضًا فَقَالَ عَمْرٌو يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ هَلْ تَرِدُ حَوْضَكَ السِّبَاعُ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ لَا تُخْبِرْنَا فَإِنَّا نَرِدُ عَلَى السِّبَاعِ وَتَرِدُ عَلَيْنَا. رَوَاهُ مَالِكٌ وَزَادَ رَزِيْنٌ قَالَ زَادَ بَعْضُ الرُّوَاةِ فِيْ قَوْلِ عُمَرَ وَإِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ لَهَا مَا أَخَذَتْ فِيْ بُطُوْنِهَا وَمَا بَقِيَ فَهُوَ لَنَا طَهُوْرٌ وَشَرَابٌ.[3]

ترجمہ: حضرت یحییٰ بن عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ایک قافلہ کے ہمراہ نکلے جس میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی تھے آپ نے تالاب والے سے پوچھا کہ اے تالاب کے مالک کیا تمہارے اس تالاب پر (پانی پینے کے لئے) درندے بھی آتے ہیں یہ سن کر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے تالاب کے مالک یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ ہم درندوں پر آتے ہیں اور درندے ہم پر آتے ہیں (یعنی کبھی تو ہم پانی پر آتے ہیں اور کبھی درندے پانی پر آتے ہیں اور چونکہ تالاب میں پانی زیادہ ہے اس لئے درندوں کے پینے سے ناپاک نہیں ہوتا)۔ (رواہ مالک) اور رزین نے کہا ہے کہ بعض راویوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں) میں نے خود سرکار دو عالم ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے درندے جو اپنے پیٹ میں لے جائیں وہ ان کا ہے اور جو باقی بچ جائے وہ ہمارے

---

[1] البرقات ۲/۱۸۸ [2] اخرجه النسائی ۱/۱۳۱ وابن ماجه ۶۷۸ [3] اخرجه مالك ج ۱ ص ۲۳

پینے کے قابل اور پاک کرنے والا ہے۔

﴿۱۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْحِیَاضِ الَّتِیْ بَیْنَ مَکَّۃَ وَالْمَدِیْنَۃِ تَرِدُھَا السِّبَاعُ وَالْکِلَابُ وَالْحُمُرُ عَنِ الطُّھْرِ مِنْھَا فَقَالَ لَھَا مَا حَمَلَتْ فِیْ بُطُوْنِھَا وَ لَنَا مَا غَبَرَ طَھُوْرٌ۔ (رَوَاہُ ابْنُ مَاجَہ)[1]

ترجمہ: اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ سے ان تالابوں کے بارے میں پوچھا گیا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہیں اور ان پر (پانی پینے کے لئے) درندے، کتے اور گدھے آتے رہتے ہیں کہ آیا اس سے کوئی چیز پاک کی جاسکتی ہے کہ نہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو ان کے پیٹوں میں آجائے وہ ان کا ہے اور جو باقی بچ جائے وہ ہمارے لئے پاک کرنے والا ہے۔ (ابن ماجہ)

﴿۱۴﴾ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ لَا تَغْتَسِلُوْا بِالْمَاءِ الْمُشَمَّسِ فَاِنَّہٗ یُوْرِثُ الْبَرَصَ۔ (رَوَاہُ الدَّارَ قُطْنِیُّ)[2]

ترجمہ: اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ دھوپ سے گرم کئے ہوئے پانی سے غسل نہ کرو کیونکہ یہ برص (یعنی سفیدی کی بیماری) کا سبب ہوتا ہے۔ (دار قطنی)

[1] اخرجہ ابن ماجہ ۵۱۹ [2] اخرجہ الدار قطنی

۲ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

باب تطهير النجاسات

نجاستوں کے پاک کرنے کا بیان

نجاست طہارت کی ضد کو کہتے ہیں نجاسات کو جمع کے صیغہ سے اس لئے ذکر کیا کہ نجاستوں کی بہت ساری قسمیں ہیں اور اس کے الگ الگ احکام ہیں۔ احکام میاہ اور تطہیر نجاسات کے باب میں فقہی لحاظ سے سب سے زیادہ لمبے چوڑے مسائل بیان ہوئے ہیں۔

لفظ **نجس** باب سمع اور کرم دونوں سے آتا ہے صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ نجس کے جیم پر کسرہ اور فتح دونوں پڑھا جاتا ہے۔ فقہاء کرام کی اصطلاح میں اگر جیم کا کسرہ ہو تو یہ عین اور ذات نجاست کو کہتے ہیں اور اگر جیم کا فتحہ ہو تو یہ عام ہے ذات نجاست کو بھی کہتے ہیں اور اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ نجاست لگی ہوئی ہو۔

الفصل الاول

مسئلة سؤر الكلب

﴿۱﴾ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِيْ إِنَاءِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ طُهُوْرُ إِنَاءِ أَحَدِكُمْ إِذَا وَلَغَ فِيْهِ الْكَلْبُ أَنْ يَغْسِلَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ أُوْلَاهُنَّ بِالتُّرَابِ.)[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا پانی پی لے اس (برتن) کو سات مرتبہ دھو لینا چاہیے (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ "تم میں سے جس کے برتن میں کتا پانی پی جائے اس کو پاک کرنے کی صورت یہ ہے کہ اسے سات مرتبہ دھو ڈالے اور پہلی مرتبہ مٹی سے دھوئے۔"

توضیح: اذا شرب الكلب: کتوں اور درندوں کا کسی برتن میں منہ ڈالنے کیلئے عربی میں کچھ مخصوص الفاظ آتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے:

"ولغ يلغ ولغا وولوغا اذا ادخل الكلب او السبع لسانه فى الماء" حركه فيه ولحس الكلب لحسًا فاذا كان الاناء خاليا فهو لحس واذا كان فيه شيء فهو ولغ".

[1] اخرجه البخارى ۱/۵۴ ومسلم ۱/۱۶۱

یعنی زبان کے کناروں سے درندے اور کتے وغیرہ جو پانی چاٹ کر پیتے ہیں اس کو ولغ کہتے ہیں۔

کتے کے جوٹھے میں اختلاف:

کتے کے جوٹھے سے پاکی کے بارے میں مختلف احادیث آئی ہیں بعض میں "**سبع مرات**" کا ذکر ہے بعض میں آٹھ بار دھونے کا ذکر ہے۔ دار قطنی میں تین یا پانچ یا سات بار دھونے کی روایات بھی ہیں جس میں ہر ایک پر عمل کا اختیار دیا گیا ہے بعض روایات میں دھونے کے ساتھ مٹی ملنے کا ذکر بھی آیا ہے اور بعض میں نہیں ہے پھر بعض روایات میں ابتداء میں مٹی کے استعمال کا حکم ہے بعض میں آخر میں استعمال کا حکم ہے، بعض میں ساتویں بار مٹی کے استعمال کی تعلیم ہے، بعض روایات میں آٹھویں بار مٹی کے استعمال کی بات ہے روایات کے اس اختلاف کی وجہ سے فقہاء کرام میں بھی اختلاف آ گیا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ یہاں دو مسئلوں میں الگ الگ اختلاف ہے۔

ایک اختلاف کتے کے جوٹھے کے پاک اور ناپاک ہونے میں ہے اور دوسرا اختلاف اس سے نجس ہونے کی صورت میں برتن کے طریق **تطہیر** میں ہے پہلے مسئلہ میں جمہور فقہاء ایک طرف ہیں اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف ہیں دوسرے میں جمہور کا آپس میں اختلاف ہے۔[1]

چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے کہ کتے کا جوٹھا پاک ہے پھر ان حضرات پر اعتراض ہوتا ہے کہ جب پاک ہے تو آپ حضرات برتن کے دھونے کو کیوں ضروری قرار دیتے ہیں؟ اس کا جواب یہ حضرات یہ دیتے ہیں کہ یہ دھونا تعبدی حکم ہے یعنی شریعت کا حکم ہے نجاست کی وجہ سے نہیں بلکہ شریعت نے دھونے کا فرمایا ہے تو ہم دھوتے ہیں یہ چیز عقل میں آنے والی نہیں ہے اور یہ نص **غیر معقول المعنی** اور خلاف القیاس ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں کتے کے جوٹھے کی **تطہیر** اور پاکی سات بار دھونے پر موقوف ہے کم سے پاک نہیں ہوگا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کتے کے جوٹھے کی پاکی تین بار دھونے سے حاصل ہو جاتی ہے ہاں سات بار تک مبالغہ کر کے دھونا مستحب ہے۔[2]

دلائل:

کتے کے جوٹھے کے پاک ہونے پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن مجید کی آیت سے استدلال کیا ہے شکاری کتوں کے بارے میں قرآن کا حکم ہے کہ جن کتوں نے شکار کر کے تمہارے لئے روکا ہے تم اس کو کھاؤ۔

"**فکلوا مما امسکن علیکم**" طرز استدلال اس طرح ہے کہ شکار کو جب کتے نے منہ میں پکڑ لیا ہے تو اس کا لعاب ضرور لگا ہوگا اور قرآن میں اس کے کھانے کا ذکر ہے دھونے کا نہیں ہے معلوم ہوا کتے کے جوٹھے سے وہ شکار نجس نہیں ہوا تو

---

[1] المرقات ۲/۱۹۲ [2] المرقات ۲/۱۹۳

اس کا جوٹھا پاک ہوا۔ دوسری دلیل بخاری کی روایت ہے جو صاحب مشکوٰۃ نے فصل ثالث ص ۵۳ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے کہ "کانت الکلاب تقبل وتدبر فی المسجد فی زمان رسول اللہ ﷺ فلم یکونوا یرشون من ذلک"۔[1] تو ظاہر ہے کہ کتے جب مسجد میں آتے جاتے رہتے تھے تو لعاب مسجد میں گرتا ہوگا اور دھونے کا ذکر نہیں تو معلوم ہوا کہ کتے کا جوٹھا پاک ہے۔ تیسری دلیل بخاری شریف کی وہ حدیث ہے جس میں ایک فاجرہ عورت کی مغفرت کا ذکر ہے کہ اس نے اپنے موزہ میں پیاسے کتے کیلئے کنویں سے پانی نکال کر پلایا۔ طرز استدلال اس طرح ہے کہ اس موزہ سے اس عورت نے نماز پڑھی ہوگی اور دھونے کا کوئی ذکر نہیں ہے معلوم ہوا کتے کا جوٹھا پاک ہے۔

جمہور نے کتے کے جوٹھے کی نجاست پر مذکورہ صریح اور صحیح احادیث سے استدلال کیا ہے۔ جمہور فرماتے ہیں کہ نجس ہونے کی وجہ سے طہارت کے حصول کے لئے غسل اور دھونے کے واضح الفاظ موجود ہیں اس کو امر تعبدی پر حمل کرنے کی کیا ضرورت ہے جس میں تحصیل حاصل ہے کہ پاک تو ہے مگر پھر دھوتے ہیں ایسا کیوں نہیں کہتے کہ نجس تھا اس لئے دھونے کا حکم دیا گیا۔

جمہور نے عقلی دلیل بھی پیش کی ہے کہ کتا بدترین نجس ہے اس کا گوشت اتفاقی طور پر حرام ہے تو اس سے پیدا شدہ لعاب کیسے پاک ہوسکتا ہے۔

جواب: امام مالک رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے قرآن کی آیت سے جو استدلال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر "کلوا" کے امر کو کسی قید کے لحاظ کرنے کے بغیر مطلق لو گے تو پھر بتاؤ کہ کچا گوشت کھاؤ گے پروں اور آنتوں اور آلودہ خون کے ساتھ کھاؤ گے؟ کیونکہ قرآن میں "کلوا" آیا ہے یعنی کھاؤ اگر دھونے کی قید نہیں تو ان سب چیزوں کی بھی قید نہیں حالانکہ آیت کا مطلب اقتضاء النص کے طور پر یہ ہے کہ اس شکار کے گوشت کو بنالو، دھولو، پکالو اور پھر کھالو تو بغیر دھوئے کھانے کا ثبوت کہاں سے آیا جب آیت لازمی طور پر مقید ہے تو پھر دھونے کی قید بھی ہے جس سے جوٹھے کی نجاست ثابت ہوگی۔

جہاں تک مسجدوں میں کتوں کی آمد ورفت اور لعاب گرنے کی دلیل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ نئی مسجد تھی ریت کے تودے تھے کوئی چار دیواری نہیں تھی رات کو کتے آجاتے صبح کو لعاب و پیشاب کی جگہ کا پتہ نہیں چلتا تھا گرم ملک تھا سخت دھوپ کی وجہ سے زمین پاک ہوجاتی تھی اور زکاۃ الارض یبسھا پر عمل ہوتا تھا۔[2]

ہم یہاں مالکیہ کو الزامی جواب دیتے ہیں کہ اگر لعاب گرتا تھا اور وہ پاک تھا تو کتے تو پیشاب بھی کرتے ہوں گے اس کے دھونے کا بھی ذکر نہیں وہ بھی پاک ہوگیا؟ علامہ خطابی نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ کتے پیشاب باہر کر کے پھر مسجد میں آجاتے تھے ہم نے کہا "شاباش!!"

باقی اس فاجرہ عورت کے موزے کا معاملہ بھی مطلق نہیں بلکہ دھونے کے ساتھ مقید ہے اگر دھونے کا ذکر نہیں تو دوسری چیزوں کا ذکر بھی وہاں نہیں نیز اس کے ساتھ نماز پڑھنے کا تذکرہ بھی نہیں ہے کہ اس نے اسی کے ساتھ نماز بھی پڑھی تھی۔

---

[1] المرقات ۲/۲۱۲ [2] المرقات ۲/۲۱۲

طریقہ تطہیر میں اختلاف:

کتے کے جوٹھے کے طریقہ تطہیر کے بارے میں جمہور کا آپس میں اختلاف ہے۔

دلائل:

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سات بار دھونا واجب ہے وہ مذکورہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں سات بار کا ذکر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تین بار دھونے سے پاکی حاصل ہوجاتی ہے یہ عام ضابطہ ہے جو کتے کے جوٹھے کو بھی شامل ہے۔ احناف نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جس کو ابن عدی نے اپنی کتاب الکامل میں ذکر کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"اذا ولغ الکلب فی اناء احد کم فلیھرقه ولیغسله ثلاث مرات"۔

نیز احناف نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کے فتویٰ سے استدلال کیا ہے جس میں تین مرتبہ دھونے کا ذکر ہے اور طحاوی اور دار قطنی نے اس کو نقل کیا ہے انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل بھی تین مرتبہ دھونے کا تھا ان روایات سے شوافع کے مستدلات منسوخ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ [1]

جواب: احناف شوافع کو یہ جواب دیتے ہیں کہ سات مرتبہ دھونے کا حکم ابتداء اسلام میں تھا تا کہ کتوں کی نفرت مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھ جائے بعد میں اس حکم میں تخفیف ہوگئی یہ ایک جواب ہو گیا شوافع کی دلیل اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ سات بار دھونے کی روایت استحباب پر محمول ہے اور تین بار دھونے کی روایت فرض پر محمول ہے اس میں ہمارا بھی اختلاف نہیں ہے۔

تیسرا جواب یہ کہ ابتداء بحث میں یہ بات گزر چکی ہے کہ بعض روایات میں تین اور پانچ اور سات بار دھونے میں اختیار بھی دے دیا گیا ہے جیسا دارقطنی کی روایت میں ہے جب اختیار ہے تو سات بار دھونے کو واجب نہیں کہا جا سکتا ہے۔

چوتھا جواب یہ کہ تین بار دھونا حصول طہارت کے لئے ہے اور سات بار طب وحکمت اور علاج کے لئے ہے اسی وجہ سے آخر میں مٹی کا ذکر آیا ہے کیونکہ مٹی میں اجزائے نوشادر شامل ہیں جس سے کتے کے منہ کے جراثیم خاص طور پر مرجاتے ہیں اسی وجہ سے اس حکمت کی تحقیق جب ایک ڈاکٹر نے کی تو وہ مسلمان ہو گیا کہ یہ حکمت صرف وحی سے معلوم ہوسکتی ہے۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ اغلظ النجاسات خنزیر کا جوٹھا اور اس کی غلاظت، خود کتے کی غلاظت، حیض کا خون اور دیگر نجاسات سب تین بار دھونے سے پاک ہوجاتے ہیں تو کتے کا جوٹھا کیوں پاک نہیں ہوتا؟ حالانکہ اس میں تو اختلاف بھی ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کو پاک کہتے ہیں۔

آخر میں الزامی جواب یہ ہے کہ اگر نہیں مانتے ہو تو حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایت میں آٹھ بار دھونے کا ذکر ہے تتریب کا ذکر بھی ہے تو آپ نے خود حدیث پر پورا عمل نہیں کیا ہے۔ [2]

---

[1] المرقات ۲/۱۹۳ [2] المرقات ۱۹۳،۱۹۴/۲

لطیفہ:
اگر کسی کتے نے کسی کا کپڑا منہ میں دبالیا تو اگر غصہ کی حالت میں دبایا ہے تو کپڑا نجس نہیں ہوگا اور اگر پیار سے دبایا تو نجس ہو جائے گا وجہ فرق یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں لعاب خشک ہو جاتا ہے نیز غصہ میں دانت کام کرتے ہیں جس میں لعاب نہیں اور پیار سے چومنے میں لعاب بھی زیادہ ہوتا ہے اور ہونٹوں سے پیار کر کے پکڑتا ہے جس سے لعاب لگ کر کپڑا نجس ہو جاتا ہے۔

مسئلۃ تطہیر الارض

﴿۲﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَامَ أَعْرَابِيٌّ فَبَالَ فِي الْمَسْجِدِ فَتَنَاوَلَهُ النَّاسُ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم دَعُوْهُ وَهَرِيْقُوْا عَلٰى بَوْلِهٖ سَجْلاً مِنْ مَاءٍ أَوْ ذَنُوْبًا مِنْ مَاءٍ فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[1]

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ایک دیہاتی نے مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا (یہ دیکھ کر) لوگ اس کے پیچھے پڑنے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے چھوڑ دو اور ایک ڈول پانی اس کے پیشاب پر بہادو (پھر آپ نے فرمایا) تم لوگ آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو تنگی کرنے والے نہیں''۔ (بخاری)

توضیح: **قام اعرابی:** عرب کے صحرا نشینوں کو اعراب کہتے ہیں اس کی طرف نسبت اعرابی ہے یعنی دیہاتی بادیہ نشین۔ اس دیہاتی کا نام بعض نے ذوالخویصرۃ بتایا ہے یہ ایک گنوار آدمی تھا ترمذی کی روایت میں ہے کہ اس نے مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے بعد دعا میں کہا "**اللھم ارحمنی وارحم محمدًا ولا ترحم معنا احدًا**"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے وسیع رحمت کو بند کرنے کی کوشش کی اس کے کچھ دیر بعد اس شخص نے کھڑے ہو کر مسجد میں پیشاب کیا یہ شخص بعد میں خوارج کا سرغنہ بن گیا بعض نے کہا کہ اس شخص کا نام اقرع بن حابس تھا۔

بہرحال اس جیسی حدیثوں میں منکرین حدیث پرویزی لوگ مضحکہ اڑاتے ہیں اور صحیح حدیثوں کا انکار کرتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی عقلمند مسجد میں پیشاب کرے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب کرنے کی مہلت اور اجازت کیسے دے دی معلوم ہوا یہ داستانیں ہیں حدیث نہیں۔

ان عقل کے اندھوں نے اس پرانے زمانے کی سوسائٹی اور ماحول کو آج کے ماحول پر قیاس کیا حالانکہ اس وقت مسجد کی کچی زمین تھی مسجد اور غیر مسجد کی زمین کا امتیاز مشکل تھا آدمی نو وارد اور نو مسلم تھا اور ناواقف بھی تھا مسجد کی زمین سو گز رقبہ پر محیط تھی کچھ آباد تھی باقی غیر آباد اور بغیر چار دیواری کی تھی مٹی اور ریت کے تودے پڑے تھے یہ شخص احکام سیکھنے کی غرض سے قریب میں کھڑا ہوگیا کہ جلدی فارغ ہو جاؤں گا ان کو معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ مسجد ہے اب اگر اس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھگا دیتے تو

[1] اخرجه البخاری ۶۱/۵

مزید جگہیں پیشاب سے آلودہ ہوجاتیں اور پیشاب روک کر خطرناک بیماری کا خطرہ بھی تھا جگہ ناپاک ہوچکی تھی دھونا لازم تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا اب اس کو مت روکو پیشاب کرنے دو بعد میں جگہ دھولیں گے یہ صحیح نقشہ ہے اب اگر کوئی شخص نقشہ خراب کرنا چاہتا ہے اور مسئلہ اور واقعہ صحابہ کے زمانے کا لیا اور ماحول آج کل کے زمانے کا لیا تو یہ ایک آدمی کی گمراہی کے لئے کافی ہے۔

تناوله الناس: یعنی لوگوں نے زبان سے اس کو گھیر لیا ان پر آوازیں کسیں روکنے کے لئے کہا۔[1]

مه مه: مت کر مت کر اس کو ڈانٹا یہ سب تناول کا مفہوم ہے ہاتھوں سے پکڑ کر مارنا مراد نہیں ہے۔ پشتو میں کہتے ہیں۔ **"مه کوه مه کوه"**۔[2]

ذنوبا: بڑے ڈول کو ذنوب کہتے ہیں جس میں خوب پانی بھرا ہوا ہو۔[2]

زمین کی طہارت کے طریقہ میں فقہاء کا اختلاف:

جمہور فرماتے ہیں کہ اگر زمین ناپاک ہوجائے تو اس کو پاک کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ پانی سے اس کو دھویا جائے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ناپاک زمین کے پاک کرنے کے تین طریقے ہیں اول یہ کہ پانی سے دھویا جائے یہ اتفاقی صورت ہے۔ دوسرا یہ کہ اس حصہ کی مٹی کو کھود کر نکالا جائے اور نئی مٹی لا کر وہاں بھر دی جائے۔ تیسرا طریقہ یہ کہ دھوپ سے زمین کو خشک ہونے دیا جائے۔ خشک ہونے سے زمین پاک ہوجاتی ہے۔

اب اگر مسجد کے وسط میں کسی نے پیشاب کیا تو اس کو دیکھا جائے گا اگر فرش پکا ہے تو کپڑا یا تولیہ لے کر پہلے اسے خشک کرے پھر کپڑا دھو کر پانی میں بھگو کر اس نجس جگہ پر مل لیا جائے دو تین مرتبہ ملنے سے جگہ پاک ہوجائے گی وسط مسجد میں پانی بہا کر پورے فرش پر پھیلانا اور پھر دھونا صحیح نہیں ہے اور اگر پیشاب مسجد کے پکے فرش کے کنارے پر ہے تو اس جگہ کو ہر حال میں دھو کر پانی باہر کی طرف گرایا جائے گا اور اگر فرش کچا ہے تو اگر مٹی مضبوط ہے تو اسے کھود کر باہر پھینکا جائے اور پاک مٹی وہاں بھر دی جائے اور اگر مٹی ریتلی ہے اور پانی اس میں جذب ہوسکتا ہے تو اس پر پانی ڈال دیا جائے اور جذب ہونے تک انتظار کیا جائے تین دفعہ ایسا کرنے سے زمین پاک ہوجائے گی اور اگر دھوپ پڑتی ہے تو سوکھ جانے سے بھی زمین پاک ہوجاتی ہے البتہ جمہور اس کا انکار کرتے ہیں۔

دلائل:

جمہور نے زیر بحث حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں پانی استعمال کرنے کا ذکر ہے۔ احناف اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ کتے مسجد نبوی میں آتے جاتے رہتے تھے اور اس کو دھویا نہیں جاتا تھا

[1] المرقات ۲/۱۹۴ [2] المرقات ۲/۱۹۴

احناف کہتے ہیں کہ یہ "ذکوٰۃ الارض یبسھا" پر عمل ہوتا تھا احناف نے مصنف ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت سے بھی استدلال کیا ہے جو محمد بن حنفیہ کا اثر ہے فرماتے ہیں "اذا جفت الارض فقد ذکت" یعنی جب زمین سوکھ جاتی ہے تو پاک ہو جاتی ہے۔

ہاں ایسی زمین پر نماز تو پڑھی جاسکتی ہے لیکن اس پر تیمم نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ تیمم میں قرآن کریم کے اندر نص قطعی کے ساتھ پاک مٹی کی قید لگائی گئی ہے اور ذکوٰۃ الارض یبسھا خبر واحد ہے جو تیمم کے جواز کے لئے کافی نہیں ہے۔[1]

﴿۳﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ فِي الْمَسْجِدِ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ إِذْ جَاءَ أَعْرَابِيٌّ فَقَامَ يَبُوْلُ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وسلم مَهْ مَهْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا تُزْرِمُوْهُ دَعُوْهُ فَتَرَكُوْهُ حَتّٰى بَالَ ثُمَّ إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ دَعَاهُ فَقَالَ لَهُ إِنَّ هٰذِهِ الْمَسَاجِدَ لَا تَصْلُحُ لِشَيْءٍ مِنْ هٰذَا الْبَوْلِ وَالْقَذَرِ إِنَّمَا هِيَ لِذِكْرِ اللهِ وَالصَّلَاةِ وَقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ أَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قَالَ وَأَمَرَ رَجُلًا مِنَ الْقَوْمِ فَجَاءَ بِدَلْوٍ مِنْ مَاءٍ فَسَنَّهُ عَلَيْهِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک روز) ہم سرکار دو عالم ﷺ کے پاس مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک ایک دیہاتی آیا اور مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا (یہ دیکھ کر) آنحضرت ﷺ کے صحابہ اس سے کہنے لگے کہ ٹھہر جا! ٹھہر جا! آنحضرت نے (یہ سن کر) فرمایا کہ اسے پیشاب کرنے سے نہ روکو بلکہ اسے چھوڑ دو اور پیشاب کرنے دو (کیونکہ اگر تمہارے دھمکانے سے اس کا پیشاب رک گیا تو یہ اس کے لئے تکلیف دہ ہوگا یا پھر اس طرح اس کا پیشاب جو ایک ہی جگہ ہے کئی جگہ پھیل جائے گا) صحابہ نے اسے چھوڑ دیا اور اس دیہاتی نے (جب پورا) پیشاب کر لیا تو آنحضرت ﷺ نے اسے بلایا اور (نہایت شفقت و مہربانی سے) فرمایا کہ مسجدیں پیشاب و گندگی وغیرہ کے لئے نہیں ہیں بلکہ ذکر الٰہی اور نماز و قرآن پڑھنے کے لئے ہیں یا آپ نے اس کے مثل فرمایا (یعنی راوی کو شک ہو رہا ہے کہ آپ نے اعرابی سے یہی الفاظ فرمائے تھے یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے مجلس میں سے ایک شخص کو حکم دیا اس نے ایک ڈول پانی لا کر پیشاب پر بہا دیا۔ (بخاری و مسلم)

﴿۴﴾ وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ قَالَتْ سَأَلَتِ امْرَأَةٌ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَرَأَيْتَ إِحْدَانَا إِذَا أَصَابَ ثَوْبَهَا الدَّمُ مِنَ الْحَيْضَةِ كَيْفَ تَصْنَعُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا أَصَابَ ثَوْبَ إِحْدَاكُنَّ الدَّمُ مِنَ الْحَيْضَةِ فَلْتَقْرُصْهُ ثُمَّ لِتَنْضَحْهُ بِمَاءٍ ثُمَّ لِتُصَلِّ فِيْهِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[3]

[1] المرقات ۲/۱۹۳،۱۹۵،۱۹۶ [2] اخرجه البخاری ۱/۶۵ ومسلم ۱/۱۶۳ [3] اخرجه البخاری ۱/۶۶ ومسلم ۱/۱۶۶

ترجمہ: حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے سرکار دو عالم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ بتایئے کہ اگر ہم میں سے کوئی حیض کا خون کپڑے پر لگا ہوا پائے تو کیا کرے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کے کپڑے پر حیض کا خون لگ جائے تو اسے چاہیئے کہ (پہلے) چٹکیوں سے اسے ملے پھر پانی سے دھولے اور اسی کپڑے سے (خواہ وہ تر ہی کیوں نہ ہو) نماز پڑھ لے۔ (بخاری و مسلم)

مسئلة المني

﴿۵﴾ وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنِ الْمَنِيِّ يُصِيبُ الثَّوْبَ فَقَالَتْ كُنْتُ أَغْسِلُهُ مِنْ ثَوْبِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَيَخْرُجُ إِلَى الصَّلَاةِ وَأَثَرُ الْغَسْلِ فِي ثَوْبِهِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: حضرت سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کپڑے پر لگی ہوئی منی کے بارے میں پوچھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ میں سرکار دو عالم ﷺ کے کپڑے سے منی دھویا کرتی تھی چنانچہ آپ (جب اس گیلے کپڑے کے ساتھ) نماز کے لئے تشریف لے جاتے تو اس کپڑے پر دھونے کا نشان رہتا تھا۔
(بخاری و مسلم)

﴿۶﴾ وَعَنِ الْأَسْوَدِ وَهَمَّامٍ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ أَفْرُكُ الْمَنِيَّ مِنْ ثَوْبِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ۔
(رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَبِرِوَايَةِ عَلْقَمَةَ وَالْأَسْوَدِ عَنْ عَائِشَةَ نَحْوَهُ ثُمَّ يُصَلِّي فِيهِ)[2]

ترجمہ: حضرت اسود اور حضرت ہمام رحمہما اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا میں سرکار دو عالم ﷺ کے کپڑے سے (خشک) منی کھرچ دیا کرتی تھی (مسلم) اور مسلم نے اس کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضرت علقمہ رحمہ اللہ اور حضرت اسود رحمہ اللہ کی ہی طرح کی ایک روایت بھی نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ اسی کپڑے سے نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

توضیح: سألت عائشه عن المني: مندرجہ بالا دونوں حدیثوں کا تعلق منی سے ہے کہ آیا یہ پاک ہے یا نجس ہے اور اس کے ازالہ اور تطہیر کا طریقہ کیا ہے۔ سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شاگرد ہیں اس لئے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منی کے متعلق پوچھا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جواب دیا ہے دونوں روایتوں کا تعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہے۔ یہ کلام پردہ میں ہوتا تھا۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اصح قول کے مطابق منی پاک ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک منی نجس ہے ہاں ان دونوں میں آپس میں اتنا فرق ہے کہ امام صاحب کے ہاں اگر منی

[1] اخرجه البخاري ۱/۶۷ ومسلم ۱/۱۶۵ [2] اخرجه مسلم ۱/۱۶۵

کپڑے پر سوکھ جائے اور پھر کھرچ لی جائے تو کپڑا پاک ہو جائے گا یہ بھی تطہیر کا ایک طریقہ ہے اور اگر منی تر ہو تو ہر حال میں دھونا لازم ہے لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ منی تر ہو یا خشک ہو ہر حال میں اس کا دھونا فرض ہے کھرچنے سے کپڑا پاک نہیں ہوگا۔[1]

دلائل:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے استدلال میں فرماتے ہیں:

① کہ حدیث میں منی کے ازالہ کے بارے میں "حکٌ اور حتٌّ" کے الفاظ آئے ہیں جو رگڑنے اور کھرچنے کے معنی میں ہیں اور یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ کھرچنے سے پوری نجاست اکھڑ نہیں جاتی بلکہ کچھ باقی رہ جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھرچنے پر اکتفا فرمایا ہے معلوم ہوا منی پاک ہے تب ہی تو اس کے قلیل اجزاء کو برداشت کیا گیا ہے۔

① گویا منی پستان کے دودھ کی طرح ہے۔

② منی سے ماں کے پیٹ میں بچہ غذا حاصل کرتا ہے تو اس کو پاک ماننا ہوگا۔

③ نیز اس سے اولیاء وانبیاء پیدا ہوئے ہیں تو اولیاء وانبیاء کی بنیاد اور اصل کو کیسے نجس کہو گے؟

④ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کو دار قطنی نے اس طرح نقل کیا ہے:

"سئل النبی ا عن المنی یصیب الثوب فقال انما هو بمنزلة المخاط والبزاق"۔

یعنی منی کی تشبیہ آپ نے ناک کی آلائش رینٹھ سے دی ہے ظاہر ہے رینٹھ پاک ہے تو منی بھی پاک ہے۔[2]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی حدیث سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منی کے ساتھ نماز پڑھی ہو ہاں منی کے ازالہ کے طریقے مختلف ہیں کبھی غسل اور دھونے سے زائل کی گئی ہے کبھی خشک ہونے کی صورت میں "حك" "حت" اور کبھی "فرك" کے طریقہ سے اس کا ازالہ کیا گیا ہے ازالہ کی جو صورت بھی ہو یہ بات طے ہے کہ منی کے ساتھ کبھی نماز نہیں پڑھی گئی ہے جو اس کی نجاست کی بڑی دلیل ہے اگر یہ پاک ہوتی تو بیان جواز کے لئے ایک آدھ مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازالہ کے بغیر اس کے ساتھ نماز پڑھتے پڑھاتے، معلوم ہوا کہ منی نجس ہے۔

اگر شوافع یہ کہہ دیں کہ "حک" "فرک" اور "حت" سے منی کا ازالہ بالکلیہ نہیں ہوتا ہے کچھ اجزاء باقی رہتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حک وغیرہ پر اکتفاء کیا ہے معلوم ہوا یہ پاک ہے۔ اس کا الزامی جواب احناف یہ دیتے ہیں کہ قضاء حاجت کے بعد استنجاء بالاحجار آپ مانتے ہو حالانکہ احجار سے مکمل ازالہ نہیں ہوتا ہے نجاست کے ذرات باقی رہتے ہیں جس کو قلیل ہونے کی وجہ سے برداشت کیا گیا ہے لہٰذا آپ حضرات انسانی غلاظت کو بھی پاک کہدیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ احناف کے ہاں قدر درہم سے کم نجاست معاف ہے لیکن شوافع کے ہاں نجاست کی کوئی مقدار معاف نہیں ہے۔ اسی لئے وہ مجبور ہوئے اور ان کو کہنا پڑا کہ منی پاک ہے لیکن استنجاء بالاحجار میں وہ کیا کریں گے۔ یہ بات یاد رہے کہ ملائم

---

[1] المرقات ۱۹۶،۱۹۷/۲ [2] المرقات ۱۹۹/۲

اشیاء سے نجاست کے پونچھنے اور رگڑنے سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے جیسے آئینہ چاقو تلوار موزہ وغیرہ ان ملائم اشیاء کی پاکی کے شوافع بھی قائل ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کو نہ دھویا گیا وہ پاک ہے احناف اور مالکیہ نے ترمذی کی اس واضح حدیث سے استدلال کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"واغسله اذا كان رطبا وافركه ان كان يابسا"۔

صحیح ابو عوانہ اور امام طحاوی نے بھی اسی قسم کی روایت نقل فرمادی ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ:

"كنت افرك المنى من ثوب رسول الله ﷺ اذا كان يابسا واغسله اذا كان رطبا"۔

شوافع حضرات نے جو دلائل پیش کئے ہیں اس کے جوابات احناف اس طرح دیتے ہیں۔[1]

جوابات: منی کو پستان کے دودھ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے کیونکہ دودھ کے نکلنے کا راستہ اور ہے اور منی کے نکلنے کا راستہ اور ہے۔ دودھ کا راستہ پاک ہے اور منی کے نکلنے کا راستہ پیشاب اور مذی اور ودی جیسے نجس اشیاء کے خروج کا راستہ ہے نیز ایک حلال طعام جب پیٹ میں منقلب ہو کر گوبر بن جاتا ہے تو وہ نجس سمجھا جاتا ہے اسی طرح منی بھی طعام سے مبدل ہو کر نجس ہو جاتی ہے نیز خروج منی موجب حدث ہے اور جو چیز موجب حدث ہے وہ نجس ہے تو منی بھی نجس ہے بلکہ یہ تو حدث اصغر نہیں حدث اکبر کو واجب کرتی ہے۔

باقی بچے کی غذا کی جو بات ہے تو اس سے منی کی طہارت پر دلیل نہیں لائی جاسکتی ہے کیونکہ بچہ تو دم حیض سے بھی غذا حاصل کرتا ہے تو کیا حیض کا خون بھی پاک ہوگا۔ باقی ان حضرات کی یہ دلیل کہ منی سے اولیاء اور انبیاء پیدا ہوئے ہیں تو سن لو کہ منی کی تحلیل دم کی طرف ہے دم کی تحلیل گوشت کی طرف ہے اور گوشت کی تحلیل وتحویل ہڈی کی طرف ہے تو اس تحویل وتحول اور تبدیل وتبدل اور ماہیت کے تغیر کی وجہ سے شے پاک ہو جاتی ہے۔

باقی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے منی کی تشبیہ رینٹھ سے جو دی ہے تو یہ پاکی میں نہیں ہے بلکہ طریقۂ ازالہ کو بتایا ہے کہ میں اس کو رینٹھ کی طرح ہٹاتا ہوں تو وہ زائل ہو جاتی ہے رینٹھ کی طرح سخت ہے غلیظ ہے چپکنے والی چیز ہے ہٹانے سے پوری ہٹ جاتی ہے یاد رہے موجودہ زمانہ میں منی کی یہ کیفیت نہیں رہی بلکہ چائے وغیرہ غیر معیاری خوراک کی وجہ سے منی پتلی ہوتی ہے تو اب اس کے ازالہ کے لئے پانی ہی استعمال کرنا چاہیئے۔ ویسے بھی احتیاط احناف ومالکیہ کے مسلک میں ہے۔

مسئلة غسل بول الغلام

﴿۷﴾ وَعَنْ أُمِّ قَيْسٍ بِنْتِ مِحْصَنٍ أَنَّهَا أَتَتْ بِابْنٍ لَهَا صَغِيْرٍ لَمْ يَأْكُلِ الطَّعَامَ إِلَى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَأَجْلَسَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فِيْ حِجْرِهِ فَبَالَ عَلَى ثَوْبِهِ فَدَعَا بِمَاءٍ فَنَضَحَهُ وَلَمْ يَغْسِلْهُ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

[1] المرقات ۲/۱۹۹ [2] اخرجه البخاری ۱/۶۶ ومسلم ۱/۱۶۳

ترجمہ: حضرت ام قیس بنت محصن رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ وہ اپنے چھوٹے لڑکے کو جو ابھی کھانا نہیں کھاتا تھا سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں لائیں آنحضرت ﷺ نے اس بچہ کو اپنی گود میں بٹھالیا اس نے آپ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا آنحضرت ﷺ نے پانی منگوایا اور کپڑے پر بہادیا اور خوب مل کر نہیں دھویا۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: چھوٹا شیر خوار بچہ یا بچی جس نے ابھی تک دودھ کے سوا کھانا شروع نہ کیا ہو اس کے پیشاب کے بارے میں سب علماء کا اتفاق ہے کہ ناپاک ہے صرف داؤد ظاہری نے لڑکے کے پیشاب کو پاک کہا ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں ہے ہاں فقہاء کا لڑکے کے پیشاب کے طریقہ تطہیر میں اختلاف ہے جس سے وہم ہوتا ہے کہ شوافع کے ہاں لڑکے کا پیشاب پاک ہے یہ وہم صحیح نہیں ہے کیونکہ شوافع کی کتابوں میں اس کے ناپاک ہونے کی تصریح موجود ہے۔

بول الغلام کے بارے میں احادیث میں مختلف الفاظ آئے ہیں کہیں "**رشح الماء**" ہے کہیں "**نضح الماء**" کا لفظ ہے کہیں "**رش الماء**" کا ذکر ہے کہیں "**اتباع الماء**" کے الفاظ ہیں اور کہیں "**صب الماء**" اور کہیں "**لم یغسله غسلا**" کا جملہ ہے اسی اختلاف کی وجہ سے فقہاء کرام میں بھی اس کے طریقہ تطہیر میں اختلاف آگیا ہے۔

فقہاء کا اختلاف:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بول غلام پر صرف چھینٹے مارنا کافی ہے دھونے کی ضرورت نہیں ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دھونا ضروری ہے لیکن خفیف غسل کافی ہے۔ غسل خفیف کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ احادیث میں **رشح، رش، نضح، صب** اور **لم یغسله غسلا** کے مختلف الفاظ آئے ہیں تو اس کے لئے ایسا معنی لینا چاہیے جو سب الفاظ پر صادق آجائے اور وہ غسل خفیف کے الفاظ ہے جو تمام الفاظ پر صادق آتا ہے اور تمام روایات کا تعارض بھی ختم ہو جاتا ہے شوافع اور حنابلہ نے بہت احتجاج کیا کہ صریح حدیث ہے جس کے احناف و مالکیہ خلاف جارہے ہیں۔ [1]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بچے کا پیشاب پاک ہے یا نجس؟ اگر نجس مانتے ہو تو پھر چھینٹے مارنے سے نجاست مزید پھیلے گی جو مزید تلویث کا باعث ہے لہٰذا ان الفاظ سے غسل خفیف کا معنی لینا بہت ضروری ہے شوافع حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ام قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں "**فنضحه ولم یغسله**" الفاظ آئے ہیں جس میں نضح کے بعد غسل کی صریح نفی ہے اور نضح کو چھینٹے مارنے کے سوا کسی اور معنی میں نہیں لیا جاسکتا ہے دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔

جواب: احناف اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ نضح سے مراد غسل خفیف ہے اور **لم یغسله** سے مراد مبالغہ کے ساتھ دھونے کی نفی ہے کیونکہ مسلم شریف کی روایت میں "**لم یغسله غسلا**" کے الفاظ آئے ہیں تو مفعول مطلق تاکید کے لئے آیا ہے اور نفی اسی تاکید کی طرف متوجہ ہے جو مؤکد اور تاکید کا معروف قاعدہ ہے یعنی "**لم یغسله غسلا مؤکدا**"۔

[1] المرقات ۲/۲۰۰،۲۰۱

نیز ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے "فصب الماء ولم یغسله" اور صب کا لفظ عربی میں بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے آیت میں ہے "انا صببنا الماء صبا" جب بہانے کا لفظ موجود ہے تو پھر صرف رش یا رشح یا نضح سے کام نہیں بنے گا نیز نضح کا لفظ عربی میں دھونے کے لئے بھی آتا ہے چنانچہ اس سے پہلے اسی باب میں اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں "ثم لتنضحه" کا لفظ حیض کے خون دھونے کے لئے آیا ہے جبکہ وہاں چھینٹے مارنے کا معنی نہیں لیا جا سکتا ہے۔ بہر حال غسل خفیف سے تمام احادیث پر عمل بھی ہو جاتا ہے اور نجاست کے دھونے کا شرعی ضابطہ بھی محفوظ رہ جاتا ہے اور احتیاط پر عمل بھی ہو جاتا ہے تو یہ بہتر ہے باقی لڑکی کے پیشاب دھونے کا ضابطہ وہی ہے جو عام نجاست کا ہے اب سوال یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے پیشاب میں کیا فرق ہے کہ شریعت نے ایک میں سہولت دی ہے دوسرے میں نہیں دی ہے جس پر عورتیں احتجاج کر رہی ہیں کہ ہمارے حقوق پامال ہو گئے۔

علماء نے اس کا ایک جواب یہ دیا ہے کہ طبیعت اور مزاج کے فرق کی وجہ سے مسئلہ کی حیثیت میں فرق آگیا ہے لڑکی کے پیشاب میں تعفن اور بدبو ہوتی ہے لڑکے میں ایسا نہیں ہے لیکن بہتر جواب وہ ہے جو شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے لمعات میں دیا ہے کہ یہ فرق دراصل لوگوں کی عادت اور مجبوری کی وجہ سے ہے کیونکہ لڑکوں کو مجلسوں میں لایا جاتا ہے کندھوں پر اٹھایا جاتا ہے گود میں بٹھایا جاتا ہے تو اس میں مشقت اور حرج ہے کہ ان کے پیشاب کو بار بار مبالغہ کے ساتھ دھویا جائے لہٰذا شریعت نے لڑکے میں سہولت دی ہے اور لڑکیوں میں یہ حرج اور مجبوری نہیں ہے لہٰذا اس میں سہولت نہیں دی ہے عورتوں کو اپنے ہر حصہ اور قسمت پر صبر کرنا چاہئے جو شریعت نے ان کو دی ہے اس پر شکر کرنا چاہیے تقسیم کرنے والے ہم نہیں شریعت ہے۔[1]

مردار کھالوں کی دباغت کا حکم

﴿۸﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ إِذَا دُبِغَ الْإِهَابُ فَقَدْ طَهُرَ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[2]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب چمڑا دباغت دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔ (مسلم)

توضیح: اذا دبغ الاهاب: دباغت کی تعریف اس طرح ہے: الدباغ هو اصلاح الجلد بما يمنع النتن والفساد۔

دباغت کئی طریقہ سے ہوتی ہے تتریب یعنی مٹی سے، تشمیس یعنی دھوپ میں ڈالنے سے تقریظ یعنی بعض درخت کے چھلکوں سے اور نمک ملنے سے ہوتی ہے۔ دباغت کے لئے ضروری ہے کہ کھال قابل دباغت بھی ہو لہٰذا سانپ اور چوہے کی کھال ناقابل دباغت ہونے کی وجہ سے اس حکم سے خارج ہے پھر حلت وحرمت اور دباغت کا یہ حکم مردار جانوروں کی کھالوں کے لئے ہے حلال تو حلال ہے۔ انسان کی کھال بوجہ عظمت اور خنزیر کی کھال بوجہ سخت نجاست قابل دباغت نہیں ہے۔

[1] اشعة اللمعات ۲/۲۷۲ [2] اخرجه مسلم ۱/۱۹۱

فقہاء کا اختلاف:

انسان اور خنزیر کی کھال کے علاوہ جمہور فقہاء کے ہاں ہر کھال دباغت سے پاک ہوجاتی ہے اور اس سے انتفاع لینا جائز ہے انسان کی کھال انسانی شرافت کی وجہ سے ممنوع ہے اور خنزیر نجس العین ہونے کی وجہ سے ممنوع اور ناپاک ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے کتے کی کھال کے بارے میں لکھا ہے کہ چونکہ کتا نجس العین ہے لہٰذا اس کی کھال بھی دباغت سے پاک نہ ہوگی۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک دباغت سے مردار جانور کی کھال پاک نہیں ہوتی ہے لہٰذا اس سے انتفاع ناجائز ہے۔[1]

دلائل:

جمہور نے زیر بحث حدیث کے علاوہ تقریباً آنے والی چھ حدیثوں سے استدلال کیا ہے جس میں واضح طور پر مردار کی کھال سے استفادہ اور انتفاع کو جائز کہا گیا ہے جبکہ دباغت ہوجائے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عکیم رضی اللہ عنہ کی آنے والی روایت سے استدلال کیا ہے جس میں "ان لا تنتفعوا من المیتة باھاب ولا عصب" کے الفاظ آئے ہیں۔[2]

جواب: جمہور نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ مردار جانور کی وہ کھال ہے جس کو دباغت نہیں دی گئی ہو اور اھاب لغت میں اسی غیر مدبوغ کھال کو کہتے ہیں۔

نیز امت کا تعامل بھی جواز پر ہے اور اس ایک حدیث کے مقابلے میں بہت ساری حدیثیں ہیں جو تواتر کے قریب ہیں یہ حدیث ان کی معارض نہیں ہوسکتی ہے۔[3]

ولا عصب: پٹھوں کا حکم بھی کھال کی طرح ہے اس لئے کہ پٹھوں میں حیات ہے کیونکہ اس کے کاٹنے سے درد ہوتا ہے اور ہڈی میں حیات نہیں ہے اس کا حکم کھال کی طرح نہیں جن حضرات نے پٹھوں میں حیات کا انکار کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔[4]

﴿۹﴾ وَعَنْهُ قَالَ تُصُدِّقَ عَلٰى مَوْلَاةٍ لِمَيْمُوْنَةَ بِشَاةٍ فَمَاتَتْ فَمَرَّ بِهَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَقَالَ هَلَّا أَخَذْتُمْ إِهَابَهَا فَدَبَغْتُمُوْهُ فَانْتَفَعْتُمْ بِهٖ فَقَالُوْا إِنَّهَا مَيْتَةٌ فَقَالَ إِنَّمَا حُرِّمَ أَكْلُهَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[5]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک آزاد کردہ باندی کو ایک بکری صدقہ میں دی گئی (اتفاق سے) وہ بکری مرگئی۔ آنحضرت ﷺ کا اس پر گزر ہوا آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کا چمڑا نکال کیوں نہ لیا اس چمڑے کو دباغت دے کر اس سے نفع اٹھالیتے لوگوں نے عرض کیا کہ یہ تو مردار ہے آپ نے فرمایا صرف اس کا کھانا حرام ہے۔ (بخاری ومسلم)

﴿۱۰﴾ وَعَنْ سَوْدَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ مَاتَتْ لَنَا شَاةٌ فَدَبَغْنَا مَسْكَهَا ثُمَّ مَا زِلْنَا نَنْبِذُ فِيْهِ حَتّٰى صَارَ شَنًّا۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[6]

---

[1] المرقات ۲/۲۰۱　[2] المرقات ۲/۲۰۸　[3] المرقات ۲/۲۰۸　[4] المرقات ۲/۲۰۸　[5] اخرجہ البخاری ۲/۱۰۷ ومسلم ۱/۱۹۰　[6] اخرجہ البخاری ۸/۱۶۳

ترجمہ: سرکار دو عالم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ ہماری ایک بکری مرگئی تھی ہم نے اس کی کھال نکال کر دباغت دے لی اور ہمیشہ اسی میں نبیذ (یعنی پانی اور کھجوروں کا شربت) بناتے رہے یہاں تک کہ وہ پرانی مشک ہوگئی۔ (بخاری)

الفصل الثانی

لڑکی کا پیشاب مکمل دھونا ہوگا

﴿۱۱﴾ وَعَنْ لُبَابَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ قَالَتْ كَانَ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ فِي حِجْرِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَبَالَ عَلَى ثَوْبِهِ فَقُلْتُ الْبَسْ ثَوْبًا وَأَعْطِنِي إِزَارَكَ حَتّٰى أَغْسِلَهُ فَقَالَ إِنَّمَا يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْأُنْثٰى وَيُنْضَحُ مِنْ بَوْلِ الذَّكَرِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ عَنْ أَبِي السَّمْحِ قَالَ يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْجَارِيَةِ وَيُرَشُّ مِنْ بَوْلِ الْغُلَامِ.[1]

ترجمہ: حضرت لبابہ بنت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ حسین بن علی رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ کی گود میں تھے کہ اس نے آنحضرت ﷺ کے کپڑے پر پیشاب کیا میں نے عرض کیا کہ آپ (دوسرا) کپڑا پہن کر یہ تہ بند مجھے دے دیجئے تاکہ میں اسے دھو ڈالوں آپ نے فرمایا لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی کا چھینٹا دینا کافی ہے (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ) اور ابوداؤد و نسائی کی ایک روایت میں ابو سمح سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر چھینٹا دیا جاتا ہے۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

راستے کی گندگی کا حکم

﴿۱۲﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا وَطِئَ أَحَدُكُمْ بِنَعْلِهِ الْأَذٰى فَإِنَّ التُّرَابَ لَهُ طَهُوْرٌ.
(رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَلِابْنِ مَاجَه مَعْنَاهُ)[2]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے جوتوں کے ساتھ گندگی پر چلے تو مٹی اس کو پاک کردینے والی ہے (ابوداؤد) اور ابن ماجہ نے بھی اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔

توضیح: **اذا وطئ:** اگر جوتے یا موزے کے ساتھ راستے کی گندگی لگ جائے تو اس کے حکم میں ائمہ کا اختلاف ہے تفصیل اس طرح ہے کہ یہ نجاست **ذی جرم مجسد** یعنی تہہ جمنے والی ہوگی یا رقیق ہوگی۔ اگر شراب یا پیشاب یا خون کی طرح رقیق اور نرم ہے تو سب کے نزدیک جوتے اور موزے کو پانی سے دھونا پڑے گا بغیر دھوئے پاک نہیں ہوگا۔ اور اگر نجاست ذی جسد ہو اور اس پر مٹی وغیرہ ڈال کر خوب جذب ہوجائے اور پھر کھرچا جائے تو اس صورت میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

---

[1] اخرجہ احمد ۶/۳۳۹ وابوداؤد ۳۷۵ وابن ماجہ ۵۲۲ [2] اخرجہ ابوداؤد ۳۸۶ وابن ماجہ

فقہاء کا اختلاف:

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، اوزاعی شام اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ نجاست رطب ہو یا خشک ہو دونوں صورتوں میں رگڑنے سے پاکی حاصل ہو جائے گی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول بھی یہی ہے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ایک قول میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر یہ نجاست خشک ہو تو رگڑنے سے پاکی آجائے گی اور اگر تر اور رطب ہو تو دھونے کی ضرورت پڑے گی۔
چمڑا یا جوتا اگر نرم ہے تو کپڑے کی طرح تین دفعہ نچوڑ کر دھونا ہوگا اور جوتا موزہ اگر سخت ہے تو پھر لکڑی کی طرح دھونا ہوگا کہ اوپر اوپر پانی ڈال کر مل لیا جائے اور پانی بہایا جائے اس کے علاوہ نجاست اگر کپڑے یا بدن انسان پر لگ جائے تو وہ مسامات میں گھس جاتی ہے اس کے لئے صرف دھونا ہے، رگڑنا کافی نہیں ہے۔
باقی مذکورہ حدیثیں سب ائمہ کے خلاف ہیں تو بعض علماء نے جواب دیا ہے کہ یہاں حقیقی بات نہیں بلکہ یہ احادیث توہم نجاست پر محمول ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حکم خشک نجاست کے متعلق ہے مگر فصل ثالث کی روایت کی تفصیل اس کے خلاف ہے بعض نے کہا ان احادیث کا تعلق طین شارع یعنی راستے کی کیچڑ کے ساتھ ہے کیونکہ وہ بوجہ مجبوری پاک کے حکم میں ہے، آنے والی روایت کی بھی اس طرح تشریح ہے۔ [1]

توھُّم نجاست کچھ نہیں ہے

﴿۱۳﴾ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ لَهَا امْرَأَةٌ إِنِّي أُطِيلُ ذَيْلِي وَأَمْشِي فِي الْمَكَانِ الْقَذِرِ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُطَهِّرُهُ مَا بَعْدَهُ.

(رَوَاهُ مَالِكٌ وَأَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَا الْمَرْأَةُ أُمُّ وَلَدٍ لِإِبْرَاهِيمَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ). [2]

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ان سے ایک عورت نے کہا کہ میرا دامن لمبا ہے اور میں ناپاک جگہ میں چلتی ہوں (یہ خیال ہے کہ دامن کو ناپاکی لگ جاتی ہے) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے (اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں) فرمایا تھا کہ اس کو وہ چیز پاک کرتی ہے جو اس کے بعد ہے (یعنی پاک زمین یا مٹی) (احمد، مالک، ترمذی، ابوداؤد، دارمی) اور ابوداؤد و دارمی نے کہا ہے کہ (سوال کرنے والی) وہ عورت ابراہیم بن عبدالرحمن بن عوف کی ام ولد تھی (جس کا نام حمیدہ تھا)

درندہ کی کھال پر بیٹھنے کا حکم

﴿۱۴﴾ وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِ يْكَرِبَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ لُبْسِ جُلُودِ السِّبَاعِ وَالرُّكُوبِ عَلَيْهَا. (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ) [3]

[1] المرقات ۲/۲۰۴،۲۰۵ [2] اخرجه مالك ۲۱ واحمد ۶/۲۹۰ [3] اخرجه ابو داؤد ۴۱۳۱ والنسائی ۷/۱۷۶

ترجمہ: حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے درندوں کی کھالوں کے پہننے اور ان پر سوار ہونے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد، نسائی)

﴿۱۵﴾ وَعَنْ أَبِي الْمَلِيحِ بْنِ أُسَامَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ نَهَى عَنْ جُلُودِ السِّبَاعِ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ أَنْ تُفْتَرَشَ)[1]

ترجمہ: حضرت ابو ملیح بن اسامہ رحمہ اللہ اپنے والد مکرم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے درندوں کی کھال کو استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد، احمد، نسائی) اور امام ترمذی رحمہ اللہ اور دارمی نے اس روایت میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ (آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ) درندوں کی کھالوں کا فرش بنایا جائے۔

توضیح: **نهى عن جلود السباع:** دونوں حدیثوں میں درندوں کی کھال پر بیٹھنا یا سواری میں استعمال کرنا یا پہننا سب منع ہیں اس لئے علماء کے فتویٰ کے مطابق درندوں کی کھال پر بیٹھنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ اس پر بیٹھنے سے انسان کی طبیعت میں درندوں کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ درندوں کی کھال دباغت کے بعد فروخت کی جا سکتی ہے اور یہ جائز ہے۔ لیکن دباغت سے پہلے اس کا خریدنا، فروخت کرنا جائز نہیں ہے شکاری لوگوں کو سوچنا چاہئے جو دباغت سے پہلے درندوں شیر وغیرہ کی کھالوں کو فروخت کرتے رہتے ہیں۔[2]

﴿۱۶﴾ وَعَنْ أَبِي الْمَلِيحِ أَنَّهُ كَرِهَ ثَمَنَ جُلُودِ السِّبَاعِ. (رَوَاهُ..............)[3]

ترجمہ: حضرت ابو الملیح کے بارے میں منقول ہے کہ وہ درندوں کی کھالوں کی قیمت کو (بھی) مکروہ سمجھتے تھے۔

﴿۱۷﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُكَيْمٍ قَالَ أَتَانَا كِتَابُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ أَنْ لَا تَنْتَفِعُوا مِنَ الْمَيْتَةِ بِإِهَابٍ وَلَا عَصَبٍ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَه)[4]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عکیم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے (قبیلہ جہینہ کے) پاس سرکار دو عالم ﷺ کا (جو) مکتوب گرامی آیا (اس میں یہ لکھا تھا) کہ تم مردار کے چمڑے اور اس کے پٹھے سے نفع نہ اٹھاؤ۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

﴿۱۸﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أَمَرَ أَنْ يُسْتَمْتَعَ بِجُلُودِ الْمَيْتَةِ إِذَا دُبِغَتْ. (رَوَاهُ مَالِكٌ وَأَبُو دَاوُدَ)[5]

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مردار کے چمڑے سے دباغت کے بعد فائدہ اٹھایا جائے۔ (مالک، ابوداؤد)

[1] اخرجه احمد ۵/۷۴ وابو داؤد ۴۱۳۲ والنسائی ۷/۱۷۶ [2] المرقات ۲/۲۰۷ [3] اخرجه الترمذی ۱۷۷۰
[4] اخرجه الترمذی ۱۷۲۹ وابو داؤد ۴۱۲۷ والنسائی ۷/۱۷۵ [5] اخرجه مالک ۳۰۸ وابو داؤد ۴۱۲۴

﴿۱۹﴾ وَعَنْ مَيْمُونَةَ قَالَتْ مَرَّ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ رِجَالٌ مِنْ قُرَيْشٍ يَجُرُّونَ شَاةً لَهُمْ مِثْلَ الْحِمَارِ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَوْ أَخَذْتُمْ إِهَابَهَا قَالُوا إِنَّهَا مَيْتَةٌ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُطَهِّرُهَا الْمَاءُ وَالْقَرَظُ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُد)[1]

ترجمہ: حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کے چند آدمی اپنی ایک مری ہوئی بکری کو گدھے کی طرح کھینچتے ہوئے سرکار دو عالم ﷺ کے پاس سے گزرے آپ نے (یہ دیکھ کر) ان سے فرمایا کہ کاش! تم اس کے چمڑے کو نکال لیتے (تو یہ اپنے کام آجاتا) انہوں نے عرض کیا کہ یہ تو مردار ہے (یعنی ذبح کی ہوئی نہیں ہے) آپ نے فرمایا اسے کیکرے کے پتے اور پانی پاک کر دیتا ہے (یعنی ان دونوں چیزوں کے ذریعے دباغت سے چمڑا پاک ہو جاتا ہے)۔ (ابوداؤد)

﴿۲۰﴾ وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْمُحَبِّقِ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ جَاءَ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ عَلَى أَهْلِ بَيْتٍ فَإِذَا قِرْبَةٌ مُعَلَّقَةٌ فَسَأَلَ الْمَاءَ فَقَالُوا لَهُ يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّهَا مَيْتَةٌ فَقَالَ دِبَاغُهَا طُهُورُهَا۔
(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُد)[2]

ترجمہ: حضرت سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ تبوک کی جنگ کے موقع پر ایک گھر تشریف لائے تو اچانک آپ کی نظر ایک لٹکی ہوئی مشک پر پڑی آپ نے پانی مانگا تو لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ تو (دباغت دی ہوئی) مردار کی کھال ہے آپ نے فرمایا دباغت نے اسے پاک کر دیا ہے۔ (احمد، ابوداؤد)

الفصل الثالث

خشک گندگی لگنے سے وضوء نہیں

﴿۲۱﴾ وَعَنِ امْرَأَةٍ مِنْ بَنِي عَبْدِ الْأَشْهَلِ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ لَنَا طَرِيقًا إِلَى الْمَسْجِدِ مُنْتِنَةً فَكَيْفَ نَفْعَلُ إِذَا مُطِرْنَا قَالَتْ فَقَالَ أَلَيْسَ بَعْدَهَا طَرِيقٌ هِيَ أَطْيَبُ مِنْهَا قُلْتُ بَلَى قَالَ فَهٰذِهِ بِهٰذِهِ۔ (رَوَاهُ أَبُو دَاوُد)[3]

ترجمہ: بنو عبد اشہل کی ایک عورت کا بیان ہے کہ میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مسجد میں آنے کا ہمارا جو راستہ ہے وہ گندہ ہے جب بارش ہو جائے تو ہم کیا کریں وہ کہتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کیا اس راستہ کے بعد کوئی پاک صاف راستہ نہیں آتا، میں نے عرض کیا جی ہاں آپ نے فرمایا یہ پاک راستہ اس ناپاک راستہ کے بدلے میں ہے۔ (ابوداؤد)

[1] اخرجہ احمد ۶/۳۳۳ وابوداؤد ۴۱۲۶ [2] اخرجہ ابوداؤد ۴۱۲۵ واحمد [3] اخرجہ ابوداؤد ۳۸۴

﴿۲۲﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّيْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلَا نَتَوَضَّأُ مِنَ الْمَوْطِئِ.
(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[۱]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور زمین پر چلنے (کی وجہ) سے وضو نہیں کرتے تھے۔ (ترمذی)

توضیح: لا نتوضأ من الموطئ: علماء نے لکھا ہے کہ یہاں وضو سے لغوی وضو مراد ہے یعنی پاؤں دھونا تو اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ اگر نجاست خشک تھی تو اس وقت ہم وضو لغوی بھی نہ بناتے یعنی پاؤں نہ دھوتے کیونکہ نجاست لگی ہی نہیں صرف ٹکرانے سے پاؤں نہیں دھوتے تھے اور اگر وضو سے شرعی وضو مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جب نجاست تر ہوتی تو اس گندگی کے لگنے سے ہم وضو شرعی نہیں بنایا کرتے تھے بلکہ صرف پاؤں دھوتے تھے کیونکہ گندگی لگنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔[۲]

﴿۲۳﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَتِ الْكِلَابُ تُقْبِلُ وَتُدْبِرُ فِي الْمَسْجِدِ فِيْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرُشُّوْنَ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ. (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)[۳]

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کے زمانے میں مسجد میں کتے آتے جاتے تھے اور صحابہ ان کے آنے جانے کی وجہ سے کچھ بھی نہ دھوتے تھے (کیونکہ ذکوۃ الارض یبسھا پر عمل ہوتا تھا) تفصیل گزر چکی ہے (بخاری)

مسئلة بول ما يؤكل لحمه

﴿۲۴﴾ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا بَأْسَ بِبَوْلِ مَا يُؤْكَلُ لَحْمُهُ وَفِيْ رِوَايَةِ جَابِرٍ قَالَ مَا أُكِلَ لَحْمُهُ فَلَا بَأْسَ بِبَوْلِهِ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالدَّارَقُطْنِيُّ)[۴]

ترجمہ: حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ فرماتے تھے کہ جس چیز کا گوشت کھایا جائے اس کے پیشاب میں کچھ حرج نہیں اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس طرح ہے کہ جس جانور کا گوشت کھایا جائے اس کے پیشاب میں کچھ حرج نہیں ہے۔ (احمد، دارقطنی)

توضیح: لا بأس ببول ما يؤكل لحمه: غیر ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب بالاتفاق ناپاک ہے ماکول اللحم جانوروں کے پیشاب کے حکم میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔[۵]

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب پاک

[۱] اخرجه الترمذي ۱/۲۶۷ [۲] المرقات ۲/۲۱۱ [۳] اخرجه البخاري
[۴] اخرجه احمد والدار قطني في سننه كتاب الطهارة [۵] المرقات ۲/۲۱۲

ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک **ماکول اللحم** جانوروں کا پیشاب نجس ہے۔ البتہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک **ماکول اللحم** جانوروں کے پیشاب سے تداوی اور علاج مطلقاً جائز ہے خواہ حالت اختیار میں ہو یا حالت اضطرار میں ہو مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے علاج صرف حالت اضطرار میں جائز ہے یعنی جان بچانے کے لئے جب ماہر اور دیندار طبیب کہہ دے کہ پیشاب پینے میں علاج ہے تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ یاد رہے جب فقہاء کا دلائل کی روشنی میں کسی چیز کے طاہر اور نجس ہونے میں اختلاف ہو جاتا ہے تو اس میں نجاست غلیظہ باقی نہیں رہتی چنانچہ **ماکول اللحم** جانوروں کا پیشاب اس اختلاف کی وجہ سے نجاست غلیظہ سے نجاست خفیفہ کے درجہ میں آ گیا ہے اسی کو کہا گیا ہے "**اختلاف امتی رحمۃ**"۔[1]

دلائل:

فریق اول کی دلیل زیر بحث حدیث ہے جس میں "**لا بأس ببول ما یؤکل لحمہ**" کے الفاظ آئے ہیں ان کی دوسری دلیل عرنیین کا قصہ ہے جس میں **اشربوا من البانہا وابوالہا** کے الفاظ ہیں۔

فریق ثانی کی پہلی دلیل "**استنزھوا من البول فان عامۃ عذاب القبر منہ**" حدیث ہے جس میں البول عام ہے خواہ انسان کا ہو یا حیوان کا ہو جب اس سے اتنا بچنے کا حکم ہے تو اس کو پاک کیسے کہا جا سکتا ہے۔

فریق ثانی کی دوسری دلیل قرآن کی آیت میں اشارۃ النص ہے فرمایا:

"**نسقکم مما فی بطونہ من بین فرث ودم لبنًا خالصًا سائغا للشاربین**"۔[2]

طرز استدلال اس طرح ہے کہ دودھ کو دو نجس چیزوں کے درمیان سے صاف طور پر نکالنے کا ذکر فرمایا ہے تو دو نجس پیشاب، لید اور خون ہے۔ ان حضرات کی تیسری دلیل میں **استقذار طبع** ہے کہ طبیعت اور فطرت سلیمہ اس چیز کا سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔

جواب: فریق اول کے استدلال کا جواب یہ کہ زیر بحث روایت قابل استدلال نہیں ہے کیونکہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "**ھذا الخبر باطل موضوع**" کذا فی آثار السنن۔

نیز اس میں **لا بأس** کا لفظ ہے جو قاعدہ کے مطابق خلاف افضل کی طرف اشارہ کرتا ہے باقی عرنیین کی حدیث منسوخ ہے کیونکہ اس میں مثلہ کا حکم تھا جو بالاتفاق منسوخ ہو گیا ہے تو بول کا حکم بھی منسوخ ہو گیا بشرطیکہ یہ فیصلہ ہو جائے کہ تاریخ میں **استنزھوا** کی حدیث متاخر ہو، نیز عرنیین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پینے کا کہا تھا اور بول سے استنشاق کا فرمایا تھا انہوں نے پینا شروع کر دیا یا وہ لوگ مرتد ہونے والے تھے تو وحی کے ذریعہ سے ان نجسوں کو نجس ہی پلانا مقرر ہوا۔

نوٹ: اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ نبیذ التمر کے مسئلہ سے **باب المسح علی الخفین** تک کی تشریح وتوضیح بندہ عاجز نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے قرب وجوار میں لکھی ہے "**اللھم لک الحمد حمدا کثیرًا کثیرًا**"۔

(فضل محمد غفرلہ نزیل المدینۃ المنورہ ۲۳ رمضان ۱۴۲۲ھ)

---

[1] المرقات ۲/۲۱۲ [2] سورۃ النحل الایہ ۶۶

۵ ربیع الاول ۱۰ ۱۴ھ

باب المسح علی الخفین

موزوں پر مسح کا بیان

موزوں پر مسح کرنا چونکہ کتاب اللہ کی آیت الوضو سے ظاہری طور پر متعارض تھا کیونکہ قرآن میں پاؤں دھونے کے ساتھ **الی الکعبین** کا لفظ آیا ہے اور ٹخنوں تک مسح کسی کے ہاں نہیں ہے اس قید نے پاؤں دھونے کے سوا ہر حکم کو رد کر دیا ہے اسی وجہ سے پاؤں پر مسح کرنے کے حکم کو امت نے بہت سوچ سمجھ کر قبول کیا۔ خود صحابہ کرام موزوں پر مسح کرنے کی روایت کرنے والے صحابی حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے بطور تعجب واستفسار پوچھ لیا کرتے تھے کہ کیا موزوں پر مسح کا حکم سورت مائدہ کی آیت کے نزول سے بعد آیا ہے یا پہلے کا ہے تو آپ فرماتے تھے کہ بھائی سورت مائدہ کے نزول سے پہلے تو میں نے اسلام کو قبول نہیں کیا تھا میں تو اس کے بعد مسلمان ہوا ہوں لہٰذا آنحضرت ﷺ کا موزوں پر مسح نزول سورت مائدہ کے بعد کا ہے۔

گویا احادیث کثیرہ مشہورہ کی وجہ سے قرآن کی آیت میں تخصیص ہوگئی ہے اور موزوں پر مسح اس کے بعد امت نے قبول کر لیا ہے حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے **مسح علی الخفین** کے بارے میں صحابہ کرام میں کوئی اختلاف نہیں پایا اور نہ بعد کے علماء میں کسی نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے احادیث **مسح علی الخفین** کے راویوں کو جمع کیا تو معلوم ہوا کہ اسی (۸۰) سے زیادہ صحابہ نے اس کی روایت کی ہے جن میں **عشرہ مبشرہ بالجنۃ** علماء شامل ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ستر سے زیادہ ایسے صحابہ سے ملا ہوں جو موزوں پر مسح کرنے کا عقیدہ رکھتے تھے حضرت ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کا سلف صالحین میں سے کسی نے انکار نہیں کیا ہے۔ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جو شخص موزوں پر مسح کرنے کا انکار کرے اور اس کو ناجائز سمجھے تو مجھے اس کے کفر کا خطرہ ہے کیونکہ اس بارہ میں احادیث تواتر تک پہنچی ہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے موزوں کے مسح پر اجماع نقل کیا ہے۔ [1]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے موزوں پر مسح کرنے کو اس وقت قبول کیا جب آفتاب نصف النہار کی طرح واضح احادیث مجھ تک پہنچ گئیں پھر آپ نے موزوں پر مسح کرنے کو اہل السنۃ والجماعۃ کی نشانی اور شعار قرار دیا آپ نے اہل سنت ہونے کیلئے تین چیزیں لازمی قرار دیں اور فرمایا "اَنْ نُفَضِّلَ الشَّیْخَیْنِ وَنُحِبَّ الْخَتَنَیْنِ وَنَرَی الْمَسْحَ عَلَی الْخُفَّیْنِ"۔

ایک روایت میں نحب سے آخر تک مخاطب کے صیغہ کے ساتھ نحب کے بجائے تحب ہے یعنی سنی ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تم آنحضرت ﷺ کے دو دامادوں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ سے محبت رکھو اور موزوں پر مسح کرنے کو جائز سمجھو اور شیخین یعنی صدیق رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کو سب سے افضل سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ موزوں پر مسح کرنا شرعاً جائز ہے اس کا

---

[1] المرقات ۲/۲/۲۱۳

انکار کوئی مبتدع اور بد باطن کر سکتا ہے جیسے روافض خذلھم اللہ نے کیا ہے اور خوارج نے بھی کیا ہے۔ پھر یہ بات یاد رکھیں کہ موزوں پر مسح کرنا رخصت ہے اور پاؤں کا دھونا افضل اور عزیمت ہے لیکن اگر کوئی تکلف کرتا ہے اور مشقت کے ساتھ پاؤں دھوتا ہے تو اس طرح دھونا افضل نہیں ہاں اگر بغیر تکلف کے کوئی دھوتا ہے تو دھونا افضل ہے۔ صاحب سفر السعادہ نے لکھا ہے کہ جو عمل آنحضرت ﷺ کے سامنے آیا ہے تو بغیر کسی تکلف کے آپ نے اس پر عمل کیا ہے اور ذرا بھی تکلف سے کام نہیں لیا ہے۔ [1]

الفصل الاول

مسئلة التوقيت في المسح

﴿۱﴾ وَعَنْ شُرَيْحِ بْنِ هَانِئٍ قَالَ سَأَلْتُ عَلِيَّ ابْنَ أَبِي طَالِبٍ عَنِ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ فَقَالَ جَعَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ لِلْمُسَافِرِ وَيَوْمًا وَلَيْلَةً لِلْمُقِيمِ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ) [2]

ترجمہ: حضرت شریح بن ہانی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے مسافر کے لئے تین دن اور تین رات اور مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات کی مدت مقرر فرمائی ہے۔ (مسلم)

توضیح: ثلاثة ايام: توقیت فی المسح یہ ہے کہ شریعت نے جب موزوں پر مسح کرنے کا حکم دے دیا تو اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ مسح کرنا کسی مقرر وقت تک ہے یا اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے اس مسئلہ کو توقیت اور عدم توقیت مسح کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک **مسح علی الخفین** غیر موقت ہے اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے آدمی جب تک مسح کرنا چاہتا ہے کر سکتا ہے اس میں مقیم اور مسافر کا بھی کوئی فرق نہیں ہے ائمہ ثلاثہ جمہور محدثین اور جمہور صحابہ کے ہاں **مسح علی الخفین** موقت ہے مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات ہے اور مسافر کے لئے تین دن تین راتیں ہیں۔ [3]

مالکیہ کے دلائل:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور وہ حضرات جو عدم توقیت مسح کے قائل ہیں وہ ابوداؤد شریف **باب التوقیت فی المسح** کی دو حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں ایک حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں یہ الفاظ موجود ہیں **"ولو استزدناه لزادنا"** یعنی جب آنحضرت ﷺ نے مسح خفین کا مسئلہ بیان فرمایا تو مقیم کے لئے آپ ﷺ نے ایک دن

[1] المرقات ۲/۲۱۳ [2] اخرجہ مسلم ۱/۱۵۹ [3] المرقات ۲/۲۱۴

اور ایک رات مقرر فرما دیا اور مسافر کے لئے تین دن تین راتیں مقرر فرما دیں اور اگر ہم اس سے زیادہ دنوں تک مسح کی اجازت مانگتے تو آپ زیادہ دنوں کی بھی اجازت دے دیتے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری دلیل بھی سنن ابوداؤد کی ابی بن عمارہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ایک صحابی نے پوچھا:

"امسح علی الخفین؟قال نعم قال یوماً قال یومین قال وثلاثه قال وما شئت"۔

اس آخری جملہ سے عدم توقیت پر مالکیہ استدلال کرتے ہیں کہ آدمی جتنے دن مسح کرنا چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ (ابوداؤد ص ۲۱)[۱]

ابوداؤد میں اسی حدیث کی ایک سند میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے:

"حتی بلغ سبعا قال رسول الله ﷺ نعم مابدالك"۔ یعنی جب تک چاہو مسح کر سکتے ہو۔

مالکیہ کی تیسری دلیل حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے یہ صحابی بہت تیز رفتار تھے شام سے مدینہ منورہ تک ایک ماہ کا سفر ایک ہفتہ میں کرتے تھے صحابہ کرام جنگ کے دوران بعض ضروریات کے لئے ان کو مدینہ بھیج دیا کرتے تھے ایک دفعہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میں نے ایک جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ تک مسلسل مسح کیا ہے۔

جمہور کے دلائل:

اس مسئلہ میں جمہور کے بہت زیادہ دلائل ہیں:

❶ زیر نظر حضرت شریح بن ھانی کی حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مسافر کے لئے تین دن تین راتیں مقرر فرمائیں اور مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات مقرر فرمائی یہ مسلم کی روایت ہے۔ (مشکوۃ ص ۵۳)[۲]

❷ اس کے ساتھ والی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے اس کو بھی مسلم نے نقل کیا ہے۔

❸ پھر فصل ثانی کی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی صریح حدیث اور روایت ہے جس میں مسافر کے لئے ایک دن ایک رات اور مقیم کے لئے تین دن تین راتیں مقرر کی گئیں ہیں اس روایت کو دارقطنی اور ابن حزیمہ نے نقل کیا ہے۔

❹ پھر اسی کے ساتھ والی روایت حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ کی ہے جس میں تین دن تک موزوں کے نہ نکالنے کی وضاحت اور تصریح ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی دلائل ہیں مگر یہ کافی ہیں۔[۳]

جواب: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت کا جواب یہ ہے کہ ابن دقیق العید نے تصریح فرمائی ہے کہ اس روایت میں **ولو استزدناه لزادنا** کے جملہ کا اضافہ ثابت نہیں ہے۔ اور اگر یہ جملہ ثابت بھی ہو جائے تو یہ صحابی کا ایک خیال ہے اس کی رائے ہے آنحضرت ﷺ کی مرفوع حدیث نہیں ہے پھر لو انتفاء ثانی کے لئے آتا ہے بسبب انتفاء اول تو یہاں زیادت کا سوال بھی نہیں ہوا ہے اور نہ زیادت ہوئی ہے۔

باقی سات دن تک مسح کی مدت والی حدیث ضعیف بھی ہے اور اپنے مقصود میں متعین بھی نہیں بلکہ محتمل ہے اس میں دو راوی مجہول ہیں امام بخاری اور بیہقی نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ اور محتمل اس طرح ہے کہ سات دن تک ایک ہی مسح کافی سمجھا گیا تھا

[۱] ابو داؤد ۱/۲۱ [۲] مشکوۃ ۵۳ [۳] المرقات ۲/۲۱۳،۲۱۵،۲۱۶

یا سات دن تک ترتیب کے ساتھ مسح کرتا رہا دونوں احتمال ہیں یعنی مسح کے قاعدہ کے مطابق سفر میں تین دن کے بعد موزے نکال کر پاؤں دھوکر پھر مسح شروع کرتا تو سات دن یا ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک موزے پہنے رہتے تھے اور ترتیب کے ساتھ قاعدہ کے مطابق مسح ہوتا رہا جیسے تیمم کے بارے میں حدیث ہے "**الصعيد الطيب طهور المسلم الى عشر سنين**" تو دس سال تک ایک تیمم نہیں چلتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دس سال تک اگر پانی نہ ملے تو قاعدہ اور ترتیب کے مطابق تجدید کے ساتھ تیمم پر دس سال تک عمل ہوسکتا ہے بالکل اسی طرح مذکورہ مسح کی حدیث بھی ہے یہ جواب اسی طرح عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت کے سمجھنے کے لئے بھی کافی ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ترتیب اور قاعدہ کے مطابق آٹھ دن تک موزوں پر مسح ہی کرتا رہا۔ آنے والی روایات کی تشریح کے لئے یہ تشریح کافی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک رکعت نکل گئی

﴿۲﴾ وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ أَنَّهُ غَزَا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ غَزْوَةَ تَبُوْكَ قَالَ الْمُغِيْرَةُ فَتَبَرَّزَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قِبَلَ الْغَائِطِ فَحَمَلْتُ مَعَهُ إِدَاوَةً قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَمَّا رَجَعَ أَخَذْتُ أُهْرِيْقُ عَلَى يَدَيْهِ مِنَ الْإِدَاوَةِ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهُ وَعَلَيْهِ جُبَّةٌ مِّنْ صُوْفٍ ذَهَبَ يَحْسِرُ عَنْ ذِرَاعَيْهِ فَضَاقَ كُمُّ الْجُبَّةِ فَأَخْرَجَ يَدَيْهِ مِنْ تَحْتِ الْجُبَّةِ وَأَلْقَى الْجُبَّةَ عَلَى مَنْكِبَيْهِ فَغَسَلَ ذِرَاعَيْهِ ثُمَّ مَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعَلَى الْعِمَامَةِ ثُمَّ أَهْوَيْتُ لِأَنْزِعَ خُفَّيْهِ فَقَالَ دَعْهُمَا فَإِنِّيْ أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا ثُمَّ رَكِبَ وَرَكِبْتُ فَانْتَهَيْنَا إِلَى الْقَوْمِ وَقَدْ قَامُوْا إِلَى الصَّلَاةِ وَيُصَلِّيْ بِهِمْ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَقَدْ رَكَعَ بِهِمْ رَكْعَةً فَلَمَّا أَحَسَّ بِالنَّبِيِّ ﷺ ذَهَبَ يَتَأَخَّرُ فَأَوْمَأَ إِلَيْهِ فَأَدْرَكَ النَّبِيُّ ﷺ إِحْدَى الرَّكْعَتَيْنِ مَعَهُ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ النَّبِيُّ ﷺ وَقُمْتُ مَعَهُ فَرَكَعْنَا الرَّكْعَةَ الَّتِيْ سَبَقَتْنَا. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ.)[1]

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ غزوہ تبوک میں شرکت کی چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ (اسی دن ایک روز) فجر سے پہلے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے میں بھی پانی کی چھاگل لے کر آپ کے ہمراہ ہولیا جب آپ (قضائے حاجت سے) واپس تشریف لائے (اور وضو کرنے کے لئے بیٹھے) تو میں نے آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈالنا شروع کیا چنانچہ آپ نے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے اور منہ دھویا آپ ایک اونی جبہ پہنے ہوئے تھے اس کی آستینیں چڑھانی چاہیں لیکن آستینیں تنگ تھیں (اس لئے چڑھ نہ سکیں) آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جبہ کے اندر سے نکال کر جبہ کو مونڈھوں پر ڈال لیا اور دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوکر چوتھائی سر کا اور پگڑی کا مسح کیا پھر (جب) میں نے آپ کے موزے اتارنے کا ارادہ کیا تاکہ آپ پیر دھولیں (تو) آپ نے فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو کیونکہ میں نے (پاؤں کی) پاکی کی حالت میں انہیں پہنا تھا (یعنی وضو کرنے کے بعد پہنا تھا) اور آپ نے دونوں موزوں پر مسح کیا، پھر آپ اور میں دونوں سوار ہوکر

[1] اخرجہ مسلم ۲/۲۶

لوگوں کے پاس آئے تو (فجر کی) نماز کے لئے جماعت کھڑی ہوگئی تھی اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے اور ایک رکعت پڑھا بھی چکے تھے جب انہیں آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کا احساس ہوا تو وہ پیچھے ہٹنے لگے (تا کہ آنحضرت ﷺ امامت کریں) مگر آنحضرت ﷺ نے انہیں اشارہ کیا (اپنی جگہ کھڑے رہو اور نماز پڑھائے جاؤ) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک رکعت نماز ان کے ساتھ ہی پڑھی (یعنی آپ نے دوسری رکعت حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں ادا کی) جب انہوں نے سلام پھیر لیا تو آپ کھڑے ہو گئے اور میں بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور جو (پہلی) رکعت رہ گئی تھی ہم نے اسے پڑھ لیا۔ (مسلم)

الفصل الثانی

مقیم اور مسافر کے لئے مدت مسح

﴿۳﴾ وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ رَخَّصَ لِلْمُسَافِرِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ وَلِلْمُقِيمِ يَوْمًا وَلَيْلَةً إِذَا تَطَهَّرَ فَلَبِسَ خُفَّيْهِ أَنْ يَمْسَحَ عَلَيْهِمَا.

(رَوَاهُ الْأَثْرَمُ فِي سُنَنِهِ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَقَالَ الْخَطَّابِيُّ هُوَ صَحِيحُ الْإِسْنَادِ هٰكَذَا فِي الْمُنْتَقٰى)۔[1]

ترجمہ: حضرت ابی بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے موزوں پر مسح کرنے کی اجازت مسافر کو تین دن اور تین رات تک اور مقیم کو ایک دن اور ایک رات تک دی ہے جب کہ انہوں نے موزوں کو وضو کرنے کے بعد پہنا ہو۔ (اثرم رحمہ اللہ، ابن خزیمہ رحمہ اللہ، دار قطنی رحمہ اللہ) اور خطابی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اسناد کی رو سے صحیح ہے اور منتقی میں بھی اسی طرح منقول ہے۔

توضیح: **اذا تطهر:** حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں اور اس سے پہلے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں کہ موزہ پر مسح تب صحیح ہے جب اس کو کامل طہارت پر پہن لیا جائے یعنی وضو بنا لیا اور ابھی تک وہ شخص باوضو ہے اور موزہ پہن لیا تو آئندہ مسح کر سکتا ہے کیونکہ موزہ طہارت پر پہن لیا گیا ہے اور باہر سے نئی نجاست یا حدث جو آتا ہے وہ موزہ کے اندر کو سرایت نہیں کرتا ہے لہٰذا صرف مسح کافی ہے اس مسئلہ میں امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تک پورا وضو نہیں کیا ہو اس وقت تک مسح جائز نہیں بلکہ کامل طہارت پر موزہ پہننا آئندہ مسح کے لئے شرط ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر کسی شخص نے وضو بناتے ہوئے پہلے پاؤں دھو لئے اور پھر موزہ پہن کر باقی وضو مکمل کر لیا تو اس صورت میں بھی آیندہ مسح جائز ہے کیونکہ اس نے پاؤں کی طہارت کی حالت میں موزے پہن لئے ہیں دراصل یہ اختلاف اس اختلاف پر مبنی ہے کہ آیا وضو میں ترتیب یعنی مرتب وضو فرض ہے یا ترتیب فرض نہیں تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وضو میں ترتیب فرض ہے اب جس نے پہلے پاؤں دھو لئے تو اس نے غیر مرتب وضو بنا لیا جو صحیح نہیں ہوا تو موزے طہارت پر کہاں پہنے؟ لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چونکہ وضو غیر مرتب بھی صحیح ہے لہٰذا یہ موزے طہارت

[1] اخرجه الدار قطنی

پر پہن لئے گئے ہیں تو مسح جائز ہوا۔ احتیاط شوافع کے مسلک میں ہے اور ظاہر حدیث بھی اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔[1]

﴿۴﴾ وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَأْمُرُنَا إِذَا كُنَّا سَفَرًا أَنْ لَّا نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ وَلٰكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَنَوْمٍ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ.)[2]

ترجمہ: اور حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہم سفر میں ہوتے تھے سرکار دو عالم ﷺ ہمیں حکم دیتے تھے کہ تین دن اور تین رات تک (وضو کرنے کے وقت پیروں کو دھونے کے لئے) موزے نہ اتارے جائیں، نہ پاخانہ کی وجہ سے نہ پیشاب کی وجہ سے نہ سونے کی وجہ سے البتہ جنابت کی وجہ سے (یعنی غسل واجب ہونے کی صورت میں نہانے کے لئے اتارے جائیں)۔ (ترمذی، نسائی)

مسئلة محل المسح فی الخف

﴿۵﴾ وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ وَضَّأْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوْكَ فَمَسَحَ أَعْلَى الْخُفِّ وَأَسْفَلَهُ. (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوٗدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ مَعْلُوْلٌ وَسَأَلْتُ أَبَا زُرْعَةَ وَمُحَمَّدًا يَعْنِي الْبُخَارِيَّ عَنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ فَقَالَا لَيْسَ بِصَحِيْحٍ وَكَذَا ضَعَّفَهُ أَبُوْ دَاوٗدَ.)[3]

ترجمہ: اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے غزوہ تبوک میں سرکار دو عالم ﷺ کو وضو کرایا تھا اور آپ نے موزوں کے نیچے اور اوپر مسح کر لیا تھا۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور امام ترمذی نے کہا) یہ حدیث معلول ہے نیز میں نے اس حدیث کے بارے میں ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ اور محمد یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تو دونوں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

توضیح: **فمسح اعلیٰ الخف واسفله:** موزوں پر محل مسح کے بارے میں اختلاف ہے کل تین صورتیں ہیں دو میں اتفاق ہے ایک میں اختلاف ہے۔

فقہاء کا اختلاف:

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ **اسفل خف** یعنی صرف نیچے کے حصہ کے مسح پر اگر کسی نے اکتفا کیا تو وضو نہیں ہوا لہٰذا نماز نہیں ہوئی اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ اگر ایک شخص موزوں کے اوپر کے حصہ پر مسح کرتا ہے تو وضو ہو گیا نماز صحیح ہے اگرچہ اس نے موزے کے نچلے حصہ پر مسح نہیں کیا فریضہ ادا ہو گیا اختلاف اس تیسری صورت میں ہے کہ موزہ کے اوپر حصہ کے مسح کے ساتھ نچلے حصہ کے مسح کی حیثیت اور رتبہ کیا ہے یعنی دونوں کو جمع کرنے میں اختلاف ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ و شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اعلیٰ اور اسفل دونوں پر مسح ہونا چاہیئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو اس کے واجب ہونے کے قائل ہیں لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اعلیٰ خف پر مسح کو واجب اور اسفل پر مسح کے سنت ہونے کے قائل ہیں۔ امام

---

[1] المرقات ۲/۲۱۶ [2] اخرجه الترمذی والنسائی ۹۵۳ [3] اخرجه ابوداؤد ۱۶۰ والترمذی ۹۷

ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہ اللہ موزہ کے صرف اعلیٰ پر مسح کرنے کو فرض کہتے ہیں اور اسفل پر نہ فرض ہے نہ واجب ہے اور نہ سنت ہے۔ [1]

دلائل:

امام مالک رحمہ اللہ و شافعی رحمہ اللہ کی دلیل زیر بحث حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی تبوک والی روایت ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کی دلیل اسی حدیث کے ساتھ والی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی یہی حدیث ہے جس میں ظاہر الخف پر مسح کا ذکر ہے نیز ان حضرات کی مضبوط دلیل وہ روایت بھی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نقل فرمائی ہے اور جس میں مسئلہ کی علت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے یہ حدیث اس باب کی آخری حدیث ہے کہ دین اگر عقل کے تحت ہوتا تو موزوں کے نچلے حصوں پر مسح کیا جاتا مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔

جواب: احناف وحنابلہ نے ان حضرات کی روایت کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ روایت معلول ہے اور بخاری اور ابو زرعہ رحمہ اللہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے لہٰذا وہ قابل استدلال نہیں ہے۔ [2]

﴿۶﴾ وَعَنْهُ أَنَّهُ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم يَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ عَلَى ظَاهِرِهِمَا. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ). [3]

ترجمہ: اور حضرت مغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو موزوں کے اوپر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد)

مسئلة المسح على الجوربين

﴿۷﴾ وَعَنْهُ قَالَ تَوَضَّأَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم وَمَسَحَ عَلَى الْجَوْرَبَيْنِ وَالنَّعْلَيْنِ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه). [4]

ترجمہ: اور حضرت مغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور نعلین کے ساتھ جوربین پر مسح کیا۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

توضیح: **مسح علی الجوربین:** جوربین تثنیہ ہے اس کا واحد جورب ہے جس کا ترجمہ جراب ہے۔ جورب معرب ہے اصل میں یہ فارسی لفظ گورب ہے اور اس کا اصل گور پا ہے جس کا معنی پاؤں کی قبر ہے۔ جراب بھی پاؤں کے لئے قبر ہے جوربین اسی طرح تثنیہ ہے جس طرح خفین تثنیہ ہے اس کا مفرد خف ہے اور خف موزہ کو کہتے ہیں ان دونوں کو تثنیہ اس لئے لایا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ تثنیہ ہی کے ساتھ خاص ہے ایک جراب یا ایک موزہ پر مسح نہیں ہوسکتا بہرحال خفین اور جرموقین کے علاوہ سردی سے بچنے کیلئے جراب بھی استعمال کئے جاتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان پر مسح کیا جاسکتا ہے یا نہیں تو اس کے سمجھنے کے لئے جوربین کی قسمیں سمجھنا ضروری ہے پھر فقہاء کا اختلاف سمجھ میں آجائے گا۔ احادیث میں خفین

[1] المرقات ۲/۲۲۱ [2] المرقات ۲/۲۲۱ [3] اخرجه الترمذی ۹۸ وابو داؤد ۱۶۱ [4] اخرجه احمد ۴/۲۵۲ والترمذی ۹۸ وابن ماجه

اور جوربین کے علاوہ جرموقین کا نام بھی آتا ہے یہ خفین کی حفاظت کے لئے خفین کے اوپر پہنا جاتا ہے اب جوربین میں فقہاء کا اختلاف ملاحظہ کریں۔ لیکن جوربین کی چند اقسام بھی ملاحظہ ہوں: [1]

فقہاء کا اختلاف:

جوربین کی چار قسمیں ہیں:

① جوربین مجلدین یہ وہ ہیں جن کے اوپر نیچے چمڑا لگا ہوا ہو تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ یہ جوربین خفین کے حکم میں ہیں ان پر مسح جائز ہے۔

② جوربین منعلین یہ وہ جوربین ہیں جن کے صرف نیچے تلوے پر یا صرف اوپر کے حصہ میں چمڑا چڑھا ہوا ہو اس میں بھی اتفاق ہے کہ اس پر مسح جائز ہے۔

③ جوربین رقیقین یعنی اس طرح جوربین ہیں کہ اوپر نیچے قدم نظر آتا ہے جس میں مسلسل آدمی بغیر جوتے کے نہیں چل سکتا ہو پانی اوپر نیچے جاتا ہو تو اس میں بھی اتفاق ہے کہ اس جیسے جوربین پر مسح جائز نہیں ہے۔ [2]

④ اور اگر جوربین نہ منعل ہیں نہ مجلد ہیں اور نہ رقیق ہیں بلکہ ثخینین ہیں۔

اس ثخینین میں اختلاف ہے لیکن ثخینین کے لئے چار شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

① اتنے موٹے اور مضبوط ہوں کہ بغیر جوتے کے تین میل مسلسل چلنا اس کے ساتھ ممکن ہو۔

② کسی طرف سے کاشف قدمین نہ ہوں بلکہ ساتر قدمین ہوں۔

③ اس طرح ثخینین ہوں کہ پانی پر قدم رکھنے سے اس میں پانی جذب نہ ہوتا ہو۔

④ کسی ربڑ تسمہ وغیرہ کی مدد سے استمساک نہ ہو بلکہ خود پنڈلی سے چپکے ہوں ایسے جوربین جو ثخینین ہوں اس پر جمہور اور صاحبین کے نزدیک مسح جائز ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تک جوربین مجلدین یا منعلین نہ ہوں اس پر مسح جائز نہیں ہے کیونکہ قرآن کی آیت سے پاؤں کا دھونا معلوم ہوتا ہے لیکن احادیث مشہورہ سے خفین کا مسح بھی ماننا پڑا لہٰذا جب جوربین منعلین یا مجلدین ہوں گے تو یہ خفین کے حکم میں آجائیں گے تو ان مشہور احادیث کی وجہ سے قرآن کے حکم میں تخصیص ہو جائے گی لیکن اگر جوربین اس قسم کے مجلدین یا منعلین نہ ہوں تو یہ خفین کے حکم میں نہیں آئیں گے لہٰذا قرآن کی آیت الوضو پر جوربین کی خبر واحد سے زیادتی جائز نہیں ہے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو بہت سارے محدثین نے ضعیف اور ناقابل استدلال قرار دیا ہے پھر اس حدیث میں ابہام اور کئی احتمالات بھی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی قسم کے جوربین پر مسح کیا تھا آیا رقیقین تھے یا مجلدین تھے یا منعلین تھے یہ سب تفصیل پوشیدہ ہے بہر حال امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ان دلائل سے قطع نظر آپ کا رجوع جمہور کے مذہب کی طرف ثابت ہے اور اسی پر فتویٰ ہے کہ ثخینین جرابین پر مسح جائز ہے یہاں یہ افسوسناک خبر بھی سن لیں کہ اہل ظواہر حضرات جو اپنے آپ کو

---

[1] المرقات ۲/۲۲۳ [2] المرقات ۲/۲۲۴

اہل حدیث شمار کرتے ہیں وہ کسی شرط کے بغیر ہر قسم کے جرابوں پر مسح کرتے ہیں اور خوب مزے اڑاتے ہیں حالانکہ پوری امت اس پر متفق ہے کہ جوربین اگر رقیق ہیں تو اس پر مسح جائز نہیں ہے۔

میں اس مسئلہ کو ۲۶ رمضان ۱۴۲۰ھ میں مکہ مکرمہ میں لکھ رہا ہوں کچھ دن قبل میں نے دیکھا کہ یہاں حرم شریف میں ایک پولیس والے نے نہایت نرم جرابوں پر مسح کیا جس سے اس کے قدم آر پار نظر آرہے تھے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کہاں گئی احتیاط اور کہاں گئی عبادت کی محنت ومحبت ومشقت اور کہاں گئی دیانت داری اور فقاہت۔

والنعلین: جوتوں پر مستقل طور پر مسح کسی کے ہاں جائز نہیں لہٰذا تمام فقہاء اس روایت میں تاویل کرتے ہیں تو بعض نے کہا کہ اصل مسح جوربین پر تھا مگر آنحضرت ﷺ ایسا جوتا پہنے ہوئے تھے کہ اس کے ساتھ جوربین پر مسح ہو گیا تو کچھ مسح نعلین پر تبعاً ہو گیا اسی کو والنعلین کہہ دیا اس وقت واؤ بمعنی مع ہو جائے گا بعض نے اس حدیث کو منسوخ قرار دیا ہے جیسا کہ سنن دارمی میں ہے۔

الفصل الثالث

﴿۸﴾ وَعَنِ الْمُغِيرَةِ قَالَ مَسَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلَى الْخُفَّيْنِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَسِيْتَ قَالَ بَلْ أَنْتَ نَسِيْتَ بِهٰذَا أَمَرَنِي رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ. (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ)[1]

ترجمہ: حضرت مغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے موزوں پر مسح کیا (یہ دیکھ کر) میں نے عرض کیا کہ آپ بھول گئے ہیں (یعنی موزے اتار کر پیر نہیں دھوئے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا بلکہ تم بھول گئے (کہ میری طرف نسیان کی نسبت کر رہے ہو) کیونکہ خدائے بزرگ وبرتر نے مجھے اسی طرح حکم دیا ہے۔ (احمد، داؤد)

﴿۹﴾ وَعَنْ عَلِيٍّ أَنَّهُ قَالَ لَوْ كَانَ الدِّيْنُ بِالرَّأْيِ لَكَانَ أَسْفَلُ الْخُفِّ أَوْلٰى بِالْمَسْحِ مِنْ أَعْلَاهُ وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلٰى ظَاهِرِ خُفَّيْهِ. (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَلِلدَّارِمِيِّ مَعْنَاهُ.)[2]

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ اگر دین (صرف) رائے اور عقل ہی پر موقوف ہوتا تو واقعی موزوں کے اوپر مسح کرنے سے نیچے مسح کرنا بہتر ہوتا اور یقیناً میں نے خود سرکار دو عالم ﷺ کو موزوں کے اوپر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (ابوداؤد، دارمی)

(الحمد للہ حمداً کثیراً کہ آج ۲۶ رمضان ۱۴۲۲ھ کو مکہ مکرمہ میں یہاں تک مشکوۃ شریف کی شرح مکمل ہوگئی۔

(فضل محمد غفرلہ یوسف زئی نزیل بیت اللہ الحرام مکۃ المکرمۃ)

[1] اخرجہ احمد ۴/۲۴۶ وابو داؤد ۱۵۶ [2] اخرجہ ابو داؤد ۱۶۲

۶ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

باب التيمم

تیمّم کا بیان

تیمم لغت میں قصد کے معنی میں ہے قرآن کریم کی آیت: [۱] وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ میں آمِّينَ اَیْ قَاصِدِيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ [۲] قصد ہی کے معنی میں آیا ہے ایک عربی شاعر اپنے اونٹوں کے سفر سے متعلق کہتا ہے:

رمی بصدور العيس منخرق الصبا فلم يدر خلق بعده اين يمما

یعنی اس شخص نے اونٹوں کے قافلے کو مشرقی ہوا کی طرف ڈال دیا اس کے بعد کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ اس نے کہاں کا ارادہ کیا۔

اصطلاح شریعت میں تیمم کی تعریف اس طرح ہے:

"قصد التراب وما يقوم مقامه على وجه مخصوص بنية الطهارة"۔ [۳]

بعض علماء نے تیمم کی نیت کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

"نويت ان اتيمم لرفع الحدث واستباحة الصلوة"۔

لیکن اس داستان کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ قلبی نیت کافی ہے۔

تیمم کا حکم پانچ ہجری میں اس وقت آیا تھا جب آنحضرت ﷺ بنو مطلق کے غزوہ کے موقع پر سفر میں تھے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کا پورا قصہ خود سنایا ہے امام بخاری نے اس کو نقل کیا ہے ترجمہ ملاحظہ ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ آپ کے بعض اسفار میں نکلے تھے ہم مقام بیداء یا مقام ذات الجیش میں تھے کہ میرا ہار ٹوٹ کر کہیں گم ہوگیا ہار کو تلاش کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ بھی رک گئے اور صحابہ کرام بھی رک گئے نماز کا وقت ہو چکا تھا ادھر لوگوں کے پاس پانی بالکل نہیں تھا لوگوں نے اس کی شکایت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کی کہ عائشہ کی وجہ سے لوگ رک گئے ہیں اور آنحضرت ﷺ بھی رک گئے ہیں حالانکہ کسی کے پاس پانی نہیں ہے اس پر ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے پاس آئے اس وقت رسول اللہ ﷺ سوئے ہوئے تھے اور آپ کا سر مبارک میری ران پر تھا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ تم نے لوگوں کو اور رسول اللہ ﷺ کو روکے رکھا ہے اور کسی کے پاس کوئی پانی نہیں ہے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے خوب ڈانٹا اور پھر اپنے ہاتھ سے میرے پہلو میں مجھے مارنے لگے میں حرکت اس لئے نہیں کر رہی تھی کہ آنحضرت ﷺ

---

[۱] المرقات ۲/۲۲۵ [۲] مائدہ (الایہ ۲) [۳] المرقات ۲/۲۲۵

میری ران پر سر رکھے ہوئے تھے کہ کہیں آپ کو تکلیف نہ ہو جائے اتنے میں حضور اکرم ﷺ جاگ اٹھے اور اس وقت پانی بالکل نہیں تھا کہ اچانک اللہ تعالیٰ نے تیمم کا حکم نازل فرمایا اور لوگوں نے تیمم شروع کیا (اس سہولت کو دیکھ کر) حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ماهی باول بركتكم يا آل ابی بكر" اے ابوبکر کی اولاد یہ تمہاری پہلی برکت نہیں ہے۔
ایک روایت میں حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے اس طرح الفاظ ہیں اے عائشہ! اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر عطا فرمائے خدا کی قسم آپ پر جب بھی کبھی پریشان کن صورتحال آتی ہے اس میں اللہ تعالیٰ آپ سمیت پوری امت کے لئے بھلائی رکھ دیتا ہے۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں جس اونٹ پر سوار تھی وہ بیٹھا ہوا تھا جب ہم نے اس کو اٹھایا تو اسکے نیچے سے ہار مل گیا۔

الفصل الاول

تمام امتوں پر امت محمدیہ کی فضیلت

﴿۱﴾ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فُضِّلْنَا عَلَى النَّاسِ بِثَلَاثٍ جُعِلَتْ صُفُوفُنَا كَصُفُوفِ الْمَلَائِكَةِ وَجُعِلَتْ لَنَا الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوْرًا إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ.
(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[۱]

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہم لوگ (پہلی امتوں کے) لوگوں پر تین چیزوں سے فضیلت دیئے گئے ہیں ① ہماری صفیں (نماز میں یا جہاد میں) فرشتوں کی صفوں جیسی (شمار) کی گئی ہیں ② ہمارے واسطے تمام زمین مسجد بنادی گئی ہے (کہ جہاں چاہیں نماز پڑھ لیں) ③ جس وقت ہمیں پانی نہ ملے تو زمین کی مٹی ہمارے لئے پاک کردینے والی ہے۔
(مسلم)

توضیح: فضلنا على الناس بثلاث: یہ فضیلت اور یہ خصوصیت امت محمدیہ علی صاحبها الف الف تحية کی ہے یہاں تین خصوصیات کا ذکر ہے دوسری روایات میں اس سے زیادہ کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن اعداد وشمار میں تعارض نہیں ہوتا ہے کیونکہ عدد اقل عدد اکثر کی نفی نہیں کرتا ہے نیز فضائل میں زیادتی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی رہتی ہے۔ تو پہلے تین کا ذکر آیا پھر زیادہ کا ذکر ہوا۔
"الناس": سے مراد سابقہ امتوں کے لوگ ہیں کیونکہ آنے والے لوگ قیامت تک اس امت کے دور اول کے حضرات صحابہ کرام کے تابع ہیں۔ لہٰذا "الناس" سے اس امت کے آنے والے لوگ مراد نہیں ہوسکتے ہیں۔[۲]

سید المرسلین ﷺ کی خصوصیات

یہاں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیات اور آپ کی امت کی خصوصیات بہت ساری ہیں لیکن یہاں

[۱] اخرجه مسلم ۲/۶۳ [۲] المرقات ۲/۲۲۵

صرف تین کا ذکر ہے باب ثواب ہذہ الامۃ اور باب فضائل سید المرسلین میں ان تمام خصوصیات کا بیان ہے چند کا ذکر یہاں بھی کرنا مناسب ہوگا چنانچہ آپ نے فرمایا:

① مجھے ایک ماہ کی مسافت تک دور دشمن پر رعب پڑنے کی خصوصیت دی گئی ہے۔ ② غنائم کو میرے لئے حلال کیا گیا ہے۔
③ مجھے شفاعت کبریٰ کا اعزاز دیا گیا ہے۔ ④ مجھے پوری دنیا کے انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔
⑤ مجھے جوامع الکلم دیئے گئے۔ ⑥ میرے ذریعہ سے نبوت کی برکات کی تکمیل ہوگئی ہے۔
⑦ میں خاتم النبیین ہوں۔ ⑧ مجھے پوری زمین کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ ⑨ میرا نام احمد رکھا گیا۔
⑩ اور میری امت کو سب سے افضل امت قرار دیا گیا ہے۔ ⑪ میرے اگلے پچھلے گناہوں (لغزشوں) کو معاف کردیا گیا۔
⑫ عرش عظیم کے نیچے خاص خزانہ ہے مجھے سورت بقرہ کی آخری آیتیں دی گئیں۔ ⑬ مجھے حوض کوثر دیا گیا۔
⑭ قیامت کے دن مجھے ایسا جھنڈا ملے گا جس کے نیچے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے علاوہ سب لوگ ہوں گے۔

ابو سعید نیشاپوری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''شرف المصطفیٰ'' میں آنحضرت ﷺ کی ساٹھ خصوصیات کا ذکر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ:

فان فضل رسول الله ليس له حد فيعرب عنه ناطق بفم

صفوفنا: اس سے میدان معرکہ اور میدان جہاد کی صفیں مراد ہیں بعض نے نماز کی صفوں کا بھی کہا ہے۔[1]

الارض کلها مسجدًا: یعنی پوری زمین اس قابل بنادی گئی ہے کہ اس پر ہم نماز پڑھ سکتے ہیں جب جگہ پاک ہو خواہ وہ خاص مسجد ہو یا مسجد کے علاوہ مکان بنی اسرائیل پر اتنی تنگی تھی کہ وہ مسجد سے باہر کسی جگہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے اور مسجد میں بھی جماعت کے بغیر پڑھنا جائز نہیں تھا مال غنیمت کو کھانے کے بجائے جلاتے تھے اور کپڑے سے نجاست کی جگہ کو کاٹتے تھے رات کا پوشیدہ گناہ گھر کے دروازہ پر لکھا جاتا تھا کہ اس شخص نے یہ گناہ کیا ہے گوشت میں چربی نہیں کھا سکتے تھے وغیرہ وغیرہ۔[2]

وجعلت تربتها لنا طهورًا: یعنی زمین کی مٹی کو پانی کے قائم مقام بنادیا جس طرح پانی سے طہارت حاصل ہوسکتی ہے تیمم کی صورت میں مٹی سے بھی طہارت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس حدیث اور اس جیسی آنے والی دیگر احادیث میں تیمم کے فضائل اور چند اخلاقی مسائل سامنے آگئے ہیں۔ تیمم کے مسائل میں چار ایسے بڑے مقامات ہیں جہاں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔[3]

مسائل تیمم میں فقہاء کا اختلاف:

❶ **پہلا اختلاف:** اس میں ہے کہ کن چیزوں پر تیمم جائز ہے اور کن پر جائز نہیں ہے۔

توامام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اور امام احمد رحمہ اللہ کے مشہور قول کے مطابق تیمم صرف تراب منبت یعنی زرخیز مٹی پر جائز ہے دیگر کسی چیز پر نہیں ہے۔

---

[1] المرقات ۲/۲۲۵ [2] المرقات ۲/۲۲۶ [3] المرقات ۲/۲۲۶

امام ابویوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تراب منبت کے ساتھ ساتھ ریت پر بھی تیمم کرنا جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک ہر وہ چیز جو جنس الارض سے ہو اس پر تیمم جائز ہے پھر امام مالک رحمہ اللہ نے جنس الارض کے متعلق فرمایا کہ ہر وہ چیز جو زمین سے ملحق ہو وہ بھی جنس الارض میں شامل ہے چنانچہ ان کے ہاں اس لکڑی پر بھی تیمم جائز ہے جس کا ایک حصہ زمین سے پیوست ہو۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جنس الارض میں یہ قید لگائی ہے کہ جو چیز جلانے سے نہ جلتی ہو، پگھلانے سے نہیں پگھلتی ہو، حل کرنے سے حل نہ ہوتی ہو اور گلنے سے گلتی نہ ہو اس پر تیمم جائز ہے لہٰذا ان کے ہاں لکڑی، سونا، چاندی، پیتل، لوہا، تانبا، نمک وغیرہ اشیاء پر تیمم جائز نہیں ہے ہاں اگر ان چیزوں پر گرد وغبار پڑ جائے تو پھر جائز ہے اور وہ تراب منبت کے حکم میں ہے۔[1]

دلائل:

امام شافعی رحمہ اللہ واحمد رحمہ اللہ وابویوسف رحمہ اللہ کی دلیل "**فتیمموا صعیداً طیباً ای ترابًا منبتًا**" جس میں صرف زرخیز مٹی کا ذکر ہے ہاں امام ابویوسف رحمہ اللہ نے ایک حدیث کی وجہ سے ریت پر بھی تیمم کو جائز قرار دیا ہے حدیث اس طرح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک وفد آیا اور اس نے عرض کیا:

فقالوا انا نکون بالرمال الاشهر الثلاثة والاربعة ویکون فینا الجنب والحائض والنفساء ولا نجد الماء فقال علیه السلام علیکم بالارض. (احمد، بیہقی، طبرانی)

احناف اور مالکیہ کی دلیل بھی قرآن کی یہی آیت "**فتیمموا صعیدا طیباً**" ہے لیکن ان کے ہاں صعید عام ہے اس سے وجہ الارض مراد ہے تراب منبت سے خاص نہیں کیونکہ دوسری آیت میں "**صعیداً جرزاً**" اور **صعیداً زلقاً** کے الفاظ آئے ہیں جو وجہ الارض کے لئے عام ہے تراب منبت سے خاص نہیں ہے۔

دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ تیمم کے جواز کی اصل علت یسر، سہولت اور آسانی فراہم کرنا ہے اور تراب منبت کی قید سے تو یسر عسر میں تبدیل ہو جائے گا خصوصاً عربستان کے ریگستان میں تراب منبت کا ملنا پانی ملنے سے زیادہ دشوار ہے۔

تیسری دلیل یہ کہ آنحضرت ﷺ نے تیمم کے حکم کے آنے کے بعد بھی نہ حضر میں اور نہ سفر میں تراب منبت کی تلاش کی ہے اور نہ اس کا حکم دیا ہے اور نہ اس کو ضروری سمجھا ہے۔ جمہور کا مسلک قوی تر اور صحیح تر ہے ہاں احتیاط اس میں ہے کہ مٹی کو تلاش کر کے اس پر تیمم کیا جائے۔ بعض حضرات مٹی کی موجودگی میں خالص نرم ملائم پتھر پر تیمم کرتے ہیں اگر مٹی پر کیا جائے تو اختلاف سے بھی نکل جائیں گے اور احتیاط پر بھی عمل ہو گا۔

❷ **دوسرا اختلاف:** اس میں ہے کہ تیمم طہارت مطلقہ اصلیہ ہے یا طہارت ضروریہ ہے یعنی ایک تیمم سے کئی نمازیں ادا

[1] المرقات ۲/۲۲۶

ہوسکتی ہیں یا صرف ایک نماز ایک تیمم سے ادا کی جائے گی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تیمم طہارت ضروریہ ہے "والضرورة تتقدر بقدر الضرورة" لہٰذا ایک تیمم سے ایک فرض مع لواحقہ جائز باقی جائز نہیں۔ ائمہ احناف فرماتے ہیں کہ تیمم وضو کا قائم مقام اور خلیفہ ہے وضو اصل اور تیمم اس کا فرع ہے تو جو کام اصل کا ہوگا وہی اس کے قائم مقام اور خلیفہ کا ہوگا ایک وضو سے جب کئی نمازیں پڑھ سکتے ہیں تو ایک تیمم سے کئی نمازیں بھی پڑھ سکتے ہیں یہ احناف کی پہلی عقلی دلیل ہے جو نص شرعی سے مستنبط ہے۔ احناف کی دوسری دلیل یہ کہ تیمم والے آدمی کے پیچھے وضو والے آدمی کی نماز اور امامت شوافع کے نزدیک بھی جائز ہے اس سے یہی بات واضح ہو جاتی ہے اور ضابطہ کے مطابق یہ ماننا پڑے گا کہ تیمم کی طہارت وضو کی طرح طہارت مطلقہ اصلیہ ہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر تیمم عبادت غیر مقصودہ کے لئے ہو تو اس سے عبادت مقصودہ ادا نہیں ہوسکتی ہے۔

یہاں بطور لطیفہ یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ غیر مقصودہ عبادت کے لئے پانی کی موجودگی میں بھی تیمم جائز ہے ثواب ملے گا مثلاً ایک آدمی مسجد میں جا کر صرف بیٹھنا چاہتا ہے تو اگرچہ حوض میں پانی موجود ہے پھر بھی یہ شخص حصول برکت وطہارت کے لئے تیمم کر سکتا ہے یا رات کو سوتے وقت وضو کے بجائے تیمم کرتا ہے تو جائز ہے یا دینی اور فقہ کی کتابوں کو چھونے کے لئے تیمم کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے اور گناہ سے بچ سکتا ہے خواہ صغیرہ کیوں نہ ہو اور مقام تقویٰ کو حاصل کر سکتا ہے۔

۳ تیسرا اختلاف: تیمم کی کیفیت میں ہے کہ آیا فعل تیمم میں ضربتین ہیں یا ضربة واحدة ہے یا کیا ہے۔

تو امام احمد بن حنبل، رحمۃ اللہ علیہ داؤد ظاہری، اسحاق بن راھویہ اور اکثر محدثین کے ہاں تیمم میں ضربة واحدة کافی ہے یعنی ایک بار ہاتھوں کو مٹی پر مار ڈالا اور چہرہ اور بازوں پر مسح کر دیا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین رحمۃ اللہ علیہ یعنی جمہور کے ہاں تیمم میں ضربتین ضروری ہیں: ضربة للوجه وضربة لليدين الى المرفقين۔[1]

دلائل:

احناف، مالکیہ اور شوافع یعنی جمہور کی ایک دلیل تو مسند بزار کی روایت ہے جس میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"قال كنت فى القوم حين نزلت الرخصة فى المسح بالتراب اذا لم نجد الماء فامرنا فضربنا بواحدة للوجه ثم ضربة اخرى لليدين الى المرفقين"۔ (مسند بزار)[2]

اس روایت میں تیمم کے لئے دو ضربیں واضح طور پر مذکور ہیں۔ جمہور کی دوسری دلیل بھی بزار کی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

ان النبى صلى الله عليه وسلم قال التيمم ضربتان ضربة للوجه وضربة لليدين الى المرفقين۔ (نصب الرایہ)

---

[1] المرقات ۲/۱۶۴ [2] المرقات ۲/۲۲۷

جمہور کی تیسری دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کی تخریج حاکم نے کی ہے دارقطنی نے بھی اس کو نقل کیا ہے اس مرفوع حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

"قال التیمم ضربتان ضربة للوجه وضربة للذراعین الی المرفقین"۔ (نصب الرایہ)

جمہور کی چوتھی دلیل مشکوۃ شریف باب التیمم کی فصل ثالث میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں دو ضربوں کی تصریح موجود ہے "ثم عادوا فضربوا باکفهم"۔

جمہور کی پانچویں دلیل مشکوۃ ص ۵۰ پر حضرت نافع کی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

ضرب رسول اللہ ﷺ بیدیه علی الحائط ومسح بهما وجهه ثم ضرب ضربة فمسح ذراعیه۔

حنابلہ اور محدثین و اہل ظواہر کی دلیل حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں ایک ضرب کا ذکر ہے اور پھر چہرہ اور کفین کے مسح کا ذکر ہے اسی طرح حضرت ابو جہیم رحمہ اللہ کی روایت میں بھی ایک ضرب کا ذکر ہے۔ ان حضرات نے جمہور کی روایات پر اعتراض بھی کیا ہے کہ وہ ضعیف ہیں۔ جس کا جواب آنے والا ہے۔ [1]

جواب: جمہور کہتے ہیں کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی روایت سے صراحت کے ساتھ ایک ضرب کا پتہ نہیں چلتا ہے یہاں صرف اتنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے چہرہ اور ہاتھوں پر مسح ایک ساتھ کیا اب دو ضربوں سے کیا یا ایک ضرب سے کیا یہ حدیث میں نہیں ہے نیز یہ تعلیم کے دوران آنحضرت ﷺ نے بطور نمونہ بتادیا کہ غسل کے لئے مٹی میں لوٹ پوٹ ہونے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وضو کے تیمم کی طرح ضرب مار کر اس طرح چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کافی تھا تو یہاں مکمل تیمم کر کے دکھانا نہیں تھا بلکہ یہ بتانا تھا کہ جنابت کے لئے بھی وضو کے تیمم کی طرح تیمم کافی تھا صرف یہی بتانا مقصود تھا۔ باقی اگر جمہور کے دلائل کچھ کمزور ہیں تو پرواہ نہیں کثرت روایات کی وجہ سے اس میں بڑا زور ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ایک ضرب کی حدیث پر عمل کرنے سے دو ضربوں والی حدیث پر عمل نہیں ہوسکتا ہے اور اگر دو ضربوں والی حدیث پر عمل کیا جائے تو ایک ضرب والی حدیث پر خود بخود عمل ہوجائے گا۔ تو احتیاط اسی میں ہے

تیسری بات یہ بھی ہے کہ تیمم میں مٹی استعمال ہوتی ہے جو اصل کے اعتبار سے مطہر نہیں بلکہ ملوث ہے اور پانی اصل کے اعتبار سے مطہر ہے جب ایک پانی کو استعمال کے بعد دوبارہ استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے تو ایک مٹی کے اثر اور استعمال شدہ اجزاء کو آپ دوسرے عضو پر دوبارہ کیسے استعمال کر سکتے ہیں بہر حال جمہور کے مسلک میں بہت ہی احتیاط ہے۔ [2]

❹ **چوتھا اختلاف:** محل تیمم میں ہے کیونکہ "ید" کا لفظ لغت میں کندھوں تک بولا جاتا ہے اور الی المرافق کی قید قرآن میں وضو کے لئے تو ہے تیمم کے لئے نہیں ہے اس لئے اس میں فقہاء کی رائیں مختلف ہوئی ہیں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ

[1] المرقات ۲/۱۶۳ [2] المرقات ۲/۲۲۷

اور اسحاق بن راھویہ کا مسلک یہ ہے کہ تیمم صرف رسغین یعنی کلائی تک ہے پورے ہاتھ یعنی کہنی تک نہیں ہے۔ [1] راجح اقوال کے مطابق امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یعنی جمہور کے نزدیک پورے ہاتھوں کا کہنیوں تک مسح ضروری ہے، البتہ امام مالک رسغین یعنی کلائی تک فرض کہتے ہیں اور کہنیوں تک سنت کہتے ہیں۔ ابن شہاب زھری مناکب اور کندھوں تک مسح کے قائل ہیں۔ بہر حال تین یا چار ضربات کا اور اسی طرح کندھوں تک مسح کرنے کا ائمہ اربعہ میں سے کوئی قائل نہیں ہے لہٰذا اس قسم کی روایات اس ابتدائی دور پر محمول ہیں جب تیمم کا نیا نیا حکم آیا تھا اور "تیمموا" پر ہر صحابی نے اپنے اپنے انداز سے عمل کیا تھا یہ کوئی ضابطہ نہیں تھا بعد میں ضابطہ وہی بن گیا کہ دو ضربیں ہیں اور کہنیوں تک مسح ہے اس پر جمہور امت کا عمل ہے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اضطراب بھی ہے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کلائی تک مسح کرنے کو قطع ید پر قیاس کیا ہے کہ وہاں بھی مطلق ید کا ذکر ہے مگر امت نے کلائی تک مراد لیا ہے تو یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اس کا جواب جمہور نے یہ دیا ہے کہ قطع ید زاجرات میں سے ہے اور تیمم عبادات میں سے ہے زاجرات میں شریعت کم سے کم سزا پر عمل کا حکم دیتی ہے لیکن عبادات میں تو زیادہ سے زیادہ کا حکم ہوتا ہے لہٰذا یہ قیاس مع الفارق ہے۔

غسل جنابت کے لئے تیمم

﴿۲﴾ وَعَنْ عِمْرَانَ قَالَ كُنَّا فِي سَفَرٍ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَصَلَّى بِالنَّاسِ فَلَمَّا انْفَتَلَ مِنْ صَلَاتِهِ إِذَا هُوَ بِرَجُلٍ مُعْتَزِلٍ لَمْ يُصَلِّ مَعَ الْقَوْمِ فَقَالَ مَا مَنَعَكَ يَا فُلَانُ أَنْ تُصَلِّيَ مَعَ الْقَوْمِ قَالَ أَصَابَتْنِي جَنَابَةٌ وَلَا مَاءَ قَالَ عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ فَإِنَّهُ يَكْفِيكَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔ [2]

ترجمہ: اور حضرت عمران رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) ہم نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ سفر میں تھے آپ نے (ہم) لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جب آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی علیحدہ بیٹھا ہوا ہے اس نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے فلاں! تمہیں لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے روک دیا تھا؟ اس نے عرض کیا کہ مجھے نہانے کی ضرورت ہوگئی ہے اور پانی نہیں ملا آپ ﷺ نے فرمایا (ایسی صورت میں) تمہیں مٹی سے (تیمم کر لینا) لازم تھا اور تمہیں وہی کافی تھا۔ (بخاری ومسلم)

﴿۳﴾ وَعَنْ عَمَّارٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ إِنِّي أَجْنَبْتُ فَلَمْ أُصِبِ الْمَاءَ فَقَالَ عَمَّارٌ لِعُمَرَ أَمَا تَذْكُرُ أَنَّا كُنَّا فِي سَفَرٍ أَنَا وَأَنْتَ فَأَمَّا أَنْتَ فَلَمْ تُصَلِّ وَأَمَّا أَنَا فَتَمَعَّكْتُ فَصَلَّيْتُ

[1] المرقات ۲/۲۲۷ [2] اخرجه البخاری ۱/۹۳ ومسلم ۲/۱۴۰

فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ هٰكَذَا فَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ بِكَفَّيْهِ الْأَرْضَ وَنَفَخَ فِيهِمَا ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ۔

(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَلِمُسْلِمٍ نَحْوُهُ وَفِيهِ قَالَ إِنَّمَا يَكْفِيكَ أَنْ تَضْرِبَ بِيَدَيْكَ الْأَرْضَ ثُمَّ تَنْفُخَ ثُمَّ تَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَكَ وَكَفَّيْكَ)۔ [1]

ترجمہ: اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے نہانے کی ضرورت ہے اور پانی نہیں ملا (تو اب میں تیمم کروں یا کیا کروں؟) حضرت عمار رضی اللہ عنہ (یہ سن کر) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بولے کیا تمہیں یاد نہیں رہا کہ میں اور تم سفر میں تھے (اور ہم دونوں کو نہانے کی ضرورت ہوگئی تھی) تو تم نے نماز نہیں پڑھی تھی لیکن میں نے زمین پر لوٹ پوٹ کر نماز پڑھ لی تھی پھر میں نے آنحضرت ﷺ سے صورت حال کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تمہیں اس طرح کر لینا کافی تھا چنانچہ آپ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے پھر ان پر پھونک مار کر (یعنی مٹی جھاڑ کر) ان سے اپنے منہ پر اور ہاتھوں پر مسح کر لیا۔ (بخاری)

توضیح: **اصابتی جنابة ولاماء:** مندرجہ بالا دونوں حدیثوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تیمم جس طرح حدث اصغر میں وضو کا قائم مقام ہے حدث اکبر یعنی جنابت میں بھی غسل کا قائم مقام ہے خواہ غسل جنابت ہو یا حیض و نفاس کا غسل ہو جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ اربعہ کا یہی مسلک ہے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم غسل جنابت کے لئے جائز ہے پھر جب پانی پر آدمی قادر ہو جائے تو غسل کرے اوپر دونوں حدیثیں جمہور کی دلیل ہیں نیز اس باب کی پہلی حدیث میں بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ مٹی ہر نجاست کے لئے طہور ہے لہٰذا حدث اکبر و اصغر دونوں کے لئے مٹی طاہر اور مطہر ہے طبقۂ صحابہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا مسلک یہ تھا کہ تیمم غسل جنابت کے لئے جائز نہیں ہے لیکن اتنی صریح احادیث کی موجودگی میں ان کا قول چھوڑا جائے گا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ان کا رجوع نقل کیا جاتا ہے جب رجوع کر لیا تو سب صحابہ اور جمہور کا مسلک ایک ہو گیا بعض محققین نے کہا ہے کہ ان حضرات کا مسلک پہلے سے جمہور کے ساتھ ہے لیکن انہوں نے یہ قول **سداً للذرائع** کے تحت اختیار کیا ہے تاکہ لوگ اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں کہ ذرا سا عذر آ گیا یا معمولی سی سردی آ گئی اور اس جنابت والے نے غسل کے بجائے تیمم کا آغاز کر دیا لوگوں کی اسی سستی کی وجہ سے ان حضرات نے تیمم سے لوگوں کو منع کر دیا تھا۔ [2]

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بحث کے دوران حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اصل حقیقت کو اس طرح اجاگر کر دیا فرمایا:

"**لو رخصت لهم في هذا كان اذا وجد احدهم البرد قال هكذا يعني تيمم وصلى**"۔ (بخاری صفحہ ۵۰ ج ۱) [3]

اوپر حدیث کا پس منظر اس طرح ہے کہ سائل کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو تیمم سے روک دیا تو حضرت

---

[1] اخرجه البخاری ۱/۹۲ مسلم ۱/۱۹۳ [2] المرقات ۲/۲۲۶ [3] البخاری ۱/۵۰

عمار رضی اللہ عنہ نے پورا واقعہ سنایا کہ میرا اور آپ کا تنازعہ ہوا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمم کو جائز قرار دیا تھا لہٰذا اس سائل کے لئے بھی تیمم کا حکم ہونا چاہیے۔

سلام کے جواب کے لئے تیمم

﴿٤﴾ وَعَنْ أَبِي الْجُهَيْمِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الصِّمَّةِ قَالَ مَرَرْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ يَبُوْلُ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ حَتّٰى قَامَ إِلٰى جِدَارٍ فَحَتَّهٗ بِعَصًا كَانَتْ مَعَهٗ ثُمَّ وَضَعَ يَدَيْهِ عَلَى الْجِدَارِ فَمَسَحَ وَجْهَهٗ وَذِرَاعَيْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَيَّ۔

(وَلَمْ أَجِدْ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَلَا فِيْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَلٰكِنْ ذَكَرَهٗ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ). [1]

ترجمہ: اور حضرت ابوجہیم ابن حارث ابن صمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ میں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سے گزرا آپ اس وقت پیشاب کررہے تھے میں نے آپ کو سلام کیا، آپ نے جواب نہیں دیا (اور پیشاب سے فارغ ہو کر) ایک دیوار کے پاس کھڑے ہوئے اور ایک لاٹھی سے جو آپ کے پاس تھی دیوار کھرچ کر اپنے دونوں ہاتھ اس پر مارے پھر اپنے منہ اور کہنیوں تک دونوں ہاتھوں پر مسح کر کے میرے سلام کا جواب دیا۔ (مشکوٰۃ کے مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ روایت نہ صحیحین میں ملی ہے اور نہ حمیدی کی کتاب میں ہاں محی السنۃ نے شرح السنۃ میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے) (لہٰذا صاحب مصابیح کو چاہیئے تھا کہ اس روایت کو پہلی فصل میں ذکر نہ کرتے)۔

توضیح: **فسلمت علیه:** اس سے پہلے دو دفعہ یہ مسئلہ لکھا گیا ہے کہ عبادت غیر مقصودہ کے لئے جو تیمم کرلیا جائے اس سے عبادت مقصودہ ادا نہیں ہوسکتی ہے مقصودہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ عبادت خود اصل اور مقصود ہو کسی اور عبادت کے لئے ذریعہ نہ ہو جیسے نماز ہے تلاوت وغیرہ ہے۔ اور غیر مقصودہ وہ عبادت ہے جو غیر کے لئے ذریعہ اور وسیلہ ہو یا یوں سمجھ لو کہ عبادت مقصودہ وہ ہے جو خود مقصود اور اصل ہو اور عبادت غیر مقصودہ وہ ہوتی ہے جو خود اصل نہ ہو بلکہ کسی عبادت مقصودہ کے ضمن میں ہو جیسے تیمم ہے اور وضو اور غسل ہے اسی طرح یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ تیمم ایسی عبادت کے لئے بھی ہوسکتی ہے جس کے مکمل فوت ہونے کا خطرہ ہو اور اس کا کوئی خلیفہ و نائب نہ ہو جیسے عیدین اور جنازہ کی نماز ہے یا سلام کا جواب ہے یہاں سلام کے جواب کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمم اس لئے کیا کہ جواب فوت ہونے کا خطرہ تھا۔ [2]

الفصل الثانی

پانی نہ ملے تو تیمم کرتے رہو

﴿٥﴾ وَعَنْ أَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِنَّ الصَّعِيْدَ الطَّيِّبَ وُضُوْءُ الْمُسْلِمِ وَإِنْ لَمْ يَجِدِ

[1] اخرجه البخاری ۱/۹۲ ومسلم [2] المرقات ۲/۲۲۸،۲۲۹

الْمَاءَ عَشْرَ سِنِيْنَ فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيُمِسَّهُ بَشَرَتَهُ فَإِنَّ ذٰلِكَ خَيْرٌ.

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْدَاوُدَ وَرَوَى النَّسَائِيُّ نَحْوَهُ إِلَى قَوْلِهِ عَشْرَ سِنِيْنَ.)[1]

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ''پاک مٹی مسلمان کو پاک کرنے والی ہے، اگرچہ وہ دس برس تک پانی نہ پائے اور جس وقت پانی مل جائے تو بدن دھولینا چاہیئے کیونکہ یہ بہتر ہے۔'' (احمد، ترمذی، ابوداؤد) اور نسائی نے بھی اسی طرح کی روایت عشر سنین تک نقل کی ہے۔

بغیر علم مسئلہ نہ بتاؤ

﴿۶﴾ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجْنَا فِيْ سَفَرٍ فَأَصَابَ رَجُلاً مِنَّا حَجَرٌ فَشَجَّهُ فِيْ رَأْسِهِ فَاحْتَلَمَ فَسَأَلَ أَصْحَابَهُ هَلْ تَجِدُوْنَ لِيْ رُخْصَةً فِي التَّيَمُّمِ قَالُوْا مَا نَجِدُ لَكَ رُخْصَةً وَأَنْتَ تَقْدِرُ عَلَى الْمَاءِ فَاغْتَسَلَ فَمَاتَ فَلَمَّا قَدِمْنَا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ أُخْبِرَ بِذٰلِكَ قَالَ قَتَلُوْهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ أَلاَّ سَأَلُوْا إِذَا لَمْ يَعْلَمُوْا فَإِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْهِ أَنْ يَّتَيَمَّمَ وَيُعَصِّبَ عَلَى جُرْحِهِ خِرْقَةً ثُمَّ يَمْسَحَ عَلَيْهَا وَيَغْسِلَ سَائِرَ جَسَدِهِ. (رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَه عَنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِيْ رَبَاحٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ.)[2]

ترجمہ: اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ہم سفر میں جارہے تھے کہ ہم میں سے ایک شخص کے پتھر لگا جس نے اس کے سر کو زخمی کر ڈالا (اتفاق سے) اسے نہانے کی حاجت بھی ہوگئی چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ تمہارے نزدیک (اس صورت میں) میرے لئے تیمم کرنا جائز ہے؟ انہوں نے کہا ''ایسی صورت میں جبکہ تم پانی استعمال کرسکتے ہو ہم تمہارے لئے تیمم کی کوئی وجہ نہیں پاتے'' چنانچہ اس شخص نے غسل کیا (جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) اس کا انتقال ہوگیا۔ جب ہم (سفر سے واپس ہوکر) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ سے یہ واقعہ بیان کیا آپ نے (انتہائی رنج اور تکلیف کے ساتھ) فرمایا ''لوگوں نے اسے ماردیا، خدا انہیں مارے (پھر فرمایا کہ) ان کو جو بات معلوم نہ تھی اسے انہوں نے جاننے والے سے دریافت کیوں نہ کرلیا؟ (کیونکہ) نادانی کی بیماری کا علاج سوال ہے اور اسے تو یہی کافی تھا کہ تیمم کرلیتا اور زخم پر ایک پٹی باندھ کر اس پر مسح کرلیتا اور پھر اپنا تمام بدن دھولیتا'' (ابوداؤد) اور ابن ماجہ نے اس روایت کو عطاء بن رباح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

توضیح: **قتلوه قتلهم الله:** یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اس مریض کو جو مسئلہ بتایا اس میں ان کو غلطی ہوئی اور یہی مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بتایا وہاں بھی ان سے غلطی ہوئی کہ

[1] اخرجه احمد ۵/۱۵۵ والترمذی ۱۲۴ وابو داؤد ۳۳۲ [2] اخرجه ابو داؤد ۳۳۶ وابن ماجه

غسل جنابت کے لئے تیمم کافی نہیں ہے۔

مگر یہاں آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو ڈانٹ کر اس طرح جملہ فرمادیا جو اوپر مذکور ہے اور وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی کوئی ڈانٹ نہیں ہوئی حالانکہ دونوں جگہ ایک ہی مسئلہ تھا کہ تیمم غسل کے لئے جائز نہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تو نماز بھی فوت ہوگئی تھی اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ وہ حضرات اجتہاد کے اہل تھے اور **صالح للاجتہاد** آدمی سے جب اجتہادی غلطی ہوتی ہے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے ڈانٹا نہیں جاتا ہے اور یہاں ان لوگوں سے جو غلطی ہوئی یہ بھی اجتہادی غلطی تھی لیکن یہ لوگ **صالح للاجتہاد** نہیں تھے جب یہ اجتہاد کے اہل نہیں تھے اور اجتہاد میں غلطی کی تو ان کو ڈانٹنا ضروری تھا۔

یہ لوگ اہل کیسے نہیں تھے یہ کیسے پتہ چلا تو حدیث میں لفظ "اَلْعَیُّ" آیا ہے اس کا ترجمہ عاجز ناواقف ہے اور مراد جہل ہے معلوم ہوا یہ لوگ اہل نہیں تھے اور جب خود اہل علم نہیں تھے اہل اجتہاد نہیں تھے تو انہوں نے کیوں فتویٰ دیا جس سے آدمی مرگیا۔ یہ لوگ کسی عالم صاحب اجتہاد سے پوچھتے وہ صحیح مسئلہ بتاتا اس سے معلوم ہوا کہ جب مسئلہ خود معلوم نہیں تو صاحب علم سے پوچھ کر اس کی تقلید کرنا چاہئے اور یہی تقلید ہے مسلمانوں نے اپنے ائمہ کو شارع نہیں بنایا ہے بلکہ خود نہ سمجھنے کی وجہ سے زمانہ کے سب سے بڑے عالم مجتہد کی بات مان کر قبول کرلی۔ یہی تقلید ہم مانتے ہیں۔ غیر مقلد بھی یہی کچھ کرتے ہیں مگر اپنے آپ کو مقلد نہیں کہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے ڈانٹ پلائی تھی مگر تاوان بوجہ اجتہاد نہیں لیا۔

تیمم کیا اور نماز پڑھی پھر پانی ملا تو کیا کرے؟

﴿۷﴾ وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَرَجَ رَجُلَانِ فِيْ سَفَرٍ فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ وَلَيْسَ مَعَهُمَا مَاءٌ فَتَيَمَّمَا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَصَلَّيَا ثُمَّ وَجَدَا الْمَاءَ فِي الْوَقْتِ فَأَعَادَ أَحَدُهُمَا الصَّلَاةَ بِوُضُوْءٍ وَلَمْ يُعِدِ الْآخَرُ ثُمَّ أَتَيَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَذَكَرَا ذٰلِكَ فَقَالَ لِلَّذِيْ لَمْ يُعِدْ أَصَبْتَ السُّنَّةَ وَأَجْزَأَتْكَ صَلَاتُكَ وَقَالَ لِلَّذِيْ تَوَضَّأَ وَأَعَادَ لَكَ الْأَجْرُ مَرَّتَيْنِ۔

(رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ وَرَوَى النَّسَائِيُّ نَحْوَهُ وَقَدْ رَوَى هُوَ وَأَبُوْدَاوُدَ أَيْضًا عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ مُرْسَلًا)۔[۱]

ترجمہ: اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”دو شخص سفر کو روانہ ہوئے (اثناء سفر) نماز کا وقت ہوا مگر ان کے پاس پانی نہیں تھا چنانچہ دونوں نے پاک مٹی سے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی (آگے چل کر) انہیں پانی مل گیا اور نماز کا وقت بھی باقی تھا لہٰذا ان میں سے ایک نے وضو کر کے نماز لوٹائی مگر دوسرے نے نہیں لوٹائی۔ جب دونوں نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو واقعہ ذکر کیا آنحضرت ﷺ نے (پورا واقعہ سن کر) اس شخص سے جس نے نماز نہیں لوٹائی تھی

[۱] اخرجه ابو داؤد ۳۳۸ والدارمی ۵۰

فرمایا کہ تم نے سنت پر عمل کیا تمہارے لئے وہ نماز کافی ہے اور جس شخص نے وضو کر کے نماز لوٹائی تھی آپ نے اس سے فرمایا ''تمہارے لئے دوگنا اجر ہے'' (ابوداؤد، دارمی)

توضیح: مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نے تیمم سے نماز پڑھ لی بعد میں پانی مل گیا تو نماز ہوگئی اور اگر تیمم کے بعد اور نماز سے پہلے پانی مل گیا تو وضو بنالے دونوں مسئلوں میں اتفاق ہے اور اگر تیمم کر لیا اور نماز شروع کی پھر درمیان میں پانی نظر آگیا تو اس تیسری صورت میں فقہاء کا اختلاف ہے احناف اور حنابلہ کے نزدیک نماز باطل ہوگئی یہ آدمی وضو کرے اور نماز پڑھے امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ آدمی تیمم ہی کے ساتھ نماز کو پورا کرلے احناف اور حنابلہ نے ان روایات سے استدلال کیا ہے جس میں ''ان لم یجد الماء'' کے الفاظ بطور شرط مذکور ہیں اور ''فاذا وجد الماء فلیمس بشرہ'' کے الفاظ ہیں تو جب بھی پانی ملا تیمم ختم ہو جائے گا تو دوران نماز پانی دیکھنے سے نماز بھی ختم ہو جائے گی۔[1]

الفصل الثالث

﴿۸﴾ وَعَنْ أَبِي الْجُهَيْمِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الصِّمَّةِ قَالَ أَقْبَلَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ نَحْوِ بِئْرِ جَمَلٍ فَلَقِيَهُ رَجُلٌ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ النَّبِيُّ ﷺ حَتّٰى أَقْبَلَ عَلَى الْجِدَارِ فَمَسَحَ بِوَجْهِهٖ وَيَدَيْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.)[2]

ترجمہ: حضرت ابوجہیم ابن حارث ابن صمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''نبی کریم ﷺ (مدینہ میں) جمل کنویں کی طرف سے تشریف لائے آپ سے ایک شخص (یعنی خود ابی جہیم) ملے اور سلام کیا سرکار دو عالم ﷺ نے ان کو سلام کا جواب نہیں دیا اور ایک دیوار کے پاس تشریف لائے چنانچہ (پہلے) آپ نے منہ اور ہاتھوں کا مسح کیا (یعنی تیمم کیا) پھر سلام کا جواب دیا۔ (بخاری ومسلم)

تیمم کے لئے دو ضربتین کا ثبوت

﴿۹﴾ وَعَنْ عَمَّارِ ابْنِ يَاسِرٍ أَنَّهُ كَانَ يُحَدِّثُ أَنَّهُمْ تَمَسَّحُوا وَهُمْ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بِالصَّعِيْدِ لِصَلَاةِ الْفَجْرِ فَضَرَبُوا بِأَكُفِّهِمُ الصَّعِيْدَ ثُمَّ مَسَحُوا بِوُجُوْهِهِمْ مَسْحَةً وَاحِدَةً ثُمَّ عَادُوا فَضَرَبُوا بِأَكُفِّهِمُ الصَّعِيْدَ مَرَّةً أُخْرٰى فَمَسَحُوا بِأَيْدِيهِمْ كُلِّهَا إِلَى الْمَنَاكِبِ وَالْآبَاطِ مِنْ بُطُونِ أَيْدِيهِمْ۔ (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ)[3]

ترجمہ: اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دفعہ) چند صحابہ نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے (اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے) فجر کی نماز کے لئے انہوں نے پاک مٹی سے (اس طرح) تیمم کیا (کہ پہلے) اپنے ہاتھوں کو مٹی پر مار کر اپنے چہرہ پر

[1] المرقات ۲/۲۳۳ [2] اخرجه البخاری ۱/۹۲ مسلم [3] اخرجه ابو داود ۳۱۸،۳۱۹

پھیرا پھر دوسری مرتبہ اپنے ہاتھوں کو مٹی پر مار کر اپنے پورے ہاتھوں پر یعنی مونڈھوں اور بغلوں کے اندر تک مسح کیا ہاتھوں کے اندر کی طرف سے''۔ (ابوداؤد)

توضیح: **ثم عادوا. فضربوا:** یہ حدیث انتہائی وضاحت کے ساتھ یہ بات بتا رہی ہے کہ تیمم کے لئے دو ضربیں ہیں۔ [1]

المناکب: مونڈھوں تک تیمم میں مسح کرنا اور بغلوں تک تیمم کرنا یہ صحابہ کرام کا ظاہری آیت سے ایک اجتہادی استنباطی حکم تھا یعنی ''ید'' کے لفظ سے انہوں نے پورا ہاتھ کندھوں تک سمجھ لیا کیونکہ لغت میں ''ید'' کا اطلاق اسی طرح ہوتا ہے لیکن چونکہ شارع علیہ السلام کے فعل سے کہنیوں تک کا حکم ملتا ہے اس لئے اسی پر عمل کیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ لغت کے زور سے اور عربی دانی کی قوت سے شریعت کو کامل طور پر سمجھنا انتہائی مشکل ہے آج کل کچھ عربی جاننے والے پروفیسر حضرات کو اسی مشکل نے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ تیمم وضو کا قائم مقام ہے جب وضو میں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا ہے تو اس کے قائم مقام تیمم میں بھی اسی طرح ہونا چاہیے۔ تیمم کے جواز کے لئے چار شرائط ہیں: [2]

1. پانی کے استعمال سے حقیقۃً یا حکماً عاجز ہونا
2. جس چیز سے تیمم کیا جائے اس کا پاک ہونا
3. اعضاء تیمم کے تمام حصوں پر اس طرح ہاتھ پھیرنا کہ کوئی جگہ مسح کے بغیر نہ رہ جائے
4. عبادت مقصودہ کی نیت سے تیمم کرنا۔

[1] المرقات ۲/۲۲۳،۲۲۵ [2] المرقات ۲/۲۲۵

۷ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

باب الغسل المسنون

مسنون غسل کا بیان

صاحب مشکوۃ اس سے پہلے باب الغسل کے عنوان سے ایک باب قائم کر چکے ہیں لیکن اس کے بعد غسل مسنون کے عنوان سے یہاں انہوں نے ایک اور باب قائم کر دیا ہے جس سے اشارہ ملتا ہے کہ پہلے اس غسل کے احکام تھے جو فرض اور واجب کی قسم سے تھا اور یہاں اس غسل کا بیان ہے جو سنت یا مستحب کی قسم میں سے ہے چنانچہ اس باب میں صاحب مشکوۃ نے چار قسم کے غسلوں کا بیان کیا ہے پہلا جمعہ کے دن کا غسل دوسرا مُردے کو غسل دینے کے بعد خود غسل کرنا تیسرا سینگی اور حجامہ کرانے کے بعد غسل کرنا اور چوتھا اسلام قبول کرتے وقت غسل کرنا۔

اس کے علاوہ عیدین کے لئے غسل کرنا فقہاء نے مسنون لکھا ہے مگر اس کے لئے جو دو یا زیادہ احادیث آئی ہیں وہ ضعیف ہیں شاید اس وجہ سے مؤلف نے اس کا ذکر نہیں کیا تاہم صحابہ کے دور سے امت میں عیدین کے لئے غسل کرنے کا معمول چلا آیا ہے اسی طرح یوم عرفہ کے لئے اور بوقت احرام غسل کرنے کو فقہاء نے مستحب لکھا ہے اسلام کا عام حکم تمام مسلمانوں کو یہ ہے کہ ایک ہفتہ میں کم از کم ایک بار غسل کرلیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پاکیزگی کا یہ بڑا تحفہ دیا ہے جس سے غیر مسلم محروم ہیں۔

الغسل: غین کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ ہے جسم کو سر سے لے کر پاؤں تک تمام اعضاء کے دھونے کا نام غسل ہے۔ اور غین کے فتح کے ساتھ کسی بھی چیز کے دھونے کو غَسل کہتے ہیں اور غین اور سین دونوں کے ضمہ کے ساتھ غُسُل ہو تو یہ غسل کے پانی پر بولا جاتا ہے اور غین کا کسرہ اور سین کا سکون ہو تو غسل کے پانی کے اندر صابن یا سرف یا اشنان وغیرہ ملی ہوئی اشیاء کو کہتے ہیں۔

الفصل الاول

غسل یوم الجمعة

﴿۱﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ. قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِذَا جَاءَ اَحَدُكُمُ الْجُمُعَةَ فَلْيَغْتَسِلْ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1]

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی جمعہ کی نماز پڑھنے آئے تو

[1] اخرجه البخاری ۲/۲ ومسلم ۳/۲

اسے چاہیئے کہ غسل کرلے۔ (بخاری ومسلم)

﴿۲﴾ وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ غُسْلُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُحْتَلِمٍ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۱]

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر بالغ پر جمعہ کے روز نہانا واجب ہے۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: **اذا جاء احدکم الجمعة فلیغتسل:** جمعہ کے لئے غسل کرنے کے بارے میں "**فلیغتسل**" کا لفظ بھی آیا ہے جو امر کا صیغہ ہے "**حق**" کا کلمہ بھی آیا ہے اور "**واجب**" کا لفظ بھی موجود ہے اسی طرح تاکید کے دیگر الفاظ بھی آئے ہیں جس کی وجہ سے فقہاء کا اختلاف ہوگیا کہ آیا یہ غسل واجب ہے یا مسنون ہے یا مستحب ہے۔

غسل جمعہ میں فقہاء کا اختلاف:

اہل ظواہر کے ہاں غسل جمعہ فرض اور واجب ہے۔ جمہور فقہاء کے ہاں جمعہ کا غسل سنت ہے جمہور صحابہ کرام بھی سنت ہونے کے قائل تھے تاہم حضرت ابوہریرہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما جمعہ کے غسل کے وجوب کے قائل تھے اور یہ مسلک حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔[۲]

دلائل:

اہل ظواہر اور غسل جمعہ کے وجوب کے قائلین کے دلائل زیر بحث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسعید خدری رحمہ اللہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیثیں ہیں جس کے ظاہر سے وجوب کا پتہ چلتا ہے بلکہ وجوب کے واضح الفاظ ہیں اور یہ تینوں حدیثیں **باب الغسل المسنون** کی فصل اول میں ہیں۔[۳]

جمہور فقہاء نے مشکوۃ ص ۵۵ پر حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جو فصل ثانی کی پہلی حدیث ہے جس میں "**فالغسل افضل**" کے الفاظ ہیں اور اسی صفحہ پر حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کی روایت سے استدلال کیا ہے ان حضرات کی تیسری دلیل حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مکالمہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمارہے تھے کہ اتنے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف لائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دیر سے آنے پر تنبیہ کی تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اے امیر المؤمنین! میں وضو بنا رہا تھا کہ دیر ہوگئی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا "**الوضوء ایضا**"۔[۴] (لمعات) یعنی دیر سے بھی آئے اور غسل بھی نہیں کیا صرف وضو بنا کر آئے؟ بس اتنا مکالمہ تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیٹھ گئے اور جمعہ پڑھ لیا جمہور فرماتے ہیں کہ اگر غسل واجب یا فرض ہوتا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضرور غسل کے لئے بھیج دیتے معلوم ہوا واجب نہیں جمہور نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تفصیلی گفتگو سے بھی

---

[۱] اخرجه البخاری ۲/۶،۲/۳ ومسلم ۲/۳ [۲] المرقات ۲/۲۳۵،۲۳۶ [۳] المرقات ۲/۲۳۶ [۴] اسعته المعات ۱/۲۸۷ المرقات ۲/۲۴۱

استدلال کیا ہے جو باب الغسل کے آخر میں آرہی ہے اور حضرت عکرمہ رحمہ اللہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور تابعی ہیں انہوں نے یہ روایت نقل کی ہے۔ان تمام روایات کی روشنی میں جمہور جمعہ کے غسل کو مسنون اور مستحب قرار دیتے ہیں۔[1]

جواب: جمہور نے قائلین وجوب غسل کے دلائل کے کئی جوابات دیئے ہیں فرماتے ہیں کہ جہاں امر کا صیغہ آیا ہے وہاں غسل کی دیگر روایات کے پیش نظر امر کو استحباب پر حمل کریں گے کیونکہ قرینہ صارفہ موجود ہے کہ اس امر کو وجوب پر حمل نہیں کیا جاسکتا ہے تو یہ امر "**واذا حللتم فاصطادوا**" کے امر کی طرح استحباب پر محمول ہے۔

اور جہاں احادیث میں حق یا واجب کے الفاظ آئے ہیں وہ ثابت کے معنیٰ میں ہیں یا حق سے مراد سنت مؤکدہ کا حکم لیا جائے گا یا یہ روایات موقوف ومنسوخ ہیں یعنی انتہاء حکم بسبب انتہاء علت ہو گیا ہے اس کا قصہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت مشکوٰۃ ص ۵۵ فصل ثالث میں اس باب کی آخری حدیث میں بہت تفصیل سے مذکور ہے جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس زمانہ کا پورا نقشہ پیش کیا ہے گویا غسل کا وجوب ابتداء اسلام میں تھا پھر موقوف ہو گیا بہر حال دلائل جیسے بھی ہوں لیکن افضل اور بہتر غسل کرنا ہی ہے اور احتیاط ان حضرات کے مسلک میں ہے جو جمہور کے علاوہ ہیں۔اور غسل جمعہ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

غسل جمعہ، دن کے لئے ہے یا نماز کے لئے؟

﴿۳﴾ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ حَقٌّ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ أَنْ يَغْتَسِلَ فِيْ كُلِّ سَبْعَةِ أَيَّامٍ يَوْمًا يَغْسِلُ فِيْهِ رَأْسَهٗ وَجَسَدَهٗ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ہر (عاقل بالغ) مسلمان پر حق ہے (یعنی ثابت اور لازم ہے یا لائق ہے) کہ ہر ہفتہ میں ایک دن (یعنی جمعہ کو) نہائے اور اپنا سر اور بدن دھوئے"۔ (بخاری ومسلم)

توضیح: جمعہ کے غسل میں دوسرا اختلاف اس میں ہے کہ آیا یہ غسل یوم جمعہ کے لئے ہے یا صلوٰۃ جمعہ کے لئے ہے۔ جمہور کے ہاں یہ یوم الجمعۃ کے لئے ہے اور احناف کے ہاں صلوٰۃ الجمعۃ کے لئے ہے امام مالک رحمہ اللہ سے دو قول مروی ہیں ایک قول جمہور کے موافق ہے اور دوسرا احناف کے ساتھ ہے۔

اختلاف کا ثمرہ:

اس اختلاف کا ثمرہ اس وقت ظاہر ہوگا کہ جو حضرات غسل کو جمعہ کی نماز کے لئے سنت قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک یہ سنت تب پوری ہوگی جب کہ اسی غسل کے ساتھ نماز ادا کی جائے اگر صبح سویرے غسل کیا اور پھر وضو ٹوٹ گیا اور اس غسل سے نماز نہ پڑھی تو سنت پوری نہیں ہوگی اور جو حضرات اس غسل کو یوم جمعہ کے لئے قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اگر جمعہ کے

[1] المرقات ۲/۲۲۱ [2] اخرجه البخاری ۲/۶ ومسلم ۳/۴

دن صبح کو غسل کیا تو سنت ادا ہو جائے گی نماز اس غسل سے ہو یا نہ ہو لیکن اگر کوئی شخص نماز کے بعد غسل کرتا ہے تو کسی کے نزدیک سنت ادا نہ ہوگی۔

احادیث میں جو یوم جمعہ اور صلوۃ جمعہ اور ہفتہ میں ایک بار غسل کرنے کا حکم آیا ہے تو بظاہر اس میں تعارض نظر آ رہا ہے مگر احادیث میں تعارض نہیں بلکہ تین قسم کے غسل مستحب ہیں اور تینوں کے لئے مختلف احادیث آئی ہیں اب جمعہ کی نماز کے لئے جس غسل کا حکم ہے اگر اس میں یہ نیت کر لی جائے کہ جمعہ کے دن اور نماز کا غسل بھی کر رہا ہوں اور یہ نیت بھی کر لے کہ ہفتہ وار غسل کر رہا ہوں تو کوئی تعارض نہیں ہوگا اور تمام احادیث پر عمل ہو جائے گا۔

الفصل الثانی

جمعہ کے غسل میں نرمی

﴿۴﴾ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَوَضَّأَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَبِهَا وَنِعْمَتْ وَمَنِ اغْتَسَلَ فَالْغُسْلُ أَفْضَلُ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ.)[1]

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس نے جمعہ کے روز وضو ہی کر لیا تو اس نے فرض ادا کیا اور یہ بہت اچھا فرض ہے اور جس شخص نے (نماز جمعہ کے لئے) غسل کیا تو یہ بہت ہی اچھا ہے"

(احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، دارمی)

﴿۵﴾ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ غَسَّلَ مَيِّتًا فَلْيَغْتَسِلْ۔
(رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَزَادَ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَمَنْ حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ.)[2]

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ا نے فرمایا "جس شخص نے مردے کو نہلایا ہو اسے خود بھی نہا لینا چاہئے"۔

(ابن ماجہ) اور احمد، ترمذی و ابوداؤد نے (اس حدیث میں) مزید نقل کیا ہے کہ (آپ نے یہ بھی فرمایا کہ) جو شخص جنازہ کو کاندھا دینے کا ارادہ کرے اسے وضو کر لینا چاہیے"۔

چار چیزوں کی وجہ سے غسل

﴿۶﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَغْتَسِلُ مِنْ أَرْبَعٍ مِنَ الْجَنَابَةِ وَيَوْمَ الْجُمُعَةِ وَمِنَ الْحِجَامَةِ وَمِنْ غُسْلِ الْمَيِّتِ۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ.)[3]

---

[1] اخرجہ احمد ۵/۸ وابو داؤد ۳۵۴ والترمذی ۴۹۷ [2] اخرجہ احمد ۲/۴۳۳ والترمذی ۹۹۳ [3] اخرجہ ابو داؤد ۳۴۸

ترجمہ: اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ”نبی کریم ﷺ چار چیزوں کی وجہ سے نہانے کا حکم دیا کرتے تھے ① جنابت (یعنی ناپاکی) سے ② جمعہ کے واسطے ③ سینگی کھچوانے سے ④ مردہ کو نہلانے سے“۔ (ابوداؤد)

توضیح: اس حدیث میں چار چیزوں کی وجہ سے غسل کا حکم دیا گیا ہے۔ میت کو غسل دینے کے بعد غسل دینے والے پر جمہور فقہاء کے نزدیک غسل نہیں ہے اسی طرح اس شخص پر بھی غسل نہیں ہے جس نے میت کا جنازہ اٹھایا ہو اور نہ اس شخص پر غسل ہے جس نے سینگی لگوائی ہو ہاں جنابت والے پر غسل فرض ہے۔

اہل ظواہر کے ہاں جنازہ اٹھانے والے کو اور میت کو غسل دینے والے پر خود غسل واجب ہو جاتا ہے ان حضرات نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جس میں "**من غسل میتا فلیغتسل**" کے الفاظ ہیں اور دوسرا استدلال حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے کیا ہے جس میں "**ومن غسل المیت**" کے الفاظ ہیں جمہور کے ہاں ان لوگوں پر اس لئے غسل نہیں ہے کہ موجب غسل کوئی چیز موجود نہیں ہے محض اس وہم کی بنیاد پر کہ کہیں چھینٹیں پڑنے سے جسم پر نجاست لگی ہوگی وجوب غسل کے لئے کافی نہیں کیونکہ یہ کوئی یقینی بات نہیں ہے۔[1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے "**کنا نغسل المیت فبعضنا یغتسل وبعضنا لا یغتسل**"

(اخرجه الخطیب)

اس سے معلوم ہوگیا کہ اگر کہیں نجاست لگ جائے تو غسل کریں گے ورنہ نہیں کریں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں "**من حمله فلیتوضأ**" میں حمل سے مراد یہ کہ جب ایک شخص جنازہ اٹھا کر اس کے ساتھ جا رہا ہے تو اسے چاہیے کہ وضو بنا کر جائے کیونکہ آگے جا کر اس کو جنازہ کی نماز پڑھنی ہوگی تو تیار رہے گا یا یہ روایت منسوخ ہے ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ روایت منسوخ ہے یا امر استحبابی ہے۔

ومن غسل المیت: یعنی مردے کو نہلانے کے بعد غسل فرماتے تھے یاد رکھو آنحضرت ﷺ نے زندگی بھر کسی مردے کو خود غسل نہیں دیا ہے یہاں اسناد اور نسبت مجازی ہے جیسے "**بنی الامیر القصر**" میں اسناد الی غیر ما ھو له ہے یا جس طرح حدیث ہے:

"**ان النبی صلی الله علیه وسلم رجم ماعزا**" ای امر برجمه۔[2]

﴿۷﴾ وَعَنْ قَيْسِ بْنِ عَاصِمٍ أَنَّهُ أَسْلَمَ فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَغْتَسِلَ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ)[3]

ترجمہ: اور حضرت قیس بن عاصم رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ جب وہ اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہوئے تو نبی

---

[1] المرقات ۲/۲۳۹ [2] المرقات ۲/۲۳۹ [3] اخرجه الترمذی ۶۰۵ وابو داؤد ۳۵۵

اکرم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ پانی اور بیری کے پتوں سے نہائیں۔ (ترمذی، ابوداود، نسائی)

توضیح: انه اسلم: اسلام سے پہلے اگر کافر جنابت کی حالت میں ہو تو اسلام قبول کرنے کے بعد اس پر غسل کرنا فرض ہے اور اگر اسلام قبول کرنے کے بعد وہ شخص جنابت میں نہ ہو تو غسل کرنا مستحب ہے خلاصہ یہ ہے کہ اسلام غسل کے بغیر بھی قبول کیا جاسکتا ہے۔[1]

الفصل الثالث

غسل جمعہ کا پس منظر

﴿۸﴾ وَعَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ إِنَّ أُنَاسًا مِّنْ أَهْلِ الْعِرَاقِ جَاءُوْا فَقَالُوا يَا ابْنَ عَبَّاسٍ أَتَرَى الْغُسْلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَاجِبًا قَالَ لَا وَلٰكِنَّهُ أَطْهَرُ وَخَيْرٌ لِمَنِ اغْتَسَلَ، وَمَنْ لَمْ يَغْتَسِلْ فَلَيْسَ عَلَيْهِ بِوَاجِبٍ وَسَأُخْبِرُكُمْ كَيْفَ بَدْءُ الْغُسْلِ كَانَ النَّاسُ مَجْهُودِيْنَ يَلْبَسُوْنَ الصُّوْفَ وَيَعْمَلُوْنَ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ وَكَانَ مَسْجِدُهُمْ ضَيِّقًا مُقَارِبَ السَّقْفِ إِنَّمَا هُوَ عَرِيْشٌ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ يَوْمٍ حَارٍّ وَعَرِقَ النَّاسُ فِيْ ذٰلِكَ الصُّوْفِ حَتّٰى ثَارَتْ مِنْهُمْ رِيَاحٌ آذٰى بِذٰلِكَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فَلَمَّا وَجَدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تِلْكَ الرِّيَاحَ قَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِذَا كَانَ هٰذَا الْيَوْمُ فَاغْتَسِلُوْا وَلْيَمَسَّ أَحَدُكُمْ أَفْضَلَ مَا يَجِدُ مِنْ دُهْنِهِ وَطِيْبِهِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ ثُمَّ جَاءَ اللّٰهُ بِالْخَيْرِ وَلَبِسُوْا غَيْرَ الصُّوْفِ وَكُفُوا الْعَمَلَ وَوُسِّعَ مَسْجِدُهُمْ وَذَهَبَ بَعْضُ الَّذِيْ كَانَ يُؤْذِيْ بَعْضُهُمْ بَعْضًا مِنَ الْعَرَقِ.

(رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[2]

ترجمہ: حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ عراق کے چند آدمی آئے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ کیا آپ کی رائے میں جمعہ کے دن نہانا واجب ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! مگر (جمعہ کے دن نہانا) بہت زیادہ صفائی اور ستھرائی ہے اور جو شخص غسل کرلے اس کے لئے بہتر ہے اور جو شخص نہ نہائے اس پر واجب بھی نہیں ہے اور میں تم کو بتاتا ہوں کہ جمعہ کے دن غسل کی ابتداء کیونکر ہوئی؟ (یعنی جمعہ کے روز غسل کس وجہ سے شروع ہوا) تو اصل بات یہ تھی کہ اسلام کے شروع زمانہ میں بعض نادار صحابہ صوف پہنتے تھے اور پیٹھ پر (بوجھ اٹھانے کا) کام کرتے تھے ان کی مسجد تنگ تھی جس کی چھت نیچی اور کھجور کی

[1] المرقات ۲/۲۲ [2] اخرجہ ابوداود ۳۵۳

ٹہنیوں کی تھی ایک مرتبہ جمعہ کے دن جب کہ سخت گرمی تھی سرکار دو عالم ﷺ (مسجد میں) تشریف لائے (سخت گرمی کی وجہ سے) صوف کے اندر لوگ پسینہ سے تر ہو گئے یہاں تک کہ (پسینہ کی) بدبو پھیلی جس سے لوگ آپس میں تکلیف محسوس کرنے لگے جب سرکار دو عالم ﷺ کو بدبو کا احساس ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''لوگو! جب جمعہ کا دن ہو تو غسل کر لیا کرو بلکہ تم میں سے جسے تیل یا خوشبو میسر ہو تو وہ اسے بھی لگا لیا کرے (یعنی بالوں میں تیل لگائے اور کپڑوں پر خوشبو (مثلاً عطر وغیرہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کی فراوانی کی تو لوگوں نے صوف چھوڑ کر (عمدہ) کپڑے استعمال کرنے شروع کر دیئے محنت و مشقت کے کام بھی چھوٹ گئے، مسجد بھی وسیع ہوگئی اور پسینہ کی وجہ سے لوگوں کو آپس میں جو تکلیف ہوتی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ (ابوداؤد)

اظہار تشکر

الحمدللہ جمعہ کے غسل کی یہ توضیح وتشریح میں ۲۹ رمضان ۱۴۲۲ھ جمعہ ہی کے دن مسجد حرام میں بیت اللہ کے سامنے لکھ رہا ہوں۔

(الحمد للہ علی انعامہ)

فضل محمد یوسف زئی نزیل بیت اللہ الحرام

۸ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

باب الحیض

حیض کا بیان

فقہاء میں یہ بحث چلی ہے کہ حیض انجاس میں سے ہے یا احداث میں سے ہے دونوں طرف فقہاء کی رائیں ہیں مگر اس اختلاف کی وجہ سے مسئلہ پر کوئی فرق نہیں پڑا البتہ حیض کی تعریف پر اس کا اثر پڑتا ہے جن حضرات نے حیض کو نجاست اور انجاس میں شمار کیا ہے ان کے ہاں حیض کی جو تعریف ہے اسی کو نقل کیا جاتا ہے۔[1]

حیض کی تعریف:

حیض کا لغوی معنی بہنے کا ہے عرب کہتے ہیں "**حاض الوادی**" ای سال اور اسی مفہوم میں حوض ہے جس کی طرف پانی بہہ کر جمع ہوجاتا ہے اور شریعت میں حیض کی تعریف فقہاء نے اس طرح کی ہے "**هو دم ينفضه رحم امرأة بالغة من غير داء**" اس مرض میں مبتلا عورت کو حائض بھی کہتے ہیں اور حائضہ بھی بولا جاتا ہے بعض نے یہ فرق کیا ہے کہ "**الحائض**" میں دوام کا مفہوم پڑا ہے اور "**الحائضة**" میں حدوث اور جدت کا مفہوم پڑا ہے۔ "**الحيضة**" حا کے فتح کے ساتھ ایک بار حیض آنے کو کہتے ہیں اور "حا" پر اگر کسرہ آجائے تو یہ حیض کا نام بھی ہے اور وہ حالت بھی ہے جس حالت میں یہ عورت مبتلا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بچے کی غذا کے لئے ماں کے رحم میں حیض کے خون کا انتظام کیا ہے چنانچہ چار ماہ کے بعد بچے میں جان آجاتی ہے تو وہ اس خون سے غذا حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چار ماہ کا جو خون رحم میں جمع ہوتا ہے وہ بچے کی ولادت کے بعد نفاس کی شکل میں باہر آتا ہے چار ماہ کے بعد کا خون بچہ پی جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کے منہ کو پاک رکھا ہے تاکہ اس سے اللہ کا مبارک نام لیا کرے لہٰذا بچہ منہ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ناف کی نالی کے ذریعہ سے اس خون سے غذا حاصل کرتا ہے اور منہ کو اللہ تعالیٰ کے مقدس نام لینے کے لئے پاک رکھا ہے: کسی نے کہا ہے:

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

حیض کا پس منظر:

حیض کی ابتداء کیسے ہوئی اور یہ بیماری عورتوں کے ساتھ کیوں لگی۔ اس کے بارے میں ایک تو نبی اکرم ﷺ کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیض کی اس بیماری کو آدم علیہ السلام کی بیٹیوں کے ساتھ لگا رکھا ہے (لمعات)[2] گویا حیض عورت کی طبیعت اور بشری تقاضا ہے اور یہ ان کی فطرت کا حصہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ سب سے پہلے حیض بنی اسرائیل کی عورتوں کو آیا تھا مصنف عبدالرزاق میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ

---

[1] المرقات ۲/۲۴۳ [2] اشعۃ اللمعات ۱/۲۸۹،۲۹۰

کی ایک حدیث میں ہے کہ بنی اسرائیل کی عورتیں اور مرد اکٹھے مسجد میں جا کر نماز پڑھتے تھے تو عورتوں نے یہ شرارت شروع کی کہ پیچھے سے مردوں کے مستور اعضاء کو جھانک کر دیکھتی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے ان پر حیض کی بیماری ڈالدی۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حوا علیہا السلام کو جنت سے زمین پر اتارا تو اس کے ساتھ حیض کی بیماری لگادی یہ سب کچھ لمعات میں شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔ بعض کتابوں میں یہ بھی ہے کہ حضرت حوا نے جنت میں جب گندم کے درخت کی ٹہنی سے دانہ حاصل کرنا چاہا تو وہ ٹہنی اوپر کی طرف بلند ہوگئی حضرت حوا نے جب اس کو کھینچا تو وہ ٹوٹ گئی اور اس سے خون بہنے لگا اس ٹہنی نے بددعا کی کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے ایسا خون جاری کردے جیسے خون تو نے مجھ سے جاری کیا اس بددعا کے بعد عورتوں کو حیض آنا شروع ہوگیا۔ بہر حال حیض عورت کی صحت کے لئے بہت ضروری ہے اور اولاد کا نظام بھی حیض کے ساتھ لگا ہوا ہے جس عورت کو حیض نہیں آتا وہ بیمار بھی رہتی ہے اور اولاد بھی نہیں ہوتی گویا یہ ایک طبعی نظام ہے جو عورت کی فطرت اور تخلیق کا حصہ ہے۔

الفصل الاول
مباحث الحیض

﴿۱﴾ وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ إِنَّ الْيَهُوْدَ كَانُوْا إِذَا حَاضَتِ الْمَرْأَةُ فِيْهِمْ لَمْ يُؤَاكِلُوْهَا وَلَمْ يُجَامِعُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ فَسَأَلَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ النَّبِيَّ فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالٰى وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ الْآيَةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ اِصْنَعُوْا كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا النِّكَاحَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ الْيَهُوْدَ فَقَالُوْا مَا يُرِيْدُ هٰذَا الرَّجُلُ أَنْ يَدَعَ مِنْ أَمْرِنَا شَيْئًا إِلَّا خَالَفَنَا فِيْهِ فَجَاءَ أُسَيْدُ بْنُ حُضَيْرٍ وَعَبَّادُ بْنُ بِشْرٍ فَقَالَا يَا رَسُوْلَ اللهِ إِنَّ الْيَهُوْدَ تَقُوْلُ كَذَا وَكَذَا أَفَلَا نُجَامِعُهُنَّ فَتَغَيَّرَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ حَتّٰى ظَنَنَّا أَنْ قَدْ وَجَدَ عَلَيْهِمَا فَخَرَجَا فَاسْتَقْبَلَتْهُمَا هَدِيَّةٌ مِنْ لَبَنٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَأَرْسَلَ فِيْ آثَارِهِمَا فَسَقَاهُمَا فَعَرَفَا أَنَّهُ لَمْ يَجِدْ عَلَيْهِمَا۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[۱]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "یہود میں جب کوئی عورت ایام سے ہوجاتی تو لوگ نہ صرف یہ کہ اس کے ساتھ کھاتے پیتے نہ تھے بلکہ اس کے ساتھ گھروں میں سونا بیٹھنا تک چھوڑ دیتے تھے چنانچہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ نے آپ سے اس کے بارے میں حکم پوچھا (کہ حائضہ عورتوں کے بارے میں یہودیوں کا تو یہ عمل ہے ہم کیا کریں؟) جبھی اللہ تعالیٰ نے یہ آیت **یسئلونك عن المحیض الایة** (یعنی یہ لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں الخ) نازل فرمائی (آیت کے نازل ہونے کے بعد) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (تم اپنی عورتوں کے ساتھ جب کہ وہ حائضہ ہوں) سوائے صحبت کے جو چاہو کرو

[۱] اخرجه مسلم ۱/۱۶۹

جب یہ خبر یہودیوں کو پہنچی تو انہوں نے کہا یہ شخص یعنی آنحضرت ﷺ ہمارے جس دینی امر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس میں ہماری مخالفت ضرور کرتے ہیں (یہودیوں کی زبانی یہ سن کر دو صحابہ) حضرت اسید ابن حضیر اور حضرت عباد ابن بشر رضی اللہ عنہما (دربار رسالت میں) حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہودی ایسا ایسا کہہ رہے ہیں (یعنی انہوں نے یہودیوں کا کلام نقل کیا اور پھر یہ کہا کہ) اگر اجازت ہو (تو یہودیوں کی موافقت کے لئے) ہم اپنی عورتوں کے پاس (ایام حیض میں) رہنا سہنا چھوڑ دیں۔ (یہ سن کر) آنحضرت کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا اور ہمیں یہ گماں ہو گیا کہ آپ ان دونوں پر خفا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ دونوں بھی نکل کر چل دیئے ان کے جاتے ہی آنحضرت ﷺ کے پاس کہیں سے تحفہ میں دودھ آ گیا آپ نے دونوں کے پیچھے (کسی شخص کو بلانے کے لئے) بھیجا (جب وہ آ گئے تو) آپ نے انہیں وہ دودھ پلا دیا (تا کہ انہیں آپ کے لطف و کرم کا احساس ہو جائے چنانچہ دودھ پینے کے بعد) انہوں نے جانا کہ آنحضرت ﷺ ہم سے ناراض نہیں۔'' (مسلم)

توضیح: حیض سے متعلق کئی مباحث ہیں اور اکثر میں اختلاف ہے۔

بحث اول:

حیض سے متعلق پہلی بحث اس کی مدت میں ہے تو اقل مدت حیض اور اکثر مدت حیض دونوں میں اختلاف ہے چنانچہ اس اختلاف کی تفصیل اس طرح ہے۔

حیض میں فقہاء کا اختلاف:

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اقل مدت حیض ایک قول کے **مطابق "دفعة واحدة"** ہے یعنی ایک بار خون کا چھلکنا کافی ہے، دوسرا قول **"یوم ولیلة"** کا ہے امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد کا قول بھی **یوم ولیلة** کا ہے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک اقل حیض دو دن اور تیسرے کا اکثر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک اقل مدت حیض تین دن تین راتیں ہیں یہ تو اقل مدت حیض میں ان حضرات کا اختلاف ہے۔ اب اکثر مدت حیض میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اکثر مدت حیض سترہ دن ہے امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اکثر مدت حیض پندرہ دن ہے اور احناف کے ہاں اکثر مدت حیض دس دن ہے۔

دلائل:

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے پاس اقل مدت حیض کے لئے دلیل کے طور پر کوئی حدیث یا نص شرعی نہیں ہے اور اکثر مدت حیض کے لئے ان حضرات نے **"تقعد احداکن شطر عمرها لا تصلی ولا تصوم"** سے استدلال کیا ہے۔ یہ حضرات شطر کے لفظ کو نصف کے معنی میں لیتے ہیں اور ہر ماہ کا نصف پندرہ دن ہوتا ہے۔

احناف کا استدلال ان روایات سے ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے

مرفوعاً منقول ہیں۔

صاحب ہدایہ نے دار قطنی اور طبرانی کی روایت سے استدلال کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

﴿۱﴾ "اقل الحیض للجاریة البکر ثلاثة ایام ولیالیها واکثره عشرة ایام"۔

﴿۲﴾ عن معاذ رفعه قال لا حیض دون ثلاثة ایام ولا حیض فوق عشرة ایام۔

(اخرجه ابن عدی واسناده واه)

عقیلی نے ایک اور سند سے مندرجہ بالا حدیث کو مختصر متن کے ساتھ اس طرح نقل کیا ہے:

﴿۳﴾ "ولا حیض اقل من ثلاث ولا اکثر من عشر"۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایات بھی ہیں۔

﴿٤﴾ عن عائشة مرفوعًا اکثر الحیض عشر واقله ثلاث۔ (اخرجه ابن حبان فی الضعفاء)

جوابٌ: شوافع کی دلیل کا احناف نے یہ جواب دیا ہے کہ شطر نصف کے لئے متعین نہیں بلکہ شطر کا اطلاق جزء پر بھی ہوتا ہے نیز اس سے اقل حیض **یوم ولیلة** پر کہاں دلالت ہوتی ہے تو تقریب تام نہیں نیز یہ روایت ضعیف بھی ہے۔

مسئلة الاستمتاع من الحائض

بحث دوم:

فقہاء کرام کے درمیان دوسرا اختلاف اس میں ہے کہ حالت حیض میں عورت کے ساتھ کیسا معاملہ رکھنا چاہئے کس قسم کا تعلق جائز ہے اور کس قسم کا ناجائز ہے۔

کیونکہ یہود نے عورت کو حیض میں نجس سمجھ کر الگ تھلگ کیا کہ گھر میں رہنا سہنا، اس کے ساتھ ملنا جلنا، اس کے ہاتھ کا کھانا پکانا سب کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا گویا ایام کے دنوں میں عورت سے سوشل بائیکاٹ کرتے تھے ادھر عیسائیوں نے سب کچھ جائز قرار دیا تھا یہاں تک کہ جماع کرنے کو بھی جائز کیا اور حیض کا انکار کیا اسلام چونکہ معتدل اور افراط وتفریط سے پاک مہذب مذہب ہے اس لئے اس نے مسلمانوں کو راہ اعتدال دکھائی کہ نہ سوشل بائیکاٹ کرو اور نہ جماع کرو آنحضرت ﷺ نے اپنے قول وفعل سے امت کے سامنے ایک معیار رکھا جس کی تفصیل فقہاء کرام نے اس طرح بیان فرمائی ہے۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

حالت حیض میں عورتوں سے میل جول اور تعلق رکھنے کی چند صورتیں ہیں:

❶ حالت حیض میں اپنی بیوی سے بوس و کنار اور مواکلت و ملامست سب کے نزدیک جائز ہے اہل اسلام میں کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔

❷ حالت حیض میں عورت سے جماع وہم بستری کرنا اجماعاً حرام ہے۔

❸ حالت حیض میں **استمتاع بما تحت الازار** کیا جائے یا نہیں اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ استمتاع جائز ہے بشرطیکہ جماع سے آدمی بچا رہے اور موضع دم یعنی خون کی جگہ سے اجتناب کرے۔ جمہور ائمہ کے نزدیک **استمتاع بما تحت الازار** ناجائز ہے۔[1]

دلائل:

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ و محمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں "**اصنعو کل شی الا النکاح**" تو **تحت الازار استمتاع** جائز ہو گیا کیونکہ جماع کے سوا سب کچھ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔[2]

جمہور کی دلیل مشکوۃ ص ۵۶ پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے جو فصل ثالث میں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"**فلم نقرب رسول الله ﷺ ولم ندن منه**"۔[3]

اسی صفحہ اور اسی فصل میں حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں "**ثم شانك باعلاها**" یعنی ازار بند کے اوپر سے فائدہ اٹھاؤ نیچے سے نہیں، اس طرح حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: "**قال ما فوق الازار**" یہ حدیثیں اصل میں سائل کے سوال کے جواب میں ہیں جس کے انداز جواب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔[4]

جواب: "**اصنعوا کل شیء الا النکاح**" کا مطلب یہود کے غلو کو توڑنا تھا جو سوشل بائیکاٹ کرتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"**اصنعوا کل شیء**" یعنی بالکل بائیکاٹ نہ رکھو بلکہ بوس و کنار کرو میل جول رکھو لیکن جماع نہ کرو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سے جماع اور دواعی جماع دونوں کی نفی اور نہی مراد ہے اور **تحت الازار** کا جو **استمتاع** ہے وہ تو خالص دواعی جماع میں سے ہے لہٰذا جس طرح جماع ممنوع ہے اسی طرح دواعی بھی ممنوع ہیں۔

بہر حال **فوق الازار** کی صریح حدیثیں موجود ہیں اور **تحت الازار استمتاع** کرنا یقیناً داعی جماع ہے تو یہ بھی ناجائز

[1] المرقات ۲/۲۴۴ [2] المرقات ۲/۲۴۴ [3] المرقات ۲/۲۵۲ [4] المرقات ۲/۲۵۲

ہے۔ ناف سے نیچے اور گھٹنے کے اوپر اس درمیانی حصہ کو ما تحت الازار کہتے ہیں اور اس کے علاوہ کو فوق الازار کہتے ہیں کیونکہ رات کو استعمال کرنے والے ازار بند کی یہی حدود ہیں۔

افلا نجامعھن: اس جملہ کے دو مطلب ہیں ایک یہ ہے کہ کیا ہم ان سے رہنا سہنا الگ نہ کریں تاکہ یہود سے موافقت آجائے حدیث کے ترجمہ میں یہی مطلب مراد لیا گیا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ کیا ہم ان حائضہ عورتوں سے جماع ہی نہ کریں تاکہ یہود جل جائیں، علماء نے اس دوسرے مطلب کو راجح کہا ہے اور اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ ناراض ہو گئے تھے۔[1]

حائضہ عورت سے میل جول رکھنے کی اجازت ہے

﴿۲﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَالنَّبِيُّ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ وَكِلَانَا جُنُبٌ وَكَانَ يَأْمُرُنِي فَأَتَّزِرُ فَيُبَاشِرُنِي وَأَنَا حَائِضٌ وَكَانَ يُخْرِجُ إِلَيَّ رَأْسَهُ وَهُوَ مُعْتَكِفٌ فَأَغْسِلُهُ وَأَنَا حَائِضٌ.

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[2]

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ”میں اور نبی کریم ﷺ دونوں جنابت کی حالت میں ایک برتن سے نہا لیا کرتے تھے (اور بعض اوقات) میں ایام سے ہوتی تھی اور آپ ﷺ مجھے (تہ بند باندھنے کے واسطے) ارشاد فرماتے جب میں تہہ بند باندھ لیتی تھی تو آپ ﷺ مجھ سے (ناف کے اوپر اوپر) اپنا بدن لگا کر لپٹ جایا کرتے تھے اور (بعض مرتبہ) آپ اعتکاف میں ہوتے اور اپنا سر مبارک (مسجد سے) باہر نکال دیتے تو میں اپنے ایام کی حالت میں آپ کا سر مبارک دھویا کرتی تھی۔“ (بخاری و مسلم)

﴿۳﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ كُنْتُ أَشْرَبُ وَأَنَا حَائِضٌ ثُمَّ أُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ ﷺ فَيَضَعُ فَاهُ عَلَى مَوْضِعِ فِيَّ فَيَشْرَبُ وَأَتَعَرَّقُ الْعَرْقَ وَأَنَا حَائِضٌ ثُمَّ أُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ ﷺ فَيَضَعُ فَاهُ عَلَى مَوْضِعِ فِيَّ.

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[3]

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ”میں حالت ایام میں پانی پی کر (وہی برتن) نبی کریم ﷺ کو دے دیا کرتی تھی آپ اسی جگہ سے جہاں میرا منہ لگا منہ لگا کر پی لیتے اور کبھی میں ایام کی حالت میں ہڈی سے گوشت نوچ کر کھاتی پھر وہ ہڈی آنحضرت ﷺ کو دے دیتی آپ اسی جگہ پر منہ رکھ کر گوشت کو نوچتے جہاں میں نے منہ رکھ کر نوچا تھا۔“ (مسلم)

﴿۴﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَّكِئُ فِي حِجْرِي وَأَنَا حَائِضٌ ثُمَّ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[4]

---

[1] المرقات ۲/۲۴۷ [2] اخرجه البخاری ۱/۸۲ ومسلم ۱/۱۶۶

[3] اخرجه مسلم ۱/۱۶۸ [4] اخرجه البخاری ۱/۸۲ ومسلم ۱/۱۶۹

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ "میں ایام کی حالت میں ہوتی اور نبی کریم ﷺ میری گود میں سہارا دے کر بیٹھ جاتے اور قرآن مجید پڑھتے۔" (بخاری ومسلم)

﴿۵﴾ وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ لِيَ النَّبِيُّ ﷺ نَاوِلِينِي الْخُمْرَةَ مِنَ الْمَسْجِدِ فَقُلْتُ إِنِّي حَائِضٌ فَقَالَ إِنَّ حَيْضَتَكِ لَيْسَتْ فِي يَدِكِ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)[۱]

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ "مسجد میں سے چھوٹا بوریا (جانماز) اٹھا کر مجھے دو (یعنی مسجد کے باہر کھڑی ہو کر اندر ہاتھ ڈال کر بوریا اٹھالاؤ) میں نے عرض کیا کہ میں تو ایام سے ہوں (اس لئے مسجد میں ہاتھ کیسے داخل کرسکتی ہوں) آپ نے فرمایا تمہارے ہاتھ میں تو حیض نہیں ہے۔ (مسلم)

توضیح: اس حدیث سے یہ ضابطہ نکلتا ہے کہ ہر آدمی کے قیام ومقام اور مکان کا اعتبار اس کے قدمین اور پاؤں پر ہے جن پر اس کا پورا جسم متوازن کھڑا ہے اب آدمی اگر پاؤں پر مسجد سے باہر کھڑا ہے اور جسم کا بوجھ پاؤں پر ہے تو یہ شخص مسجد سے باہر شمار ہوگا خواہ اس کے ہاتھ یا سر وغیرہ مسجد میں کیوں نہ ہوں یہ شخص خارج مسجد ہے تو جنبی آدمی یا حائضہ عورت اگر ایسا کرے تو اس کی گنجائش ہے اور مسجد میں داخل نہ ہونے کی اگر کوئی شخص قسم کھائے اور پھر اس طرح عمل کرے تو وہ حانث نہیں ہوگا اسی طرح مسجد کے اندر اگر کھڑا ہے اور سر باہر کیا یا ہاتھ باہر کئے تو اس کا اعتبار نہیں اعتبار پاؤں اور اس پر قیام کا ہے اوپر والی حدیثیں اور آنے والی حدیثیں امت کو حائضہ عورت سے میل جول رکھنے کی تعلیم دیتی ہیں۔ اور جماع سے روکتی ہیں یہود ونصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو۔[۲]

﴿۶﴾ وَعَنْ مَيْمُونَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي فِي مِرْطٍ بَعْضُهُ عَلَيَّ وَبَعْضُهُ عَلَيْهِ وَأَنَا حَائِضٌ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[۳]

ترجمہ: حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک ایسی چادر میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے کہ جس کا کچھ حصہ تو آپ کے اوپر ہوتا تھا اور کچھ حصہ مجھ پر ہوتا تھا اور میں ایام میں ہوتی تھی۔ (بخاری ومسلم)

الفصل الثانی

تین افعال پر کفر کا حکم

﴿۷﴾ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَنْ أَتَى حَائِضًا أَوِ امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا أَوْ كَاهِنًا فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَالدَّارِمِيُّ وَفِي رِوَايَتِهِمَا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ فَقَدْ كَفَرَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: لَا نَعْرِفُ هٰذَا الْحَدِيثَ إِلَّا مِنْ حَكِيمٍ الْأَثْرَمِ عَنْ أَبِي تَمِيمَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ)۔[۴]

[۱] اخرجه مسلم ۱/۱۶۸ [۲] المرقات ۲/۲۴۷ [۳] اخرجه البخاری ومسلم [۴] اخرجه الترمذی ۱۳۵ وابن ماجه ۶۳۹

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ایام والی عورت سے صحبت کی یا عورت کے پیچھے کی طرف بدفعلی کی یا کسی کاہن کے پاس (غیب کی باتیں پوچھنے) گیا تو اس شخص نے (گویا) محمد (ﷺ) پر نازل کئے گئے دین کا کفر کیا۔" (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

ابن ماجہ اور دارمی کی روایتوں میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "کاہن کے کہے ہوئے کی اس نے تصدیق بھی کر دی تو وہ کافر ہے" اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "ہمیں یہ حدیث معلوم نہیں سوائے اس سند کے جسے حکیم اثرم ابوتمیمہ سے نقل کرتے ہیں اور وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے۔"

توضیح: من اتی حائضا: یعنی حیض کی حالت میں جماع کو حلال سمجھتا ہے تو وہ کافر ہے کیونکہ اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، نیز یہ صحت کے لئے تباہ کن ہے۔[1]

فی دبرها: اس سے بیوی کے ساتھ بدفعلی مراد ہے اس کو حلال سمجھنے والا بھی کافر ہے بعض شیعہ امامیہ اس کو جائز سمجھتے ہیں کچھ لوگوں کو قرآن کی آیت "**فاتوا حرثکم انی شئتم**" سے دھوکہ لگا ہے نیز اس روایت سے بھی دھوکہ لگا ہے جس میں **انی شئتم** کی ایک صورت بتائی گئی ہے جو دبر کی طرف سے قبل میں جماع کرنا ہے تو جماع تو ہر حال میں قبل میں ہے کسی طرف کی پابندی اور تعین نہیں ہے روافض اس قبیح فعل کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا کوئی مسلمان بدفعلی کا یہ عمل کر سکتا ہے؟[2]

کاهنا: کاہن وہ کہ جو غیب کی آنے والی خبریں لوگوں کو بتاتا رہتا ہے کبھی کوئی جن اس کو خبر لا کر دیتا ہے یہ کاہن سو جھوٹ اس کے ساتھ اپنی طرف سے ملا کر مستقبل کی پیشن گوئیاں کرتا ہے یہ بھی حرام ہے۔ اقبال مرحوم کہتے ہیں:[3]

تیری تقدیر کو انجم شناس کیا جانے — تو خاک زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

سعدی بابا رحمۃ اللہ علیہ نے نجومی سے کہا:

تو بر اوج فلک چہ دانی چیست — چوں نہ دانی کہ درسرائے تو کیست

فقد کفر: اس کا ایک مطلب یہ کہ یہ شخص اس کو حلال سمجھتا ہے تو وہ کافر ہو گیا دوسرا مطلب یہ کہ کفر سے کفر عملی مراد ہے اعتقادی نہیں ایک جواب یہ کہ یہ حدیث تشدید و تغلیظ پر محمول ہے کیونکہ کبیرہ کا مرتکب اہل سنت کے ہاں کافر نہیں ہوتا۔

﴿۸﴾ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ مَا يَحِلُّ لِيْ مِنِ امْرَأَتِيْ وَهِيَ حَائِضٌ قَالَ مَا فَوْقَ الْإِزَارِ وَالتَّعَفُّفُ عَنْ ذٰلِكَ أَفْضَلُ. (رَوَاهُ رَزِيْنٌ وَقَالَ مُحْيِ السُّنَّةِ إِسْنَادُهُ لَيْسَ بِقَوِيٍّ).[5]

---

[1] المرقات ۲/۲۴۸،۲۴۹ [2] المرقات ۲/۲۴۸ [3] المرقات ۲/۲۴۸
[4] المرقات ۲/۲۴۸،۲۴۹ [5] اخرجه

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میری بیوی کے ایام کی حالت میں میرے واسطے کیا کیا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا وہ چیز جو تہ بند کے اوپر ہو اور اس سے بھی بچنا بہت ہی بہتر ہے۔ (رزین) اور محی السنہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے۔

حالت حیض میں جماع کا کفارہ

﴿۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا وَقَعَ الرَّجُلُ بِأَهْلِهٖ وَهِيَ حَائِضٌ فَلْيَتَصَدَّقْ بِنِصْفِ دِيْنَارٍ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ)[1]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اگر کوئی شخص اپنی حائضہ بیوی سے جماع کرے تو اسے نصف دینار صدقہ کر دینا چاہیے۔" (ترمذی، ابوداؤد، دارمی، ابن ماجہ، نسائی)

﴿۱۰﴾ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِذَا كَانَ دَمًا أَحْمَرَ فَدِيْنَارٌ وَاِذَا كَانَ دَمًا أَصْفَرَ فَنِصْفُ دِيْنَارٍ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)[2]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا (ایام کی حالت میں اگر حیض کا) خون سرخ رنگ کا ہو (اور اس حالت میں کوئی صحبت کرے) تو ایک پورا دینار اور اگر خون کا رنگ زرد ہو تو آدھا دینار (صدقہ لازم ہے)۔ (ترمذی)

توضیح: اذا کان دما احمر: یہ فرق اس لئے ہے کہ خون ابتدائی حیض میں سرخ ہوتا ہے تو ایسے خون کے دوران جماع کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی ابھی عورت حائضہ ہوئی ہے اس سے کچھ وقت قبل شوہر جماع کرتا تھا ابھی ایک دن بھی نہیں گزرا کہ شوہر بے قاعدگی اور بے صبری کرتا ہے لہٰذا اس پر جرمانہ بھی زیادہ ہے کہ ایک دینار دے گا۔ لیکن جب وقت کافی گزر جاتا ہے تو خون پیلا پڑ جاتا ہے لہٰذا یہ شخص کچھ نہ کچھ معذور ہے کہ کئی دن تک چھٹی کی تو اب اس پر نصف دینار کا جرمانہ آئے گا۔ فرق کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب خون سرخ ہوتا ہے تو یہ حیض کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے ایسے وقت میں جماع کرنا زیادہ جرم ہے تو پورا دینار دینا ہوگا ورنہ نصف دینار دینا ہوگا۔

یہ معمولی سا جرمانہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو ایک احساس دلایا جاتا ہے کہ شرم کرو ڈوب مرو حالت حیض میں جماع کرتے ہو اب اس جرم کا تاوان ادا کرو جب ایک دفعہ تاوان دے دیا پھر جرم کے قریب نہیں جائے گا۔ جرمانہ کا فرق حیض کی قوت اور ضعف کی بناء پر ہے۔

---

[1] اخرجہ الترمذی ۱۳۶ و ابوداؤد ۲۶۴ [2] اخرجہ الترمذی ۱۳۶

نیز صدقہ کا حکم اس لئے دیا کہ "الصدقة تطفیٔ غضب الرب" تو جرم کو صدقہ ہلکا کردے گا ویسے جمہور کے نزدیک صدقہ کا حکم استحبابی ہے اصل چیز استغفار ہے اور سچے دل سے توبہ کرنا ہے۔[1]

الفصل الثالث

حائضہ سے بوس وکنار جائز ہے

﴿۱۱﴾ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ قَالَ إِنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ مَا يَحِلُّ لِيْ مِنِ امْرَأَتِيْ وَهِيَ حَائِضٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَشُدُّ عَلَيْهَا إِزَارَهَا ثُمَّ شَأْنَكَ بِأَعْلَاهَا.

(رَوَاهُ مَالِكٌ وَالدَّارِمِيُّ مُرْسَلًا)[2]

ترجمہ: حضرت زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میرے لئے میری بیوی سے جبکہ وہ ایام کی حالت میں ہو کیا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا اس کے جسم پر اس کا تہہ بند خوب مضبوط باندھ لو، پھر تہہ بند کے اوپر تمہارا کام ہے (یعنی ناف سے اوپر تم کو اختلاط مباح اور ناف کے نیچے حرام ہے) امام مالک رحمہ اللہ اور امام دارمی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بطریق ارسال روایت کیا ہے۔

حیض کے اثرات

﴿۱۲﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ إِذَا حِضْتُ نَزَلْتُ عَنِ الْمِثَالِ عَلَى الْحَصِيْرِ فَلَمْ نَقْرُبْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَلَمْ نَدْنُ مِنْهُ حَتّٰى نَطْهُرَ. (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)[3]

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ جب میں ایام سے ہوجاتی تو بستر سے اتر کر بوریہ پر آجاتی چنانچہ جب تک کہ وہ پاک نہ ہوجاتیں نہ تو نبی کریم ﷺ ان کے نزدیک آتے تھے اور نہ وہ نبی کریم ﷺ کے نزدیک آتی تھیں۔ (ابوداؤد)

توضیح: حیض کئی چیزوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور کئی چیزوں کے لئے مانع ہے چند چیزیں ملاحظہ کریں:

1. حیض طہارت کے لئے مانع ہے جب تک حیض ہے طہارت نہیں آسکتی۔
2. وجوب الصلوۃ کے لئے مانع ہے اسی طرح صحۃ الصلوۃ کے لئے بھی مانع ہے۔

[1] المرقات ۲/۲۵۱ [2] اخرجہ مالک ۹۳ والدارمی ۱۰۳۳ [3] اخرجہ ابوداؤد ۲۷۱

❸ صحۃ الصوم سے بھی مانع ہے یعنی صوم اگرچہ واجب ہو جاتا ہے لیکن اس کا اس حالت میں رکھنا صحیح نہیں ہے۔

❹ تلاوت قرآن اور مس مصحف سے مانع ہے۔

❺ دخول مسجد سے مانع ہے۔

❻ جماع سے مانع ہے۔

اس کے بعد یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ حدیث سابقہ کئی احادیث سے معارض ہے جس میں حائضہ سے میل جول اور بوس وکنار کا ذکر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم حضور اکرم کی اجازت کے بغیر قریب نہیں جاتیں اجازت سے بوس وکنار ہوتا تھا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے یا ضعیف ہے یہ بات بھی ملحوظ نظر رہے کہ اس حدیث میں ایک نسخہ **فلم یقرب** ہے، مذکورہ ترجمہ اسی نسخہ کے مطابق ہے۔ [۱]

[۱] المرقات ۲/۶۵۷

باب المستحاضة

مستحاضہ کا بیان

مسائل مستحاضہ مہمات فقہ میں سے عمیق اور مشکل ترین مسائل ہیں علماء نے ہر زمانہ میں اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر مستقل کتاب لکھی ہے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مستقل کتاب لکھی ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس پر مستقل کتاب لکھی ہے مستحاضہ اور استحاضہ کے متعلق چند ابحاث کو الگ الگ لکھنا ضروری ہے اس کے بعد تمام احادیث کو ان ابحاث کی روشنی میں سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا۔

بحث اول:

پہلی بحث اس میں ہے کہ استحاضہ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم اور حقیقت کیا ہے تو استحاضہ باب استفعال کا مصدر ہے اس کا مجرد حیض ہے جو باب **حاض یحیض حیضاً** سے آتا ہے باب استفعال میں جو سین اور تا کی زیادتی ہوتی ہے اس کے کئی خواص ہیں یہاں سین اور تا زیادتی یا تو مبالغہ کے لئے ہے یعنی بہت زیادہ خون کا بہنا اور یا یہ مصدر تحول کے لئے آیا ہے یعنی ایک حقیقت سے نکل کر شے دوسری حقیقت میں چلی گئی ہے مثلاً **استنوق الجمل ای تحول الجمل الی الناقة** یا کہا جائے "**کان حماراً فاستن ای صار الحمار اتانا**" یعنی پہلے گدھا تھا اب گدھی بن گئی یہاں بھی استحاض یعنی **صار الحیض شیئًا اٰخر ای تحول الحیض استحاضة**۔ یا کہا جاتا ہے: **استحجر الطین ای صار الطین حجرا**۔

اب بطور لطیفہ علمیہ یہ بات سمجھ لو کہ استحاضہ کے مادہ اور صیغہ سے آپ جو بھی صیغہ استعمال کرو گے وہ مجہول کا ہوگا معروف کا صیغہ نہیں آئے گا اسی طرح اسم فاعل استعمال نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے اسم فاعل کو توڑ کر اسم مفعول بنانا پڑے گا۔ تو **استحاضت المرأة** نہیں کہا جا سکتا ہے بلکہ **تُسْتَحَاضُ الْمَرْأَةُ** یا **اُسْتَحِیْضَتِ الْمَرْأَةُ** مجہول کا صیغہ بولنا پڑے گا **امرأة مستحیضة** کہنا صحیح نہیں بلکہ **مستحاضة** ضروری ہے جو اسم مفعول ہے تو یہ استحاضہ کی لغوی تحقیق تھی۔

استحاضہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے حیض اور نفاس کے علاوہ عورت کے قبل سے جو خون آتا ہے وہ استحاضہ کہلاتا ہے۔[1]

احادیث میں استحاضہ کی وجہ اور اس کے اسباب کے بارے میں مختلف الفاظ آئے ہیں۔ ایک جگہ **انها رکضة الشیطان** کے الفاظ ہیں دوسری جگہ "**عرق انقطع**" کے الفاظ وارد ہیں اس کی تشریح میں ایک حدیث میں **داء عُرِضَ** کے الفاظ ہیں۔

---

[1] المرقات ۲/۲۵۳

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک رگ ہے جس کا نام "عاذل" ہے اور حضرت شاہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو فم رحم کا نام دیتے ہیں جو کچھ بھی ہو یہ خون بہر حال رحم سے آتا ہے البتہ یہ غیر طبعی خون ہے جو مزاج کے فساد کی وجہ سے آتا ہے حدیث میں "داء عرض" کے الفاظ جو آئے ہیں یہ اسی غیر طبعی نظام کی طرف اشارہ ہے اب رکضة الشیطان ان آخری دونوں اسباب کو شامل ہے کہ شیطان کی یہ ٹھوکر کبھی تو عرق انقطع کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی داء عرض کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے عرق عاذل کی اصطلاح اطباء کے ہاں نہیں باقی چیزوں میں وہ متفق ہیں بہر حال کبھی کبھی یہ خون رحم کے اندر کی کسی رگ سے بھی آتا ہے۔ یہ بھی ایک سبب ہے مستحاضہ عورت اصحاب اعذار اور شرعی معذورین کے حکم میں ہے لہٰذا یہ دیگر معذورین کی طرح نماز پڑھے گی تمام عبادات ادا کرے گی شوہر اس کے ساتھ جماع کر سکتا ہے۔ گویا استحاضہ سلسل البول، رعاف دائم، استطلاق البطن اور انفلات الریح جیسی بیماریوں کی طرح ایک بیماری ہے جو کسی امر شرعی کے لئے مانع نہیں ہے۔

بحث دوم: مستحاضہ کی اقسام:

ائمہ احناف کے نزدیک مستحاضہ کی کل تین قسمیں ہیں معتادہ، مبتدأہ اور متحیرہ ہر ایک کے الگ الگ احکام ہیں جمہور علماء کی بھی یہی رائے ہے لیکن ان کے ہاں مستحاضہ کی ایک چوتھی قسم بھی ہے جو ممیزہ کے نام سے مشہور ہے آئندہ اس کی تفصیل آئے گی۔

معتادہ کا حکم:

معتادہ وہ عورت ہے جس کی مدت حیض اور اس کے دن معروف اور مقرر ہوں کہ مثلاً آٹھ یا دس دن یا پانچ دن حیض آتا ہے یہ اس کی عادت ہے ائمہ احناف کے ہاں تین بار جب ایک ہی انداز سے حیض آگیا تو عادت کے ثبوت اور تقرر کے لئے یہی کافی ہے معتادہ کا حکم یہ ہے کہ مدت عادت تک حیض شمار ہوگا اور اس کے بعد استحاضہ شمار ہوگا حیض کے ایام میں یہ عورت شرعی احکام ادا نہیں کرسکتی ہے اور استحاضہ میں سب ادا کرے گی احادیث میں جن مستحاضہ عورتوں کا بیان آیا ہے احناف کے ہاں وہ اکثر معتادہ تھیں۔

مبتدأہ کا حکم:

مبتدأہ اس مستحاضہ عورت کو کہتے ہیں جس کو بلوغ کے وقت جو پہلی بار خون آیا وہ اتنا لمبا ہو گیا کہ اکثر مدت حیض سے بھی آگے بڑھ گیا۔ مبتدأہ کا حکم احناف کے ہاں یہ ہے کہ دس دن اس کا حیض ہے باقی استحاضہ ہے شوافع کے ہاں ۱۵ دن حیض ہے باقی استحاضہ ہے مالکیہ کے ہاں ۱۷ دن حیض ہے اور باقی استحاضہ ہے ہر ماہ میں اس کا یہی حکم رہے گا۔

متحیرہ کا حکم:

متحیرہ وہ مستحاضہ عورت ہے جو اپنے ایام حیض اور زمانہ استحاضہ میں تمیز نہ کر سکے اور خود حیران رہ جائے کہ اب میں کیا کروں یا عالم دین اور فقیہ کو اس کے دقیق اور گھمبیر و پیچیدہ مسائل نے حیران کر کے رکھ دیا اس متحیرہ کی حیرانی اور پریشانی کی وجہ سے اس کی تین قسمیں ہیں یعنی ایک قسم متحیرہ فی مدۃ الزمان ہے کہ کتنے دن خون آیا تھا اس میں حیران و پریشان ہے دوسری قسم متحیرہ فی **اوقات الزمان** کہ کب سے یہ خون شروع ہوا تھا آیا ابتداء مہینہ میں تھا یا وسط کا وقت تھا یا آخر مہینہ تھا، متحیرہ کی تیسری قسم یہ کہ سب میں حیران و پریشان ہے۔ اس کا حکم اجمالی طور پر سمجھ لیں کہ یہ عورت اپنے مسائل میں سوچ و بچار اور تحری کرے اور پھر ظن غالب پر عمل کرے فقہاء احناف کی تفصیلات کا یہی خلاصہ ہے، اس سے زیادہ اس کے مسائل میں پڑنے سے صرف حیران ہونا پڑے گا حیرانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ اس متحیرہ کو ضالہ بھی کہتے ہیں جو خود بھٹکی ہوئی ہے یا **مُضِلَّہ** ہے جو عالم کو بے راہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

بحث سوم: خون کے رنگوں میں تمیز کرنا

احناف کے نزدیک مستحاضہ کی وہی تین قسمیں ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے دیگر فقہاء کے نزدیک مستحاضہ کی ایک چوتھی قسم بھی ہے جس کو ممیزہ کہتے ہیں جو اپنے ایام کا تعین خون کے رنگوں کو دیکھ کر کر سکتی ہے احناف کے ہاں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔[1]

بہر حال یہاں یہ بحث ہے کہ کونسے الوان اور کونسے رنگ کا خون حیض کا ہے اور کونسے رنگ کا استحاضہ کا ہے۔ فتح القدیر میں لکھا ہے کہ خون کے کل رنگ چھ ہیں: ① حمرۃ ② صفرۃ ③ کدرۃ ④ خضرۃ ⑤ تربۃ ⑥ اور سواد۔

ان اقسام میں سے دو قسمیں یعنی حمرۃ اور سواد بالاتفاق حیض کا خون ہے اور صفرۃ اور خضرۃ کے بارے میں بھی علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ وہ بھی حیض کا خون ہے۔

فقہاء کا اختلاف:

اب اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ الوان اور خون کے رنگوں کا اعتبار ہے یا نہیں ہے یعنی دم کے رنگ کا اثر صاحب دم پر پڑے گا یا نہیں؟ تو جمہور کے نزدیک الوان اور خون کے رنگوں کے اختلاف کا اعتبار ہے پھر آپس میں ان کا یہ اختلاف ہے کہ اگر عادت اور خون کے رنگ میں اختلاف آیا تو ترجیح کس کو دی جائے گی یعنی عادت کا تقاضا اور ہے اور رنگ کا اور ہے تو ترجیح کس کو ہوگی؟ تو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عادت کو ترجیح ہوگی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ممیزہ کی تمیز کو ترجیح دی جائے گی بہر حال جمہور کے ہاں الوان دم کا اعتبار ہے اور اسی سے ان کے ہاں ممیزہ پیدا ہوگئی ہے کہ ایک مستحاضہ ممیزہ بھی ہے جو خون کے رنگ کو دیکھ کر فیصلہ کر سکتی ہے کہ یہ خون حیض کا ہے یا استحاضہ کا ہے۔ احناف کے ہاں الوان کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ یہ تو بسا اوقات اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اطباء اور ڈاکٹر بھی اس کا فرق نہیں کر سکتے ہیں۔[2]

---

[1] المرقات ۲/۲۵۴ [2] المرقات ۲/۲۵۵

دلائل:

جمہور نے فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے استدلال کیا ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں "**فانه دم اسود یعرف**" یعنی حیض کا خون سیاہ ہوتا ہے جو پہچانا جاتا ہے اس کی تمیز عورت کر سکتی ہے۔ لہٰذا تمیز بالالوان کا اعتبار ہے اور ممیزہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے جمہور کے ہاں تمیز بالالوان اور ممیزہ بطور ضابطہ وقاعدہ تسلیم شدہ ہے ائمہ احناف نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے استدلال کیا ہے جس کو امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں نقل کیا ہے روایت یہ ہے:

"**کان النساء یبعثن الدرجة الی عائشة فیها الکرسف فیه الصفرة من دم الحیض یسئلنها عن الصلوة قالت لا تعجلن حتی ترین القصة البیضاء**"۔ (موطأ مالک ص ۴۳)

یعنی عورتیں اپنے کرسف حیض کے چیتھڑے ڈبیہ میں بند کر کے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں بھیجا کرتی تھیں تا کہ وہ فیصلہ کریں کہ یہ خون حیض کا ہے یا استحاضہ کا ہے تا کہ نماز پڑھنے کا حکم معلوم ہو جائے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی تھیں کہ تم عورتیں جلدی نہ کرو یہاں تک کہ تم خالص سفیدی دیکھ لو جب سفید پانی آجائے تو وہ حیض کا خون نہیں ہوگا تم نماز پڑھ سکتی ہو۔[1]

جواب: احناف نے فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت "**اذا کان دم الحیض فانه دم اسود یعرف**" پر دو اعتراض کئے ہیں پہلے اعتراض کا تعلق جمہور کے اس استدلال کے الفاظ اور سند سے ہے:

1. بیہقی نے کہا ہے کہ یہ الفاظ مضطرب ہیں۔
2. ابن ابی حاتم نے کہا کہ میں نے اپنے باپ سے ان الفاظ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ روایت منکر ہے۔
3. یحیی بن سعید قطان نے کہا کہ یہ منقطع ہے طحاوی نے اس روایت کو شاذ قرار دیا ہے۔

دوسرا اعتراض احناف نے یہ کیا ہے کہ الوان کا اختلاف اغذیہ، امکنہ اور ازمنہ کی وجہ سے ہوتا ہے چنانچہ گوشت کھانے والی عورت کے حیض کا خون کالا آتا ہے اور سبزی کے زیادہ استعمال سے خون کے رنگ میں سبزی کا رنگ غالب ہو جاتا ہے اور گرمی اور سردی کے مقامات و بلدان اور آب و ہوا کا اثر لازمی طور پر انسانی طبیعت پر پڑتا ہے لہٰذا خون کے رنگوں کو حیض اور استحاضہ کے خون کے لئے معیار اور ضابطہ نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ بلکہ عادت ایک مضبوط نظام طبعی ہے اسی کو معیار کے طور پر قبول کرنا چاہیئے نیز احادیث کے زیادہ تر الفاظ کے اشارے عادت کی طرف ہیں صرف یہ ایک جملہ جو اوپر مذکور ہوا اس میں الوان کا ذکر ہے لیکن یہ روایت قابل استدلال نہیں ہے خصوصاً جبکہ اس کے مقابلہ میں دیگر احادیث بھی ہیں۔

جمہور نے فصل اول کی پہلی حدیث "**فاذا اقبلت حیضتك فدعی الصلوة**" سے بھی استدلال کیا ہے لیکن اس حدیث سے الوان دم پر استدلال کرنا نا قابل فہم ہے لہٰذا اس کے جواب کی بھی ضرورت نہیں ہے۔[1]

---

[1] المرقات ۲/۲۵۴

بحث چہارم: مصداق احادیث:

باب الاستحاضہ میں مستحاضہ کے بارے میں احادیث میں مختلف احکام مذکور ہیں تتبع اور تلاش سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں تین قسم کے احکام کا ذکر آیا ہے۔

● مستحاضہ کے لئے آنحضرت ﷺ کا پہلا حکم یہ ہے کہ تدع الصلوۃ ایام اقرائها کہ حیض کے ایام میں یہ عورت نمازیں چھوڑے گی۔

● "اذا اقبلت حیضتك فدعی الصلوۃ و اذا ادبرت فاغسلی عنك الدم"۔

اس روایت میں حیض کے آنے جانے کے اوقات کی طرف اشارہ ہے اور عورت کے عمل کو بتایا گیا ہے۔جس سے معتادہ کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

● "لتنظر عدد اللیالی والایام التی کانت تحیضهن من الشهر"۔

اس روایت میں بھی اشارہ ہے کہ عورت کو اپنے ایام کا خوب حساب کرنا چاہئے۔

ائمہ احناف کے نزدیک ان تمام روایات کا تعلق معتادہ سے ہے اور یہ احکام بھی معتادہ کے بیان ہوئے ہیں اور شوافع کے ہاں دوسری روایت میں معتادہ اور ممیزہ دونوں کا احتمال ہے اور تیسری روایت ممیزہ کے لئے ہے احناف اور حنابلہ کے ہاں ممیزہ کا وجود نہیں مستحاضہ یا معتادہ ہے یا مبتدءہ ہے اور یا متحیرہ ہے جس کو ضالۃ اور مضلہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ عورت یا حقیقت پانے سے خود گم شدہ ہے یا فقیہ کو گمراہ کررہی ہے۔[1]

بحث پنجم: مستحاضہ کے وضو کا حکم:

باب المستحاضہ کی روایات میں مستحاضہ عورت کے احکام وضو اور احکام غسل کے بارے میں کئی قسم کے الفاظ آئے ہیں مثلاً ایک روایت میں **تتوضأ لکل صلوۃ** کے الفاظ ہیں دوسری روایت میں **تغتسل لکل صلوۃ** کے الفاظ آئے ہیں ایک روایت میں **تتوضأ لوقت کل صلوۃ** کے الفاظ ہیں ایک روایت میں **تجمع بین الصلوتین بغسل واحد** کے الفاظ ہیں مشکوۃ شریف کی روایات کا مفہوم بھی اسی طرح نکلتا ہے اگر چہ اوپر کے الفاظ سے مشکوۃ کے الفاظ مختلف ہیں۔

فقہاء کرام کا اختلاف:

انقضاء حیض کے بعد مستحاضہ پر ایک غسل بالاتفاق فرض ہے وضو کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ استحاضہ کے خون سے وضو نہیں ٹوٹتا اور جن روایتوں میں وضو کا حکم آیا ہے وہ مالکیہ کے نزدیک استحباب پر محمول ہیں ائمہ ثلاثہ کے نزدیک دم استحاضہ کا خروج موجب للوضو ہے مستحاضہ کو وضو کرنا پڑے گا پھر ان حضرات کا آپس میں وضو کے بارے میں

[1] المرقات ۲/۲۵۴ المرقات ۲/۲۵۷

اختلاف ہوا ہے کہ آیا ہر نماز کے لئے مستحاضہ وضو کرے یا ہر وقت کے لئے وضو کرے۔

شوافع کے نزدیک مستحاضہ پر لازم ہے کہ وہ ہر نماز کے لئے وضو کرے اگر ایک وقت کے اندر کئی نمازیں پڑھنی ہیں تو ہر فرض نماز کے لئے نیا وضو بنانا پڑے گا ہاں وقت کی نماز کے ساتھ جو توابع سنتیں ہیں وہ اس وضو سے پڑھ سکتی ہیں گویا فرض نماز کے بعد مستحاضہ کا وضو ٹوٹ گیا۔

ائمہ احناف اور حنابلہ کے نزدیک مستحاضہ نماز کے وقت کے لئے وضو کرے گی جب نماز کا وقت نکل جائے گا تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا وقت جب تک موجود ہے یہ مستحاضہ اس وقت میں ہر قسم کی کئی نمازیں پڑھ سکتی ہے خواہ نوافل ہوں یا فرائض ہوں۔[۱]

دلائل:

امام شافعی رحمہ اللہ نے **تتوضأ لکل صلوة** اور **تتوضأ عند کل صلوة** والی روایات سے استدلال کیا ہے اور حکم لگایا کہ مستحاضہ جب بھی نماز پڑھے گی نیا وضو بنائے گی بہت ساری حدیثوں میں وضو کرنے کا حکم آیا ہے اور مشکوۃ کی فصل ثانی میں عدی بن ثابت کی روایت میں **تتوضأ عند کل صلوة** کے الفاظ موجود ہیں جو شوافع کی دلیل ہے۔

احناف اور حنابلہ کی دلیل وہ روایت ہے جس میں **تتوضأ لوقت کل صلوة** کے الفاظ آئے ہیں اس روایت کو ابن قدامہ نے اپنی مشہور کتاب مغنی میں ذکر کیا ہے یہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بعض روایات کے الفاظ ہیں بعض روایات میں **حتی یجیئ ذلك الوقت** کے الفاظ آئے ہیں اس سے بھی احناف نے استدلال کیا ہے کہ وقت کے لئے وضو ہے کیونکہ وقت کی صراحت موجود ہے۔[۲]

ترجیح: ائمہ احناف اور حنابلہ نے جب **تتوضأ لوقت کل صلوة** کی روایت سے استدلال کیا تو اب **تتوضأ لکل صلوة** اور **عند کل صلوة** والی روایتوں سے ان کے لئے مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ ان پر عمل کیسے ہوگا اور اس کا جواب کیا بنے گا۔

تو احناف کے مشہور محقق ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احادیث میں تین قسم کے الفاظ ہیں **لوقت کل صلوة، لکل صلوة، عند کل صلوة** پہلا لفظ وقت کے لئے متعین ہے اور آخری دونوں جملوں میں وقت اور نماز دونوں معنوں کا احتمال ہے کیونکہ لام اور عند تعلیلیہ بھی ہو سکتے ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ مستحاضہ ہر نماز کی وجہ سے وضو بنائے اور وقتیہ بھی ہو سکتے ہیں۔

تو مطلب یہ ہو جائے گا کہ مستحاضہ نماز کے ہر وقت کے لئے وضو بنائے اب ان محتمل کلمات کو ان متعین کلمات پر حمل کرنا چاہئے جن میں وقت کا تعین کیا گیا ہے۔ جیسے **تتوضأ لوقت کل صلوة** ہے خلاصہ یہ کہ مجمل اور محتمل کو مفسر اور متعین پر حمل کریں گے اور عربی لغت میں لام وقت کے لئے استعمال ہوتا رہتا ہے قرآن کریم کی آیت ہے: **اقم الصلوة لدلوك الشمس** یہاں لام وقت کے لئے ہے ای **وقت دلوك الشمس** اسی طرح عرب کہتے ہیں **آتیك للظهر ای فی وقت الظهر**۔

---

[۱] المرقات ۲/۲۵۴،۲۵۵ [۲] المرقات ۲/۲۵۴،۲۵۵

خلاصہ یہ نکلا کہ حدیث کے تمام الفاظ کو وقت کے معنی پر آسانی سے حمل کیا جاسکتا ہے اور نماز کا معنی اگر لیا تو ان روایتوں پر عمل نہیں ہوسکتا جن میں وقت کا لفظ آیا ہے۔ امام طحاوی نے شوافع پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مثلاً ایک مستحاضہ عورت نے نماز کے لئے وضو تو بنالیا مگر نماز نہ پڑھی اور نماز کا وقت نکل گیا تو اب بتاؤ اس کا وضو کیسے ٹوٹے گا جبکہ اس کے لئے آپ حضرات نماز ناقض للوضو بناتے ہو؟

نیز طحاوی نے یہ بھی اشکال کیا ہے کہ شریعت مطہرہ میں یہ بات تو معروف ومشہور ہے کہ وقت کے ختم ہونے اور وقت کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے مثلاً ایک شخص نے موزوں پر مسح کیا ہے اب مقیم اور مسافر کی مدت مسح جب ختم ہوجاتی ہے اور وقت نکل کر گزر جاتا ہے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے تو خروج وقت ناقض للوضو ہوا لیکن شریعت میں **فراغ عن الصلوٰۃ** کو کہیں بھی ناقض للوضو نہیں کہا گیا اور نہ اس کی کوئی نظیر ملتی ہے۔ نیز ہر نماز کے لئے وضو کرنے میں احتیاط تو ہے لیکن اس میں ان جیسی مسکین عورتوں پر حرج بھی تو ہے اگر حدیث شریف سے سہولت کی صورت مل سکتی ہے تو حرج **مدفوع فی الشرع** ہے۔ حرج میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟

مستحاضہ کے غسل کا مطلب

مستحاضہ سے متعلق جو احادیث وارد ہیں ان میں بعض سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مستحاضہ کو ہر نماز کے لئے غسل کا حکم دیا تھا امام طحاوی نے بھی سھلہ بنت سھیل رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق نقل کیا ہے کہ ان کو حضور اکرم ﷺ نے ہر نماز کے لئے غسل کا حکم دیا تھا مشکوٰۃ شریف کی تیسری فصل میں اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں **لما اشتد علیھا الغسل** یعنی ہر نماز کے لئے غسل کرنا جب فاطمہ بنت ابی حبیش پر دشوار ہوگیا تو آنحضرت نے ان کو دو نمازوں کے لئے ایک غسل کرنے کا حکم دے دیا اس سے بھی ہر نماز کے لئے غسل کا حکم معلوم ہوتا ہے اسی طرح مشکوٰۃ کے **باب المستحاضہ** میں حمنہ بنت جحشکی روایت سے دو نمازوں کے لئے ایک غسل کا حکم معلوم ہوتا ہے یعنی ظہر اور عصر کے لئے ایک غسل اور مغرب اور عشاء کے لئے دوسرا غسل اور فجر کے لئے تیسرا غسل تو یہ پانچ نمازوں کے لئے تین غسلوں کا حکم ہے اسی طرح پانچ نمازوں کے لئے تین غسلوں کا حکم اس باب کی آخری حدیث میں بھی ہے جس کی روایت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کی ہے۔

ان غسلوں کے علاوہ ہر نماز کے لئے وضو کرنے کا حکم بھی کئی احادیث میں آیا ہے اب ائمہ اربعہ کا مسلک وضو کا ہے تو غسل کی ان حدیثوں کا جواب دینا اور ان احادیث کو صحیح محمل پر حمل کرنا ائمہ اربعہ کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ ان احادیث کی ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کی طرف سے علماء نے کئی توجیہات کی ہیں۔

① اول توجیہ اور جواب یہ ہے کہ غسل کی تمام احادیث استحباب پر محمول ہیں کہ غسل واجب تو نہیں لیکن اگر کرے تو مستحب ہے کہ ہر نماز کے لئے الگ الگ یا دو نمازوں کے لئے ایک غسل کرے۔

❷ غسل کی تمام احادیث کا تعلق علاج سے ہے مطلب یہ کہ ان مستحاضہ عورتوں کو غسل کا حکم اس لئے دیا گیا تا کہ ٹھنڈے پانی کے استعمال کرنے سے خون میں کمی آجائے اور خون رک جائے۔

❸ احادیث غسل کا تعلق متحیرہ کی بعض صورتوں سے ہے جس کے غسل کے احناف بھی قائل ہیں۔

❹ غسل اور وضو کی تمام احادیث کا نقشہ بہت اچھے طریقہ سے امام طحاوی نے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سھلہ بنت سہیل رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آنحضرت ﷺ نے ابتداء میں ہر نماز کے لئے غسل کا حکم دیا تھا پھر آپ نے اس میں نرمی کر کے دو نمازوں کے لئے ایک غسل کا حکم دے دیا جب یہ بھی ان پر شاق ہو گیا تو آپ نے ہر نماز کے لئے وضو کا حکم دیا تو دو نمازوں کے لئے ایک غسل کے حکم سے ہر نماز کے لئے غسل کا حکم منسوخ ہو گیا پھر ہر نماز کے لئے وضو کرنے کے حکم سے غسل کا حکم منسوخ ہو گیا اور اگر غسل کا حکم منسوخ نہیں ہے تو علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بطور علاج تبرید کے حصول کے لئے غسل کا حکم دیا تھا۔ (واللہ اعلم)

ان پانچ مباحث سے الحمد للہ باب الاستحاضہ کی تمام احادیث کی آسان تشریح سامنے آگئی اور یہ کتاب الطہارۃ کی آخری تفصیلی توضیح تھی جو کہ مکہ مکرمہ میں ۳ شوال ۱۴۲۲ھ میں مکمل ہو گئی ہے اور جس سے التوضیحات اردو شرح مشکوٰت کی پہلی جلد مکمل ہو گئی جس کی ابتداء گزشتہ سال ۱۴۲۱ھ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ہوئی تھی۔

اللهم لك الحمد كما ينبغي لجلال وجهك وعظيم سلطانك لك الشكر على ما انعمت ولك الشكر على ما مننت ولك الشكر اولًا واخرًا ولك الشكر ظاهرًا وباطنًا انت الخالق وانت المالك وانت الرازق لا رب الا انت ولا مالك الا انت ولا ناصر الا انت بيدك الخير وانك على كل شيء قدير وصلى الله تعالىٰ على اشرف الخلق وخاتم النبيين جيش الانبياء والمرسلين وعلى اله واصحابه اجمعين۔ امين يارب العالمين۔

فضل محمد بن نور محمد یوسف زئی

استاذ جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی

حال نزيل مكة المكرمة زادها الله عزة وعظمة وهيبة ومهابة

۳ شوال ۱۴۲۲ھ

الفصل الاول

﴿۱﴾ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ أَبِي حُبَيْشٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنِّي إِمْرَأَةٌ أُسْتَحَاضُ فَلَا أَطْهُرُ أَفَأَدَعُ الصَّلَاةَ فَقَالَ لَا إِنَّمَا ذٰلِكِ عِرْقٌ وَلَيْسَ بِحَيْضٍ فَإِذَا أَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ فَدَعِي الصَّلَاةَ وَإِذَا أَدْبَرَتْ فَاغْسِلِي عَنْكِ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّي۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔[1]

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ میں ایک ایسی عورت ہوں جسے برابر (استحاضہ کا) خون آتا رہتا ہے چنانچہ میں کسی وقت پاک نہیں رہتی تو کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نہیں، یہ تو ایک رگ کا خون ہے حیض کا خون نہیں ہے لہٰذا جب تم کو حیض آنے لگے تو تم نماز چھوڑ دو اور جب حیض ختم ہو جائے تو (جسم سے) خون کو دھو ڈالو اور (نہا کر) نماز پڑھ لو"۔ (بخاری، مسلم)

الفصل الثانی

﴿۲﴾ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ أَبِي حُبَيْشٍ أَنَّهَا كَانَتْ تُسْتَحَاضُ فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ ﷺ إِذَا كَانَ دَمُ الْحَيْضِ فَإِنَّهُ دَمٌ أَسْوَدُ يُعْرَفُ فَإِذَا كَانَ ذٰلِكِ فَأَمْسِكِي عَنِ الصَّلَاةِ فَإِذَا كَانَ الْآخَرُ فَتَوَضَّئِي وَصَلِّي فَإِنَّمَا هُوَ عِرْقٌ۔ (رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ)۔[2]

ترجمہ: حضرت عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ (تابعی) حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ "انہیں استحاضہ کا خون آتا تھا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ جب حیض کا خون آئے جس کی پہچان یہ ہے کہ وہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے تو اس وقت تم نماز پڑھنے سے رک جایا کرو اور جب استحاضہ کا خون آنے لگے (یعنی خون سیاہ رنگ کے علاوہ اور کسی رنگ کا ہو) تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو کیونکہ (یہ حیض نہیں بلکہ) ایک رگ کا خون ہوتا ہے۔" (ابوداؤد، نسائی)

﴿۳﴾ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ إِنَّ امْرَأَةً كَانَتْ تُهَرَاقُ الدَّمَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَاسْتَفْتَتْ لَهَا أُمُّ سَلَمَةَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِتَنْظُرْ عَدَدَ اللَّيَالِي وَالْأَيَّامِ الَّتِي كَانَتْ تَحِيضُهُنَّ مِنَ الشَّهْرِ قَبْلَ أَنْ يُصِيبَهَا الَّذِي أَصَابَهَا فَلْتَتْرُكِ الصَّلَاةَ قَدْرَ ذٰلِكَ مِنَ الشَّهْرِ فَإِذَا خَلَّفَتْ ذٰلِكَ فَلْتَغْتَسِلْ ثُمَّ لِتَسْتَثْفِرْ بِثَوْبٍ ثُمَّ لِتُصَلِّ۔ (رَوَاهُ مَالِكٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ وَرَوَى النَّسَائِيُّ مَعْنَاهُ)۔[3]

---

[1] اخرجه البخاري ۱/۶۶ ومسلم ۱/۱۸۰ [2] اخرجه ابو داؤد ۲۸۰ والنسائي ۱/۱۲۱

[3] اخرجه مالك ۲۶ وابو داؤد ۲۷۴ والنسائي ۱/۱۱۹

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ "نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ایک عورت کو استحاضہ کا خون آتا تھا (اور وہ معتادہ تھی) چنانچہ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے فتویٰ پوچھا (کہ اس کا کیا حکم ہے؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا اسے چاہئے کہ وہ دیکھے کہ اس بیماری کے آنے سے پہلے اسے مہینہ میں حیض کا خون کتنے دن رات آتا تھا (جب معلوم ہو جائے تو) ہر مہینہ اتنے ہی دنوں کی نماز پڑھنا چھوڑ دے اور جب وہ دن گزر جائے تو نہالے اور (پاجامہ کے اندر) کپڑے کی لنگوٹی باندھ کر نماز پڑھ لیا کرے۔" (مالک، ابوداؤد، دارمی) اور نسائی نے اس روایت کو بالمعنی نقل کیا ہے۔

﴿٤﴾ عَنْ عَدِيِّ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ يَحْيَى بْنُ مَعِينٍ: جَدُّ عَدِيِّ اِسْمُهُ دِينَارٌ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ فِي الْمُسْتَحَاضَةِ تَدَعُ الصَّلَاةَ أَيَّامَ أَقْرَائِهَا الَّتِي كَانَتْ تَحِيضُ فِيهَا ثُمَّ تَغْتَسِلُ وَتَتَوَضَّأُ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَتَصُومُ وَتُصَلِّي۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ)[1]

ترجمہ: حضرت عدی ابن ثابت رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ان کے والد اپنے والد یعنی عدی کے دادا سے نقل کرتے ہیں "یحییٰ ابن معین کہتے ہیں" کہ عدی کے دادا کا نام دینار ہے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ "آپ نے ایک مستحاضہ کے بارے میں فرمایا کہ جن دنوں میں اسے (عادت کے موافق) حیض آتا ہے اسے چاہئے کہ ان میں نماز چھوڑ دے پھر (ان دنوں کے بعد ایک مرتبہ) نہائے اور ہر نماز کیلئے تازہ وضو کرے اور روزہ رکھے اور نماز بھی پڑھے۔" (ابوداؤد، ترمذی)

﴿٥﴾ وَعَنْ حَمْنَةَ بِنْتِ جَحْشٍ قَالَتْ كُنْتُ أُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيرَةً شَدِيدَةً فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَسْتَفْتِيهِ وَأُخْبِرُهُ فَوَجَدْتُهُ فِي بَيْتِ أُخْتِي زَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ إِنِّي أُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيرَةً شَدِيدَةً فَمَا تَأْمُرُنِي فِيهَا قَدْ مَنَعَتْنِي الصَّلَاةَ وَالصِّيَامَ قَالَ أَنْعَتُ لَكِ الْكُرْسُفَ فَإِنَّهُ يُذْهِبُ الدَّمَ قَالَتْ هُوَ أَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ فَتَلَجَّمِي قَالَتْ هُوَ أَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ فَاتَّخِذِي ثَوْبًا قَالَتْ هُوَ أَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ إِنَّمَا أَثُجُّ ثَجًّا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ سَآمُرُكِ بِأَمْرَيْنِ أَيَّهُمَا صَنَعْتِ أَجْزَأَ عَنْكِ مِنَ الْآخَرِ وَإِنْ قَوِيتِ عَلَيْهِمَا فَأَنْتِ أَعْلَمُ قَالَ لَهَا إِنَّمَا هٰذِهِ رَكْضَةٌ مِنْ رَكَضَاتِ الشَّيْطَانِ فَتَحَيَّضِي سِتَّةَ أَيَّامٍ أَوْ سَبْعَةَ أَيَّامٍ فِي عِلْمِ اللهِ ثُمَّ اغْتَسِلِي حَتَّى إِذَا رَأَيْتِ أَنَّكِ قَدْ طَهُرْتِ وَاسْتَنْقَأْتِ فَصَلِّي ثَلَاثًا وَعِشْرِينَ لَيْلَةً أَوْ أَرْبَعًا وَعِشْرِينَ لَيْلَةً وَأَيَّامَهَا وَصُومِي فَإِنَّ ذٰلِكَ يُجْزِئُكِ وَكَذٰلِكَ فَافْعَلِي كُلَّ شَهْرٍ كَمَا تَحِيضُ النِّسَاءُ وَكَمَا يَطْهُرْنَ مِيقَاتَ حَيْضِهِنَّ وَطُهْرِهِنَّ وَإِنْ قَوِيتِ عَلَى أَنْ تُؤَخِّرِينَ الظُّهْرَ وَتُعَجِّلِينَ الْعَصْرَ فَتَغْتَسِلِينَ وَتَجْمَعِينَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ الظُّهْرِ

[1] اخرجه ابو داؤد ۲۹۷ والترمذی ۱۲۶

وَالْعَصْرِ وَتُؤَخِّرِيْنَ الْمَغْرِبَ وَتُعَجِّلِيْنَ الْعِشَاءَ ثُمَّ تَغْتَسِلِيْنَ وَتَجْمَعِيْنَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ فَافْعَلِي وَتَغْتَسِلِيْنَ مَعَ الْفَجْرِ فَافْعَلِي وَصُوْمِيْ إِنْ قَدَرْتِ عَلٰى ذٰلِكَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهٰذَا أَعْجَبُ الْأَمْرَيْنِ إِلَيَّ۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ)۔[1]

ترجمہ: حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ''مجھے بہت ہی کثرت سے استحاضہ کا خون آتا تھا اس لئے نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی تا کہ آپ کو اس کی خبر دوں اور اس کا حکم پوچھوں چنانچہ میں اپنی بہن زینب بنت جحش کے مکان میں سرکار دو عالم ﷺ سے ملی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے استحاضہ کا خون بہت ہی کثیر آتا ہے جس نے مجھے نماز روزہ سے بھی روک رکھا ہے اس کے بارے میں آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں تمہارے لئے روئی کو بیان کرتا ہوں کیونکہ وہ خون کو لے جاتی ہے (یعنی خون نکلنے کی جگہ روئی رکھ لو تا کہ وہ باہر نہ نکلے) حمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ وہ تو (اس سے نہیں رکے گا کیونکہ) بہت زیادہ ہے آپ نے فرمایا (روئی رکھ کر) اس پر لگام کی طرح کپڑا (یعنی لنگوٹی) باندھ لو۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس سے (بھی نہیں رکے گا کیونکہ) زیادہ ہے آپ نے فرمایا تو پھر (لنگوٹ کے نیچے) ایک کپڑا رکھ لو انہوں نے کہا کہ وہ اس سے (بھی نہیں رکے گا کیونکہ بہت ہی) زیادہ ہے یہاں تک کہ خون بارش کی (دھار کی) طرح آتا ہے۔ آپ نے فرمایا پھر تو میں تمہیں دو باتوں کا حکم کرتا ہوں ان میں سے تم جس کو بھی اختیار کر لو گی دوسری کی ضرورت نہیں رہے گی اور اگر تمہارے اندر دونوں (پر عمل کرنے) کی طاقت ہوگی تو تم خود ہی دانا ہو (کہ بہت بڑا اجر ملے گا لہٰذا تم اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے جو چاہو کرو) چنانچہ آپ نے حمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا کہ یہ استحاضہ شیطان کی لاتوں میں سے ایک لات مارنا ہے لہٰذا (ہر مہینہ) چھ یا سات روز جس کا علم اللہ کو ہے حیض کے ایام قرار دو اور پھر (مدت مذکورہ جانے کے بعد) نہا ڈالو اور جب تم جان لو کہ میں پاک اور صاف ہو گئی ہوں تو تیئیس (۲۳) دن رات (ایام حیض سات دن قرار دینے کی شکل میں) نماز پڑھتی رہا کرو اور (اسی طرح ہر مہینے رمضان وغیرہ کے) روزے بھی رکھتی رہا کرو، چنانچہ جس طرح عورتیں اپنی اپنی مدت پر ایام سے ہوتی ہیں اور پھر وقت پر پاک ہوتی ہیں تم بھی ہر مہینہ اسی طرح کرتی رہا کرو (کہ چھ دن یا سات دن تو حیض کے ایام قرار دو اور بقیہ دن طہر یعنی پاکی کے ایام قرار دو) تمہارے لئے یہ کافی ہوگا اور اگر تمہارے اندر اتنی طاقت ہے کہ ظہر کا وقت اخیر کر کے اس میں نہا لو اور عصر میں جلدی کر کے ان دونوں نمازوں کو اکٹھا پڑھ لو اور پھر مغرب کا وقت اخیر کر کے نہا لو اور عشاء میں جلدی کر کے ان دونوں نمازوں کو اکٹھا پڑھ لو اور نماز فجر کے لئے (علیحدہ) نہا لو تو اسی طرح کر لیا کرو اور (جن دنوں نماز پڑھوان دنوں میں نفل اور فرض جیسے بھی چاہو) روزے رکھ لیا کرو اگر تم میں اس کی طاقت ہو تو (اس طرح کرتی رہا کرو) پھر سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ان دونوں باتوں میں سے آخری بات مجھے پسند ہے۔''

(احمد، ترمذی، ابوداؤد)

---

[1] اخرجه احمد ۱/۳۸۱ وابو داؤد ۲۸۷ والترمذی ۱۶۸

توضیح: حمنہ بنت جحش یہ صحابیہ آنحضرت ﷺ کی سالی ہے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علاوہ حضرت جحش کے ساری بیٹیاں استحاضہ کی بیماری میں مبتلا تھیں، مدینہ منورہ میں تقریباً بارہ خواتین استحاضہ کی بیماری کا شکار تھیں ان میں سے حمنہ بنت جحش کا بیان اس حدیث میں ہے۔[1]

انعت لك الكرسف: فرج کے اندر روئی کے مناسب بنڈل رکھنے کا نام کرسف ہے۔[2]

فتلجمي: لجام لگانے کو کہتے ہیں اور فارسی میں لگام ہے عربی میں لجام کتاب کے وزن پر ہے یہ اس لنگوٹ کو کہتے ہیں جو حائضہ اور مستحاضہ عورت کرسف کے اوپر خون بند کرانے کے لئے باندھ لیتی ہے۔[3]

فاتخذي ثوبا: یعنی کپڑے کا مضبوط بنڈل بنا کر رانوں کے درمیان فرج پر رکھ کر اوپر لجام اور لنگوٹ لگالو۔[4]

اثج: ثجاً یعنی سیلاب کی طرح خون آتا ہے حدیث میں ہے **الحج العج الثج** یعنی حج زور سے تلبیہ پڑھنے اور خون بہانے کا نام ہے قرآن میں **ماء ثجاجا** کا لفظ آیا ہے۔

فتحيضي: یعنی اپنے آپ کو حائضہ شمار کرو اور حیض کے احکام کو لازم پکڑو۔[5]

او سبعة ايام: یہ "او" شک کے لئے نہیں ہے بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس عورت کو دو کاموں کا حکم دیا گویا او تنویع کے لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو کچھ ہو اس پر عمل کرو خواہ چھ دن حیض ہو یا سات دن ہو تحری کرو اور عمل کرو۔[6]

اعجب الامرين: یہاں یہ سوال ہے کہ دو امرین کونسے ہیں؟ تو ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ دونوں کا رجحان اس طرف ہے کہ اعجب الامرین میں پہلا امر تو آنحضرت ﷺ نے یہ دیا تھا کہ ہر نماز کے لئے مستقل غسل کرنا چاہیئے لیکن پھر بوجہ حرج آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دو نمازوں کے لئے ایک غسل کرو یعنی ظہر اور عصر کے لئے ایک غسل ہوگا مغرب وعشاء کے لئے دوسرا اور فجر کے لئے الگ غسل ہوگا تو پانچوں نمازوں کے لئے پانچ غسلوں کے بجائے تین غسلوں میں حرج کم ہوگیا۔[7]

استحاضہ کی ایک حدیث میں "لتستثفر" کا لفظ آیا ہے **استثفار** گھوڑوں اور گدھوں پر سامان لادنے کے وقت دم کے نیچے ایک پٹی دبا کر مضبوط باندھی جاتی ہے تاکہ اترائی میں سامان گدھے کے سر کی طرف سرک نہ جائے پھر کتے کے بیٹھنے کے وقت جب وہ دم رانوں کے درمیان دبا کر اس پر بیٹھ جاتا ہے اسکو **استثفار** کہتے ہیں مستحاضہ عورت کو بھی یہی حکم ہے کہ آرام سے بیٹھ کر کپڑے کا بنڈل بنائے اور پھر فرج میں دبا کر اس کے اوپر لنگوٹ باندھ لے تاکہ خون بند ہوجائے، یہ **استثفار** ہے۔

[1] المرقات ۲/۲۵۸،۲۵۹ [2] المرقات ۲/۲۵۹ [3] المرقات ۲/۲۵۹ [4] المرقات ۲/۲۵۹
[5] المرقات ۲/۲۶۰ [6] المرقات ۲/۲۶۰ [7] المرقات ۲/۲۶۷

الفصل الثالث

﴿۶﴾ عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ إِنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ أَبِيْ حُبَيْشٍ أُسْتُحِيْضَتْ مُنْذُ كَذَا وَكَذَا فَلَمْ تُصَلِّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ سُبْحَانَ اللهِ إِنَّ هٰذَا مِنَ الشَّيْطَانِ لِتَجْلِسْ فِيْ مِرْكَنٍ فَإِذَا رَأَتْ صُفَارَةً فَوْقَ الْمَاءِ فَلْتَغْتَسِلْ لِلظُّهْرِ وَالْعَصْرِ غُسْلاً وَاحِدًا وَتَغْتَسِلْ لِلْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ غُسْلاً وَاحِدًا وَتَغْتَسِلْ لِلْفَجْرِ غُسْلاً وَاحِدًا وَتَوَضَّأُ فِيْمَا بَيْنَ ذٰلِكَ.

(رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ رَوٰى مُجَاهِدٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ لَمَّا اشْتَدَّ عَلَيْهَا الْغُسْلُ أَمَرَهَا أَنْ تَجْمَعَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ) [1]

ترجمہ: حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! فاطمہ بنت ابی حبیش کو (پہلی مرتبہ) اتنی مدت سے استحاضہ آ رہا ہے اس لئے وہ (خیال کر کے کہ شاید یہ بھی حیض کے حکم میں ہو) نماز نہیں پڑھ رہی ہیں۔ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ! یہ نماز کا چھوڑنا تو شیطانی اثر ہے اسے چاہیئے کہ ایک لگن میں پانی ڈال کر بیٹھ جائے جس وقت پانی پر زردی معلوم ہونے لگے تو ظہر اور عصر کے لئے ایک غسل کرے، مغرب اور عشاء کے لئے ایک غسل کرے اور فجر کے لئے علیحدہ غسل کرے (اور جب ضرورت ہو تو) ان کے درمیان وضو کر لے۔" یہ روایت ابوداؤد نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب فاطمہ کو (ہر نماز کے لئے) غسل کرنا دشوار معلوم ہوا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو (ایک غسل سے) دو نمازیں اکٹھی پڑھنے کا حکم دیا۔

توضیح: مجلس: یعنی غسل کے لئے ایک ٹب کے پاس بیٹھ جائے یا ظہر کے آخری وقت اور عصر کے اول وقت کے معلوم کرنے کے لئے ایک ٹب کے پاس بیٹھ جائے۔

مرکن: ٹب اور بڑے تھال کو کہتے ہیں۔ [2]

رأت صفارة فوق الماء: یعنی سورج کا رنگ متغیر ہو جائے اور پانی کے اوپر سورج کے رنگ کا پیلا پن نمودار ہو جائے یعنی ظہر کا آخر وقت ہو جائے اور عصر کا اول وقت آ جائے تو اس وقت غسل کر کے دونوں نمازیں اپنے اپنے اوقات میں ادا کرے۔

پیلے رنگ سے عصر کا مکروہ وقت مراد نہیں بلکہ ظہر کا آخری وقت مراد ہے جس میں سورج ایک طرح متغیر ہو جاتا ہے۔ [3]

وتوضأ فیما بین ذلک: یعنی ظہر اور عصر کے لئے جب ایک غسل کرے تو عصر کے لئے اس غسل کے باوجود وضو بھی کرے اور جب مغرب اور عشاء کے لئے ایک غسل کرے تو عشاء کے لئے ایک وضو بھی کرے اور فجر کے لئے الگ ایک غسل کرے، مستحاضہ کے احکام غسل میں تخفیف کا یہ پہلا مرحلہ ہے اس کے بعد تخفیف وضو تک ہو گئی۔ شکر الحمد للہ کہ جلد اول مکمل ہو گئی۔ [4]

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم و تب علينا انك انت التواب الرحيم

و صلى الله على نبيه الكريم محمد وعلى اله وصحبه اجمعين

---

[1] اخرجہ ابو داؤد ۲۹۶ [2] المرقات ۲/۲۶۳ [3] المرقات ۲/۲۶۴ [4] المرقات ۲/۲۶۴

گزارش

قارئین کرام سے مؤدبانہ گزارش ہے

کہ اس جدید ایڈیشن میں حتی الوسع اغلاط کی تصحیح

کے باوجود اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اس سے ادارہ

کو مطلع فرما کر ممنون و مشکور ہوں۔

فقط ناشر

0315-3788955
0321-3788955
0321-3788956
021-35470973